UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222978
UNIVERSAL
LIBRARY

The Drinched Book

text fiy book

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣٠٥ Accession No. ٨٢

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

رجسٹرڈ نمبر — ایچ (۱۸۴)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا ماہوار رسالا

جلد (۲۰) — محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا — نمبر (۱)

ہندستانی ادب

چندا سالانا — حیدرآباد ۲ ۔ آندھرا پردیش ۔ — آٹھ روپے

آذر سنہ ۱۳۶۹ف — ایڈیٹر — اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

جی ۔ ام ۔ خان، ام ۔ اے (عثمانیا)

فہرست

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریے کے ساتھ
		ایڈیٹر	۲	
۱	ہمارے خیالات	سلیم جعفر	۹	قومی زبان
۲	نظیر اکبرآبادی کی مصوری	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۱۳	
۳	حقایق و معارف	بیگم ذکیہ حسین	۱۴	سوویت عورت
۴	کلچر کی سیر	حسن عباس فطرت	۱۸	
۵	آلہا	فیاض ہریانوی	۲۱	رہنمائے تعلیم
۶	نہ بیچے	چندر پرکاش جوہر بجنوری	۲۱	معارف
۷	غزل	اختر علی تلہری	۲۱	معارف
۸	غزل	نذیر حسین	۲۲	خیال
۹	غرناطا	شام داس کھنہ شاد امرتسری	۲۴	
۱۰	ہندستانی افسانا اور اس کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲۸	
۱۱	سفر ایران کے تاثرات	بھوشن بزاز	۳۱	
۱۲	کشمکش	ابھے چرن سریواستو بیتاب	۳۲	شمع ادب
۱۳	غزل			

ہمارے خیالات

"ہندستانی ادب" بیسویں سال میں

بیسویں سال کا پہلا نمبر پیش کرتے ہوئے ہمیں یاد آتا خشی اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ ناامیدی امید میں بدل گئی اور ہماری جدوجہد ایک غیر ممکن کام ممکن ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے، نپولین نے "ناممکن" کے شبد کو ڈکشنری سے خارج کر دینے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ آدمی اس لفظ کی نفسیاتی کیفیت سے اثر لیتا ہے، جس کے سبب اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اس کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی ہے۔

ہم نپولین کی زبان میں نہیں بول رہے ہیں، اور نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ لفظ "ناممکن" کو لغت سے نکال دیا جائے، لیکن ہم نپولین کے اس اہم نظریے کی داد دیے بغیر نہ رہیں گے، اس لیے کہ "ناممکن" کو "ممکن" کر دکھانے کی کوشش میں آدمی کے حوصلے اور عزائم ضرور بلند ہو جاتے ہیں، اور آخر کار وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ ہی جاتا ہے ——

چنانچہ "ہندستانی ادب" کی بیسویں سالگرہ انہیں انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے —— آپ یقین جانیے کہ اس بارے میں ہم نے ایک شبد بھی غلط نہیں لکھا ہے۔ ہم کیسے اور کس طرح بتائیں کہ انیسویں سال کا ہر نمبر ایک کٹھن مرحلہ طے کر کے وجود میں آتا تھا، اور ہمارے ان گنت "نادان" کرم فرماؤں کا مسلسل اصرار اور یہ مشورا کہ "رسالے کو فوراً بند کر دو" ہمارے حوصلے پست کیے دیتا تھا۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس سے ہمارے سب ہی نام نہاد "مہربان واقف ہیں ——

مگر ہم انہیں کیسے بتائیں کہ "ہندستانی ادب" مالی فائدے کی خاطر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ اس نوبت پر تو صرف "یسوا" پیش نظر ہے، یعنی علمی ادبی اور ہندستانی بھاشا یا زبان کی خدمت۔ جب "خدمت" کا جذبا کام کر رہا ہو تو پھر تکلیف یا تشکل کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے ——؟

لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حالات اگر سو فی صد ناسازگار ہو جائیں تو بھی ہم رسالے کو جاری رکھ سکیں گے۔ ہمارے کہنے کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ رسالے کی خاطر ہم ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت گوارا کر لیں گے، اور جب تک ہم سے ممکن ہو سکے رسالے کو جاری رکھیں گے ——

بہرحال، انیسویں منزل کٹھن ضرور تھی، اس لیے جب کبھی ہم پچھلے ایک سالا دور کا خیال کرتے ہیں تو اب بھی وہ منظر بڑا ہی بھیانک اور ڈراونا نظر آتا ہے۔ ہمت کر کے ہم نے اسی پرخار وادی میں پھر سے قدم رکھا ہے —— کہہ نہیں سکتے کہ اس کی بارہ آنٹر لیں طے بھی ہو سکیں گی یا نہیں ——؟

بیکھ مضامین اور نظموں وغیرہ کے بارے میں

جس وقت سے "ہندستانی ادب" ڈائجسٹ کر دیا گیا ہے، اس سمے سے رسالے کا معیار بہت بڑھ گیا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مختلف معیاری رسالوں سے منتخب مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی یہ ضرور کہیں گے کہ "ہندستانی ادب" کا ہر نمبر ایک حسین علمی ادبی "گلدستے" کی شکل میں پیش ہوا کرتا ہے —— جن رسالوں سے

مضامین وغیرہ نقل کیے جاتے ہیں، فہرست میں "شکریے کے ساتھ" ان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ "ہندستانی ادب سو میں سو" ڈائجسٹ نہیں ہے، اور نہ آیندہ بھی ہم اس کو ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا شروع ہی سے یہ طریقہ رہا ہے کہ ہم رسالوں سے بھی مضامین نقل کرتے ہیں، اور جو مضامین وغیرہ ہمیں راست وصول ہوتے ہیں، ان کو بھی اس رسالے کے صفحوں میں جگہ دی جاتی ہے، اس لیے مضمون نگاروں، افسانا نویسوں اور شاعروں وغیرہ سے ہماری پھر سے یہ اپیل ہے کہ وہ ضرور بضرور اپنی تحریریں راست ہمارے ہاں بھیجا کریں، ان میں سے جو بھی چھپنے کے قابل ہوں، انہیں شایع کیا جائے گا۔

"آزادی نمبر"

کئی سال بعد "ہندستانی ادب" نے اپنا خاص نمبر پیش کرنے کی جرات کی تھی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ خاص نمبر سو، دو سو صفحے کا نہیں تھا، اور نہ اس میں تصویریں وغیرہ ہی تھیں، لیکن اس رسالے کے اپنے خاص (تا قابل بیان) حالات کا لحاظ کرتے، یہ خاص نمبر ایک بڑی چیز تھی، اور جیسا کہ ہم نے نمبر ۱۹۵۹ء کے پرچے میں لکھا تھا، کہ اس رسالے کا "آزادی نمبر" ہر حیثیت سے کامیاب رہا۔ اگر ہم خاص نمبر نکالنے کا ارادہ کرتے اور کچھ عرصا پہلے سے اس کے لیے کام کرتے تو یقیناً اس سے زیادا بہتر اور کہیں زیادا کامیاب، خاص نمبر پیش کرتے۔

اس وقت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیندا پھر کب اور کس موقع پر اس رسالے کا خاص نمبر پیش کریں گے! اگر اس رسالے کو اس کے ہمدردوں کا مستقل تعاون حاصل رہے تو ہم ہر سال، ایک سے زیادا خاص نمبر پیش کر سکتے ہیں۔

حکومتی اداروں اور تاجروں سے

ہماری یہ پرزور اپیل ہے کہ وہ "ہندستانی ادب" میں مستقل طور پر اشتہار دیں، اس لیے کہ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، حکومت آندھرا پردیش نے لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسوں کے لیے اس رسالے کی خریدی کی سفارش کی ہے۔ اس کے علاوا یہ رسالا یونیورسٹیوں اور کالجوں کے لیے بھی خریدا جاتا ہے۔ انڈین کانفرنس آف سوشل ورک (شاخ حیدرآباد) اور حیدرآباد سیول کارپوریشن کے ریڈنگ رومس کے لیے بھی اس رسالے کی خریدی جاری ہے۔ خانگی اور سرکاری لائبریریوں اور ریڈنگ رومس کے علاوا انفرادی خریداری بھی جاری ہے۔

اوپر کے حقایق کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں کہ "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادا ہے دوسرے رسالوں میں۔

"HINDUSTANI—ADAB" IS A WIDELY READ PAPER."

ایک اشتہار دینے والے کو اس سے زیادا کیا چاہیے کہ اس کا اشتہار زیادا سے زیادا تعلیم یافتا لوگوں کی نظر سے گذرتا ہے، اس لیے ہم پھر سے ایک بار سرکاری اور غیر سرکاری اشتہار دینے والے اداروں سے یہ کہیں گے کہ وہ "ہندستانی ادب" میں ضرور بضرور اور مستقل طور پر اشتہار دیا کریں، اس سے اشتہار دینے کا حقیقی مقصد پورا ہو کر رہے گا۔

اشتہارات انگریزی میں بھی چھاپے جا سکتے ہیں۔ چیک یا TRNSFER نکال کر بھیجے جائیں یا اشتہار کا مضمون MATTER ہمارے ہاں بھیج دیا جائے تو انگریزی چیزوں کا انتظام ہم خود ہی کر لیں گے۔

یہاں حال اشتہار دینے والوں کو ہم ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا صرف یہ کہنا ہے کہ وہ ہمارے ان وجاروں پر ضرور دھیان دیں۔ اشتہار

کے نرخ وغیرہ کے بارے میں، منیجر "ہندستانی ادب" ۹۹ - اے، اعظم پورہ انترتی - حیدرآباد ۲ (اے پی) سے تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔

حکومت آندھرا پردیش اور مرکزی حکومت ہندستان سے ہماری اپیل

یہاں اس کا پورا پورا علم ہے کہ مقامی اور مرکزی دونوں حکومتیں، بعض اداروں کو رقمی امداد دے رہی ہیں۔ امداد کی شکلیں مختلف ہیں۔ کسی ادارے کو یکمشت رقم ملی ہے تو کسی کو سالانا، اور کسی رسالے کو ماہوار امداد بھی دی جا رہی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انہیں امداد نہ دی جانی چاہیے، بلکہ ہم تو خشی کے ساتھ یہ مشورا دیں گے کہ ان کی امداد میں اور بھی اضافا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ علمی ادبی رسالوں اور اداروں کو جتنی بھی امداد دی جائے کم ہے۔

اس سلسلے میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ "ہندستانی ادب" ایسی امداد سے کیوں محروم رہے؟ اس رسالے کی بیسویں سالانہ زندگی ہے، اس کو آج تک کبھی خانگی یا سرکاری طور پر کوئی بھی امداد نہیں ملی۔ جب تک رسالے کے حالات بہتر تھے، امداد حاصل کرنے کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا، اور حالات خراب ہونے کے بعد بھی ہمیں یہ خیال پیدا نہ ہوا، لیکن جب حالات آجکل کے سے ہیں تو لازمی طور پر امداد کا خیال پیدا ہوا اور اسی نظریے کہ تحت آج ہم کھلے طور پر، ہماری دونوں ہی حکومتوں سے پرزور طریقے پر امداد کی "اپیل" کر رہے ہیں۔ اس کا تقاضا ہم حکومت کے کرتا دھرتاؤں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ جتنی بھی چاہیں، مناسب رقمی امداد اس رسالے کے نام منظور کریں۔

حق مبنی امداد کا، اس رسالے سے زیادا اور کون مستحق ہو سکتا ہے، اس لیے کہ یہ رسالا "ہندستانی" بھاشا یا زبان کا پرچار کر رہا ہے، اور یہ وہی "ہندستانی" زبان ہے جس کو دیس کا مہاتما گاندھی شہید پرچار چڑھتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم انہیں کے وچاروں کا پالن کر رہے ہیں، اس لیے "اصولی طور پر ہندستانی ادب" سے زیادا، اور کوئی رسالا یا ادارا سرکاری امداد پانے کے قابل نہیں ہے۔ ہمیں آشا ہے کہ ہماری مہربان حکومتیں، اس رسالے کی بیس سالا طویل مدت علمی ادبی خدمات یا سیوا کے صلے میں رقمی امداد یقینی طور پر منظور کریں گی۔

ایجوکیشن افسر، ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس صاحبان توجہ دیں

ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، گورنمنٹ آف آندھرا پردیش نے اس رسالے کی خریدی کی ایک سے زیادا مرتبا سفارش کی ہے، اس لیے ایجوکیشن افسر صاحبان سے ہماری یہ درخاست ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقے کی حد تک ہیڈ ماسٹرس اور ہیڈ مسٹریس کو اس رسالے کی خریدی کی طرف توجہ دلائیں، جس کے لیے ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

اس کے علاوا ہیڈ ماسٹرس اور ہیڈ مسٹریس سے راست ہماری یہ اپیل ہے کہ وہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے پہلے سرکلر کی روشنی میں اس رسالے کی خریدی کی طرف ضرور توجہ دیں۔ رسالے کا سالانا چندا پیشگی آٹھ روپے منی آرڈر کے ذریعے روانہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا، اس لیے کہ وی۔ پی میں اخراجات زیادا ہو جاتے ہیں۔

بعض مدرسوں سے سالانا چندا چھ روپے اور بعض مدرسوں سے صرف چار روپے وصول ہوا ہے۔ بار بار توجہ دلانے کے باوجود، کوئی نتیجا نہ نکلا، اس لیے ان سطروں کے ذریعے ان مدرسوں کو پھر سے توجہ

دلائی جاتی ہے، یقین ہے کہ وہ اس یاد دہی کو آخری تصور فرمائیں گے اور اپنا اپنا نقایا چندا، جلد سے جلد بھیجکر ہمیں ممنونیت کا موقع دیں گے!

"جوبلی نمبر"

اصول "سلور جوبلی" پچیس سال کے ختم پر منائی جاتی ہے لیکن اس نظریے میں ہم تھوڑی سی جدت سے کام لینا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ پچیس سال کے ختم پر ہم اس رسالے کی "سلور جوبلی" نہیں، بلکہ صرف "جوبلی" منائیں گے۔ جوبلی کی دنیا میں، ہماری یہ جدت، یقیناً اعتراض کا نشانا بنے گی، لیکن ہم پر حرف دھرنے سے پہلے معترضین کو یہ ٹھیک سے سمجھ لینا چاہیے کہ ہم "سلور جوبلی" نہیں، بلکہ "جوبلی" منانا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اعتراض کرنے کی بجائے ہماری اس جدت کی داد دینی چاہیے۔

اگر ستمبر ۱۹۶۰ء تک یہ رسالا جاری رہے اور اکتوبر ۱۹۶۰ء کا پرچا نکالنے کے قابل ہوں تو وہ لازمی طور پر "ہندستانی ادب" کا "جوبلی" نمبر ہوگا ــــ کیسا اور کیا ہوگا، اس وقت اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے ــــ رسالے کے حالات جیسے بھی رہیں، اسی کے مطابق "جوبلی نمبر" ہوگا۔

"ہندستانی ادب" کی یہ جدت شروع شروع میں قابل اعتراض ضرور رہے گی، لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ آگے چل کر "جوبلی" منانے والے ضرور اس پر عمل کریں گے، اور "سلور جوبلی" سے پہلے پچیس سالا "جوبلی" بھی منایا کریں گے۔ اس وقت جدت کا سہرا یقیناً "ہندستانی ادب" کے سر رہے گا۔

ماجد ادیب بریلوی

معاصر "دین دنیا" دلی، اس خبر کا ذمے دار ہے کہ ماجد ادیب بریلوی کا انتقال ہوگیا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو واقعی قابل افسوس ہے، اور زیادہ افسوس کے قابل اس لیے کہ ماجد ادیب کا تعلق بحیثیت شاعر "ہندستانی ادب" سے ایک عرصے تک رہا ہے۔ پہلے پہلے تو وہ مسلسل لکھتے رہے، ہر مہینا ان کی نظم یا غزل اس رسالے میں ضرور چھپا کرتی تھی۔ بعد میں انہوں نے اس طرف توجہ کم کردی تھی۔ جب ہم نے اس بات کی شکایت کی کہ "ہندستانی ادب" پر پہلی سی نظر عنایت باقی نہیں رہی، تو انہوں نے اپنی پریشانیوں اور مصروفیتوں کو اس کا سبب قرار دیا تھا، ہم نے بھی زیادا اصرار نہیں کیا، اور جب کبھی وہ اپنا کلام بھیج دیتے تو ہم چھاپ دیا کرتے تھے۔ ہمیں ان کی بیماری کی کوئی اطلاع نہ مل سکی، اس لیے کہ پچھلے کچھ عرصے سے خط کتابت بلکل ہی بند تھی۔

ماجد نوجوان تھے، انہیں تو دنیا میں ابھرنا اور ترقی کی منزلیں طے کرنا تھا، مگر افسوس موت کے ظالم پنجے نے انہیں آدبوچا۔ ماجد تو ختم ہوگئے، لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا نام اور کلام چھوڑ گئے ہیں۔ ہندستان کے نوجوان شاعروں میں ماجد ادیب نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کرلیا تھا۔ اگر وہ زندا رہتے تو تھوڑے ہی عرصے میں بڑے اور مشہور شاعروں کی صف میں اپنا مقام بہت جلد پیدا کرلیتے۔

ماجد ادیب نے کسی خاص شاعر کی تقلید نہیں کی۔ انہوں نے خد اپنا ایک خاص رنگ پیدا کیا تھا، اور ان کی یہ انفرادیت خد ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ ماجد "نظم" گو شاعر تھا۔ مختلف عنوانوں پر طبع آزمائی کی ہے، اور ہر موضوع کی وضاحت میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ماجد نے غزلیں بھی کہی ہیں، رباعیات بھی، اور قطعات بھی کہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر صنف شاعری میں ماجد نے طبع آزمائی کی ہے، اور اپنی شاعری کی تھوڑی سی عمر میں وہ بہت کچھ کہہ گیا ہے۔ مرحوم کے متعلقین کو یا بریلی وغیرا کے پبلشروں کو ہمارا یہ مفید مشورا ہے کہ

وہ ماہر ادیب بریلوی کے کلام کا مجموعہ عنقریب چھاپیں۔

آخر میں ہم ماہر ادیب بریلوی کے پسماندوں سے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندستانی اور آوازی یا صوتی (فونیٹک) اصول

آوازی اصول پر لکھائی کا مقصد ہندستانی بھاشا یا زبان کو بگاڑنا نہیں، بلکہ بنانا اور سنوارنا ہے۔ وہ لوگ کم عقل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ آوازی اصول کے سبب زبان بگڑ جاتی ہے۔ ایسے لوگ دنیائے لسانیات سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں غالباً اس کا بھی علم نہیں کہ دنیا کی بڑی زبانوں کو آسان اور سہل بنانے کی طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔ مغربی زبانوں میں امریکی زبان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اور مشرقی زبانوں میں چینی زبان۔ چینی زبان کی اصلاح کے لیے زبان کے ماہروں کی ایک کمیٹی قایم کی گئی ہے، جس نے اپنی رپورٹ میں یہ بات صاف طور پر بتا دی ہے کہ چینی ابجد نہایت ہی مختصر ہے، اس لیے اس کی بجائے ROMAN ابجد اختیار کر کے چینی زبان کو آوازی یا صوتی سانچوں میں ڈھالا جائے۔

چین کی تقلید میں جاپان میں بھی یہ تحریک چل نکلی ہے، مگر ابھی اس کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی ہے، آج نہیں تو کل چین کی طرح جاپانی حکومت بھی زبان کی اصلاح کی طرف ضرور دھیان دیگی۔ یہ رہیں بدیس کی باتیں، اب دیس کا بھی کچھ حال سن لیجیے۔ تلگی اور کنڑی زبانوں پر غور کرنے کے لیے دونوں زبانوں کے ماہروں کی ایک کمیٹی قایم کی گئی ہے۔ اس کمیٹی کے ذمے کئی ایک فرایض ہیں، ان میں سے ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ ان دو بھاشاؤں کو آوازی یا صوتی سانچوں میں ڈھالنے پر غور کیا جائے۔

اوپر کی چند ایک مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ ماہر ان لسانیات کا زیادا تر رجحان، زبانوں کو آوازی سانچوں میں ڈھالنے کی طرف ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ زبان بالکل ہی سائنٹفک SCIENTIFIC طریقے پر بنتی اور آسان ہو جاتی ہے۔ یہ تو بالکل کھلی بات ہے کہ جو چیز جتنی آسان ہو گی، وہ اتنا ہی جلد اپنائی جا سکے گی۔

ہماری کوششوں کا مقصد بھی تو یہی ہے کہ ہندستانی بھاشا، آسان سے آسان تر ہو، اور زیادا سے زیادا اپنائی جا سکے۔ ایک ایسی ہی زبان قبول عام حاصل کر سکے گی۔

غور تو کیجیے کہ اپنی زبان کو آوازی اصول پر لکھنے کا بیڑا اٹھا کر ہم نے بڑائی پاپ کیا ہے، چاروں طرف سے ہم پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، اور ہم کو یہ مشورے دیے جا رہے ہیں کہ اس اصول کو ترک کر دو، اس سے زبان بنتی نہیں، بلکہ بگڑتی ہے ـــــ یہ بھی عجیب بات ہے! ہم کہتے ہیں کہ زبان بنتی ہے، اور اعتراض کرنے والا کہتا ہے، بگڑتی ہے ـــــ آخر وہ اعتراض کرنے والا جو ٹھہرا ـــــ اور کیا کہے گا کہ بنتی ہے ـــــ نہیں! اعتراض کرنے والے سے یہ آشا کیسے کی جا سکتی ہے!

ہمارے اس زرین نظریے یا اصول پر اعتراض زبانی بھی کیے جاتے ہیں اور تحریری بھی۔ ان اعتراضوں میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہوتا، اس کی دو ایک مثالیں ہم ابھی نیچے پیش کرنے والے ہیں۔ آوازی اصولوں کے مخالفوں کا اعتراض، اگر صرف اعتراض کی حد تک رہتا تو کوئی بات نہ تھی، مگر بعض لوگوں کے اعتراض میں "انتقام" یا بدلے کا زہر ملا ہوتا ہے ـــــ اور ایسے متعصب لوگ بدلا لے کر ہی رہتے ہیں، یعنی رسالے کی خریداری بند کر دی جاتی ہے ـــــ یہ عمل تعلیمی اداروں کا ہے، اس لیے بھی ہمیں اس کا زیادا افسوس ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کو تو بلند حوصلا اور وسیع خیال ہونا چاہیے، اس قسم کا بے معنی دباو اور بیجا اثر ڈالنا تو انہیں شوبھا نہیں دیتا۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا "آزادی خیال" کے بھی معنی ہیں کہ دوسروں کے نظریوں اور خیالات کو ایک خاص

اثر اور دباؤ کے تحت کچلنے کی نادیدا اور نازیبا کوشش کی جائے؟ یہ کونسا انصاف ہے کہ نہایت ہی "رکیک" طریقے پر آپ دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں؟ مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حق اور صداقت پر مبنی آواز کو دنیا کی کوئی قوت بھی دبا نہیں سکتی۔ "ہندستانی ادب" کا آوازی یا صوتی اصول کا "پیام" بھی اس کی صداقت بھری آواز ہے ـــــ اور یہ آواز ساری دنیائے لسانیات میں گونج رہی ہے اور گونجتی رہے گی ـــــ آج نہیں کل ـــ اس آواز پر ضرور کان دھرا ہوگا اور "ہندستانی" زبان کے لیے سنہرے اور مفید آوازی اصول کو مجبوراً اختیار کرنا ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ "کل" کچھ دیر سے آئے ممکن ہے اس وقت ہم نہ رہیں، لیکن ہمارا یہ "پیام" تو "ہندستانی ادب" کے صفحوں میں اس بات کی گواہی دینے کے لیے موجود رہے گا کہ ایک "پیامبر زبان" نے آج سے پچاس عرصا پہلے اس اٹل ضرورت کو محسوس کیا تھا، اور "ہندستانی" زبان کی بھلائی بہتری اور ترقی کے لیے آوازی یا صوتی اصول کا "نعرا" لگایا تھا، جس کا ثبوت "ہندستانی ادب" کی جلدوں میں موجود ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا تھا کہ آوازی اصول کے سلسلے میں اعتراضوں کی دو ایک مثالیں پیش کریں گے، چلیے پہلی مثال معاصر "منادی" (فروری۔ مارچ ۱۹۵۹ء) دلی کی پیش ہے ـــــ

"ہندستانی ادب" اچھے خاصے معیار کا پرچہ ہے۔ لیکن اس کا آوازی اصول کچھ بے اصول سا ہے۔ جس طرح بولنا اسی طرح لکھنا مفید اور ضروری چیز ہے مثلاً لکھتے تو اس طرح ہیں "میں کہہ میں تھا" اور بولتے ہیں "میں کہے میں تھا"۔ اردو کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ "میں کہے میں تھا" لکھا جائے۔ کیونکہ اس طرح نوآموزوں کو بڑی آسانی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ تلفظ غلط نہیں ہوتا۔ بعض ایسے آدمی جو زبان دلی

نہیں ہیں کتابت کے اس فرق کی وجہ سے بہت سے الفاظ کا غلط تلفظ کرتے ہیں۔"

دیکھا آپ نے اعتراض کے بے ڈھنگے پن کو ـــ پہلے تو ہمارے اصول کو "بے اصول" قرار دیا ہے، مگر ساتھ ہی اس کی افادیت کا اعتراف، خط کھینچے ہوئے شبدوں میں کیا ہے۔ ہم "دنیائے انصاف" سے اس کا "فیصلا" چاہتے ہیں ـــ! آیا یہ ہمارے "اصول" کی تائید ہے یا نہیں ـــ؟ اعتراض تو محض "اعتراض" کے جذبے کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن دل کی جو بات یا "حقیقت" تھی وہ ظاہر ہو کر ہی رہی۔ معترض کا ہر ہر "لفظ" اور یہاں تک کہ ہر ہر "حرف" پکار پکار کر اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ زبان کی بھلائی اور ترقی کے لیے "آوازی یا صوتی" اصول کی شدید ضرورت ہے، بغیر اس اصول کے زبان ترقی نہیں کرسکتی اور یہ کہ "تلفظ غلط نہیں ہوتا" ـــ ہمارا بھی تو یہی کہنا ہے۔ ہم خود بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ غلط تلفظ سے پرہیز کیا جائے، تاکہ زبان آسانی کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرسکے!

آگے چل کر تبصرہ نگار نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ "لیکن آوازی اصول پر لکھنے کے لئے بھی کچھ اصول و ضوابط مقرر ہونے چاہئیں ....." ہمیں اس سے کب انکار ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس اہم کام کے اصول اور ضوابط مقرر ہونے چاہئیں ـــ مگر مجبوری یہ ہے کہ اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے ہمارا کوئی ساتھی یا ہم خیال نہیں ہے، اسکی باوجود، تنہا ہم خود ہی اس کام کو کر لیتے، لیکن افسوس کہ ہمیں ایک منٹ کا چین اور سکون بھی تو نصیب نہیں ہے، چونکہ آپ ہمارے ہم خیال ہیں، اس لیے ہم آپ کو دعوت عمل دیتے ہیں ـــ آیئے! اس بھلے اور مفید کام کو آپ اور ہم، دونوں ہی مل کر کریں ـــــ!

آگے چل کر مبصر نے شبدوں کے تلفظ کے صحیح

فرق کو واضح کیا ہے۔ یہ بالکل ہی الگ بحث ہے جس کو معترض ٹھیک طور پر سمجھ نہ سکا۔ یعنی دوسرے معنی میں خدا ہی بہتر طرح سے ٹھوکر کھائی ہے۔ ہم اس غیر متعلق اور غیر ضروری بحث کو چھیڑ کر آپ کا وقت ضایع کرنا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد ہمارے کرم فرما نے بڑے ہی پتے کی بات لکھی ہے، اس پر ہم خود بھی لکھنا چاہتے تھے، مگر موقع محل کے متلاشی تھے، اور اتفاق سے آج یہ موقع ہاتھ آ ہی گیا، لکھتے ہیں ــــــ

"حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے مولانا جعفر بیا پھلواری کے مشورے سے یہ تحریک شروع کی تھی لیکن فنی طور پر اصول و ضوابط حضرت خواجہ صاحب کے سامنے بھی مقرر نہیں ہو سکے۔ خواجہ صاحب آوازی اصول کو بہت محدود پیمانے پر استعمال کرتے تھے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس کی ضرورت صرف "ہندستانی ادب" کو محسوس نہیں ہوئی، بلکہ خواجہ حسن نظامی جیسے صاحب طرز انشا پرداز اور ادیب کے بدل نے بھی صوتیاتی اصول کی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس پر عمل بھی کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خواجہ صاحب نے سو فی صد اس پر عمل نہ کیا ہو، اور بالکل مختصر پیمانے پر سہی، لیکن عملی طور پر یہ بات تو ثابت کر دی کہ زبان کے بے ڈھنگے پن کو دور کرنے کا واحد حل صرف آوازی یا صوتی اصول ہے۔

خواجہ صاحب کے صوتی اصول کے قابل ہونے کا مزید ثبوت ہم بھی پیش کیے دیتے ہیں۔ ابتداء ۱۹۱۵ء کی بات ہے، جب خواجہ صاحب نے "اخبار وطن" جاری کیا تھا، اس اخبار کی عمر صرف ۱½ مہینے رہی۔ ہمارے ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہونے کے سبب بند کر دینا پڑا۔ ایک روز ہم ناظم اطلاعات رائے جانکی پرشاد صاحب سے ملنے ان کے دفتر آگئے۔ باتوں باتوں میں فرمایا کہ علی گڑھ کلب میں آج شام حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کی تقریر ہے، میں جا رہا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ ہم نے جناب والا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم ضرور چلیں گے، اس لیے کہ خواجہ صاحب کو دیکھنا ضرور ہے، لیکن سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہم رائے صاحب کے ساتھ گئے۔ اور خواجہ صاحب کو سننے کا بھی شرف حاصل کیا۔

تقریر کے ختم پر صرف چند ایک خاص خاص لوگ رہ گئے تھے۔ بعض حضرات سے خواجہ صاحب نے باتیں کیں اور پھر جانکی پرشاد صاحب سے مخاطب ہوئے۔ رائے صاحب نے ہمارا تعارف کرایا، ہم نے آداب بجالایا اور اس روز کے "وطن" کی ایک کاپی ان کی خدمت میں پیش کی۔ اخبار لے کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور تعریف کی۔ رائے صاحب نے اپنی عادتی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، آپ نے اس اخبار کی ایک خاص چیز ملاحظہ نہیں فرمائی، اس کی لکھائی صوتی اصول پر ہے۔ "خوب" کہتے ہوئے آپ نے اخبار پر پھر سے نظر ڈالی۔ ایسے میں جانکی پرشاد صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپ ایک ماہوار رسالا "ہندستانی ادب" بھی نکالتے ہیں، جس کی لکھائی بالکل صوتی اصول پر ہوتی ہے۔ رائے صاحب نے یہ جملا ابھی ختم کرنے نہ پایا تھا کہ نظر کرم ہم پر دوڑائی اور فرمایا، وہ رسالا تو ہمارے ہاں آتا ہے نا! ہم نے جواب میں عرض کیا، جی ہاں پابندی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا، میں اس اصول کو بے حد پسند کرتا ہوں، اور میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں۔ زبان کے آسان بنانے کے لیے یہ ایک بہتر اصول ہے، اس پر ضرور عمل ہونا چاہیے۔ اس کے بعد تقریباً ۱۵ منٹ تک آوازی اصول کی بھلائیوں کو گناتے رہے۔

"ہندستانی ادب" کے آوازی اصول پر اعتراض کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ پہلے حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے ان وچاروں پر غور کر لیں، اس کے بعد ہماری تحریک پر اعتراض کریں۔

(اس سلسلے کی دوسری قسط آنیوالے نمبر میں ملاحظہ فرمایئے)

نظیر اکبر آبادی کی مصوری

سلیم جعفری

جب شاعری مصوری ٹھہری اور شاعر مصور تو پھر مصور کو اس سے کیا بحث کہ وہ کس قسم کی تصویر بنا کر پیش کر رہا ہے۔ اس کے سامنے جس طرح کی چیز آئے گی وہ اسے یا اس کے تمام تاثرات کو وہ ایج فطری کی مدد سے ترنم و موزوں لفظوں کا جامہ پہنا کر منظر عام پر لے آئے گا۔ بظاہر قدرت کے اتنا ہی تنوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ مصوری لامحدود تنوع کی مالک ہو لیکن حقیقتاً یہ صرف دو نوعوں پر مشتمل ہے اور ان انواع کی فصلوں کا احاطہ خارج از امکان ہے۔ ایک قسم کی مصوری تاثرات کی مرہون منت ہے۔ اس میں شاعر ان چیزوں کو اپنے وجدانی فطری کی مدد سے منظر عام پر لاتا ہے جو اس کے افراد کائنات سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ ہیں، یہ داخلی مصوری یا شاعری ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ایک سانحہ ایک حادثہ ایک واقعہ آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے، مصور کا حافظہ اسے محفوظ کر لیتا ہے اور اس کی وہ کیفیت فطری کرشمہ سے بیان دکھاتی ہے، یہ خارجی مصوری یا شاعری ہے اس لیے نظم یا تو محض داخل ہو سکتی ہے یا محض خارجی، لیکن اگر شاعر ان سے تجاوز کر جائے اور وہ ایک کی حدود سے نکل کر دوسری کی حدود میں داخل ہو جائے تو پھر وہ دونوں کا مجموعہ ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دلفریب صورت دیکھ کر اگر شاعر محض اس کے خدوخال دکھانے پر قناعت کرے گا جو اس مجسمۂ حسن سے اس کے دل پر پڑا ہے تو اس کی تگ و دو داخلی شاعری کی حدود سے آگے نہ بڑھے گی اور اگر وہ خدوخال کا حسن بیان کر کے اس حسن نے جو اثر اس پر کیا ہے اسے بھی بیان کرے گا تو یہ نظم دونوں کا معجون مرکب ہوگی۔

ہندستانی میں عام طور سے "رزم و بزم" دو ہی طرح کی نظم مانی گئی ہے، لیکن سنسکرت نے اس کی بال کی کھال کھینچی ہے۔ اس نے تو طرح کے موضوع شاعری تسلیم کیے ہیں جو یہ ہیں۔

शृंगार (۱) نگار۔ مواصلت و مفارقت۔

हास्य (۲) ہاسیہ۔ ناز و کرشمہ و غمزہ دکھانے کو ہنسی مذاق۔

करुण (۳) کرتا۔ درد و کرب اس حد تک کہ جان پر بنجائے۔

वीर (۴) بیر۔ شجاعت و بسالت۔ رحم و کرم۔

रौद्र (۵) رودر۔ خفگی و رنجش مقدمات برہمی مزاج طرفین۔

भयानक (۶) بھیانک۔ خوف و ہراس۔

बीभत्स (۷) بی بھتس۔ تنفر و تمخض جو کسی مکروہ چیز کو دیکھ کر پیدا ہو۔

शान्त (۸) شانت۔ سکون و اطمینان۔ تصوف۔

अद्भुत (۹) ادبھت۔ حیرت و استعجاب۔

دامن ہندستانی ان گلہائے رنگین سے تہی نہیں ہے اور اصطلاحات رزم و بزم ان پر حاوی ہے۔ یہ سب موضوع داخلی اور خارجی انہیں دو اصناف کے تحت میں آتے ہیں، چنانچہ اس مثال کو لیجیے کہ اگر شاعر اپنے تاثرات و واردات قلب کو بیان کرے گا تو وہ داخلی شاعری ہوگی، کیونکہ وہ مواصلت و مفارقت کے صرف وہ مناظر دکھائے گا جو اس نے دیکھے ہیں اور جن کا مظہر و مورد اس کی ذات ہیں۔

نظیر کی شاعری بھی کلیات سے مستثنا نہیں، ان کی خارجی شاعری کی مثال وہ نظمیں ہیں جن میں انہوں نے محض واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔ مثلاً آگرا کی تیراکی، کبوتر بازی، ہولی، دوالی وغیرہ۔ ان میں تاثرات ذاتی کو

قطعی کوئی دخل نہیں۔ ان میں ان کا کمال یہ ہے کہ نہایت ہی وضاحت کے ساتھ وہ منظر بیان کرتے ہیں جو انہوں نے دیکھے ہیں "برسات" پر بار بار طبع آزمائی کی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں جیسے ذیل میں خارجی شاعری کی مثال ہے اس میں کہیں بھی سوا آخری بند کے تاثر و تخیل کا پتا نہیں۔ جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسے نظم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

برسات کا جہاں میں لشکر پھیل پڑا | بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھیل پڑا
جھڑیوں کا مینھ بھی آکے سراسر پھیل پڑا | چھاتا کسی کا شور مچا کر پھیل پڑا
کوٹھا جھکا اٹاری جھکی در پھیل پڑا

جن کے نئے نئے تھے مکان و محل سرا | الٹی چھتیں ٹپکتی ہیں چھلنی ہو جا بجا
دیواریں بیٹھتی ہیں چھلوں کا ہے عمل بچا | لاٹھی کو ٹیک کر جو شتوں سے کھڑا کیا
چھجا گرا منڈیر کا پتھر پھیل پڑا

جھڑیوں نے اسطرح کا دیا آکے جھڑ لگا | سیئے جدھر ادھر ہے دھڑاکے ہی کی صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا | کوئی کہے ہے ہائے کہوں تم سے اب کیا
تم در کو جھیلتے ہو مرا گھر پھیل پڑا

باراں جب آکے نخلہ مکانوں کے تئیں ہلائے | کچا مکان پھر اسکی بھلا کیونکر تاب لائے
ہر جھونپڑے میں شور ہے ہر گھر میں ہائے ہائے | کہتے ہیں یار دوڑیو جلدی سے واوا ے
پانی بہت سو گئے چھپر پھیل پڑا

اگر گرا ہے جو کسی نڈی کا اب مکان | اور اس کے آشنا کی بھی چھت گر گئی وہیں
کہتا ہے ٹھٹھے باز ہر اک سے کے وہاں | کیا بیٹھے چھت کو روتے ہو تم آکے یہاں یہاں
واں چھت لگن کا آپکے سب گھر پھیل پڑا

یاں تک ہر اک مکان کے پھیلنے کی ہے زمیں | نکلے جو گھر سے اسکو پھیلنے کا ہے یقیں
مفلس عجب پھنسے ہے یہ موقوف کچھ نہیں | کیا فیل کا سوار ہے کیا پالکی نشیں
آیا جو اس زمین کے اوپر پھیل پڑا

دیکھو جدھر تدھر کو یہی غل پکارے ہے | کوئی پھنسا ہے اور کوئی کیچڑ میں خوار ہے
پیادہ اٹھلو مرکے تو بچڑ اسوار ہے | گرنے کی دھوم دھام یہ کچھ بیشمار ہے
جو ہانتی رپٹا اوندا گرا ڈھیر پھیل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا | کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رتھ کے پہیے پاؤں کسی کا رپٹ گیا | اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا

وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھیل پڑا

کرتی ہے گرچہ سبکی پھسلی زمین خوار | عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار | گرنے کا مکر کر کے اچھل کود ایک بار
اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھیل پڑا

کیچڑ کے ہر مکان سے پوچھا بہت پھرا | پر جب دکھائی دیئے کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکے حسن کی میوہ رسے نازکا | پھسلن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا
آخر وہاں نظیر بھی آکر پھیل پڑا

اسی موضوع پر ان کی دوسری نظم داخلی شاعری کا نمونا ہے۔ اس میں کوئی واقعا بیان نہیں کیا گیا۔ چند چیزوں کو دیکھ کر دل پر جو اثر ہوا ہے، سے بذریعۂ تشبیہات، جس کی نیرنگیاں، تخیل کی رنگ آمیزیاں ہیں اوروں تک پہنچایا ہے۔

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا
دیکھ کچھ تازگی صنعت بے چون و چرا
جا بجا نکلے ہیں اس لطف سے طفلان نبات
اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے جنہیں نشو و نما
کھل رہے ہیں در و دیوار پہ ابواب بہشت
آرہی ہے چمن خلد کی ہر گھر میں ہوا
دیکھو سبزوں کی طراوت کو زمیں پر ٹھہتی ہے
دم بدم انبتہ اللہ نباتاً حسنا
برگ اشجار وہ سرسبز ہوا و رنم لطیف
فی المثل خلد جنت انہیں کہئے تو بجا
کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا
مخمل تازہ کسی نے الجھیاں دی ہے بچھا
الغرض دشت تو ہیں کا رگہ مخمل سبز
اور جو ہیں کوہ تو ان پر بھی زمرد ہے فدا
جان سے کرتی ہے اب بہت و خضرت وہ سلوک
جیسے غنچوں سے نسیم سحر اور گل سے صبا
ملتے اس لطف سے ہیں بھیگے ہوئے کھتا نہال
جیسے ہو نازنین دلبر کے نہانے کی ادا
اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے

سب مالیدہ مسّی میں در دنداں کی صفا
اب میں ساون کے اندھیرے کی کروں کیا تعریف
جعد شبریں کہوں یا زلف سیاہ لیلیٰ
جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار
ماتھے پہ ہاتھی کے تشگرف ہے گویا چھڑکا

چونکہ ان کی شاعری کا عنصر غالب خارجی ہے اس لیے جب دل پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اکثر اسے ایک مصرع یا شعر میں ظاہر کرکے اس کے اسباب مختلفا کو بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، گویا وہ ایک وکیل ہیں جو اپنے دعوے کو دلائل و شہادت سے ثابت کرتا ہے، وہ ایسے موقعوں پر بہ سرعت تمام داخلی سے نکل کر خارجی شاعری کی حدود میں پہنچ جاتے ہیں، اور بیشتر ان کی نظم ترجیع بند کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کلیات اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن یہاں "برسات" ہی کی مثالیں پیش کرنی مقصود ہیں، اس لیے ناظرین کی توجہ ترجیع بند ذیل کی طرف منعطف کی جاتی ہے۔ اس میں دس بندوں میں مناظر قدرت دکھا کر جن کا داخلی سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ہے، وہ خارجی شاعری کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، اور پھر ۳۵ بند کہہ کر کوس لمن الملک بجاتے ہیں۔ اتنی بڑی نظم کا یہاں نقل کرنا خالی از طوالت نہیں، اس لیے چند بندوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں
ہریالے کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر موسم چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پٹھے ہیں پانی پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار کھلکھلے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈابر دریا ڈبو رہے ہیں
مور و پپیہے کوئل کیا کیا رمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہے جھڑیاں ناچے اُمنڈ رہے ہیں
برسے ہے مینھ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن بن
سو ہیں گلابی جوڑے پھولوں کے ہار ابرن
کتنوں کو ہے گھر کھاتا، سونا لگے ہے آنگن
کونے میں پڑ رہی ہے سر منھ لپیٹ سوکن
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات سارى
جو غم میں ہیں ہو ہو ان کی گذرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ کہی ہیں جو پی پیا کی پیاری چھاتی پھٹے ہے انکی جو ہیں بہو کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گاتی ہے گیت کوئی جھولے پہ کر کے پھیرا
مارو جی آج کیجے یاں رین کا بسیرا
ہے خوش کسی کو آکر ہے درد و غم نے گھیرا
منھ زرد بال بکھرے اور آنکھوں میں اندھیرا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے شرابی پی کر موسم چھک رہے ہیں
مے کی گلابی آگے پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر گھنگھرو جھنک رہے ہیں
پڑتا ہے مینھ جھڑا جھڑ طبلے کھڑک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

داخلی شاعری کے خلاف جس کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے، خارجی شاعری کے موضوع ماضی، حال و استقبال، تینوں اجزا کے واقعات و حادثات ہو سکتے ہیں۔ ماضی سے ان موضوعات کا تعلق ہوگا جو شاعر کی پیدائش سے پہلے رونما ہوئے ہیں، جنہیں اس نے اپنے عین حیات میں نہیں دیکھا اور جو اس تک بذریعۂ تقریر یا تحریر

پہنچے ہیں۔ حال سے اس کے آنکھوں دیکھے واقعات و حادثات سے متعلق ہوں گے۔ واقعات مستقبل اس کے تخیل کا نتیجا ہوں گے۔ تینوں طرح کے موضوع پابند زمان و مکان اور دو قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک قسم میں وہ موضوع داخل ہیں جو محض وقتی ہیں یعنی وہ علت و معلول کا نتیجا ہونے کے باعث ماضی سے تعلق ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک اسباب و علل کا ایک خاص معلول ہونے کی وجہ سے ایک خاص وقت اور ایک خاص محل وقوع سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بار ظاہر ہو کر ہمیشہ کو غایب ہو جاتا ہے۔ اس کی حیات "دو روزہ" ہے۔ مثلاً ۱۹۵۷ء کا ہنگامہ دوسری قسم میں وہ موضوع داخل ہیں جو متواتر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً "عید، بقرعید، شب برات۔ ان کا دامن اپنے ماضی سے بندھا ہوا ہے، لیکن یک رنگی اور "نو رنگی" ان کی فطرت میں ہے۔ کیونکہ زمان و مکان کی تبدیلی گو ان کے تواتر و وقوع پر اثر انداز نہ ہو، مگر ان کی نوعیت پر ضرور ہوگی۔ تبدیلی زمان و مکان کے ساتھ ہی ساتھ ان تاثرات کے کرداروں کا بدلنا اور ان کی اداکاری کا ان کے ماحول و فطرت میں ڈوبا ہوا ہونا ناگزیر ہے۔ اس طرح باوجود یکے ان میں ایک طرح کا تسلسل ہے، لیکن ان کی ہر کڑی اپنی ماقبل اور مابعد کی کڑی سے بالکل نہیں تو تھوڑی بہت ضرور مختلف ہے اور یہی اختلاف اس کو زیور انفرادیت سے آراستا اور ایک خاص زمان و مکان سے وابستا کرتا ہے۔

خارجی شاعری کے موضوع جو کسی شاعر کے زمان حیات سے تعلق رکھتے ہیں، اس وقت کے تمدن کی آئینہ داری کرتے ہیں، چاہے ان کا تعلق متواتر رونما ہونے والے واقعات سے کیوں نہ ہو۔ نظیر کی خارجی شاعری اپنے عہد کے تمدن پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ انہوں نے ہولی، دیوالی، راکھی، بھیروں جی کا میلا، جو کچھ لکھا ہے اس میں صرف وہ کیفیتیں دکھائی ہیں جو خود ان کے زمانے میں موجود تھیں۔ ان تہواروں کے قدیم ہونے کے باعث ان میں سے چند باتیں ضرور ایسی تھیں جو ان کی پیدائش سے عرصا پہلے وجود میں آچکی تھیں، لیکن کچھ ایسی بھی ضرور تھیں جو بعد میں ان میں شامل کر دی گئیں، یا پہلے تھیں اور اب چھوڑ دی گئیں۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ جس طرح نظیر کے عہد میں ہولی منائی جاتی تھی، اسی طرح زمانۂ قدیم میں بھی منائی جاتی تھی تو یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اس تہوار کو عہد نظیر کے تمدن سے خارج اور اس کی آئینہ داری سے قاصر مانا جائے۔ اس کا اس کی زندگی میں منایا جانا اس کو ایک خاص زمان و مکان سے وابستا کر کے اس میں تعین وقت پیدا کرتا اور اسے عصری ماحول کا جزو ثابت کرتا ہے۔ اس میں اس دور کے رجحانات و میلانات موجود ہیں۔ ہولی منانے کا رجحان گو ایک نسل نے دوسری نسل سے ورثے میں پایا ہو، لیکن پھر بھی وہ اس کا ذاتی رجحان و میلان ہے اور جس طریقے سے وہ اسے مناتا ہے اس میں ایک خصوصیت ہے، جو اسے اس کے دور اور اس کی ذات سے وابستا کرتی ہے۔ نظیر کی خارجی شاعری کے ایک حصے کو ان کے زمانے کے تمدن اور ماحول سے گہرا تعلق ہے۔

نظیر کی داخلی شاعری مرزا فرحت اللہ بیگ کی مساعی جمیلا سے منظر عام پر آئی ہے۔ موصوف کو ایک قلمی نسخہ ہات لگ گیا جو دو دیوانوں پر مشتمل ہے، اس میں وہی پرانے عاشق و معشوق کے رونے پیٹنے ہیں، لیکن ڈھائی تین سو صفحے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمزور صدی بچے کی طرح دل لگا کر نہیں روتے، یعنی رونے لگے تو تار باندھ دیا، بلکہ ہٹے کٹے ہنسی مکھ بچے کی طرح چند منٹ رو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ ان کی بیشتر غزلوں کا سر مایا پانچ چار شعر ہیں، شاذ و نادر ہی کوئی غزل سات یا نو کیا اس سے زیادہ اشعروں کی حامل ہے۔ ان کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان پر ایک قسم کی فضائے "سطحیت" چھائی ہوئی ہے۔ ان میں جوش و خروش کی کمی ہے، یہ حیرت انگیز ہے کیونکہ

ان کے سوانح نگاروں کو اس کے کہنے میں دریغ نہیں کہ ان کے شباب کے دامن پر جوانی دیوانی کی ہوسناکیوں کے داغ ہیں، لیکن یہ غزلیں بھی اس قادر کلامی پر شاہد ہیں جو ان کی خارجی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اصل میں نظیر خارجی شاعری کے استاد ہیں اور ان کی داخلی شاعری کو ان کے کمال کا محض ایک ضمنی پہلو SIDE SHOW قصور کرنا چاہیئے۔ اس کی اسی فطرت اور اسی سعی نے کہ اس کے اشعار کی سطح فہم عام سے بلند نہ ہونے پائے اس کی غزل میں عمق پیدا ہونے نہ دیا۔ اور اکثر زبان اس سطح سے پست تر ہے، جو اس وقت سے آج تک پسند کی جاتی ہے۔ حقیقت میں خارجی شاعری سے عنصر تخیل معدوم ہونے اور اس کے موضوع کے لیے زبان روزمرا میں مصالح بہم پہنچانے کی قابلیت ہونے کے باعث نظیر اس قسم کی کاوشوں سے بچ دور ہی رہے جو محض غزل گو شعرا کا مسلک تھا اور جن کے موضوع ایرانی موضوعات غزل سے مشابہت و مماثلت کی وجہ سے انہیں خراسان فارسی سے استفادے کی جانب بے طرح مایل کر رہے تھے۔ اس مخمس کو دیکھیے جو اس سے پہلے خارجی شاعری کے نمونے کے طور پر نقل کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ کسی منظر کا بھی تقاضا نہیں کہ ادب فارسی سے استفادا کیا جائے۔

کئی نظیر غزلیں کہہ گئے ہیں اور ان کی اتنی بڑی تعداد مل گئی ہے کہ دو ڈھائی سو صفحے گھیرتی ہے، مگر ان کے کلام کی تنقید کرتے وقت زیادہ تر نظر اس پر رہنی چاہیے کہ وہ خارجی شاعری کے استاد ہیں اور اس میدان میں ان کی فکر رسا نے کیا گل افشانیاں کی ہیں کیونکہ ان کے کمال کو ان کے میلان طبع سے جدا کر کے صحیح صحیح اندازا نہیں کیا جا سکتا، ابدالعلا حکیم ناطق لکھنوی کی یہ رائے حقیقت سے قریب ترین ہے کہ "نظیر اپنے رنگ کے موجد اور مناظر عالم کے مصور تھے"

حقائق و معارف لسان الحقیقت افقر موہانی دام ظلہ

تجلیاں وہ ترے حسن کی معاذ اللہ
ٹھہر سکی نہ جہاں پر کلیم کی بھی نگاہ
ملا تھا ایسا بھی اک بت ہیں خدا ہے گواہ
فلک پہ چاند ستارے تھے جس کے چشم براہ
حرام ناز کی وہ دل کشی معاذ اللہ
قیامت آئی تو لیکن ہوئی خدا کی پناہ
نظر فریبی حسن تباں ادے تو یہ
کہ سر بسجدہ ہیں ہزاروں تو لاکھوں چشم براہ
نظر تھی پہلو پہ میرے نہ دیکھا زیر قدم
کہاں پہ ٹوٹنا تھا دل کہاں تھی آنکھ لگا
دیار یار کے ذرے ہیں عرش کے تارے
جو ان پر رہنے لگے بن کے وہ ہر شاہ
پھری ہیں پتلیاں نبضیں چھٹیں زبان خاموش
وہ آئے دیکھنے کس وقت میرا حال تباہ
بدلی ہیں تری چشم کرم سے تقدیریں
کہاں کی گردش قسمت کہاں کا بخت سیاہ
نہ سن سکے گا زمانہ مرا فسانۂ غم
کہ داستاں ہے طویل اور زندگی کوتاہ
میں سجدہ کر کے ترے در سے اٹھ نہیں سکتا
کہاں ملے گی زمانہ میں ایسی سجدہ گاہ
پکارتا ہے یہ محشر نہیں ہوں میں دنیا
جہاں ہیں دونوں برابر گدا ہو یا شاہ
تمام حسن تصدق، تمام عشق نثار
کہ مرکز دل عالم ہے تری جلوہ گاہ
ہزار حیف دم سجدہ دم نکل نہ گیا
کہ زندگی میں یہی ایک ہم سے تیری جلوہ گاہ

وہ ایک جلوہ کہ موسیٰ کو جس سے غش آیا
اسی کا نام ہے افقر کسی کی جلوہ گاہ

کے لخوز کی سیر

بیگم زکیہ احسین

"امی! بوچائے ہم پیتے ہیں، کیا وہ ایسی ہی ہری بھری جھاڑیوں میں اگتی ہے؟" نجانے کھیت کے دوسرے سرے سے حیرت بھرے انداز میں چلا کر کہا۔ میں اچھل پڑی اور یکایک مجھے احساس ہوا کہ یہ خواب نہ تھا، بلکہ ہم حقیقت میں جاوجا میں چائے کی کاشت کرنے والے خوبصورت علاقے کی سرسبز ڈھلوانوں پر کھڑے تھے۔ جب سے میں سوویت یونین آئی تھی کلخوز کا لفظ میرے لیے ایک معما تھا۔ میں اکثر تصور کرتی کہ فارم میں رہ رہی ہوں اور کسانوں کے کاموں اور ان کی زندگی کی بے لوث مسرتوں میں شریک ہوں۔ مجھے اس کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ دلکش خواب ایک روز حقیقت بن جائے گا۔

ماسکو میں قیام کے پہلے ہی سال، جیسے ہی میں ٹوٹی پھوٹی روسی میں اپنا مطلب ادا کرنے لگی، میں نے اپنے کچھ دوستوں سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی عنایت سے تقدیر نے یاوری کی اور میری اس درخواست پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ ایک روز مطلوبا جواب پا کر میں مسرت سے پھولی نہیں سمائی۔

کچھ عرصا بعد ہمارا تفصیلی پروگرام مرتب کیا گیا۔ میری لڑکی اور لڑکا بھی میرے ساتھ جا رہے تھے۔ جو کلخوز ہمارے سیر کے لیے تجویز کیا گیا تھا وہ جارجیا کی ریپبلک میں واقع ہے۔ شروع میں طویل مسافت کا خیال کر کے ہم ذرا پریشان ہوئے۔ وہاں پہنچنے کے تین رستے تھے۔ سب سے چھوٹا یہ تھا کہ ہوائی جہاز سے تبلیسی پہنچیں اور پھر وہاں سے باتومی جائیں۔ سب سے طویل، لیکن زیادہ دلچسپ رستا یہ ہوتا کہ ہم ہوائی جہاز سے سوچی جاتے اور وہاں سے باتومی تک سمندری جہاز پر سفر کرتے۔ چونکہ ہم نے یہاں کبھی تنہا سفر نہیں کیا تھا، اس لیے سب سے سیدھا رستا اختیار کرنے کا فیصلا کیا، یعنی ہوائی جہاز سے باتومی تک براہ راست پرواز کرنا۔ بعد کو ہمیں اپنے اس انتخاب پر پچھتانا پڑا، کیونکہ ہوائی جہاز میں ہم میں سے کسی کو نیند نہ آئی۔ اور جب صبح دس بجے ہم لوگ باتومی پہنچے تو سب بہت تھکے ہوئے اور نیند کے مارے تھے، لیکن ہمارے ذوق و شوق کو کوئی پریشانی ماند نہیں کر سکتی تھی۔

باتومی ہوائی اڈے پر ہمارا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ اس پر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ اور ہم بہت ہی متاثر ہوئے۔ کئی اہم شخصیتوں نے جن میں دو خوبصورت خواتین تھیں ہمیں، گلدستے پیش کیے۔ اس شہر کے حسن نے ہمارے دل موہ لیے۔ یہ بحیرۂ اسود کے ساحل پر واقع ہے، اور یہاں کی آب و ہوا اتنی ہی فرحت بخش ہے جتنی بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کی۔ اپنی منزل مقصود کی طرف روانا ہونے سے پہلے ہم نے ذرا دیر تک ایک شاندار ہوٹل میں آرام کیا جہاں سے سمندر کا نظارا بڑا دلکش تھا۔ سہ پہر کو ہم ایک بل کھاتی ہوئی سڑک سے کابلیتی پہنچے۔ پہاڑوں اور سمندر کے خوبصورت مناظر نے ہمیں اٹلی کے جھیلوں والے علاقے کی یاد دلادی۔ کابلیتی کا ساحل بڑا حسین ہے، اور اس کے کنارے کئی سینی ٹوریم اور آرام گھر بنے ہوئے ہیں، جن میں چھٹیاں منانے والے اور سوویت یونین اور بعض دوسرے

ممالک کے طالب علموں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ کابلیق سے خوبانی گاؤں پہنچنے کے لیے جہاں ہمارا مخصوص کلخوز واقع تھا ہمیں تقریباً ۵ کلومیٹر کا سفر کرنا تھا۔ آخر کار ہم ایک ہری بھری سایا دار سڑک پر ہوتے ہوئے اس مکان پر پہنچے جس میں ہمارا قیام ہونے والا تھا۔ چھوٹے سے قد اور شفیق چہرے والی ایک عمر رسیدہ خاتون نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کے کالے لباس پر نیلا ایپرن بندھا ہوا تھا اور سر پر ایک سیاہ فصابا باندھے تھیں۔ غالباً وہ سوگ میں تھیں۔ بعد کو ہمیں پتا چلا کہ ان کا سب سے بڑا بیٹا گذشتہ جنگ میں لاپتا ہو گیا، اور حال ہی میں یہ سانحہ پیش آیا کہ ان کی ساس کا انتقال ہو گیا۔ ان کے نیز ہی تیس پینتیس سال کی عمر کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یہ ان کا چھوٹا اور اب اکلوتا بیٹا تھا، جو درمیانے قد کا کسی قدر تگڑا آدمی تھا اور اس کی مونچھیں خاص جارجیائی انداز کی تھیں۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور ملنسار معلوم ہوتا تھا۔ شروع میں یہ معلوم کر کے ہم ذرا گھبرائے کہ ہماری میزبان نہ تو روسی سمجھتی ہیں اور نہ اس زبان میں بات چیت کر سکتی ہیں، لیکن ان کے بیٹے نے ترجمان کے فرائض انجام دے کر یہ مشکل آسان کر دی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میزبان ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گئیں۔ طرح طرح کے کھانوں، مشروبات اور پھلوں سے بھری بڑی میز ہماری منتظر تھی۔ ہمیں پڑوس کی چند خواتین اور کلخوز کے چیرمن کی ملنسار سکریٹری سے متعارف کرایا گیا۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ جب مہمان رخصت ہوئے تو ہم نے اطمینان سے رہنے سہنے اور نئے ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

چائے کی پتیاں چننے والوں کے لیے دن کا کام صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتا تھا۔ ہماری میزبان کی بھونازی کو صبح چند پڑوسیوں کے ساتھ ایک ٹرک پر چائے کے باغ جایا کرتی تھیں، جہاں وہ کام کرتی تھیں۔ ہم کسی قدر کاہل تھے اور اتنے سویرے ان کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ بہر حال بعد کو ہم ٹہلتے ہوئے چائے کے باغ پہنچے تھے۔ دوپہر کو عام طور پر وقفہ ہوتا۔ اس وقت ہم سب جمع ہو کر کھاتے پیتے اور ذرا دیر آرام کرتے۔

ہم معمولی کپڑے پہن کر کام کرتے، لیکن ہمارے ساتھ تقریباً دس کسان عورتیں بھی تھیں۔ وہ خوب بڑی بڑی سی چٹائی کی خوبصورت ٹوپیاں پہنتیں، جو دھوپ سے محفوظ رکھتی ہیں، اور چائے کی پتیاں جمع کرنے کے لیے کمر پر کینوس کے نرم تھیلے باندھے رہتیں۔ جب وہ دونوں ہاتھوں سے ایک ساتھ کام کرتیں تو ان کی تیز حرکت کرتی ہوئی انگلیوں کو دیکھنے میں بڑا لطف آتا۔ یقیناً ان ماہرین کا تعاقب کرنے کے لیے ہمیں کچھ تربیت حاصل کرنے کی ضرورت تھی خاص جہاں ہونے کی وجہ سے کلخوز کی چیرمن خود ہمیں پہلا سبق دینے آئے۔ شروع میں ہمارا کام تکلیف دہ حد تک سست تھا۔ کلخوز کی ہر کسان عورت روزانہ چالیس پچاس کلوگرام چائے چنتی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہم تینوں، یعنی میرے دو جوان سال بچے اور میں تقریباً ۱۰ کلو چائے جمع کر پاتے تھے۔ ممکن تھا کہ مشق کرنے سے ہمارے کام کی رفتار بڑھ جاتی، لیکن بدقسمتی سے بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم چائے چننے کا کام چند روز سے زیادہ جاری نہ رکھ سکے۔

ہمارے کلخوز کا نام استالن کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کی خاص پیداوار چائے، لیکن زیادہ تر ان کسانوں نے سنترے کے باغ بھی لگائے رکھے ہیں۔ ۷۵۰ مربع میٹر سے لے کر ایک ہیکٹر تک کے قطعے کاشتکاروں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ عام طور سے بیشتر رقبے پر پھلوں مثلاً سنترے، آڑو، ناشپاتی اور سیب کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ بقیا زمین پر سبزیوں اور چائے کی کاشت ہوتی ہے سنترے کاشتکاروں کے لیے بہت منافع بخش ہیں کیونکہ حکومت ان سے نو روبل فی کلوگرام کے نرخ سے سنترے

خریدتی ہے۔ باغ کی آمدنی کے علاوہ ہر عورت چاہے چن کر ۲۰۰۰ — ۱۵۰۰ روبل ماہوار تک کما لیتی ہے۔ کلخوز میں ایک مرد کے کام کی اجرت ۳۰ روبل ہے اور معمولی تن و توش کی عورت ایک دن میں ڈیڑھ دن کا کام ختم کر لیتی ہے۔ بعض اتنی تیز ہے کہ روزانا دو تین دن کا کام ختم کر لیتی ہیں۔ اس صورت میں انہیں ۵۰ فی صدی مزید رقم ملتی ہے۔

ہر کاشتکار دو تین گائیں اور جتنی مرغیاں بطخیں وغیرہ چاہے پال سکتا ہے۔ وہ کلخوز کے خاص ترکاری کے باغ سے اپنے لیے تمام سبزیاں رعایتی داموں پر خرید سکتا ہے، اور اناج بھی اسے اسی طرح ملتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ متوسط درجے کے کاشتکار کی سالانا آمدنی تقریباً ۳۰ — ۲۵ ہزار روبل ہے۔

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اتنے سکھ چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے گھروں کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوئی۔ مثال کے طور پر ہماری میزبان کے مکان ہی کو لے لیجیے۔ وہ زیادا تر لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس قسم کا بنگلانما مکان تھا جیسے پہاڑوں پر ہوتے ہیں۔ اس میں پانچ چھ کشادا کمرے، شیشے کا برآمدا اور بڑا سا باورچی خانا تھا۔ فرنیچر بھی صاف سترا، نفیس اور تمام مکینوں کی ضرورت کے مطابق تھا۔ عمدا پالش کیا ہوا فرش اور آرام دہ پلنگ مجھے خاص طور پر پسند آئے۔ جن پر نہایت سفید براق چادریں بچھی ہوئی تھیں، بیٹھنے کے لیے صوفے اور آرام دہ کرسیاں تھیں اور کھانے کے کمرے میں میز، کرسیاں، شیشے اور چینی کے برتنوں اور چھری کانٹوں کی الماری موجود تھی۔ ان کے علاوا کونے میں ایک ریفریجریٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں تیل اور گیاس کے چولہے تھے اور تمام برتن دھلے، منجھے قاعدے سے رکھے ہوئے تھے۔ گھر میں دو ریڈیو اور دو سلائی کی مشین تھیں۔ اور مجھے بتایا گیا کہ ان کے پاس ایک "پوبیدا" موٹر بھی تھی، جو انہوں نے حال میں بیچ دی تھی تاکہ اس سے بہتر کار خرید سکیں۔

مجھے گمان ہوا کہ شاید میری میزبان کا مکان غیر معمولی طور پر اچھا تھا اور چونکہ وہ سوشلسٹ جماعت کی ہیرو تھیں اور انہیں دو لینن آرڈر بھی مل چکے تھے، اس لیے ان کے لیے بہتر سے بہتر چیز مہیا تھی، لیکن میرا یہ خیال درست نہ تھا کلخوز کے چیرمین ہمیں دس بارا گھروں میں لے گئے اور ان سب میں کم و بیش اتنا ہی اونچا معیار زندگی نظر آیا۔ حقیقت میں ان میں سے اکثر اس مکان کے مقابلے میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، زیادا بڑے اور زیادا سجے سجائے تھے۔ بعض میں قالین، تصویریں اور مختلف قسم کا آرائشی سامان موجود تھا۔ ہماری ملاقات ایک ایسے کاشتکار سے ہوئی جس کے پاس "زیم" موٹر تھی۔

کلخوز کا اپنا ہسپتال، ثانوی اسکول، سات درجے اور چھٹے درجے تک کے اسکول ہیں۔ اس میں ایک ریڈیو اسٹیشن، سینما اور کلب ہیں، جس میں شوقیا آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرا کرتے ہیں۔ نوجوان لوگ، جنہیں ناچ گانے سے دلچسپی ہے ہفتہ وار استاد سے جو اس کلب کا ملازم ہے، ان فنون کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اب بھی کچھ بوڑھے لوگ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں، لیکن نوجوان سب کے سب پڑھے لکھے اور ہوشیار ہیں۔ کلخوز کی اپنی دو دکانیں ہیں، جن میں کھانے پینے کا سامان اور روزمرا کی دوسری چیزیں ملتی ہیں۔ اسی کلخوز کے علاقے میں چائے کا ایک بڑا سا کارخانا بھی ہے۔

کلخوز کی آبادی ۲۵۰۰ ہے۔ اس بات سے ہمیں بہت دلچسپی ہوئی کہ وہ لوگ سب کے سب مسلمان تھے۔ اصل میں ہمیں معلوم ہوا کہ ادجاریا کی خود مختار ریپبلک میں تقریباً سب مسلمان ہیں۔ طور طریقوں، کھانے پینے اور رسم و رواج کی مطابقت کا احساس بڑا خوش کن تھا۔ ہم دونوں کی زبانوں میں بہت سے الفاظ مشترک تھے۔ ہماری میزبان کا نام عصمت خانم تھا اور ان کے شوہر کا حسین خاجا، ان کی ایک لڑکی کا نام فاطما تھا۔

اور بھتیجی ذکیہ خانم میری ہم نام تھی۔

جاپانی ملک کی طرح یہاں بھی بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ جب باپ گھر میں آتے تو بچے کھڑے ہو کر انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ دیتے۔ ماں کو گھر میں بڑی عزت اور اہمیت حاصل ہے۔ بیٹا پرانے زمانے کی طرح ماں کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتا ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ عصمت خانم کا بیٹا ترسن میرے لڑکے اکبر سے کہہ رہا تھا "جب ماں تم سے یہ کہتی ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔" ایک بار ہمارے کسی پڑوسی نے ہمیں دعوت دی۔ رواج کے مطابق میں نے توجولن خاتون خانا کا جام صحت پینے کے لیے گلاس اٹھا لیا۔ ہمارے میزبان نے فوراً یہ تصحیح کی "پہلے ہم اپنی ماں کا جام صحت پئیں گے، اصل میں وہی خاتون خانا ہیں۔ میری بیوی کا رتبہ ان کے بعد ہے۔"

جاپانی کے لوگ کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ وہ عمدہ غذا کھاتے ہیں اور اپنی مقامی شرابوں کے دلدادہ ہیں۔ وہ کئی قسم کی بہترین شرابیں بناتے ہیں اور انگور و رس کا تازہ رس تیار کرتے ہیں جو دل کے لیے بہت قوت بخش سمجھا جاتا ہے۔ ان کا دعوا ہے کہ جس نے یہ رس زندگی میں ایک بار بھی پیا ہے اسے کبھی دل کی بیماری نہیں ہو سکتی، ممکن ہے یہ بات اس حد تک صحیح نہ ہو، پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ان علاقوں کے لوگ بہت تندرست اور قوی ہوتے ہیں اور ان کی عمریں بھی طویل ہوتی ہیں۔ ہم نے ۱۱۰ اور ۱۵ سال کے مرد اور عورتیں دیکھیں اور سنا کہ ۱۱۵ سال کی عمر کا بھی ایک آدمی موجود ہے۔ یہ لوگ زندگی کے دن ہی نہیں پورے کر رہے تھے، بلکہ عام سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ خوب کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرتے تھے۔

قدرت نے جاپانی لوگوں کے ساتھ خاص طور پر فیاضی برتی ہے۔ انہیں با اخلاق نعمتیں، دلکش مناظر، عمدہ پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی زرخیز زمین، جانفزا اور خوشگوار موسم عطا کیا ہے۔ اس حسن کا پرتو یہاں کے مردوں اور عورتوں کی شکل و صورت ہی میں نہیں، بلکہ ان کی سیرت میں بھی نظر آتا ہے۔ ایسے گرم جوش اور پرخلوص، ایسے فرش خلق اور مہمان نواز لوگ مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ ہم جہاں بھی گئے، لوگوں نے بڑی ہی آؤ بھگت اور بے انتہا خاطر مدارات کی۔ ہم نے جاپانی مہمان نوازی کے چرچے سنے تھے، لیکن تجربا، ہمارے اندازوں اور توقعات سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کلوز کے چیرمین نے ہمیں دعوت دی۔ جس میں کم سے کم بیس قسم کے کھانے تھے، اور دعوت کا سلسلہ تین بجے سہ پہر سے لے کر نو بجے شام تک جاری رہا۔ یہ ہمارے نئے دوستوں کی شاندار مہمان نوازی کی متعدد مثالوں میں سے ایک ہے۔ اگر ہم پڑوس کے کسانوں کے باغوں میں ٹہلتے بھی چلے جاتے تو وہیں پھل، میوے اور گلدستے پیش کیے جاتے۔ ان کے دلکش طور طریقوں نے ہمارے دلوں کو اس طرح موہ لیا کہ ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنے ہی لوگوں میں ہیں۔

ہم وہاں دو ہفتے ٹھہرنے والے تھے، لیکن تو ہمارے میزبانوں ہی کا ہم سے اتنی جلدی جدا ہونے کو دل چاہتا تھا اور نہ ہمارا اپنا۔ ہم سے اصرار کیا گیا کہ ہم کم سے کم ایک مہینا ٹھہریں۔ پہلے ہی دن سے ان لوگوں نے ہم سے عزیزوں جیسا سلوک کیا۔ مجھے ناز یکو کے ساتھ چائے پینے میں بڑا لطف آیا اور انہیں اپنے گھر کھانے تیار کرتے ہوئے دیکھنے میں بھی میں نے بہت دلچسپی لی۔

بدقسمتی سے ہمیں اپنے دوستوں کا ساتھ جلد چھوڑنے پر خلاف توقع مجبور ہونا پڑا۔ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے میں وہاں سے اچانک روانا ہو گئی۔ ہم مجبوراً اپنے دوستوں سے رخصت ہوئے، لیکن بڑی محبوب یادیں ساتھ لائے جو یقیناً ہمیشہ سرمایۂ مسرت رہیں گی۔

"ہندستانی ادب"
کی بیسویں "سالگرہ" کے موقع پر ادارہ اپنے
معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہے ——

آلھا

(ہندستان کا عوامی رزمیہ)

حسن عباس فطرت

برسات کے موسم کا وہ وقت جب ساون کا مہینا اپنی بھرپور جوانی پر ہوتا ہے، گھنے گھنے بادلوں کے قافلے ہر وقت آسمان پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ دن رات کی موسلا دھار بارش، بادلوں کا گھن گرج ماحول کو ڈراونا بنائے رہتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رسیلی ہوا امنگ اور ترنگ کے خزانوں کا منہ کھول دیتی ہے۔ انہیں دنوں میں اکثر ہوا کی تیز سائیں سائیں کے ساتھ وحشی خروش سے بھری ہوئی کچے لہردار آوازیں فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں، لیکن کبھی آپ نے آگے بڑھ کر دیکھا بھی کہ یہ ہے کیا۔ اگر نہیں دیکھا تو آیئے میں آپ کو بتاؤں یہ ہندستان کے مشہور عوامی رزمیہ آلھا کھنڈ کی گنجار اور للکار ہے، جسے شمالی ہندستان کے ہر چھوٹے بڑے دیہات و شہر میں آپ بچے بچے کی زبان سے سن سکتے ہیں، اور اگر کہیں آپ ان کی محفلوں میں بیٹھیں جہاں چند تگڑے بدن اور رسیلی دھوتی باندھے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کے مجمع میں آلھا گایا جا رہا ہو تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی مستی اور چہکار کو دیکھ کر آپ بھی چند منٹ کے لیے اپنے خون کے دوران میں تیزی محسوس کرنے لگیں گے۔

آلھا کھنڈ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندستان کے دو مشہور جیالے سورما آلھا اور دل کے کارناموں کی طویل و دلچسپ داستان ہے۔ اگرچہ اس کی تصنیف کو لگ بھگ آٹھ سو برس سے زاید بیت چکے ہیں، پھر بھی ہزاروں اشعار کا یہ طویل منظوما آج بھی اتنا ہی زندہ اور مقبول ہے جتنا شروع عہد میں رہا ہوگا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ بندیلی زبان میں لکھا گیا تھا، لیکن عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت نے اس میں بہت کچھ مقامی حالات و رسم و رواج کے مطابق تبدیلیاں بھی کر ڈالی ہیں اور اب اس کی موجودا زبان اتنی سہل و سادا ہے جسے بس ہندستانی کہا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آلھا کھنڈ کے نسخے فارسی خط میں بھی اتنے ہی ہیں جتنے ناگری میں، اور ساتھ ہی یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اس کا ترجما انگریزی میں بھی ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی اصل آلھا وہی مستند مانا جاتا ہے جو پشت ہا پشت سے سینہ بسینہ چلا آیا ہے اور جس کی کتاب ہماری جنتا کا مضبوط حافظہ ہے۔

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ ہر علاقے اور ہر صوبے کے آلھا میں باوجود بنیادی واقعات کے یکسانیت کے طرز ادا اور تشبیہات وغیرہ میں کافی فرق ہے اور وہاں پر وہی آلھا مستند مانا جاتا ہے۔ یہی ایک وحدت مکان کی خاصی اگر نہ ہوتی تو بلاشبہ آلھا دنیا کی مشہور اپیک (EPIC) نظموں کے مقابل رکھا جا سکتا تھا۔ خیر یہ بات تو بیچ میں آ گئی، مجھے کہنا یہ تھا کہ وہ آلھا جو نہ جانے کتنی بار کہاں کہاں اور کتنی بار کتابی صورت میں چھپ چکا ہے، اس سے زیادا تعداد ان کتابوں کی ہے جسے میں نے عوام کا حافظا کہا ہے۔ اس طرح اگر قبولیت عام اور روایت کسی تخلیق کی خوبی پر دلیل و مدین ہو سکتی ہے تو میں یہ صدیوں بعد بھی آلھا کی جیتی جاگتی اور ہمہ گیر مقبولیت کو دیکھ کر بہ آسانی کہہ سکتا ہوں کہ آلھا کھنڈ ہندستانی عوام کا شاہنامہ ہے۔

یہ نظم جس کا ظاہری ہیکل بالکل تنوی کا سا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہزار ہا لہردار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے پڑھنے اور گانے کی بھی ایک مخصوص البیلی اور انوکھی لے ہے جس میں عجیب ناقابل بیان گرفتگی اور گہرائی ہے۔ آپ اس کے گانے کی لے، ادا کو دیکھیں، ان کا جوش و طنطنہ اور بانکی طرز ادا دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ گانے والا آلھا کے کارنامے نہیں بیان کر رہا ہے، بلکہ بجائے خود آپ ہی آلھا بنا ہوا یا گل ہو کر میدان جنگ میں دشمن کی کاٹ میں مصروف ہے۔ آخر یہ ولولا، یہ مستی، یہ ابال کہاں سے آ جاتا ہے۔ یہ آلھا کھنڈ کا زیر و بم، اصوات کی ہم آہنگی، لفظ و معنی کا حسین ربط، اور پر تاثیر موسیقیت کا چلتا پھرتا جادو ہے جو دھیرے دھیرے سر پر چڑھ کر ہی

چلا جاتا ہے، اور دم کے دم میں پڑنے اور سننے والوں کو مدہوش و سرشار کر دیتا ہے۔ آلھا کھنڈ میں یہی ایک صوتی خصوصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور یہی چیز اصل میں اس مشہور نظم کا محور ہے، جس کی گردش اتنی تیز ہے کہ دوسری خصوصیات شوری اس کے ارد گرد ناچتے نظر آتے ہیں۔ اس کے الفاظ اور ان کی آواز، واقعات کی تصویر کشی اور جذبات و خیالات کے بے باکانہ اظہار میں ایسا مدھر لہلان اور گھلاوٹ ہے، جس کا رس کانوں سے اترتے ہی اپنا جادو بھرا عمل شروع کر دیتا ہے، مگر بدمستی کی حد تک نہیں، بلکہ رگوں میں خون کی روانی تیز کرنے اور ولولا کو شکن بھر دینے تک۔ اس کا اثر کو دیکھا ثبوت آپ کو روہیل کھنڈ و گوالیار کے علاقے میں مل سکتا ہے، جہاں آلھا گانے گانے والے گوجر اور بھاٹ تلواریں چمکا کر اور بھونبیں تان کر غرا اٹھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تیز ہو جاتی ہیں، نتھنے پھول جاتے ہیں، اور منھ سے جھاگ بہہ نکلتا ہے۔ یہ ہے آلھا کی دین اور چمتکار، وہی آلھا جس کی گرج دار تان فضاؤں کو چیرتی ہوئی آکاش اور پاتال سے ٹکراتی ہے، ہمارے شاندار ماضی کی یاد دلاتی اور مستقبل کے لیے ہمیں کام دیتی ہے، اور ہمارے جذبۂ حقیقت کو جگاتی اور جھنجھوڑتی ہے۔ ہمارے لیے حرارت دل اور حرارت اقدام کی معلم بنتی ہے۔ شاید یہی اسباب ہیں کہ اتنا طویل زمانہ ہمارے عوام کی زبان پر ہر وقت رقصاں اور متحرک رہتا ہے۔ بظاہر یہ ایک اعجاز بھی ہے، اور عظیم مصنف جگنیک کے زبردست ماہر صوتیات و موسیقیت ہونے کا نشان اور زندہ ثبوت بھی کہ اس نے ان اشعار کو ڈھالتے وقت اس کا خاص دھیان اور التزام رکھا کہ اس کی حقیقی حلاوت و صحی تاثر بیان اور اپر موقوف رہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا یہ خزانا ہمیشہ متحرک رہے گا اور سامنے آتے رہے گا، اور پھر اس فنوں کاری کی تو داد دینا ہی محال ہے کہ اس قدر برتی قوت کے ساتھ اتنا طویل منظوما حافظے اور دماغ میں کیسے اپنی مستقل اور ان مٹ جگہ بنا لیتا ہے، اور عوام لوگ اسے نسل بعد نسل ایک دوسرے کو گاتے ہوئے سن کر بھی یاد کر لیتے ہیں۔ اس فلسفے کے تحت میں نہیں سمجھ پاتا کہ اس نظم کی تحریر، حوالا اور اقتباس ناظرین کے لیے پیش کرنا میرے لیے جایز بھی ہے یا نہیں، جبکہ مزید دشواری یہ بھی ہے کہ اتنی لمبی نظم میں سے جس کا ہر ایک حصا، ایک دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے کتنا اور کونسا جز پیش کیا جائے، مگر صرف اس خوف سے کہ آپ مجھے خلا میں باتیں کرنے کا الزام نہ لگا دیں چند اشعار پیش کرتا ہوں جس سے آلھا کی خصوصی صوتی صفت کا کچھ اندازا ہو سکے گا۔ میدان حرب و ضرب کا ایک سماں ملاحظہ کیجے جس میں الفاظ کے تناسب ٹکراو اور ترتیب کی ہنرکاری کے ذریعے یوں نقشا کھینچا گیا ہے۔

کٹ کٹ سر دھرتی پر گرگئے سب کا پھوٹ گیا ابھمان
کھٹ کھٹ کھوٹ تیگا بولے رن مان چمک چمک تروار
سن سن سن گولی برسے ٹھن ٹھن بھالن کی جھنکار
کٹ بھج ونڈ گئی چھتران کی جو جھجے بڑے بڑے سمراٹ
چلے سکیلا پانی پت کے جہہ پر دو دلگل کی باڑھ
چلے جنوبی اور گجراتی رونا چلے ولایت کیار

آلھا کھنڈ کا موضوع حب وطن، کلچر، ایک رنگی، ایثار و قربانی، ایکتا و بھائی چارا، اخلاق و محبت اور خدا پرستی ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ۔

"رام بنائیں تو بن جھلیس بگڑی بنت بنت بن جائے"

ٹیپ کے بند کی طرح آتا ہے، اور ہندستان قدیم کے گہرے مابعد طبیعاتی فلسفے کو دہراتا ہے۔ اور ماخوق البشر طاقت کی یاد دہانی اور اس پر اعتماد کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بے شمار امثال و حکیم، محاورات و ضرب مثل کے استعمال کے ساتھ اجتماعی و انفرادی زندگی کے لیے لائحۂ عمل پیش کیا گیا ہے، اور زندگی کی مشکلات کا حل بتایا گیا ہے۔ ہمت و جرات اور خدا کا رانا زندگی کی تلقین و تبلیغ کے لیے حکیمانا طریق کار استعمال کیا گیا ہے۔ اس رزمیہ کی ایک اور لایق توجہ خصوصیت تفصیل جزیات

بھی ہے۔ ایک جگہ دو شعروں میں عوامی مثالوں کے ساتھ یہ بتا کر کہ دنیا کی ہر شئے کی طرح انسان بھی فانی ہے۔ بہادرانہ موت اس کی جنت ہے اور بزدل کی موت ذلت و عذاب، اس طرح جذبۂ مردانگی کو بیدار کیا جاتا ہے۔

سدا نہ ماتا جنے پیٹ سے یار و سدا نہ ساون ہوئے
سدا نہ ماتا جنے پیٹ سے یار و سدا نہ جیون ہوئے

کھٹیا پر جو تم مرجیہو تمرا ماس کا گ نہیں کھائے
جو مرجیہو سمر بھوم ماں تم کا اندر یہ ہی لے جائے

میاں نے کہیں پر آلھا کھنڈ کو ہندستانی عوام کا "شاہنامہ" کہا ہے۔ وہ محض جوش عقیدت مندی یا استعارہ نہیں بلکہ بہت کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ اگر دوسری زبانوں میں آلھا کی ہمہ جہت مثال ڈھونڈیں گے تو کوئی ایک چیز مستقل طور سے آلھا کے ہم پلہ یا ہم مثال نہیں ملے گی، ویسے تو یورپ کے اکثر بیشتر رزمیہ منظومات میں آپ آلھا کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں، مگر فردوسی کا "شاہنامہ" اور خصوصاً ہرام شگفل کی داستان بہت کچھ آلھا کھنڈ سے میل کھاتی ہے اور ہر اعتبار سے شگفل نامے کو منظر کشی، مکالمات کا زور، بے باکانہ انداز، رزم و بزم کی مصوری میں لفظ و معنی کی گھلاوٹ اور موسیقیت و موسیقیت کا خاص التزام جو آلھا کھنڈ کی خصوصیت نمایاں صفت ہے، کافی حد تک ایکساں و ہمرنگ نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ شگفل نامے کی خالص پہلوی زبان اتنی سخت و مشکل ہے کہ باوجود سمجھ لینے اور حل کر لینے کے اس کی صحیح لذت و کیفیت ہمیں نہیں پائی ورنا اس سلسلے میں لسانیات اور افادے و استفادے کے نقطۂ نظر سے مطلب خیز بحث کی جا سکتی ہے۔

آلھا کھنڈ کی ایک اور خصوصیت افغانستان کے مشہور شاعر کو لرح کی نظموں کا بھی عنصر مشترک ہے اور وہ پڑھنے اور سننے والوں کی مانی ہوئی بے اعتقادی کا یہ اضاد و بہت تھوڑی دیر کے لیے معرض التوا میں پڑ جانا جس طرح کو لرح کی اکثر نظمیں مافوق عادت واقعات اور مافوق بشر ہستیوں کے ذکر سے بھری ہیں، مگر اس نے انہیں کچھ ایسے نفسیاتی جذباتی اور احساساتی تاثرات کی رنگ آمیزی کر کے زینا بزینا پیش کیا ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پڑھنے والوں کے سامنے وہ حقیقت کی صورت میں آجاتا ہے اور وہ اس کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی طرح یہی بات آلھا کھنڈ میں بھی پائی جاتی ہے، کیونکہ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ آلھا تو مبالغے کی پوٹ ہے، مگر انہیں کو اس محفل میں ایسا کھویا ہوا مسحور پایا ہے جیسے ان کے تمام یقینی غلط واقعات و قصص کو زبردستی کسی جادوگر نے اپنی لکڑی پھیر کر سچ منوا لیا اور وہ یقین پر مجبور ہو کر رہ گئے ہوں۔

ہندستانی میں انیس کی شاعری ان کے محض مخصوص جوہنگام کارزار کی عکاسی سے متعلق ہیں بجا طور پر آلھا کا جواب ہو سکتے ہیں۔ البتہ فرق صرف مزاج اور ماحول کا پڑتا ہے، مگر لاتق لحاظ و توجہ بات تو یہ ہے ہندستانی شاعری بھی سولہویں صدی تک اس کا نمونا پیش کر پائی، البتہ سترہویں اور اٹھارویں صدی کے مشہور رزمیہ شاعر بھوشن اور لال کوی کی نظمیں اس کا اثر قبول کیے ہوئے ملتی ہیں۔ بھوشن کی مشہور نظم "شیو راج بھوشن" اور وہ نظمیں جن میں اس نے شیواجی کی بہادری، ان کی جنگ، ان کے لشکر اور جاہ و جلال کی عکاسی کی ہے۔ اس کا الفاظ کی نشست و ترتیب اور تکرار سے ہیبت ناک ماحول پیدا کرنے کا انداز اور نظم کی آن بان اور تیور صاف بتاتے ہیں کہ بھوشن نے آلھا کھنڈ سے کافی اثر قبول کیا ہے۔

آخر میں مجھے آلھا کھنڈ کی کردار نگاری کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے۔ آلھا کا ہر کردار اپنی جگہ پر مضبوط اور اٹل ہے، اور شروع سے آخر تک اپنے مخصوص معیار پر قائم رہتا ہے، پھر کردار جتنے ہیں ان میں کوئی بھی قیاس سے باہر نہیں، سب ایسے ہیں جنہیں ہم اپنی عام زندگی میں دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ وفاداری اور اخلاص، جانبازی و دلاوری کا نمونا ہے، اور عورت، مرد، بچا، بوڑھے ہر کردار کے چہرے پر کھلا ہوا ملتا ہے اور یہی ایک رزمیہ نظم کی سب

سے بڑی کامیابی ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر کردار سید ہے، جس کی حیثیت ایک فکر اور آلھا کی صلاح کار و قوت بازو کی ہے۔ سید کا کردار حب وطن، جاں فروشی اور ثبات و استقلال کا ایک ایسا عظیم اور مکمل خاکا ہے جس کا فوری تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی قدیم تہذیب، کلچر، اتحاد و ایثار، حق پرستی و بے لوثی پر بے پایاں فخر و مسرت ہونے لگتی ہے اور اس کے خون تمام ایسے سچے کردار جیسے مرہٹوں کا ابراہم گاردی رانی جھانسی کا غوث وغیرہ انظروں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ سید کا کردار باوجود سخت ترین مصایب و آفات کے مرتے دم تک بے میل اور بے لچک نظر آتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی آلھا گانے والے عوام روزانا کی کاروباری زندگی میں سید کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے سید کے کردار نے ان پر انمٹ چھاپ لگادی ہے۔ جسے وہ کسی وقت بھی فراموش کر نہیں پاتے۔

آج جب ہم اپنے ماضی کے کوچ میں اٹھے ہیں اور ہمیں موقع بھی ملا ہے تو ضرورت ہے آلھا کھنڈ اور اس کے پس منظر و پیش منظر کا گہرا جایزہ لیا جائے، اس سے بہت سے مفید و بامقصد نتایج نکلیں گے۔ اور آلھا و دل کی حقیقی عظمت و منزلت بھی معلوم ہوسکے گی۔ آلھا جو ہمارے عوام کے دلوں میں رہتا ہے، آلھا جو امر ہے، نہ وہ مرا ہے نہ مرے گا، کیونکہ وہی تو ہمارے شیروں میں ساونتوں کا دیوتا ہے، اور دیوتاؤں پر موت کا بس نہیں چلتا۔

دولت دنیا کے بدلے گوہر ایماں نہ بیچ
دیکھ! دوزخ کے عوض یہ خلد کا ساماں نہ بیچ
شوق کا ساغر مسرت خیز و کیف انگیز ہے
خلد کے بدلے بھی ایسا چشمۂ حیواں نہ بیچ
جنت الماوی کے بدلے دے نہ اشک انفعال
دیکھ اس جنس گراں مایہ کو تو ارزاں نہ بیچ
بے بہا جوہر ہے عرفان خودی خود آگہی
ایسے گوہر کو کسی قیمت پہ اے انساں نہ بیچ

یہ قطعہ بر یاض ہیدرآبادی

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

نہ آئے دور محبت کا غم نہیں ہے
زمانے کو شعور غم نہیں ہے
بیان غم پہ کیا رونے سے حاصل
جہاں میں چوں و چرا اب مقصود
نوائے ساز بھی دلکش ہے لیکن
وہ بزم گل ہوئی بے رنگ جس میں
جہاں زندگی ہے یہ کشاکش
محبت سے ہے تخلیق دو عالم
غم دوراں کو کیا اپنا ؤں جوہر
غم جاناں کی لذت کم نہیں ہے

نظر ساقی سے اوجھل کہیں ہے
یہاں کوئی مرا محرم نہیں ہے
علاج تشنگی شبنم نہیں ہے
جہاں تم ہو وہاں کچھ غم نہیں ہے
سکوت ساز بھی کچھ کم نہیں ہے
کوئی شعلہ کوئی شبنم نہیں ہے
مجھے ناکامیوں کا غم نہیں ہے
محبت کا کوئی عالم نہیں ہے

غزل

اختر علی تلہری

ہنگامۂ قیامت کا ہے لرزے میں زمین ہے
ان کی نگہ قہر تو جنبش میں نہیں ہے
جب سے کہ ترے حسن کی وسعت ہے نظر میں
دنیا کی ہر ایک شے مری آنکھوں میں حسیں ہے
تیری نگہ لطف و غضب نے یہ بتایا
جنت بھی یہیں اور جہنم بھی یہیں ہے
میں اور ترے غمزۂ خوں ریز کے شکوے
دنیاے محبت کا یہ آئین نہیں ہے
کیا جانیے کیا کہہ گئی میری نگہ شوق
بیٹھا ہے وہ خاموش مگر چین بجبیں ہے
واعظ نہ بڑھا بات، یہی کیوں نہیں کہتا
سامان تسلی ہوس خلد بریں ہے
دنیا کے حوادث نے بدل دی مری نظریں
پہلو میں اب اختر دل پرجوش نہیں ہے

غرناطا

الحمراء کی جوت علم و فن کی آماجگاہ

نذیر حسین

ایران اور روما کے زوال کے بعد یونانی علم و فن کو عربوں نے اپنے سینوں سے لگایا، یونان کا ایک ایک موتی، ایک ایک جواہر تاریخ کے کھنڈروں سے نکال کی انہیں آب و تاب بخشنے کا کام عربوں نے انجام دیا۔ ان عربوں کے تمدنی، ذہنی کی تاریخ ہسپانیا کے کئی سے پھیلی ہوئی ہے۔ غرناطا اس تمدنی ذہنی کا ہسپانیا میں سب سے آخری نشان ہے۔ اسی سرزمین پر ارسطو کا سب سے بڑا شاگرد ابن رشد دفن ہے۔ قرطبا جس کی حکایتیں ہمیں الجبل کے صفحات میں ملتی ہیں۔ اسی قرطبا کے قریب یہ شہر واقع تھا۔ عربی اور یونانی علوم کا خزانہ اسی شہر میں یورپ والوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ جب ہسپانیا کا یورپ نے مکمل استیصال کر لیا تو عربوں کی تہذیب اور علوم و فنون کو اس صفحۂ قرطاس سے مٹانے کے لیے اسی غرناطا کی شاہراہوں پر لاکھوں عربی کتابوں کی خاکستر کیا گیا تھا، لیکن وہ ذہن خاکستر نہ ہو سکے تھے جو علم و فن کی تخلیق کرتے ہیں ——— ایڈیٹر "خیال"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے عروج اور زوال کا ایک وقت مقرر ہے۔ جس طرح یونان کو زوال ہوا جس طرح رومانیا تباہ ہوا۔ اسی طرح ہسپانیا میں بھی مسلمانوں پر زوال آیا۔ سلطنت غرناطا مسلمانوں کی آخری یادگار ہسپانیا میں باقی رہ گئی تھی۔ ہر طرف دشمنوں کا نرغا تھا، مگر واہ رے شجاعت سب کو برابر جواب دیتے رہے۔ آخر یہ طے ہوا کہ ابن احمر سلطان کے زمانے میں صرف غرناطا اور اس کا قرب و جوار مسلمانوں کے قبضے میں رہ گیا۔

قرطبا کے عوض اب غرناطا اسلامی علم و ہنر کا گھر ہوا۔ اس کی عمارات کی دھوم پڑ گئی۔ خد غرناطا ایک خوبصورت شہر تھا۔ شہر کی بلند عمارتوں پر چڑھ کر نظر دوڑائی جاتی تو دور تک ایک سرسبز و شاداب میدان دکھائی دیتا تھا جس میں ندیاں، انگورستان، باغات اور نارنج کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ اندلس بھر میں کوئی شہر اس وضع اور آب و ہوا کا نہ تھا۔ برف کے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں تو سخت سے سخت گرمی میں جاڑے کا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔

قصر الحمرا ایک سطح مرتفع پر قائم ہے جس کے چاروں طرف کھنڈ اور نالے ہیں اور شمال کی طرف دامن میں دریائے ڈارو بہتا ہے۔ پتھر کی مضبوط دیواریں چاروں طرف سے قصر کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت سنگین اور مضبوط برج کے نیچے قصر کا بیرونی دروازا ہے جس میں دربار عدالت نصب ہے۔ اس دروازے میں مسند عدالت پر بیٹھ کر سلطان دادِ انصاف دیتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چوک نظر پڑتا ہے، جس کی ایک طرف چار سو پنجہ کا تیار کیا ہوا محل نامکمل حالت میں پڑا ہوا ہے۔ آگے چل کر ایک برآمدا ملتا ہے جس سے گذر کر صحن خانی میں جا داخل ہوتے

ہیں۔ اس صحن میں حنا کے بیشمار پودے ہیں۔ اس کے بعد ایک تنگ رستے سے نکل کر ایک اور صحن میں، ۴۰ فٹ لمبا اور ۲۰ فٹ چوڑا ملتا ہے۔ اس کے عین وسط میں ایک تالاب ہے، جس میں سنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔ دھوپ کا عکس جب مچھلیوں اور پانی پر پڑتا ہے تو عجب بہار ہوتی ہے۔ چاروں طرف کونوں پر ستون اور بھول بھلیاں ہیں۔ ہر وقت ایک سکوت کا عالم چھایا رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیوان و کلاہیں جاتے ہیں۔ سلاطین بنی امیہ اسی دیوان میں مسند خلافت پر متمکن ہوتے تھے۔ اوپر کا ایک گنبد بلند ہے۔ چاروں طرف عربی خط اور عربی زبان کے کتبے دیواروں پر ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مناسب مناسب موقعوں پر پیتل بوٹے بھی ہیں۔ چھت پر دو بڑے تاج اور ستارے بنے ہوئے ہیں، جس سے گنبد میں گنبد نیلوفری کی شان پیدا ہے۔

مینار کی بھول بھلیاں طے کر کے ہم مینار کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ یہاں سے میدان و یگاصاف نظر آتا ہے۔ سلطان کا مکان ان ہی بھول بھلیوں میں ہے۔ جس کی کھڑکیاں میدان و یگا کی طرف ہیں۔ دروازے کے نزدیک ہی سفید سنگ مرمر کے فرش میں متعدد سوراخ نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس فرش کے نیچے خوانات جلاتے تھے، اور خوش بوئیں سوراخوں سے نکل نکل کمرے کو معطر کرتی تھیں۔ نیچے پائین باغ ہے جس میں ایک مختصر سا چمن ہے۔ اس کے قریب ہی شاہی حمام ہیں جن پر چکی کاریاں اور گل کاری کا کام دیکھنے اور تعریف کرنے کے قابل ہے۔ حمام کے بیچوں بیچ حوض ہے جس کا پانی لہروں کے باعث آہستہ آہستہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ سامنے اوپر کی طرف بالا خانے کے طرز کی کھڑکیاں ہیں جن میں حمام کرنے کے وقت نقاہ سرور سے کام لیا جاتا ہے۔

عجائب سے زیادہ مشہور و معروف قصر کا وہ حصہ ہے جو "بیت الاسد" یا شیروں کے صحن سے موسوم ہے۔ ایک سو اٹھائیس سفید سنگ مرمر کے ستون تین تین، چار چار کی قطار میں نصب ہیں۔ ان پر بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں جن کے ستونوں کی خوبی باریک گل کاری کی شان، سنہری اور روپہلی رنگ کی بہار، تاریخ نما گنبدوں، خوبصورت مینا روں اور محرابوں کی دلربانا کیفیت، شاعرانہ مزاج کے لیے تازیانے کا کام دیتے ہیں۔ نیچے ایک خالی حوض ہے، جس میں بارہ سیت ناک شیر ہیں۔ ان کے مونھوں سے کسی زمانے میں پانی نکل نکل کر حوض کو بھرتا رہتا تھا۔

اس خوبصورت حوض سے آگے بڑھ کر دیوان بنی نصر ہے کہتے ہیں بنی نصر کے سردار اسی جگہ سلطان ابو عبداللہ کے حکم سے تہہ تیغ کیے گئے تھے۔ قصر زریف ایک اور محل ہے جسے قصر الحمرا کا ثانی مقام کہنا چاہیے۔ ایک سادا سا محل ہے، دیوانیں، چبوترے، بارہ دریاں، محرابیں سب کھنڈر پڑے ہیں۔ عربی کی گل کاری پر سفیدی کی پائیدار تہیں ابھی تک قایم ہیں، مگر سنگ تراشی کے عجیب و دلفریب نمونے ضایع ہو چکے ہیں اور عمارت کی اندرونی خوبی عرصا ہوا معدوم ہو گئی ہے۔ ہاں باغوں اور نہروں کا لطف ضرور قایم ہے۔ ایک سبک رفتار نہر سنگ مرمر کی نالی سے ہو کر صحن میں اس طرف سے اس طرف کو نکلتی ہے، جس پر نارنج اور بہرو کی گہری چھاؤں کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ فوارے، نلکے، نلکیاں، چھوٹے چھوٹے پانی کے برتن، نہر کے بیچ در بیچ رستے، نہروں کے اندر چھوٹی چھوٹی اور نہریں۔ یہ سب اس خوبی و نفاست سے جمع کیے گئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ دو صدیوں تک مسلمانوں نے غرناطہ میں امن چین کے ساتھ حکومت کی، مگر آخر کہاں تک؟ فرڈیننڈ اور ملکہ ازیلا کی شادی ہوتے ہی ہسپانیا کی قوت ایکجا مجتمع ہو گئی۔ یہ شگون مسلمانوں کے لیے برا ثابت ہوا۔ سلطان ابوالحسن نے اپنی سی بہتری کوشش کی سیحیوں کا مقابلا خوب خوب کیا، مگر بعد بھی سارے کے سارے مفتوحات ایک کے بعد ایک مسلمانوں کے ہات سے نکلتے گئے۔ مدینۃ الزہرا کا محاصرا کر لیا گیا اور وہ ہات سے جاتا رہا۔ پھر یہاں تک ہوا کہ آخر غرناطا بھی ہات سے نکل گیا۔ محاصرۂ غرناطا کے بعد جب سلطان میدان چھوڑ کر شہر غرناطا میں پناہ گزیں ہوئے تو در و دیوار سے نالا و بکا کی آواز بلند تھی۔ خوبصورت غرناطا! تیرے نارنج اور حنا کی خشواب بھی اسی طرح عیش خانوں اور آبادگاہوں کو معطر کرتی ہے۔ بلبل کا نغما اب بھی

ہندستانی افسانا اور اس کی مختصر تاریخ

شام داس کھنہ شاہد امرتسری

افسانا ایک چھوٹی کہانی ہے، جس کی داستان بڑی لمبی اور پیچیدہ ہے، اس کا رواج اس زمانے سے چلا آتا ہے، جب انسان ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ افسانے کا پہلا دور وہ تھا جب رات کے وقت گھر کے بڑے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے بچوں کو جنگلی جانوروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے، یہ سن کر بچے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ فنی طور پر وہ کہانیاں رسوم اور قواعد سے بری نہیں اور افسانا نگاری کی قید سے آزاد۔ بیان کا طریقہ بھی بیدا سادا ہوتا تھا، ان میں دلکشی کا سامان ضرور ہوتا تھا اور ساتھ ہی یہ کہانیاں نصیحتوں سے بھری ہوتی تھیں۔ پنچے تنتر اور ایسپ کی کہانیاں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد دوسرا دور جادو طلسم کا دور تھا۔ عجیب و غریب اور جادو بھری کہانیوں کی مانگ پیدا ہوئی، اس عہد کے قصوں میں جنوں، بھوتوں، پریوں اور دیوتاؤں کا ذکر ہوتا تھا۔ یا جادوگروں کی موکا آرائیوں اور جنگی کارناموں کا بیان ہوتا تھا۔ کہیں طلسم و سحر کے کرشمے دکھائے جاتے تھے اور کہیں نامعلوم دور دراز ملکوں کے عجایب و غرایب سے روشناس کرایا جاتا تھا، اور کبھی آدم زاد کی پریوں اور دیوتاؤں کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

واقعات اور ان کے بیان میں اکثر ایکسانیت پائی جاتی تھی جس سے طبیعت اکتا جاتی۔ چنانچہ الف لیلا بیتال پچیسی وغیرہ اس دور کے آثار قدیمہ ہیں۔ پہلے دور کی کہانیوں کی طرح ان میں بھی دلچسپی اور کشش ضرور ہے، مگر واقعیت اور حقیقت سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔ یہ کہانیاں ہماری دنیا کی نہیں، بلکہ ایک ایسی دنیا کی تھیں جسے ہم نے نہ دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتے۔ یہ ایک خیالی دنیا تھی، جس کا تصور کیا گیا تھا۔ یہ انسانی دماغ کی اختراع تھی، جو اصلیت سے مطلق بہرہ کار نہ تھا۔ یہ بے تکی سی اور بے سر پیر کی کہانیاں پڑھ کر لوگ تذبذب میں پڑ جاتے تھے۔ انتہائی محویت کے عالم میں ڈوب جاتے۔ انہیں کھانے پینے تک کی سدبد نہ رہتی۔ وہ بے حد لطف اندوز ہوتے، مگر کہانی کے خاتمے پر ان کا دل گواہی دیتا کہ ہمارا وقت ضایع کیا گیا۔

تیسرے دور کی ابتدا عشقیا کہانیوں سے ہوئی۔ ان میں حسن و محبت کا بیان غالب ہے۔ یہ واردات عشق اور جذبات فطرت سے معمور ہیں اور رنگینی و لطافت سے پر۔ ان میں چاند کی چاندنی، پھولوں کی بو اور حسن و عشق کے چرچے ہیں۔ قصے کہانیوں کی اشاعت اور ترقی کے سلسلے میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کا نام قابل ذکر ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں جب بعض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کالج کے روح رواں ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ملک کے قابل اہل زبان جمع کیے اور ہندستانی نثر میں ان تصوں اور کہانیوں کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا اور نظم کو شش کی۔

ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی فرمایش سے میر امن دہلوی نے "قصۂ چہار درویش" کا آسان ہندستانی میں ترجمہ کیا اور اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" (۱۲۱۷ھ یا ۱۸۰۱ء) رکھا۔ "قصۂ چہار درویش" امیر خسرو نے اپنے مرشد نظام الدین اولیا کی علالت کے زمانے میں ان کا دل بہلانے کے لیے لکھا تھا۔ حضرت کی دعا تھی کہ جو بیمار اس کو سنے گا شفا پائے گا۔ یہ قصہ اب تک بھی مقبول ہے اور بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ میر امن پہلے شخص ہیں جنہوں نے صاف ستھری، سیدھی سادی، اور با محاورہ ہندستانی زبان لکھی۔ ان کی زبان نہایت ہی صاف اور سلیس ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ "باغ و بہار" دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ۱۸۰۱ء کی تصنیف ہے، بعض بعض جگہ صرف قدامت کی جھلک نظر آتی ہے۔

گل کرائسٹ کی زیر نگرانی میر شیر علی افسوس دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، مظہر علی خاں ولا اور حفیظ الدین احمد نے بھی فارسی اور سنسکرت کے قصوں کا ہندستانی میں ترجمہ کیا۔

میر شیر علی افسوس کا ہندستانی ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ "باغ و بہار" بہت مقبول ہوا۔ سید حیدر بخش حیدری کی تصانیف قصۂ "لیلیٰ مجنوں" و امیر خسرو کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا ترجمہ "طوطا کہانی" (سید محمد قادری کے "طوطی نامہ" کا ترجمہ) گلزار دانش (شیخ عنایت اللہ کی "بہار دانش" کا ترجمہ) جس میں عورتوں کے فریب کے قصے ہیں اور "آرائش محفل" (قصۂ حاتم طائی) بہت مشہور ہیں۔

مرزا کاظم علی جوان نے شکنتلا مصنفہ کالیداس اور سنگھاسن بتیسی کے ترجمے بھی کیے۔ للو لال نے مترجم کو بڑی مدد دی۔ نہال چند لاہوری نے قصۂ "تاج الملک" اور "گل بکاولی" ۱۸۱۲ء میں فارسی سے ہندستانی میں ترجمہ کیا۔ مظہر علی خاں ولا نے صورت کیسر کی "بیتال پچیسی" اور قصۂ "مادھو مل و کام کندلا" کو ہندستانی میں ڈھالا۔

حفیظ الدین احمد نے "خرد افروز" کے نام سے ۱۸۵۳ء میں ابوالفضل کی "عیار دانش" کا ترجمہ کیا۔ عیار دانش خدا ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی تلخیص اور انوار سہیلی "کلیلہ دمنہ" عربی کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔

اکبر کے قصوں کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ جو دلی کی تباہی کے بعد ہندستانی زبان کا مرکز بن گیا تھا، تراجم اور نثر نگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا۔ وہاں فقیر محمد خاں گویا نے خوب شہرت پائی۔ اس کی تصنیف "بستان حکمت" انوار سہیلی کا مفہوم و ترجمہ ہے جو ۱۸۵۳ء میں ختم ہوا۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں، بلکہ موزوں مقامات پر مترجم نے اپنی قابلیت سے بھی کام لیا ہے۔ ایک زمانے میں "بستان حکمت" بہت مقبول ہوئی۔

مرزا جب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھ کر لوگوں کے دلوں میں افسانے کا شوق پیدا کیا۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے، جس کے مضمون اور واقعات میں کوئی جدت نہیں۔ اس میں طلسم و سحر، دیووں سے لڑائی، جادوگروں سے مقابلے اور سفر کے عجائب و غرائب بکثرت ہیں۔ اس کتاب کی عبارت مقفیٰ، مسجع اور تکلف و تصنع سے الجھی ہوئی ہے۔ سرور نے "فسانۂ عجائب" میں جذبۂ حب وطن سے متاثر ہو کر اہل دلی پر چوٹیں کیں، جن کا جواب "فسانۂ سروش سخن" میں خواجہ فخر الدین دہلوی نے دیا۔ پھر محمد جعفر علی شیون لکھنوی نے "طلسم حیرت" لکھ کر "سروش سخن" کے طعن کا جواب لکھا۔

ہندستان کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے کے قصوں اور داستانوں کو فنی اعتبار سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی زبان عموماً رنگین ہوتی تھی جس میں فارسی کی ترکیبیں اور بندشیں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ ان میں نہ تو باقاعدہ کوئی پلاٹ ہوتا تھا، اور نہ کردار نگاری پر توجہ دی جاتی تھی۔ جنگ آزادی کے بعد ہمارے افسانوں کی روش بدل گئی۔ سب سے پہلے بہ اعتبار فن پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے افسانوں میں کردار نگاری کے حالا سے عالا جوہر اور لکھنوی تہذیب و تمدن کی صحیح اور سچی تصویریں پیش کیں۔ پنڈت برج نارائن چکبست کی رائے میں حضرت سرشار افسانہ نگاری کے موجد ہی نہیں تھے، بلکہ ہندستانی کے سب افسانہ نگاروں میں ان کا پایا عالی تر تھا۔

سرشار نہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی مانند مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں اور نہ وہ برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو چمکاتے ہیں، بلکہ جو بہو تصویر کھینچتے ہیں۔ ان کے اشخاص قصاب کی طرح ہمارے آنکھوں کے سامنے

نہیں گذرتے، بلکہ وہ افسانوں کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کی عالا اور ادنا سوسائٹی کی انہوں نے صحیح ترین تصویریں کھینچی ہیں۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ حرم سراؤں کے اندرونی حالات کا مطالعہ انہوں نے کس طرح کیا۔ شوخی و ظرافت ان کا کہیں ساتھ نہیں چھوڑتے۔ عام طور پر ان کا مذاق مہذب ہے۔ مکالمات لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ ادنا عالا شخص کی بولیاں الگ معلوم ہو جاتی ہیں۔ سرشار کیریکٹر نگاری کے استاد ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹروں کی خصوصیات چن لیتے ہیں، اور ان ہی میں ظرافت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں۔

چکبست نے سرشار کی افسانہ نگاری پر رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے "لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی تراکت، جواب سوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی، روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گل کاری، تراشوں کی نئی چبھن، ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا والا و شیدا بنا لیا۔" اس کے بعد مولوی عبدالحلیم شرر نے نہایت دلچسپ اور شاعرانہ پیرائے میں تاریخی افسانے لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد، منشی سجاد حسین، قاری سرفراز حسین اور مرزا رسوا نے انگریزی افسانوں اور ناولوں سے استفادہ کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی کوششوں میں ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

ہندستانی زبان میں مختصر افسانوں کی باقاعدہ ابتدا انگریزی افسانوں کے ترجموں سے ہوئی جو سب سے پہلے "اودھ پنچ" لکھنؤ میں شائع ہوئے (منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں اس اخبار کو جاری کیا تھا) اس قسم کے افسانے اس قدر پسند کیے گئے کہ رفتہ رفتہ طبع زاد افسانے بھی لکھے جانے لگے۔ غالباً سجاد حیدر یلدرم پہلے شخص تھے جنہوں نے ترکی افسانوں کو پہلے پہل ہندستانی میں منتقل کرنا شروع کیا اور بعد میں بحیثیت مصنف بھی میدان میں آ گئے۔

مختصر افسانے اس تیزی کے ساتھ ایک قلیل مدت میں ہمارے ادب کی جان ہو گئے اور یہ کہ نثر میں اتنی کامیابی کسی صنف کو بھی نہیں ہوئی۔ گذشتہ ناولوں کے مقابلے میں اس کو زندگی سے زیادہ قریب پا کر پڑھنے والوں نے اسے سینے سے لگایا اور ساتھ ہی نئی چیز ہونے کی حیثیت سے بھی وہ زیادہ پر لطف اور دلکش ثابت ہوا۔ آج جرائد و رسائل، اخبارات وغیرہ بھی اس صنف سے اپنے صفحات کو آراستہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

منشی پریم چند کا افسانہ ہندستانی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہندستان اور یورپ کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے درمیانی رستا اختیار کرتے ہیں۔ وہ حقیقت کو اپناتے ہیں۔ انہوں نے آخری زندگی تک دو سو سے زاید مختصر افسانے لکھے اور افسانہ نگاری کو ایک مستقل فن کی صورت بخشی۔ ان کے افسانے فطرت کے گوناگوں اسرار کی تصویریں ہیں۔ اور نفسیاتی حقیقتوں پر مبنی ہونے کے سبب دوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ صحیح فن ادب میں خاص طرز کے استاد، موجد فن، اور مصور جذبات تھے۔

منشی پریم چند کے علاوہ یہ حضرات بھی مشہور افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سدرشن نے منشی پریم چند ہی کی روش اپنائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت افسانہ نگار کامل فن تھے۔ خواجہ حسن نظامی، مصور غم مولانا راشد الخیری، مجنوں گورکھپوری، اختر رائے پوری، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، اور کرشن چندر وغیرہ وغیرہ۔

موجودہ دور کے افسانوں میں مزاح اور

شوخی کا جوہر غالب ہے۔ لطف مذاق اپنی معنویت اور تاثیر کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اولین مقصد علمی ادبی ذوق کو پورا کرنا ہے۔ تفنن طبع اس کا ثانوی منشا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں اور سیاسی مسایل اور اقتصادی حالات کا بھی خاکا کھینچا جاتا ہے۔ منظر کشی اور کردار نگاری بھی دور حاضر کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

جدید اور ابتدائی افسانوں میں فرق

ابتدائی افسانوں کو اصول فن سے کوئی واسطا نہ تھا۔ واقعات کی اصلیت اور زندگی کی حقیقتوں سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اکثر ان میں جنوں، بھوتوں، پریتوں اور دیوتاؤں کا ذکر ہوتا تھا۔ جادو اور طلسم کے کرشمے دکھائے جاتے تھے۔ زمین آسمان کے قلابے ملانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ ہوائی قلعے تعمیر کرنا ان کا معمول تھا، گویا ابتدائی افسانا نگار شیخ چلی کی سیرت رکھتا تھا۔ اسے زمان و مکان کی قید کا خیال ہوتا اور نہ عقل و فہم سے کام، وہ بے تکی اور بے سری باتوں سے سننے والوں کو خبط کرنا جانتا تھا۔ ابتدائی افسانے فنی طور پر مکمل نہ تھے۔ زبان تو بلکل سادا اور حسن بیان کی خوبیوں سے قطع عاری ہوتی اور یا پھر بعد میں حد سے زیادا رنگین ہوتی جس میں فارسی کی مشکل ترکیبیں اور بندشیں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ ان میں نہ تو باقاعدا کوئی پلاٹ ہوتا تھا اور نہ کردار نگاری پر توجہ دی جاتی تھی، ان کے اشخاص سائے کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گذرتے تھے۔ وہ گوشت پوست سے بنے ہوے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے معمولی انسان نہیں تھے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے کسی کردار کے فضایل و عادات سے ہم واقف نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس زمانے کے تہذیب و تمدن کی کوئی جھلک ان میں ملتی ہے۔ وہ محض وہم اور باطل پر مبنی ہیں اور ہمارے ذہن ان سے نہ تو کوئی دیرپا اثر قبول کرتے ہیں اور نہ ہی ان سے اخلاقی اصلاح ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے ابتدائی افسانے محض کم سن اور نادان بچوں کی تفریح طبع اور دل لگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور اس سے زیادا کچھ نہیں۔

جدید افسانا باقاعدا اور مستقل فن کی صورت میں رونما ہوا۔ سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے افسانوں میں کردار نگاری کے عالا سے عالا جوہر دکھائے انہوں نے اپنے وقت کی تہذیب و تمدن کی پوری تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ اپنے ماحول اور نواح کا صحیح چربا اتارا ہے۔ انہوں نے بانکپن کمال لکھنؤ کی عالا اور ادنا سوسائیٹی کا خاکا کھینچا ہے۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ حرم سراؤں کی اندرونی حالت کا مطالعا انہوں نے کس طرح کیا۔ شوخی و شرارت کو کبھی ہات سے نہیں جانے دیا، مگر ان کا مذاق تہذیب اور ادب سے عاری نہیں ہوتا۔ مکالمانویسی میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور کردار نگاری کے استاد ہیں۔ زبان کے اعتبار سے بھی کامل فن ہیں۔ جدید افسانا زبان کی گوناگوں خوبیوں سے آراستا ہے، طرز تحریر کی نزاکت، ترکیبوں کی خوبصورتی، بندش کی چستی، محاورات اور تشبیہات کی جدت، خیال و تخیلات کی ندرت، جوش زبان، صفائی اور پاکیزگی بیان، روزمرا کی لطافت، مزاح و ظرافت کی گل کاری سب ہی اوصاف پاے جاتے ہیں۔ جہاں ابتدائی زمانے میں واقعات کا تسلسل مفقود تھا اور کرداروں کی باہمی حیثیت کا خیال نہ رکھا جاتا تھا اور نہ ہی تاریخی حقایق پر توجہ دی جاتی تھی یعنی زمان و مکان کی قیود کی مطلق پروا نہ کی جاتی تھی، اور کہانی کے اجزا میں کوئی ربط نہ ہوتا تھا وہاں جدید افسانے میں ہر بات کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ پلاٹ یعنی کہانی نیچرل ہو۔ واقعات کو ایک دوسرے کیساتھ باقاعدا ربط ہو، کردار کے عادات و خصایل صحی رنگ میں پیش کیے جائیں، اور ان کے باہمی تعلقات

کو مدنظر رکھا جاے۔ افسانے کی غرض و غایت کو ہمیشا سامنے رکھا جاتا ہے اور مرکزی خیال کی ایکجہتی سے نظر نہیں ہٹائی جاتی جس

سفر ایران کے تاثرات

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

وہ سرزمین جس سے تہذیب اور شائستگی کی اولین شعاعیں پھوٹیں، جہاں زرتشت نے محبت اور انسانیت کا درس دیا جس کے چپے چپے پر دارا اور جمشید کے نقوش کندہ ہیں، جہاں فردوسی اور حافظ نے نغمہ و نور کی بارش کی، جہاں ابن سینا و فارابی نے فلسفہ و ادب کی چند لافانی تحقیقات پیش کیں، اور جو آج بھی "امن و وفا" اور "کشور گل و بلبل" ہے اور جس کو اختصار کے طور پر ایران کہتے ہیں۔ اس کے صرف خیال اور تصور ہی میں میرے لیے دلکشی اور جاذبیت کا ایسا سامان پوشیدہ رہا ہے کہ اکثر میں رسمی کاموں کے ہجوم میں بھی ایک نامعلوم خوشی سے چونک چونک پڑا ہوں۔ اگر خواب حقیقت بن جائے تو اس خوشی کا اندازا کوئی نہیں کر سکتا، ایسا ہی میرے ساتھ ہوا، جب سفیر کبیر شاہنشاہی ایران آقائے علی اصغر حکمت کے لطف خاص سے وزارت فرہنگ ایران کا پیغام نامہ میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے بعد اطالیا، فرانس، جرمنی، اور انگلستان بھی جانا تھا اور وہاں اپنے علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں ڈیڑھ برس رہنا بھی تھا، لیکن ایران جانے کی ایسی خوشی تھی جیسے ایک دور افتادہ طالب علم برسوں کے بعد اپنے گھر جا رہا ہو اور وہ اپنے خاص عزیزوں اور دوستوں کے ملنے کے خیال سے پھولا نہ سماتا ہو۔ اس کا سبب اصل میں "علاقۂ محبت ازلی" ہے جو ہندستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان سدا سے ایک ہے، ہمارے اجداد ایک ہیں۔ ہم خون و ہم نژاد، ہماری تاریخ کا ایک حصہ مشترک ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے افکار و معتقدات، معاشرت و مذہب و تہذیب و تمدن کے بھی اکثر دائرے باہم مل گئے ہیں۔

اس بات کا عین الیقین اس وقت ہوا جب میں ایران پہنچا اور وہاں دس روز وزارت فرہنگ کا مہمان رہا۔ اب ہمالیا اور ہرت پڑا کے بجائے البرز اور دماوند کے پہاڑ تھے اور برگد و پیپل کے بجائے سرو و شمشاد کے پیڑ۔ طبعی ماحول ضرور بدل چکا تھا، لیکن پھر بھی اس رنگا رنگ اور گوناگوں کثرت میں وحدت کا رشتہ موجود تھا جس کو عارفوں کے وجدان، فلسفیوں کی فکر، زاہدوں کی ریاضت اور فن کاروں کے تخیل نے قوت بصر پہنچائی تھی۔ تخت جمشید، شوش، پاسارگاد، تخت سلیمان، کاشان، نہاوند وغیرہ کے آثار اور موہن جوداڑو اور ہڑپا میں جو مماثلت ہے یا قدیم ایرانی داستان اور ویدک سنسکرت میں جو مشابہت ہے وہ اتفاقی نہیں ہے، اس کی پشت پر برس ہا برس کا میل جول اور تہذیبی اتحاد ہے۔ اسی طرح عہد مغلیا کا آرٹ ہم اسی وقت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، جب ایران کی خاتم کاری، آئینہ کاری، کاشی سازی، سوزن دوزی، مینا تور سازی، نقاشی، قالین بافی اور زری بافی سے ہو جس کے بے مثل اور نہایت دلکش نمونے موزۂ سلطنتی باستان شناسی تہران و اصفہان میں موجود ہیں۔ اسی طرح عہد اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی عمارتوں کو سمجھنے کے لیے اصفہان کے تالار اشرف، مسجد شاہ عباس، مسجد صدر اور مسجد شیخ لطف اللہ کو دیکھنا چاہیے۔ کتنے رنگ، اور طرز ہیں جو ہم نے لیے ہیں اور دیے ہیں۔ میں نے موزۂ سلطنتی میں کئی خوبصورت اور ذی قیمت ابریشمی قالین دیکھے۔ درخت دار یا آثار تخت جمشید مشتمل ان کو دیکھ کر مجھے جے پور میوزیم کے قالین یاد آ گئے، خصوصاً غالیچے مہاراجا مان سنگھ، اس میں شاہ عباس کے باغ کا حسین منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ہر سمت

نارون و سفیدار کے درخت، نہریں اور نالیاں ہیں۔ ایران کے قدیم باغات بھی ہمارے شالیمار، نشاط اور اچھابل کے باغات کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی حال ایران کے اصلی اور ہندستان کے مغلیا کھانوں کا ہے۔ نام تک مشترک ہیں، آداب دسترخوان بھی وہی ہیں۔ اسی طرح سنائی، سعدی، حافظ، عمر خیام ہمارے وظیفۂ زندگی ہیں اور آج بھی مجالس سماع میں ان ہی سے رونق ہے۔

حافظ نے جو بات اپنے زمانے کے لیے کہی تھی وہ آج بھی حقیقت ہے ؎

شکر شکن شدند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگال می رود

اسی طرح سے ایرانی حسن دہلوی، امیر خسرو، فیضی اور غالب کے اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں ایران میں دس روز رہا اور ہر ایک ایک چیز کی دریافت کی۔ ذرا اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز جانی پہچانی ہے۔

اصفہان واقعی نصف جہان ہے۔ شراب اصل جائے امن و دیار مہربان سے عبادت۔ اس کا پیالۂ سنگی، مینار جنبان، جلفا، پل، مساجد اور دلکش عمارتیں عجیب ہیں اور جی چاہتا ہے آدمی انہیں دیکھتا ہی رہے اور وہیں عمر بسر کردے۔ ایک ارمنی ناجر تھا اس کی تصویر جلفا میں ہے، اصفہان میں لاکر دفن کیا گیا۔ واقعی اصفہان اسی محبت کا مستحق ہے۔

تہران، اصفہان کے مقابلے میں بالکل نیا شہر ہے۔ اس کی زیادا تر ترقی پچھلے ۲۵ سالوں میں ہوئی ہے۔ اس میں ایک خوبصورت یونیورسٹی ہے، جس کا طور طریق فرانس کی درسگاہوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں آٹھ ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ پارلیمنٹ ہے، محلات شاہی ہیں، دفاتر ہیں، عدالتیں ہیں، بنک ہیں، تھیٹر ہیں، سینما ہیں، قہوہ خانے ہیں، بڑے بڑے بازار خیابان لالہ ہوٹل ہیں۔ غرض کیا نہیں ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے لندن کے متعلق لکھا تھا "جو شخص دنیا سے تھک جاتا ہے وہ لندن سے بھی تھک جاتا ہے"۔ یہی بات تہران کے متعلق ہے، بلکہ حافظ کی زبان میں یہ کہنا صحیح ہوگا۔ ع

ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شد

عوام میں گاندھی، نہرو اور ابوالکلام کے ہندستان کے متعلق بڑے اچھے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ایرانی عوام ماضی کی میراث سے باخبر ہیں اور نئی دنیا کے تقاضوں سے آگاہ۔ انہوں نے مادی ترقی کے ساتھ اپنی روح کی تب و تاب کا بھی سامان بہم پہنچایا ہے اور ایران کی قدیم صحت مند روایات کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے عوامی تھیٹر میں "سہراب و رستم" کو دیکھ کر ہوا۔ "شاہ نامہ" پڑھنے کا انداز بھول نہیں سکتا۔ اب تک دل میں جوش اور سہرورد کی کیفیت ہے۔ یہ شعر پہلے بھی پڑھتے تھے، لیکن وہاں ان کی سچے مچے کی وضاحت ہوئی۔ سہراب عشق میں گرفتار ہوکر کہتا ہے ؎

غریب آمدہ آمدم در کمند — کہ از بند جست و مرا کرد بند
زہی چشم بندے کہ آن پرفسوں — بہ تیغم نہ خست و مرا بخت خوں
ندانم چہ کرآن فسوں گر بہ جن — کہ ناگہ مرا بست راہ سخن

(اس کے بعد ہومان کی یہ نصیحت کہ یہ خاتون اپہلوانوں کا منصب نہیں ہے ؎

تو ئی مرد میداں ابی ہر راہ — چہ کارت بہ عشق پری سکواہ
تو کارے کہ داری تہمتنی بسر — چرا دست بازی بہ کار دگر
بہ نیروی مردی جہاں آبگیر — نہ شایان بدست آر تاج و سریر

بعض مجالس عزاداری میں بھی شریک ہوا اور بالکل یہ معلوم ہوا کہ میں تہران میں نہیں لکھنؤ میں ہوں۔ ان صحبتوں کا درد انگیز کیف اب تک محسوس کرتا ہوں۔ میں ایران کے جس گھر میں بھی گیا اس کا بچا بچا آنکھیں فرش راہ کرنے پر آمادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا کوئی بچھڑا ہوا عزیز آگیا۔ ان کے تبسم میں ایسا خلوص، ایسی

صداقت، ایسی محبت پوشیدا تھی کہ وہ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے، اور کسی طرح بھی بھلانے کی چیز نہیں۔

علمائے تہران کے خان کرم پر مجھے اچھے کھانے ہی میسر نہیں آئے، جس سے کام و دہن اب تک لذت یاب نہیں، بلکہ وہ غذائے روح بھی میسر آئی جس کی تلاش میں میں ایران گیا تھا۔ ڈاکٹر پورداود پوچھنے لگے، اب ہندستان میں فارسی تعلیم کا شوق کس حد تک پایا جاتا ہے، میں نے کہا آزادی کے بعد ایران سے روابط پھر نئے سرے سے قایم ہوئے ہیں، اس لیے فارسی زبان و ادب کی طرف بھی خصوصی توجہ ہوئی ہے، اور تقریباً تمام بڑی یونیورسٹیوں میں فارسی کی عالا تعلیم کا بندوبست ہے۔ تہذیبی رشتوں سے قطع نظر ہندستان کے عہد وسطا کی تاریخ اور ہندستانی ایرانی لسانیات بغیر فارسی کی مدد کے پڑھنا ناممکن ہے۔

ڈاکٹر سا پورداود نے فرمایا کہ ایرانیات اور ہندیات میں رشتہ قایم کیجیے اور فارسی کا مطالعا سنسکرت کے ساتھ اور ہندستانی کا مطالعا آریائی زبانوں کے ساتھ کیجیے۔ اس سے نہ صرف INDO-ARYAN LINGUISTICS کو فائدہ پہنچے گا بلکہ تہذیبی رشتے بھی محفوظ ہوں گے، اور فکر و حدت کی نظر پہلے سے زیادا استوار ہو جائے گی۔ یہ نصیحت بڑی کارآمد ہے۔ اور میں اس کو ایران کے سفر کا وہ آور دسفر سمجھتا ہوں۔

پسند کا معاملا بلکل وجدانی، ذوقی اور شخصی ہے، اس لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ایرانیوں سے زیادا مہمان نواز اور شایستا لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ایرانیوں کے متعلق یہ بات میں نے بہت پہلے بھی کہی ہے اور اب پھر "ہفت شہر عشق" کو دیکھنے کے بعد کہتا ہوں کہ چھ ہزار برس کی تہذیب نے ان کو شایستگی مہمان نوازی اور دلداری کے ان تمام جوہروں سے مالا مال کر دیا ہے جو ہر اچھے تمدن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ آقائی زادہ، دکتور محمد اقبال، آقائے وزیر فرہنگ، آقائے بدیع الزماں فروزانفر، آقائے دکتر محمد معین، پروفیسر سعید نفیسی، دکتر پورداود، دکتر صفا اور دوسرے اہل علم کی عنایتوں پر غور کرتا ہوں تو میری روح "دو زانو" ہو جاتی ہے اور مجھے اداے شکر کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ آخر میں صرف یہی کہوں گا ؎

اے صبا گر بجوانان چمن باز رسی
خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

دیوبند کے مشہور دینی و علمی ماہنامہ

تجلی کا خلافت نمبر

یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع ہو رہا ہے

قیمت ایکر وپیہ

- عصر حاضر کی جمہوریت، اشتراکیت اور دیگر نظام ہائے زندگی کے مقابلہ میں اس پاکیزہ نظام خلافت کا تذکرہ جس سے بہتر نظام چشم فلک نے نہیں دیکھا۔
- خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کی سیرت و سیاست اور اسلوب حکمرانی پر تحقیقی مقالات کا گنجینہ۔
- ایڈیٹر تجلی مولانا عامر عثمانی کا مبسوط مقالہ "العثمانؓ" بھی شامل اشاعت ہے۔

آج ہی اپنے یہاں کے ایجنٹ سے اپنا پرچہ بک کرا لیجیے، براہ راست منگانا ہو تو سوا روپیہ ۱/۱ ادا سال فرمائیے۔ رجسٹرڈ منگانا ہو تو ایکر وپیہ دس آنے ۱۵/۱ منی آرڈر کریں۔

- چھ روپیہ بھیجکر سالانہ خریداری قبول کرنے والوں کو یہ نمبر اسی رقم میں مل جائے گا۔

مکتبہ تجلی، دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

کشمکش

بھوشن بزاز

بھگوان شنکر کی پوجا ابھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی اچانک نظریں کرتی کے ڈرائیور پر پڑیں' اور جھٹ سے اس نے دریافت کیا "کہو بھولے بابو کیسے آنا ہوا آپ کا؟"

"میم صاحب آپ کو بلاتی ہیں"

"بھئی کوئی خاص کام تو نہیں ہے نا"

"ان کی طبیعت خراب ہے"

"ارے بات کیا ہے آخر بھلے آدمی! صاف صاف کہتا کیوں نہیں۔ میں ابھی ابھی تو وہیں سے آیا ہوں۔ بھلی چنگی اور اچھی خاصی تو تھیں۔" بھولے بابو ڈرائیور کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی اور ایک خاص انداز سے بھولے بابو نے کہا "جی ہاں! ابھی ابھی بی بی جی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔"

"تو بابا' جانا کسی ڈاکٹر کے گھر۔ تو ڈاکٹر کو ادھر لے جانا اور میں بھی تھوڑی دیر سے آتا ہوں۔"

"بی بی جی نے کہا ہے آپ کے آنے کے بعد ہی ڈاکٹر کے بارے میں رائے مشورا کریں گے' کرپا کرکے جلد چلیے آپ"

"ہاں بابا چلتا ہوں" اور جواہر بابو کرتی کی کار میں بیٹھ کر اس کے گھر پہنچے۔ کرتی اپنے کمرے میں صوفے پر لیٹے درد بھری آواز میں کراہ رہی تھی۔ جواہر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "تو یہ ہے آپ کی دکھ بیماری ——" کرتی صوفے سے اچھل پڑی اور قہقہے لگاتے ہوئے دریافت کیا "کہیے جواہر بابو' پسند آیا آپ کو میرا گانا؟"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں؟ خوب ہی تو گاتی ہیں آپ!"

"سچ؟" کرتی نے خاطر خواہ انداز میں اس سے معلوم کرنا چاہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ گے ڈاکٹر کو بلا لاؤں"

"ارے کیسے بتادوں' جواہر بابو کہ آپ کے آتے ہی کہ بیماری بس رفو چکر ہو جاتی ہے۔"

"اوہو! تو یہ بات ہے"

"جی ہاں"

"تو لو' ہم پھر چلے اپنے گھر"

"ارے ایسا نہ کہیے جواہر بابو' بیٹھیے' ابھی تو آئے ہیں آپ"

"جی ہاں' جیسے مجھ کو کوئی کام دھندا ہی نہیں ہے۔ آج کئی روز سے ایک اسٹوری کا پلاٹ نامکمل سا پڑا ہے۔ جب کبھی اس کی طرف دھیان دینا چاہتا ہوں' ڈرائیور آدھمکتا ہے —— چلیے! بابو صاحب! آپ کو بی بی جی بلاتی ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے ——" کرتی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا' اور کہنے لگی "اگر ایسا نہ کہلواتی تو آپ کب آتے میرے گھر"

"جی ہاں' سچ ہے' میں نہ آتا' آخر مجھ کو اپنی اسٹوری بھی تو پوری کرنی ہے۔"

"ارے فکر کیوں کرتے ہو' آج نہیں کل پوری ہو ہی جائیگی"

"پوری ہو ہی جائے گی۔ شاید اسٹوری بھی مشین میں ڈھل کر نکلتی ہے۔ اجی لکھنی پڑتی ہے۔ دماغ سوزی کے بعد ہی تو اسٹوری لکھی جاتی ہے' اور جب تک اسٹوری مکمل نہ ہو پیسے کون دے گا یہیں"

"ارے تو بس اتنی سی بات" یہ کہتے ہوئے کرتی جواہر کے قریب آگئی اور ہمدردانہ لہجے میں کہا "کیسے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے آپ کو"

"مجھ کو نہیں کرتی' مجھ سے زیادہ' میری بوڑھی ماں کو ضرورت ہے۔ میری کنواری بہن کو ضرورت ہے' اور...."

"بولتے کیوں نہیں' رک گئے کیوں آپ —— اور کس کو ضرورت ہے بولیے نا؟"

"نہیں نہیں کرتی اور کسی کو ضرورت نہیں —— ہاں ہاں ضرورت ہے' اور ضرورت نہیں بھی ہے کرتی" جواہر نے بھرائی آواز میں کہا۔

"تو لو! جواہر بابو' یہ پیسے لو اور اپنی ماں بہن کے ہاں بھیج دو"

"نہیں، نہیں، کرتی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جان لے کر اپنی ماں، بہن کی بیوہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں اسٹوری لکھ کر ہی پیسے کماؤں گا، اور اپنی کمائی سے ان کی بیوہ کروں گا"

"مگر جواہر بابو۔ ان بیسوں کو بھی اپنے ہی بچے۔ کیا آپ مجھ کو غیر سمجھتے ہیں؟ بولو، جواب دو۔ چپ کیوں ہو گئے آپ ——؟"

"نہیں، نہیں، کرتی ایسا نہیں"

"تو پھر لیتے کیوں نہیں یہ پیسے"

"یہ ہرگز نہیں ہوگا، میں اپنی کمائی سے ان کی خدمت کروں گا —— اور ایسا ہی ہوگا کرتی"

"ٹھیک ہے جواہر بابو، میں آپ کو منع نہیں کرتی، مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ سے زیادہ پتا جی، آپ سے سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ جس روز آپ نے مجھکو غنڈوں کے ہات سے بچایا ہے، اس روز سے پتا جی آپ کے دل سے ممنون ہیں، اور آپ کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرنے تیار ہیں، مگر آپ ہمارے سلوک کو ہر وقت ہی ٹھکرایا کرتے ہیں ——"

"ایسا نہ کہو کرتی، ٹھکرانا کیا معنی۔ بھئی، سچ بات تو یہ ہے کہ میں کسی قسم کا بدلا لینا نہیں چاہتا"

"ٹھیک ہے، مگر میری التجاؤں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا"

"ایسا نہ کہو کرتی۔ مجھکو شرمندا کیوں کرتی ہو —— اچھا اب مجھکو اجازت دو۔ میں جاتا ہوں"

"پھر کب آئیں گے آپ؟"

"جب آپ بیمار ہوں" دونوں کے طوفانی قہقہوں سے آسمان گونج اٹھا۔

جواہر نے جب کبھی اسٹوری کی طرف دھیان دیا تو کرتی ہیروئن بن کر نظروں میں سما جاتی، مگر اپنی بیوی کے خیال کے ساتھ ہی وہ کرتی کے تصور کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا۔ اور جب بیوی کا خیال دل میں نہ ہوتا تو کرتی بھوت کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی۔ بہرحال، جواہر زندگی کی عجیب و غریب "کشمکش" سے دو چار تھا ——

کرتی کا باپ بھی جواہر کو بہت چاہنے لگا تھا، اور کسی نہ کسی بہانے وہ جواہر سے ساتھ سلوک کر ہی جاتا تھا —— اس کی بزرگی کا لحاظ کرتے جواہر کو ایک کہتے بن نہ پڑتی تھی —— ادھر جواہر کو اس بات کی فکر تھی کہ اس کی ماں، بہن اور بیوی ناقوں مرنے سے بچ رہے، اور خدا بھی اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس سلوک کے بدلے جواہر نے یہ طے کیا کہ کرتی کو اسٹوری رائٹنگ کا سبق دے —— پلاٹ کی ہیروئن کرتی ہوتی اور ہیرو، جواہر —— پلاٹ بنتا اور ٹوٹتا —— بنتا اور ٹوٹتا —— اور کبھی بھی مکمل ہونے پایا —— اس لیے کہ اسٹوری بجائے خود ایک "کشمکش" تھی۔

غزل

ابھے چرن سریواستو بیتاب

فتور ہے چار سو زمانے میں
لگ گئی آگ آشیانے میں

راز پایا ہے میں نے گیتی کا
ایک انسان کے آنے جانے میں

کامیابی زیست مضمر ہے
ضبط گرنے میں مسکرانے میں

رنج دنیا مصائب عالم
ہم نے ٹھکرا دیے ہیں مسکرانے میں

دیر و کعبہ تمہیں سلام مرا
کیا نہیں ہے شراب خانے میں

زندگی ختم ہو گئی بیتابؔ
اپنی تقدیر آزمانے میں

مینجنگ ایڈیٹر اور پبلشر جی۔ ایم۔ خان نے مطبع ابراہیمیہ۔ کلمنڈی مگزاری روڈ حیدرآباد۔ میں چھپوایا۔

U
2912

خیر خواہ

حیدرآباد دکن ۲ - آندھرا پردیش

OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD (A.P.)

ایڈیٹر - جی - ایم - خان، ایم - اے (عثمانیہ)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

رجسٹرڈ نمبر — انیچ (۱۸۴)
جلد (۲۰) — نمبر (۲)
چندا سالانا — آٹھ روپے
دے سنہ ۱۳۶۹ف — نومبر سنہ ۱۹۵۹ء

ہندستانی ادب

حیدرآباد ۲ - آندھرا پردیش
ایڈیٹر
جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	اے ادیب نکتہ داں	ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانہ زیب بریلوی	۷	نوری کرن
۳	قطعات	اختر نسیم بھاگلپوری	۸	نوری کرن
۴	مثنوی "فریاد آغ"	گوپال متل	۹	
۵	رباعیات	شفیق مینائی	۱۲	
۶	شرارے	سعید احمد	۱۳	سوویت دیس
۷	غزل	عبدالرزاق رضا	۱۵	سب رس
۸	عمر عزیز	ڈاکٹر اختر حسین	۱۶	راہنمائے صحت
۹	دیوان غالب	عارف نیازی	۱۹	جدوجہد
۱۰	غزل	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۲۳	
۱۱	دیہی بنگال کے گیت	سریش چکرورتی	۲۴	
۱۲	غزل	کندن پرشاد کندن	۲۵	رہنمائے تعلیم
۱۳	مصر سنہ ۱۹۵۶ء میں	عابد رضا بیدار	۲۶	برہان
۱۴	چشم خوں بستہ	من موہن تلخ	۳۱	صبا
۱۵	اسکو کما "ہمصر تھیٹر"	ن - نورد کیانیدزے	۳۲	سوویت خورت

ہمارے خیالات

"ہندستانی ادب" کا آوازی اصول "منادی" دلی کے تبصرے کی روشنی میں

پچھلے نمبر میں، ہم نے لکھا تھا کہ "اس سلسلے کی دوسری قسط آنے والے نمبر میں ملاحظہ ہو" ــــ لیجئے حاضر خدمت ہے، ملاحظہ فرمایئے اور غور سے ملاحظہ فرمایئے ــــ! اس رسالے پر اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے "منادی" کے قابل مبصر نے لکھا ہے ــــ

"جی۔ ام۔ خاں صاحب نے "آٹھ" کو "آٹ" لکھا ہے۔ ممکن ہے حیدرآباد میں آٹھ کو اس طرح بولتے ہوں کہ "ٹھ" کی آواز پیدا نہ ہوتی ہو۔ لیکن شمالی ہندستان والوں کے منہ سے صاف "ٹھ" کی آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے پڑھنے کو "پڑنے" لکھا ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ آٹھ کی طرح انہوں نے ھ کو خواہ مخواہ نکال دیا بلکہ اس طرح لکھنے میں یہ دشواری بھی ہوگی کہ "پڑنا" اپنی جگہ الگ ایک لفظ ہے۔ آٹھ کو "آٹ" اور پڑھنے کو "پڑنے" لکھنے سے پہلے تو علم کو "الم" بنانا چاہیے تھا۔ لیکن "ہندستانی ادب" میں علم بدستور علم ہے۔"

تبصرے کی اوپر کی عبارت میں بلکہ اس طرح لکھنے میں یہ دشواری بھی ہوگی کہ ....." کے بعد "منادی" کے کاتب کی ستم ظریفی سے کچھ حصہ اصل عبارت کا چھوٹ گیا ہے، اس لیے کہ پہلے اور بعد کے جملے میں ربط پیدا نہیں ہوتا، مگر ہم اس کے مطلب کو سمجھ گئے ہیں اور اس کی روشنی میں جواب بھی دیں گے۔

کسی چیز کو کسی شخص یا جماعت یا کسی کی ذات پر حملا یا اعتراض کرنے سے پہلے معترض یا مبصر کو چاہیے کہ وہ پہلے اس بات پر خوب خوب ہی غور کرلے کہ وہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے، اور اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟ اوٹ پٹانگ باتیں تو زبانی کہی جاتی ہیں، جن کا کوئی حوالا ہوتا ہے اور نہ ثبوت۔ ایسی باتیں ہوا برد ہو کر رہ جاتی ہیں، اس لیے بات چیت یا گفتگو میں ایسی بے لگامی کو گوارا بھی کرلیا جاتا ہے، مگر تحریر کا ہر ہر شبد ببانگ دہل کہہ رہا ہے کہ "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"۔ جس تحریر کو "ایسا دوام حاصل ہو، اس کے وجود سے کون انکار کرسکتا ہے ــــ؟ اور نہ مبصر "منادی" اپنی اس تحریر سے انکار کرسکتا ہے کہ "ممکن ہے حیدرآباد میں "آٹھ" کو اس طرح بولتے ہوں کہ "ٹھ" کی آواز پیدا نہ ہوتی ہو"۔ "ملاحظہ" فرمایا آپ نے کہ کتنا بھونڈا طنز ہے، اس اعتراض کے پردے میں ــــ یعنی حیدرآبادیوں یا دکن والوں پر چوٹ چلی ہے جناب نے! مطلب یہ کہ حیدرآبادی یا دکنی اتنے گنوار ہیں کہ انہیں ٹھیک سے بات کرنی بھی نہیں آتی اور ان میں تلفظ کے صحیح طریقے پر ادا کرنے کی صلاحیت تک نہیں! چونکے الزام حیدرآبادیوں یا دکنیوں پر آرہا ہے، اس لیے اوپر کے رکیک حملے، گہرے طنز اور مہمل چوٹ کا "دانت توڑ" جواب دینے کے لیے ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

مبصر نے جہاں یہ لکھا ہے کہ "جی۔ ام۔ خاں صاحب نے "آٹھ" کو "آٹ" لکھا ہے" آگے چل کر یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ "ممکن ہے جی۔ ام۔ خان "آٹھ" کو "آٹ" بولتے ہوں" تو بات آئی گئی ہو جاتی اور ممکن تھا کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" اس مہمل اعتراض کا جواب دے یا نہ دے، اس لیے کہ جن مسایل کو گہری نظر سے جانچے بغیر، ان پر اعتراض کردیا جائے تو ایسے اعتراض کو ہم کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور جن اعتراضوں میں کچھ معقولیت پائی جائے، ان کا ہم مناسب اور

سوزوں جواب دیتے ہیں ـــــ لیکن بعض اوقات فضول، مہمل اور بے معنی اعتراضوں کا بھی جواب دینا پڑتا ہے، جیسا کہ موجودا شکل میں اس ناگوار فرض کو ادا کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اس طنز یا چوٹ کا جواب دینے سے پہلے ہم اپنی اس عام پالیسی کا، اس نوبت پر دھرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" سارے ہندستان کی عام اور ملی جلی زبان یا بھاشا "ہندستانی" کا پرچار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شمالی ہندستان یا جنوبی ہندستان اور مشرقی ہندستان یا مغربی ہندستان کا کوئی فرق نہیں۔ ہندستان کی صوباواری زبانیں اپنی اپنی جگہ برقرار اور قایم ہیں، ہمیں ان بھاشاؤں یا زبانوں سے کوئی بحث نہیں۔ ہندی دستوری طور پر "راج بھاشا" ہے، مگر "راشٹر ابھاشا" نہیں، اس حقیقت کو سب ہی جانتے ہیں، اور "ہندستانی" راشٹر ابھاشا یا دیس بھاشا ہے، اس کھلی حقیقت کے دل سے سب ہی قایل ہیں، لیکن عملی طور پر اس کا ثبوت دیتے بہت سے لوگ جھجکتے ہیں، ممکن ہے، آج نہیں کل، یہ جھجک ضرور دور ہو جاے گی، اور ہماری طرح سارا ہندستان صرف "ہندستانی" ہی کو دیس بھاشا مان لے اور اس پر سچے دل سے عمل بھی کرنے لگے۔

ہاں تو دیکھ لیا جناب آپ نے! کہ ہم کس وسیع نظر سے کے قایل ہیں، اس لحاظ سے شمالی اور جنوبی ہندستان کا فرق یا ایسے مکروہ مسایل سے بحث، ہم کسی طرح بھی روا نہیں رکھ سکتے، اور خصوصاً اس ترقی پاے اور روشن دور میں جو کوئی بھی ایسے مسایل کو چھیڑے تو ہم اس کو مجذوب کی بڑ یا ایک پاگل اور دیوانے کی بکواس سے زیادا اہمیت نہیں دیتے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اعتراض صرف ہماری حد تک ہوتا تو ممکن تھا اس کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا، مگر سوال تو بیچارے حیدرابادیوں یا دکنیوں کی جہالت کا ہے کہ جنہیں ٹھیک سے "ٹھ" کی آواز بھی ادا کرنی نہیں آتی، حالانکہ صورت حال حقیقت کے خلاف ہے، کہ وہ "ٹھ" کی آواز شمالی ہندستان والوں سے بہتر طریقے پر ادا کرتے ہیں، اور انہیں تو اپنی زباندانی پر ناز ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہندستانی شاعری کے باوا آدم، ولی دکنی ہی نے تو شمالی ہندستان والوں کو شعر کہنا سکھایا۔ ولی دکنی کے شعر سن کر شمالی ہندستان والوں کو بڑا اچنبا سا ہوا۔ ولی دکنی نے انہیں شعر کہنے کا رنگ ڈھنگ بتایا۔ دوسرے معنی میں شمالی ہندستان کے شاعروں نے ولی دکنی کے آگے زانوے ادب تہہ کیا، اور دکن کا مایۂ ناز شاعر شمالی ہندستان کے شاعروں کا استاد قرار پایا۔ چونکہ زبان کی سند اشعار ہی سے لی جاتی ہے، اس لیے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ولی دکنی نے شمالی ہندستان والوں کو نہ صرف شعر کہنا سکھایا، بلکہ دوسرے شبدوں میں انہیں زبان بھی سکھائی ہے۔ اس لحاظ سے جنوبی ہندستان والوں کو آج تک بھی اس بات پر فخر اور ناز ہے کہ انہوں نے شمالی ہندستان والوں کو زبان سکھائی ہے، ایسی صورت میں، ان کی زبان دانی کا کیسے مذاق اڑایا جا سکتا ہے ـــــ؟ اور اپنی زبان دانی کی آڑ لے کر، ان کی عدم زبان دانی کی جہالت کا کیونکر تمسخر کیا جا سکتا ہے ـــــ؟ مثل مشہور ہے کہ "چاہ کن را چاہ در پیش"۔ کسی کی زبان دانی کی چاہ کنی کرنے سے پہلے "جواب تلخ" کے "در پیش" چاہ، کا بھی خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ہم چونکے "صلح کل" پالیسی کے قایل ہیں، اس لیے ہم نے اس مہمل طنز کا "عشر عشیر" جواب بھی نہیں دیا، ممکن ہے، حیدرابادی یا دکنی اس کا سو فی صد "دندان شکن" جواب، آپ کو دے سکیں ـــــ!

اپنی بیس سالا علمی ادبی اور لسانی خدمات کے طویل دور میں "ہندستانی ادب" نے ایک سے زیادا مرتبا اس مہمل اور بے معنی نظریے پر لکھا ہے کہ شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان کے فرق کو مٹا دو، یہ بیکار باتیں داستان پارینہ بن گئی ہیں، ان کو بالکل ہی بھلا دو، ہمارا ہندستان

ایک ہے، اس کی زبان ایک ہے، اس سے ہماری مراد علی زبان ہے، لکھنے کی زبان ہے، تحریر کی زبان ہے نہ کہ بولنے کی زبان۔ بولنے کی زبان "بولی" کہلاتی ہے۔ ہر مقام اور ہر علاقے کی بولی میں فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق بھی اب کم ہوا جاتا ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں کہ موجودہ دور میں جانے آنے کی سہولتیں آئے دن بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں، اور ایک دوسرے صوبے والوں میں میل جول بڑھتا ہی جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ نہایت ہی سرعت اور تیزی کے ساتھ ایک عام اور ملی جلی "بولی" بھی بنتی جارہی ہے، اور یہ ہے "ہندستانی بولی" اور اسی کی ادبی خراد پر تراشی ہوئی شکل کا دوسرا نام "ہندستانی زبان" یا بھاشا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ شمالی یا جنوبی ہندستان کا فرق کہاں باقی رہا، اس ترقی پائے دور میں تو سوال سارے ہندستان کا ہے، اور سارے ہندستان کی عام اور ملی جلی زبان کا بننا ایک ناگزیر سا عمل ہے۔ اور یہ عمل جاری ہے، اور ترقی کے منازل طے کرتا جارہا ہے۔ اس لیے ایسے ترقی پائے دور میں شمالی اور جنوبی ہندستان کی بحث چھیڑنا، بے سر راگ الاپنے کے برابر ہے۔

"مشاعرہ" کے ناداں مبصر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم "پڑھنا" کو "پڑنا" جو لکھتے ہیں تو اس پر سناوے فی صدی حیدرآبادی یا دکنی ہی اعتراض کرتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" کے ایڈیٹر کو ٹھیک سے لکھنا تک نہیں آتا، اور باقی ہندستان سے کبھی کبھار، اعتراض کی ایک آدھ کمزور آواز سنائی دیتی ہے، جیسا کہ زیر بحث تبصرے کا بے معنی اعتراض۔ ہمارے اس بیان سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہندستان والوں کی نسبت، جنوبی ہندستان والے، زبان کے مسایل سے زیادہ باخبر اور بہتر زبان داں ہیں۔ یہ تو رہیں شمالی اور جنوبی ہندستان والوں کی جھگڑالو باتیں، جن سے ہمیں قطعاً کوئی لگاؤ یا واسطہ نہیں۔ ہمارا نعرا ان دونوں سے الگ ہے، چنانچہ ہمارا یہ کہنا ہے کہ زبان کے مسئلے میں یہ دونوں بھی غلطی پر ہیں۔ یہ دونوں واقعی زیادتی پر ہیں، اور بڑی حد تک ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ ان دونوں کی ضد نے زبان کو ترقی کے منازل طے کرنے سے روک رکھا ہے۔ اگر یہ لوگ آوازی یا صوتی اصول کا مذاق نہ اڑائیں، بلکہ اس پر نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور ٹھنڈے دل سے دھیان دیں تو زبان بہت جلد اور نہایت ہی تیزی کے ساتھ ترقی کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر "آٹھ" اور "پڑھنا" ہی کو لیجے۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ "ٹھ" اور "ھ" کی آواز نکلتی ہے، حالانکہ یہ دونوں بھی غلطی پر ہیں۔ عام بول چال اور روانی کے ساتھ بات چیت میں دونوں ہی شکلوں میں "ٹھ" کی آواز ہرگز ہرگز نہیں نکلتی، اس کا ثبوت چاہو تو ان دعویداروں کی بات چیت کو انجانے طریقے پر ریکارڈ کر لیا جائے، اور پھر وہی آواز انہیں سنائی جائے۔ "آوازی" یا "فونیٹک" تجزیے کے تحت "ھ" کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ یہ ایک مہمل سا دعوا ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے، اور اس غلط بیانی کے مرض میں شمالی اور جنوبی ہندستان والے، دونوں ہی مبتلا ہیں۔

مبصر نے آگے چل کر ایک اور بھی اعتراض کیا ہے، یعنی یہ کہ "آٹھ" کو "آٹ" اور "پڑھنے" کو "پڑنے" لکھنے سے پہلے تو علم کو "الم" بنانا چاہیے تھا، لیکن "ہندستانی ادب" میں علم بدستور ہے۔ ناداں مبصر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ "ہندستانی ادب" کی پالیسی "تحریری" ہے، نہ کہ "تخریبی" یعنی یہ رسالا زبان کو بنانا اور سنوارنا چاہتا ہے نہ کہ بگاڑنا اور تباہ کرنا۔ اس کے پیش نظر زبان کی ہر جہتی ترقی ہے۔ اسی طرح وہ الفاظ کے ذخیرے کو بڑھانا چاہتا ہے، نہ کہ کم کرنا، اس کے آوازی اصول میں سنجیدگی اور غور و فکر کو دخل ہے "علم" اور "الم" والا اعتراض تو بلکل ہی مہمل سا ہے۔

یہ بلکل ایسی ہی حجت ہے، جیسے ت ۔ س ۔ ص کے تمام الفاظ کو صرف س، سے لکھا جائے، یا ز ۔ ض ۔ ظ کے تمام خبدوں کو صرف ز سے لکھا جائے، اور ح ۔ ہ کے تمام الفاظ صرف ہ سے لکھے جائیں ۔ اس تحریک کے علمبردار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر رشید محمود، اور ڈاکٹر جافر حسین (جعفر حسین) ہیں ۔ "جافر حسین" ہم نے اپنے طور پر نہیں لکھا ہے، بلکہ خود ڈاکٹر موصوف مضامین کیساتھ اپنا نام اسی طریقے پر لکھتے ہیں ۔

عوض فرمایا آپ نے کہ یہ تحریک زبان کو اجاگر کرنے والی نہیں، بلکہ تباہ اور برباد کرنے والی ہے ۔ زبان بلکل ہی سکیڑ کر رہ جائے گی ۔ زبان کی ترقی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے ۔ میمبر "منادی" کا "علم" اور "الم" والا بے معنی مشورا بھی اسی قسم کا ہے، جو زبان کی ترقی میں ایک روڑا ثابت ہو سکتا ہے، اور ہمارا عمل زبان کی ترقی کا ضامن ہے ۔

ہمارے آوازی یا صوتی اصول بلکل ہی سیدے سادے اور آسان ہیں ۔ ان اصولوں کا مقصد یہ ہے کہ الفاظ کی آوازیں جس طرح پیدا ہوتی ہیں، اسی طریقے پر انہیں لکھا بھی جائے، مگر چند ایک استثنائی صورتوں کے ساتھ ۔ مثال کے طور پر "علم" ہی کو لیجیے کہ اس کی آواز "الم" کی نکلتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم "علم" کو "علم" ہی جائز رکھتے ہیں، اس لیے کہ "علم" کے معنی جھنڈے کے ہیں، اور "الم" کے معنی رنج یا غم کے ۔ اگر ہم دونوں لفظوں کی املا ایک ہی طریقے پر لکھیں تو پھر لفظ کا دوسرا مفہوم یا الگ معنی باقی نہ رہیں گے ۔ ایسی صورت میں زبان کو ترقی دینے کا مقصد فوت ہو جائے گا، اور اس طریقے پر الفاظ کا ذخیرہ گھٹتا چلا جائے گا جو ہماری بنیادی پالیسی کے خلاف ہے ۔ غالب یہی وجہ ہے کہ آخر میں میمبر "منادی" نے ان سطروں میں ہمارے اس زرین اصول کی تائید اور تعریف بھی کی ہے ——

"بہرحال "ہندستانی ادب" نے ایک اہم تحریک میں حصہ لیا ہے ۔ امید ہے اس کو دیکھ کر اردو دانوں کو اس طرف توجہ ہو گی ۔ اور سنجیدگی سے اس اہم مسئلے پر غور کیا جائے گا ۔"

وکیل لوگ جو ہم سے یہ دریافت کرتے آئے ہیں کہ ہماری اس تحریک کی آج تک کسی نے تائید بھی کی ہے، یا صرف ہم ہی لکھتے آئے ہیں، تو ان لوگوں کے لیے اوپر کی تائید کہ "ہندستانی ادب" نے ایک اہم تحریک میں حصا لیا ہے ..... سنجیدگی سے اس اہم مسئلے پر غور کیا جائے گا" ایک طمانچے سے کم نہیں ۔ کم سے کم اب انہیں اس سنہرے مشورے پر عمل کرنا چاہیے ۔ اس کے علاوا، جیسا کہ ہم نے پچھلے نمبر میں حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کا قول نقل کیا تھا کہ زبان کی ترقی کے لیے صوتی اصول کا اختیار کیا جانا ضروری ہے —— معترضین کے لیے واقعی غور و فکر کا باعث بن جاتا ہے، بشرطیکہ وہ حسن نظامی جیسے بلند پایا ادیب کے بیان کو اہمیت دیں!

محض مخالفت کی خاطر مخالفت کرنا، نہایت ہی آسان کام ہے ۔ یہ تعمیری نہیں تخریبی پہلو ہے ۔ تخریب بری چیز ہے، اس سے سوائے نقصان کے، فائدے کی ہرگز ہرگز آشا نہیں کی جا سکتی ۔ یہ جذبا نہایت ہی ناپاک اور برا ہے، اس لیے ہمارا یہ مفید مشورا ہے کہ اس کو دل اور دماغ کی گہرائیوں سے نکال پھینکو —— اپنے دل سے کدورت کے داغ کو دور کر دو، اور دل کو آئینا سا بنا لو ۔ تعمیری فہن پیدا کرو، ترقی کے نیک اور مفید جذبے کے ساتھ قدم آگے بڑھاؤ، اور کام کرنے کی نیت سے ہات ملاؤ —— کام بن کر رہے گا، اور ہم دونوں کا مقصد پورا ہو گا ۔ آپ اور ہم دونوں بھی زبان کی ترقی اور بھلائی چاہتے ہیں، دیکھو، سوچو اور غور کرو کہ زبان کی بہتری بھلائی اور ترقی کا صحیح اور سیدا رستا کونسا ہے —— ؟

مختصر یہ کہ "ہندستانی ادب" پر بلا وجہ بھی کیچڑ اچھالنے والوں، اور اس کے مفید زبان زرین آوازی اصول کا مذاق اڑانے والوں کو ہمارا یہ کھلا چیلنج ہے کہ پہلے تعصب کی عینک اتار پھینکو اور اس کے بعد صدق دل سے حقیقت کی عینک لگا کر معاصر "منادی" دلی کے تبصرے کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھو، تو ہر بار، اعتراضی پلڑے کی نسبت آوازی اصول کا تائیدی اور تعریفی پلڑا ہی جھکتا نظر آئے گا۔ مبصر کی یہ تعریف اور توصیف نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اس کے شبدوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صوتی اصول کی پوری پوری تائید کر رہا ہے، اور دنیا لسانیات کو اس اہم مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ خود بھی یہ محسوس کر رہا ہے کہ موجودہ دور میں کٹھن اور پیچیدہ زبان چلنے چلانے والی نہیں، جہاں تک ممکن ہو سکے اس کو آسان اور سہل بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ "ہندستانی" زبان کو آسان بنانے کے چند ایک موٹے موٹے اصول یہ ہیں کہ سنسکرت، فارسی اور عربی کے نامانوس شبدوں سے پرہیز کیا جائے۔ عبارت آسان طریقے پر لکھی جائے اور جملے چھوٹے چھوٹے استعمال کیے جائیں، اور یہ کہ الفاظ کو آوازی یا صوتی اصول پر لکھا جائے۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کے بعد ہندستانی بھاشا یا زبان نہایت ہی آسان بن جائے گی، اور جتنا اس کو آسانی کے ساتھ اپنا سکے گی۔ انہیں چند ایک زرین اصولوں میں زبان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے، اور یہ راز ایک کھلی حقیقت کی شکل میں دعوت عمل دے رہا ہے۔ اس دعوت کو قبول کرنا زبان کے حقیقی ہمدردوں اور صاحبان عقل و فراست کا کام ہے۔ ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، اس سے قطعاً کسی فرد یا جماعت کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ کھری کھری باتیں سنائی ہیں، تاکہ ان لوگوں پر اس کا اثر ہو، جو زبان کے خادم اور سیوک ہونے کے دعویدار ہیں۔

ماجد ادیب بریلوی مرحوم

ہم نے پچھلے نمبر میں معاصر "دین دنیا" کے حوالے سے ماجد ادیب بریلوی کی موت کی خبر دی تھی۔ ہم نے بریلی لکھ کر اس خبر کی تصدیق بھی کر لی، اور بریلی کے ماہوار رسالے "نوری کرن" سے تو اس کی سو فی صد تصدیق ہو گئی۔ ماجد ادیب بریلوی کے نام کے ساتھ "مرحوم" کے ناگوار لفظ کا اضافہ کرتے ہمارا قلم ورلرزتا" رہا ہے۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہمارا ایک پرخلوص ساتھی ہم سے واقعی بچھڑ گیا ہے۔

اس دلخراش خبر کے پانے تک ہم ماجد ادیب کو اپنے ہی میں سمجھ رہے تھے۔ ہم، اپنے ماجد کو خط لکھنے والے تھے کہ کہو بھائی ہم سے روٹھ تو نہیں گئے ماجد۔ بہت عرصے سے لکھا نہیں آپ نے، ہم سے خفا ہو تو کوئی بات نہیں، مگر اپنے "ہندستانی ادب" کو نہ بھلانا۔ افسوس! صد افسوس! ہمیں کب معلوم تھا کہ ہمارا پیارا بھائی، نوجوان ماجد اور ہر دلعزیز شاعر ماجد ادیب واقعی ہم سے خفا ہو گیا ہے، حقیقت میں، ہم سے روٹھ گیا ہے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے عزیز رسالے "ہندستانی ادب" کو بھی بھلا گیا ہے! ضعیف ماں باپ کو داغ مفارقت دے گیا، جوان بیوی کو زندگی بھر تڑپنے کے لیے، عزیز اقربا کو آنسو بہانے، دوستوں کو رنج و غم سہنے، اور احباب کو سدا ماتم اور واویلا کرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ سچ ہے اور بالکل سچ ہے۔

"آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں"

اس نمبر میں، ہم معاصر "نوری کرن" سے ماجد ادیب مرحوم سے متعلق ایک نوحہ اور چند قطعات دے رہے ہیں، آنیوالے نمبروں میں بھی مرحوم کے تعلق سے نظم و نثر کے مضامین پیش کرتے رہیں گے۔ اہل قلم حضرات سے ہماری پر زور اپیل ہے کہ وہ ماجد ادیب مرحوم کے بارے میں جو بھی لکھیں، راست ہمارے نام بھیجیں۔ ماجد ادیب کے تعلق

دے ۱۳۶۹ف ہندستانی ادب نومبر ۱۹۵۹ء

اے حریفِ نکتہ داں

ڈاکٹر ماتا پرشاد اشتہانہ
زیبؔ بریلوی

عالمِ ارض و سماء اے خالقِ ذات و صفات
مالکِ کونین اے پروردگارِ کائنات
ایسے ماہر کا جو بانی تھا نئے پیغام کا
دور میں شعر و ادب کا جام و پیمانہ ... نہیں
آج قندیلِ وطن پر کوئی پروانہ نہیں
اٹھ گیا وہ شاعرِ ہندوستاں وہ آدمی
وہ مسلسل کاوشیں وہ خدمتیں ماجد ادیبؔ
وہ سلیقے وہ زباں کی صحبتیں ماجد ادیبؔ
تیرے اٹھ جانے سے بزمِ نغز و فن خاموش ہے
تیرے پیغامات ہیں کون و مکاں کے واسطے
تو نے قربانی بھی دی اردو زباں کے واسطے
اے ادیبِ باخبر اے شاعرِ انسانیت
سب عزیز و اقربا کو آج یہ افسوس ہے
صبح گلشن میں صبا کو آج یہ افسوس ہے
راہِ ہستی میں یقیناً سنگِ تھا تیرے لیے
بھائیوں کے خونِ ناحق کی یقیناً تھی خبر
کعبۂ حب وطن میں امن کے پیغام ہیں
اے ادیبِ نکتہ داں اے شاعرِ عرفانیت
کس طرح ہو پائے گی تنظیمِ بابِ شاعری
کون چھلکائے گا اب جامِ شرابِ شاعری
ہو کے محرمِ شاعری کے خواب کی تعبیر کا
وہ مفکر، وہ مبصر، عارفِ وحدانیت
وہ مدبر، وہ مقرر، ماہرِ ... عرفانیت
دسترس جس کو زباں پر تھی ادب پر تھا عبور
ربطِ احساس پر بے ساختہ ..... گاتا رہا
جو حوادث سے مسلسل دوست ٹکراتا رہا
فیضِ قدرت سے ملی تھی آگہی جس کے لیے

اے امیرِ ہر دو عالم صدرِ بزمِ ممکنات
کاش بڑھ جاتا میرے ماجد کا دامانِ حیات
ایسے شاعر کا جو حامی تھا ترے اسلام کا
لکھنے والا اب کوئی انسان کا افسانہ نہیں
ہائے لیلائے ادب کا کوئی دیوانہ نہیں!
جس کے دم سے تھی بریلی کے ادب میں زندگی
وہ اضافے وہ ادب میں جدتیں ماجد ادیبؔ
کیسے بھولی جائیں گی وہ صحبتیں ماجد ادیبؔ
انجمن خاموش، ساز انجمن خاموش ہے
دے گیا تو داغ اہلِ گلستاں کے واسطے
وقف تھا تو خدمتِ ہندوستاں کے واسطے
رو رہی ہے سوگ میں بیٹھی عروسِ شعریت
مجمعِ اہلِ عزا کو آج یہ افسوس ہے
شامِ غم اہلِ وفا کو آج یہ افسوس ہے
دامنِ ہستی نہایت تنگ تھا تیرے لیے
اختلافِ مذہب و ملت پہ تیری تھی نظر
تھے نظر میں تیری ایوانِ ادب کے بام و در
تیرے ہر احساس میں رقصاں تھا حسنِ ادبیت
کون کھولے گا بریلی میں کتابِ شاعری
کون چھیڑے گا بریلی میں ربابِ شاعری
چل دیا پیغام دے کر شعر کی تعمیر کا
وہ علمبردارِ آزادی و شانِ حریت
شاعرِ انسانیت وہ شاعرِ انسانیت
ہو گیا رخصت ہمیشہ کو وہ ہم سے ذی شعور
خدمتِ قوم و وطن میں کام جو ..... آتا رہا
وہ ستارا آسمانِ زیست سے جاتا رہا
تھی میسر زندگی میں ہر خوشی جس کے لیے

اس کے اٹھ جانے کا محفل کو بہت احساس ہے
اس کے چھٹ جانے کا ساحل کو بہت احساس ہے
وہ مدبر، بزم فن غم کوش ہے جس کے بغیر
سینۂ اہل ادب میں غم رہے گا مدتوں!
حلقۂ احباب میں ماتم رہے گا مدتوں!
تیرے اخلاق وفا نے کی ہے تعمیر خلوص
روشنی راہ وفا میں ہائے دکھلائے گا کون
محفل احباب کو اب رنگ پر لائے گا کون
تیرے مٹ جانے سے خالی ہو گئی سب انجمن
مٹ نہیں سکتا بزم شعر و فن سے تیرا نام
ذی ادب سنتے رہیں گے حشر تک تیرا پیام
مانتا ہوں بات تو دنیا سے گزر سکتا نہیں
رخصت اے مینا و ساغر رخصت اے جام و سبو
رخصت اے جان سخن رخصت ادیب لاجواب
السلام اے متفق من السلام و السلام

اس کے کھو جانے کا منزل کو بہت احساس ہے
اس کے مر جانے کا ہر دل کو بہت احساس ہے
وہ مفکر، انجمن خاموش ہے جس کے بغیر
تیرا مرہون کرم عالم رہے گا مدتوں
تیرا احساس وفا پیہم رہے گا مدتوں
نقش ہے سینے میں اب تک تیری تصویر خلوص
زندگی بزم طرب میں آج برسائے گا کون
داستان عہد رفتہ زیب دہرائے گا کون
تیرے اٹھ جانے سے سونی ہو گئی بزم سخن
زندگی بخشے گا تجھ کو تا ابد تیرا... کلام
الوداع اے دوست من تسلیم کر میرا سلام
زندۂ جاوید ہے شاعر ہے مر سکتا نہیں
رخصت اے حسن وفا، جوش وفا عہد شباب
رخصت اے ماہ ادب رخصت ادب کے آفتاب
جنت الفردوس میں تجھ کو ملے اعلیٰ مقام

قطعات

اختر نسیم بھاگلپوری

وہ مفکر وہ مدبر وہ شہنشاہ سخن
چل دیا سوئے عدم دنیا سے ناطہ توڑ کر
بے نیاز ہو کر غم مضراب بے ہنگام سے
دوستوں کے طعنہ و تشنیع سے آنکھیں پھیر کر
ہے اندھیرا ہی اندھیرا دور کوسوں دور تک
قبر کے گوشے میں ہے آسودۂ خواب عدم
وہ ادیب نکتہ داں وہ ناصر دین متیں
پیکر انسانیت مہر و محبت کا امام
زندہ باد اے فخر قوم اے نازش ہندوستاں
قابل تقلید ہیں تیرے نظریات حسیں

جس کے دم سے تھی بہار بزم شعر و شاعری
اب کرے گا کون تفسیر کتاب زندگی
ساز فن پر وہ ہمہ دم گیت گاتا ہی رہا
ربط فکر و نظر پیہم بجاتا ہی رہا
کون اب تم کردہ راہوں کو دکھائے گا چراغ
آہ! جو تھا رونق بزم سخن عالی دماغ
جس نے انساں کو سکھایا آدمیت کا چلن
ہم سے رخصت ہو گیا صد حیف در چشم زدن
زندہ باد اے فخر قوم اے شاعر شیریں بیاں
زندہ باد اے فخر ارباب سخن اردو زباں

مثنوی "فریاد داغ"

گوپال متل

ہندستانی زبان کے مشہور ناقد مرحوم عبدالقادر نے مثنوی "فریاد داغ" کے متعلق کہا ہے کہ "اگرچہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔"

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اگرچہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں ملتی ہیں اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں" لیکن یہ انہیں بھی تسلیم ہے کہ "اس مثنوی کے بہت اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی، روانی اور بے ساختگی ان کی قابل داد ہے۔"

"فریاد داغ" داغ کے اپنے واردات قلبی کا بیان ہے۔ یہ ان کی اپنی حیات معاشقانہ کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ "مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو ابتک میرے رگ و ریشہ میں سمائے ہوئے ہیں۔ ایک منی بائی حجاب کا دوسرا خواجہ معین الدین چشتی کا۔" "فریاد داغ" منی بائی حجاب کے عشق کا بیان ہے جو کلکتہ کی ایک مشہور طوائف تھی اور جس سے ان کی ملاقات قیام رام پور کے دوران میں بے نظیر کے میلے میں ہوئی، لیکن صرف یہی بات ہے کہ داغ نے اس عشق کا ذکر خواجہ معین الدین چشتی کے عشق کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا ثبوت ہے کہ انہیں اس عشق پر کوئی ندامت نہیں تھی بلکہ ناز تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو تعیش کی جو تصویریں نظر آئیں وہ غالباً اس تصور کا نتیجہ ہیں کہ شاعر کا عشق لازمی طور پر افلاطونی ہوتا ہے۔

داغ افلاطونی عشق کے قایل نہیں تھے جسم کے تقاضوں پر انہیں کوئی ندامت نہیں تھی اور وہ عشق کو تفریح کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے، لیکن عشق کو ذریعۂ تفریح اور جسم کا تقاضا سمجھنے کے باوجود ان کا تصور عشق اخلاص و وفا سے محروم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو عشق کے یہ تینوں پہلوان کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے۔

سب نے کی ہیں برائیاں اس کی
میں نے دیکھیں بھلائیاں اس کی

دل بنا ہے اس مزے کے لئے
ہیں یہ لطف بیاں جان کے لئے

شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو تکے ہیں ان کا کام نہیں

عشق سے دل گداز ہوتا ہے
ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے

عشق سے آدمیت آتی ہے
آدمی کو مروت آتی ہے

عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو
اس سے توبہ کرے تو کافر ہو

جو عشق اس قسم کے جذبات پیدا کرسکے اس کی صداقت سے صرف اس بنا پر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موضوع عشق ایک طوائف ہے، کیونکہ اہم بات بقول نیاز فتحپوری یہ نہیں کہ "عشق کس سے کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ کیسے کیا جائے" اور پھر غالب بھی تو کہہ گئے ہیں ؎

مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

"فریاد داغ" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے یا اپنے محبوب کے چہرے پر کوئی مصنوعی نقاب نہیں ڈالی بلکہ اپنے اس نے صاف طور پر بتادیا ہے کہ یہ اس کا پہلا اور ناگہانی عشق نہیں تھا اور وہ تجربہ کار عاشق تھا۔ عشق کی ابتدا کے باب میں کہتے ہیں۔

دل ستایا ہوا ہزاروں کا
داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

خوب تکلیف عشق پائے ہو
بیوفاؤں کے داغ اٹھائے ہو

لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب اس نئی آفت جان سے سامنا ہوا تو شاعر عشق و عاشقی سے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔

توبہ کرلی پیام سے میں نے
ہاتھ اٹھایا سلام سے میں نے

اس پیام و سلام سے نفرت
تھی محبت کے نام سے نفرت

گو طبیعت تو گدگدائی تھی | پر کسی سے نہ میل کھاتی تھی

اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، کیونکہ جب داغ کو یہ حادثہ پیش آیا تو ان کی عمر بارہ سال کی تھی اور انہیں اعصابی امراض نے بھی گھیر رکھا تھا۔

داغ کا یہ بھی احساس تھا کہ ان کی شکل میں ایسی کوئی کشش نہیں جو ان کے محبوب کو ان کی طرف راغب کر سکے، عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت کے باب میں وہ حجاب سے اپنے تعلق کہلواتے ہیں۔

ایسی صورت پہ یہ دماغ تو ہو | خوب رکھا ہے نام داغ ترا
حسن ہوتا ہے حاصل تصویر | رو سیہ تو ہے قابل تصویر
ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے | پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے
تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کیلئے | رکھ لیا ہے نظر گذر کیلئے

لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود داغ کو اپنی طبیعت پر ناز تھا، اور ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری آڑے آجائے گی اس باب میں مجوبا سے کہلواتے ہیں۔

نہ کہیں گے کہ صورت اچھی ہے | ہاں مگر کچھ طبیعت اچھی ہے

پھر داغ کو یہ بھی احساس تھا کہ جس آفت جہان سے انہیں پالا پڑا ہے وہ کوئی سادہ دل عورت نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کائیاں اور معاملہ فہم ہے۔ یہ نہیں بلکہ صیاد۔ معشوقہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

بجھ دبھے آفت، غضب تم اشوخ خراش | کبھی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
کبھی رہے سے اپنے ڈرا جانا | کبھی کچھ بانکپن بھی کر جانا
ہر کسی کو نظر میں رکھ لینا | خوب کھوٹا کھرا پرکھ لینا
نرم باتیں کبھی ترا کت سے | گرم فقرے کبھی شرارت سے
مفت دل لے کے نقد جان لینا | باتوں باتوں میں امتحان لینا
سادگی میں یہ اوٹیں کیا کیا | اکڑی اکڑی لگاوٹیں کیا کیا
ہر کسی سے اک التفات کی بات | وظع کا وظع اور مدارات کی بات
سو اگر میں کسی سے کام نہیں | پر کوئی شاکی کلام نہیں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام پرکاری کے باوجود داغ کی کوئی ادا اسے ضرور بھا گئی تھی لہذا اس کے لیے اس کے لیے انہیں یہ یقین دلانا ضروری ہو گیا۔

ہم کو کچھ آرزوے مال نہیں | اس کا واللہ کچھ خیال نہیں
زر سے معمور ہے ہمارا شہر | کونا دوسرا ہے ایسا شہر
ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے | آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا | داغ سا آدمی نہیں ملتا

یہ ساری باتیں کتنے ہی رسمی اور پٹیا ورانا انداز میں کہی گئی ہوں، لیکن داغ کو ان پر اعتبار تھا اور بقول میر تقی میر ع یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

حجاب رام پور میں قیام کے بعد اور انہیں یہ یقین دلانے کے بعد کہ ؎

دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں
اس قدر دور رام پور نہیں

کلکتہ واپس چلی گئی تو داغ کا ہرائی میں برا حال ہوا اور ان کے اپنے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ حال ایک واقعی عاشق سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس بیان میں انہوں نے خالص شاعری کی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں اگر کوئی مہمان بھی آیا تو انہوں نے اسے حجاب کا پیامبر ہی سمجھا۔ سنیے!

کوئی مہمان جو میرے گھر آیا | میں نے جانا پیامبر آیا
لبیں ہلائیں ہزار باتیں نے | دیں دعائیں ہزار باتیں نے
اس کو باتوں میں کھو لتا تھا میں | خط کا مضمون ٹٹولتا تھا میں
کبھی پیتا تھا پاؤں دھو دھو کر | کبھی ہنستا تھا خوب رو رو کر
کبھی قرعہ جو اس کے گرتا تھا | کبھی گردا اس کے پھرتا تھا

لیکن اس تمام اضطراب کے باوجود حقائق پسندی نے داغ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور اپنے محبوب کا ہر جائی پن ان کی نظر میں رہا۔ کہتے ہیں۔

غیر یار پر جھکتا تھا میں | حال اغیار پوچھتا تھا میں
رنگ کیا ہے ایسا دار وں کا | ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا
کون ہے منتظر پر غماز ہے | کس سے دن رات گرم ساز ہے
سنتے ہیں انسان عم کہتے ہیں | یاد آتے ہیں ان کو ہم کہ نہیں
کس سے ہر وقت ہم کلامی ہے | کون سرکار کو سلامی ہے

داغ تگڑی تو تھے ہی جب ان سے ہجو برداشت نہ ہوسکا تو جہاں کو دوبارہ رام پور بلانے کی سوجھی، اور اسے بے نظیر کے میلے کا اسطادیا۔

کچھ رہو رام پور میں آکر — لطف اٹھاؤ حضور میں آکر
پر یہ ہے شرط آکر میلے میں — پھنس نہ جانا کسی جھمیلے میں

جہاں آئی اور بقول داغ۔

جا کے عہد شباب کا آنا — تھا دوبارہ جہاں کا آنا
بزم میں شمع انجمن آئی — یا بہار گل چمن آئی
میں نے پایا ہے اپنے دلبر کو — آب حیواں ملا سکندر کو

معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کو داغ سے تلی ضرور، لیکن بے حجاب ہو کر نہیں۔

آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ — ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ
وہم بھی بے قیاس تھا ان کو — پاس والوں کا پاس تھا ان کو

جہاں اس مرتبہ رام پور میں دو مہینے رہی، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں اپنی تمام تجربہ کاریوں کے باوجود داغ اس کی برہمی مزاج کا باعث بن گئے اس شکایت نے یہ قباحت کی — کہ بڑھیں بختیں قیامت کی
اپنے حق میں یہ زہر گھول لیا — لمحے دے دے کے رنج مول لیا
کیا زمانے نے رنگ بدلا ہے — ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

جہاں کلکتا لوٹ گئی مگر جاتے جاتے اسے داغ کی حالت پر رحم آگیا اور وہ انہیں یہ تسلی دے گئی ؎

صبر کا پھل ضرور پاؤ گے — اس کی راحت ضرور اٹھاؤ گے

کلکتا کو جہاں کی واپسی کے بعد داغ کا اضطراب پھر بڑھا، اور ادھر اس ستم پیشا کو امتحان لینے کی سوجھی، اس نے انہیں کلکتا بلوا بھیجا۔ داغ کا اپنا بیان ہے کہ یہ چال اسے رقیبوں نے سجھائی تھی۔

ہوئے دس بیس رخنہ گو پیدا — کئے سو فتنے لاکھ شر پیدا
بنے اس کے مشیر وہ انساں — آئے جن کے فریب میں شیطان
یہ لگایا بلاؤ تو ان کو — تم کبھی آزماؤ تو ان کو
کتنے پانی میں ذرا دیکھو — وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو

تم نے دیکھا کیا ہے زمانے کا — داغ ہے جا بجا زمانے کا
یہ ہے کیا بات سوچئے اس کو — منہ لگایا ہے آپ نے کس کو

یہاں لگائی بجھائی کام آگئی اور داغ کے نام بلاوا آگیا۔

یاد ہے قول اس زمانے کا — تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا
کس سے مل کر خوشی میں بھول گئے — تم یکایک جو ہم کو بھول گئے
لوگ کہتے ہیں وہ مڑ پتے ہیں — ایسے ہوتے ہیں جو تڑپتے ہیں
چین سے اپنے گھر میں بستے ہو — بزم والا گھر میں رہتے ہو
رسم الفت نباہتے ہو اگر — جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اٹھ کر سیدھے ادھر چلے آؤ — کوئی روکے مگر چلے آؤ
ریل میں آنی دو رآنا کیا — کار سرکار کا بہانہ کیا
ہم بلائیں نہ آئیں آپ خوش — اور اس پر رہے ملائیں خوش
دلبروں سے دغا نہیں کرتے — ایسا اہل وفا نہیں کرتے

یہاں خط ملا تو داغ کشمکش میں پڑ گئے۔ ایک طرف عشق تھا اور دوسری طرف ملازمت۔ داغ کی یہ ادا قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنی اس کشمکش کو چھپایا نہیں۔

نامۂ دلنواز جب آیا — میں نے سوچا یہ کیا غضب آیا
دل تو کہتا تھا سر کے بل چلئے — جس طرح ہو سکے نکل چلئے
لیکن ——
کار سرکار نے جو آگھیرا — قدم اٹھ اٹھ کے رہ گیا میرا
بہرحال آخر کار ——
شوق بے اختیار لے ہی گیا — یہ دل بے قرار لے ہی گیا
آنی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

داغ رخصت لے کر کلکتا پہنچ ہی گئے اور اس شان سے کہ ——

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا
تیام کلکتا کا زمانا داغ نے بڑے مزے میں کاٹا۔

بخت بیدار یار ہے دمساز — اے شب وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف — شام سے صبح تک وصال کے لطف
عیش ہی عیش تھا بیس برس میں — کھلبلی پڑ گئی رقیبوں میں

داغ عشق میں ناکام مضطرب سہی لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ۔

کب میسر ہو روزگار ایسا اور آقائے نامدار ایسا

داغ رام پور لوٹ آئے اور مثنوی "فریاد داغ" اس دعا پر ختم ہوتی ہے۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

پہلا دونوں دعائیں مستجاب ہوئیں۔ ۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء کو جب داغ کی عمر ۷۲ برس کی تھی اور حیدرآباد میں ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ منی بائی حجاب ان کے پاس پہنچ گئی اور نکاح کا وعدہ لے کر۔ لوگوں نے جب از راہ تمسخر مرزا سے پوچھا کہ اس عمر میں جب ان کے موئے میں بتسی لگی ہوئی ہے اور داڑھی کے بال خضاب اور مہندی سے سیاہ و سرخ کیے جاتے ہیں، وہ آخر کس برتے پر حجاب سے نکاح کرنے پر مائل ہیں۔ تو مرزا نے فرمایا کہ۔

"نکاح کر کے میں عام اصطلاح میں حجاب کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ رفیق بناؤں گا۔ اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔"

لیکن حجاب صرف رفیق بننے پر قناعت نہیں کر سکتی تھی وہ ان پر حکومت بھی چاہتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں بھی اس کے مطالبے کچھ ایسے تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے داغ تیار نہیں تھے۔ داغ اسے مہر سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ حجاب اسے ناکافی سمجھتی تھی اور بسا اوقات دوسروں سے قرض بھی لے لیتی تھی جس کا بار آخر داغ ہی پر پڑتا تھا۔ آخر داغ نے اسے دو ٹوک لکھ دیا۔

"اس سے زیادہ کی مجھ سے امید نہ رکھو مکان کا کرایہ میرے ذمے، تنہا، ے ملبوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمے تو پھر سو روپے تمہارے لئے کیوں کافی نہیں ہیں۔ ادھر ادھر سے قرض لینا اچھا نہیں خود ذلیل اور میں مطعون ہوتا ہوں۔ ان لوگوں سے جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود کفیل ہوں دوسرے پر بار بننا کسی طرح مناسب نہیں۔"

اس طرح یہ والہانا عشق خالص مادی وجود پر ختم ہو گیا اور حجاب پھر کلکتا لوٹ گئی۔ اس موقع پر داغ کا یہ مطلع بے ساختہ یاد آجاتا ہے۔

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا
بلاؤں میں بھی کہ آئی بلا کو ٹال دیا

رباعیات — شفیق مینائی

مٹنے پہ بھی تزئین چمن باقی ہے — وہ موج صبا کا بانکپن باقی ہے
برباد خزاں ہوئی بہار رنگیں — لیکن ابھی بوئے یاسمن باقی ہے

محفل کا تری عجب سماں ہے ساقی — ہر اہل طلب تشنہ دہاں ہے ساقی
سیراب کو سیراب کیا جاتا ہے — اس دور میں انصاف کہاں ہے ساقی

اغیار کی پیروی میں چلنا کیسا — گر گر کے محبت میں سنبھلنا کیسا
جلنا ہے تو جل بھر کے شعلوں کی طرح — گھٹ گھٹ کے سلگ سلگ کے مرنا کیسا

اغیار ہیں کچھ دل کے سہارے بھی ملے — دشمن ہی نہیں دوست ہمارے بھی ملے
ظلمات کیسا تھ دامن شب میں شفیق — بکھرے ہوئے موتی ستارے بھی ملے

ارد وارغم حیات کس سے کہتے — جھیلی ہیں جو مشکلات کس سے کہتے
ہر شخص میں بیگانگی آئی ہے نظر — ہم اپنے دل کی بات کس سے کہتے

احساس کی بنیاد ہلا دی تو نے — اک آگ میرے گھر میں لگا دی تو نے
اے قسمت ناکام بھلا ہو تیرا — ہمدرد کی پہچان بتا دی تو نے

وہ آپڑی آفت کہ اٹھائے نہ بنی — رسم اہل زمانہ سے نبھائے نہ بنی
کہتے ہیں کہ بگڑی ہوئی بنتی ہے — بگڑی مری ایسی کہ بنائے نہ بنی

شرارے

سعید احمد

اس دن دریا کو پار کرنا ناممکن تھا۔

"طوفان آرہا ہے۔" بوڑھے ملاح نے متلاطم موجوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کہیں ناؤ کو نہ توڑ ڈالیں۔ کل تک تمہیں انتظار کرنا ہوگا اس لیے صبر کرو۔ آؤ چلے پئیں۔"

ہم اس کے جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے چراغ کی لو اونچی کی، میز پر روٹی اور شکر رکھدی اور بولا "میں ذرا دیکھ آؤں کہ کشتی کی حالت ٹھیک ہے یا نہیں۔"

میں نے ایک پیالے میں چائے انڈیلی اور دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک لڑکی کی تصویر تھی جو کام کے کپڑے پہنے ویلڈر کی شیڈ لیے کھڑی تھی۔ میں نے لالٹین اٹھا کر ذرا اونچی کی تاکہ تصویر ٹھیک سے دیکھ سکوں۔ ایک دم میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ اقبال کی تصویر تھی ـــــ میری مسرت، وہ لڑکی جسے ایک زمانے میں، میں نے اپنے بازوؤں میں لیا تھا اور پھر اسے کھو دیا تھا۔

یادیں مجھے کہیں دور لے گئیں۔ میری نظروں کے سامنے اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ پہاڑیوں کے درمیان بہتا ہوا پرشور دریا اور زیر تعمیر بجلی گھر کے آثار۔

ایک لمحے کے لیے جھونپڑی کی کھڑکی سنہری مایل نیلے رنگ سے روشن ہوگئی اور آسمان پر سیاہ بادل کے ٹیڑھے میڑھے کنارے نظر آگئے۔ شرارے بار بار اڑنے لگے۔ میں کھڑا ہوگیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

بوڑھا ملاح آگ کے سامنے بیٹھا کوئی چیز جوڑ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"سوے کیوں نہیں؟" اس نے سوال کیا۔ "کیا چکارو

نے جگا دیا؟ کشن کناک کی ویلڈر کام کر رہی ہے۔

اقبال بھی بجلی ویلڈر تھی اور ان بارکوں کی کھڑکیوں میں بھی شرارے بھی چمک پیدا کرتے تھے جہاں میں رہا کرتا تھا، میں بجلی گھر کے بڑے بند کی تعمیر میں حصا لے رہا تھا اور اقبال بجلی گھر میں دھات کی سلاخوں کو جوڑا کرتی تھی۔

کام ختم ہونے کے بعد شام کو میں اس سے ملنے جاتا اور ہم لوگ صحرا میں دور تک چلے جاتے۔ ہم تاریک ہوتے آسمان میں تاروں کو ایک ایک کر کے نکلتے دیکھتے اور جھینگروں کا شور سنا کرتے۔

ایک دن میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ وہ خاموشی سنتے رہی، لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ اس شام جب ہم جدا ہوئے تو اس کے مصافحے سے معمول سے زیادہ گرمجوشی کا اظہار ہوا۔ یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا۔

تھوڑے دنوں بعد ہی اقبال کا تبادلہ دوسری شفٹ میں ہوگیا اور ہمیں شام کو گھومنے کا موقع نہ ملا، اور کام کے بعد میں پہاڑ پر وہاں تک چڑھتا چلا جاتا جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ چار کلومیٹر کی چڑھائی مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہوتی۔ اقبال کے ویلڈر سے چمک پیدا ہوتی اور پہاڑ روشن ہوجاتی۔ میں چبوترے پر اس کے پاس بیٹھ جاتا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھا کرتا۔

ایک بار جب صحرا کی ہوا نے اس کے بال بکھیر دیے تو میں نے اس کے رخسار پر پیار کیا۔ اس کے بعد اس کے طریقوں میں تبدیلی آگئی اور وہ مجھ سے کترانے لگی۔ کبھی اتفاق سے اگر ملے بھی تو وہ موڈ پھر لیتی۔

مجھے ایک اکس کیویٹر کا ایک آپریٹر بنا دیا گیا اور

کام کے بعد میں تعلیم حاصل کرتا۔ اب اقبال سے ملاقات شکل ہی سے ہوتی۔

ایک دن شام کو مجھے کلاس سے باہر بلایا گیا اور ایک پرچا دیا گیا۔ میں نے جلدی جلدی اسے کھولا۔

"میں ہسپتال میں ہوں" اقبال نے لکھا تھا "اگر تمہارے پاس وقت ہو تو مجھے دیکھ جاؤ۔

میں فوراً ہسپتال پہنچا، وہاں مجھے ایک وارڈ میں لے جایا گیا جہاں صرف ایک مریض تھی۔ ایک عورت جس پر نیلا کپڑا پڑا ہوا تھا اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"یہ رہی اقبال" نرس نے کہا اور چلی گئی۔ پٹیوں میں سے مانوس آواز نے میرا نام لیا۔

"یہ کیا ہوا اقبال" میں نے پوچھا

وہ پلنگ پر سے اتر آئی اور چلنا سیکھنے والے بچے کی طرح دیوار کا سہارا لے کر میری طرف چند قدم بڑھی۔ میں اس کی طرف لپکا اور اس کا ہات اپنے ہات میں لے لیا۔

"چنگاریاں میری آنکھوں میں گھس گئیں" اقبال کی آواز کانپ رہی تھی۔ اپنی دہشت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اس کے بالوں کو سہلانا شروع کیا۔

"مجھے کھڑکی تک لے چلو" وہ بولی "باہر کیا ہے"

"بڑی دھلی ہوئی رات ہے، تارے نکلے ہوئے ہیں"

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی "کیا اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟" آخر اس نے سوال کیا۔

میرا دل اس کے لیے دھڑکنے لگا۔ میں اسے کھڑکی سے پلنگ تک لے آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر امکان بھر اسے تسلی دینے لگا۔

ایک ہفتے کے بعد اقبال کو تاشقند کے آنکھوں کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں مجھے فوج میں اپنی مدت پوری کرنی تھی۔ اپنی یونٹ کی طرف جاتے ہوئے میں تاشقند میں رکا اور اقبال کو دیکھنے گیا۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہم دونوں ہسپتال کے باغ میں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ خزاں کا موسم تھا اور پتیاں زرد ہونی شروع ہو گئیں تھیں۔ صرف شاہ بلوط کے بلند درخت سرسبز نظر آ رہے تھے۔

اقبال نے پوری قوت سے میرا ہات دبا لیا، جیسے اسے خطرہ ہو کہ میں ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاؤں گا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی "تم جا رہے ہو اور میں تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتی!"

"لیکن میں واپس آؤں گا اور تمہاری روشنی بھی واپس آ سکتی ہے"

"ہاں پروفیسر صاحب بھی یہی کہتے ہیں، لیکن شاید وہ میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کہتے ہیں"

میں نے اسے یقین دلایا کہ پروفیسر نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ تمہاری آنکھوں کی روشنی واپس آ جائے گی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا "میری بچی میں یہ نہیں آیا کہ تم بھی تجربا کار جل کیسے گئیں"

اقبال نے میرا ہات اور بھینچ لیا "اس دن میں صرف اپنے ہات اور آنکھیں استعمال کر رہی تھی" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میرے خیالات کہیں اور تھے"

میں خاموش رہا۔ میرے دل میں خوشی اور افسوس کے جذبات ابھر رہے تھے۔ اس دن وہ میرے متعلق سوچ رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا اقبال" میں نے کہا "نہ صرف یہ کہ تم مجھے دوبارا دیکھو گی، بلکہ تم میری بیوی ہو گی، تب تمہیں کام کے کپڑے نہ پہننے ہوں گے اور نہ برقی ویلڈر لے کر صحرا میں چلنا پڑے گا۔ تم گھر پر رہنا، پریوں کی شہزادی کی طرح کپڑے پہننا۔ ایک اچھی زندگی کے لیے ہمارے پاس سب کچھ ہو گا"

اقبال کانپ اٹھی اور میرا ہات چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہم باغ میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے، لیکن مجھے

محسوس ہوا کہ حالات میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔

آخر رخصت ہونے کا وقت آیا۔ میں اقبال کو واپس لے گیا اور چلا آیا۔ میرا دل بہت بوجھل تھا میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کونسی چیز حایل ہو گئی تھی۔ میری نظروں کے سامنے اس کا پیلیوں بندا چہرا گھومتا رہا۔

پانچ برس گذر گئے۔ میں نے اقبال کو درجنوں خط لکھے، لیکن اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ میں اسے کھو چکا تھا۔

آج میں ایک دریا کے کنارے ایک ملاح کے جھونپڑے میں بیٹھا اس کی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تو اقبال اچھی ہو گئی، لیکن اس نے میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیا؟ کیا میں نے اسے کوئی تکلیف پہنچائی تھی؟ میں نے ماچس جلائی اور اسے تصویر کے پاس لایا، تاکہ اس کو بہتر طریقے سے دیکھ سکوں جس کے بارے میں اتنے سال خواب دیکھتا رہا تھا۔

اس وقت مجھے حقیقت کا احساس ہوا۔ اپنے کام کے لباس میں شیلڈ اور ویلڈ رکھے وہ اس بنی سنوری گڑیا کے مقابلے میں ہزار گنا خوبصورت نظر آ رہی تھی جو میں اسے بنانا چاہتا تھا۔

ماچس کے شعلے نے میری انگلیاں جلا دیں۔ اقبال اچھی ہو گئی تھی۔ تصویر میں اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن نظر آ رہی تھیں، لیکن وہ ہے کہاں؟ شادی کر لی؟ ناممکن۔ میں اسے پھر تلاش کروں گا تاکہ ہم دونوں ایک ہو جائیں جیسا ہم نے ایک زمانے میں خواب دیکھا تھا، لیکن اقبال کو، اپنی مسرت کو کہاں تلاش کروں؟

"مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے" دوسرے دن صبح میں نے ملاح سے کہا۔ اس کے بعد میں اسے جھونپڑے کے اندر لے گیا اور وہ تصویر مانگی۔

"تم اس سے خود ہی مانگ لو" وہ بولا۔

"تو آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہے؟"

"کیوں نہیں وہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ وہ تو رات بھر کش کتاک میں چنگاریاں اڑایا کرتی ہے، کیا وقت ہے؟ سات بج رہے ہیں۔ تو اب یہاں آتی ہی ہو گی۔ وہ جلد ہی میری کشتی پر ادھر آئے گی۔"

"کیا اس کی شادی ہو گئی ہے؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

ملاح نے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ اس نے شادی کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ جب کبھی بجلی گھر میں کام کرتی تھی تو ایک آدمی سے اسے محبت ہو گئی جو اسے چھوڑ گیا، لیکن عورتیں تو طرح طرح کی باتیں کیا ہی کرتی ہیں۔"

میں ساحل پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگائی۔ بوڑھے نے اپنی کشتی کو دھکا دیا اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ اس ساحل کی طرف جہاں سے میری مسرت جلد ہی آنے والی تھی۔

غزل

غم زیادہ، میری خوشی کم ہے
یا شعور خود آگہی کم ہے

اس کے کوچے میں جا رہا ہوں مگر
دل کو امید واپسی کم ہے

دل میں ارمان تو بہت ہیں مگر
اس کا رونا ہے زندگی کم ہے

مجھ سے اسرار کائنات نہ پوچھ
خود مجھے اپنی آگہی کم ہے

اے رضا تجھ پہ ہے نگاہ کرم
اب وہ ان کی نوازشیں کم ہے

عبدالخالق رضا

عمر عزیز

ڈاکٹر اختر حسین

عمر ـــــ کے بارے میں بعض اہم غلط فہمیاں لوگوں میں موجود ہیں ان پر تبصرے کے بغیر بھی نقطۂ نظر یہ ہے کہ فاطر کائنات نے شخص ہر فرد کی عمر متعین فرما رکھی ہے، جس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، لیکن یہ تعین صرف اسی ذات کو معلوم ہے، جس نے اس کا فیصلہ فرمایا۔ دوسرا یہ سوال کہ انسان صحت کی حفاظت۔ غذا۔ امراض کے حدود کی نے اور ماحول کی سازگاری کے لیے کوشش کی ہے۔ یہ بات اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی عمر میں (عام معلومات کے مطابق) جو اضافہ ہو گیا یہ بھی اس فیصلے کا جز ہوگا، جو خالق کائنات نے اس کی عمر میں فرمایا ہے (ادارہ)

اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں، امریکی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں اور جسمانی طور پر اوروں سے زیادہ تنومند ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سائنسی ترقی اور جدید طبی سہولتوں کی افراط ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہاں بچوں کی شرح اموات میں زبردست کمی واقع ہوئی ہے بلکہ ماہرین نے صحت و سلامتی کے ساتھ زیادہ عرصہ زندہ رہنے کا راز بھی معلوم کر لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راز کا تعلق بہت کچھ ہر ملک و قوم کے اقتصادی حالات سے ہے۔ آب و ہوا بھی اس پر براہ راست اثر ڈالتی ہے۔ تاہم چند سادا گر ایسے ہیں جن پر عمل کر کے ہر فرد اپنی عمر میں تھوڑا بہت اضافہ ضرور کر سکتا ہے۔

عمل و حرکت

موت کا ایک دن معین ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کے لیے حرکت نہایت ضروری ہے۔ ارتقا کا پورا نظریہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ جس عضو سے کام نہ لیا جائے وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ ہمیں جسم انسانی، دماغی روحانی قبا کہ معاشرتی نقل و حرکت کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے لیے لمبی چوڑی ورزش کا کوئی جامع پروگرام وضع کریں، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ سستی کو چھوڑ کر اپنے جسم کو جائز طور پر عمل کرنے پر مائل کیجیے۔ کام بڑی نعمت بیکاری اور سستی سب سے بڑی لعنت ہیں۔

وزن

انسانی صحت کا جسمانی وزن سے گہرا تعلق ہے، اگر آپ وقتاً فوقتاً اپنا وزن لیتے ہیں اور اسے اپنی ڈائری میں باقاعدہ طور پر ریکارڈ کرتے رہیں، تو آپ کو اپنی صحت پر نگاہ رکھنے میں کافی آسانی رہے گی یاد رکھیے کہ جسم میں چربی کی زیادتی انسان کو قبر سے قریب تر کرتی ہے۔ صحت اور فربہی دو متضاد چیزیں ہیں۔ فربہی کی زیادتی صحت کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔

گذشتہ کچھ عرصے تک ڈاکٹروں کو صحی اور پر یہ معلوم نہ تھا کہ انسان کا کتنی عمر میں کتنا وزن ہونا چاہیے، لیکن اب تحقیقات نے ایسی جدولیں تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، جن کی مدد سے آپ یہ جان سکتے ہیں، کہ اتنی عمر میں اتنے قدر آپ کا وزن اس قدر ہونا چاہیے۔ ممکن ہے انگلستان یا امریکا کی ایسی کوئی جدول آپ کے ملک پر صحی نہ اترے، لیکن آپ اس سے تھوڑا بہت اندازا تو ضرور کر سکتے ہیں۔

عام طور پر غذا، اقتصادی حالات، معاشرتی رجحانات اور ایسے ہی دوسرے عوامل ہمارے وزن پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں، اس کے باوجود تیس سال کی عمر میں ہمارا جو وزن ہوتا ہے، اسے باقی عمر کے لیے معیاری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً چالیس سال کی عمر میں آپ کا

وزن تیس سال کے مقابلے میں پانچ فی صدی کم ہونا چاہیے یعنی اگر تیس سال کی عمر میں ڈیڑھ سو پونڈ ہے تو چالیس سال کی عمر میں ۱۴۲ پونڈ ہو جانا چاہیے' یہ کمی ضروری ہے اور اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ۴۵ سال کی عمر میں آپ کے وزن میں مزید ۵ فیصدی کی کمی ہونی چاہیے' اور پچاس سال کی عمر میں وزن کا ۱۰ فی صدی اور گھٹ جاتا ہے۔

دماغ اس کی یہ ہے کہ جیسے جیسے ہماری عمر میں اضافا ہوتا ہے' ہمارے عمل اور حرکت میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے' اور چربی بڑھنے لگتی ہے۔ اگر درمیانی عمر میں آپ کا وزن مستقل رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم میں چربی بڑھ رہی ہے۔ وزن میں کمی ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک ہے اور آپ چاق چوبند ہیں۔ ہمارے ملک میں دبلاپن عام طور پر بیماری اور خراب صحت کا پیش خیما سمجھا جاتا ہے' لیکن ایک عمر ایسی بھی آتی ہے جب بھرا بدن صحت کی علامت ثابت ہوتا ہے۔

جسمانی ورزش

آپ مدت سے سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ ورزش صحت و توانائی کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے' لیکن ڈاکٹر اور ماہرین صحت اس ذیل میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اب بھی کچھ ماہرین ایسے ہیں جو قطعی طور پر یہ نہیں بتا سکتے کہ ورزش کا طول عمر سے کیا تعلق ہے۔ کتنی ورزش کرنے سے آپ کی عمر میں کتنا اضافا ہو سکتا ہے۔

چند ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ہی قسم کے حالات میں ایک ایسا شخص جو دن بھر چلتا پھرتا ہے اور کچھ ورزش کر لیتا ہے ایک ایسے شخص کے مقابلے میں آٹھ سال زیادا زندا رہتا ہے جس کے فرایض منصبی اسے دن بھر بیٹھا رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اگس ورزش باقاعدگی کے ساتھ مناسب مقدار میں کی جائے تو جسم توانا رہتا ہے' خاص طور پر جوڑوں کے درد سے نجات ملتی ہے صحت مند رہنے سے دل قوی رہتا ہے اور اس میں اتفاقی حادثات اور جھٹکوں کو برداشت کر لینے کی قوت محفوظ ہوتی جاتی ہے' یہی وہ قوت ہے جو شدید بیماری کے وقت بھی موت کو دور رکھتی ہے۔

بیس سال کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ انسان کو ایسے تمام کھیلوں میں حصا لینا چاہیے جو ایک ٹیم کی شکل میں یا انفرادی طور پر کھیلے جاتے ہیں' لیکن افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔ چالیس سال کی عمر میں صرف اتنا کھیلنا چاہیے جتنا جی چاہے' اور جسم پر زیادا بار نہ پڑے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ٹہلنا اور چلنا پھرنا ہی بہت اچھی ورزش ہے۔ باغبانی بھی اس عمر کے لیے بڑا اچھا شغل اور فایدا مند ورزش ہے۔

دماغی ورزش

جدید تحقیقات مظہر ہیں کہ جسم کے دوسرے اعضا کی طرح دماغ بھی استعمال کا طالب ہے ورنہ وہ بھی زوال پذیر ہو جاتا ہے' لکھنا پڑھنا' مباحثوں اور بات چیت میں حصا لینا۔ دوسروں سے کچھ سیکھنا یا کسی کو کچھ سکھانا اور معاشرتی امور میں حصا لینا دماغی ورزش کی مختلف شکلیں ہیں۔ کچھ ماہرین کی راے ہے کہ ایسے لوگ جو دماغی کثرت کرتے رہتے ہیں' ان لوگوں کی نسبت زیادا عمر پاتے ہیں' جو اپنی آنکھوں اور دماغ کو چاروں طرف سے بند رکھتے ہیں۔

کچھ ماہرین کی راے ہے کہ بیس سال کی عمر میں انسان کو ہر روز کم سے کم دو گھنٹے دماغی ورزش پر خرچ کرنے چاہئیں۔ چالیس سال کی عمر میں کم سے کم سو منٹ روزانا اس کام پر صرف کرنے چاہئیں۔ دماغی صحت انسان میں ایک طرح کی لچک پیدا کر دیتی ہے' اور وہ بڑاپے سے خوفزدا نہیں ہوتا یہ دماغی ورزش ان فرایض منصبی کے علاوا ہے' جو ہمیں تعلیم یا معاش کے سلسلے میں یونیورسٹی یا دفتر میں انجام دینے پڑتے ہیں۔

آرام اور نیند

نیند کا بھی ہماری عمر سے گہرا تعلق ہے' ماہرین اس مسلے پر ایک دوسرے سے بہت کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ کچھ سائنسدان تو یہ بھی

کہتے ہیں کہ نیند انسان کے لیے قطعی ضروری نہیں اور یہ محض تضیع اوقات ہے، لیکن ہم ابھی اتنے ترقی یافتا نہیں اور نیند کو صحت کے لیے ایک لازمی شرط کا درجا دیتے ہیں، رہا یہ سوال کہ ہمیں کتنی عمر میں کتنا سونا چاہیے بہت کچھ انفرادی مسلا ہے۔ بعض لوگ جیسے کیا صرف چار گھنٹے سو کر تندرست اور خش رہتے ہیں، اور بعض آٹھ گھنٹے سو کر بھی سست رہتے ہیں، انہیں تو دس گھنٹے کی نیند درکار ہوتی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پانچ گھنٹے کی نیند ناکافی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر تک ہمیں کم سے کم سات گھنٹے ضرور سونا چاہیے، اور اس کے بعد تو گھنٹے روزانا نیند تو آجاتی ہے، لیکن سونے کے لیے تو پرسکون ماحول آرام دہ بستر اور چارپائی محفاظت کا احساس، درست ہاضما اور بے فکری ضروری ہیں۔ نیند بہترین ٹانک ہے جبھی وہ وقت ہوتا ہے جب جسم خرچ کی ہوئی توانائی دوبارا حاصل کرتا ہے، دیر تک جاگنا اور صبح تک سونا صحت پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔

چند دوسرے نکات

انسان کو اپنی صحت کے متعلق اس قدر محتاط تو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ وہم میں پڑ جائے، لیکن وہ وقتاً فوقتاً جسم کا طبی معائنا کرا لینے سے بہت سی بیماریوں کو دور رکھا جا سکتا ہے اور عمر میں بھی اضافا کیا جا سکتا ہے۔

اگر آپ زیادا عرصے تک زندا رہنا چاہتے ہیں تو پریشان ہونا چھوڑ دیجیے۔ گھبراہٹ، پریشانی، الجھن، فکر، تنک مزاجی اور غصا عمر کو کم کرتے ہیں۔ بہت سے تفکرات ہم خدا اپنے لیے پیدا کرتے ہیں۔ بہت سی الجھنیں ہماری مصنوعی معاشرت نے پیدا کر دی ہیں۔ اولاد کی کثرت، ذمے داری کا عدم احساس، دوسروں کے معاملات میں بلا وجہ بھی دخل دینا اور غم جہاں مول لینا بھی رفتار فتا فکرات کا درجا حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں عمر کو کم کرتی ہیں۔ خش رہیے، زندا رہیے اور دوسروں کو بھی زندا رہنے دیجیے، صحت و سلامتی اور طویل عمری کا زرین اصول یہی ہے

اگر ممکن ہو تو دوپہر کے کھانے کے بعد مختصر سی جھپکی لے لیجے۔ غذا کھاتے ہی کام شروع نہ کیجیے۔ اگر سونے سے تکلیف ہوتی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے آرام ضرور کیجیے اس طرح آپ کے معدے کو پورے طور پر کام کرنے کا موقع ملتا ہے، اور جو غذا آپ نے کھائی ہے آپ کا جسم اس سے پورا فائدا اٹھاتا ہے۔

اگر آپ اپنے بزرگوں کو زیادا دیر تک رکھنا چاہتے ہیں تو بچوں کی طرح ان کی خاطر مدارات کیجیے۔ جس طرح چھوٹے بچے اپنے والدین اور دوسرے اعزا سے پیار محبت کے طالب ہوتے ہیں، اسی طرح بوڑھے آدمی بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ان کی بے قدری نہ کریں، انہیں بس پشت نہ ڈالیں، ان کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، اگر آپ ان کی توقعات کو پورا کرتے رہیں گے تو آپ پر ان کا سایا زیادا دیر تک قایم رہے گا۔

جو بگڑ کے ساتھ ساتھ انسان کی ہڈی بھی بھربھرا ہو جاتی ہیں اس لیے جوڑوں کا درد تکلیف دینے لگتا ہے، ایسے موقعوں پر ہارمون کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ یہ علاج درد و دکھ سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہی ہیں وہ چند گر جو سائینسدانوں اور ماہرین طب نے مسلسل تحقیقات کے بعد صحت و توانائی کو برقرار رکھنے اور زیادا عرصے تک زندا رہنے کے لیے معلوم کیے ہیں۔ اندازا لگایا گیا ہے کہ ریاست ہاے متحدا امریکا میں جیسے ترقی یافتا ملک میں بھی اوسط عمر میں دس سال کا اضافا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اوپر کے سادا اصولوں پر عمل کیا جاے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں اس کی گنجایش کہیں زیادا ہے، بظاہر یہ تمام باتیں نہایت سادا ہیں، لیکن خود ہی اندازا لگایئے آپ ان پر عمل پیرا ہیں بھی یا نہیں؟

"ہندستانی ادب" کیلیے خریدار فراہم کر کے علمی ادبی سیوا کا موقع دیجیے

پہیلی دیوان غالب قسط

عارف نیانتری

کیرداڑا

دیوان غالب ۔ ایک شخص کلکتا کا جاجو مجھے غالب سے بے پناہ عقیدت ہے ۔ غالب کا پورا دیوان اسے ازبر یاد ہے ۔ جو کبھی نثر میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ ہر بات غالب کے اشعار میں کرتا ہے دوسروں کے جوابات کے طور پر غالب کے اشعار پیش کرتا ہے ۔

وکیل صاحب } دیوان غالب کے پرانے دوست
حکیم صاحب } اور یار غار ۔

مولوی صاحب ۔ دیوان غالب کے نئے دوست

(جج ۔ جیوری ۔ سرکاری وکیل اور نوکر وغیرہ)

مقام ـــــ کراچی شہر

پہلا منظر

(پردہ اٹھتا ہے)

دیوان غالب فقیروں کے سے کپڑے پہنے ایک تخت پر بیٹھے ہیں ۔ سامنے ایک ڈیسک رکھا ہے ۔ ڈیسک پر قلم دوات ، کاغذ اور دیوان غالب کی کئی ایک جلدیں رکھی ہیں ۔ کمرے میں جابجا غالب کی تصویریں آویزاں ہیں ۔ دیوان غالب نے بھی غالب کی دوپلی ٹوپی پہن رکھی ہے ۔ اگالدان برابر رکھا ہوا ہے ۔ پاندان ڈیسک پر موجود ہے ۔ دیوان غالب کے دونوں بچے بھی ترتیب کھیل رہے ہیں ۔ نوکر داخل ہوتا ہے ۔

نوکر (دست بستہ آداب بجالاکر) حضور ! میں صدیقی صاحب کے ہاں گیا تھا ۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں آج بھی حاضر نہ ہوسکوں گا ۔ بہت مصروف ہوں ۔

دیوان غالب ... یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اور اگر جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(نوکر واپس چلا جاتا ہے ۔ تھوڑی ہی دیر بعد نوکر پھر داخل ہوتا ہے)

نوکر ۔ حکیم صاحب تشریف لائے ہیں اور باریابی چاہتے ہیں ۔

دیوان غالب ۔ ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

(حکیم صاحب لکھنوی لباس پہنے ہاتھ میں چھڑی لیے داخل ہوتے ہیں اور جھک کر فرشی سلام کرتے ہیں ۔)

دیوان غالب ۔ (حاضرین کی طرف موخ کرکے)
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(پھر حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہوکر)

تو ہو اجلوہ گر مبارک ہو
ریزش سجدۂ جبین نیاز

(ایک شخص کوٹ پتلون پہنے داخل ہوتا ہے ۔ اس کو دیکھتے ہی حکیم صاحب اور دیوان غالب دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں)

حکیم صاحب ۔ السلام علیکم ۔ آیئے وکیل صاحب ! تشریف لایئے ۔ کہیئے کیسے حال چال ہیں ؟

وکیل ۔ بکل ٹھیک ، دعا چاہیے آپ کی ۔

(دیوان غالب کی طرف مخاطب ہوکر) ماشاء اللہ آپ تو آپ بھلے چنگے دکھائی دے رہے ہیں ۔ موخہ پہ رونق بھی آگئی ہے ۔

دیوان غالب ۔ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

حکیم صاحب ۔ کیوں کیسی طبیعت ہے آپ کی ؟

دیوان غالب ۔ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
وکیل صاحب ۔ کیا ابھی تک وہ کمزوری باقی ہے؟
دیوان غالب ۔ ضعف سے اے گریہ باقی پھر بہ تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا وہ خون کہ دامن میں نہیں
ہو نشاط ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں
وکیل صاحب ۔ کچھ اپنی بیماری کے متعلق تو بتایئے، اس کا کیا حال ہے۔
دیوان غالب ۔ کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا
وکیل صاحب ۔ حکیم صاحب! آپ ہی کچھ بتایئے نا! انہیں تو بیماری نے ایسا گھیرا ہے کہ یہ تو کہیں کے نہ رہے۔
حکیم صاحب ۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو نیند وغیرہ تو ٹھیک آجاتی ہے۔
دیوان غالب ۔ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
وکیل صاحب ۔ دیوان غالب صاحب آپ نے اپنی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے۔ اگر آپ ہاجمہ ہی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی وضع کو چھوڑ دیں۔
دیوان غالب ۔ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں،
(نوکر داخل ہوتا ہے)
نوکر ۔ مولوی ریاض الدین صاحب تشریف لائے ہیں۔
حکیم صاحب ۔ ارے بلاؤ بلاؤ۔ جلدی بلاؤ انہیں۔ یہیں بھی ان سے کام ہے۔
(مولوی ریاض الدین بڑا سا عمامہ باندھے لمبا سا چوغا پہنے اور کندھے پر زردہ رومال ڈالے داخل ہوتے ہیں سب کو سلام کر کے خالی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔)
مولوی صاحب ۔ دیوان غالب صاحب! آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ مستقبل کے لیے کوئی فیصلا کیا یا نہیں۔ کاروبار وغیرہ کچھ کیجیے گا یا ملازمت؟
دیوان غالب ۔ کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
حکیم صاحب ۔ آپ نے پچھلے ماہ کوارٹر کے لیے جو درخواست دی تھی۔ اس کا کیا بنا۔ کیا کوارٹر ملنے کی کوئی امید ہے؟
دیوان غالب ۔ (ٹھنڈی آہ بھر کر)
کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
وکیل صاحب ۔ آپ اطمینان رکھیے ہم جلد ہی آپ کو ایک اچھا سا فلیٹ دلوا دیں گے۔
دیوان غالب ۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک،
وکیل صاحب ۔ مگر وہ کوارٹر جو حکومت آپ کو دے گی، بالکل بیکار ہے اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔
دیوان غالب ۔ ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
(مولوی صاحب سر جھکائے خاموش کسی سوچ میں بیٹھے ہیں اور ہر تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں)
دیوان غالب ۔ (مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) دل نادان! تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔
مولوی صاحب ۔ میں خلد مکان کی طرف سے بڑا فکر مند ہوں کہیں کوئی کوارٹر یا فلیٹ ملتا ہی نہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہاں چل کر رہا جائے۔
دیوان غالب ۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
مولوی صاحب ۔ (حکیم صاحب سے) حکیم صاحب! کوئی دوا دیجیے میرا تو برا حال ہو گیا ہے۔ ایک

ماہ سے شب بیداری کے مرض میں مبتلا ہوں، رات بھر نیند نہیں آتی۔

حکیم صاحب۔ بہت اچھا کسی روز.....

دیوان غالب۔ (بات کاٹ کر) موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مولوی صاحب۔ وکیل صاحب! اس سال تو آپ بھی حج کر آئیں۔ حج کرنے سے سال بھر کے.....

دیوان غالب۔ (بات کاٹ کر) کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

مولوی صاحب۔ (جھلا کر) آپ بار بار لفظ غالب کہتے ہیں۔ یہ آخر کون ہے۔؟

دیوان غالب۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

مولوی صاحب۔ ہم تو غالب کو فطعاً نہیں جانتے۔

دیوان غالب۔ ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مولوی صاحب۔ اگر وہ صرف شاعر ہی ہے تو دنیا میں اور بھی تو شاعر ہیں اسی میں ایسی کیا خصوصیت ہے؟

دیوان غالب۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مولوی صاحب۔ برا ہو غالب کا کہ اس نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا۔

دیوان غالب۔ (دبی کر غصے میں)
یہ باعث نومیدیٔ اہل ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مولوی صاحب۔ جب غالب برا تھا تو ہم کیوں نہ اسے برا کہیں۔

دیوان غالب۔ کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

مولوی صاحب۔ پھر بھی آخر اس میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ سیدھی طرح تشریف میں بات ہی نہیں کرتے۔

دیوان غالب۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

حکیم صاحب۔ آپ کو غالب اب تک کیوں یاد آتا ہے جبکہ اسے مرے ہوئے بھی اسّی سال سے زیادہ ہو گئے۔

دیوان غالب۔ ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مولوی صاحب۔ آپ غالب کو اپنا استاد مانتے ہیں یا پیر و مرشد؟

دیوان غالب۔ یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مولوی صاحب۔ بیشک مجموعی غالب نے باتیں بہت کی ہیں اور خدمت کم۔

دیوان غالب۔ (تڑپ کر اٹھتا ہے اور غالب کی بڑی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔)
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

(دیوان غالب اسی طرح ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے)

وکیل صاحب۔ اجی حضرت معاف کیجئے مولوی صاحب سے غلطی ہو گئی۔ آجایئے بیٹھ جایئے۔ یہاں اپنی جگہ پر۔

(دیوان غالب بدستور ہاتھ باندھے تصویر کے سامنے کھڑا رہتا ہے)

حکیم صاحب۔ اجی دیوان غالب صاحب تشریف لے آیئے۔

مولوی صاحب۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضور دیوان غالب صاحب بلعفانی مانگ رہا ہوں، معاف کر دیجئے۔

وکیل صاحب۔ دیوان غالب تو بالکل بہرا ہو گیا۔ سنتا ہی نہیں اس سے بات کیا کی جائے۔

دیوان غالب۔ بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

وکیل صاحب ۔ کیا مطلب آپ کہا "دو ناہوا التفات" کے معنی میں نہیں سمجھا۔

دیوان غالب ۔ یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

حکیم صاحب ۔ (موضوع بدل کر) فرمایئے اب کبھی آپ کو اپنا کلکتا بھی یاد آتا ہے۔ اس کی گلیاں، اس کی سڑکیں اور وہاں کے دلفریب مناظر۔

دیوان غالب ۔ کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

(دیوان غالب" ہائے ہائے کرتے گر جاتے ہیں اور زمین پر بھی لوٹتے پوٹتے رہتے ہیں۔ اور زبان سے مسلسل ہائے ہائے نکلتا رہتا ہے)

حکیم صاحب ۔ افوہ! معلوم ہوتا ہے دورا پڑ گیا ہے ان کو، نوکر کو بلاؤ۔

(نوکر داخل ہوتا ہے اور دیوان غالب کی یہ حالت دیکھ کر پھر بھاگا جاتا ہے اور شراب کی بوتل اور گلاس لیے آتا ہے ـــــ ایک گلاس بھر کر دیوان غالب کے منہ سے لگا دیا جاتا ہے، جس کو دیوان غالب ایک ہی گھونٹ میں پی جاتے ہیں۔ پھر ہوش آجاتا ہے۔ مولوی صاحب کو شراب کی بو آتی ہے۔

مولوی صاحب ۔ افوہ! لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔
یہ شراب جسے لوگ غم و اندوہ بھول جانے کے لیے پیتے ہیں۔

دیوان غالب ۔
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

وکیل صاحب ۔ آپنے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ شراب چھوڑ دو گا۔

دیوان غالب ۔ غالب چھٹی شراب اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

وکیل صاحب ۔ آپ قرض کی شراب پینا چھوڑ دیجیے۔ ورنہ دفعہ ۳۱۲ میں دو سال کے لیے دھر لیے جائیں گے۔ کیوں اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کرتے ہیں۔

دیوان غالب ۔ نقصان نہیں جنوں میں بلا سے گھر ہو خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

حکیم صاحب ۔ شراب ہی نے تو آپ کی صحت کو اس حال پر پہنچا دیا ہے۔

دیوان غالب ۔ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

مولوی صاحب ۔ شراب پینا اسلام میں حرام ہے۔ اس لیے کہ یہ عیش و عشرت کی باتیں ہیں۔

دیوان غالب ۔ مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

وکیل صاحب ۔ اچھا اب ہمیں پتا چلا کہ آپ شراب کیوں پیتے ہیں۔ اس بے خودی کے پیچھے کوئی گہرا معاملہ ہے۔

دیوان غالب ۔ (مسکرا کر) بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

حکیم صاحب ۔ ہوں! وہ گہرا معاملہ بھی کچھ عشق وغیرہ سے متعلق معلوم ہوتا ہے، جس کی پردہ داری ہے۔

دیوان غالب ۔ (ہاتھ ملتے ہوئے)
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مولوی صاحب ۔ آپ کی شراب خوری کی وجہ سے آپ کو جنت نہیں ملے گی۔

دیوان غالب ۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مولوی صاحب ۔ اور اپنے عشق کی وجہ سے زمانے بھر میں بدنام ہو گئے تو!

دیوان غالب ۔ رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

(نوکر داخل ہوتا ہے اور خط دے کر چلا جاتا ہے۔ وکیل صاحب خط کھولتے اور پڑھتے ہیں۔)

وکیل صاحب۔ جس دکان سے آپ شراب منگاتے ہیں یہ اسی کا خط ہے۔

(اٹھتے ہیں نوکر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ صاحب! وہی دکاندار چار سپاہیوں کو لے کر آیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ پیسے لاؤ۔

وکیل صاحب۔ یہاں بھیج دو ان سب کو۔

(دکاندار ڈگری لیے ہوئے مع چار سپاہیوں کے داخل ہوتا ہے)

دکاندار۔ (دیوان غالبؔ کی طرف اشارا کرکے) یہ ہیں صاحب! وہ ——

(دو سپاہی آگے بڑھ کر دیوان غالبؔ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیتے ہیں۔)

مولوی صاحب۔ ارے بات کیا ہے آخر کچھ بتاؤ تو سہی؟

سپاہی۔ (دیوان غالبؔ کی طرف اشارا کرکے) ان ہی سے پوچھ لیجے۔

دیوان غالبؔ۔ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دکاندار۔ (آگے بڑھ کر) اگر تم ہمارا قرض بھی اتار دو، تو ہم تمہارے دوست بن جائیں گے۔

دیوان غالبؔ۔ (پولیس کی طرف اشارا کرکے)
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

(سپاہی دیوان غالبؔ کو لے کر چلتے ہیں تو دیوان غالبؔ کے رونے بچے آکر لپٹ جاتے ہیں۔)

بچے۔ (رو کر) ابا ہمیں کس پر چھوڑے جا رہے ہو

(دیوان غالبؔ۔ (پلٹ کر)
غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

(پردہ گرتا ہے)

حقائق و معارف

لسان

اکثر خیال آتا ہے دیرینہ خواب کا
بھولا نہیں ہوں مر کے بھی عالم شباب کا
کافی ہوا نہ برق کو دامن سحاب کا
جلوہ نے فاش کر دیا پردہ نقاب کا

الحقیقت

دنیا سمجھ رہی ہے جسے اپنا انقلاب
دھندلا سا عکس ہے وہ مرے اضطراب کا
وہ حسن یار اس پہ وہ عالم شباب کا
رنگین جیسے مئے سے ہو شیشہ شراب کا

افکر

اہل جنوں عشق کی دنیا ہی اور ہے
زاہد نہ دے فریب عذاب و ثواب کا
ساقی پلا رہا ہے تو پینے بھی دے مجھے
واعظ نہیں محل یہ سوال و جواب کا

موھانی

اب اور ہی نگاہ ہے اب اور ہی مزاج
احساس اب انہیں ہی ہے اپنے شباب کا
وحشت سے کانپتا ہے فلک پر زمیں سے دور
دیکھا تھا جلوہ مہر نے کس کے عتاب کا

واحد

افقر ہمارے عہد میں دنیا بدل گئی
ماضی کو شکوہ حال کے ہے انقلاب کا

ہندی بنگال کے گیت

ڈاکٹر ایش چکرورتی

کلاسیکی سنگیت پورے شمالی ہندستان کی مشترکا ملکیت ہے، اور کلاسیکی سنگیت کی ترقی میں بنگالی نے جو پارٹ ادا کیا ہے آج اس سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں، لیکن بنگال کے علاقائی سنگیت اور دوسرے سنگیت میں بھی شان رکھتے ہیں اور ہندستان کے کسی بھی دوسرے خطے کے سنگیت سے ان کا مقابلا کیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ دیہی باشندوں نے گھریلو عوامی اور پیشاورانا مقاصد کے لیے سنگیت کو فروغ دیا ہے۔ پچھلی صدی سے پہلے بنگالی ادب کی تقریباً ہر تصنیف نظم میں ہوتی تھی، جسے بنگالی لہجے اور ڈھنگ سے گایا کرسایا جاتا تھا۔ آج بھی دیہات میں قصے سنانے والا اس وقت تک اپنی کہانی کو مکمل نہیں سمجھتا جب تک کہ درمیان میں وہ گیت نہ سنا جائے۔

بنگالی لوک گیت کی قسمیں بنگال لوک گیتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ گیتوں میں جوش ہوتا ہے اور وہ سرت و انبساط کے جذبات سے بھرپور ہوتے ہیں، لیکن کچھ گیت زیادہ بنجیدا ہوتے ہیں۔ چند گیتوں میں غنایت نمایاں ہوتی ہے، اور بعض گیت سادگی لیے ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی گیت ہوتے ہیں جن میں فلسفا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور ویدانت کی گہرائیاں بھی ہوتی ہیں، جو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کر دی جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے گیت بھی ہوتے ہیں جو عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کر دیے جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے گیت بھی ہوتے ہیں جو کسانوں کی زندگی کے سب سے حسین واقعات کا ذکر کرتے ہیں، چنانچہ موضوع کے لحاظ سے گیتوں کو تقسیم کرنا بہت پیچیدہ مسلا بنجاتا ہے۔

عام طور پر ہم بنگال کے لوک گیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی ایک تو وہ جو گھر کے اندر گائے جاتے ہیں، دوسرے وہ جو گھر کے باہر گائے جاتے ہیں۔ اب ہم ان گیتوں کے بارے میں ان کی نوعیت، موقع اور سنگیتی اہمیت کے لحاظ سے خاص خاص باتیں آپ کو بتائیں گے۔

بھٹیالی بھٹیالی گیت عام طور پر کسان یا ماجھی گاتے ہیں۔ بھٹیالی کا عام موضوع کوئی گڈریا ہوتا ہے، جو چراگاہوں سے اپنے ڈھور ڈنگر لیے واپس لوٹتا ہے۔ کوئی ملاح ہوتا ہے جو پتوار لیے آرام کر رہا ہے۔ اور کشتی پرسدے کی مدد سے آپ ہی آپ چلتی رہتی ہے۔ ہم شخصی طور پر بھٹیالی کو اور کئی لوک گیتوں کی بنیاد مانتے ہیں۔ خد بھٹیالی کی کئی قسمیں ہیں۔ مثال کے طور پر گائیں چرانے والے کا گیت۔ بھینسیں چرانے والے کے گیت سے ملتا جلتا نہیں ہوتا، بلکہ الگ ہوتا ہے۔

ساری نغمے کے لحاظ سے ساری گیت بھٹیالی سے بالکل الگ ہوتا ہے، یہ اس وقت گایا جاتا ہے۔ جب کچھ لوگ اکٹھے کشتی چلا رہے ہوں یا اس قسم کا کوئی اور موقع ہو جب مزدوروں کا گروہ سر تال کے ساتھ مل کر گانا گا رہا ہو۔ بعض اوقات ساری کا متن بھٹیالی یا باول ہی سا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گیت کا موضوع ملاح کے کاموں یا خیالات سے متعلق خاص خاص باتوں پر مرکوز ہوتا ہے۔ ساری عام طور پر پوربی بنگال میں گایا جاتا ہے، جہاں بڑے بڑے دریا اور بڑی بڑی جھیلیں ہیں کشتیوں کا مقابلا ایک تفریحی شغلا سمجھا جاتا ہے۔ ساری گیت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔

باول اصل میں باول ایک مذہبی فرقا ہے، جن کے گیت

بھی باول ہی کہلاتے ہیں۔ باول وشنو بھگت بھی ہو سکتا ہے اور گورکھا بھگت بھی، لیکن اسے ایشور یا ایشور بھگتی سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ باول کے فلسفے نے سہجیا فرقے کے خیالات سے خوشا چینی کی ہے۔ خدا سہجیا فرقے کا نظریہ بدھ یوگیوں سے لیا گیا ہے، جن کا دور دورہ اُس زمانے میں تھا، جب ہندستان میں بدھ دھرم زوال پذیر تھا۔ باول یوگیوں کی ایشور بھگتی سے بے نیازی کا سبب شاید بدھ نظریوں کا براہ راست اثر ہے۔

باول گیتوں کا متن عام طور پر دو معنی ہوتا ہے، ایک تو ظاہری مطلب ہوتا ہے، دوسرا باطنی یا روحانی۔ باول یوگی فقیروں یا سنیاسیوں کی طرح مخصوص قسم کا لباس پہنتے ہیں اور اکتارا اور نوپور پر گاتے ہیں۔

پرانے باول گیتوں نے شاعر ٹیگور کے دل پر نقش چھوڑا تھا، چنانچہ انہوں نے خود کئی باول گیت لکھے ہیں۔

بھاوپا یہ کوچ بہار اور آس پاس کے ضلعوں کے کسانوں کا گیت ہے، لیکن اس میں غنائیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے یہ ایک محدود علاقے کا گیت تھا، لیکن اب بنگال بھر میں رائج ہو گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ پوربی بنگال کے بہت سے لوک گیت پچھمی بنگال میں بھی سنے جانے لگے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ان کا پرچار کر رہا ہے۔ جگہ جگہ گراموفون ریکارڈ بجتے رہتے ہیں اور پوربی بنگال سے آنے والے بے گھر لوگ بھی بنگال کے مختلف مقامات پر بس گئے ہیں۔

جاری جاری کا موضوع کربلا کے واقعات ہوتے ہیں۔ یہ گیت مشرقی بنگال کے مسلمان مل کر گاتے ہیں۔ ان گیتوں کا طرز بیان مختلف مقامات پر مختلف ہوتا ہے، اگرچہ جاری خاص خاص طور پر مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے، لیکن ان کے ہندو بھائی بھی اسے بڑے دھیان اور دلچسپی سے سنتے ہیں۔

جھومر جھومر مغربی بنگال کی مغربی سرحد کے علاقے کا گیت ہے۔ جھومر کی کئی دلچسپ قسمیں ہیں اس کے ساتھ ڈھولک بھی ہوتی ہے، جسے دونوں ہاتھوں سے بجایا جاتا ہے، عام طور پر جھومر کے ساتھ ناچ بھی ہوتا ہے۔ سنتال قبائلیوں کا جھومر بھونڈا سا، مگر جاندار ہوتا ہے۔

گمبھیرا گمبھیرا گیت ضلع مالدا میں گایا جاتا ہے۔ موسیقی کے نقطۂ نظر سے اسے لوک گیت اور نئے گیت کے مابین سمجھا کہہ سکتے ہیں۔ گمبھیرا میں بھگوان شیو کو ایک عام دیہاتی کے لباس میں دکھایا جاتا ہے جنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا اور اچھے اور برے دونوں کاموں کا ذمے دار بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ ادھر تازا اور نئے قسم کے گیت بھی ہر سال لکھے جا رہے ہیں، جو وقت کے حالات اور تقاضے کے مطابق لوگوں کی شکایتوں اور مانگوں کو پیش کرتے ہیں۔

غزل

کندن پرشاد کندن

جنوں کی خیرہ پر خطر سے گذرے ہیں
کسی کے دل سے کسی کی نظر سے گذرے ہیں
جنون و ہوش کی سوگند حوصلہ کی قسم
کچھ اہل جوش تری رہگذر سے گذرے ہیں
ہنوز درد جگر ہے رہین بے اثری
ہیں نالے مرے کہ باب اثر سے گذرے ہیں
وہ بدنصیب رہے سوز عشق سے محروم
جو بچ کے حسن کی ترچھی نظر سے گذرے ہیں
بھٹک رہے ہیں ازل سے جو آسمانوں میں
وہ قافلے بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں
ہزار ظلم پہ بھی بندھ گئی امید کرم
ابھی ادھر سے جو وہ خوش نظر سے گذرے ہیں
خار زیست میں کچھ بھی خبر نہیں کندن
کہاں کا عزم کیا ہے کدھر سے گذرے ہیں

مصر ۱۹۰۰ء میں

عابد رضا بیدار

پنجاب کے مشہور اخبار "پیسہ اخبار" کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں تقریباً چھ ہفتے یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت میں گذارے۔ ۲۷ مئی کو بمبئی سے روانا ہوئے اور ۱۹ نومبر کو بمبئی واپس پہنچے۔ ستمبر ۱۹۰۰ء میں "سفرنامۂ یورپ" کے نام سے انہوں نے اپنے خیالات سفر شائع کیے۔ یہ سفرنامہ تقریباً ایک سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً ۷ صفحے مصر پر ہیں۔

غیر ضروری اور انشائیہ باتوں سے قطع نظر انہوں نے اپنے جو کچھ مشاہدات بیان کیے ہیں وہ دم توڑتی، ہوئی انیسویں صدی کے مصر کے عینی شاہد کی حیثیت سے ایک معاصر دستاویز کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ ان کے اصل الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کے "سفرنامۂ مصر" کے ضمیمے کے طور پر یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ امرتسری کے سفرنامے مطبوعہ "نور افشاں" اکتوبر ۱۹۵۸ء کے سلسلے میں ایک اہم اعتراف کیا تھا۔ شبلی کا "سفرنامۂ روم و مصر و شام" ۱۹۱۲ء میں نہیں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے، لیکن اس میں مصر کے بارے میں کوئی نادر یا اہم اطلاع ہمیں نہیں ملتی۔ (بیدار)

"پورٹ سعید اچھا خاصا بارونق شہر (۱۸۹۰ء آبادی (۴۲۰۹۵) یورپین طرز کا سمندر کے کنارے اور نہر کے دہانے پر واقع ہے، شہر سے الگ ایک طرف تھوڑی سی آبادی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسبیوں کی آبادی ہے، جسے شہر سے الگ کر دیا گیا ہے۔ (ص ۹۰۶)

مصر میں ہر چیز گراں ہے، بلکہ قاہرہ میں تو بعض چیزیں اور مکانات یورپ سے بھی گراں ہیں۔ (ص ۹۰۷)

اجنبی کو پورٹ سعید میں جو بات سب سے نرالی معلوم ہوتی ہے وہ عورتوں کا ایک برقع یا پردے کا سامان ہے اور یہی اسکندریہ، قاہرہ اور سوئیز میں عورتوں کے چہروں پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک لکڑی یا پیتل وغیرہ کی ریل کی صورت کی چیز ہوتی ہے جس پر تانگا پروکر اس کو (ص ۹۰۸) سر سے اس طور سے باندھا جاتا ہے کہ یہ سیدا ناک کے قریب پر تا یم رہتا ہے، اور ناک کے نیچے سے ایک سیدا رومال ناف تک لٹکتا ہے۔ پیشانی پر سیاہ یا سفید پٹی باندھی جاتی ہے، جس سے صرف عورتوں کی آنکھیں ننگی رہ جاتی ہیں اور باقی جسم سیاہ چادر سے خوب ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ (ص ۹۰۹)

اسکندریہ میں "البصیر" "الاہرام" روزانا اخبار اور انیس الجلیس" ماہوار اور رسالے کے علاوہ ایک فرانسیسی اخبار "ایگزیپڈری" اور یونانی ایمپونا کے علاوہ یورپین اخبار بہت بکتے ہیں، یہاں میوہ جات کثرت سے ہیں، جو سے دکانیں لبریز نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر یورپ سے آئے ہوئے میوے بھی ہیں (ص ۹۱۳)

رات دن میں تین مرتبہ ریل گاڑی اسکندریہ اور قاہرہ کے مابین آتی جاتی ہے، فاصلہ ۱۳۱ میل ہے۔ میں ۷ بجے صبح سوار ہو کر ۱۱ بجے قاہرہ پہنچ گیا۔ (ص ۹۱۲)

رستے ہیں آٹھ دس اسٹیشن پڑتے ہیں، جن میں طنطا ہے بڑا ہے اور بوجہ سید احمد بدوی علیہ الرحمۃ کا مدفن ہونے کے مصریوں کی نظر میں ویسا ہی قابل احترام مقام ہے، جیسا کہ ملک مشرق کے مسلمانوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کا مزار ہے۔ مصری یوں بھی بڑے قبر پرست معلوم ہوتے ہیں۔ (ص ۹۱۴)

بھر چند کہ یہاں برقی ٹرین بہت دور تک چلتی ہے، اور یہاں کے تنگ بازاروں میں چھوٹی چھوٹی بس گاڑیاں اور وکٹوریا گاڑیاں گھوڑوں سے چلتی ہیں، لیکن رب سے بڑی سواری یہاں کے گدھے ہیں جو گو بہت چھوٹے قد کے ہوتے ہیں، مگر بڑے تیز گام، سبک رفتار اور مضبوط ہوتے ہیں، ان کا کرایا بھی سستا پڑتا ہے، اس لیے بہت لوگ اس سواری کو پسند کرتے ہیں۔ اس واسطے جا بجا بازاروں میں کسے کسائے گدھے مع فرمانوں کے نظر آتے ہیں، یہ گدھے والے اکثر لڑکے ہوتے ہیں جو تیز رفتاری میں اپنے گدھوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ (ص ۹۱۸)

اہل مصر ج کو گ کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ (ص ۹۱۸) ث کو ت کی طرح، جیسے کثیر کو کتیر اور ر کو جب کہ وہ آخر کلمے میں ہو ڈ کہتے ہیں مثلاً علی طریق الرشاد کو رشاڈ پڑیں گے۔ اسی طرح ق کو ا ف جیسے قدیم کو ادیم۔ (ص ۹۱۹)

بخلاف ٹرکی کے مصر میں بھی ہر مصری یورپین لباس نہیں پہنتا۔ (ص ۹۲۰)

سب لوگ سوائے ترکوں کے جو آفندی کہلاتے ہیں مصر کی تمام آبادی مع ترکی اور عربی جز کے ترکوں اور شامیوں سے شائستگی اور قابلیت میں بہت پیچھے ہیں۔ (ص ۹۲۲)

۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق نے انتقال کیا جب کہ موجودا خدیو مع اپنے چھوٹے بھائی کے دیانا میں تعلیم پاتے تھے..... خدیو عباس بڑے روشن ضمیر اور لایق حکمراں ہیں اور بلکل عالا درجے کے تعلیم یافتا حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے ہیں، سوائے عربی اور ترکی کے، فرانسیسی جرمنی اور انگریزی بخوبی جانتے ہیں، مگر چونکہ ایک طرف مصر پر ٹرکی کی ماتحتی اور دوسری طرف انگریزی فوج کی نگرانی کا بار ہے، اس لیے ان کی حکومت عجیب بے اختیاری حکومت ہے ؎ غم صیاد و فکر باغباں ہے
دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

گو گذشتا چھبیس ۲۶ سال سے مصر پر انگریزی فوج کا قبضہ ہے، لیکن چونکہ فرانس نے اس قبضے کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے انگریز مصر پر اپنی من مانی حکومت نہیں کر سکتے تھے، لیکن ۱۹۰۴ء سے انگلستان نے فرانس سے مصر کے متعلق یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ فرانس انگلستان کے قبضۂ مصر کی راہ میں حایل نہ ہو اور اس کے عوض میں انگلستان نے فرانس کو مراکش کی مداخلت کا پورا اختیار دے دیا۔ (ص ۹۲۶)

اس طرح سے جو کبھی انگلستان کے مصر خالی کر دینے کی امید تھی وہ بھی جاتی رہی ہے۔ گو پہلے پہل انگلستان اور فرانس نے قرضۂ مصر کے انتظام کے لیے مصر میں مداخلت کی تھی، مگر اب نہر سویز جو ہندستان کا شاہراہ ہے انگلستان کو ہرگز مصر چھوڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک کہ ملک ہندستان انگریزوں کے ہات میں ہے وہ مزدہ مصر کو اپنے ہات میں رکھیں گے۔ اس لیے مصر جو "سلف گورنمنٹ" اور مصر مصریوں کے لیے، کی خواہش سے قومی فریق قایم ہوا ہے، سردست کوئی امید نہیں کہ انگریز اس کی پکار کی طرف توجہ کریں۔ (ص ۹۲۶) فرانس اب ۱۸۸۷ء کی طرح تخلیۂ مصر کا مطالبا نہیں کر سکتا۔ ٹرکی اپنی حالت میں خدا جانے ہے، ان حالات میں سوائے اس کے کہ مصر مدت مدید تک انگریزی نگرانی میں رہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ گو ظاہراً انگریزی ایجنٹ صرف

نگرانی کرتا ہے، لیکن درحقیقت حکومت کی زمام کار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ (ص ۹۲۷)

لیکن یہ مرتع بے انصافی ہوگی اگر ہم انگریزی قبضے مصر کی برکتوں کو صرف اس وجہ سے نظر انداز کر دیں کہ انگریزوں نے بے انصافی سے اور اپنے ابتدائی وعدوں کے خلاف مصر پر اپنے قبضے کو طول دے رکھا ہے۔ اگر صرف ایک بات، آزادی پریس ہی کو لے لیا جائے تو اس کی بدولت اہل مصر کو اس قدر فوائد حاصل ہوئے ہیں کہ جن کا دوسرے ملکوں میں آسکنا مشکل ہے۔ اس وقت مصر بلحاظ اشاعت اخبارات، پولیٹیکل مضامین پر آزادی سے بحث کرنے اور ہر قسم کی علمی کتابیں چھاپنے میں یورپ کے اچھے اچھے ملکوں کے برابر ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت صرف ۱۸۹۷ء تک کے اعداد ہیں۔ انگریزی قبضہ، بغاوت عربی پاشا فرو کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا اور اس پندرہ سال کے عرصے میں مصر میں حسب ذیل مادی ترقی ہوئی۔

۱۸۸۲ء میں مصر کی کل آبادی ۶۸ لاک تیرہ ہزار تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۷۰ لاک ۳۴ ہزار ہوگئی۔ شہروں اور موضعوں کی تعداد ۱۳۲۴ تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۲۸۱۴۱ ہوگئی، محاصل ۹۰ لاک پونڈ تھے جو ۱۸۹۷ء میں ایک کروڑ ایک لاک پونڈ تک پہنچ گئے۔ (بجائے بعض محصول اور ٹیکس کاشتکاروں کے معاف کر دیے گئے) تجارت درآمد ۱۰ لاک ۸ ہزار ٹن تھی جو ۲۲ لاک ۶۲ ہزار ٹن ہوگئی، محصول چنگی اڑھائی لاک پونڈ۔ تیس لاک ۹۳ ہزار پونڈ تک پہنچ گیا۔ کل ملک میں ۱۴۴ ڈاکخانے تھے جو ۸۸۷ ہوگئے، تقریباً پانچ ہزار لڑکے مدارس میں تھے جو دس ہزار ہوگئے اور معلموں کی تعداد سہ چند ہوگئی، ۱۸۸۶ء میں خرچ فوج ۴۲ ہزار پونڈ تھا جو ۱۸۹۷ء میں ۸ لاک ۲۶ ہزار پونڈ سے اوپر ہے، (۹۲۸ ص) ۱۸۸۰ء میں مصری قرضے کی تعداد (۹ کروڑ ۷۸ لاک پونڈ تھی اور سود و ادائیگی ۴۰ لاک ساٹھ ہزار پونڈ تھا جو ۱۸۹۷ء میں (۹) کروڑ ۶۰ لاک پونڈ اور سود وغیرہ ۳۸ لاک ۲۳ ہزار پونڈ رہ گیا، اسی طرح آج تک بہت ترقی ہو چکی ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں کل محاصل ایک کروڑ ۴۸ لاک پونڈ سے متجاوز تھے اور تعداد طلبا مدارس سرکاری میں ۱۹۰۵ء میں انیس ہزار تک بڑھ گئی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ ڈفرن نے حالات مصر کی جو رپورٹ لکھی تھی اس میں اس ملک کی تعلیم کا یوں تذکرا کیا تھا، (ص ۹۲۹) اس وقت مصر میں جتنے مدرسے موجود ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔

اول جامع الازہر۔ اس میں آٹھ ہزار طالب علم ہیں جن کو تین سو استاد تعلیم دیتے ہیں، اور اس میں علوم ذیل پڑھائے جاتے ہیں۔ علم کلام، فقہ، نحو، منطق، اور عربی زبان دانی۔

دوم۔ وہ مدرسے جن کو مصر میں غیر ممالک کے لوگوں اور ان کی مشنری جماعتوں نے قایم کیا ہے۔ ایسے مدارس کی تعداد ۱۵۲ ہے اور ان میں ۱۲۲۴۷ طالب علم پڑھتے ہیں۔ طلبا کی اس تعداد میں ۶۴۱۹ خاص مصری لڑکے ہیں یعنی ۵۲ فی صدی۔ اور ان مدارس میں بعض مدرسوں کو حکومت مصر کی طرف سے مالی مدد بھی ملتی ہے۔

سوم۔ خاص حکومت کے مدارس اور ان کے چار درجے ہیں (ص ۹۲۹-۹۳۲)

۳۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو سرکاری نگرانی میں آٹھ مختلف پیشوں کی تعلیم کے کالج، چار ٹیکنیکل اسکول، ۳ سکنڈری اور ۳۴ پرائمری اسکول تھے جن میں بنا بر یا ایک حد تک فرانسیسی یا انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں ۷۴۸ مدرسین اور ۱۰۳۱۲ شاگرد تھے جن میں صرف عربی زبان میں تعلیم ہوتی تھی۔ ان میں (۲۵۲) استاد اور ۸۳۵ استاد تھے (جن میں ۱۹۰۲ لڑکیاں تھیں) اور پرائیوٹ پرائمری اسکول اور ۴۴۳۲ کتاب جنہیں سرکاری افسران

۳۴۸۳ لڑکیاں تھیں۔ ان کے علاوہ تھے۔ خاص ٹیکنیکل اور ۹ ایریگری تھے جن میں

تعلیم معائنا کرتے ہیں، ان کے علاوا ہیں۔

جامع الازہر میں ۹۷۵۸ طلبا جو علوم دین کی تعلیم ۳۱۷ استادوں سے حاصل کرتے ہیں اور جامع الاحمدی طنطائیں ۵۱۶۱ طلبا، ۷ استادوں سے علم دین پڑھتے ہیں۔

مصر کے ان سرکاری، ابتدائی (پرائمری) اور تجہیزی یا ثانوی (ہائی) اسکولوں میں نصاب تعلیم حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے۔ (ص ۹۴۳)

مدارس ابتدائی۔ القرآن والاسلام، اللغۃ العربیہ، الترجمہ، الحساب، الہندسہ (مبادی قلیلہ) انگلیزیہ (او فرانسیہ)، دروس الاشیاء، الجغرافیہ و الرسم (مصوری)، التاریخ (مبادی)۔

مدارس ثانوی۔ الترجمہ، اللغۃ العربیہ، الانگلیزیہ (او الفرانسیہ)، الریاضیات، الجغرافیہ، التاریخ، الطبیعیات، ایکیمیا، الرسم (مصوری) التمرین العضلی (ورزش)۔ (ص ۹۳۵-۹۳۴)

اگرچہ مرحوم شیخ محمد عبدہ کی جد و جہد ترقی الازہر میں ناکام رہی تاہم انہوں نے طلبا کے دلوں میں تاریخ اور طبیعیات وغیرہ علوم جدید کے مطالعے کا شوق ضرور پیدا کر دیا جس کی وجہ سے اب بعض طلبا کسی قدر ان علوم کی کتابیں دیکھتے اور آزادی بحث اور خاہش وسعت معلومات اور مفید علوم میں تمیز کرنے کی صفات سے بہرہ اور ہو گئے ہیں، اس وقت ازہر میں دس ہزار سے زاید طالب علم باعتبار سکونت مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور ہر فرقا مسجد کی چھت یا پڑوس کے ایک مکان میں رہتا ہے، جس کے اندر بہت سے حجرے ہیں اور یہ مکان رواق کہلاتے ہیں۔ الازہر میں ایسے ۲۷ رواق ہیں، منجملہ ان کے ۱۱ خاص ہر زمین مصر کے باشندوں کے لیے ہیں جن کی تقسیم شہروں یا مذاہب کے لحاظ سے ہے (ص ۹۴۰)۔ معلوم ہوا کہ نہ طلبا کی کوئی مستقل جماعت بندی ہے، نہ وقت کی پابندی، رجسٹر حاضری نہ سالانا امتحان کی قید۔ اس لیے بعض لوگ ساری ساری عمر میں ازہر میں خرچ کر دیتے ہیں اور کسی منزل تک نہیں پہنچتے۔ (ص ۹۴۳) ۱۹۰۲ء میں (ص ۹۰۳) ہندستانی طلبا تین تھے۔ (ص ۹۴۴)

قاہرہ میں بہت سے روزانا، ہفتاوار اخبار اور ماہوار رسالے عربی زبان میں شایع ہوتے ہیں جن میں بعض مسلمانوں اور بعض عیسائیوں کے ہیں۔ روزانا اخبارات میں المویدب سے بڑا اخبار ہے اور اب اللواء بھی ترقی کر رہا ہے، اور برقی طاقت سے شایع ہوتا ہے۔ گو المویدکے ہشیار مالک شیخ علی یوسف صاحب کی لیاقت اور رسوخ سے ان کا سکہ بیٹھ چکا ہے کہ مصر کے اچھے اچھے لوگ المویدسے ڈرتے ہیں، المویدد ولت عثمانیا کا طرفدار ہے، مگر انگریزی قبضۂ مصر سے بھی ظاہراً مخالفت نہیں کرتا، اور شاید دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ مجھ سے شیخ بڑی مہربانی اور محبت سے پیش آے اور ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری روز جب میں ان سے رخصت ہوا، تو افسوس کرتے تھے کہ میں نے اتنی جلدی رخصت ہونے کا ارادا کر لیا۔ اس پر انہوں نے میری کچھ کیفیت حسن ظن کے ساتھ اس روز کے المویدمیں شایع کی اور مجھے اپنا فوٹو گراف بھی دیا۔ یہ دبلے پتلے چھوٹے قد کے آدمی ہیں اور دھنی لباس پہنتے ہیں۔ سواے عربی زبان کے کوئی مغربی زبان نہیں جانتے، مگر عربی لکھنے اور معاملات کے سمجھنے میں بڑے لایق ہیں۔ ان کے نایب ایڈیٹر انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ دوران گفتگو میں، میں نے ان سے ذکر کیا کہ ہندستان میں انگریزی زبان کے اخبارات دیسی (ص ۹۵۸) زبان کے اخبارات سے زیادا معزز اور بڑے ہوتے ہیں، انہوں نے کہا مصر میں صورت اس کے برعکس ہے۔ وہاں عربی زبان کے اخبارات سب سے بڑے ہیں، میں نے پوچھا المویدکی

اشاعت کس قدر ہے۔ آپ نے کہا آٹھ ہزار روزانا ہے۔ یہ اشاعت ہندستان کے شاید ہی کسی انگریزی اخبار کی بمشکل ہو۔ مصر میں بازاروں میں اخبارات بیچنے کا رواج بہت ہے اور عام لوگوں میں اخبار خرید کر پڑھنے کا مذاق بھی خوب پیدا ہو گیا ہے۔

میں مصطفےٰ کامل صاحب ایڈیٹر و مالک اللواء سے بھی ملا جنہوں نے ابھی سال گذشتا میں روزانا اخبار جاری کیا تھا، لیکن ان کی ذات کی شہرت ان کے اخبار سے بھی زیادا ہے۔ یہ ایک چھریرے بدن کے خوبصورت نوجوان ہیں، یورپین لباس پہنتے ہیں۔ پہلے انہوں نے قانونی پیشے کے لیے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن حب وطنی نے جوش مارا، انہوں نے اس بات کی تائید میں لکچر دینے شروع کیے کہ انگلستان نے مصر میں عربی پاشا کی بغاوت کے وقت فوج بھیجتے ہوئے وعدا کیا تھا کہ جب امن ہو جائے گا تو مصر خالی کر دیا جائے گا، لیکن اب اس بات کو مدت طویل گذر چکی ہے اور مصر میں ہر طرح سے امن بھی ہے، اب انگلینڈ اپنے وعدے کو ایفا کرے۔ یہ عربی زبان کے علاوہ فرانسیسی میں بھی اچھی طرح تقریر کر سکتے ہیں، انہوں نے خیر و عافیت کے بعد مجھ سے پوچھا کہ ہندستان میں تم لوگوں کا کیا حال ہے، تو میں نے کہا اچھا ہے، ہم لوگ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے زیر سایا ہمیں ہر طرح کی اصلاح اور ترقی کی آزادی حاصل ہے۔ (ص ۹۵۹)

میں نے جوانان مصر کی تعلیم، قومی خیالات اور خلوص اور کیریکٹر کی نسبت ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا کہ بے شک وہ بہت ہشیار معقول اور اہل خلوص ہیں، فاتحے پر کہا کہ مصر میں کئی شیر غاروں میں سوتے ہیں جو بوقت ضرورت نکل آئیں گے، لیکن میرے ہمراہ ہوں، محمد شکری اور عابد بن آفندی نے مجھے رستے میں یقین دلایا کہ مصر کے نوجوان اکثر نالائق ہیں۔ بہرحال مصطفےٰ کامل صاحب ہونہار اور پرجوش آدمی معلوم ہوتے ہیں اور ان کا اخبار ترقی کر رہا ہے۔ میرے واپس آنے کے بعد مصطفےٰ کامل پاشا کو بہت کامیابی ہوئی ہے، ان کے ہم خیال لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور ۱۹۰۷ء سے انہوں نے مصریوں کے قومی گروہ کے اغراض کی اشاعت کے لیے روزانا اللواء کے ایک فرانسیسی اور ایک روزانا اخبار "نے تاندرد ایجپشین اسٹینڈرڈ" جاری کیے ہیں۔ مصر کی آزادی کے لیے کوشش کرنا اور باب عالی کی حمایت مصطفےٰ کامل پاشا کی پالیسی کا خلاصا ہے۔

"المقطم" یہ مسیحی روزانا اخبار انگریزی قبضے مصر کا ایکلا آرگن ہے۔ فارس نمر، اس کا ایڈیٹر ہے۔ یہ اخبار خبروں میں سنات کا لحاظ رکھ کر اندرونی معاملات پر خوب لکھتا ہے، مگر عثمانی حکومت کی پالیسی پر ضرور موہ آتا ہے، وہ ترکوں پر بعض اوقات معقول اعتراض کرتا ہے، سب سے مقدم پالیسی اس اخبار کی انگریزوں کی رضا جوئی ہے۔ (ص ۹۶۰)

"الاہرام" یہ بھی عیسائی روزانا اخبار ہے، جو عام مصری پبلک اور عثمانی پالیسی کو راضی رکھنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات یہ فریق مخالف کا بھی پاس کرتا ہے، اور عموماً بے روو رعایت لکھتا ہے ان کے علاوہ "المیزر" "الظاہر" وغیرا اور کئی ایک روزانا اور ہفتاوار یا تقریباً اخبار بھی قاہرہ سے شایع ہوتے ہیں۔ ماہوار رسالے الہلال، المنار، الحیات، المقطف، انوار الاسلام وغیرا کئی نکلتے ہیں کہ جن کی نہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں سے رشید آفندی صاحب ایڈیٹر المنار سے ملا۔ یہ بڑے لائق اور فاضل نوجوان ہیں۔ السید محمد عبدہ، صاحب مفتی دیار مصر آپ کے اعزا سے ہیں۔ آپ نے ان سے بہری ملاقات کرائی۔ مفتی صاحب علوم دینیات میں فاضل اجل ہیں اور زمانے حال کے حالات سے بھی بے خبر نہیں۔ آپ اپنے عالا عہدے کی بہت سی ذمے داریوں کے علاوہ اکثر سرکاری اور

غیر سرکاری علمبوں کے رکن رکین ہیں اور رفاہ عام کے کاموں میں مدد کرنے کے دل سے ساعی رہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے ایک روز مجھ سے مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی کیفیت دریافت کرکے کہا کہ کیا ایسی دنیاوی تعلیم سے طلبا مذہب کو تو نہیں بھول جاتے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا سوائے اسلام کے دیگر ادیان کے نیک لوگ بھی مستحق مغفرت ہیں یا نہیں، فرمایا کہ جو نیک بندے خدا کو مانتے ہیں وہ بخشے جائیں گے، آپ نے اپنی تصنیف سے رسالا التوحید اور تقریر مفتی دیار مصر کے کئی نسخے دیے۔ ایک روز میں ازہر میں ان کے درس تفسیر (ص ۹۶۹) میں بھی شامل ہوا، مگر افسوس ہے کہ ۱۹۵۰ء میں ایسے علاما کا انتقال ہوگیا ہے۔ مفتی صاحب نزالیسی بول سکتے تھے اور کہتے تھے کہ قصد ہے کہ چھ ماہ انگلستان میں رہ آوں تاکہ انگریزی بولنا سیکھ لوں اللہ! کیسے اولوالعزم بزرگ تھے۔ (ص ۹۶۲)

مصر میں بیماری چشم کا طاعون ضاہت ہے، مصری اکثر شافعی اور مالکی مذہب کے پیرو ہیں، اس لیے اس لیے تمام پانی کے جانور کھا جاتے ہیں، مصری شراب بھی عموماً پیتے ہیں اور بہت کم ہونگے جو نہ پیتے ہوں۔ (ص ۹۶۴) مصر میں سلام کا طریقہ مجھے بڑا عجیب معلوم ہوا۔ دو شخص ایک دوسرے سے مل کر آپس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، چلیے سلام ہو چکا۔ شام کی طرح یہاں بھی لوگ رخصت کے سلام کے وقت "مع السلامۃ" کہتے ہیں۔ عیسائی جب ملتے ہیں تو السلام علیکم کے بجائے "سعیدی" کہتے ہیں۔ "سیدی" و "مولائی" کہنے کا تکلف کی گفتگو میں رواج ہے۔ سر آنکھوں پر رکھنے کے لیے "بالراس والعیون" یا "عیونی" بھی کہتے ہیں۔ (ص ۹۶۵)

۹ نومبر کی شام کو میں جہاز پر سوار ہوگیا، اس جہاز کا دوم درجے کا کرایا سویز سے ۱۹ پونڈ، انتنگ اور سوم درجے کا کرایا ۱۵ پونڈ بمبئی تک تھا۔ (ص ۹۶۶)*

* ۱۲ نومبر کو صبح سے خیل کر ۱۹ کی شب کو ۱۲ بجے بمبئی پہنچا۔ (ص ۹۶۷)

چشمہ خوں بستہ

آج پھر قافلۂ غم کا گذر ہے دل سے
زخم پندار لیے طبع گرانبار لیے
آج پھر مہر بہ لب جی سے گذرنے کی ہے تاب
غم انکار لیے حسرت اقرار لیے

جمع پھر دل میں ہے ناکام امنگوں کا ہجوم
آنسوئے دیدۂ پرياس میں آہ خاموش
آج پھر کشمکش ضبط و فغاں جاری ہے
مضطرب ہے سر احساس میں آہ خاموش

کارواں غم کا ٹھہر جاتا جو دم بھر کے لیے
ساتھ بھٹکی ہوئی یادوں کو بھی لے لیتا میں
زندگی کون بڑی بات تھی یہ تیرے لیے
سمت ماضی اگر آواز بھی دے لیتا میں

عالم گمشدگی مجھ سے نہ پوچھے کوئی
مجھ کو اپنی ہی مدار دور سے آئے جیسے
یوں ٹھٹھک کر رہ ہستی میں کھڑا ہوں گم سم
کوئی چھپ چھپ کے اشاروں میں بلائے جیسے

خود کو اے محویت باد! کہاں کھویا ہے
طور غم یاد رہا طور خوشی بھول گیا!
کیسے اے دیدۂ تر ربط نظر ٹوٹ گیا!
دور غم یاد رہا دور خوشی بھول گیا!

آج دل مرگ محبت کی خبر لایا ہے
کس کے اشکوں سے ہے بھیگی ہوئی شام فرقت
سسکیاں لے کے ہوا دل سے لپٹ کر روئی
دل نے رو رو کے سنا کسی کا پیام فرقت

چشم خوں بستہ میں رہ رہ کے ابھر آتے ہیں
کوئی دو مہندی رنگے ہاتھ بہ انداز وداع
اب یہ معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اے دل
آج تک تیر ادیا ساتھ بہ انداز وداع

ماسکو کا "معصر تھیٹر"

ن۔ لی۔ راد کیا نیل نسے

ادا کار ایدا تولما چیوا لاچیوالیر مونتوف کے ڈرامے "مسکراد" میں نینا کا پارٹ ادا کرتی تھی۔ نینا ارمینن کی نوجوان، حسین اور بھولی بھالی بیوی ہے جو عین جوانی کے عالم میں دنیا سے اٹھ جاتی ہے۔ ایدا اشکیسپیر کے ڈرامے "کنگ لیئر" کے ریگان کے روپ میں جلوہ گر ہوتی تھی جو مغرور اور بیرحم شہزادی ہے اور اسے اپنے جذبات پر بالکل قابو نہیں ہے۔ یہ اہم دو کردار بہت ہی نوخیز اداکارا کے سپرد کیے گئے تھے اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے جو ایک صوبے (سمراتوف) سے آئی تھی۔ اتنی قبل از وقت ذمہ داری کا کام کسی نئے اور انجانے اداکار کو اسی وقت سپرد کیا جا سکتا ہے، جبکہ اس کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا اور اعتماد ہو۔ ایدا تولما چیوا نے ماسکو کی ایک بڑی تھیٹریکل کمپنی "موس سوویت تھیٹر" میں آنے کے بعد جلد ہی وہاں کے کارکنوں میں بڑی وقعت حاصل کر لی اور وہ اس کے کمال کی مداح ہو گئی۔

ایک اداکار کو اور کیا چاہیے؟ ماسکو، ایک مشہور و معروف تھیٹر اور اہم رول! ایدا کے لیے اس سے بڑھ کر کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی! لیکن اس کے لیے یہ کافی نہ تھا۔ دو سال قبل گرمی کے موسم میں شام کو ایک نئی تھیٹر کمپنی "ماسکو آرٹ تھیٹر" کے اسٹوڈیو اسکول میں اپنا بھلا سا تماشا پیش کر رہی تھی، آج وہ "ہمعصر تھیٹر" تماشائیوں میں بہت مقبول ہے اور اس کا ہر نیا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے، لیکن دو سال قبل چند ناقد اسٹوڈیو کے ایک اوسط درجے کے کمرے میں اس تھیٹر کا پہلا تماشا دیکھنے کے لیے محض تجسس اور سرپرستی کے جذبات کے تحت جمع ہو گئے تھے۔ ڈراما شروع ہوا اور پہلے ہی منظر میں لوگوں کو احساس ہوا کہ اس پیشکش میں بڑا خلوص اور تازگی ہے، ایک ایسا انوکھا پن جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اس شام روٹوف کا ڈراما "زندۂ جاوید" پیش کیا گیا رہا تھا (ظلم بگلے اڑتے رہے)۔ اسی ڈرامے کا بنیاد پر تیار کیا گیا ہے) اس تماشے نے اس تھیٹر کی قسمت کا فیصلا کر دیا یعنی یہ کہ نئے تھیٹر کے قیام کی اجازت مل گئی۔ اس ڈرامے نے ایدا تولما چیوا کے مستقبل کا بھی فیصلا کر دیا اور وہ اس تھیٹر سے وابستہ ہو گئی۔ بہرحال یہ بیان بلکل صحیح تو نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ایدا تولما چیوا اور اس کے دوسرے ہمعصر اداکار بہت پہلے سے دل و جان سے وابستہ ہو چکے تھے۔ یہ اداکار تماشے ختم ہونے کے بعد رات گئے تک یہاں آتے آپس میں مشورے ہوتے اور ریہرسل کیے جا سکتے۔ یہ لوگ اتوار کے دن اور فرصت کے اوقات میں بھی برابر آتے رہتے تھے۔ ایدا تولما چیوا بھی "موس سوویت تھیٹر" سے علیحدہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے نینا اور "کنگ لیئر" کی شہزادی کے پارٹ کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ "ہمعصر تھیٹر" میں اس نے سب سے پہلے ڈراما "زندۂ جاوید" میں ایرینا کا پارٹ ادا کیا۔ ایرینا ایک کم گو لڑکی ہے، جس کی آرزوؤں کو جنگ نے ملیامیٹ کر دیا۔ وہ نہ تو شادی کر سکی اور نہ ماں بن سکی۔ جنگ نے اس میں ایک بچے انسان کی طرح محسوس کرنے اور زندگی بسر کرنے کا شدید جذبا پیدا کر دیا۔ ایدا تولما چیوا نے کہا اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ اداکار کے لیے سب سے خشی کی بات کون سی ہے تو میں بغیر سوچے فوراً جواب دیتی — کامیابی ایسے رول ادا کرنا جیسے "بغیر جہیز کی دلہن" میں لاریسا تیکیشیر کی جولیٹ، میں اب بھی یہ رول ادا کرنا چاہتی ہوں، بلکہ اس کی بیحد خواہش مند ہوں، مگر اصلی مسرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ہمارے کام سے عوام کو موجودہ زندگی میں مدد ملتی ہے۔ یہ مقصد ہمعصر کرداروں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے تھیٹر کا نام بھی "ہمعصر تھیٹر" رکھا۔ ایدا تولما چیوا نے جب یہ بات کہی تو مجھے ان کے بہت سے پارٹ یاد آ گئے اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی ان کے الفاظ میں گہرا خلوص ہے۔ اسی قسم کا ایک کردار تھا رانے ا۔ ولودین کے ڈرامے "پانچ شاموں"

جی۔ ام۔ خان، نے مطبع ابراہیمیہ، کنٹلمنڈی، حیدرآباد سے چھپوایا۔



U
2 9 MAY 66

حیدرآباد ۲ - آندھراپردیش

ایڈیٹر - جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظور

رجسٹرڈ نمبر — اتیچ (۱۸۴)
جلد (۲۰) — نمبر (۳)
چندا سالانا — آٹھ روپے
بہمن سنہ ۱۳۶۹ف — دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء

ہندستانی ادب

حیدرآباد ۲ - آندھرا پردیش
ایڈیٹر
جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت انقر موہانی وارثی	۸	
۳	دو غزلیں	ماجد ادیب بریلوی (مرحوم)	۹	نوری کرن
۴	دیوان غالب	عارف نیازی	۱۰	جدوجہد
۵	ماجد ادیب بریلوی اور ان کے کلام پر ایک نظر	احقر کاشی پوری	۱۵	نوری کرن
۶	قطعات	احقر کاشی پوری	۱۹	سب پس
۷	زمزمۂ تغزل	رتن پنڈوروی	۱۹	رہنمائے تعلیم
۸	مثنوی کا روپ اور کلا کام	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲۰	صبا
۹	دنیا کی مائیں	عصمت چغتائی	۲۴	سوویت عورت
۱۰	عزم جواں	محمد ادریس خادم سیتاپوری	۲۶	شمع ادب
۱۱	پل کے بچے	ستیش بترا	۲۷	خیاں
۱۲	غزل	آلم مظفر نگری	۳۲	یہاں

ہمارے خیالات

ایک خط کی روشنی میں

"منادی" کے تبصرے کا جواب دیتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ ایک دو اعتراضوں کا جواب دینا ہے۔ ایک اعتراض کا جواب تو ہم نے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ دیا ہے، اور اب دوسرے اعتراض کا جواب، اس کی حیثیت اور مناسبت سے دینا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم اس خط کو جوں کا توں پیش کیے دیتے ہیں، اس کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرینگے۔

سہانہ - سوماجی گوڑہ
حیدرآباد
۲۶ فروری ۵۹ء

مکرمی جی۔ ام۔ خاں صاحب

سلام علیکم۔ آپ کا شمارہ نمبر (۵) "ہندستانی ادب" دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ ایک قدیم عثمانین نے اردو ادب کی خدمت شروع کی ہے، لیکن بغور مطالعہ سے واضح ہوا کہ میرا اندازہ صحیح نہیں تھا۔

کیا مجھے اجازت ہے کہ اردو ادب کے ایک خادم کی حیثیت سے کچھ عرض کروں؟ اگر میری تنقید تلخ ثابت ہو تو مجھے درگذر فرمایئے کیونکہ تنقید ہی ادب کی جان ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا پرچہ اردو ادب کے لیے بڑی رکاوٹیں پیدا کرے گا۔ جس ہیچ سے آپ نے پرچہ شروع کیا ہے، وہ میرے لیے سوہان روح سے کم نہیں۔ مجھے بتلایئے کہ ہندستانی ادب جیسی "شئے" کہاں ہے جس کو زندہ کرنے کی سعی لاحاصل میں آپ سرگرم ہیں؟ ہمیں حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ یا تو اردو زبان آگے بڑھے گی یا ہندی۔ مہاتما جی نے "ہندستانی" کے لیے پرزور وکالت فرمائی تھی، لیکن ہندی ہماری قومی زبان بن گئی اور اردو دیگر سلم زبانوں میں سے ایک ہے۔ "ہندستانی" جیسی زبان دستور ہندستان کے کسی صفحے پر نظر نہیں آتی ہے۔

بہرحال مجھے رنج ہے کہ آپ کی کوشش اردو ادب کے لیے بڑی حد تک نقصان دہ ثابت ہوگی۔ "ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا" ممکن

ہے کہ اپنے لئے وسیع میدان حاصل نہ کر سکے۔ جس زبان کو آپ "ہندستانی" زبان سے یاد فرماتے ہیں، وہ زبان رسالہ کے کئی صفحات پر دم توڑتی نظر آتی ہے۔ نہ تو "ہندستانی" کو آپ نے اپنایا ہے اور نہ ہی صوتیاتی اصول پر رسالہ کی کتابت ہوئی ہے۔ کیا "ہندستانی زبان میں "عبارت" "معیاری" "مفہوم" جیسے الفاظ استعمال ہوں گے جو آپ کے معیار سے عام نہیں۔

مضامین کا انتخاب بھی معیاری نہیں معلوم ہوتا۔ نظم اور غزل نے پرچہ کے ایک بڑے حصہ پر جگہ پائی ہے جو مناسب نہیں۔ مختلف علمی معیار کے حضرات کے ذوق کو پورا کرنے کی کوشش بھی جاذب نظر نہیں، جبکہ پرچہ معمولی ضخامت کے ساتھ شائع ہوتا ہو۔

مجھے امید ہے کہ سطور بالا پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایا جائے گا۔ میری تنقید تخریبی ہے، تعمیری نہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ کا پرچہ اردو کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتا یا پھر ہندی کو پروان چڑھانے میں پیش پیش ہوتا! شکریہ — خیر طلب

علی محمد موسوی

اس خط کے پیش کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم کڑی سے کڑی تنقید سے بھی نہیں گھبراتے۔ خط کا شائع کرنا نہ کرنا ہمارے ہاتھ بات تھی۔ خط کو آئے کافی عرصہ ہوا مگر علی محمد موسوی نے اس کی اشاعت کی طرف ایک بار بھی ہمیں توجہ نہیں دلائی تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنے فرض کو محسوس کیا اور اس خط کی اشاعت ضروری سمجھی۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ موسوی جیسے FANATICS اور بھی ہیں جو اردو کی محبت میں عقل کے اندھے ہو گئے ہیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے، اور جواہر لال نہرو کے بعد اردو کا کیا حشر ہوگا؟ وہ تو "شمع اردو" کے پروانے ہیں، جو اس کے عشق میں اندھا دھند فنا ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی دیوانوں کی دماغی اصلاح کے لیے ہم نے اوپر کے خط کی اشاعت اور اس کے جواب کو ضروری خیال کیا۔

خط کی عبارت سے صاف ہے، سو بوکھلاہٹ ظاہر ہے، اور اس کے ہر جملے اور ہر ہر شبد سے اردو سے بے پناہ عقیدت اور محبت کا پتا چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اندھی محبت میں توازن دماغ باقی نہیں رہتا، اور جب توازن دماغی باقی نہ رہے تو وہ جنون حد ہی بول اٹھے گا کہ — ع "بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ" اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ بے چارا خط لکھنے والا، غیر غلط اور اوٹ پٹانگ سب ہی کچھ بک گیا ہے —

ذرا غور تو فرمایئے کہ کتنا پاک اور نیک جذبا ہے آپ کا، کہ جب آپ نے رسالے پر ایک اچٹتی نظر ڈالی تو یہ معلوم کر کے آپ کی "مسرت" کی کوئی انتہا نہ رہی کہ "ایک قدیم عثمانین نے اردو ادب کی خدمت شروع کی ہے"۔ حالانکہ یہ خود آپ کی جلد بازی کا غلط نتیجہ تھا، جس کا اعتراف ان شذروں میں کیا گیا ہے "لیکن بغور مطالعہ سے واضح ہوا کہ میرا اندازہ صحیح نہ تھا"۔ یہی آپ کی رائے میں ہر شخص کو آپ کا ہم خیال ہونا ضروری ہے، ورنہ دوسرے کا کام اور کارنامہ آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ "ایک خادم کی حیثیت سے" آپ دوسروں کو بھی غالباً "غلام ذہنیت" بنانا چاہتے ہیں، کہ دوسرے بھی آپ کی طرح غلامانہ اور اندھی تقلید کریں! آپ کی تحریر "تنقید" ہی کب ہے جو صحیح ثابت ہو۔ ہم نے شروع ہی میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کے خط کے شائع کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ جیسے اردو کے دیوانے "خادموں" کے دل اور دماغ سے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، جو "ہندستانی ادب" سے متعلق ہیں۔ آپ کے اس معصومانہ "افسوس" پر ہمیں ترس اور رحم آتا ہے کہ ہمارا پرچا "اردو ادب کے لیے رکاوٹیں پیدا کرے گا"۔ یہ ایک کھلی حقیقت

ہے کہ ہمارا پرچا "ہندستانی زبان" اور ادب کی ہوا کر رہا ہے، ایسی صورت میں وہ لازماً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھائے گا اور دوسری زبانوں کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے گا۔ اس میں شک اور شبے کی کوئی گنجایش ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے، آپ ہمالائی عقل کے مالک ہیں ــــ

"ہر ایں عقل و دانش بیا ید گریست"

آپ کی معلوماتی کمی کا ایک اور نمونا ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں "جس پنج سے آپ نے پرچا شروع کیا ہے وہ میرے لیے سوہان روح سے کم نہیں"۔ غالب نمبر (۵) سے آپ نے یہ نتیجا نکالا کہ رسالے کو جاری ہوئے صرف پانچ ہی مہینے ہوئے ہوں، اس لیے نہایت ہی حوصلہ انداز میں لکھا ہے کہ "جس پنج پر آپ نے پرچہ شروع کیا ہے" اور جلد یا سال کے انیسویں عدد کو خدا ان کے الفاظ میں شاید انہوں نے "درگذر" کر دیا۔ ایسے جذباتی اور بھولے بھالے لوگ کیا خاک کسی چیز پر "تنقید" کر سکتے ہیں، جبکہ ان میں کسی چیز کے صحیح طریقے پر سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو۔ رہا "سوہان روح" کا سوال، اس کا نہایت ہی آسان حل ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں ــ آپ کا بھلا، سوامی گوڑا، "حسین میں گر" سے ملا ہوا ہی تو ہے، آپ چاہیں تو اپنی روح" کو "سوہان" سے ہمیشا ہمیشا کے لیے نجات دلا سکتے ہیں ــ

پھر وہی مہمل سی باتیں کہ "ہندستانی ادب" جیسی "شے" کہاں ہے، جس کو زندہ کرنے کی سعی لاحاصل میں آپ سرگرم ہیں؟ عجب نامعقولیت پسند ہیں آپ! پھر وہ کون "شے" تھی جس کے دیکھنے سے پہلی ہی نظر میں، تعصب اور نفرت کے ناپاک جذبات ابھر آئے تھے آپ میں! ایک موجود چیز کے بارے میں آپ کا یہ مہمل خیال کس حد تک واجبی ہو سکتا ہے کہ اس کے "زندہ کرنے کی سعی لاحاصل" کی جا رہی ہے۔ وہ "شے" بیس سال سے "زندا" ہے اور "زندۂ جاوید" رہے گی، تا کے آپ جیسے متعصب افراد کے لیے مستقل طور پر "سوہان روح" کا کام کرتا رہے!

ابھی ابھی آپ کے بھولے پن کی داد دی تھی اس بارے میں ہمارا خیال غلط نہ نکلا، چنانچہ آپ کی معصومیت کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو کہ "ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ یا تو اردو زبان آگے بڑھے گی یا ہندی"۔ مہاتما جی نے ہندستانی کے لیے پرزور وکالت فرمائی تھی، لیکن ہندی ہماری قومی زبان بن گئی اور اردو دیگر جملہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ "ہندستانی" جیسی زبان دستور ہندستان کے کسی صفحہ پر نظر نہیں آتی۔ یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں "یا تو اردو زبان آگے بڑھے گی یا ہندی" کیا کہنے اس عقل کے! اور کتنے ہی نادان ہیں آپ! اردو اور ہندی کی گھوڑ دوڑ! دونوں کا مقابلا تو خوب کیا آپ نے، ہندی کی ترقی اور ترویج پر سالانا کروڑوں روپیا پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے، اور "بی" اردو کو حکومت آندھرا پردیش نے صرف دس ہزار روپے دان کیے ہیں ــ "یہ منہ اور مسور کی دال" آپ تو بڑے ہی میٹھے بنے دیکھ رہے ہیں اردو کے بارے میں، کیا کہنے آپ کی اس عقل کے کہ "یا تو اردو زبان آگے بڑھے گی یا ہندی"۔ غنیمت ہے کہ صرف یہی کہنے پر اکتفا نہیں کیا کہ "صرف اردو زبان ہی آگے بڑھے گی" یہ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"؟

یہ بھی سچ ہے کہ دلیس پتا مہاتما گاندھی شہید نے "ہندستانی" کے لیے پرزور وکالت فرمائی تھی، اگر وہ زندہ رہتے تو آج راج بھاشا "ہندستانی" ہی ہوتی جس کی ناگری اور فارسی دو رسم خط ہوتے۔ افسوس ہے کہ آپ کس قدر کم عقل اور نادان ہیں کہ "قومی زبان" اور "حکومت کی زبان" میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ہندی راج بھاشا یا حکومت کی زبان ہے، قومی زبان نہیں، اس لیے کہ غیر ہندی بولنے والے علاقوں نے اس کو آج تک

بھی قومی زبان تسلیم نہیں کیا ہے۔ رہی اس کی سرکاری حیثیت، اس کو تسلیم کرنے پر سب ہی مجبور ہیں۔ "اردو دیگر مسلمہ زبانوں میں سے ایک ہے" یہ ایک حقیقت ہے، جس کو ہم بھی مانتے ہیں، مگر دیکھنا یہ ہے کہ جواہر لال نہرو کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا۔ ۶ اس بارے میں ہم اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ غدار وطن، دشمن لیگ آبادی نے ہندستان سے بھاگنے وقت حکومت اور عوام پر جو الزامات لگائے تھے، ان میں ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ آگے چل کر ہندستان میں اردو کا کوئی مقام نہ ہوگا۔" بھلوڑ سے جو شو کے بعد بھی "اردو کے تاریک مستقبل" کے بارے میں کئی ایک آوازیں اٹھی ہیں، مگر "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق ہم اس وقت صرف دو عدد تازہ مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جس سے "اردو دوستی" کا آپ کو صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

لکھنؤ کے مشہور ہفتہ وار "صدق جدید" میں اس کے ایڈیٹر عبدالماجد دریابادی نے "میں پاکستان کیوں جانا چاہتا ہوں" کے اسباب گناتے ہوئے، یہ بھی لکھا تھا کہ اردو کشی و اردو بیزاری اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ "اردو سے بیزاری اور اردو دشمنی کی ایک اور بھی مثال ملاحظہ ہو۔ حیدرآباد کے مشہور ماہوار علمی مذہبی رسالے "الفقیہ" نے اپنی اگست ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں، لکھنؤ کے ماہوار رسالے "معارف" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "..... لکھنؤ جیسے مقام سے جہاں حکومت کا زبان اردو سے سوتیلی اولاد کے جیسا سلوک ہو رہا ہے....."

مختصر یہ کہ اوپر کی اردو دشمنی کی مثالیں اردو دوست حضرات کے لیے عبرت کا مقام ثابت ہو سکتی ہیں، اس لیے انہیں چاہیے کہ غلط فہمیوں کے خطرناک بھنور سے اپنے آپ کو نکالنے کی کوشش کریں، ورنہ اتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی کہ "بی" اردو کا دماغ ہی ہلکا ہو جائے گا۔

"ہندستانی" کے بارے میں آپ کا یہ خیال کہ "ہندستانی جیسی زبان دستور ہندستان کے کسی صفحے پر نظر نہیں آتی" بالکل صحیح ہے۔ ہمیں کب اختلاف ہے اس سے! عالم آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ "انگریزی" کا نام بھی دستور کے کسی صفحے پر نہیں ہے، اور "ہندی" زبان کا نام بھی تو دستوری حیثیت نہیں رکھتا ہے، مگر جیسا کہ خود آپ کو معلوم ہے، یہ دونوں زبانیں ہندستان میں جاری ہیں۔ بالکل اسی طرح ہندستانی کی عام اور ملی جلی بھاشا یا زبان "ہندستانی" سارے ہندستان پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی کا دوسرا نام راشٹر بھاشا" ہے اور یہ گاندھی جی مرحوم کے خواب کی تعبیر ہے۔ کیسے لے سکتی ہیں آپ کی "بی" اردو، اس سے ٹک ۶ ہم آپ کی طرح کوئی بھاری بھرکم دعوا تو نہیں کرتے، مگر یہ ضرور کہیں گے کہ آج نہیں تو کل، جب ہندستان میں بھی سیاسی انقلاب آئے گا تو بہت ساری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دستور کی دفعات میں بھی لازمی طور پر تبدیلیاں ہوں گی اور ممکن ہے کہ دستور کا 8TH. SCHEDULE بھی متاثر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اردو" زبان بھی اس کی زد میں آجائے۔ معاف فرمایئے! جو کچھ کہا جا رہا ہے، اردو دشمنی کی بنا پر نہیں، بلکہ زمانے کے بدلتے حالات اور حقایق کی روشنی میں بطور پیشینگوئی" بیان کیا گیا ہے۔

موصوری کے بیان میں تکرار زیادہ ہے، چنانچہ آگے چل کر وہ پھر سے پہلات بک گئے ہیں کہ "آپ کی کوشش اردو ادب کے لیے بڑی حد تک نقصان دہ ثابت ہوگی" ان کے اس جاہلانہ کردہ خیال کا ہم نے اوپر معقول جواب دیا ہے، اس لیے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہی ان کی یہ رائے کہ "ہندستانی" زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ، ممکن ہے کہ اپنے لیے وسیع میدان حاصل نہ کر سکے۔" اس نوٹ پر اس بارے میں ہم کچھ بھی کہنا نہیں چاہتے، آگے چل کر زمانہ خود اس کی اہمیت یا غیر اہمیت کا ثبوت دے گا۔ پھر سے انہیں بوکلاہٹ کا دورہ پڑا، پنانچہ بلکل ہی بچگانہ انداز میں وہ لکھتے ہیں۔

"جس زبان کو آپ "ہندستانی" زبان سے یاد فرماتے ہیں وہ زبان رسالے کے کئی صفحات پر دم توڑتی نظر آتی ہے۔ نہ تو "ہندستانی" کو آپ نے اپنایا ہے اور نہ ہی صوتیاتی اصول پر رسالہ کی کتابت ہوئی ہے۔ کیا "ہندستانی" ہندستانی زبان میں راست معیاری مفہوم جیسے الفاظ استعمال ہوں گے جو آپ کے معیار سے عام نہیں" کتنے نادان ہیں آپ! شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ صرف نثر کی حد تک رسالے کی لکھائی آوازی اصول پر ہوتی ہے، اور نظم کا حصا عارضی طور پر مصلحتاً اس سے مستثنا ہے۔ اب فرمایئے آپ کہ "ہندستانی" زبان دم توڑتی نظر آتی ہے" یا واقعی تنازادم ہے! "ہندستانی" زبان کا نظریا پیش کرنے والا آپ کی طرح تنگ نظر نہیں ہے، جو دوسری زبانوں کے شبدوں سے پیر برتے۔ "ہندستانی" کوئی BASIC زبان نہیں، جس کے الفاظ کا سرمایا محدود ہو۔ یہ ایک قدیم اور وسیع زبان ہے، جس کی لغت میں آئے دن اضافا ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ دوسری زبانوں کے ہزاروں ہی ضروری شبد اس میں سموئے گئے ہیں اور زمانے کے بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ اور بھی ناگزیر الفاظ اپنائے جائیں گے۔ دنیا کی ہر زبان میں یہی عمل ہوتا ہے، پھر "ہندستانی" بھلا اس عام اصول سے کیسے الگ تھلگ رہ سکتی ہے؟ اور آپ نے تو ایسے شبدوں کی مثال دی ہے جنہیں "ہندستانی" زبان کا جز بنے مدتیں گذر گئیں۔ آپ عمر کے اعتبار سے تو بڑے کہلا سکتے ہیں، لیکن عقل آپ کی بچوں کی سی ہے، اسی لیے آپ نے بنا سوچے سمجھے اوٹ پٹانگ اور نہایت ہی مہمل قسم کے اعتراضات کر ڈالے ہیں۔ ذرا غور تو فرمایئے کہ ان الفاظ کے بارے میں بھی کوئی اعتراض ہوسکتا تھا؟ ہم ان الفاظ کو بیس سال سے استعمال کرتے آرہے ہیں، اور انہیں "ہندستانی" زبان کا لازمی جز قرار دیا ہے، اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ الفاظ ہمارے اپنے معیار پر پورے اتر چکے ہیں یا اس میں ابھی کوئی کسر باقی ہے۔ شاید حضرت سعدی نے آپ ہی جیسے کم عقل والوں کے بارے میں کہا ہے

آدمی را عقل باید در بدن
ورنہ جان در کالبد دارد حمار

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔ "مضامین کا انتخاب بھی معیاری نہیں معلوم ہوتا" عنیمت ہے کہ اس بارے میں اپنی قطعی رائے دے کر آپ نے پھر سے اپنی جہالت کا ثبوت نہیں دیا، یکے "نہیں معلوم ہوتا" کہہ کر اپنی نادانی اور کم عقلی کے باور کرنے کی لچک ضرور پیدا کردی ہے۔ آپ جیسے بدوطبائع لوگ کیا جانیں کہ مضامین کس قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ اجی جناب! "ہندستانی ادب" DIGEST رسالا ہے، جس میں کئی ایک معیاری رسالوں سے منتخب مضامین پیش کیے جاتے ہیں، اور بلا مبالغا، ہر مہینا یہ رسالا ایک علمی ادبی "گلدستے" کی شکل میں پیش ہوا کرتا ہے، رہا آپ کا اعتراض کہ "نظم اور غزل نے پرچہ کے ایک بڑے حصہ پر جگہ پائی ہے، جو مناسب نہیں" ہماری سمجھ سے باہر ہے، اس لیے کہ ۳۲ صفحے کے رسالے میں جملا آٹھ صفحے غزلوں اور نظموں غیرا کے لیے مختص کیے جاتے ہیں، گویا مجم کا ایک چوتھائی حصا ہوا کرتا ہے۔ یہ ایک مانا ہوا STANDARD تناسب ہے۔ اس کو آپ نامناسب سمجھیں اور بات ہے، لیکن ساری دنیا تو اس تناسب کو مناسب سمجھتی ہے۔ "مختلف علمی معیار کے حضرات کے ذوق کو پورا کرنے کی کوشش بھی جاذب نظر نہیں، جبکہ پرچہ معمولی ضخامت کے ساتھ شایع ہوتا ہے" آپ بڑے ہی مندغرض معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ سارا پرچہ صرف آپ ہی کے ذوق کی تکمیل کرے اور دوسرے صاحبان ذوق اس سے محروم کردیے جائیں! ایسا تو کسی رسالے میں بھی نہیں ہوتا، ہر رسالے کی ترتیب میں مختلف ذوق والے حضرات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ تجارتی اور دھندا بنانے کی باتیں ہیں، ان کو آپ جیسے گنداد ماغ لوگ کیا جانیں۔! "مجھے امید ہے کہ سطور بالا پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایا جائے گا"۔ آپ کی یہ گذارش ہم نے ——

COLD STORAGE میں رکھ چھوڑی ہے جب ٹھنڈک اپنے معیار پر آجائے تو اس وقت اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایا جائے گا۔" آپ فکر نہ کریں، اگر آپ چاہیں تو ایک سے زیادہ مرتبہ آپ کی خبر گیری بھی کی جائے گی۔ "میری تنقید تعمیری ہے، تخریبی نہیں۔" کیا کہنے آپ کے اس معصومانہ انداز بیاں کے۔ اگر اس تنقید کو "تعمیری" کہا جاسکتا ہے تو پھر "تخریبی" تنقید کس چڑیا کا نام ہے؟ غور سے سن لیجئے! آپ کو تنقید سے دور کا بھی واسطہ نہیں، آپ صرف بکواس کرنا جانتے ہیں۔ آپکا پورا خط جوکا توں دینے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم صاحبان عقل و فہم سے انصاف چاہیں کہ آیا یہ تحریر تنقید کہلائی جاسکتی ہے یا کٹ حجتی، اور ایسے نقطۂ نظر کو تعمیری کہا جاسکتا ہے یا تخریبی؟

آخر میں آپ نے پھر سے اپنی دیوانگی اور جہالت کا ثبوت ان شبدوں میں دیا ہے۔ "کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ کا پرچہ اردو کی خدمت کے لیے وقف ہو جاتا یا پھر ہندی کو پروان چڑھانے میں پیش پیش ہوتا۔"

دیکھ لیا آپ نے کہ جناب معترض کیسے نادان اور کس قدر کم عقل واقع ہوئے ہیں کہ جو رسالا دو دہائی سے دیس کی عام اور ملی بھاشا یا زبان "ہندستانی" کی سیوا کر رہا ہے، اس کے بارے میں یہ مجنونانہ اور پاگل پن کا مشورا کیا جاتا ہے کہ اردو یا ہندی کی خدمت کے لیے وقف ہو جاتا! حالانکہ آنجناب، یہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" اردو اور ہندی کی بجائے گاندھی جی مرحوم کے نظریے کے تحت دیس کے لیے صرف ایک ملی جلی زبان "ہندستانی" ہی کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے، یہی ہمارا مشن ہے، اسی کا ہم پرچار کر رہے ہیں اور اسی بھلے کام کے لیے "ہندستانی ادب" وقف ہے۔ آخر میں، ہم یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ رسالا جاری رہے تو اوپر گنائے گئے اصولوں اور نظریوں کے ساتھ علم و ادب اور زبان کی سیوا کرتا رہے

ہیڈ ماسٹرس اور ہیڈ مسٹرسس توجہ دیں

جن مدرسوں سے اس رسالے کا چندا وصول طلب ہے ان سے ہماری اپیل ہے کہ وہ جلد سے جلد اس خصوص میں توجہ دیں۔ ہمیں سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض مدرسوں سے دو سال کا بقایا وصول ہونا ہے، اور کئی ایک مدرسوں سے ایک سال کا چندا۔ اس عرصے میں، ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ یاد دہانی کی ہے، لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ اس سلسلے میں، ہم اور بھی خط بازی کریں تو تقریباً آدا چندا ڈاک خرچے کے نذر ہو جائے گا۔ بہرحال، یہ ایک ناگوار سی صورت ہے جس کا دور کیا جانا ضروری ہے، اس لیے ہم پھر سے ایک بار انہیں توجہ دلاتے ہیں کہ اپنا اپنا بقایا چندا بھیج کر ہمیں ممنونیت کا موقع دیں۔

اس سلسلے میں ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ کئی ایک مدرسوں کے نام رسالا مستقل خریداری کی غرض سے بھیجا جا رہا ہے، لیکن ان مدرسوں سے آج تک بھی کوئی جواب نہ ملا۔ یہ رسالا ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، آندھرا پردیش کا منظور شدہ ہے، اس کے علاوہ اس محکمے نے اس رسالے کی خریدی کی غرض سے مدرسوں کو زاید بجٹ بھی دیا ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اس رسالے کی خریدی کے سلسلے میں تین بار توجہ بھی دلائی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ مدرسے کے صدر محض ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ ہم شکوے شکایت کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے، ہم راست کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا روئے سخن راست صدور مدرسا سے ہے۔ آشا ہے کہ ہماری اس اپیل کی طرف وہ فوری توجہ دیں گے۔

بعض مدرسوں کو ہم رسالا نہیں بھیج رہے ہیں، مگر ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کے لیٹر کا حوالہ دیتے ہوئے اس رسالے کی خریدی کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا ہے لیکن

ان اصولوں اور نظریوں کو دنیا کے ہر ذی فہم انسان نے پسند کیا ہے۔ یہی ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے ہمارا رسالا ہر لحاظ سے مناسب

جگر مرادآبادی

از الیگزنڈر فقر موہانی

جو بیٹھے آ کے تھے درد جگر سے
وہ اٹھے مر کے تیرے سنگ در سے

وہ ہیں آزاد خیر و شر سے
جو خود ہیں بے خبر اپنی خبر سے

ابھی کھنچ آئیں وہ دل کے اثر سے
ذرا لے کام جذبات نظر سے

ہیں اٹھوں گا تو اٹھے گی قیامت
اٹھا ظالم نہ مجھ کو اپنے در سے

زمین دل کی جنبش کہہ رہی ہے
وہ گذرے ہیں ضرور اس رہگذر سے

جہاں پہنچے وہیں پھر گھر تھا اپنا
نہ رکھا واسطہ جب ہم نے گھر سے

ہزاروں حسن نے گو بھیس بدلے
چھپے کب وہ نگاہ معتبر سے

کہاں دھوکا دیا عمر رواں نے
اٹھے منزل کے پردے جب نظر سے

ہر اک ذرہ ہے گو آئینہ، لیکن
ہمیں تو کام ہے آئینہ گر سے

بلا سے مٹ گئے ہم مل گئے تم
بہت پایا حیات مختصر سے

وہ دنیا اور تھی شاہ و گدا کی
یہاں یکساں ہیں سب خوف و خطر سے

تہہ و بالا ہوئی جاتی ہے دنیا
نظر ملتی ہے اب ان کی نظر سے

نہ جیتے جی کھلے گا باب زنداں
صدا آتی ہے یہ دیوار و در سے

بہار حسن پر اترانے والے
ذرا بچ کر زمانے کی نظر سے

ہوئے جلوے ہی سے بیہوش موسیٰ
یہاں تو سابقہ ہے جلوہ گر سے

انہیں کیا محتسب کا خوف افقر
جو ہیں مخمور ساقی کی نظر سے

(۱)

گلستاں کی زمیں ہے پایہشت بریں ہے
ہر نفس آتشیں ہے عشق آساں نہیں ہے
ہم تمہیں بھول جائیں اب یہ ممکن نہیں ہے
میرے حسن نظر سے کوئی زہرہ جبیں ہے
دل کی حالت نہ پوچھو ہم کہیں دل کہیں ہے
آپ ہی کی بدولت سارا عالم حسیں ہے
ایک وہم تصور! اب مکمل یقیں ہے
عشق صادق جہاں میں اصل دنیا و دیں ہے
حسن خلوت میں آکر شرمگیں شرمگیں ہے
آستان زمانہ میرا نقش جبیں ہے
غم سے مایوس ہونا اپنی فطرت نہیں ہے
ایک فکر تبسم کتنے غم کی امیں ہے
اے ادیب اپنا حالت انقلاب آفریں ہے



ماجد ادیب بریلوی (مرحوم)

ماجد ادیب بریلوی کی یہ غزل
غیر مطبوعہ غزلیں۔ ہمارے
خواہش تھی کہ ہم ان کا تمام شائع کر
کلام اس جزو میں دے سکیں، مگر
ہمیں دکھ ہے کہ وہ دستیاب
نہ ہو سکا۔ (ترتیب کار)

(۲)

ساغر و جام ہیں نگاہوں میں　　غم کے انعام ہیں نگاہوں میں
غیر کو بت پرست کیا کہیئے　　اپنے اصنام ہیں نگاہوں میں
طائر زیر دام ہوں لیکن　　سینکڑوں بام ہیں نگاہوں میں
لب پہ مہر سکوت ہے تو کیا　　دل کے پیغام ہیں نگاہوں میں
خانقاہوں کا تذکرہ مت چھیڑ　　یہ در و بام ہیں نگاہوں میں
فکر مستقبل وفا نہ رہی　　ان کے اکرام ہیں نگاہوں میں
جو بچھے ہیں ہماری راہوں میں　　وہ حسیں دام ہیں نگاہوں میں
یہ شارے یہ پھول یہ غنچے!　　آپ کے نام ہیں نگاہوں میں

ذکر دار و رسن نہ چھیڑ ادیب
حق کے انجام ہیں نگاہوں میں

دوسری اور عارف نیانہاری آخری قسط

دیوان غالب

ڈرامہ

تیسرا منظر (پردہ اٹھتا ہے)

(چار سپاہی دیوان غالب کو ننگے پیر ہتکڑی ڈالے لیے جاتے ہیں۔ پیچھے پیچھے دیوان غالب کے نیفوں دوست سر سر جھکائے چلے آتے ہیں۔

دیوان غالب ۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

(تمام لوگ اسٹیج کے دائیں کونے پر آکر غایب ہو جاتے ہیں۔ پردا گرتا ہے، مگر پھر فوراً ہی اٹھ جاتا ہے۔ منظر میں کوئی تبدیلی نہیں چار سپاہی معہ فیری دائیں کونے سے نکلتے ہیں مگر دیوان غالب کے دوستوں میں وکیل صاحب نظر نہیں آتے)

سپاہی ۔ (ڈانٹ کر) جلدی جلدی ہمارے ساتھ چلو۔

دیوان غالب ۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

(تمام لوگ اسٹیج کے بائیں کونے میں غایب ہو جاتے ہیں۔ پردا گرتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے پھر اٹھ جاتا ہے۔ اب چاروں سپاہی معہ قیدی بائیں کونے سے نکلتے ہیں، مگر اس دفعہ مولوی صاحب اور حکیم صاحب بھی غایب ہو جاتے ہیں)

دیوان غالب ۔ (ایک دم پیچھے گھوم کر دیکھتا ہے)

؎ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(رستے میں دیوان غالب کا ایک دوست مل جاتا ہے)

دوست ۔ ارے کیا معاملا ہے؟

دیوان غالب ۔ یہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

دوست ۔ اچھا تو اب کہاں جا رہے ہو؟

دیوان غالب ۔ لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ راہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

(رستے میں انکا ٹھاتا ہے اسکو دیکھ کر دوست کھسک جاتا ہے)

انسپکٹر ۔ اچھا ہی ہے دیوان غالب بہت برا آدمی ہے یہ۔

دیوان غالب ۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

انسپکٹر ۔ (سپاہی سے) اس کو جا کر حوالات میں بند کر دو۔

(انسپکٹر جانے لگتا ہے)

دیوان غالب ۔ (انسپکٹر کی طرف موڈھ کر کے) ؎
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

(انسپکٹر سن لیتا ہے اور غصے میں واپس آتا ہے)

انسپکٹر ۔ کیا بکتے ہو جی تم؟

دیوان غالب ۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

انسپکٹر ۔ ابھی تم نے میری طرف موڈھ کر کے کیا کہا تھا۔

دیوان غالب ۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

انسپکٹر ۔ تم بہت بدطینت آدمی ہو۔

دیوان غالب ۔ قسمت بری سہی پہ طبیعت نہیں بری
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

(انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے)

دیوان غالب ۔ (انسپکٹر کی طرف موڈھ کر کے آہستہ سے) ؎
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

دیکھو مجھے غالب سے الجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر (پردہ اٹھتا ہے)

(جیل کی سلاخوں کی دوسری طرف دیوان غالب بیٹھے ہیں اور سنتری بندوق کاندھے پر اٹھائے پہرا دے رہا ہے۔ حکیم صاحب داخل ہوتے ہیں دیوان غالب سلاخوں سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں اور مصافحہ کرنے کے بعد)

حکیم صاحب ۔ آپ کے آنے کے بعد گھر کا حال سمجھیے کہ بس...

(کہتے کہتے رک گئے)

دیوان غالب ۔ قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حکیم صاحب ۔ آپ کے آنے سے گھر کی رونق کم ہو گئی۔

حکیم صاحب ۔ یہاں آپ کا کیا حال ہے ؟

دیوان غالب ۔ کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

حکیم صاحب ۔ آپ کو جیل میں کوئی تکلیف تو نہیں ؟

دیوان غالب ۔ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حکیم صاحب ۔ جب آپ یہ سمجھتے ہیں تو روتے کیوں ہیں ؟

دیوان غالب ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

حکیم صاحب ۔ لیکن اب آپ کے رونے سے ہوتا کیا ہے ۔ اب تو عدالت جو بھی فیصلہ دے گی وہی قسمت ہے ۔

دیوان غالب ۔ یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

حکیم صاحب ۔ اچھا دیوان غالب صاحب ! یہ تو بتایئے کہ آپ کو یہ قید زیادہ پسند ہے یا وہ غم آلود زندگی ؟

دیوان غالب ۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حکیم صاحب ۔ آپ کو یہاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ؟

دیوان غالب ۔ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

(سپاہی آتا ہے)

سپاہی ۔ تمہارے مقدمے کی تاریخ ۲۱ اپریل پڑی ہے ۔ اس لیے تمہیں اسی دن عدالت میں چلنا ہوگا ۔

دیوان غالب ۔ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

(سپاہی واپس چلا جاتا ہے ۔ حکیم صاحب بھی جانے کے لیے اٹھتے ہیں)

دیوان غالب ۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(پردہ اگرتا ہے)

چوتھا منظر

(پردہ اٹھتا ہے)

(عدالت کا منظر ۔ جج ایک اونچی سی کرسی پر تشریف فرما ہیں ۔ ان کے پیچھے چوبداری کے پانچ ممبر بیٹھے ہیں ۔ کٹہرے میں ملزم یعنی دیوان غالب کھڑے ہیں ۔ سرکاری وکیل بیچ میں کھڑا ہے ۔ کٹہرے کے دوسری طرف دیوان غالب کے تینوں دوست بیٹھے ہیں ۔ انسپکٹر سامنے آکر ملزم کو روشناس کراتا ہے)

انسپکٹر ۔ (ملزم کی طرف اشارا کرکے) یہ ہیں وہ صاحب جو مدعی سے پندرا سال سے زیادا مدت تک شراب قرض لے کر پیتے رہے ۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور پچاس روپے روزانا صرف شراب کا خرچا تھا ۔ اصل نام کسی کو معلوم نہیں دیوان غالب کے نام سے اپنے آپ کو مشہور کرا کر خوش ہیں ۔ بات بھی نثر میں نہیں کرتے ۔ ہر بات کے جواب میں غالب ہی کے اشعار پیش کرتے ہیں ۔ کلکتا سے فسادات کے دوران میں کراچی آکر آباد ہو گئے ۔ کام کچھ کرتے نہیں ۔ خالی بیٹھے یا تو دن بھر شراب پیتے ہیں یا دوستوں کو جمع کرکے دھما چوکڑی مچاتے ہیں ۔

(انسپکٹر واپس چلا جاتا ہے اور سرکاری وکیل اٹھتا ہے اور ملزم سے جرح کرتا ہے)

سرکاری وکیل ۔ (ملزم سے) تیرا نام کیا ہے ۔ تو کہاں رہتا ہے اور کیا کام کرتا ہے ؟

دیوان غالب ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سرکاری وکیل ۔ اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اب آپ بتایئے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں

دیوان غالب ۔ عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سرکاری وکیل ۔ آپ پر جو الزامات عاید کیے گئے ہیں کیا آپ کو ان کی صحت کا اقرار ہے؟

دیوان غالب ۔ کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

(سرکاری وکیل کو دیوان غالب کے جوابات سن کر غصہ آجاتا ہے اور وہ انتہائی غصے کے عالم میں ہلنے لگتا ہے)

سرکاری وکیل ۔ می لارڈ! یہ عجیب بے ڈھنگی قسم کا ملزم ہے ۔ کتنے سخت اور اوٹ پٹانگ جوابات دیتا ہے ۔ اسے یہ احساس ہی نہیں کہ یہ عدالت کے کٹہرے میں بحیثیت ملزم کھڑا ہے یا کسی محفل مشاعرہ میں صاحب صدر کی کرسی پر براجمان ہے ۔ یہ شخص بالکل دہریا ہے ۔ خدا کی عبادت نہیں کرتا اور بے وفا بھی ہے ۔ می لارڈ! میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے دہریا پنہ اور بیوفائی کی ایسی سخت سزا دی جائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں ۔

دیوان غالب ۔ ؎
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

جج ۔ (ملزم سے) (میز پر ہتھوڑا بجاتا ہے) آڈر، آڈر
آڈر ۔ اے یو ملزم! زبان سنبھال کر بات کرو یہ کمرۂ عدالت ہے ۔

دیوان غالب ۔ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

جج ۔ پھر بھی تمہیں یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تم عدالت سے بات کر رہے ہو۔ اگر تم نے بیدی طرح نثر میں بات نہیں کی تو "توہین عدالت" کے سلسلے میں عدالت تم پر دوسرا مقدمہ قایم کر سکتی ہے ۔

(دیوان غالب کا وکیل دوست کھڑا ہوتا ہے)

وکیل صاحب ۔ می لارڈ! ایکس کیوزمی ۔ اف یور آنر مائینڈ ۔ اشعار میں عدالت کے سوالات کے جواب دینا تو ہین عدالت قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ عدالت کے پاس ایسی کوئی دفعا نہیں جس سے وہ ملزم کو کسی خاص طریقے یا زبان میں جواب دینے پر مجبور کر سکے ۔

جج ۔ (ہتھوڑا بجاتا ہے) آڈر، آڈر! ملزم اپنا بیان جاری رکھے ۔

دیوان غالب ۔ منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

جج ۔ تم پر جو الزامات عاید کیے گئے ہیں ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ۔

وکیل ۔ (پھر کھڑا ہوتا ہے) می لارڈ! یہ سوال عدالت کی جانب سے کیا جا چکا ہے، جس کا جواب ملزم نے جیسا کہ چاہیے دے دیا ہے ۔

جج ۔ (ہتھوڑا بجا کر) آڈر! آڈر! ملزم اپنا بیان جاری رکھے ۔

دیوان غالب ۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

جج ۔ کیا تم شاعر ہو؟

دیوان غالب ۔ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

جج ۔ تم پر الزام یہ ہے کہ تم محلے میں جھگڑتے رہتے ہو۔

دیوان غالب ۔ آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

جج ۔ تم مدعی کا قرض کیوں ادا نہیں کرتے ؟

دیوان غالب ۔ نہ سنتا دن کو تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سرکاری وکیل ۔ بکل جھوٹ ۔ اس کے گھر میں کبھی چوری نہیں ہوئی ۔

جج ۔ (ہتوڑا بجا کر) آرڈر ! آرڈر ! (ملزم سے) یہ حلف اٹھاؤ کہ تم نے جو بیان دیا ہے وہ بکل سچ ہے ؟

دیوان غالب ۔ صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(جج اور جیوری اٹھ کر چلے جاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتے ہیں)

جج ۔ چونکہ ملزم پر عاید کیے گئے تمام الزامات کا ملزم نے جیسا کہ چاہیے جواب نہیں دیا جس سے عدالت مطمئن ہو سکے ۔ اس کے علاوہ اس کی وجہ سے محلے میں نقض امن کا خطرہ لگا رہتا ہے اور ملزم اتنا خود سر ہے کہ توہین عدالت کے جرم کا بھی مرتکب ہوا ہے ۔ حالانکہ عدالت نے دو مرتبہ اسے تنبیہ کی مگر ملزم کی خود سری نے عدالت کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ اسے مناسب سزا دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو ۔ عدالت ملزم کو مجرم سمجھتی ہے اور اس مجرم کے لیے وہ سزا منتخب کرتی ہے جس میں قوم اور ملک کا مفاد مضمر ہے ۔ عدالت ایسے خطرناک مجرم کو موت کی سزا دیتی ہے ۔
(جج فیصلا سنا دینے کے بعد بیٹھ جاتا ہے)

دیوان غالب ۔
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پہ دھرا ہوتا

(جج سے مخاطب ہو کر)
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جج ۔ جج اچھا بتاؤ گیا مدعا ہے تمہارا اور اپنی آخری خواہش بھی بتاؤ ۔

دیوان غالب ۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جج ۔ ہم ہزاروں خواہشیں پوری نہیں کر سکتے ۔ صرف ایک کوئی آرزو بتاؤ ۔

دیوان غالب ۔ رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

جج ۔ جلاد حاضر ہو !

دیوان غالب ۔ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے

(جلاد ہاتھ میں کٹار لیے داخل ہوتا ہے ۔ دیوان غالب مقتل کی طرف چلتا ہے)

دیوان غالب ۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

(دیوان غالب اپنی گردن تختۂ دار پر رکھ دیتا ہے جلاد کٹار اٹھاتا ہے)

دیوان غالب ۔ یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

(جج رومال سے اشارا کرتا ہے ۔ جلاد اشارا دیکھتے ہوا وار کرتا ہے لیکن دیوان غالب فوراً ہی اپنا سر تختے سے ہٹا لیتا ہے ۔ کٹار لکڑی میں گھس کر اسے چیر دیتی ہے ۔ تمام مجمع ایک اضطراب کے عالم میں اٹھ جاتا ہے ۔ پھر دیوان غالب کو صحیح سالم دیکھ کر دیوان غالب کے دوستوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے)

دیوان غالب ۔ جلد جا ہے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

وکیل صاحب (اپنی کرسی سے اٹھ کر نیچے آ جاتے ہیں اور اپنے دوست دیوان غالب کی پیروی کرتے ہیں)

نے کسی کا خون نہیں کیا ہے۔ کہیں چوری اور ڈاکا بھی نہیں ڈالا۔ صرف قرض ادا نہ کرنے کا جرم عمدہ ہے۔ جس کی سزا دفعہ ۳۱۲) کے تحت زیادہ سے زیادہ دو سال قید سخت ہو سکتی تھی۔ موت کی سزا کے خلاف میں مدعا علیہ کے وکیل کی حیثیت سے اپیل کرتا ہوں کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔

جج۔ مگر ملزم تو ہین عدالت کے جرم کا بھی تو مرتکب ہے جس کی سزا عدالت کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔

وکیل صاحب۔ ی لارڈ! گستاخی معاف۔ عدالت کو محسوس کرنا چاہیے کہ مقدمہ مایقطی ایکٹ کے ماتحت نہیں چلایا جا رہا ہے کہ جس میں صرف زبان کھولنے کی سزا موت ہوتی ہے۔ اور رعایتی عمر قید ہو جاتی ہے۔ ی لارڈ! عدالت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ملزم کوئی سیاسی کارکن نہیں کہ جس پر آپ ملک سے غداری کا الزام عاید کر کے موت کی سزا سنا دیں جس بات کو آپ توہین عدالت کہتے ہیں ایکس کیوز می ٹو ٹیل دی فیکٹ کہ وہ تو ملزم کی پیدائشی خدمہری ہے۔ پیدائشی نہیں، بلکہ موروثی خدمہری ہے۔ ملزم کے باپ اور دادا کی سوانح حیات اگر عدالت کے پاس موجود ہو تو دیکھیں کہ ان کی عمریں بھی حق کی اشاعت میں گذری ہیں۔

جج۔ (فیصلہ سناتا ہے) اگر مدعی چاہے تو اپنا ذہن معاف کر سکتا ہے۔ عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

مدعی۔ (سامنے آکر) ہم اپنا سارا قرض معاف کرتے ہیں۔ (دیوان غالب سے) دیوان غالب صاحب ہمیں معاف کر دو ہم نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

دیوان غالب۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جج۔ عدالت دفعہ ۳۱۲) کے تحت قایم کیا ہوا مقدمہ خارج کر کے ملزم کو باعزت طور پر بری کرتی ہے مگر توہین عدالت کے سلسلے میں تا برخاست عدالت قید اور کرے عدالت سے بے عزتی کے ساتھ نکالنے کی سزا دیتی ہے۔ (تھوڑی دیر بعد عدالت برخاست ہوتی ہے۔ دو چپراسی آگے بڑھتے ہیں اور دیوان غالب کو کان سے پکڑ کر باہر نکالنے لگتے ہیں۔)

دیوان غالب۔ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

(پردہ گرتا ہے)

"تصانیف حضرت جلیل"

اہل الفن حضرت جلیل کی تصانیف کا مختصر سا اسٹاک موجود ہے جو کہ ذیل کے پتوں پر حاصل فرما سکتے ہیں

۱۔ تاج سخن (دیوان اول) ۲/
۲۔ کلام جلیل (منتخب کلام کا مجموعہ) ۱۲/

کتب فروش صاحبان اور دیگر خواہشمند حضرات کو ۵ یا ۵ سے زائد کتب کی خریدی پر ۲۵ فیصد ڈسکونٹ دیا جائے گا۔

پتہ

۱۔ مجتبیٰ پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار حیدرآباد دکن

۲۔ جمیل اینڈ کو۔ مسجد چوک حیدرآباد دکن

ماجد ادیب بریلوی اور ان کے کلام پر ایک نظر

احقر کاشی پوری

ستمبر ۱۹۵۹ء کی آٹھویں رات کے ایک بجے ہم تھکے نے ہندستانی زبان کے اس چراغ کو گل کر دیا اور اس طرح ارتقا پسند کرنوں کا وہ عزم جو انہوں نے زندگی کو نکھارنے سنوارنے کے لیے کیا تھا ٹوٹ گیا۔ ہندستان کو جہاں کئی اور غم ہیں اس سال اک نہ اک بے پوت خدمت گذار کا ماتم بھی اس کا جائز تقدیر بن گیا ہے۔ یوں تو ماجد ادیب بریلوی صحف حیات کے چھبیسویں ورق تک پہنچ سکے تھے، لیکن اس عرصے میں انہوں نے ہندستان و پاکستان کے شاعروں کی جدید پود میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کر لیا تھا۔ ہندستان و پاکستان کے بیشتر رسائل شق کردار، بیسویں صدی، پاسبان، نیا دور، مستقبل، ہندستانی ادب، سہیل، صبح امید، قسم، سب رس، جام نو، لالہ زار، پگڈنڈی، آجکل، راہی وغیرہ میں ان کی نظمیں غزلیں بصد احترام شایع ہوتیں اور قارئین سے خراج تحسین وصول کرتی رہی ہیں۔ روزناموں اور سنڈے ایڈیشنوں سے بھی ان کے کلام کا تعریفی رشتہ رہا۔ بریلی کے ماہنامے "ارمان" "کامرانی" "نوری کرن" اور ہفتہ وار اخبار "روہیلکھنڈ اخبار" کے خاص طور پر وہ ہفتہ ہی قریب رہے۔ "روہیلکھنڈ اخبار" کے ادارے میں شریک ہو اور ہندستان پاکستان کے متعدد ادیبوں کا تعاون اس کے لیے حاصل کر کے انہوں نے اس ہفتہ وار کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اس کو وہ تمام حضرات بخوبی جانتے ہیں جو اس اخبار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ "روہیلکھنڈ اخبار" کے خاص نمبر اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے ان کی ترتیب میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔

ماجد ادیب بریلوی بریلی کے ادبی ماحول میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ قریب قریب ہر جگہ کا شاعر اماحول بغض و عناد کی غلاظتوں سے بھرپور ہے۔ بریلی بھی اس سے دور نہیں، لیکن جذبۂ ایثار و خلوص برتنے سے غایت رکھنے والے ماجد ادیب نے اسی ماحول میں رہ کر اپنے فن کو ادب کی بہتر قدروں سے ہمکنار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

معاشی زبوں حالی اور فرسودہ رسم و رواج و عقاید کی پیہم کشاکش نے ان کے مطالعے اور مشاہدے کو پختگی دی اور ان کے شعور اور احساس میں تفکر و تجسس کا مادہ پیدا کیا۔ ان کو پسماندہ زندگی کے کھنڈروں پر ایک پرکیف نظام حیات کی تعمیر کے لیے اور سیاسی اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف کھل کر احتجاج کرنے کی ترغیب دی، ان کے احساس کی گیرائی اور فکر کی گہرائی نے حیات اور کائنات کے ارتقائی سیلانات کی فنکارانہ ترجمانی کی۔ ان کی نظمیں، غزلیں، ہندیہ تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی موجودہ بوقلمونی کا پرتو ہیں، اور ان میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک ارتقا پسند فنکار کے لیے اشد ضروری ہیں۔ بے راہ روی اور افراط و تفریط کی تہمتوں سے انہوں نے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اسی لیے بغیر کسی الجھن کے ان کے تاثرات قاری کے ذہن و دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں کشش اور جاذبیت ہے، کیونکہ ان کی ساخت میں انہوں نے انتہائی سوجھ بوجھ، احتیاط اور فنکارانہ چابکدستی سے استفادہ کیا ہے۔ ماجد ادیب بریلوی کا "دل" حیات اور کائنات کے سچے ہمدرد کا دل تھا جو عمر بھر یاس و اندوہ کے دھندلکوں سے برسرپیکار رہا۔

ان کی نظموں میں "قدیم سے" "دعوت" "حوصلہ" "شبستان تصور" "ہمسفر" "اعلان حق" "آج" "نئے دور کا انسان" "طلوع سحر" "نئی حیات" "نئی منزلیں"

صبح امید" "نجوری" اور "سکون و دوام" قابل قدر ہیں، جن میں اخلاص کی قوت، صداقت کا جوش، عمل کا ولولا، اشاریت اور کنایت اور اسلوب بیان کی دلکشی سب ہی کچھ موجود ہے۔ اپنی ہر نظم میں وہ بطور رجائی موجود ہیں، کیونکہ ان کو سماجی اور سیاسی غارت گری کے ہنگاموں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور کی منزل آغاز سے شناسا ہونے کا کامل یقین تھا۔ مجاز اور ادیت کی شاعری جنسی موضوعات کی آلائشوں سے پاک ہے، کیونکہ ان کے رچے ہوئے شعور نے ان کو ہیجر ضبط اور تنظیم کی وہ تمام قوتیں عطا کیں جو زندگی کا آورش پیش کرتی اور فراریت ذہنیت کا گلا گھونٹتی ہیں۔ کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

سکرا کر دہر کی رنگینیوں کو جگمگا!
گلشن ہستی کے رخ سے کاکل ظلمت ہٹا
چھا گئی ہے ایک تابانی سی صبح و شام پر
اب خدا کے واسطے تاریکیوں کا غم نہ کر

گلستاں کا گلستاں ہے عصر نو کا منتظر
ڈوبکر اب جام و مینا میں بھر طوفاں اٹھا
زندگی کا ذرہ ذرہ جس سے ہو پھر فوشاں
چھیڑ شمع شب گزیدہ اک نئی شمع جلا

"ندیم"

عہد ماضی کا پرستار رہے گا کب تک
دام ظلمت میں گرفتار رہے گا کب تک
صورت نرگس بیمار رہے گا کب تک
شعلۂ نور سے بیزار رہے گا کب تک
اٹھ کہ اے دوست تجھے آگ پہ چلنا ہوگا
اس زمانے کو بہر طور بدلنا ہوگا
جستجو میں ہے تری آج بھی منزل بیتاب
تری کشتی کے لئے ہے لب ساحل بیتاب
روشنی پھیکنے کو ہے مہ کامل بیتاب
بزم کی بزم ہے اب صورت بسمل بیتاب

اٹھ کہ اے دوست تجھے آگ پہ چلنا ہوگا
اس زمانے کو بہر طور بدلنا ہوگا "دعوت"

یہی دونوں نظمیں سوے ہوؤں کو للکارتی اور ان کو اس فرسودہ اجتماعی نظام سے بغاوت کی ترغیب دیتی ہیں۔

یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا یہ سماں کچھ بھی نہیں
یہ المناک مناظر یہ خزاں کچھ بھی نہیں
یہ اٹھتا ہوا بادل یہ دھواں کچھ بھی نہیں
یہ غریبوں کا تڑپنا یہ فغاں کچھ بھی نہیں
تیز طوفان کے دھاروں کو بدل سکتا ہوں
میں خزاں تیز بہاروں کو بدل سکتا ہوں "حوصلہ"

خلل اعتمادی کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی۔

کیف آلودہ فضاؤں کا حسیں مرکز ہے تو
سحر پرور دہ مناظر ترے کاشانے میں ہیں
غنچہ و گل کہہ رہے ہیں تری رنگیں داستاں
سینکڑوں افسانے شامل ترے افسانے میں ہیں

"شبستان تصور"

اس ابھی کے بہار آفریں تبسم سے
فروغ مہر ہے تنویر ماہ و انجم سے
دل و نظر کے چمن زار جگمگائے ہیں
خیال و فکر کے شہکار جگمگائے ہیں
وہ شاہکار جو اظہار میں سما نہ سکیں
وہ شاہکار کہ الفاظ جن کو پا نہ سکیں "ہمسفر"
زندگی کے نئے چراغوں کو
کوئی آندھی بجھا نہیں سکتی
آج ہم عشق کے امینوں کو
کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی
امن و انسانیت کی طاقت سے
ہم نے بدلا ہے وقت کا دھارا
جگمگائی ہے محفل امروز
ذرہ ذرہ ہے آئینہ بردار "بطلان حق"

حامئ امن و زندگی کے امیں!
موت پر بھبتیاں اڑائیں گے
ساز دوراں پہ مطربانِ چمن
نغمۂ خوشگوار گائیں گے
شانۂ عصرِ نو پہ گذرے گی
زندگی کے حسین زلف دراز
رخ بدلنے کو ہے فضائے کہن
اٹھ رہا ہے نظر سے پردۂ راز
"صبحِ امید"

ان دونوں نظموں میں امن کی عظمت کا جنون اور بے پناہ رجائیت ہے۔

آج گلشن میں بہاریں ہیں نہ پھولوں میں کشش
آج غنچوں میں چٹک، ہے نہ فضا میں تابش
آج تاروں میں چمک ہے نہ لبوں کو جنبش
آج کیوں چٹکیاں لیتی ہے سرے دل میں خلش
آج کا دیکھئے اب ختم کہاں پر ہو سفر
آج کا دیکھئے کس رخ سے نکلتا ہے قمر
آج کا دیکھئے کیا وقت دکھاتا ہے اثر
آج کا دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے سحر
بالیقیں آج خزانے میں تغیر ہوگا
بالیقیں آج زمانے میں تغیر ہوگا
"آج"

آزادی کے بعد ملک کے راہبروں نے خشحال اور پر بہار زندگی کے جو حسین خواب دکھلائے وہ فریب ثابت ہوئے، لیکن ماجد اویب مایوس نہیں، وہ ان درندوں کو للکارتے ہیں جو اپنی ناپاک مٹھیوں میں زندگی کی شعاعوں کو قید کیے ہوئے ہیں۔

عصرِ حاضر کے درندو! مری اب آنکھ کھلی
اب یہ طوفان تشدد میں سہہ نہیں سکتا
میں ہوں آزاد چمن میرا فضائیں میری
اب میں اپنوں کا بھی محکوم نہیں رہ سکتا
"نئے دور کا انسان"

یہ اتحاد کے جو یا یہ امن کے پیکر
نئی حیات کی منزل ضرور پائیں گے
یہ پھول آج سسکتے دکھائی دیتے ہیں
بہار بن کے یہی اک جہاں پہ چھائیں گے
روش روش پہ جلا کر تبسموں کے کنول
نئے رباب کے تاروں پہ گیت گائیں گے
جئیں گے اور سکھائیں گے زندگی کے طریق
نئی سحر کے نظارے فروغ پائیں گے
"نئی حیات نئی منزلیں"

یہاں بھی وہی خدا اعتمادی اور رجائیت ہے۔

ماجد اویب بریلوی کو عوام کی طاقت پر پورا بھروسا تھا ان کا نعرہ تھا ؎

نظر میں مستیٔ سوز دوام لے کے بڑھو
بڑھو طلوعِ سحر کا پیام لے کے بڑھو
غم نہ کر میری جدائی کا یہی بہتر ہے
حادثات غم ایام کی منزل ہے یہی
زندگانی اسی ماحول میں گذریگی تیری
جذبۂ فطرت آلام کا حاصل یہی ہے
تیرہ و تار روایات کے کاشانوں میں
اپنی معصوم محبت کا ہو بہنے دے
ساز امید کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھیڑ
تلخیٔ غم کے شراروں کو دبا رہنے دے
اور مجھے یاد نہ کر، یاد نہ کر
"مجبوری"

معاشی اور سماجی کشاکش کے دور میں رومان کی موت کوئی چیز نہیں ہے۔ ماجد اویب نے بھی ٹوٹے ہوئے دل سے ایک مشورا دیا ہے یعنی ؎

"اور مجھے یاد نہ کر، یاد نہ کر"

غزل بھی نظم کی طرح سماجی زندگی کے ٹھوس حقایق اور جدید ترقی پسند انسانی عوامی رجحانات کی حامل ہے اور اس میں تمام ذہنی اور قلبی مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعر منزل میں اپنی فنی یا کسی اور کمزوری کے سبب زندگی کے تقاضوں کے خدوخال نہ بنا سکے۔ ماجد ادیب بریلوی نے اپنی غزلیات میں بھی وسعتیں اور امکانات پیدا کیے ہیں۔ ان میں بھی سیاسی اور سماجی شعور کی ہم آہنگی، شگفتگی اور عشق کی ہواؤں کی خنکی ہے۔ مثلاً کچھ اشعار پر اکتفا کیا ہے یہ فیصلا قارئین پر چھوڑتے ہوئے کہ ماجد ادیب نے کہاں تک غزل کی رسم سے نباہ کیا ہے ؎

ارباب گلستاں کا چلن ہم سے نہ پوچھو
اے دوست حالات چمن ہم سے نہ پوچھو

ممکن ہو تو ماحول کی زلفوں کو سنوارو
درمان غم و رنج و محن ہم سے نہ پوچھو

مذاق عقدہ کشائی ہماری فطرت ہے
ہم اہل دل سے رموز نہاں کی بات کرو

یہ کشمکش ہی تو اصل بہار گلشن ہے
کبھی خزاں، کبھی برق تپاں کی بات کرو

ہم منکران فیض کرم تو نہیں مگر
ذروں کو آفتاب بنا دو تو بات ہے

پھر ایک بار سنواریں گے ہم غم ہستی
رہی یہ شرط کہ دنیا دعا شناس رہے

ہر منزل ہستی میں چراغاں کیا ہم نے
ہر گام پہ ایک نقش قدم ہم نے بنایا

افسانۂ ہستی ہے ادیب آج بھی رنگیں
جاں دے کے بھی معیار رقم ہم نے بنایا

آئینۂ فطرت کے جلو میں ہر اک رخ سے
یا تم نظر آتے ہو یا ہم نظر آتے ہیں

کل وہ بھی گریزاں تھے حقیقت سے جو آج ادیب اپنے ہمدم نظر آتے ہیں

ہم اعتبار وعدۂ فردا کے باوجود
امیدوار وعدۂ فردا نہ بن سکے

اہل خرد کو ناز خرد تھا مگر ادیب
راز آشنائے دیدۂ بینا نہ بن سکے

اب ہندستانی کی واحد شاعری کی اس صنف پر آیئے جس کو رباعی کہتے ہیں۔ یہ صنف اختصار کی وجہ سے کیوں کر شاعر کو اپنے دلی جذبات اور مختلف تجربات اور تجربات کو چار چار مصرعوں میں بیان کرنا پڑتا ہے، غزل کے قریب ہے اور بیان میں ابہام اور پیچیدگی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نظم سے بھی مشابہت ہے۔ اس میں کنایاتی اور علامتی الفاظ کے بجائے وہ الفاظ استعمال کرنا پڑتے ہیں، جو ہر حیات افروز پیغام کو براہ راست قاری تک پہنچا دیں۔ ماجد ادیب نے اس گلستان فن میں بھی گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں۔ کچھ رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

یہ دور یہ ہنگام تباہی توبہ
میخانے پہ چھائی ہے سیاہی توبہ

کچھ نیت ساقی میں یقیناً ہے فتور
ہر رند کے لب پر ہے الٰہی توبہ

آلام کو سینے سے لگایا ہم نے
اشکوں کو تبسم میں چھپایا ہم نے

ہر غم کو مسرت کی قبا پہنا کر
انسان کی عظمت کو بڑھایا ہم نے

بے مہریٔ ایام کا ماتم نہ ہوا
دل اہل ہوس کی طرح برہم نہ ہوا

ہم لوگ غنیمت ہیں زمانے میں ادیب
دنیا کی جفاؤں کا ہمیں غم نہ ہوا

وہ منزل مقصود طلب پاتے ہیں
آداب غم عشق جنہیں آتے ہیں

دنیا انہیں منصور کہا کرتی ہے
جو دار کی راہوں سے گذر جاتے ہیں

بدلی ہے زمانے کی یہ حالت کیسی
تہذیب کی دنیا میں جہالت کیسی
انسان! تری محفل میں ہنگام الفت
یہ بغض، یہ نفرت، یہ عداوت کیسی

غم خانۂ عالم کی قسم کھاتا ہوں
سوزِ غمِ پیہم کی قسم کھاتا ہوں
اب میں کبھی چاہوں گا نہ دنیا سے فرار
اے دوست ترے غم کی قسم کھاتا ہوں

ماجد ادیبؔ بریلوی کی شاعری میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، نشست الفاظ کا انداز اور بندشوں کا طریقۂ استعمال قابل قدر ہے، جس کی وجہ سے اس میں قاری کے تمام ذہنی و قلبی مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے نہ صرف عوامی اور اجتماعی زندگی کی عکاسی کی، بلکہ اس کی تعمیر کے لیے شعور اور عزم کی تشکیل بھی کی۔ انہوں نے زندگی اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو موضوع بنا کر انسانی سماج کو سیاسی، معاشی اور اقتصادی نظام کی تذلیل کے گھروندوں سے اٹھانے کی بھرپور کوششیں۔ ماجد ادیبؔ کی جواں مرگی سے ہندستانی ادب کو جو زبردست نقصان پہنچا ہے وہ واقعی بڑی حد تک ناقابل تلافی ہے۔

قطعات

سبزہ و برگ و بار و غنچہ و گل
ابتلا میں ہیں زندگی کے لیے
ہر حسیں چیز موت ہوتی ہے
ایک حساس آدمی کے لیے

اختر ابوں کے اس جزیرے میں
گردشِ وقت کھینچ لائی ہے
اب اسی بے بسی کے دوراہے پر
جس نے برسوں شکست کھائی ہے

ساحر پنڈوروی

نرہ مرہ تغزل

کوئی شاید پھر نوا پرداز ہے
ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

کہہ رہی ہے دل کی شانِ بیخودی
عشق کی منزل کا یہ آغاز ہے

مٹ گئی دل سے خلش انجام کی
کچھ تو آخر حاصلِ آغاز ہے

اب کہاں باقی تعین کی حدیں
ہر صدا مجھ کو تری آواز ہے

فرقِ ہوش و بیخودی کا مٹ گیا
اب مری ہستی سراپا راز ہے

عشق کی روداد سننے کے لیے
حسن خود اب گوش بر آواز ہے

رازِ الفت کو چھپاؤں کس طرح
گریۂ پیہم بڑا غماز ہے

کیوں کہوں میں اپنی رودادِ الم
میری خاموشی ہی شرحِ راز ہے

اے رتنؔ جب پردۂ دل اٹھ گیا
پھر تو چشمِ شوق بھی اک راز ہے

مثنوی کامروپ اور کامرو

Osmania University
HYDERABAD (DI

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

بہار ہندستان کا نہایت قدیم اور ہر دلعزیز قصا ہے۔ گارساں دتاسی اس کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ عجیب قصا ہے اور ہندستانیوں میں بہت سے مصنفوں نے اسے لکھا ہے..... کہتے ہیں کہ سندباد کا قصا "الف لیلیٰ" میں ہے اور سق برہان دین کا قصا جو میری دی فرانس کی تالیف ہے ان کی اصل یہی ہے۔ دتاسی اسی قصے کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے خطبات میں اس کی بار بار تعریف کی ہے اور وہ اسے ULYSSES سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس کی نظر سے اس قصے کے فارسی اور ہندستانی کے کئی نسخے گذرے تھے لیکن وہ ان سب میں تحسین الدین کی دکنی مثنوی کو بہترین قرار دیتا ہے، چنانچہ اس نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں LES AVENTURES DE KAMRUP کے نام سے کیا جو پیرس سے ۱۸۳۴ء میں شایع ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۳۵ء میں دتاسی نے تحسین الدین کی مثنوی کا دکنی متن بھی شایع کیا۔ یہ نسخہ ابی برٹرنڈ کی فرہنگ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں پھر شایع ہوا۔ کامروپ کے فرانسیسی ترجمے سے تقریباً چالیس برس پہلے ڈیلو فرنیکلن اس قصے کو انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۷۹۳ء میں لندن سے شایع کر چکا تھا۔ انگریزی کا ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں کلکتے سے شایع ہوا۔ جرمنی زبان میں بھی کامروپ کی تمہید کا ترجمہ پروفیسر ROSE GARTEN نے کیا تھا۔ جسے نامور گوئٹے نے اس نظم کی تعریف میں لفظ UNCH ATZBARE استعمال کیا ہے۔ کامروپ کے فارسی اور ہندستانی نسخوں کی تفصیل یہ ہے۔

فارسی نسخے

۱۔ قصۂ کامروپ (نثر) میر محمد کاظم حسینی متخلص بہ کریم جو عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶-۷۲ء) کا ملازم تھا۔ ریو کا بیان ہے کہ کریم نے قصا سنکرت سے لیا ہے۔

۲۔ قصۂ کامروپ (نثر) از ہمت خان میرآن بن خان جہاں۔ نسخہ بانکی پور۔ ہمت خان عہد عالمگیری کے ایک میر منشی تھے۔

۳۔ مثنوی دستور ہمت از مراد۔ یہ شخص ہمت خان کا ملازم تھا۔ اپنی مثنوی میں اس نے وضاحت کر دی ہے کہ میرے مربی ہمت خان نے قصۂ کامروپ کو فارسی نثر میں لکھا، چونکہ یہ قصا اسے بہت پسند تھا، اس نے مراد سے اس کے نظم کرنے کی فرمایش کی، مگر افسوس کہ مثنوی کی تکمیل سے پہلے ہمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ اسپرنگر اسے ہمت خان لائق بن اسلام خان کی مثنوی قرار دیتا ہے جو غلط ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۹۶ھ۔

دتاسی نے بھی جو مثنوی دستور ہمت کو غلطی سے ہمت خان سے منسوب کیا ہے۔

۴۔ مثنوی فلک اعظم۔ از انجب، بدیع العصر حاجی ربیع سنہ تصنیف ۱۱۵۷ھ۔

۵۔ مثنوی کامروپ از منشی علی رضا لکھنوی ۱۱۹۲ھ کیپٹن JOHN FLTCHIE کی فرمایش پر ہندوی سے ترجمہ کیا گیا۔

۶۔ قصۂ کامروپ از کوڑا مل (المتوفی ۱۸۴۸ء) یہ کتاب مصنف کے فرزند کالی رائے ڈپٹی کلکٹر نے دلی سے ۱۲۶۲ھ میں شایع کی۔ تعداد صفحات ۱۳۶۔

قصۂ کامروپ فارسی کے دو نثری نسخے دتاسی کے

کے پاس تھے۔ اس کا بیان ہے کہ اس قصے کا ایک مصور نسخہ موسیو JOMARD نے شاہی کتب خانے پیرس میں جمع کرایا تھا۔ مثنوی کامروپ فارسی کا ایک نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی محفوظ ہے۔

ہندستانی نسخے

۱۔ مثنوی کامروپ اور کلاکام از تحسین الدین۔ یہ مراد کی فارسی مثنوی دستور ہمت (سنہ تصنیف ۱۰۹۶ھ) سے ترجمہ ہے۔ اس کے دو مخطوطے انڈیا آفس میں ایک کتب خانۂ مانچسٹر میں اور ایک "انجمن ترقی اردو" علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

۲۔ کامروپ "نظم اردو" از ضیعم۔

۳۔ کامروپ "نظم اردو" از آرزو۔

۴۔ کامروپ "نظم اردو" از حسن۔

۵۔ کامروپ "نظم اردو" از سراج۔

۶۔ مرغوب القلوب (نثر) از سید حسین علی خاں حیدرآبادی (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ سنہ تصنیف ۱۲۴۵ھ

۸۔ قصۂ کامروپ (نثر) از کندن لال لاہوری (سنہ تصنیف ۱۸۴۹ء) یہ کتاب مراد کی فارسی مثنوی "دستور ہمت" کے پہلے باب کا ترجمہ ہے۔

مثنوی کامروپ اور کلاکام از تحسین الدین

تحسین الدین کی یہ مثنوی یورپ میں بہت مقبول رہی ہے۔ دناسی اس قصے کو عجیب و لاجواب کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے "ایک اعتبار سے اس قصے میں ہمارے لیے علم انسان کی معلومات پوشیدہ ہیں، ممکن ہے کہ اس مضمون کی خاص کتابوں میں ہمیں اس قدر مواد نہ ملے، جتنا کہ اس قصے سے۔ اس قسم کی خیالی کہانیاں ہمیں اہل مشرق کی زندگی سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔"

یورپ میں تحسین الدین کی اس مثنوی کے تین ایڈیشن شایع ہوئے۔ ہندستانی متن ۱۸۳۵ء میں فرانسیسی ترجمہ ۱۸۳۷ء میں اور متن مع فرہنگ ۱۸۵۹ء میں شایع ہوا۔ دناسی نے اس مثنوی کا خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ نوابان اودھ کے کتب خانے میں تھا۔ انڈیا آفس میں اس کے دو مخطوطے ہیں۔ ایک کا سنہ کتابت ۱۱۹۳ھ ہے (اوراق ۳۸) کتب خانۂ مانچسٹر کا قلمی نسخہ ۱۲۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہندستان میں اس مثنوی کا صرف ایک مخطوط دستیاب ہوا ہے جو "انجمن ترقی اردو" علی گڑھ کی ملکیت ہے۔ سنہ کتابت ۱۲۲۱ھ اوراق ۴۸۔ مثنوی میں مصنف نے کہیں اپنا نام اور تخلص نہیں لکھا۔ اس مثنوی سے متعلق محمد ابرار حسین فاروقی ازہری کا ایک مضمون رسالہ "معاصر" شمارہ ۳ میں شایع ہوا تھا (ص ۱۴۵) اور موصوف نے درخواست کی تھی کہ ناظرین معاصر مصنف کے نام تخلص اور سال تصنیف کا پتا چلائیں۔ دناسی نے اس مثنوی کا جو متن شایع کیا تھا وہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لیے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ نسخہ انجمن تحسین ہی کی تصنیف ہے۔ البتہ قرائن اس کے حق میں ہیں۔ دناسی کا بیان ہے کہ یہ مثنوی دکنی زبان میں ہے۔ نسخہ انجمن کی زبان بھی دکنی ہے۔ دناسی نے قصے کا جو خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے، وہ بنیادی طور پر نسخہ انجمن سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں نے کامروپ کے باپ کا نام مہاراجا پت لکھا ہے۔ دونوں اسے اودے پور کا حکمران بتاتے ہیں۔ شہزادے کی پیدائش دناسی بھی فقیر کے دیے ہوئے پھل کا نتیجہ بتاتا ہے۔ دونوں کہانیوں میں چھ وزیروں اور ان کے چھ بیٹوں کا ذکر آیا ہے جو شہزادے کے ہمجولی تھے۔ دونوں کے ہاں یہ بارہ برس کی عمر میں عشق کا شکار ہوتا ہے اور دونوں کے ہاں ہیروین سراندیپ کی شہزادی ہے۔

اس گہری مطابقت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ انجمن، تحسین الدین ہی کی تصنیف ہے۔ اگر یہ مثنوی کسی دوسرے مصنف کا نتیجۂ فکر ہوتی تو قصا بلکل یہی نہ ہوتا،

کیونکہ قدیم زمانے میں جب ایک ہی روایت پر مختلف شاعر طبع آزمائی کرتے تو تھے کو تازا اور رنگین بنانے کے لیے مرکزی کرداروں اور مقامات کے ناموں اور بعض جزیات میں تغیر و تبدل ضرور کر لیتے تھے۔ ایسی کسی تبدیلی کی غیر موجودگی میں انجمن کے نسخے کو تحسین الدین سے منسوب کرنا قرین قیاس ہے۔ تحسین الدین جس کی مثنوی کا یورپ میں شہرا رہا، اپنے ملک یعنی ہندستان میں گمنام ہے اور ہمارے تذکروں میں اس کے حالات نہیں ملتے۔

قصے کا خلاصا

اودے پور کے راجا، راج پیت کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے سادوؤں، سنیاسیوں کی دعوت کی۔ ایک درویش نے اسے "مہری" کا پھل دیا، جسے کھانے سے رانی سندر روپ کے پاؤں بھاری ہو گئے، چونکہ راجا کے چھ وزیر بھی لاولد تھے۔ ان کی بیگمات نے بھی پھل چکھا اور مقررا میعاد کے بعد سبھوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ شہزادے کا نام کامروپ رکھا گیا۔ پنڈتوں نے جنم پتر دیکھ کر بتایا کہ بارا برس کے بعد شہزادے کے گرہ بھاری ہیں اور بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شہزادے کو ایک عالیشان محل میں وزیروں کے چھ بیٹوں کے ساتھ رکھا گیا اور ان کی تربیت اور نگہداشت کے بہترین انتظامات کیے گئے، لیکن جو ہونا تھا ہو کے رہا۔ بارا برس کی عمر میں کامروپ نے خواب میں شہزادی کو دیکھا جو حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ اس کا چہرا تو نول کا سا، آنکھیں ہرنی جیسی اور گردن ہنس کی سی تھی۔ حسن اتفاق کہ اسی روز کلاکام نے شہزادے کامروپ کو خواب میں دیکھا اور اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔

کامروپ کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس پری چہرا بت طنار کی یاد اسے رہ رہ کر ستانے لگی اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود بھی اسے بھلا نہ سکا۔ شہزادے کے دن پریشانی اور راتیں بے خوابی میں گذرنے لگیں۔ آخر وزیر زادے کے ذریعے بادشاہ پر یہ راز کھلا تو وہ بہت سٹ پٹایا۔ ملک ملک کے پردیسیوں، جوگیوں اور فقیروں کی دعوت کی گئی کہ کوئی شہزادی کا پتا بتا سکے۔ آخر سمت نامی برہمن نے جو سراندیپ کا رہنے والا تھا، کلاکام کا آتا پتا دیا۔ یہ برہمن دراصل کلاکام ہی کا بھیجا ہوا تھا۔ غرض شہزادا کامروپ مع چھ رفیقوں کے سمت کے ہمراہ سراندیپ روانا ہوا۔

جلد ہی دراز کا سفر تھا، سمندر پار کرتے ہوئے طوفان کا سامنا ہوا اور جہاز پاش پاش ہو گیا۔ ایک کو ایک کی خبر نہ رہی۔ کامروپ تختے کے سہارے بہتا ہوا کنارے پر آ لگا۔ رات جنگل میں گذاری۔ یہ تریا راج رانی راوتا کا مقام تھا جو شہزادے پر عاشق ہو گئی اور دونوں مل جل کر رہنے لگے۔ شہزادا کلاکام کو بھول چلا تھا کہ ایک رات وہ خواب میں آئی اور کامروپ کو سخت سست کہا۔ اس واقعے کے بعد کامروپ راوتا کے چنگل سے نکل بھاگا، لیکن ایک پری کی ہوس کا شکار ہوا۔ یہاں سے ایک حاسد راکھس نے اسے سمندر میں جا پھینکا اور وہ بہتا ہوا سراندیپ کے کنارے جا لگا۔ اس جزیرے میں تسما پاد رہتے تھے جو کامروپ کے کاندھے پر سوار ہو کر اسے کوڑے مار مار کر ہانکنے لگے۔ کامروپ نے انگوروں کا رس نکال کر شراب بنائی۔ جسے پی کر تسما پاد مدہوش ہو گئے۔ کامروپ اور دوسرے گرفتار لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور تسما پادوں کو چن چن کر قتل کیا اور بھاگ نکلے۔ ان آزاد ہونے والوں میں وزیر کا بیٹا متر چند بھی تھا۔ اسے ایک دیو نے گرفتار کر لیا تھا جو بعد میں اس کا ہمدرد بن گیا اور اپنے بالوں کے ذریعے ضرورت کے وقت مدد دینے کا مدعی ہوا۔ ابھی متر چند اور کامروپ باتیں کر رہے تھے کہ ان کا تیسرا ساتھی بھی آ ملا۔ یہ طوطے کی شکل میں تھا اور پانی کا دھارا گھولنے پر انسان بن گیا۔ وہ ایک پری کا شکار رہا جس کی قید سے آخر وہ اڑ نکلا تھا۔ اسی اثنا میں انہیں وہ برہمن بھی ملا جس کے پراسرار بھل کی بدولت

کامروپ اور اس کے چھ بھجولی پیدا ہوئے تھے، اس نے سنگ کیمیا دیا تاکہ شہزادا غربت اور افلاس کے عالم میں پریشان نہ ہو۔

چند دنوں کے بعد شہزادے کے باقی ساتھی بھی مل گئے۔ ان میں ایک نقاش تھا اور ایک طبیب۔ دونوں بادشاہ کامراج کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے۔ نقاش نے شاہی محل میں نقش و نگار بنائے اور طبیب شہزادی کلاکام کا علاج کرتا ہے۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ شہزادی عشق میں مبتلا ہے۔ بادشاہ نے نقاش سے شاہی محل میں جگہ جگہ کامروپ کی تصویریں بنوائیں، جنہیں دیکھ کر کلاکام کے مرض میں کچھ کمی ہوئی۔ آخر سوئمبر رچانے کا فیصلا کیا گیا۔ کامروپ نے اپنے ایک ساتھی کو طوطا بنا کر شہزادی کے پاس بھیجا کہ وہ اس رسم کے موقع پر فقیر کے بھیس میں آئے گا۔ چنانچہ جب شہزادی نے موتیوں کا ہار بجائے راجاؤں مہاراجوں کے، ایک فقیر کے گلے میں ڈالا تو اس کے باپ کامراج کے غصے کی انتہا نہ رہی، لیکن دیو کے بالوں اور سنگ کیمیا کی مدد سے کامروپ نے دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی کا سا جاہ و جلال اور شان و شوکت پیدا کر لی۔ کامراج کو جب شہزادے کی اصلیت معلوم ہوئی تو بڑا خفا ہوا، غرض اس طرح مدتوں کی جد و جہد کے بعد کامروپ اور کلاکام اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے۔

تحسین الدین کی مثنوی حسب معمول حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔

الٰہی بحق توں ہی کرتا رہے — دو عالم کا پیدا کرن ہار ہے
نہ کرے کوئی تیری قدرتیاں — نہیں علم تیرا کسی پر عیاں

اس کے بعد چند اشعار عشق کی تعریف میں ہیں۔ مثنوی کی زبان دکھنی ہے، لیکن ادق اور مشکل نہیں۔ شاعر کے انداز بیان میں سادگی، لطافت، روانی اور صفائی ہے وہ قصے کی دلچسپی ہر جگہ قایم رکھتا ہے اور مناظر و واقعات کو اچھوتے اور دلکش انداز میں بیان کرنے پر قادر ہے۔ بعض تشبیہات جدت و ندرت کا پتا دیتی ہیں۔ شہزادی کلا کام کے سراپا سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سکھتی چلے چال وہ پگ اٹھاے — بجیں پگ میں گھنگرو محل چھن چھناے
بھریں ہاتھ مہندی کے وہ لال لال — بھریں کیس موتی گندھے بال بال
دونیوں میں کاجل دئے من ہرن — سمی مل کے نیلی پھرے وہ پرن
سمرج دیکھ صورت کھڑا تھر تھراے — چندرماں بدن دیکھ کر منھ چھپاے

کامروپ کے کامران و کامیاب آنے پر۔

سنی فوج کی راج پت نے خبر — کہا اپنے دیوان کو دیکھ کر
بلا کر کرم چند دیوان کوں — کہا فوج میں جا کے پہچان توں
کہاں کا مہاراج کیا نام ہے — اودے پور میں آیا، کیا کام ہے
کہو جا کے کس دیس میں تم رہو — کنو کامرو کی کچھ خبر کہو

یہ سب دراصل کامروپ کی فوج تھی، مدتوں کے بچھڑے ملے۔ کامروپ نے اپنی دشت نوردی اور کامیابی کی داستاں سنائی اور آخر کار۔

تھا سن مہاراج نے تب کہا — کرم میں ترے تھا یہی کچھ بدا
بہت دھیان کر کے کیا تھا جتن — کہ تجھ پہ نہ آوے برہ کی کٹھن
کبھی فکر و عقل سے کچھ نہ ہوئے — بدھا تا جو چاہے کرے سو تو ہوئے
رہو سکھ میں خوش ہو کے اپنے نگر — کرو راج اب بیٹھ کر بے فکر

خاتمہ۔

کرے عشق اس طرح سے کوئی — نہیں شک یقین اولیا وہ جوئی
مقرر ہے جنت میں اس کے لئے — ورے نیک بختی بہ طاعت ملے

دنیا کی مائیں

عصمت چغتائی

ہلسنکی سے جب ہم امن کانفرنس کے خاتمے پر روس جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو نہ جانے کیوں ہمارے دل بے طرح دھڑک رہے تھے "روس جا رہے ہیں ہم" تالستائی گورکی اور چیخوف کی جنم بھومی کی اور جا رہے ہیں۔ یہ ملک کوئی انجانا نہیں ہے۔ ہم نے کتابوں کے ذریعے خاص جان پہچان کر لی ہے" ہم سوچ رہے تھے۔ اور جب ہم دھڑکتے ہوئے دل لے کر اسٹیشن پر پہنچے تو ہمارے نئے میزبانوں نے ہمیں خستی خستی مال غنیمت کی طرح سمیٹ لیا۔ ہمیں پتا بھی نہ چلا اور جب ہم آرام دہ ریل کے خوبصورت ڈبوں میں اطمینان سے بیٹھ گئے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہر ایک کا چھوٹی موٹی ضرورتوں کا بیگ پاس دھرا ہے۔ نئی دلہن کی طرح آہستہ آہستہ ریل چلتی رہی اور دس گھنٹے کا سفر باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ ہم روس کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اس زمین پر ہماری ریل چلی جا رہی تھی جہاں کسی روسی تالستائی جیسے گھمکڑ مزدور گذرے ہوں گے۔ کچے بچے سارشتا دلوں میں جاگ رہا تھا۔ ہر چیز پیار آ رہا تھا ہم لوگ بلاوجہ بھی جذباتی ہو رہے تھے۔ کہانیوں اور ناولوں کی دنیا میں رہتے رہتے ہم رومانٹک ہو کر رہ گئے ہیں۔

لینن گراد آ رہا تھا۔ اور ہم حد سے زیادہ ایجیٹیٹ ہوتے جا رہے تھے۔ یہ سوچ کر ذرا دلوں پر اوس پڑ جاتی کہ جن لوگوں سے ہم اتنے ارمان بھرے دل لے کر ملنے جا رہے تھے شاید انہیں کچھ بھی نہ محسوس ہو رہا ہو۔ ایسے مہمان تو روز ہی آیا کرتے ہیں روس میں، ایک گاڑی اور سہی۔ اجنبی دیس کے اجنبی باسی بھلا کیا جانیں کہ ہم ان سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ بھلا ناولوں اور کہانیوں کی ملاقات بھی کوئی ملاقات ہوئی۔

لیجئے لینن گراد آ گیا۔ وہی لینن گراد جس نے ہٹلر میاں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ ہم چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ لمبا چوڑا پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسا کہ اگر ایک پھول بھی پھینکو تو سروں پر ہی ٹک جائے نیچے نہ گرنے پائے۔

"دل سے دل کو راہ ہوتی ہے" ہم نے کہا۔ ہمارے دل بے کار تھوڑا ہی دھڑک رہے تھے۔ نیچے اترے تو ہمیں اتنے بڑے بڑے گلدستے پیش کیے گئے کہ اٹھانا دشوار ہو گیا۔ ہماری مشکل کو دیکھ کر ہمارے میزبانوں نے ہم سے کوٹ اور بیگ وغیرہ لے لیے، کیونکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ دو قدم چلے تو اسی ڈیل ڈول کے بلا مبالغہ دس بارہ اگلدستے اور تھما دیے گئے۔ یا خدا..... پھول ہی پھول کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اور پھولوں سمیت ہمیں لینن گراد کی عورتوں نے دبوچ کر پیار کرنا شروع کیے۔ وہ پھولوں میں سے ہمارے گھبرائے ہوئے چہرے ڈھونڈتیں اور بوسوں کی بارش تھوپ کر دیتیں۔ پھر چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ پھر دوسری بڑی بی ہمیں ان سے چھین کر کلیجے سے لگا لیتیں۔

کسی نے ہمیں بتایا "یہ لینن گراد کی مائیں ہیں! ان میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا بیٹا، میاں یا پوتا، نواسا اس گذشتا جنگ میں نہ مارا گیا ہو۔ بہت سی تو ایسی ہیں جن کے سارے کے سارے خاندان ان کی ضعیف آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے۔ انہوں نے لینن گراد کی ہر باری دیکھی ہے۔ اس زمین کا ذرا ذرا ان کی کوکھ سے جنے ہوؤں کے لہو میں نہا چکا ہے۔ لینن گراد کے در و دیوار میں ان کی ماستا اور سہاگ دفن ہے۔"

ہماری آنکھوں سے بہنے والے خشی کے آنسو ہر

میں ڈوب گئے۔ مامتا کی یہ بے قدری اور اسی انسان کے ہاتوں جسے "اشرف المخلوقات" کہا جاتا ہے۔ ایک دیس کی ماؤں کے دل یوں پیس ڈالے گئے اور ہم دور دیس کی عورتوں کے کلیجوں میں کسک بھی پیدا نہ ہوئی۔

ہائے ان معصوم عورتوں نے کونسا جرم کیا تھا جو لہلہاتے کھیتوں اور ہنستے بچوں کے بجائے انہیں بھیانک بم اور مشین گنوں کی باڑیں ملیں۔ بچوں کے قہقہے اور محبوب کی سرگوشیاں توپوں اور بندوقوں کے غرانے میں ڈوب گئیں۔ جنگ نے ان کی زندگی کو کس گناہ کی پاداش میں ڈس لیا؟

ان کا قصور بس اتنا ہی تو تھا کہ کسی سے پیار کیا تھا، انسان کو جنم دیا تھا، اسے پالا پوسا تھا، لوریاں سنائی تھیں۔ اس کے بدلے میں انہیں تباہی ملی۔ کیا مامتا کا یہی انعام ہے!

.... ہم پلیٹ فارم پر چلتے چلے جا رہے تھے، اور پھولوں کے انبار اونچے ہوتے جا رہے تھے۔

اور عورتیں وہیں رستے میں چونے کے لیے دبوچ رہی تھیں۔ اس بھاگ دوڑ میں بڑے مزے کی باتیں کرنے سے بھی نہ چوکتیں۔ ہمارے بیتر جان ان سے چھیننے کی بہت کوشش کرتے، مگر چاروں طرف سے عورتیں ایسا گھیرتیں کہ پت نہ چلتا۔

اب ہمارے بھی آنسو بہنے لگے۔ ارے، یہ ہم سب رو کیوں رہے ہیں۔ جیسے برسوں کے بچھڑے ملے ہوں، مگر ہم تو آج پہلی بار مل رہے ہیں، مگر اس پیار میں بڑی جانی پہچانی مہک ہے۔ اوہ! یاد آیا..... جب میں چھٹوں میں کالج سے آیا کرتی تھی تو میری پیاری اماں اسی طرح رو رو کر مجھے پیار کرتی تھیں۔ ان کے جسم سے بھی ایسی سوندی سوندی مٹی کی خوشبو آیا کرتی تھی کہ بس جی چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر ان کی گود میں منہ دے کر سو جاؤں۔

اور ان عورتوں کو دیکھ کر مجھے اپنی اماں یاد آ گئیں۔ پیاری پیاری نرم گرم اماں۔ اب ان کی گود کبھی نصیب نہ ہوگی۔ دو سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

جیسے بچوں میں ایک خاص قسم کی خوشبو آتی ہے۔ خاص کر کے جب وہ سو کر اٹھتے ہوں۔ کچے، ناز اٹھائے ہوئے دودھ جیسی۔ کچے شہد سے ملتی، کبھی آپ نے ناز اٹھائے ہوئے بچے کو سونگھا ہے۔ ایسی نشا آور مہک آتی ہے کہ جی چاہتا ہے چکو تو نشہ دار لذیز ہوں گے۔ اسی طرح بوڑھوں سے ایک خوشبو آتی ہے جسے سونگ کر نیند سی آنے لگتی ہے۔

عورتیں چاہے کسی بھی ملک کی ہوں، انہیں یہ پوچھنے کی بڑی فکر پڑی رہتی ہے کہ "تمہارے کتنے بچے ہیں؟" اب مشکل یہ ہے کہ زبان نہیں آتی کیسے بات چیت ہو۔ انٹرپریٹر بھلایا ہوا ہے سنتا نہیں، مگر زبان نہ جاننے سے کیا ہوتا ہے؟ محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی عاشق معشوق ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور فسانے مکمل ہو جاتے ہیں۔

ایک بڑی بی نے ہاتھ کے اشارے سے فوراً پوچھ لیا "کتنے بچے ہیں؟" میں نے فوراً دو انگلیاں اٹھا دیں۔ ان کے ہونٹ لرزے، آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ چہرے کی جھریاں کپکپائیں، چار بوڑھی انگلیاں ہوا میں لرزیں ایک آہ سرد کلیجے سے نکلی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیے۔

میرے کلیجے پر گھونسا سا لگا۔ یعنی چار بچے تھے چاروں گہری نیند سو گئے، اور اس لمحے جو ویرانی میں نے بڑی بی کے چہرے پر دیکھی آج تک میرے دل و دماغ پر لوہے کے داغ کی طرح سلگ رہی ہے۔ ان کے گرم گرم آنسو سے میرے رخسار تر ہو گئے۔ ان کے جھریوں دار ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسی مسکراہٹ نے میرا کلیجہ کاٹ دیا۔ یا خدا! یہ آنسو ہتھیا ہتھیا ہوں ہی میرے ہونٹوں پر سلگتے رہیں گے! یہ مسکراہٹ میرے ضمیر کو نشتر کی نوک کی طرح کچوکے دیتی رہے گی۔ کیا ایک انسان کی حیثیت سے اس مسکراہٹ کا میرے اوپر کوئی حق نہیں؟ کیا میرے اوپر کوئی اور

ذمہ داری نہیں آتی؟ میں بھی تو ماں ہوں، میں نے بھی نو ماہ بچے کو پیٹ میں پالا ہے۔ میں جانتی ہوں اگر میرے بچوں کو کچھ ہو جائے تو میرا کیا حال ہوگا۔ نہیں میں زندہ نہ رہ سکوں گی، مگر یہ زندا ہیں۔ اور مسکرا رہی ہیں۔ اپنا سب کچھ کھونے کے بعد بھی یہ عورتیں دوسروں کی سجی بنی دنیا کو دیکھ کر ہی جی لیتی ہیں۔ جب ڈائنیں کی ڈائنیں تندرست بچوں کی ان کے سامنے کوندتی، اچھلتی گذرتی ہیں تو ان تھکی ہوئی آنکھوں میں زندگی کا خمار چمکنے لگتا ہے۔ جب کوئی نیا دلہا دلہن کا جوڑا مسکرا کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں غرق ہو جاتا ہے تو یہ جھوم اٹھتی ہیں۔ کسی نوخیز ماں کی گود میں اس کا لال ہمکتا ہے تو یہ اسے اپنا پوتا یا نواسا تصور کر کے زخمی مامتا کو بہلا لیتی ہیں۔ دوسروں کی دنیا ہی ان کی دنیا ہے۔

کیا یہ گھایل مسکراہٹ بھی ان ہونٹوں سے چھن جائے گی؟ یہ آج کئی گھنٹوں سے پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ بڑی دور دور سے آ کر جمع ہوئی ہیں۔ انہوں نے سنا ہے ہلسنکی میں جو امن کانفرنس ہوئی تھی وہاں سے سوامن کے حامی لینن گراد آ رہے ہیں۔ اب یہ جنگ نہ ہونے دیں گے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے اگر یہ آ جاتے تو جنگ رکوا دیتے اور تب ان کی یہ دنیا اتنی خالی نہ ہوتی۔ ذمہ داری کے بوجھ سے بھول ہمارے کندھوں پر نوالادی زرا کچھ بن گئے۔ یہ آس لگا رہی ہیں کہ ہم جنگ نہ ہونے دیں گے۔ وہ گھروندا جو ڈھا دیا گیا تھا ہمت والوں نے دوبارا اپنا سجا کے کھڑا کر لیا ہے۔ کہیں کسی بموں کے بیوپاری کی نظر اسے نہ کھا جائے۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی، اف! یہ جنگ بھلا مجھ سے کیسی روکی جائے گی؟

مکسی ان بڈیوں نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے یہ پیار کا جادو ہے۔ اسے کوئی منتر نہیں اتار سکتا۔ میں ان ماتا بھری آنکھوں کو کیسے بھول سکوں گی۔ یہ تو جنم جنم میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ ان کے محبت بھرے جسموں کی مہک تو میری نیندیں اڑا دیں گی۔

کاش میں یہ سونی سونی مسکراہٹ اور یہ سلگتے ہوئے آنسو اپنے دیس لے جا کر اپنے بچوں کو پکڑا دوں اور کہوں "میرے دیس کے پیارے بچو، دور بہت دور کے دیس سے تمہارے لیے تحفا لائی ہوں، یہ پیار کے موتی ہیں۔ ان کی عزت اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی رکشا کرنا تمہارا دھرم ہے، میرے ہونٹوں سے ان کے بوسے چن لو یہ انہوں نے تمہارے ہی لیے مجھے دیے تھے۔ دنیا میں جنگ کی ڈائن کے ہاتھوں اجاڑی ان گنت نامراد گودیں ہیں۔ میرے تو نہا لو انہیں اپنے پیار سے بھر دو۔ اپنے دیس کی عورتوں سے کہو۔ اے سہاگنو، تمہاری کوک ٹھنڈی رہے! جب اپنی اولاد کو کلیجے سے لگاؤ تو ان ماؤں کا بھی خیال کرنا جن کی باہیں خالی ہو چکی ہیں۔

عزم جواں

محمد حسین عرشی

گلشن سے نکلنے کو ہم آج نکل جائیں
ڈر ہے کہ بہاروں کے عنواں نہ بدل جائیں
ہم عزم جواں لے کر جس سمت نکل جائیں
بڑھتے ہوئے طوفاں بھی رخ اپنا بدل جائیں
ہوتے ہیں بہاروں کے سائے انہیں پھولوں پر
بیخوف جو کانٹوں کے آغوش میں پل جائیں
اسوقت سمجھ لینا عالم ہے بہاروں کا
جب توڑ کے زنداں کو دیوانے نکل جائیں
ڈھل جائیں محبت کے سانچے میں اگر انساں
بگڑے ہوئے دنیا کے حالات بدل جائیں
خادم مری آہوں کو حاصل ہیں وہ تاثیریں
انساں کی حقیقت کیا پتھر بھی پگھل جائیں

پل کے نیچے

(فیچر)

ستیش بترا

(دور ریل کی ہلکی سی سیٹی جیسے رات کی سنسان تاریکی کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے، ایکایک دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہیں اور پھر ان سے کچھ قریب رات کے بیکراں سناٹے میں کسی عورت کے کراہنے کا مدھم آواز سنائی دیتی ہیں)

راجو۔ (چلم پیتے ہوئے کھانسنے لگتا ہے اور پھر سردی سے ٹھٹھرتا ہے) پھر وہی کھانسی کا دورہ را! اف کتنی سردی ہوگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے ہیں۔ اب تو جاڑا ان گدڑیوں کو چیر چیر کر ہمارے جسموں کو کھائے جا رہا ہے (وہ پھر ٹھٹھرتا ہے) کتنی سنسان ہے یہ رات! یہ بھونکتے ہوئے کتے سہمے ہوئے دلوں کو اور بھی ڈرا دیتے ہیں۔ ریل کی لائینوں میں انجن کی راک میں پڑے ہوئے ان کو بھی جاڑا نسا رہا ہے۔ آخر یہ راک کب تک گرم رہ سکتی ہے۔ اور سردی ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ (وہ ایک عجیب ہنسی ہنستا ہے جو ویرانگی کے احساس کو اور بھی بڑھا دیتی ہے) اب تو پل کے اوپر بھی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ چپ چاپ خاموش یہ پل سو رہا ہے۔ دن بھر یہ بے چارا پل ہنکتے ہوئے ٹھیلے، چرچراتی بیل گاڑیاں اور سناٹی ہوئی موٹروں کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، کتنی رونق ہوتی ہے اس پل پر، لیکن اندھیرا ہوتے ہی اس قدر ویران کیوں ہو جاتا ہے (وہ پھر کھانستے ہوئے ایک گہری سانس لیتا ہے) کتنا اندھیرا ہے۔ اور یہی ریل کی پٹڑیاں جو چاند کی روشنی میں چاندی کے تار کی طرح چمک اٹھتی ہیں، آج بالکل دکھلائی نہیں دیتیں۔ اس دروازے کی چھت ریل کے دھوئیں سے کتنی سیاہ ہو گئی ہے۔

کردار:-

راجو

بھیکو

راگھو

حیوان

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ شاید پل کے اوپر روشنی ہو گی۔ سامنے اسٹیشن کی بتیاں ہلکے ہلکے ٹمٹما رہی ہیں کتنا سناٹا ہے اسٹیشن پر۔ کوئی مسافر بھی تو نظر نہیں آرہا ہے اس جاڑے میں کون نکلے۔ سب کے سب مسافر خانے میں دبکے پڑے ہوں گے۔ یہ چلم بھی کمبخت ٹھنڈی ہوگئی ہے (وہ کش لینے کی بیکار کوشش کرتا ہے) اب آگ کون جلائے (جلنے کی کوشش کرتا ہے، ماچس کراہنے لگتا ہے) اوہ! اف! کس قدر درد ہے اپاہج ہونا بھی ایک گناہ ہے۔ کس قدر شدت کا درد ہوتا ہے۔ اوہ! اوہ! (پل کے دروازے میں سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

بھیکو۔ غضب کی سردی ہے۔ دانت سے دانت بج رہا ہے۔

راجو۔ کہو بھیکو! بچی کا کیا حال ہے؟

بھیکو۔ بیچاری کو بہت زور کا درد ہو رہا ہے۔ حیوان اس کے پیٹ پر مالش کر رہی ہے۔

راجو۔ ہاں ایسی حالت میں شدت کا درد ہوتا ہی ہے۔ سکھیا ابھی تک نہیں آیا؟

بھیکو۔ نہیں ابھی تو دس کی گاڑی بھی نہیں آئی۔

راجو۔ میں نے کتنی بار اس سے کہا ہے وہ جلدی آجایا کرے۔

بھیکو۔ آخر فکر کس بات کا ہے راجو۔ راگھو بھی تو ساتھ ہی ہے۔

راجو۔ گھر میں دکھ سکھ ہے۔ یہ لڑکے جلدی آجاتے تو اچھا تھا۔ نہ جانے کس وقت کون چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ تم نے تمام ضروری چیزیں تو پہلے ہی سے منگوا لی ہیں نا؟

بھیکو۔ ہاں تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ راجو اور پھر حیوان

تو لچھمی کے پاس ہے۔ جیوان بڑی تجربے کار عورت ہے۔

راجو۔ ہاں! مجھے جیوان پر پورا وشواس ہے، لیکن یہ لڑکے جلدی گھر آجاتے تو زیادہ اچھا تھا۔

بھیکو۔ چلم کہاں ہے؟ ارے یہ تو بالکل بجھ گئی ہے۔

راجو۔ ہاں! مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں اٹھ کر آگ جلا سکوں۔ میں اٹھنا چاہتا ہوں، لیکن کوئی چیز میرے گھٹنوں کے پاس شدت کا درد پہنچا کر مجھے احساس دلاتی ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری زندگی بے کار ہے، مجھے کس قدر نفرت ہے اس زندگی سے۔ رات کے اندھیروں میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا وجود اس دنیا پر بوجھ ہے، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کاش کہ میری ٹانگیں مجھے واپس مل جائیں تاکہ میں زندگی کی مصیبتوں کا دلیری سے مقابلا کر سکوں۔ لوگ میری بے بسی اور لاچاری پر ترس کھا کر میری جھولی میں پیسے ڈال دیتے ہیں، لیکن یہ ایک ایک پیسا جیسے میرا منھ چڑاتا ہو۔ میری کمزوری پر ہنستا ہوا اور میری زندگی کا تمسخر اڑاتا ہو۔ کاش کہ میں کچھ کر سکتا (وہ پھر کھانسنے لگ جاتا ہے) میں گھنٹوں اس پل کے دروازے میں بیٹھا سوچتا رہتا ہوں کہ مانگنے کے لیے پل کے اوپر جاؤں یا نہ جاؤں۔ میں پہروں اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں، لیکن پھر پیٹ کی آگ مجھے فیصلا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں گھسیٹتا گھسیٹتا کراہتا ہوا پل کے اوپر جا بیٹھتا ہوں، لیکن مجھ میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ میں لوگوں سے کچھ مانگ سکوں میں چپ چاپ مٹی کے کھلونوں کی طرح بیٹھا رہتا ہوں۔ مجھے وہاں بیٹھے رہنے میں بھی انتہائی شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن کوئی نہ کوئی رحم دل انسان میری جھولی میں کچھ ڈال دیتا ہے۔ اور تسلی کی طرح میرے منھ سے نکل پڑتا ہے "داتا تجھے سکھی رکھے۔ داتا تجھے سکھی رکھے۔" بھیکو یہ آواز میرے دل سے نہیں نکلتی میرا پیٹ میرے منھ سے نکلواتا ہے۔ کاش کہ میرے ماں باپ میرے پیدا ہوتے ہی میرا گلا گھونٹ کر مار دیتے۔ میں ایسی زندگی کے لیے ہرگز پیدا نہ ہوا تھا۔

بھیکو۔ یہ سب تقدیر کا چکر ہے۔ اس میں کسی کا دوش نہیں۔

راجو۔ تقدیر کا چکر (وہ اسی عالم میں بڑبڑانے لگتا ہے) ہاں! میں بھی ایک کھاتا پیتا کسان تھا۔ میرا بھی ایک کھیت تھا۔ ہرا بھرا لہلہاتا ہوا چیت بیساک کے دنوں میں سونا اگلتا تھا۔ اس کے قریب بل کھاتی ہوئی ندی تھی جس کا شوخ اٹھلاتا ہوا پانی میرے کھیت کو شاداب کیا کرتا تھا اور جس کی گنگناتی ہوئی لہریں اپنی میٹھی لوریوں سے گاؤں والوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا کرتی تھیں۔ اس کی ہواؤں میں گاؤں کی الھڑ کنواریوں کے گیت گونجا کرتے اور ان کی تان پر میں اپنے کھیت میں ہل چلایا کرتا۔ جب سورج بلندیوں پر پہنچ جاتا اور گاؤں کے مندر کا سنہرا کلس اس کا منھ چڑانے لگتا تو میری بیوی میرے لیے کھانا لے کر کھیت میں آتی۔ سکھو ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے جھولتا ہوا آتا۔ ایک ننھی سی جان کس قدر پیار کیا کرتے تھے ہم اسے! میں انہیں دیکھتے ہی کام چھوڑ دیا کرتا۔ ہم ندی کے کنارے ہری ہری گھاس پر نیم کے نیچے بیٹھ جاتے اور ہمارے قہقہے گاؤں کی فضاؤں میں پھیلتے رہتے۔ اس کے بعد میری بیوی میرے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی اور ننھا سکھو منڈیر پر بیٹھا اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تالیاں بجاتا، خوشی سے چیختا چلاتا۔ ہم لوگ گیہوں کی بالیاں کاٹ کاٹ کر اس کی طرف پھینکتے۔ وہ ان سے کھیلتا اور ہم اپنی دولت کو یوں اکٹھا ہوتے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ آہ! اب وہ رنگین لمحے پھر کبھی نہ آئیں گے۔ کیا وہ وقت کے تیز دوڑتے رتھ کی دھول میں ہمیشہ کے لیے غایب

ہو گئے (وہ پھر کھانسنے لگتا ہے)

بھیکو۔ پھر کیا ہوا۔

راجو۔ (کھانستے ہوئے) اوہ! یہ کھانسی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ کسی نہ کسی روز یہ میرا دم لے کر ہی چھوڑے گی۔ آہ! کس قدر پیارا تھا وہ سپنا، پھر گاؤں میں چھپک پھیلی۔ میری بیوی اور سکھو دونوں اس کا شکار ہو گئے۔ سکھو تو جلدی ٹھیک ہو گیا، لیکن ظالم چھپک میری پاروکو اپنے ساتھ لے گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری مصیبتیں بڑھنے لگیں۔ رفتار فتاہم پر قرض کا بوجھ بڑھتا گیا۔ گاؤں کا ساہوکار ہمارا چھوٹا سا کھیت ہڑپ کر گیا۔ میں سکھو کو لیے شہر چلا آیا، تاکہ مزدوری کر کے اپنا اور سکھو کا پیٹ پال سکوں اور پھر ــــ اور پھر بھیکو میں اپاہج ہو گیا۔ میں ایک موٹر کے نیچے آ گیا۔ میری دونوں ٹانگیں ضایع ہو گئیں اور اب ــــ اب بھیکو میں ایک زندہ لاش ہوں۔ دنیا اور سکھو پر ایک بوجھ (خاموشی چھا جاتی ہے)

بھیکو۔ (چلم کے کش لگاتا ہوا) لو یہ چلم لو، کس قدر دکھ بھری کہانی ہے تمہاری!

راجو۔ لاؤ۔ (کش لگا کر) میرا دماغ ایک عجیب ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے، لیکن چلم پیتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہوں، بھیکو! ایک باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے کتنی امیدیں ہوتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرے۔ انہیں اس قابل بنا دے تاکہ وہ فخر سے اپنا سر بلند کر سکے، لیکن میں اپنے بیٹے کو ایک بھکاری ہی بنا سکا۔ ایک بھکاری (وہ طنز بھری ہنسی ہنستا ہے) پارو اور میں اسے ایک خاکش کسان بنتا دیکھنا چاہتے تھے، لیکن ایک بھکاری! ہمیں کیا معلوم تھا کہ سکھو کی زندگی گاڑیوں میں لوگوں کو گیت سناتے گذرے گی۔ اس کے ہات مسافروں کے سامنے پیسے پیسے کے لیے پھیلیں گے۔ اور کبھی کبھار کوئی مسافر ترس کھا کر اسے ایک آدھیلا دے کر یہ سمجھے گا کہ اس نے انسانیت کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ بھیکو یہ تو ہین ہے۔ بھکاری۔ بھکاری۔ (راجو جیسے عالم خواب میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ پھر ایک طویل خاموشی چھا جاتی ہے۔ جس میں دو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ پھر ریل گاڑی کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

راجو۔ ہاں گاڑی آ رہی ہے۔ ابھی تو بہت دور ہے، لیکن یہ لائن کتنا ہلنا شروع کر دیتی ہے (ایک ہلکی سی سیٹی اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ واضح ہوتی چلی جاتی ہے)

بھیکو۔ ہاں اب گاڑی آئے گی۔ ساتھ والے دروازے میں سے گذرتی ہوئی بھاپ کے بادلوں سے ہم سب کو ڈھانپ لے گی۔ یہ ٹھنڈی دیواریں لمحے بھر کے لیے گرم ہو جائیں گی۔ اور ہمارے سردی سے اکڑے ہوئے جسم ان دیواروں سے چمٹنے پر مجبور ہو جائیں گے، تاکہ وہ بھاپ کی گرمی کو زیادہ سے زیادہ دیر تک جذب کر سکیں (گاڑی کی سناہٹ قریب سنائی دیتی ہے) کس قدر راحت بخش اور خوشگوار ہے یہ گرمی! اس کی حرارت ہمارے جسموں میں پگھلتی چلی جا رہی ہے (گاڑی کی آواز مدھم ہو جاتی ہے)

راجو۔ لیکن بھیکو تم نے کبھی یہ سوچا کہ اس ایک لمحے کی گرمی کے بعد جاڑا کس قدر بڑھ جائے گا یہ ہی حرارت کے زندگی بخش سانس ٹھنڈے ہو کر ہماری ہڈیوں کو تک یخ کر کے رکھ دیں گے۔

بھیکو۔ راجو میں صرف حال کی پروا کرتا ہوں مستقبل کے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

راجو۔ (کچھ دیر کے بعد لمبی سانس لیتے ہوئے) اوہ! اب تو

سگنل کی بتی پھر لال ہو گئی ہے۔ وہ دیکھو گاڑی رک گئی۔ اسٹیشن کی زندگی میں ایک جان سی آ گئی ہے۔ نہ جانے یہ دبکے ہوئے مسافر کہاں سے نکل آئے ہیں۔ اسٹیشن کی مدھم روشنیوں میں یہ متحرک سائے بالکل بھوت معلوم ہوتے ہیں (ایکایک چونک کر) مجھے ان مسافروں میں سکھو اور راگھو تو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ وہ دونوں تو لپک کر گھر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بھیکو۔ شاید وہ آج رائے پور کی طرف گئے ہیں۔ وہ گاڑی بھی اب آتی ہی ہوگی۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ ارے بیٹھو اور منو تو سو گئے۔

راجو۔ ہاں تو کیا جاگتے رہیں گے معصوم بچے! بیچارے سکڑ کر سو رہے ہیں۔ کتنی سردی ہے! تم ان کے نزدیک آگ کیوں نہیں جلا دیتے؟ بیچاروں کے اکڑے ہوئے جسم تو ڈھیلے پڑ جائیں گے۔

بھیکو۔ ہاں میں ابھی انجن کی راک میں سے کوئلا لاتا ہوں سوکھے ہوئے پتوں کا ڈھیر تو میں نے ایک طرف لگا ہی دیا ہے (ریل کی پٹڑی پر بھیکو کے چلنے کی آواز۔ آ ایک دم خاموش ہو گئی ہے۔ دور سہمے ہوئے کتے بھونکتے ہیں)

راجو۔ کس قدر سنسان ہو گیا ہے پھر! معلوم ہوتا ہے یہ کتے بھونکتے ہی چلے جائیں گے (دور سیٹی کی آواز) لو یہ گاڑی بھی چل دی۔ اب اسٹیشن بالکل ویران ہو جائے گا۔ دور سگنل کی سرخ روشنی ہمیں تاک رہی ہے۔ کتنی بھیانک ہے۔ اس کالے دیو کی انگارا جیسی آنکھ (طنزیہ ہنسی) کاش کہ یہ نزدیک ہوتی تو میں اس کی گرمی تو محسوس کر سکتا (کھانسی کا دورہ) اف! غضب کا جاڑا ہے۔ اور یہ کھانسی کا دورہ ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اس سردی میں بچی بیچاری کا کیا حال ہوگا۔

بھیکو۔ لو میں کوئلا تو لے آیا۔ یہ رہے سوکھے پتے اور یہ دیا سلائی۔ میں ذرا بچی کو دیکھ آؤں۔

راجو۔ ہاں ہاں ضرور۔ اور اس کے پاس آگ بھی جلا لانا آنا بے چاری ٹھٹر رہی ہوگی اس جاڑے میں۔

بھیکو۔ نہیں ایسی بات تو نہیں۔ اس کے قریب بل کا دروازا تو ایک طرف چنا ہوا ہی ہے۔ تم فکر نہ کرو میں تمام انتظام کر لوں گا (بھیکو کے جانے کے قدموں کی چاپ)

راجو۔ (کچھ دیر بعد) بھیکو! بھیکو! چلا گیا۔ خیر یہ کوئلے اور پتے ذرا قریب رکھ جاتا تو مجھے اتنی دقت نہ ہوتی۔ اب مجھے اپنی جگہ سے ہلنا ہی ہوگا۔ اوہ! (وہ ایک دم درد سے کراہ اٹھتا ہے) لو گھسٹتے گھسٹتے یہاں تک تو پہنچ گیا۔ ارے وہ دیا سلائی کہاں ہے؟ کمبخت کتنا اندھیرا ہے۔ اب سجائی پڑے تو خاک! لو مل گئی (دیا سلائی کے جلانے کی آواز پھر پھونکیں مارتا ہے) کتنا دھواں ہے! آنکھوں میں پانی بھی آ گیا۔ بیچاری پارو کی آنکھوں میں بھی تو پانی آجایا کرتا تھا اور میں اسے کس قدر چڑایا کرتا تھا (وہ کچھ دیر خاموش ہو جاتا ہے) دس سال ـــــ دس لمبے سال! جن کی گھڑی گھڑی میں نے گن کر گذاری ہے۔ کتنا دشوار ہو گیا ہے جینا! آخر ایسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے فائدہ! (بھیکو کے قدموں کی چاپ وہ نیند میں ہے اور جمائیاں لے رہا ہے)

بھیکو۔ اوہ! آگ جل گئی (آگ کے قریب بیٹھ کر ایک گہری سانس لیتا ہے) کتنی اچھی ہے اس کی گرمی! میرے ٹھٹرے ہوئے ہاتھوں میں جیسی جان سی پڑ گئی ہے۔

راجو۔ کہو بچی کا کیا حال ہے؟

بھیکو۔ بے چاری بہت تکلیف میں ہے۔ چیوان اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ میں اس کے قریب آگ جلا آیا ہوں۔ (چند لمحوں کے لیے خاموشی)

راجو ۔ دیکھا آگ جلتے ہی شو اور منو کے اکڑے ہوئے جسم ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ کتنی معصوم نیند سو رہے ہیں۔ دین دنیا سے بے خبر! کس قدر ساکن، بے جان، خاموش ہے ہماری زندگی۔ شاید پل کے اوپر سڑک پر دو کھمبوں کے درمیان بجھے ہوئے اندھیرے کی طرح۔ شاید یہ اندھیرا روشنی میں کبھی تبدیل نہ ہوگا۔ کبھی تبدیل نہ ہوگا۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں؟

بھیکو ۔ آج تم کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو (دور کہیں ریل کی نہایت مدھم سی سیٹی سنائی دیتی ہے)

راجو ۔ مجھ پر صرف سکھو کی ذمے داری ہے اور تم پر تین بلکے چار بچوں کی، میں کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم نے ان بھولی بھالی جانوں کو جنم دے کر دکھ، غریبی اور بھوک کے بھیانک غار میں ڈھکیل دیا ہے، جس میں میلوں تک کوئی روشنی دکھلائی نہیں دیتی، جہاں مکمل اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بھیکو ان کی تباہی کی ذمے داری ہم پر ہے۔ ہم نے جنم دے کر نرک میں ڈھکیلا ہے، لیکن بھیکو پھر بھی ہم ۔

بھیکو ۔ راجو ہماری بے رونق زندگی میں ہے ہی کیا۔ میں اس زندگی سے بھی خشی کے رس کی کی آخری بوند چوس لینا چاہتا ہوں۔ بلکل اسی طرح، جس طرح میرا جسم گذرتی ہوئی گاڑی کی بھاپ کی تمام گرمی چوس لینے پر مجبور رہے۔

راجو ۔ یہ خدغرضی ہے، انسان کتنا خدغرض واقع ہوا ہے۔

بھیکو ۔ (جمائی لیتے ہوئے) راجو اس دنیا میں کوئی جیو کسی دوسرے کو نہیں کھلاتا۔ ہر انسان اپنی اپنی قسمت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ سنسار تو قسمت کا چکر ہے۔

راجو ۔ قسمت! (طنزیہ ہنسی) بھیکو تم خدغرضی کو قسمت کہتے ہو؟

بھیکو ۔ راجو قسمت بڑی چیز ہے۔ اگر ان بچوں کی قسمت میں بھکاری بننا ہی لکھا ہے تو یہ بھکاری ہی رہیں گے، اور اگر ان کی قسمت میں راجا بننا لکھا ہوگا تو ہم تو کیا دنیا کی کوئی بھی طاقت انہیں ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی (ایک لمبی جمائی لیتا ہے)

راجو ۔ جب کبھی میں یہ سوچتا ہوں تو شو اور منو کے زرد سوکھے چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ بجھی کی بے نور تڑپتی آنکھیں جیسے اس زندگی کے متعلق فریاد کرتی ہیں۔ بھیکو یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آخر یوں سسک سسک کر جینے سے فائدہ؟ یہ زندگی کی توہین ہے! یہ زندگی کی توہین ہے۔ بھیکو! بھیکو! سو گئے۔ کتنی جلدی سو جاتا ہے (ایک لمبی سانس لیتا ہے) اب تو آگ بجھنے کو ہے۔ یہ آگ کتنی جلدی اتنے بڑے انبار کو نگل گئی ہے۔ اور یہ تمام چیتے بلکل ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔ صرف ان کی رنگت سیاہ ہو گئی ہے۔ مردا، بے جان جسم جن میں سے روحیں نکل کر شاید آسمان کی طرف پرواز کر گئی ہیں۔ بھکاری (وہ ایک تلخ ہنسی ہنستا ہے) کوئی آ رہا ہے شاید! (کتوں کے بھونکنے کی ڈراونی آوازیں اور پھر کوئی جیسے ریل کی پٹڑی پر آ رہا ہو) کون سکھو؟

راگھو ۔ نہیں چاچا ۔ میں ہوں ۔ راگھو ۔

راجو ۔ آ گئے۔ ارے تم تو اکیلے ہو؟ سکھو کہاں ہے؟

راگھو ۔ سکھو!

راجو ۔ کیا ہوا سکھو کو؟

راگھو ۔ سکھو ۔ (رونا ضبط کرتے ہوئے) وہ ۔ گاڑی ۔ کے ۔ نیچے ۔ آ گیا (راجو خاموش رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد راگھو پھر بولنے کی کوشش کرتا ہے) میرپور کے اسٹیشن پر بہت

بیٹھ رہی تھی، چاچا! میں نے سکھو سے کہا ہم دوسری طرف سے چڑھ جائیں تو بہتر ہوگا۔ سکھو اور میں انجن کی طرف لپکے تاکہ سامنے سے دوسری طرف چلے جائیں لیکن گاڑی نے سیٹی دی۔ ہم نے بھاگ کر گاڑی پر چڑھنا چاہا، لیکن لوگوں نے ہمیں دھکے دیے۔ میں تو گرتے گرتے بچا۔ سکھو نے مجھ سے کہا آؤ گاڑی کے نیچے سے ہو کر دوسری طرف چلیں۔ میں نے اسے روکا، لیکن وہ گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ ..... اور پھر میں اس وقت گاڑی چل دی۔ میں نے پکارا اور میں چلایا ..... تھوڑی دور جا کر گاڑی رک گئی۔ میں بھاگا ہوا وہاں گیا جہاں سکھو گاڑی کے نیچے گھسا تھا ..... وہاں ..... وہاں اف! میں نے سکھو کا جسم خون میں لت پت دیکھا۔ تمام جگہ سرخ ہو رہی تھی ــــ پل کے سہرے والے شیشوں کے تمبو دروں سے بھی لال ..... چاچا! ..... چاچا! بولتے کیوں نہیں ..... اب سکھو کبھی میرے ساتھ نہ جائے گا۔ سکھو بہت اچھا تھا وہ ہمیشہ مجھے توروں کی دکان سے ریوڑیاں لے دیا کرتا تھا۔ چاچا! تو مرنے کی ریوڑیاں بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔ خشو دادا تو کڑ کڑاتی ہوئی۔ میں تمہارے لیے بھی کسی دن لاؤں گا۔ میرے منھ میں تو اب بھی پانی بھر آیا ہے ..... چاچا! بولتے کیوں نہیں ایک بھیانک خاموشی جس میں کتے زور زور سے غراتے ہیں۔ ایک نوزائیدہ بچے کی چیخیں اور پھر ایکایک کوئی دوڑتا ہوا آتا ہے)

جیوان ــ بھیکو! راجو! ارے بھیکو! اٹھو تمہارے ہاں چاند سا بیٹا ہوا ہے۔

بھیکو ــ ہوں! ایں! (خفگی سے) بیٹا! بچی کا کیا حال ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔

(ایکایک ریل گاڑی شور مچاتے ہوئے گذر جاتی ہے) کس قدر خشگوار ہے اس بھاپ کی گرمی۔ کاش کہ میں اس کی تمام حرارت کو جذب کر سکتا۔ (عالم خواب میں بڑبڑاتا ہے) اچھا ہوا۔ اچھا ہوا۔ سکھو کو اس زندگی سے چھٹکارا مل گیا۔ کاش کہ میں بھی مر جاتا۔

(گاڑی کی آواز مدھم ہوتی چلی جاتی ہے فیڈ آؤٹ)

غزل

آلم مظفر نگری

لیے چہرے پہ زلفیں شانہ لالہ فام آئیگا
نہ صبح آئیگی پھر اور نہ وقت شام آئیگا

وہی لیکر متاع لذت بے نام آئیگا
جو دیوانہ کہ ان کی بزم سے ناکام آئیگا

مدد کو کون وقت گردش ایام آئیگا
جو کام آیا بھی تو کچھ یہ دل ناکام آئیگا

یہ کیوں مخمور خاموشوں میں آغوش خرابات میں
کبھی نہ یہ سر شکستہ غم بہت کچھ کہلا آئیگا

بدل دیگا جو دم بھر میں نظام بادہ آشامی
کوئی ایسا بھی ساقی تشنہ کام جام آئیگا

گلستان میکدہ بنجائیگا کب کی بہاروں میں
سر شاخ چمن ہر پھول بنکر جام آئیگا

محبت میں نبھانا ہو تو ایسا عزم بے معنی
یہ سمجھی جائے عشق پہ الزام آئیگا

عبث آشنا ہو لیں راز سے اے چرخ تو لاکھ
مجھے آرام آیا بھی تو زیر دام آئیگا

نہیں امیدوار آگے بڑھے یہ دور ساقی
جو آیا بھی تو مجھ تک دور دور جام آئیگا

یہ آواز آرہی ہے اے مسافر حد منزل سے
سر منزل نہ کوئی طالب آرام آئیگا

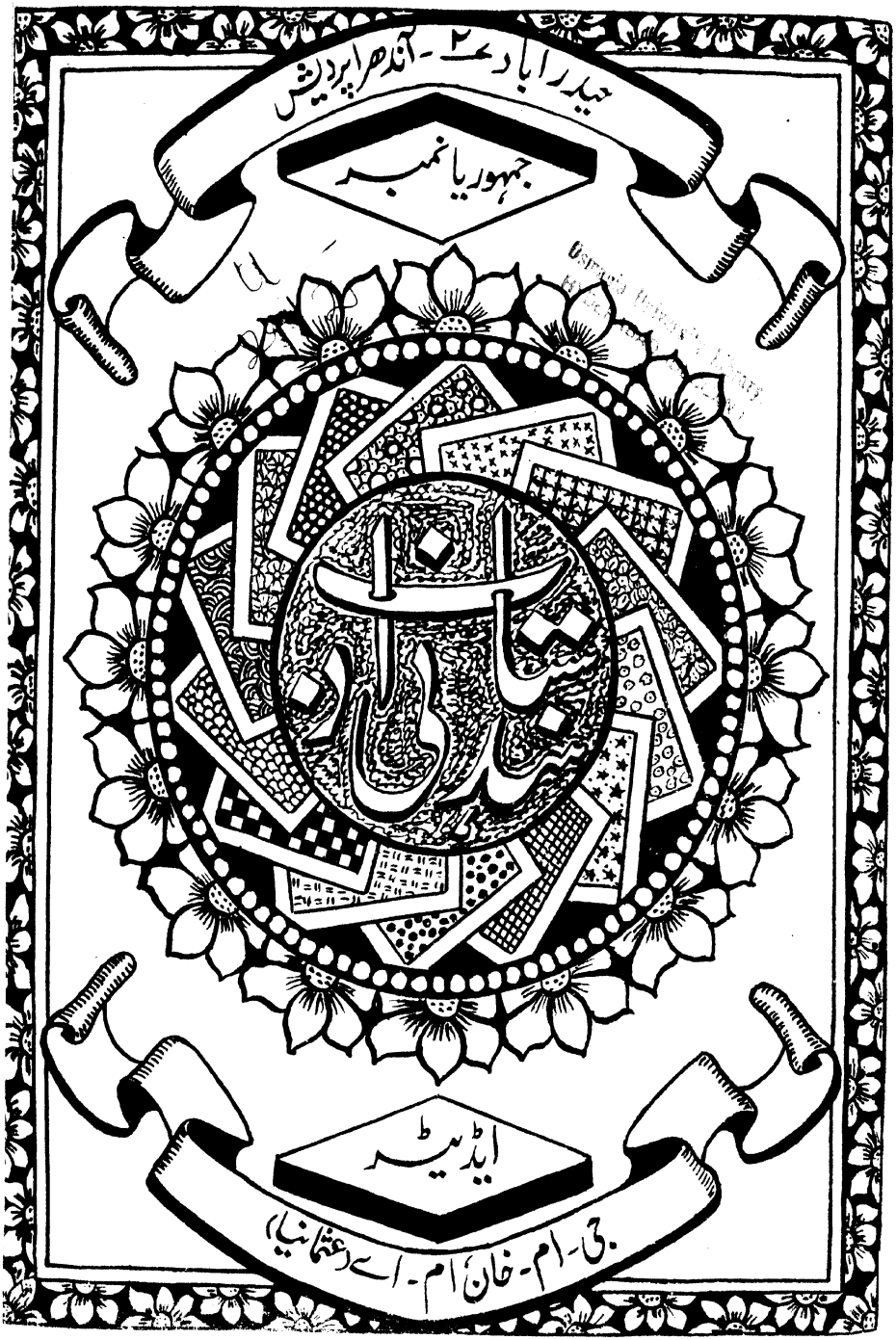
کبھی جس نے کلمہ وقت امن کو نوازا تھا
وہی جلوہ کسی دن پھر لب پر بام آئیگا

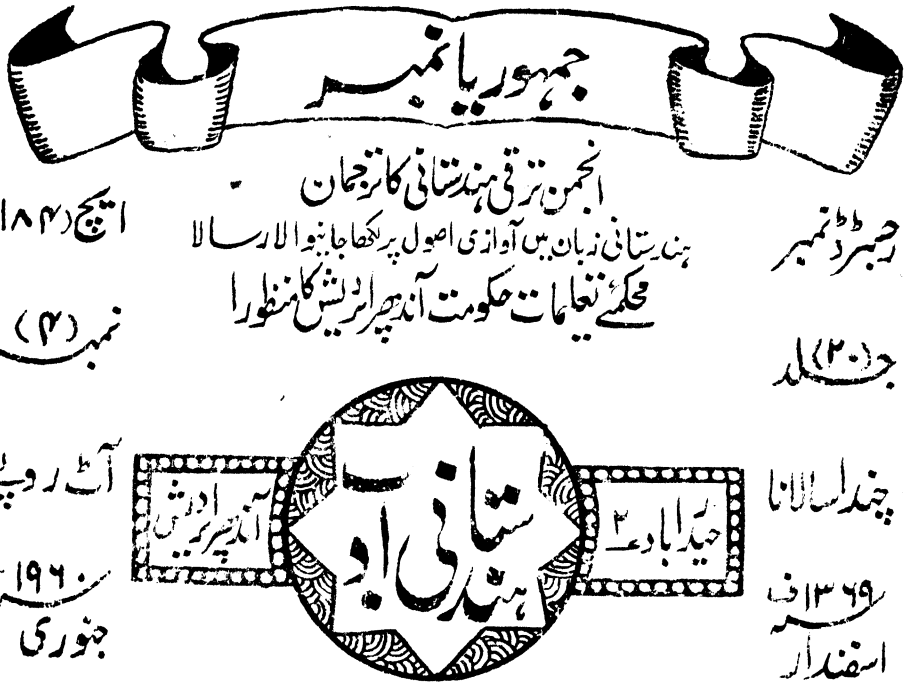
سنبھلکر زندگی کی منزلوں کو قدم غافل
تجھے لگے ہر اک آغاز کا انجام آئیگا

ہے چمکی گر گئی پر دانہ آب و دانہ کی خاطر
وہی مرغ چمن صیاد زیر دام آئیگا

وہی ساقی وہی دور و دختر رز ہوگی تخلیقت میں
اگر ہے گوش آواز دختر غم کا ہر زرہ
تو خاموش ہستی پر جلی ن کا نام آئیگا

جی۔ ام۔ خاں نے مطبع ابراہیمیہ، کنگ منڈی حیدرآباد سے میں چھپوا یا۔


حیدرآباد ۲ - آندھرا پردیش
جمہوریا نمبر
۱۰
ایڈیٹر
جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)



نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریے کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳	
۲	حقایق و معارف	[illegible]	۴	
۳	[illegible]	[illegible]	۵	پرتاب
۴	ہندوستان آزاد ہے	جناب مظفر نگری	۵	"
۵	عزم	طالب پانی پتی	۶	"
۶	زندہ باد اے انقلاب	ساجد مظفر نگری	۶	"
۷	یک رنگ	اختر واصفی	۷	جد و جہد
۸	آزادی کے بعد	ح۔ ب۔ بیگم ہدایت اللہ خان	۸	
۹	شوق آزادی	جگناتھ آزاد	۹	پیام مشرق
۱۰		بیخود وارثی (ملیگ)	۱۰	

۱۰۔ نوروز ہند	تلوک چند محروم بی۔ اے	۱۱	طالب
۱۱۔ ترانۂ جمہور	مضطر مراد آبادی	۱۱	〃
۱۲۔ جھیل ڈل کے کنارے چاندنی رات کا منظر	خضر مغربی	۱۲	روشنی
۱۳۔ جنون و حکمت	بلبو رام جوش ملسیانی	۱۳	شاعر
۱۴۔ اپیل	واہی	۱۴	〃
۱۵۔ غزل	شاد عارفی	۱۵	آہنگ
۱۶۔ جمہوریت کے تحفے	مجاز ۔ وجد ۔ شاہد صدیقی	۱۶	سیاست
۱۷۔ حافظ میری نظر میں	رضیہ بیگم	۱۷	صبا
۱۸۔ غزل	ارتضیٰ عزمی	۲۶	قومی زبان
۱۹۔ نظام کائنات	اکبر حسین	۲۷	جد و جہد
۲۰۔ زبان حروف تہجی اور رسم خط	ہمایوں کبیر	۳۱	
۲۱۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار	بیگم انیس قدوائی	۳۳	شعلہ و شبنم
۲۲۔ غزل	سعادت نظیر	۳۶	سب رس
۲۳۔ ہم سفر	رام لعل	۳۷	خیال
۲۴۔ غذا (خوراک)	منظور الحق ہاشمی بی۔ اے	۴۰	رہنمائے تعلیم
۲۵۔ زندان کی ایک رات	احمد ندیم قاسمی	۴۳	افکار
۲۶۔ سوویت یونین میں گورکی کے خواب کی تعبیر	تروون چیٹرجی	۴۴	سوویت عورت
۲۷۔ تم جہاں یاد آئے	نیلوفر ناہید	۴۵	خاتون مشرق
۲۸۔ بنگلا زبان	الطاف گوہر	۴۷	ماہ نو
۲۹۔ شاعری میں شاگردی استادی	ڈاکٹر منوہر سہائے اوور پی ایچ۔ ڈی اے	۵۲	پگڈنڈی
۳۰۔ رشتا	بلونت سنگھ	۵۶	چمنستان
۳۱۔ نعرۂ امن	گرآہ ہشیار پوری	۶۳	پیام انقلاب

(نوٹ۔ پرچہ کی تاخیر کی وجہ سے صفحہ ۱ سے ۱۰ تک نمبر کے جاری کرنے میں کافی دیر ہو گئی جس کا ادارے

ہمارے خیالات

"جشن جمہوریا" کی روشنی میں

۱۵ اگست کی طرح ۲۶ جنوری بھی اہم تاریخ ہے، اور یہ دونوں تاریخیں "ہندستان کی تاریخ" یا اتہاس میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۵ اگست کو ہندستان نے صدیوں کی غلامی کے آزادی حاصل کی تھی اور ۲۶ جنوری کو ہمارا دیس "جمہوریت" کے مرتبے کو پہنچا، اس لیے ان دونوں تاریخوں میں ہم جتنی بھی خوشیاں منائیں کم ہے۔

اسی خوشی کے ثبوت میں "ہندستانی ادب" ۱۵ اگست کو پہلی بار اپنا "آزادی نمبر" پیش کیا تھا، اور اب ایک ایسی ہی مسرت کے اظہار کے طور پر "جمہوریا نمبر" پیش کر رہا ہے۔ "آزادی نمبر" ہر طرح سے کامیاب رہا تھا اور اس "جمہوریا نمبر" کو بھی ہر طرح سے کامیاب کہتے ہیں ہاک نہیں ہوتا، اس لیے کہ حقیقت کا اظہار خدستائی نہیں ہے۔ بہرحال "جشن جمہوریا" کو بھی ہر طرح سے کامیاب کہتے ہیں ہاک نہیں ہوتا، اس لیے کہ حقیقت کا اظہار خدستائی نہیں ہے۔ بہرحال "جشن جمہوریا" کا یہ خاص نمبر آپ کی سیوا میں پیش ہے، اگر قبول ہو تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی!

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ حجم یا صفحات کی تعداد کا لحاظ کرتے "ہندستانی ادب" کا یہ خاص نمبر کچھ زیادہ اہم نہیں مگر نظم اور نثر کے مضامین کا انتخاب خاص اہمیت ضرور رکھتا ہے، اس لیے آپ سے ہماری عرض ہے کہ اس رسالے کو ردی کی ترازو میں نہ تولیے، بلکہ میزان معیار پر کسنے کی کوشش کیجیے!

آپ خود بھی، غالباً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ علمی ادبی رسالوں کا حال پتلا ہے، اس لیے انہیں قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے، اگر وہ زیادہ اجم کی جرات دکھائیں تو معاشی نقطۂ نظر سے بری طرح سے موت کی [illegible] نظر سے اتنی ہی زیادہ ترقی کرے گا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں [illegible]

کھانی پڑے گی۔ ان رسالوں کی بدبختی یہ ہے کہ انہیں کاغذ کا کوٹا نہیں دیا جاتا۔ جو رسالے چھوٹے موٹے بڑا تعداد بنیادی یا چارٹرڈ اکونٹنٹس کے غلط سلط سرٹیفکٹ پیش کرتے ہیں، انہیں ضرور کوٹا دیا جاتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ حکومت غلط ہی جھوٹ بولنا سکھاتی ہے، اور جو رسالے جھوٹ سے کام نہیں لیتے، ان پر حکومت کا کوٹائی "عتاب نازل ہوتا ہے، چنانچہ حکومت کے ان معتوبین میں سے "ہندستانی ادب" بھی ایک شکار ہے۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت کے اس طرز عمل کو ہم صحی میں جمہوریت کہیں یا غیر جمہوریت مگر جب سارے دیس میں "جمہوریت" کا نعرہ بلند ہے، تو پھر ہم کیسے اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن ہم حکومت کے کرتا دھرتاؤں سے انصاف کے طالب ہیں۔ نا انصافی کی ہماری مشکلات نا واجبی نہیں، اس لیے جمہوریت کے نام پر ہم اپنے "حکومتی نیتاؤں سے انصاف کا کوٹا مانگتے ہیں۔ ہمیں آشا ہے کہ وہ ہمارے ان وچاروں پر ضرور دھیان دیں گے اور ہر حقدار کو اس کا حق ضرور پہنچائیں گے۔

حکومت کی ان کمزوریوں اور نا انصافیوں کے باوجود "ہم جشن جمہوریا" میں برابر کے شریک ہیں، اور سارے دیس کو اس شبھ یا اچھے موقع پر آشیرباد یا مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ ہندستان ہر حال اسی طرح سے "جشن جمہوریا" مناتا رہے، اور ہر میدان میں ترقی کی منزلیں طے کرتا جائے۔ خصوصاً تعلیمی ترقی اس ملک کی بے مثال ہو۔ گو مبالغہ ضرور ہوگا، مگر ہم دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دیس کی تعلیمی ترقی واقعی سو فیصد ہو۔ کسی ملک کی ہر جہتی ترقی کا راز صرف تعلیمی ترقی ہی میں چھپا ہوا ہے۔ جس ملک میں جتنے زیادہ تعلیم یافتا ہوں گے وہ ملک معاشی، سماجی اور سائنس [illegible]

لسان الحقیقت

افقر موہانی

یہ پرکیف منظر یہ دلکش نظارے
ہیں واللہ ممنون احسان تمہارے
تمہیں دیکھکر کیوں نہ دنیا پکارے
نگاہوں کے مرکز دلوں کے سہارے
وہی کام آئیں گے اک دن تمہارے
وہ جو ہیں تمہاری محبت کے مارے
رہے عمر بھر ہم تمہارے سہارے
مگر تم نہ کچھ کام آئے ہمارے

اگر جان جاتی ہے الفت میں جائے
یہ شرط وفا ہے کہ ہمت نہ ہارے
وہ ہو جائے پھر محرم راز الفت
سمجھ لے جو کوئی تمہارے اشارے
تجھے پھونک دیں گی فلک سیری آہیں
اگر اور اونچے ہوئے کچھ ستارے
ارے میرے قاتل سنبھلنا سنبھلنا
ہوئے مر چکے ختم دنیا کے سارے
تجھے کیا خبر ان کی او سونے والے
شب غم کٹی جن کی گن گن کے تارے
یہی بس محبت کا حاصل ہے افقر
رہے دل کے دل ہی میں ارمان سارے

حسرت موہانی

۲۶ چھبیس جنوری

چراغ چیوٹی

آج سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا
نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلے گی تصویر
آج سے ریت پر اماوس پر وا نہ ہوا
آج سے اوج پہ پہنچے گی وطن کی تقدیر

یہ ہے اس خواب کی تعبیر کہ جس کی خاطر
کتنے سرمست جوانوں نے جوانی دیدی
یہ ہے بھارت کی وہ تصویر کہ جس کی خاطر
کتنی ماتاؤں نے آنکھوں کی نشانی دیدی

اسی آزادی کی خاطر مسلسل برسوں
سر پہ معصوم رعایا کے قضا کھیلی تھی
سب نے برداشت کیے غیر کے چھل بل برسوں
تازہ خونوں سے جہنم کی ہوا کھیلی تھی

آج ہر چیز کو احساس ہے آزادی کا
آج سورج بھی نئے رنگ کی کرنیں لایا

ہندوستان آزاد ہے — بیتاب — مظفر نگری

آج ہم آزاد ہیں ہندوستاں آزاد ہے
بلبلیں آزاد ہیں اور باغباں آزاد ہے

زندہ باد اے انقلاب بزم عالم زندہ باد
آفتاب قسمت ہندوستاں تابندہ باد

ہر کلی آزاد ہے، ہر گل، شجر آزاد ہے
ہر روش آزاد ہے، ہر رہ گذر آزاد ہے

زندہ باد اے انقلاب بزم عالم زندہ باد
آفتاب قسمت ہندوستاں تابندہ باد

اپنا دل آزاد ہے، اپنی زباں آزاد ہے
راستے آزاد ہیں، عزم جواں آزاد ہے

زندہ باد اے انقلاب بزم عالم زندہ باد
آفتاب قسمت ہندوستاں تابندہ باد

یاسمن آزاد ہے اور نسترن آزاد ہے
گلاب آزاد ہے، لالہ سخن آزاد ہے

زندہ باد اے انقلاب بزم عالم زندہ باد
آفتاب قسمت ہندوستاں تابندہ باد

ہر فقیہ آزاد ہے ہر نوجوان آزاد ہے
ہر جبین آزاد ہے ہر آستان آزاد ہے

ہر دلی آزاد ہے، ہر ذہنیت، ہر آزاد ہے
آج ہے آزاد ہر دل ہر نظر آزاد ہے

راہبر آزاد ہے اور کارواں آزاد ہے
آج ہے ناقوس آزاد اور اذاں آزاد ہے

ہر گل آزاد ہے اپنا چمن آزاد ہے
فخر ہے بیتاب دنیا میں وطن آزاد ہے

عزم

طالب

جو روح سوئی ہے اسے جگانا ہے
درست علم و عمل کا نظام کرنا ہے
بہار نام ہے جس کا یہ بہار نہیں

پانی پتی

وطن کی مہر و محبت کے گیت گانا ہے
جو نا تمام ہے قصہ تمام کرنا ہے
وہ پھول کون ہے آخر جو داغدار نہیں

ہیں درست گل و خار کی یہ ناچاقی
ابھی چمن میں ہے تکمیل رنگ و بو باقی

زندہ باد اے انقلاب

سبط احمد

روح گاندھی شادماں، روح جواہر شادماں
جشن آزادی میں ہیں مصروف سب پیر و جواں
زندہ باد، زندہ باد اے انقلاب روزگار
مرحبا صد مرحبا اے گردش لیل و نہار

مظفر نگری

پرچم جمہوریت لے کر کھڑا ہے باغباں
آ گئی اپنے چمن میں اک بہار بے خزاں

اپنا بھی آزاد ہے اور غیر بھی آزاد ہے
ہر منٹ آزاد ہے اور ہر گھڑی آزاد ہے
زندہ باد، زندہ باد اے انقلاب روزگار
مرحبا صد مرحبا اے گردش لیل و نہار

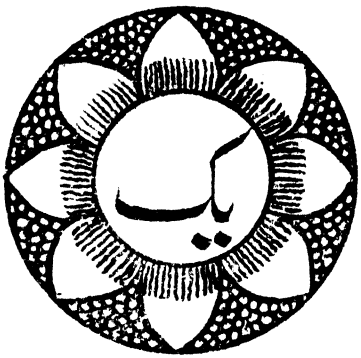
برہمن آزاد ہے اور مولوی آزاد ہے
آج اپنے ملک کی ہر چیز ہی آزاد ہے

اب چمن کی جو فضا ہے وہ معطر کیف بار
ہو گیا اپنے چمن پر آج اپنا اختیار
زندہ باد، زندہ باد اے انقلاب روزگار
مرحبا صد مرحبا اے گردش لیل و نہار

ہر کلی پر، پھول پر آئی ہے اک تازہ بہار
چھا گیا سارے زمانہ میں ہمارا اقتدار

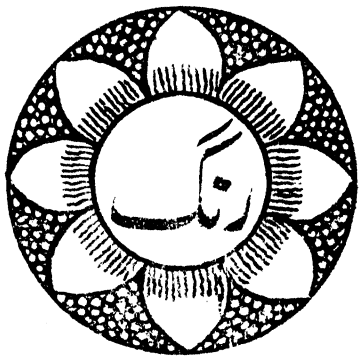
کوہ بھی آزاد ہے، آزاد ہیں گنگ و جمن
آج ساجد ہم ہیں اور ہے منعقد بزم سخن
زندہ باد، زندہ باد اے انقلاب روزگار
مرحبا صد مرحبا اے گردش لیل و نہار

اب مذاق چاہ ہی ہے اک خوشی کی انجمن
غیر کیا معلوم تھے آزاد ہیں اہل وطن



بدلا ہوا نظام جہاں دیکھتا ہوں میں
یہ کیا ہے دن کو شب کا سماں دیکھتا ہوں میں
مردوں کی شکل عورتوں نے کی ہے اختیار
اور مرد سب بروے زناں دیکھتا ہوں میں
تزئین بزم عیش ہے حور حرم سرا
تھی کس جگہ کی چیز کہاں دیکھتا ہوں میں
دشمن ہے باپ بیٹے کا، بیٹی سے ماں کو بیر
انساں میں حیف خوئے سگاں دیکھتا ہوں میں
بھائی کا اپنے بھائی نے کاٹا ہے اف گلا
الفت کا کٹ چکا ہے نشاں دیکھتا ہوں میں
وہ آ رہا ہے دوست سے ملنے کو ایک دوست
خنجر در آستیں نہاں دیکھتا ہوں میں
میدان ہے گرم دہر میں جنگ و جدال کا
اک حشر سا بپا ہے جہاں دیکھتا ہوں میں
ایسی لگی ہے غم من امن واماں میں آگ
ہر گھر سے اٹھ رہا ہے دھواں دیکھتا ہوں میں
رہتے تھے جن کے چونٹ تبسم سے آشنا
کیوں آج ان کو محو فغاں دیکھتا ہوں میں
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا تھا جن کا کام
گنگ ہو گئی ہے ان کی زباں دیکھتا ہوں میں
اخترؔ رواں ہے جانب کعبہ صنم پرست
مسلم کو سوے دیر رواں دیکھتا ہوں میں





کیا شور زمانے میں بپا دیکھ رہی ہوں
آفاق کو فتنے سے بھرا دیکھ رہی ہوں
سنتا ہوا میں نام وفا دیکھ رہی ہوں
بڑھتا ہوا میں سیل بلا دیکھ رہی ہوں
صدیف گئے بھائی کے ہاتھوں یہاں میں
کٹتا ہوا میدان کا نکلا دیکھ رہی ہوں
بیگانے تو بادل کی طرح چھائے دلوں پر
دل اپنوں کا اپنوں سے جدا دیکھ رہی ہوں
شیرازۂ امت کو بکھیرا علماء
میں نقشہ قرآن میں پڑا دیکھ رہی ہوں
واعظ کہ بلا دیتے ہیں آپس کے دل کو
دل ان کا کدورت سے بھرا دیکھ رہی ہوں
میں آج ہر اک مفلس نادار کے دل پر
بے حرج جما رعب غنا دیکھ رہی ہوں
ہر صاحب ثروت پہ ہے فرعون کا دھوکا
ہر اس کو رعونت سے بھرا دیکھ رہی ہوں
اس دور میں صفحہ پر ہے ملائک کو بھی افسوس
ہر روز کا بھی دل اس سے جلا دیکھ رہی ہوں
ہاں مشعل توحید اٹھا راہ راست دکھا دے
میں سوئے در رب ملا دیکھ رہی ہوں



جگن ناتھ آزاد

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی جھڑانے والے
ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے

جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے

نو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
نو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

آج بھی دل میں ہیں بیتاب تکلم نالے
اور سینے میں دل زار طپاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
حسن کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ انکار پہ پردے ہیں محیط
مسئلِ طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینہ میں نہاں آج بھی ہے

یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے

رنگِ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سو نگراں آج بھی ہے

آج بھی شورِ فضا میں ہے وہی محنت کا
گوشِ سرمایہ پہ یہ شورِ گراں آج بھی ہے

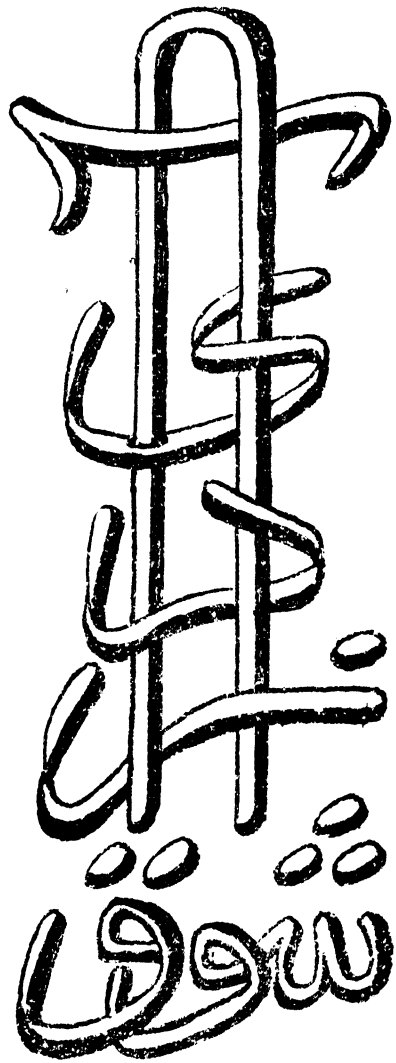
نصب یا نات میں بت اب بھی ہیں انگریزوں کے
اور شہنشاہ کا سکوں پہ نشاں آج بھی ہے

آج بھی معنتِ نظر ہے وہی سینوں کا عناد
بند اخلاص و محبت کی دکاں آج بھی ہے

دین و دنیا میں یہاں ربط باہم ہے کہ نہیں
سوچ میں ڈوبا ہوا مجمعِ دیدہ وراں آج بھی ہے

اس نئے عصر میں انصاف کی اے جنس لطیف
صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ہے

کون اس دور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز
نطق پر دشنۂ احکامِ رواں آج بھی ہے



بینوا وارثی (علیگ)

کیا کہوں دنیا بڑی نا آشنائے راز ہے
ورنہ ہر پردے میں تو ہے اور تیری آواز ہے

ٹوٹنے پر بھی نہیں خاموش دل کا ساز ہے
لے وہی اس کی، وہی نغمہ، وہی آواز ہے

وہ جہاں، یا جس جگہ موجود، جاں نواز ہے
ہاں وہیں اپنی جبین شوق سجدہ ساز ہے

ناصح ناداں سمجھ یہ انتہا کا راز ہے
اس جہان عشق میں انجام ہی آغاز ہے

مجھ کو اپنے ان شکستہ بازوؤں پر ناز ہے
جن کی ہر جنبش سے لرزاں عالم پرواز ہے

سر جھکا دینے کے قابل خاک کوئے ناز ہے
جس طرف دیکھو جبین شوق سجدہ ساز ہے

بیخودی شوق نے کھولے ہیں اسرار حیات
عقل کی مستی میں پنہاں ہوش کا اعجاز ہے

اے نگہبان قفس اپنے قفس سے ہوشیار
شوق آزادی میرا بھی بال و پر انداز ہے

بلبل بیکار ہے گر بال و پری والا نہ ہو
سوز دل جس کو نہ ہو، وہ دل نہیں وہ ساز ہے

اپنے دیوانے کی باتیں سن کے فرماتے ہیں وہ
اس تیری دیوانگی میں ہوش کا انداز ہے

ہم سے تو کیا پوچھتی ہے صبح کی ٹھنڈی ہوا
بند کلیوں میں چمن کی زندگی کا راز ہے

ان مجازی صورتوں کو دیکھ لیتا ہوں، مگر
میری آنکھوں میں خدائے حسن جلوہ ساز ہے

نغمہ ہائے زندگی ہیں منحصر ایک تار پر
نزع کی ہچکی شکست ساز کی آواز ہے

ڈھونڈنے ہو تم خلوص دل، خلوص دل کہاں
یہ بھی اک تہذیب بیجوڑ زمانہ ساز ہے

نوروز

تلوک چند محروم بی اے

گل بہ داماں ہے چمن زار نظام نو کا
کشور ہند کا فیروز ہے ہر روز سعید

آنکھیں پرنور ہیں دل اہل وطن کے مسرور
کہ ہوئی صبح وطن مطلع انوار امید

جس نے نعمت ہمیں بخشی ہے یہ آزادی کی
اس کے الطاف کریمانہ کب ہے بعید

کہ براہ راست پہ لے آئے وہ گمراہوں کو
ہیں جو بالطبع ابھی پیر کلیسا کے مرید

فرقہ واری پہ ہیں دل آج بھی جن کے مائل
یا جو کرتے ہیں تشدد کے عمل کی تائید

میکشوں کو وہ بنی جام رکھے گا کب تک
جس نے دی ہے در میخانۂ عشرت کی کلید

نئی تقدیر کا سانچہ ہو ترا ہر ذرہ
ہو مبارک تجھے اے خاک وطن دور جدید

آرزوان کی بر آئی پس مردن افسوس
آرزو پہ جو تیری ہو گئے مردانہ شہید

دل پر شوق ہوا فال کہا جو تو نے
گوش مشتاق میں آئی یہ فرح بخش نوید

فللہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میجوید
آمد آمد ز سر ما بہ دہ امید بدید



یہ جھومتی ہوئی سحر یہ ناچتی ہوئی کرن
یہ نوربار انجمن یہ شان و شوکت وطن
چہار سو ہے جلوہ گر حیات نو کی روشنی
فضا کی موج موج سے ابھر رہی ہے زندگی
ابھر رہی ہے زندگی نکھر رہی ہے زندگی
نیا یہ رنگ روپ ہے سنور رہی ہے زندگی
جہان دل نثار ہے متاع جاں نثار ہے
روش روش ہے گلستاں چمن چمن بہار ہے
خرام قدم وہ بڑھ رہا ہے زندگی کا کارواں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہر ایک [illegible] ہے روشنی ہر آنکھ میں سرور ہے
بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں رواں دواں
وہ سر جھکائے سامنے کھڑی ہیں کامرانیاں

خضرا — جھیل ڈل کے کنارے چاندنی رات کا منظر! — مغربی

چاروں طرف ہے خامشی سحر نہاں ہے آشکار
ڈل کا کنار و جوے بار چاندنی اور سبزہ زار

منظر دل ربا کو دیکھ، چاندنی کی ادا کو دیکھ
عشق یہاں ہے نعرہ زن، عقل یہاں پہ شرمسار

قلب و نظر کی زندگی، چاندنی رات اور ڈل
دیدۂ و دل کی تازگی شام نشاط و شالامار

خامشی اور سکون شب، ڈل ہے اور محفل طرب
اس پہ یہ چاندنی غضب، دل کو کہاں رہے قرار

آہ یہ فضائے دلکشا، باغ بہشت کی ہوا
عشق ہو اور ہو ادا، دل ہو اور ہو کنار یار

ڈل پہ مہ تمام سے کیا ہی عجب یہ رات ہے
مست مئے مدام ہیں، باغ نسیم کے چنار

سرمہ گوں ڈال اور پات، سرمہ گوں رنگ شش جہات
سرمہ گوں ساری کائنات، سرمہ گوں ڈل و کوہسار

بحر نیلوفری میں ہے کشتیٔ مہ سبک خرام
جھیل کے خار زار میں علم کے نور کا سوار

شیشۂ ڈل پہ عکس مہ بیقرار اور مضطرب
جیسے شب فراق میں دل عاشق در انتظار

پیر و سفید اور چنار اس شب ماہتاب میں
زلف سنبل پہ چھا گیا، جیسے ہو گرد و غبار

چاند کی روشنی ہے نور ستاروں کا ماند
خوبرویوں کی بزم میں جیسے ہے جھرمٹ نگار

رو پہلی بدلیوں میں وہ چاند کا لینا ڈھلکیاں
ایسا ہے جیسے روے یار ڈالے نقاب بار بار

ساقیٔ شب کے ہاتھ میں چاند کا جام رنگیں
پی کے مئے طہور کو چھا گیا چار سو خمار

ڈل کی فضاے ہوش زا، درد دل کیلیے دوا
زخم جگر کا چارہ گر، چاندنی رات کی بہار

ایسی فضاے دلفزا ایسا سہان جاں نواز
اور کیا چاہتا ہے پھر میرا دل جنوں شعار

قافلۂ حیات کا کوس رحیل چاند ہے
خضر امید و بیم کے ہاتھ میں اس کی ہے مہار

رباعیات

جوش ملیح آبادی

حکمت و جنون کے

ہر حال میں نیک و بد کی پہچان رہے
انسان بڑا بن کے بھی انسان رہے
دانا ہی سے یہ امید ہو سکتی ہے
نادان کو الٹ بھی تو نادان رہے

دنیا اک روز چھوڑنی پڑتی ہے
میدان سے باگ موڑنی پڑتی ہے
مرنا بھی کچھ آسان نہیں ہے اے جوشؔ
اس کے لئے جان توڑنی پڑتی ہے

اخلاص و محبت کا پرستار بھی ہو
اشفاق و مروت کا خریدار بھی ہو
لیکن ہے اگر رحمت باری کی طلب
اس کے لئے تھوڑا سا گنہگار بھی ہو

دانا ہے وہ جس نے غم کا چارہ جانا
ہمت نے کیا تھا جو اشارہ جانا
حیف اس پہ کہ جس نے اپنی نادانی سے
مرنے ہی کو جینے کا سہارا جانا

ساغر کے لئے شور مچانا بھی جنوں
پینا بھی جنوں اور پلانا بھی جنوں
کہتے ہیں کہ مئے سے غم غلط ہوتا ہے
یہ سچ ہے تو پھر ہوش میں آنا بھی جنوں

تھوڑا سا بھی نمک آرزو سب کچھ ہے
تھوڑی سی بھی دل کی تشنگی سب کچھ ہے
اے بود کو نابود سمجھنے والے
گو کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی تو سب کچھ ہے

ریپل طنز و مزاح واہی

امیدوار تھا واہی بھی مہری کے لیے
کہ "شارٹ کٹ" ہے یہی اک تونگری کے لیے

مگر بہ فیض حریفاں اسے ٹکٹ نہ ملا
پھنسا جو کہر سیاست میں "شارٹ کٹ" نہ ملا

"اپیل بورڈ" میں پہنچا تو یوں شکایت کی
حضور! کی نہ گئی قدر میری خدمت کی

یہ خودستائی نہیں، بلکہ ہے حقیقت حال
کسی حریف سے کمتر نہیں مرے اعمال

وہ سارے گن جو ہیں معیار لیڈری کے لیے
وہ سارے وصف جو لازم ہیں رہبری کے لیے

ہیں اس غلام کی فطرت میں اس طرح موجود
کہ جیسے دودھ میں چینی ہو اور تار میں پود

عوام دشمنی پیشہ رہا ہے مدت سے
تمام عمر لڑا ہوں حق و صداقت سے

مری گرفت میں رہتے ہیں سادہ لوح عوام
میں ان کے نام کو کرتا ہوں رات دن نیلام

زبان تیز سے تقریر گرم کرتا ہوں
اور اس کی آنچ سے لوہے کو نرم کرتا ہوں

کبھی جو خدمت قومی کا بار لیتا ہوں
تو مفلسوں کی لنگوٹی اتار لیتا ہوں

مری سرشت میں داخل ہے چور بازاری
سری بہشت ہے بازار حرص و مکاری

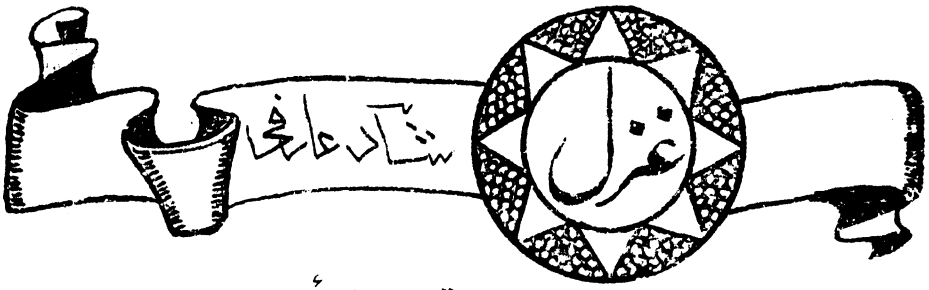
خدا کے فضل سے راشن کا روزگار بھی ہے
بسیں بھی چلتی ہیں خادم کے پاس کار بھی ہے

سانچ خور بھی ہوں، اور سود خوار بھی ہوں
خدا پرست بھی ہوں اور خدا کی مار بھی ہوں

میں چور بھی ہوں اور ڈکیتوں کا سرغنہ بھی ہوں
میں رہزنوں کا معلم بھی، رہنما بھی ہوں

بڑی صفائی سے کر کے ذخیرہ اندوزی
اکال میں بھی مناتا ہوں جشن فیروزی

غرضکہ منبع اوصاف ہے یہ خادم قوم
خدا کے واسطے بولیں نہ اس کو ناظم قوم



جو چاہتے ہیں، ہمیں بیقرار فرمائیں
کہیں وہ خود نہ ستارے شمار فرمائیں

ہمیں جو آپ، شریک بہار فرمائیں　　تو ہم خزاں بھی نہیں، اعتبار فرمائیں
وہ عہد لطف و کرم بار بار فرمائیں　　ہمیں یقین نہ ہوگا، ہزار فرمائیں
وہ انکسار کہ ہے جس سے آپ کو نفرت　　عجیب شئے ہے، اگر اختیار فرمائیں
جو ناچتے ہیں ابھی، آپ کے اشاروں پر　　انہیں بھی آپ غنیمت شمار فرمائیں
ہے اعتراض، ہمارے قیاس پر جن کو　　وہ لوگ صبر کریں، انتظار فرمائیں
وہی چمن کی تباہی پہ بات پہنچے گی　　ہمیں گنیں — کہ نشیمن شمار فرمائیں
چبا چبا کے، جو کہنے چلے ہیں ہم سے　　مزہ تو جب ہے کہ بے اختیار فرمائیں
بجائے اس کے ہمیں آپ کچھ سہارا دیں　　"حضور! اپنے قدم استوار فرمائیں"
یہ فیصلہ جو ہمارے خلاف فرمایا　　خلاف گردش لیل و نہار فرمائیں
تو چاہیے اس کی خباثت پہ مہر فرما دی　　جسے وہ اپنا اطاعت شعار فرمائیں
روش یہی ہے تو اصلاح کار کیا ہوگی　　وہی غلط ہیں جو اصلاح کار فرمائیں
غزل کی جان ہیں، اب تک وہ کافران ادا　　"جو مسکرا کے خزاں کو بہار فرمائیں"

جناب شادؔ یہ چربے اتارنے والے
"ہماری طرح مقامیں شکار فرمائیں"

وجد

مردہ دلوں میں دوڑ گیا خونِ زندگی
چہروں پہ حریت کی شفق جلوہ گر ہے آج
پردے اٹھے ہوئے ہیں حریمِ جمال کے
جلوہ بقدرِ وسعتِ ذوقِ نظر ہے آج
اڑتی ہیں گرد راہ کے مانندِ مشعلیں
بیباک رقصِ عمرِ جو گرمِ سفر ہے آج
اک دلنواز خوابِ حقیقت میں ڈھل گیا
نخلِ امیدِ اہلِ نظر بارور ہے آج

بجنسہٖ

ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن
یہ کام کر گئے آخر بلا کشانِ وطن
ابھی تو خیر سے وہ چند ہو گی شانِ وطن
ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن
کہ یہ بہار پیامی صد بہاراں ہے

"شعلۂ نظر"

الگ رہے ہے جن کی زندگی تو ابیدہ رہتی ہے
وہ ذرے جمع ہو کر وسعتِ صحرا بڑھاتے ہیں
تسلسل بخشتا ہے جنہیں انداز گویائی
وہ سناٹے بھیانک شور شوں کا سر جھکاتے ہیں
ضیائے ماہ کی حاجت نہیں رہتی اندھیروں کو
جہاں شعلے ستارے ساتھ مل کر جگمگاتے ہیں
پرو دیتا ہے اک رشتے میں جن کو رخ ہواؤں کا
وہی قطرے کسی دن زورِ طغیانی دکھاتے ہیں
تصور کا قلم اٹھتا ہے جب پیغامِ جاں لے کر
خطوطِ منتشر تصویر بن کر مسکراتے ہیں
جہاں پھولوں میں اک ترتیب ہو کلیاں منظم ہوں
بیاباں کے وہی گوشے گلستاں جانے جاتے ہیں
جدائی کی حسرت ہے سوز جاں کا ارمان ہے
حجابِ کشمکش میں قسمتِ جلوہ نہاں ہے

شاکر علی

حافظ میری نظر میں

رضیہ بیگم

مجھے اعتراف ہے کہ حافظ پر اپنے تاثرات کے اظہار کی پہلی تحریک میرے لیے محترم خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی کتاب "فکر اقبال" بنی جس میں گو انہوں نے ضمناً حافظ کا ذکر کیا ہے مگر نہ جانے کیوں وہی ذکر میرے اندر یاس نامومس حافظ کا جذبا پیدا کرنے کا باعث بن گیا اور ایک طرح سے میں نے اپنے خیالات کو جوابی انداز میں ترتیب دیا ہے لیکن میں اپنے پڑھنے والوں کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اس سے میرا مقصد خلیفہ صاحب کی فکر پر اعتراض یا ان کی فلسفیانہ نگاہ کا مقابلہ ہرگز نہیں کہ ظاہر ہے میں ایسا دعوا نہیں کر سکتی..... اور شاید اس کے پیچھے کچھ یہ بھی جذبا تھا کہ فارسی ادب کے تعلق سے اکثر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ دنیا کی ایک قدیم اور ترین ترین زبان کے لطیف و عظیم ادب سے اتنا اعتنا نہیں برتا گیا جتنا کہ چاہیے تھا..... ہندستان کو چھوڑ کے خود ایران میں آج کل اس تمنی میں باوجود بہت کچھ ہونے کی جیسی ٹھوس کوششیں ہونی چاہیے تھیں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ نہیں ہوئی ہیں، ایران میں جو کچھ موجود اور دیں ہو رہا ہے وہ اب بھی بہت کم ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک فارسی شعر و ادب سے متعلق جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر یورپین مستشرقین کا رہین منت ہے اور جہاں تک میرے محدود مطالعے کو دخل ہے چند ایک کو چھوڑ کر ان مغربی محققین اور نقادوں کا طرز عمل خاص طور سے شعر و سخن کے بارے میں بہت سطحی رہا ہے اور فارسی شعر و ادب کی متنوع اور شوخ و طحار روح کو پوری طرح شاید ہی کوئی گرفت میں لا سکا ہو، اور ہمارے ہاں تو اکثر اچھے اچھے لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی ادب میں رکھا ہی کیا ہے سوائے عشق و عاشقی اور نالہ و شیون کے قصیدے ہیں سو چاپلوسی اور خوشامد کا انبار، مثنویاں داستان پارینا اور غزل گل و بلبل کی تکرار۔۔۔ ظاہر ہے اس سے خدا ہماری کم مائگی کے سوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا اور جیسا خود حافظ کا کہنا ہے ؎

کسے گیرد خطا بر نظم حافظ کہ بیچش لطف در گوہر نباشد

تو وہی جو گوہر ناآشنا ہیں ایسی بات کر سکتے ہیں۔۔۔ جو فارسی زبان و شعر کی وسعت، ہمہ گیری اور اس کے رمز و کنایا کے پیچھے جو ایک عالم رنگ و بو ہے اور نظم و ضبط حیات بھی اس تک پہنچ نہیں پاتے لہٰذا اس کی بس ایسی تصویر کھینچتے ہیں جیسی خود طہران کے ایک مطبوعہ دیوان حافظ کے نئے ایڈیشن میں آپ کو نظر آئیں گی یا جیسی چاری فلپی دینانے غالب کی شخصیت کو پردے پر دکھایا تھا کہ ان کی نظریں صرف الفاظ کی ظاہری اور ایک اوپری سطح سے آگے نہیں جاتیں..... چنانچہ حافظ کے ساتھ بھی اکثر یہی ہوا ہے کہ یا تو اسے محض ولی اللہ سمجھا جاتا ہے یا ایسا "لذت پرست" جو، کے نزدیک "قید حیات و بند غم" کا واحد علاج "نشے" سے کی مستقل فراموشی ہے تو یہی کچھ بہت پرانا اپنے احساس اور خیال کا بھی ایک پس منظر تھا کہ اس میں خلیفہ صاحب نے اپنی "فکر اقبال" میں سرسری جو ذکر حافظ کا کیا اس نے لامحالا مجھے حافظ کو پھر سے پڑھنے اور اپنے..... تاثرات کو مرتب کرنے پر مجبور کر دیا..... کسی کی فکر پر تنقید یا اعتراض اس کا مقصود نہیں۔ (رضیہ بیگم)

مانا کہ حافظ کہیں بہت جاہدانا سے زندگی کا سامنا کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ تمام مسایل کا علاج "آب طربناک" سے کرنا چاہتا ہے۔ زندگی سے دست و گریباں ہونے کے بجائے اس کے ہر مرحلے سے غرق مئے

ناب اولیٰ" کہہ کر گذر جانا چاہتا ہے، لیکن کیا ضروری ہے کہ زندگی کا تعاقب ایک "جارحانہ انداز جارحانہ" ہی سے کیا جائے۔

ایک خاتمش سکون طلبی بھی اپنا مقام رکھتی ہے، اس میں بھی تو تغیر کی دلی آویزی ہو سکتی ہے، جیسے ایک خاتمش نظر بھی کبھی لاکھوں طوفان اٹھا کر رستے کے کتنے ہی ہوتوں کو گرا سکتی ہے، حرکت و حیات صرف پرشور نغما اور صدائے نشور سے ہی تو پیدا نہیں ہوتی۔ حافظ کی پوری شاعری جس طرز حیات کو پیش کرتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس کی سکون طلبی اور حلاوت شہد و شکر میں فوری طور پر کسی ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف ڈھکیل سکنے کی پائیداری کم ہو، اور اس میں کوئی ایسا انداز جنوں و خروش نہ ہو جو ہماری توانائیوں کو یکسر صف آرا کر دے، لیکن زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو ایک انداز بردباری و وقار سے اپنے پیے اور سب کے لیے گوارا بنا بھی تو بڑی بات ہے۔ اکثر و بیشتر اسی تلخی حیات کو گوارا بنا سکنے کی طاقت نے ہی انسان کو نئے حرکات سے دوچار نہیں کیا۔ اس کی تعمیر نو کو نہیں ابھارا.....

ہو سکتا ہے کہ حافظ کے شعر انسانی فکر و عمل کے لیے فوری بھرک نہ بنیں، لیکن کیا شعر کا فوری محرک بننا ضروری ہے؟ اور کیا اس پیمانہ پر ہم کسی فنکار کی عظمت کا تعین کر سکتے ہیں؟

کلیسائی روایات کی ہزار گرہیں کھلنے پر بھی زندگی ایک رنگا سرسبز نظر آتی ہے۔ ریوں کی تاریک فکر بھی صحن سبزہ میں ان کی تہہ تک پہنچ نہیں پاتی، کتنے ہی قدم بھٹک کر بھی ہر "دانائے راہ" زندگی کی زندگی میں کچھ ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ؎

کس نکشود و نکشاید بہ دانش ایں معمارا

تو اگر حافظ بھی ایک عالم جسم و روح اور اس کی گونا گونی کے حیرت و استعجاب میں مگن کی "ارسطو اور انسانی علم کی ہنوز نشو کی کہانی" کچھ حقیقت افروز اظہار کر بھی ہے اور ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

کہتا ہو اعشرت امروز کی طرف مایل نظر آتا ہے تو یہ ایسا کوئی فعل مذموم تو نہیں کہ انسانی ذہانت کے لیے باعث شرم و ندامت ہو، اور اس کے کہنے والے پر لذت پرستی کا الزام عاید کیا جائے اور غور طلب امر تو یہی ہے کہ کیا حافظ کی تمام تر شاعری بقول خلیفہ صاحب کہ بیشتر ایام والی لذت پرستی ہے (یہ ایام والی لذت پرستی کیا ہے وہ ایک علیحدہ سوال ہے) اور طبائع پر اس کا عام اثر لذت پرستی اور عمل سے گریز کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اس کے شعر صرف بیمار نغمے تو پیدا کرتے ہیں وہ نہ تو غم غلط کرنے کا سامان ہیں۔

اول تو میں نہیں سمجھتی ایسا ہے اور جو ہو بھی تو غم غلط کرنا کوئی گناہ نہیں اس کی کوشش و تمنا بھی تو اپنے اندر ایک قوت محرکہ رکھتی ہے۔

انسان نے اپنی زندگی کی ہر منزل پر سیکڑوں نامکمل تجربوں کے بعد تکمیل کے حسین خواب کب نہیں دیکھے تو حافظ بھی اگر کیٹس کی طرح "BEAUTY IS JOY, JOY IS BEAUTY" کے ایک گہرے اور وسیع فلسفے کو مسرت تکمیل کی ایک امید فردا کو موجود اور آج کا تصور دے کر دعوت لطف و نظر دیتا ہے تو اس میں جو فضا ہے زندگی کے پرستار ابراہیمی کردار کی جو ترجمانی کی ہے، جس آج میں ماضی کا بھی اور کل کی بھی جواز کی تمنا ہے اور بھی تو دیکھنا ہوگا ــ انسانی ذہن و احساس کی آزادی اور شائستگی کی جس شدید تمنا نے اس کے قلم سے ایسے شعر لکھوائے جو اپنے اندر اتنی آفاقیت رکھتے ہیں کہ آج بھی زندگی کے کتنے ہی مرحلوں پر ہم نے اختیار انہیں دھرا لیتے ہیں اس لیے نہیں کہ بس میں نہیں چاشنی زباں اور لذت کام و دہن ہا ملی ہے، کچھ لذت نفس کا احساس ہوتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ہماری ڈوبتی نبضوں میں نئی دھمک پیدا کرتے ہیں ہماری رکی ہوئی سانسوں کو تازہ ہوا بخشتے ہیں اور ایک حسن طمانیت کے ساتھ ہماری یاسیت میں امید کی تو نائی کرتے ہیں تو کیا اس کو ہم محض لذت پرستی اور فراریت کی موہوم اصطلاحوں میں گھر کر نظر انداز کر سکتے ہیں، اس میں

سکوں طلبی کا جو انسانی آفاقی جذبا ہے کیا اسے صرف لاادریت سے وابستا کر کے خامش رہا جا سکتا ہے؟

بعض شاعر آج کے پڑھنے والوں سے بھی یوں راست مخاطب نظر آئے جو جانے گئے ہی خابوں کی تعبیر بن سکے جو اتنا پورا انسان ہو کہ زندگی کو کہاں سے پکڑے اور خشی کو کس طرح اپنائے جو ؎

گل مراد تو آنگہ نقاب بکشاید
کہ خدمتش چو نسیم سحر توانی کرد

کہہ کر زندگی کی مختلف منزلوں پر ہمارے ولولۂ حیات کے لیے ایک بڑا سہارا بن سکے ۔

قرعۂ فال بہ نام من دیوانہ زدند

کی تفسیر سے انسان کی عظمت و برتری ہی کا نہیں اس کے فرض حیات کا بھی احساس دلا سکے جو سرود خشی ایک احساس زیست بھی پیدا کر سکے، اس کا زاد حیات میں وہ بھی قابل قدر ہے اور میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ حافظ کے نغمۂ سرود میں اس احساس زیست کو پیدا کرنے اور جگائے رکھنے کی جو کیفیت ہے اور ایک شاعر ذہن کے کے غیر معروضی ہی، مگر فنکارانہ رجحان اور ظاہری انداز گریز کے پیچھے بھی زندگی کی چھڑپ اور ایک مخصوص تھا ہے اس میں بلا دا پیچ اور جاذبار ہے کہ کسی موقع پر بھی ٹھکاؤ یا در ماندگی کا احساس نہیں ہوتا حتا کہ حافظ جہاں کہیں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتا ہے ۔ تب بھی آپ دیکھیں گے اس کے لہجے میں بڑاپے کی سردگی اور تھکان نہیں آتی بہ ہو گا ہوں میں سرد مہری پیدا ہوتی ہے وہ ہر منزل پر اس ہوش حیات سے ساغر و مینا اٹھائے نظر آتا ہے ـــــ اور کیا اسی کو ہم فنکار کا وہ سوز ساز نہیں کہہ سکتے جو خلیفا صاحب کی نظر میں انسان کی حرکت حیات کو باقی رکھنے میں معاون ہوتا ہے ۔

[illegible] اور "نزہت گاہ انس" کا الفاظ [illegible] انسان کی تمام کاوشیں اسی کی ساری جد و جہد کیا اس لحاظ سے ہمیشا اسی "نزہت گاہ انس" کے لیے نہیں رہی؟ کیا ازل سے لے کر آج تک اولاد آدم اسی خشی اور آسودگی کے لیے سرگرداں نہیں؟ اور کیا اسی اچھی زندگی اور باغ نعیم کی تمنا نے ہی انسان کو ہر دور میں نت نئی زنجیریں توڑنے پر مجبور نہیں کیا؟ اسی آرزو اور خاب نے تو اکثر و بیشتر اوقات آگی منزلوں کا بھی بتا دیا ہے اور اس کے اندر دیکھی قوتوں کے جگانے کا کامیاب جذبا دینے کی ہمت بھی پیدا کی ہے تو حافظ بھی اگر سپاہیانا تیور کے بجائے اپنے مخصوص سکونی لہجے میں، میں کہوں کی عیش پرستی نہیں عیش کوشی کی دعوت دیتا ہے، ہمت حیات کو ایک انداز وقار سے ہنسی خوشی گذارنے کی بات کرتا ہے تو کیا برا کرتا ہے؟

"چناں نماند و چنیں ہم نخواہد ماند"

کہہ کر اگر وہ ساقی ماہ پیکر کو آواز دیتا ہے تو اس میں صرف زندگی کی تلخیوں کو جام عیش [illegible] کا تو جذبا نہیں اس ازلی حقیقت کی طرف بھی [illegible] ہے کہ زندگی پیہم تبدیلیوں سے دوچار ہے جو آج برا ہے کل اچھا بھی ہو سکتا ہے تو کیوں نہ ہم چکاے کم نہ ہے مغلوب ہوئے کے اپنے اندر [illegible] عالم تواں گذشت" کی ہمت اور یا [illegible] ای پیدا کریں [illegible] عزیمت نقصے اپنے جوش حیات کو برقرار رکھے [illegible] کہ یوں بھی تو زندگی کی مخالف طاقتوں کو ایک طرح سے زیر کیا جا سکتا ہے ۔ غم زمانا سے یوں بے نیاز انا آگے نکل جانا بھی تو ترقی ہے ۔ ایک قرار کے ساتھ افراد جیسے پوشیدہ کاے کامیابی میں ہے کہ گرد و پیش کی ہلاکت [illegible] انیاں اسے بھا گتے ان سے دور ہونے پر مجبور کرتی ہیں [illegible] ساتھ ہی وہ اس زندگی کا پردا چاک کرنے میں [illegible] کا ہے فریب ہے، بار نہیں رہ سکتا اور ہم دیکھیں گے حافظ نے بھی بڑی جگر داری سے اپنے چاروں طرف کہ زندگی کے ایک کمزور پہلو سے پردا اٹھایا اور [illegible] کثافت سے

بھاگ کر لطافت حیات کے اقرار کے ساتھ اسی زندگی میں مضمر ایک متبادلیت مستقل قدر حسن کو اجاگر کیا۔

حافظ کے مزاج میں ہزاروں سال کی ایک تہذیبی میراث کا جوہر اثر ہے ایک خاص نرمی، شیرافت، ہمواری، نیکی اور واقعی خطہ شخصیت کی سرو باری بھی۔ وہی اس کی شاعری کا بھی مزاج ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اپنے طویل تجربوں اور جہاں دیدگی نے بھی اس کے ذہن کے دروازوں کو کھلا رکھا اور وہ کبھی کسی قسم کی تنگ نظری اور یک طرفی کا شکار نہیں بنا، اسی لیے وہ ــــ

"بادوستاں لطف بادشمناں مدارا"

کا زندگی کا سب سے اونچا آدرش بنا سکا کہ ظاہر ہے کہ یہ نگاہ بلند یہ وقار زیست کسی کے اندر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ کائنات و حیات کی پوشیدہ رمازیوں کے نیچے اس نوعا میں بھی ــــ کس کس رازہ پرستہ توازن نظر کے ساتھ انسانی فطرت کی خامیوں اور نیکیوں دونوں کا صحیح ادراک کر سکے اور ساتھ ہی بدی کو انسانی فطرت نہ سمجھے اور انسان کے لیے آسودگی اور طمانیت کے بلند تر مقصود کو کبھی فراموش نہ کرے اور یہ مسرت و آسودگی عاقبت کا مقصود ہے۔ وہ یقین صرف پیغمبر کی دولت۔ عمارت عزت و شہرت اقتدار شاہی اور زر و مال کامرانیوں کی ناقص مسرت نہیں وہ اس سے برتر انسان کا مقصود ایک سچی مطمئن حتمی ایک عالمگیر محبت کی آسودگی ہے جس تک پہنچنے کے لیے بے شک حافظ کا کوئی نسخہ خواہ ناہیں لگاتا۔ مگر جس انداز و لطف سے اس دنیائے حیات کو ہمارے اندر جگاتا ہے۔ خود ہی خوش رہو اور سروں کو بھی خوش رہنے دو کے جس وسیع مسلک کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے اس میں مجھے تو کوئی بڑا دانا گریز و کھائی نہیں دیتا نہ "غنیمت شمر ناب اولی" کا تاثر غالب نظر آتا ہے اور جو بعض کہیں زمانی اور مکانی عالم سے گریز کا پہلو نکلتے نمایاں بھی ہو تو بقول ورڈسورتھ یہ گریز لازم تو نہیں کہ انسان کو ایک موہوم دنیا میں پہنچا دے اس میں ایک اقرار بھی تو نہاں ہو سکتا ہے جیسا میں نے ابھی کہا ہے۔ چنانچہ اس وقت کے مولویانہ زاہدانہ کے مقابلے میں کہ انسان دنیائے موجود سے نظریں ہٹا کر ترک اور توکل بیجا کو شعار بنائے حوران بہشتی کا حقدار بنے یا عاقبت کے رازہائے سربستہ کو سمجھنے میں الجھا رہے یا ثواب طاعت و زہد کی امید میں آخرت سے لو لگائے بیٹھا رہے، میرا خیال ہے حافظ کی "عشرت امروز" کا رجحان حقیقت موجود سے زیادہ قریب ہے کہ وہ اسی دنیا میں حصول آرام و مسرت چاہتا ہے موجود سے لطف اٹھانے کو کہتا ہے کہ اس کا انکار اس کی نظر میں کفران نعمت ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں گے کہ جس سر زمین پر اس کی پرورش ہوئی تھی جس کی روایت فکر میں ہمیشہ خوش باشی کے ساتھ ایک جوابی کا عنصر بھی ملتا ہے وہ حافظ کے فنکار ذہن و مزاج کا بھی لوازمہ ہے۔ وہ بھی فکر کرتا ہے، اسے بھی تلاش ہے۔ صرف محو عیش امروز نہیں رہتا، لیکن اپنی کیوری کا من سفنس سے کام لے کر کبھی عاقبت سے دست و گریباں نہیں ہوتا اور اپنے دماغ کو مابعد طبیعاتی الجھنوں میں نہیں پھنساتا، بلکہ اس سے کترا کر نکل جانے کو ہی دانشمندی سمجھتا ہے اور جو سچ پوچھیے تو اسی دانشمندی نے اس کی زندگی میں اتنا وقار پیدا کیا کہ ہزاروں آفتوں میں گرے ہونے پر بھی اس نے اپنی فکر و نظر کی وسعتوں اور بصیرت شناسی کو کبھی طائی ھوم و صلواۃ کا پابند نہیں کیا نہ قلب و روح کی گرمئ حیات کو سرد ہونے دیا نہ شیراز چھوڑا نہ اہل شیراز سے رفاقت کے رشتوں کو توڑا۔ ہم جانتے ہیں بظاہر ایک الگ تھلگ سی خانگی زندگی رکھتے ہوئے بھی حافظ کو ہمیشہ اپنی ذہنی اور جسمانی آسودگی سے گہرا بطہ رہا اور اس نے خود بزدلانہ ترک اختیار کیا نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دی بلکہ ــــ

راہے بزن کہ آہے برسازآں توان زد
شرے بسخواں کہ بادے طل گراں توان زد

کے قابل عمل مسلک کی طرف رہنمائی کی ــــ وہ جانتا ہے کہ

زندگی کا رستا اتنا سیدھا نہیں اس میں سینکڑوں موڑ ہیں طرح طرح کے سنگ راہ ہیں، سینکڑوں غم اور فکریں ہیں جو ہر وقت ہی زندگی سے لپٹی رہتی ہیں، ایسے میں بھی انسان خوش رہ سکے غم و آلام روزگار کے آگے بھی سر اونچا کر کے چل سکے تو یہی اس کی اصلی بلندی ہے اور تب ہی وہ جگر داری کا دعوا کر سکتا ہے ـــــ اور جو نشاط کی یہ گری تھوڑی دیر کے لیے بھی میسر آ سکے تو اس نقد کو کم اور بے معنی سمجھ کر ٹھکرا دینا کوئی بڑی دانائی تو نہیں ـــــ

اے دل عشرت امروز بہ فردا افگنی
مایۂ نقد بقارا کہ ضماں خواہد شد

کہہ کر حافظ موجود کی قدر سکھاتا ہے کہ کل کا ضامن کون ہو سکتا ہے جو آج ہے اسی کو غنیمت جانو ـــ

غنیمت داں دمے خود را گلستاں
کہ گل تا ہفتۂ دیگر نباشد

حافظ کی اس تمنا میں جیسی سادگی اور معصومیت ہے اتنی گہرائی بھی کہ اس میں انسانی خواہشوں کے لیے کچھ درس تسکین بھی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کی نظر میں صرف "آج" معنی رکھتا ہے کل لایعنی ہے میرے خیال میں ایسا ہی ہوگا کہ ہم ایبی کیورس کی ساری فلاسفی کا صرف یہ مطلب لیں کہ "وہ لہو لعب کو ہی زندگی سمجھتا تھا" جو ظاہر ہے پوری سچائی کی شاید نصف سچائی بھی نہیں ـــ اور ذرا یہ بھی تو سوچیے جب حاکم و فقیہہ عام زندگی کو محکمۂ احتساب بنائے ہوئے ہوں زاہد و ملا کے پاس صرف "وعدۂ فردا" ہو فکر و فن کی جو لائنوں کو ہر دم زنجیر نظر آئے تو ایسے میں "آج" کے تھوڑے سے سکون اور موجود خوشی کے ایک لمحے کا بھی قابل قدر بن جانا کتنا اگزیر ہوتا ہے، اور پھر حافظ جیسے حساس شاعر کے لیے جو زندگی میں سناٹا برداشت نہیں کر سکتا اور جب اس کی زندگی کو معمور طرب دیکھنے کو تنہا اپنے گرد و پیش کی تنہائی سے سر بہ گریباں دکھائی دیتی ہے، ہر روح میں ایک سناٹا نظر آتا ہے، بنائے حیات خالی دکھائی پڑتی ہے۔ نہ ذوق محفل نہ حسن و فن کی بھاؤٹیں ـــ ہر طرف ایک خلا، شور قیامت میں بھی بے پناہ سناٹا تو شاعری کی بے تاب مسرت آرزو بے اختیار چلا اٹھتی ہے ـــ

یاری اندر کس نمی بینم یاراں راچہ شد
دوستی کے آخر آمد دوستداراں راچہ شد
آب حیواں تیرہ گوں شد خضر فرخ پے کجا است
گل بگشت از رنگ خود بادِ بہاراں راچہ شد
صد ہزاراں گل شگفت و بانگ مرغی برنخاست
عندلیباں راچہ پیش آمد ہزاراں راچہ شد
شہر یاراں بود و خاک مہرباناں ایں دیار
مہربانی کے سر آمد شہریاراں راچہ شد

یہ بے ثباتیٔ دنیا یا آلام روزگار کا ماتم نہیں انسانی ذوق و روح کا نوحہ ہے جس میں یقیناً ایک پر کیف فریب مجاہدانہ سے زیادہ پر اثر بھی ہے اور قوت تسخیر بھی ـــ

بیشک حافظ کے پاس کچھ ایسے شعر بھی ملیں گے جن میں یہ خواہش تسخیر کی ہے وہ بڑی حد تک نقد پرستی کا نمونہ ہیں۔ ان کی انفعالیت گرمیٔ حیات کے لیے مضر ہو سکتی ہے، لیکن حافظ کا یہ تاثر سیر الخیال ہے اس کی شاعری کا اصلی مزاج نہیں صرف ایک "موڈ" ہے۔ جس کی نظروں کے سامنے اس کی متاع گراں بہا سکون و عافیت کی ہر قدر مٹ رہی ہو جس کی فطری انسان دوستی پر مسلسل ضربیں پڑ رہی ہوں اور اس کے محبوب شیراز پر بھی ہوا و ہوس کا دھواں چھا رہا ہو، ہر طرف رسوائیوں کا انبار ہو، تہذیب لطافت کا ہر قصر گرایا جا رہا ہو اس کے دل میں کبھی اس "موڈ" کا بھی راہ پا جانا کیا ایک خطا ہے؟ اور نہیں، بلکہ اس وقت کے حالات میں حافظ جیسا غیر معمولی حساس شاعر اور "نزہت گاہ انس" کا طالب ہمیشہ کے لیے چپ بھی سادھ لیتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی اس لیے شاید ذہانت کا تقاضا کبھی زندگی کے دوسرے معیار اور اونچے پیمانے سے ساز نہیں کر سکتا۔ اس کی "آج" اور پر واز فن انسانی فکر و نظر

کی بے جا بندشوں اور گراوٹوں سے بات نہیں ملا سکتی اور اس وقت اس کے سامنے دو ہی رستے ہوتے ہیں یا تو ہمیشا کے لیے خاموش ہو جائے یا ان گراوٹوں کو ایسے ضبط و وقار سے چیلنج کرے اور اپنا ایک ایسا مسلک بنائے جس کی کشادگی میں ساری دنیا کی سمائی ہو سکے جس کا حسن خد بخد سیکڑوں نظروں کو کشش بن کر سکے ..... اور ہم جانتے ہیں حافظ نے خاشی اختیار نہیں کی، بلکہ اپنے خصوص انداز شائستگی اور صدائے خسن سے اور بہت سے ذہنوں میں بھی چھپے ڈھکے نئے مطالبوں کو اکسایا اور حالات کے دھاروں میں بے سوچے سمجھے کتنے ہی بہے چلے جانے والوں کو اس وقت بھی مڑ کر اپنی اور فقیہہ شہر دونوں کی طرف دیکھنے پر مجبور اور یہہ احساس تقابل جگانا بھی تو بھائے خود ایک محرک ہو سکتا ہے۔

کیا ہم نہیں جانتے اس وقت کی عام زندگی میں ملائیت جس طرح ذہنی آزادی پر انسان کے فطری جذبات پر اس کے جمالیاتی ذوق پر بے تکی پابندیاں لگا رہی تھی اور حکمراں گروہ کی سیاست سے ہات ملا کر جس بے جان روحانیت، درویشی، توکل علی اللہ اور زندگی کی ناپائیداری کا علم کر رہی تھی، عام لوگوں کی سادگی اور خوش فہمیوں سے فائدہ اٹھا رہی تھی ۔ حافظ نے اس مولویانہ اقتدار اور غلط رجحان کے خلاف اس کی مظلومیت کے مقابل انسان دوستی اور حسن کے کتنے وسیع جذبے کو ابھارا ۔ ہمہ آفاقیوں اور بے معنی جھگڑوں کا کس لطیف انداز میں مضحکہ اڑایا اور عام نظروں کے سامنے سے ہٹتے کھلتے، کتنے بت ہٹائے ملائی زہد و تقویٰ کے تصور پر اپنی روشن عیش سے کیسی کاری ضرب لگائی ایک دشنام در آستین زندگی کی ریاکاریوں کی کس طرح پردہ دری کی ۔ کیا صرف اسی کو ہی ہم حافظ کا ایک بہت بڑا اجتہاد نہیں کہہ سکتے ؟

کون نہیں جانتا ۱۴ ویں صدی ایران کی تاریخ میں کتنی قیامت خیز تھی ۔ چنگیز و ہلاکو کے لکھڑوں پر جو ایلخانی عمارت بنی تھی اس کو توڑنے والے بہت تھے اور سنوارنے والے بہت کم ۔ ہر طرف ہنگامے، بغاوتیں مختلف گروہ طرح طرح کے حاکم و سردار، رہبر و رہنمائے تصوف اقتدار کے طالب، کچے قومی وقار کے نام لیوا، ایک مستقل کشاکش ہر لمحہ غیر یقینی، ہر صورت حال پایہ رکاب، دوستی دشمنی کم یاب، بھائی بھائی کے خلاف تو باپ فرزندوں کا دشمن ۔ آپس کے رشتے بیاردو محبت کے بندھن جیسے سب ٹوٹ چکے تھے ۔ کوئی انسانی رشتہ قابل قدر نہیں رہا تھا ۔ اسی نے تو حافظ کو یہ کہنے پر مجبور کیا ۔

نے تنہا کشم قطاول زلفت
کیست کہ او آں داغ سیاہ ندارد

اور وہ انسان کی اتنی گراوٹ اور ابتری کو دیکھ کر پکار اٹھا ۔

این چہ شوریست در دور قمری بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شری بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و بدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہ پدری بینم

یوں تو ایران کی تاریخ ہمیشا ہی سخت قسم کے مد و جزر سے دوچار رہی ہے، لیکن چودھویں صدی کی یہ سرگرانی کچھ اور ہی تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے انسان کے ہات سے زندگی کا سرا شتا ہی چھوٹ گیا ہو ۔ فریدوں و ایرج کی نیکیاں پرچھائیوں کی قوتوں کے آگے سرنگوں تھیں ..... ذرا دیکھئے جو زمین کبھی داریوش و جمشید کی مملکت تھی ۔ ایک عالمی ریاست ۔ اس کے کیسے ہزار ٹکڑے ہو رہے تھے ۔ آذربائیجان اور عراق عجم شیخ حسن بزرگ کے تحت تھے بغداد اور عراق پر ادیرات اور قراجری خاندان قابض تھا، ہرات اور خراسان کے کچھ حصے پر آل کرت اپنا سکہ چلا رہے تھے اور جرجان تیموز سبزواری کے ہات میں تھا ۔ یہتی و نیشاپور، سربداری امیروں کے دست نگر تھے تو کرمان و اصفہان نوابوں اور جاگیرداروں کے ہات کا کھلونا بنے ہوئے تھے ۔ ان کے دل پر فارس پر انجو کا اقتدار تھا اور ہر حاکم و فرماں روا

اپنی حاکمیت اور اقتدار کے دایرے کو پھیلانے کی فکر میں غرق۔ نہ کوئی نظم تھا نہ ضبط ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا اور فضا اور شہر کی فراوانی میں غلط افلاس اور غربت کے ساتھ کوناگوں بیماریوں اور وباؤں کی میعت الگ۔ لوگ حیران پریشان بس دیکھ رہے تھے کیا ہے؟ کیا رہے گا؟ کیا بچائیں؟ کیا بات سے دیں؟ اتنا بھی سوچنے کا وقفہ نہ تھا طوفان کچھ تو تھمے کہیں تو رکے کہ کوئی دم بے کسے کچھ سوچے سمجھے اور کچھ بنا سکے اور اس سارے شور قیامت میں حافظ کی زمین خاموش و شیراز کے لیے چوتھم رسا کشتی رہی گلگشت مصلیٰ اور آب رکناباد کی خنک فضائیں بھی جس طرح آپس کی مخالفت و منافرت سے داغ دار ہیں شیراز کی زمین شعر بھی پر بھی فقیہہ و حاکم کے اتحاد و سازش نے جو خون کی ہولی کھیلی انسانی رفاقت اور دوستی کے درمیان جو صنوعی دیوار کھینچی آپس کے پر امن رشتوں میں جو زہر گھولا۔ ان حالات کے پورے ذہنی اور روحانی پس منظر میں حافظ کی شاعری کا جایزہ لیا جائے تو تب ہی ہم اس کے احساس و خیال کی وسعت و گیرائی کا بھی مضمون میں احاطہ کر سکیں گے کہ کس طرح اس نے دلوں میں صرف "لذت پرستی" کا جذبہ ابھارا انہیں مرنے سے گم کر کے کل کی فکر سے یکسر بیگانہ بنانا چاہا یا اپنے تغزل کی لطافت و حیات اور نوکر آب طرب ناک کی متوازن حسرت کو شوخی سے انسانی ذہن و روح کو اس تباہ کن موڑ پر ایک بہت بڑی موت سے بچا لیا اور "غم مخور" کہ "نقش جور و ستم نخواہد ماند" کے اعتماد کے ساتھ مایوس دلوں کو یہ نوید سنا کر چونکایا بھی کہ ــــ

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
ارغواں جام عقیقی بہ سمن خواہد داد
چشم نرگس بہ ستائش نگراں خواہد شد
ایں تطاول کہ کشید از غم ہجراں بلبل
تا سر ایپردۂ کل نعرۂ زناں خواہد شد

بلا شبہ حافظ جیسے خسن بین کی جگر داری تھی کے زندگی کے کسی مرحلے پر اس نے اپنی خسن فکری کو ہات سے نہیں دیا اور قصر امل کو "سخت سست بنیاد" اور "راز دہر کہ تر جو گتے ہوے بھی کبھی حوادثات زمانا کے آگے سپر نہیں ڈالی نہ تلاش فکر کو ماؤف ہونے دیا حتا کہ اس وقت بھی جب دم بہ دم تبدیلیوں نے نصب کی دھکیوں کو بھی بے معنی سا بنا دیا تھا نہ اس کا ڈر رہا تھا نہ اس کی مسکراہٹوں کی تمنا گویا ہر دل مرجایا ہوا تھا' احساس زیست بھی جیسے رچکا تھا' انسان کو جس بار امانت پر ناز تھا اس کو سنبھالے رکھنے کی توانائی ہی دم توڑ رہی تھی ــــ حافظ نے جس انداز سے آسایش دو گیتی کی تحقیر کی جس جوش و جذبے کے ساتھ مرد اور بادہ اس سے عاری دلوں میں شمع الفت کی لو تڑپائی' ہر دو حرف کے سنانے کو جس طرح محور حیرت کرنا چاہا اسے آج ہم محض سامان رقت کہہ کر گذر جائیں تو ہمارا کچھ نہ گیا پر اپنی اس بیتا قابل تحریر ہو سکتا ہے ورنا ہماری ادبی بیداری اور شعر فہمی کا تقاضا کیا ہم کسی تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ حافظ جیسے فن کار کا ہی حوصلہ تھا کہ اس نے اس طوفان محشر میں ہزار تعجبوں کے بیچ اپنی بندگاہی کو لحد و دبا کے بجائے انسانی شرافت' یگانگت اور آسودگی کی ان اقدار کو سامنے رکھا جن کی تاثیر ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حافظ ان حالات میں گرا ہوا تھا جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہی خول میں بند ہو رہا تھا اور اندر ہی اندر کچھ گیت گائے گئے "مطلق اقدار" کی پوجا کی ــــ میں تو کہوں گی حافظ نے شاید اپنے دور کے ہر شہر و دنیا سے زیادہ اپنے چاروں طرف سے اٹھتے ہوے سیلاب کے تھپیڑوں کو نہ صرف محسوس کیا' بلکہ رہناؤں کی نگاہ اپنی ہی سیاست میں الجھی ہوئی جو کچھ جو دیکھ سکتی تھی اس کو بھی دیکھا اور دوسروں کو بھی دکھانے جو شش کی

خاص طور سے شیراز و فارس کے مدوجزر کا اس پر بہت گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ اس کی کتنی ہی غزلیں ایسی ملیں گی جن میں ہم شیراز و فارس کی اچھی بری دونوں تبدیلیوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں اور چونکہ وہ مجنونانہ جوش سے اسے بنانے بگاڑنے میں کم نہیں رہا، ہر تبدیلی اور طوفان کے بیچ بھی اس سے الگ رہ کر اور اس سے اوپر اٹھ کر دیکھنے کی صلاحیت کو ہمیشہ بیدار رکھا غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کے احساس و شعر کا محور صرف شیراز و اصفہان نہیں بنے اور ان کی تاثیر چند زاویوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں عام انسانی تمنا کی بے کناری اور آفاقیت نے جگہ پائی۔

یہاں میں مختصراً حافظ شیراز کی کچھ تبدیلیوں کا اور اس کے آثار چڑھاؤ کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں تاکہ ہم حافظ کے پاس وہ جو اصطلاح میں "روح عصر" کہلاتی ہے اس کو بھی چلتا پھرتا دیکھ سکیں۔۔۔۔۔

ایلخانی دور میں صدرالدین احمد خالدی کو فارس کا گورنر بنایا گیا تھا اور اس کے زمانے میں اہل فارس بڑی حد تک ترکمانوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے تھے، لیکن یہ امن و امان بہت عارضی تھا، اس کی وفات کے بعد ہی مورونی حکمرانی کے لازمی نتائج آپسی کی نزع کی صورت میں ظاہر ہونے لگے۔۔۔ ابوسعید مغل فرمانروا نے ان پر قابو پانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔۔۔ یہ فتنے بڑھتے ہی گئے۔ فارس کی سڑکیں اور گلیاں قتل و غارت گری کا مرکز بن گئیں، تھوڑی سی مدت میں کتنے ہی حاکم و فرماں روا ابھرے اور ڈوب گئے، مگر آپس کی دشمنی اور رقابت کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اسی درمیان میں امیر شیخ اسحاق نے کچھ عرصے کے لیے شیراز پر پورا قبضہ کیا تو لوگوں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ اس سے پہلے مسلسل دو سال تک امیر پیر حسن نے شیراز میں جو ظلم و جبر پھیلا رکھا تھا جس طرح ملاؤں کو کھلی دے کر لوگوں کی آزادی فکر و خیال پر بھی پابندیاں لگادی تھیں اس کے مقابلے میں ابو اسحاق کی آمد لوگوں کے لیے بجا طور پر "بادِ شمال" سے کم نہ تھی، حافظ کی عمر اس وقت ۷۰-۷۱۹ سال کی تھی، اور اس غیر معمولی حساس شاعر نے کہنا چاہیے بچپن سے ہی شخصی اقتدار اور حکمرانی کی خاطر جنگ و جدل کے جو خونی مناظر حاکم و فقیہہ کی ساز باز اور نت نئی مخالفتوں کے تانے بانے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے تھے اس کے دل پر لازماً اس کے بہت گہرے داغ تھے اور حافظ اگر شوہنہار جیسا بھی بدبیں ہوتا تو دوسروں کو دعوت عیش دینا تو بڑی بات ہے شاید زندگی بھر خود بھی مسکرا نہ سکتا، لیکن پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ یہ حافظ کے مزاج کی وہی گلگشت مصلی کی سی نظری شگفتگی تھی اس کی اپنی خوش کوشی اور انسانیت پر اعتماد کا فیض اندوہ محن کے بیچ روشنی کی ایک کرن بھی پھوٹتی ہے اس کی یاس و ناامیدی کے اندھیروں میں ہزار چراغ جل اٹھتے ہیں اور وہ بے اختیار عام انسانوں کی سادہ خوشیوں میں شریک ہو کر اپنی اور ان کی امیدوں کو تقویت پہنچاتا ہے۔

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد
زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

آں ہمہ ناز و تنعم کہ خزاں می فرمود
عاقبت در قدم باد بہار آخر شد

صبح امید کہ بود مشعلہ پردۂ غیب
گو بر دن آئی کہ کار شب تار آخر شد

آں پریشانی شب ہائے دراز و غم و دل
ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد

ساقیا عمر دراز و قدحت پر می باد
کہ بہ تدبیر تو تشویش خمار آخر شد

حافظ کی یہی ایک غزل ظلم و غارت گری کے ایک وقفے کے اختتام اور نسیم بہار کے ایک جھونکے کا تاثر

نہیں اور بھی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن میں ہم شیراز کی اس وقت کی کم و بیش ہر تبدیلی کا عکس واضح دیکھ سکتے ہیں مثلاً امیر شیخ اسحاق کے سکے کی جھنکار ابھی شیراز میں پوری طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ امیر مبارز الدین مظفر نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے اپنی تند خوئی اور سخت گیری کے نذر کر دیا۔ فارس و شیراز پر تسلط کے ساتھ ہی اس نے پہلا کام یہ کیا (جو بجائے خود برا نہ تھا) کہ سبخا نے بند کروا دیے۔ شاید اسی لیے اہل شیراز اسے سلطان محتسب کہتے تھے۔ حافظ نے اس دور اختناق کی طرف بھی کئی غزلوں میں بہت حسین پر معنی اشارے کیے ہیں جن میں جیسا کہ عام طور پر ظاہری الفاظ سے سمجھا جاتا ہے شراب بندی کے خلاف غصے کا اظہار نہیں بلکہ دراصل بے جا جبر کی غلط کاریوں کا دیا ہے وہ کسی برائی کو ختم کرنے کے لیے ہی کیوں نہ ہو پہلو مضمر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس جبریا شراب بندی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گھروں کے اندر خفیہ طور پر بازار ریا کاری گرم ہونے لگا ـــــ ایک سادا پرائی کتنی برائیوں سے آمیز ہو گئی ـــــ چنانچہ خد مبارز الدین کے لڑکے شجاع نے اس "دور جبر" کو جس سے ہر کوئی نالاں تھا ختم کیا تو سب ہی نے بڑے جوش سے خوش دلی کا اظہار کیا اور حافظ نے بھی اس کی ہنوائی کی، مگر اپنے اسی مخصوص ایمائی آفاقی انداز میں کہ ـــ

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش (نبوش)

شد آں کہ اہل نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش

یہ ہما پوری غزل اپنے اندر ایک نئے آغاز کی خوش امیدی رکھتی ہے ـــ

شجاع مبارز الدین کا دوسرا فرزند تھا جو ترکوں کے ایک قبیلے قراختائی کی ایک خاتون کے بطن سے تھا۔ غالباً اسی بنا پر حافظ نے اسے "شاہ ترکاں" کہا ہے ـــ

حافظ بچپن ہی سے شجاع کو دوست رکھتا تھا۔ اور تقریباً ۳۲ سال تک حافظ اور شجاع ایک دوسرے سے بہت قریب رہے تھے۔ شجاع کی شخصیت حافظ کو بہت عزیز تھی، اس لیے کہ وہ بہت نیک طبیعت، نرم مزاج امن پسند اور شعر و ادب کا دلدادا تھا (گو خد پڑا لکھا نہ تھا، جس کی طرف خد حافظ نے بھی کئی جگہ اشارا کیا ہے) لیکن مزاج شاعرانا تھا اور نظر حسن دوست ..... جو ہو سکتا ہے جمال ہمنشیں کا ہی فیض ہو ـــ اور غالباً اسی قدر مشترک کی بنا پر حافظ نے اسے ایک طرح سے اپنا نقطۂ فکر بنایا۔

حافظ جس طرح پہلے ابو اسحاق کے طرفداروں میں نظر آتا ہے اس کے بعد کے اس کے مخالف گروہ کے جانشین شجاع کی پر جوش تعریف ممکن ہے بعض نظروں میں کھٹکے اور اس پر موقع پرستی کا بھی الزام لگائیں ـــ لیکن اس کو ہم اگر اسی طرح دیکھیں اور سمجھیں کہ حافظ نے اپنی ذہانت اور حسن کارانا وسیع نظری کو کبھی کسی جماعتی سیاست کے گنبد میں محصور نہیں کیا نہ شخصیت پرستی کو اس طرح اپنا شعار بنایا کہ وہ اس کے رستے میں ایک بت بن کر کھڑی ہو جاتی تو بات واضح ہو جائے گی۔ اس کی آزاد روش کسی موڑ پر بھی تنگ نظری اور ذاتی حدود کی پابند نہیں ہوتی۔ جس کسی نے شیراز کو سنوارا تھوڑی دیر کے لیے بھی اس کی گرم و تند ہوا دی میں کچھ نرمی پیدا کی، شعر و ادب کی قدر بڑھائی اور آسودگی اور شائستگی کی امید بندھائی وہ اس کی نظر میں محبوب و خوب ہے، وہ، اس کو سہرا نتا ہے، چاہے سیاسی حالات اور جماعتی گروہ بندیوں کے لحاظ سے اس کا مخالف قوتوں سے ہی تعلق کیوں نہ رہا ہو۔

شیخ ابو اسحاق کا بھی وہ اسی لیے دلدادا

تھا کہ وہ واقعی نیک انسان تھا، ادب دوست تھا، اس کے مزاج میں ایک خاص شائستگی تھی خود بھی شاعر تھا اور حافظ کی طرح خوش دلی سے جینا چاہتا تھا اور اہل شیراز کے دلوں سے یہاں تک ہو سکا اس نے پچھلے ظلم و جبر کے نشانات مٹانے کی کوشش کی ۔۔۔ اس طرح شجاع نے بھی چونکہ شیراز کو زیادہ اتاہیوں سے بچائے رکھا اور اس کے مزاج و طبیعت میں بھی خوش باشی کی نرمی اور انسان دوستی کا گداز تھا۔ اہل شیراز سے اس کا برتاؤ بہت کچھ دوستانہ رہا اس لیے شجاع کی شخصیت بھی اس کا مرکز نگاہ بنتی ہے، لیکن میں پھر یہ کہوں گی کہ حافظ کسی ایک واقعے یا شخصیت کے سہارے جو تخلیق کرتا ہے اس میں وہ خصوصی مخاطب شخصیت یا واقعہ بہت پیچھے چھوٹ جاتا ہے اور اس کا حسن بیان اور ذوق نگاہ اپنے اندر اس آفاقیت کو سمیٹ لیتا ہے جو زمان و مکاں کی حدود سے بے نیاز ہوتا ہے شخصیت گویا اس کے لیے محض ایک نقطہ ہے جس کو مرکز بنا کر وہ اپنی گردش پرکار سے جو دائرہ کھینچتا ہے اس میں جیسے ساری دنیا سمٹ آتی ہے جس کے سہارے اس کی شعری فکر پرواز حاصل کرتی ہے اور اپنے ماحول کے تنگ دائرے سے نکل کر ہر روح کی تمنا بن جاتی ہے۔

شاہ شجاع کے بعد مظفری خاندان کا شیراز اجڑنے لگا، اور آخر کار امیر تیمور نے شیراز و فارس پر جس طرح نظر عنایت ڈالی وہاں پھر انسانی خون کی بھی ہولی کھیلی گئی، اطمینان و سکون کو جس طرح سربازار نیلام کیا گیا، خیاں جس طرح لوٹی گئیں، کچے بنتی ہوئی امیدوں کو جس طرح پیچھے ڈھکیلا گیا، روضۂ شیراز کی خنک ہواؤں کو پھر جس طرح گرم بنایا گیا ۔۔۔ یہ سارے دلخراش مناظر بھی سالخوردہ حافظ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ۔۔۔ اس کا حافظہ جیسے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا ہوگا ہمارے لیے اس کا اندازا لگانا بھی مشکل ہے ۔۔۔ وہ تو کہیے اس کے ضمیر میں نشاط حیات کی جو گرمی تھی، طبیعت میں جو بنیادی خوش بینی تھی اس نے اس دور آخر میں بھی جیکے زندگی کی ہر حرارت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی نہ کوئی ہمدم رہا تھا نہ دمساز، اس کے حوصلوں اور انسانی وقار کو مرنے نہیں دیا۔ اور ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ۸ ویں صدی کے کفر و فسق کے اس سارے طوفان اور ہنگاموں کے بیچ بھی اس نے انسان کی کچھ از لی و ابدی تمناؤں کے چراغ راہ گزر کو بجھنے سے جو بچا لیا وہ بھی کچھ کم اجتہاد نہیں۔

آخر میں، میں صرف اتنا کہوں گی ۔۔۔

دوستاں عیب نظربازی حافظ مکنید
کہ من او راز محبان خدای بینم



ارتضیٰ غزنی

کبھی جو ترک وفا کا ارادہ کرتے ہیں
تو التفات وہ ہم پر زیادہ کرتے ہیں

یہ کائنات نہایت حسین ہے اے دوست
مگر جو غم سے ترے استفادہ کرتے ہیں

تمام عمر ترستے ہیں زندگی کے لیے
جو زندگی کی تمنا زیادہ کرتے ہیں

ہمارے حال پریشاں پہ گردش دوراں
گواہ رہنا کہ ہم ترک بادہ کرتے ہیں

اسی خطا پہ سزاوار قید و بند ہیں ہم
کہ فکر تو سے دلوں کو کشادہ کرتے ہیں

ہمیں عزیز ہے دنیا بھی دین بھی دل بھی
وفائیں ہم سے مگر بے ارادہ کرتے ہیں

بہار ان کے تبسم کا عکس ہے غزنی
وہی جو باتیں بڑی سادہ سادہ کرتے ہیں

نظام کاینات

اکبر حسین

انسانی تجسس کو سب سے پہلے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں نے اپنی طرف متوجہ کیا، اور جب انسان نے ان کی چمک دمک اور رجاذیت سے متاثر ہو کر ان پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا تو اسے ان کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب نظر آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بیشمار ستارے اپنے ازلی مدار پر ایک مخصوص نظام کے تحت سرگرم سفر ہیں۔ اس تحقیق کے بعد شاہدات کی روشنی میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں اور مفکرین نے کاینانی نظام کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے، جن میں تاریخی اعتبار سے بطلیموس نظام کو کافی اہمیت حاصل ہوئی۔ حالانکہ بطلیموس (سنہ ۱۴۰ء) سے بہت پہلے ۵۳۶ ق م میں حکیم فیثاغورث نے شمس مرکزی نظریہ (سورج زمین کا مرکز ہے اور زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے) پیش کیا تھا، لیکن یہ نظریہ مقبول عام نہ ہو سکا۔

بطلیموسی نظام کی رو سے زمین مرکز کاینات تھی، یعنی تمام اجرام فلکی مختلف فاصلوں پر زمین کے گرد گھوم رہے تھے، اور زمین ساکت تھی۔ بطلیموسی نظام تقریباً ۱۳۰۰ برس تک جاری رہا، اور اغلب ہے کہ قدیم عربی تقویم اسی نظام کے تحت ترتیب دی گئی ہو، جس میں زمین فرش ہے اور پہلے آسمان پر چاند دوسرے پر زہرا، تیسرے پر عطارد، چوتھے پر سورج، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل واقع ہیں۔ ان چھ سیاروں اور ساتویں سورج کے مدار سات آسمان ہیں اور آٹھویں آسمان پر باقی ستارے، اور بارا بروج مختلف صورتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔

تیرا سو برس بعد یعنی ۱۵۰۷ء میں کوپرنیکس نے ثابت کیا کہ زمین مرکز کاینات نہیں، بلکہ دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔

یہاں تو تھیں پرانی باتیں، لیکن اب علم ہیئت قدیم معلومات کے قطرے سے پھیل کر سمندر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس کے باوجود انسان محو حیرت ہے کہ اس قدر وسیع معلومات کے حاصل کر لینے کے بعد بھی عقل انسانی رموز کاینات کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر ہے۔ تاریخی "جد و جہد کی دلچسپی کے لیے میں موجودا کاینانی نظام کا خاکہ بطور" مشتے نمونہ از خروارے" پیش کرتا ہوں۔

آج سے اربوں برس پہلے زمین آتش سیال اور گیسی مادے کی صورت میں سورج کا ایک جز تھی۔ آسمان پر ستارے ہی ستارے تھے۔ جن میں سورج بھی شامل تھا اور اب بھی شامل ہے۔ یعنی سورج ایک ستارا ہے جو اب سے اربوں برس پہلے بھی موجود تھا اس وقت نہ زمین تھی نہ زمین پر بسنے والے والے موجود تھے۔ قدرت خدا سے ایک تارا جو سورج سے کئی گنا بڑا تھا اپنے مدار پر گردش کرتا ہوا سورج کے نزدیک سے گذرا۔ اس نئے ستارے کی کشش کے باعث سورج کا بہت سا حصہ الگ ہو کر نہایت تیزی سے اس نئے ستارے میں شامل ہونے کے لیے دوڑا، مگر وہ اپنی تیز رفتار کے باعث بہت دور نکل چکا تھا، اس لیے سورج سے علیحدا ہوئے آتشی مادے کے بہت بڑے بڑے کرے فضا میں منتشر ہو گئے۔ اس آتش سیال کے یہ نو بڑے بڑے کرے سورج کی کشش کے باعث اس کے گرد ایک ازلی گردش میں آج بھی موجود ہیں۔ آفتابی مادے کے یہ بڑے بڑے کرے ایک خاص طبیعی اصول سے مجبور ہو کر اربوں سال سے سورج کے

گردگھوم رہے ہیں۔ یہ اصول مادے کے چند بنیادی ذرّوں پر استوار ہے اور وہ یہ ہیں۔ ہر مادے میں کشش ہوتی ہے جو اس کی کمیت MASS اور رفتار پر منحصر ہے۔ اس لیے جب سورج اپنی عظیم کمیت کے سبب اپنے سے ہلکے، مگر متحرک مادی کروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو یہ کرے رفتار میں ہونے کے سبب سورج میں جا گرنے کی بجائے اسکے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ مادے کا یہ حیرت میں ڈال دینے والا طبیعی اصول خالق کائنات کی قدرت کا ایک ادنا کرشمہ ہے۔ اسی اصول کے تحت روسی سپوتنک نے زمین کے چاروں طرف لاکھوں میل کا سفر کسی قسم کا ایندھن خرچ کیے بغیر طے کیا ہے۔

یہاں تو کرے جو زمین کی طرح ٹھوس اور سخت ہو گئے ہیں، سیارے کہلاتے ہیں اور دنیا انہیں عطارد، زہرا، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورے نس، نیپٹون اور پلاٹو کے نام سے جانتی ہے۔ سورج کے سب سے نزدیک سیارے کا نام عطارد ہے، جو سورج سے تین کروڑ میل کے فاصلے پر اپنے مدار پر چکر لگا رہا ہے۔ نظام شمسی میں ایک ایسا سیارا ہے جس کا مدار مستقل نہیں، بلکہ سو سال کے بعد ۴۳ سکنڈ کے حساب سے بدلتا رہتا ہے، یعنی تیئس ہزار صدیوں کے بعد اس کا پورا مدار بدل جاتا ہے۔ اس سیارے کا قطر تین ہزار آٹھ میل ہے، جبکہ سورج کا قطر آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار تین سو اسی میل ہے۔ دوسرا سیارا زہرا سورج سے چھ کروڑ میل دور رہ کر سورج کا ایک طواف کر رہا ہے اس کا قطر سات ہزار پانچسو پچھتر میل ہے۔ بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس سیارے پر زمین سے مشابہ زندگی ہونے کا امکان ہے۔ تیسرا سیارا ان سے ذرا بڑا ہے جس کا قطر سات ہزار نو سو چھبیس میل ہے۔ یہ سورج سے نو کروڑ میل دور ہونے کے باوجود سورج کا چکر انا نا ہوا ہے۔ یہ سیارا ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ سورج کی زبردست کشش کے باعث اس میں سے بھی بہت سا مادا الگ ہو کر ذرا چھوٹے کرے کی صورت میں اس بڑے سیارے کے گرد گھومتا رہ گیا۔ اس بڑے سیارے کا نام زمین ہے جس پر ہم رہتے ہیں اور وہ چھوٹا کرا جو ٹھنڈا ہو کر اس کے چاروں طرف گھوم رہا ہے، وہ چاند ہے جو صرف دو لاکھ تیئس ہزار میل کے فاصلے پر زمین کے گرد گھومتا ہے اور اس کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔ یہ تھا سیارا مریخ چار ہزار دو سو پندرہ میل قطر کا ہے اس کا مدار زمین کے مدار سے باہر کی طرف واقع ہے۔ مریخ جو اکروڑ دس لاکھ میل کے فاصلے پر سورج کے گرد ایک غیر مرئی دائرے پر رواں دواں ہے۔ بعض سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق اس سیارے پر بھی آبادی ہے اور دونوں سیاروں (زہرا اور مریخ) پر رہنے والے زمین پر رہنے والوں سے ترقی کے میدان میں بہت آگے ہیں، لیکن اس نظریے کی ابھی تک کوئی تسلی بخش تصدیق نہیں ہو سکی۔ پانچواں سیارا مشتری زمین سے بارا گنا بڑا ہے اس کا قطر اٹھاسی ہزار چھ سو اٹھانوے میل ہے۔ مشتری سورج سے اڑتالیس کروڑ تیئس لاکھ میل دور رہ کر سورج کے گرد چھیانوے کروڑ ساٹھ لاکھ میل قطر کا ایک وسیع دائرہ بناتا ہے، اس سیارے کے اب تک گیارا چاند دریافت ہو چکے ہیں جو ایک اچھی دوربین سے نظر آجاتے ہیں۔ چھٹا سیارا زحل ہے جو مشتری سے قدرے چھوٹا، مگر دوسرے سب سیاروں سے بڑا اور عجیب ہے اور اس کے گرد تین ہالے ہیں جن میں سے دو روشن ہیں اور ایک تاریک ہے۔ زحل کا قطر پچھتر ہزار میل ہے اس کے نو چاند بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ یہ اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل کی دوری پر سورج کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے۔

ان چھ سیاروں کے علاوہ اتنے اور سیارے بھی جو دوربین کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے بہت مدت بعد میں دریافت کیے گئے تھے۔

ساتواں سیارا یورے نس زمین سے تقریباً چار گنا بڑا ہے اس کا قطر تیس ہزار آٹھ سو اٹھتر میل ہے۔ سورج ایک ارب اٹھتر کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر اس کا مرکز ہے۔ یہ سیارا ۱۷۸۱ء میں ولیم ہرشل نے دریافت کیا تھا۔ آٹھواں سیارا نپ ٹیون ہے جو یورے نس سے کچھ چھوٹا ہے۔ اس کا قطر اڑتیس ہزار سات سو میل ہے اور سورج سے دو ارب انا سی کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ نواں اور آخری سیارا پلاٹو ہے جو عجم میں زمین سے تقریباً آدھے اس کا قطر تین ہزار چھ سو میل ہے یہ سورج سے تین ارب چھاسٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ میل کی دوری پر واقع ہے۔ پلاٹو ۱۹۳۰ء میں دریافت ہوا تھا۔ یہ تمام سیارے سورج سے بہت عظیم فاصلوں پر اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ سورج کے گرد پلاٹو کا ایک چکر دو سو اڑتالیس سال میں پورا ہوتا ہے یہ ۲۴۸ سال کا زمانا پلاٹو کا ایک سال ہے اس سارے نظام کو نظام شمسی کہتے ہیں۔

نظام شمسی کی وسعت سات ارب تینتیس کروڑ بیس لاکھ میل قطر کا ایک کرا ہے۔ اس وسعت کا اندازا لگانا اگرچہ ہمارے احاطۂ تصور سے باہر ہے، لیکن پھر بھی اگر ہم کسی طرح نظام شمسی کے اس دائرے سے باہر نکل سکیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ وسعت تمام کائنات کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے کرۂ زمین کے مقابلے میں ریت کا ایک حقیر ذرا۔

آسمان کے چھوٹے بڑے ستاروں میں سورج بھی شامل ہے، یوں سمجھیے کہ یہ تمام ستارے بیشمار سورج ہیں، مگر اس قدر دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں کہ صرف روشنی کے نقطے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان کے فاصلے کا حساب میلوں میں لگانا ناممکن ہے اس لیے ہیئت دانوں نے ان فاصلوں کو ناپنے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کیا ہے جسے سال نور LIGHT YEAR کہتے ہیں۔ اگر روشنی اس رفتار سے لگاتار ایک سال تک سفر کرتی رہے تو تاون کھرب ایسی ارب چھ کروڑ چوبیس لاکھ میل کا سفر طے کرے گی۔ جو ایک سال نور کے برابر ہوگا۔

سورج کے بعد سب سے نزدیک ستارا ہم سے دو سو پچاس کھرب میل یا تقریباً چار سو سال نور کے فاصلے پر واقع ہے، یعنی اس ستارے کی روشنی جو اب نظر آتی ہے آج سے چار سو سال پہلے چلی تھی اور اگر یہ ستارا اس وقت معدوم ہو جائے تو اب سے چار سال کے بعد ہی ہمیں اس کے معدوم ہونے کا احساس ہوگا۔ اندھیری رات میں آسمان پر جو بیشمار ستارے جھل مل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی تعداد میں دوربین لگانے سے اضافا ہوتا جاتا ہے۔ ان میں ستاروں کی ایک سڑک سی بھی دکھائی دیتی ہے، جسے کہکشاں کہتے ہیں۔ یہ سڑک اور ستارے کہکشانی دنیا کہلاتے ہیں۔ سورج اپنے نو سیاروں کیساتھ اس کہکشانی دنیا میں واقع ہے۔ اس دنیا کے تمام ستاروں کا باہمی فاصلا بھی کم و بیش چار سال نور ہے، لیکن دور دراز فاصلے پر ہونے کے باعث یہ ہمیں نزدیک نزدیک نظر آتے ہیں۔ اس کہکشانی دنیا میں تقریباً ایک کھرب یعنی ایک ہزار کروڑ ستارے ہیں۔ ہر ستارے کے چاروں طرف لامحدود خلا ہے، لیکن مرکز میں ستاروں کے فاصلے تدرے کم ہیں۔ سورج کہکشانی دنیا کے مرکز سے تیس ہزار سال نور کے فاصلے پر ہے اس فاصلے پر رہ کر سورج کو تیرا میل فی سکنڈ کی رفتار سے پورے مدار کا سفر طے کرنے میں بائیس کروڑ پچاس لاکھ سال درکار ہیں۔ اس کہکشانی کائنات کی وسعت تقریباً ایک لاکھ سال نور قطر کا ایک وسیع احاطا ہے۔

کہکشانی دنیا جسے مجمع النجوم کو سحاب یا دیم کہتے ہیں کہکشانی کائنات میں ستاروں کا درمیانی فاصلا نظام شمسی کی وسعت سے کہیں زیادا ہے۔ اس طرح اگر خلا میں اور سحاب ہوں تو ان کا درمیانی فاصلا کہکشانی دنیا کی وسعت سے بہت زیادا ہوگا۔ چنانچہ ہیئت دانوں نے معلوم کیا ہے کہ خلا میں اور بھی سحاب یعنی مجمع النجوم ہیں۔ جن میں بہت سے کہکشانی کائنات سے شابہ ہیں اور انہیں دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان سحابوں کا درمیانی فاصلا تقریباً دس لاکھ سال نور ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ تمام

کرۂ خلا میں ایسے ایسے ان گنت سحاب ہیں، جن کی تعداد اب تک دس کروڑ سحاب دریافت ہو چکی ہیں۔ یہ سحابی اتنے دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں کہ ہلکی روشنی کے بادل سے نظر آتے ہیں دوسرے کائنات کے سب سے دور ستارے کا فاصلہ ہم ہرشل نے تیس لاکھ سال نور بتایا تھا۔ اس کے بعد سحابی جہانوں کا دھواں سا نظر آتا ہے یہ سب انتہائی دوری کے باوجود اس قدر نزدیک نظر آتے ہیں کہ ان کی روشنی کے فقط باہم ملی کر روشنی کے بادل کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ نورانی دھواں شہابی ذرات یا کائناتی شعاعیں ہوتی ہیں۔ سب سے دور سحابی کائنات جسے سو انچ قطر کی دوربین سے دیکھا گیا ہے، پچاس کروڑ سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔

سائنسدانوں نے اندازا لگایا ہے کہ کل مادی کائنات کے خلا کا قطر سات سو دس کھرب سال نور ہے۔ خلا اس احاطے کو کہتے ہیں جس میں چیزیں واقع ہوں، یعنی اوپر کے قطر کا ایک خالی کرا ہے، جس کے اندر تمام کائنات واقع ہے۔

البرٹ آئن شٹائن نے ثابت کیا ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے، یعنی سحابی کائناتوں کے درمیانی فاصلے بڑھ رہے ہیں اور ان فاصلوں کے بڑھنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس اصول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کرۂ خلا اندازے سے کہیں زیادہ بڑا ہے، لیکن اس کے باوجود محمد آئن شٹائن نے یہ بات نہایت واضح دلایل اور ریاضی کے اصول کے مطابق بتائی ہے کہ بہ حال کائنات محدود ہے یہاں کائنات سے مراد وہ تمام خلا ہے جس میں سحاب ستارے اور سیارے واقع ہیں۔ خلا کے نام سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں کچھ نہ ہو اسے خلا کہتے ہیں، لیکن جہاں کچھ نہ ہو وہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔

فی تحقیقات کی رو سے مادا اور قوت ایک ہی چیز کے دو مظہر ہیں یعنی مادے سے قوت پیدا کی جا سکتی ہے اور قوت سے مادا ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ روشنی اور کشش ثقل وغیرا قوت کی قسمیں ہیں جو مادے سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ روشنی اور مقناطیسی کشش اور کشش ثقل وغیرا مادے کی لطیف ترین صورتیں ہیں، جسے ہم خلا کہتے ہیں وہ اصل میں ستاروں کی روشنی، گرمی اور تمام ستاروں کی باہمی کشش ثقل سے پر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلا بھی مادا ہے اور مادا جگہ گھیرتا ہے، جس طرح ستارے اور سیارے خلا میں واقع ہیں، اسی طرح خلا بھی کسی اور خلا میں واقع ہے۔ یہ نیا خلا ابھی تک انسان کے ذہن میں نہیں آیا، کیونکہ آج تک کبھی مادی کائنات کے خلائی جال سیاروں اور ستاروں کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا ہے جس سے وہ قیامت تک نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس ضمن میں ہم جتنا زیادا علم حاصل کرتے ہیں، اتنا ہی زیادا اپنے جاہل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

"تصانیف حضرت جلیل"

امام الفن حضرت جلیل کی تصانیف کا مختصر سا اسٹاک موجود ہے جو کہ ذیل کے پتوں پر حاصل فرما سکتے ہیں۔

۱۔ تاج سخن (دیوان اول) ۲/
۲۔ کلام جلیل (منتخب کلام کا مجموعہ) ۱۲/

کتب فروش صاحبان اور دیگر خواہشمند حضرات کو پانچ یا پانچ سے زائد کتب کی خرید پر ۲۵ فیصد ڈسکونٹ دیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

۱۔ مجتبیٰ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن

۲۔ جمبیل اینڈ کو۔ مسجد چوک حیدرآباد دکن

زبان، حروفِ تہجی اور رسم خط

ہمایون کبیر

لوگوں کے ذہن میں عام طور پر کسی زبان اور اس کے حروفِ تہجی کے باہم تعلق کے بارے میں بہت الجھن پائی جاتی ہے یہ دعوا کیا جاتا ہے کہ کسی خاص زبان کو خاص حروفِ تہجی میں ہی لکھا جا سکتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ نہ صرف حروفِ تہجی، بلکہ رسم خط بھی کسی زبان کا لازمی جز ہے۔ التباس توڑنے سے سوچ بچار کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ زبان حروفِ تہجی اور رسم خط بالکل علحدہ چیزیں ہیں۔ دنیا میں کئی ایسی زبانیں ہیں جن کا نہ کوئی رسم خط ہے اور نہ حروفِ تہجی۔ ہندستان میں کئی قبائلی لوگوں کی زبانیں اس حد تک ترقی یافتہ ہیں کہ وہ شاعرانہ احساسات کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہیں، لیکن ان کے نہ کوئی خاص حروفِ تہجی ہیں اور نہ ہی رسم خط۔ تاریخ کے طالبعلم یہ جانتے ہیں کہ ایک مانے تک انسان کا ثقافتی ورثا محض انسان کی قوتِ حافظہ کی بدولت نسل بہ نسل منتقل ہوتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ کاغذ کی ایجاد اور چھپائی کے فن کے وجود میں آنے کے بعد ہی کتابیں علم کے ذخیرے کا سب سے بڑا وسیلا بنیں۔

زبان زبان کی نشوونما کی شروعات ماں اور بچے کے درمیان ایک دوسرے پر اپنے جذبات واضح کرنے کی کوششوں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ جب ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے یا جھڑکتی ہے اور اسی طرح جب بچا اپنی بھوک یا کسی اور تکلیف کا اظہار کرنے کے لیے شور کرتا ہے، تو ان کا یہ عمل محض ذہنی سطح پر ایک دوسرے تک اپنی رپورٹ پہنچانے تک ہی حدود نہیں ہوتا بلکہ اس کا جذباتی پہلو بھی ہوتا ہے، اور بچے کے شور کرنے میں تقریباً ہمیشہ ایک طرح سے یہ حکم پایا جاتا ہے کہ اس کی تکلیف کو رفع کیا جائے۔ اس ڈھنگ سے بچے کے لیے زبان سے آشنا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے، اسی لیے مادری زبان کو انسان کے جذبات اور خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ مانا گیا ہے۔

اس طرح زبان کی بنیاد انسان کے عمیق ترین جذبات پر مبنی ہے اور دنیا کے بارے میں انسانی تخیل کی وسعت زبان کے دائرے کو وسیع تر بناتی ہے۔ زبان انسان کا سب سے بڑا روحانی اثاثا ہے اور اس کے لیے نہ صرف اپنی روحانی خاصیت کے اظہار، بلکہ اسے وسیع تر بنانے کا ذریعا بھی ہے۔ اگر زبان کی پیدائش اور اس کی خاصیت کے بارے میں اس نظریے کو تسلیم کر لیں تو یہ امر ہمارے لیے مشکل سے ہی سمجھ میں آئے گا کہ زبان انسانی شخصیت کا لازمی جز ہے۔ کوئی شخص لباس، رہائش، رسم و رواج اور یہاں تک کہ عقیدت وغیرہ کی تبدیلی سے بھی وہی شخص رہے گا، لیکن زبان بدل کر وہ شخص نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زبان بدل سکتا ہی نہیں۔ کسی دوسری زبان کو سیکھنے کے باوجود اس کی مادری زبان کے جذباتی پہلو کو دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ کسی زبان کو دبانے کی نہایت ہی تردید قسم کی سرگرمیاں بھی ناکام ثابت ہوئی ہیں، اگر سیاسی دباؤ یا معاشی مجبوریاں کسی زبان کو دبا سکتیں تو پولش زبان کبھی صدیاں پہلے روئے زمین سے مٹ گئی ہوتی۔

حروفِ تہجی زبان کسی فرد کی شخصیت کا لازمی جز ہے، لیکن حروفِ تہجی کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں۔ ایک ہی زبان کو مختلف حروفِ تہجی میں لکھا جا سکتا ہے۔ یونانی حروفِ تہجی، عربی اور سنسکرت کے حروفِ تہجی سے مختلف ہیں، لیکن ایک ہی قوم ان میں سے کسی بھی حروفِ تہجی میں لکھا جا سکتا ہے۔ سنسکرت کے حروفِ تہجی کی برتری اس بات میں ہے کہ ان میں صوتی اصولوں کے مطابق آوازوں کی ترتیب دی گئی ہے، لیکن دوسرے ایسے حروفِ تہجی بھی موجود ہیں، جن کی بنیاد اگرچہ دوسرے اصولوں پر رکھی گئی ہے، لیکن وہ موثر ثابت ہوئے ہیں۔ سنسکرت حروفِ تہجی کے بارے میں یہ دعوا خود ہی طور پر ٹھیک

ہے کہ اس کے ذریعے محاوروں کی ادائیگی زیادہ درست طریقہ سے کی جاسکتی ہے، لیکن اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ آنیہڑی سے کام لیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ مثال کے طور پر سنسکرت کے حروف تہجی میں کوئی ایسا حرف نہیں جو انگریزی کے لفظ ..... میں "اے" کی آواز کو ادا کرسکے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی حروف تہجی چاہے وہ کتنے ہی جامع کیوں نہ ہوں۔ انسانی آواز کی تمام باریکیوں کو ادا نہیں کرسکتے۔

حروف تہجی کا زبان سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے، اگرچہ یہ تعلق اتنا گہرا نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں، لیکن رسم خط کا سلسلہ بالکل الگ ہے اور اس کی کسی بھی حروف تہجی یا زبان سے کوئی نسبت نہیں۔ رومن رسم خط میں جو کئی یورپی زبانوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بڑے چھوٹے حروف کو ظاہر کرنے والی علامتیں، اکثر بالکل مختلف ہوتی ہیں۔

حروف تہجی اور رسم خط

یہ بات حیران کن ہے کہ ہندوستان میں حروف تہجی اور رسم خط کے باہم تعلق کے بارے میں بہت زیادہ الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ سنسکرت کے حروف تہجی تقریباً دو ہزار سال پہلے مکمل ہوئے، لیکن اس کے رسم خط کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک برہمی اور کھروشتی رسم خط ایک ساتھ رائج رہے۔ اس کے اشوک رسم خط، گپتا رسم خط، سرسوتی رسم خط وغیرہ میں ایک سے حروف تہجی استعمال کیے گئے، لیکن ان میں ان حروف کو لکھنے کا ڈھنگ مختلف تھا۔ شمالی ہندستان کی تمام زبانوں نے سنسکرت کے حروف تہجی ورثے میں پائے ہیں، لیکن ان کا رسم خط مختلف ہے۔ جہاں تک حروف تہجی کا تعلق ہے آسامی، بنگالی، ہندی اور اڑیا میں کوئی فرق نہیں، لیکن ان زبانوں کے رسم خط مختلف ہیں، اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ان میں سے کسی بھی رسم خط کا مشترکہ حروف تہجی سے کوئی مقدس رشتہ ہے!

جب رسم خط اور حروف تہجی مختلف چیزیں ہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندستان اور بعض اوقات دوسرے ملکوں میں بھی رسم خط کے سوال پر اتنے جوش و خروش کا مظاہرہ کیوں کیا جاتا ہے۔ بچا اپنی زبان کو ماں کی گود میں ہی سیکھتا ہے، لیکن جب اسکول میں اسے ایک ضابطے میں ڈالا جاتا ہے تو اسے حروف تہجی کی بھی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن رسم خط کو تو بچا اور بھی مشکل سے سیکھتا ہے اور ایک کافی عرصے کے بعد وہ کسی خاص ظاہری علامت اور کسی خاص آواز کی باہم نسبت کو محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زبان کو کسی فرد کی تخصیت کا لازمی جز ہے۔ حروف تہجی کو زبان سے کچھ نسبت ہے اور کچھ حروف تہجی ایسے ہیں جن کے ذریعے مختلف آوازوں کو زیادہ کامیابی سے ادا کیا جاسکتا ہے، لیکن زبان اور رسم خط میں پہلی اور تیسری منزل کی دوسری ہے۔ کسی بھی زبان کو کسی بھی رسم خط میں لکھا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ حروف تہجی میں ضروری آوازیں موجود ہوں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس میں ضروری آوازوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے اور ان کو ظاہر کرنے کے لیے نئی ظاہری علامتیں مقرر کی جاسکتی ہیں یا اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی رسم خط کو ترجیح دینے کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اسے پڑھنے میں کتنی آسانی ہوسکتی ہے اور اسے ہاتھ سے اور مشین کے ذریعے کس حد تک آسانی سے لکھا جاسکتا ہے۔



پنڈت رتن ناتھ سرشار

بیگم انیس قدوائی

"ماسوں گھنا پھوٹے آنکھ" والی مثل تو ہزار بار سنی تھی لیکن اس کا صحیح مفہوم "فسانۂ آزاد" پڑھ کر سمجھ میں آیا۔ اور حضرت اکبر کے شعر کی تشریح اسی سے ہوئی۔

بجھے لگا پیا تو چپ ہو گیا چکارا
بیتاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا

دل میرو دزد ستم صاحب داں وزارا

واقعہ یہ ہے کہ سرشار نے سلطنت اودھ کے ملبے میں سے زور لگا کر سہارا تو قیامت آ گئی تھی۔ سورج بچھ سے طلوع ہو چکا تھا اور اس کی آب و تاب کرنیں ریاست و جاگیرداری کے کھنڈروں اور کونوں کھدروں میں پہنچ رہی تھیں۔ اسی گھر ہوتے تانے بانے کی نزاکت پر شرق و مغرب کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔

جہاں ستان کی پوری پوری دھرتی کی چھاتی پر بھی دہشت چلا اشوب ہو چکے تھے اور فضا میں انھی کی بیٹیوں اور مشنریوں کی گھر گھر آہٹ سے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ مشروع کہ یا جلنے اور تین لوگ والے انگریز کے جلدی جلدی صندوق میں بند ہو رہے تھے اور سونا چاندی، ٹکسالی ٹھوڑیوں سے نکل کر بنک میں پہنچنے لگا تھا۔ اس "نئے دور کی نئے بردی" والے ماحول کے دھندلکے میں سرشار نے آنکھیں کھولیں تو ارد گرد بیمار سماج کے اعلاج مریض ریینگتے ہوئے چل پھر رہے تھے۔ ماضی کی شان و شوکت، حال کا اداس کر دینے والی خامیاں، اور غیروں کی چابک دستیاں کچھ کر لینے کا ان کا دل چاہا کہ بکھرے ہوئے نقوش کو اپنی فنکاری کے [illegible] ایک ورثہ مصور نے اس ٹوٹی ہوئی ہوئی تلوار اور بھوت سوسائٹی اور فضا ہوئی ہوئی شکلوں کو سنوار [illegible] مزین کر کے حیات جاوداں عطا کر دی۔ یہ سارے حاشیوں کی پوٹ ریئسوں کے بھی ہیں اور عقل کل مصاحبین کے بھی۔ ان میں گوالیار کے باکے بھی ہیں اور ہمارے کاچگھٹا کی۔ سرشار کے قلم نے ہیروں کی بھی ہیرا عوام کی اخلاقی تہی دستی، بیگمات کی لن ترانیاں اور توہم پرستی کی چیرا دستیاں اور اودھ کی زبان کا چوہتر قتا کھینچ کر دکھیا ہے۔

اچھا ہی ہوا جو ان کے جی میں یہ بات آ گئی ورنہ اودھ کے آثار قدیمہ والوں کو ہڑپا اور موہن جو دارو کی طرح اودھ کے کھنڈروں میں بھی تہذیب و تمدن کے آثار ڈھونڈنے پڑتے اور پھر بھی سکے اور برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر زیادہ سے زیادہ اودھ کی کڑیا چوڑی اور تیاہو آرائیاں کرنے کی نوبت آ جاتی۔

عشق و عاشقی ہادی شعور ہر زمانے اور ہر دور میں جدا گانہ رہا۔ اقبال تو کہتے ہیں کہ عشق حضرت انسان سے پہلے بھی موجود تھا اور جب پہلا انسان نمودار ہوا تو۔

"خرد نے دیکھ کے دیوانہ کر دیا مجھ کو"

لیکن ہر ملک و ہر زمانے میں عشق کی نوعیت جدا گانہ رہی ہے۔ ایک شیخ سعدی کے زمانے میں یہی ہوا کرتا تھا کہ عشق میں کوئی پڑا تو بارہ برس جوگیوں کی طرح عشق چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک اور جگر مراد آبادی عشق بھی تھا کہ داد اپوتے نے لاکھ چھوا کو پہاڑ کی سے نیچے پٹک دیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری پیاپے تھا ہی ختم ہوا۔

ایک اور ملکوں ملکوں پھرنا ساجھوں کو عشق ہوا تو خوب دنیا چھوڑا مگر ہندستان تو ہمیشہ سے مفکروں کا دیش رہا ہے۔ یہاں دماغ کا قول بھی اکثر و بیشتر سنا ہے۔

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

لیکن سرشار کے زمانے میں عاشقی نری عاشقی ہی نہ تھی۔ دل جلانے کا مشغلہ بھی تھی، اور سوسائٹی، امارت اور ادب پر دھونس جمانے کا ہتیار بھی تھی۔ بلکہ "فسانۂ آزاد" کے ہیرو یہاں آزاد مرزا برباد اسی کی روٹی کھاتے اور اسی کے سہارے جیتے تھے۔ اس عشق بازی کی بدولت ان کے لیے "ہر زمیں کہ رسید آسمان بپیدا است"

کا نقشہ فراہم ہو جاتا تھا۔ حتا کہ ریل، گھوڑے، جہاز سب پر سفر و عشق کے زور سے کیا کرتے تھے۔

سنا ہے ان دنوں نچلے جوانوں کا دستور تھا کہ جھروکوں اور بالاخانوں کے نیچے گشت لگایا کرتے تھے۔ جہاں کوئی کھڑکی ملا ایک فریب نظر پڑی تو ہائے کا نعرہ مار کر دھڑام سے نیچے سڑک پر گر پڑتے۔ راہ چلتے اللہ کے بندے انہیں اٹھاتے دوا میں دارو پیدا کرتے اور وہاں تک کسی بہری یا کتنی کے ذریعے ان کی رسائی کراتے۔ پر دانشمندان حرم عصمت کی تعلیم کیا کیا کرتیں و الفت کی باتیں کرتی تھیں، اور اکثر اپنے زانوں پہ سر رکھ کر لیٹی تھیں، بلکہ سہیلیوں سے بھولیوں تو بالا کر کہا بھی دکھاتیں کہ یہ شیر خالی ہوتی ہیں۔ دونوں ہنستا ہنساتی رہتیں۔ مزے مزے سے کوٹھوں پر آنکھیں اور چٹکیاں لڑا جاتیں۔ شوخ و شنگ عورتیں کہ ذرا سوال جواب ہوتا، کہیں نچلے والوں کے کان پھوٹتے رہتے اور کوشش میں رہتیں کہ بازار میں نہ نکلنے پائے۔ مگر والا کوئی نہ جاتا۔ اچھے دن تھے، میدان جنگ ہو یا محل، ہر جگہ عشق و عاشقی کا چرچا۔ بھلے جانباز میدان جنگ میں بھی نہ چوکتے تھے۔

تمہاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کسی سے دب کے نہ ہم ہائکین میں رہے

حد ہے تو یہ ہے کہ جہادوں میں زنانہ "آزاد" کا ہیرو جان پر کھیل کر مرنے سے تاتل کی گردن میں لٹک جاتا ہے اور زنخا گرہ گیرا اپنے عارض نازکوں کو تختۂ مشق بنانے کے جرم میں قید دائمی کی سزا بھگتنے کے لیے سایہ یار روانہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ میری بات ہے اور بہت سی انہونی باتوں کی طرح یہ بھی ہو جاتی ہے کہ رستم سے تو گرستار لاہ گئے، اور یہ بیناء عزم کا دور چل پڑا، اور محبوب سیم ساق کی نظر میں آزاد کے عارض گلیوں سے ایسے سماں کا دل مضطرب بچوں کی گلی کی طرح اچھل کود کھونے کی تنگ سے الجھ گیا۔ سب کچھ ہوا، مگر کسی نقاد کے کانوں پر جوں نہ رینگی۔ ایک اپنا زمانہ ہے کہ قلم زد اوپچے ہوا اور نوٹس مانگ گھبی۔

بکٹ ہرڈ آئیسٹ اپنے آرٹ میں عدم تحفظ ہے اور ہر زمانے کا ادب اس دور کے حالات و جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سرشار کی تصنیفات سو فیصدی اسی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ وہی افتاد و پراگندگی جو پوری سوسائٹی میں پھیلی ہوئی تھی، صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔ خامیوں سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو سرشار ہمارا سچا شخصیت اور سماج کے ہر گوشہ پر اجاں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں پرانی تہذیب کا ٹھاٹ باٹ گھوم رہا تھا۔ غیر ملکی کے بوجھ سے کچلے کندھے بھی ٹوٹتے محسوس ہو رہے ہوں گے۔ ہم وطنوں کی پست حالی و جہالت پر بھی رہ رہ کر دل کڑھتا تھا، اس لیے وہ آزاد جیسا ہر فن مولا کیرکٹر تلاش کرتے ہیں۔ کبھی اس سے مذہب، سائنس، ہیئت پر تقریریں کرواتے ہیں، اور کبھی سوٹ بوٹ پہنا کر بچے بچے بنڈیلے کی طرح کسم کے کیت میں چھوڑ دیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ سرشار کے فاوسٹ کی طرح دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں ہر گھڑی جوتی پیزار ہوتی رہتی ہے۔ اسی کشمکش کی بدولت وہ حد زندگی بھر تو با پر تو با اور پئے در پئے تو با شکنی کرتے رہے۔ اور اپنے ہیرو میاں آزاد کو بھی کرواتے رہے۔ جب تو با کی اپنے کردار سے شراب خانہ خراب کے خلاف تقریر یا مضمون لکھوا دیا، اور پھر بار بار قول حضرت۔

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بدلوں جو نظر آئے بدلا ہوا میرا نیت ہے

حزمانہ آزاد کے اصل ہیرو یا آزاد اتنے دلچسپ، ناقابل یقین اور اتنے دلآویز ہیں کہ کچھ نہیں آتا۔ انہیں کیا کہیے۔ آزاد صاحب کا تو کوئی اور چھور ہی نہیں۔ کبھی دیکھو تو سوٹ بوٹ پہنے ہوئے سر ایس کھٹیا پر پڑے ہوئے بھٹیاری سے مخول کر رہے ہیں، اور ذرا دیر میں چار جامہ کسا، گھوڑے پر سوار ہو بیگم صاحبہ کے نقل میں سوار ہے اور پھر اللہ اللہ کہہ کر اٹھ پڑے تو ایران و ترکی ہی نہیں ترکی کے میدان جنگ میں پہنچ کر دم لیا۔ دلالی، نظارہ، ہوکا، فریب، شراب خوری کا سب ہیں رنگ ہیں۔ ساتھ ہی شاعر، عزاادار، عالم بے بدل بھی ہیں، تمام علوم جدیدہ سے واقف ہیں، اور فی البدیہہ تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ غرض ہمہ صفت موصوف ہیں۔ ادھر بھی حسن آرا ایسی شتعلیق چال چلتی ہوئی آتی ہیں کہ آپ کی سنجیدگی سے طبیعت بور ہو جاتی ہے۔ مجبوراً مجھے بھی

بے رونق ہیروئن ہے۔ پیدائشی اباجان ٹائپ کی لڑکی ہے، نہ جانے آزاد کا دل اس سے کیسے اٹک گیا۔

"جام سرشار" اور "فسانۂ آزاد" دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جس دن سرشار نے موئے قلم کی جولانیاں دکھانی شروع کی ہوں گی تو ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی ہوگی۔ میں نے تو پہلی بار شاید ۲۳-۱۹۲۲ء میں "فسانۂ آزاد" پڑھا تھا۔ ایک بزرگ نے دونوں کا نوٹنگ دیکھ کر چاروں جلدیں عنایت کر دیں۔ مہینوں پڑھنے اور سننے کا سلسلہ جاری رہا۔ زبان و بیان میں اس کی تھی ہونے لگی۔ محاورے اس کے چسکے۔ اشعار ازبر کیے گئے۔ ظرافت کا مفہوم "فسانۂ آزاد" پڑھ کر سمجھ میں آیا۔ فرہنگ کی مدد سے الفاظ کے معنی یاد کیے گئے اور رفتہ رفتہ ایک ورق تر کیوں نے ہلا کر کھایا، کیونکہ چٹنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ آخر چکے اور اق کسی شتر بلعم نے نذر کر دیے اور ہمارے دماغ میں صرف مرکزی کردار محفوظ رہ گئے۔ میں تو سوچا کرتی تھی کہ حسن آرا جو کتاب کی جان ہے وہ تو بھولی بسری ہو گئی اور اللہ رکھی چلتی دکھتی تھیں میں موجود ہے۔ خوبی اور صاف تکلم پیڑو والے نواب صاحب میں ایسی کون سی خصوصیت ہے جو دماغ سے چپکے رہ گئے۔ آج برسوں بعد پھر ان سے ملاقات ہوئی تو یہ راز کھلا۔

کیا شاندار تصویر اللہ رکھی کی کھینچی ہے۔ سب گنوں میں پوری، کوئی نہ کہو لنڈوری۔ یا کدا منی کا یہ عالم کہ۔

داس چوڑیوں تو فرشتے وضو کریں

کیا مزے سے چھم چھم کرتی ہوئی سرائیں، محفلوں میں اور سڑکوں پر ٹہل رہی ہیں۔ شہسوار، چوڑی والیں والا جس کا دل چاہا ہات پکڑ کر گود میں لے گیا، اور جب موقع ملا دامن چھڑا کر چل دیں۔ فقرے عام کرتی پھرتی ہیں، مگر مصنف بے چارا اپنے آپ کی عفت و عصمت کی قسم کھا رہا ہے۔ بھولے کو یہ عالم ہے کہ آزاد کو دیکھ کر ہی ان کے ہم شکل پر ریجھ جاتی ہیں، اور حیرت ایسی کہ بڑے بڑے دوکھے کھا جاتا ہے۔ عباس سے ہری تو خبر اپنی جگہ ٹھیک ہے۔

نواب ممتاز اور خورشید نما جیسے لوگ بنے بنائے پٹکھل نواب ہیں، اور شہسوار وغیرہ چھٹے ہوئے شہدے۔ سلاروں، فوجی چانڈو باز اور وکیل صاحب سب کیرکٹر ایسے اندر انفرادیت اور دلکشی رکھتے ہیں۔ سپہر آرا بھولی بھالی دلفریب لڑکی ہے، مگر اتنی نئی تو نہیں ہے، نہ اتنی بھولی کہ دھوکے میں شادی کرے، لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ حافظا تو شاید ان دنوں سب ہی کا خراب تھا۔

لیجئے، کیرکٹر تو ایسے عجیب اور فضول سرشار نے تخلیق کیے ہیں کہ خدا نظر اکثر بدنداں" وہ گئی ہوگی اور بعض تو بعض گڑبڑ یا گڈے نظر آتے ہیں۔ ایسے بیدار مغز اور اتنے اعصابی کہیں کھیتے ہی نہیں۔ اب یہی استانی جی کو لیجئے۔ ایسی موقع بے موقع پھبکی تعریف کرتی ہیں کہ جی جل جاتا ہے، ہر جگہ موجود۔ موقع بے موقع دخیل۔ ایک عجیب سا رقیع پوئیٹ کی نواب زادی معلوم ہوتا ہے جو دھڑلے سے ایک ٹیٹھ، زمیندار میں زیر داس کو ٹھاٹ باٹ جمائے ہوئے کوہ جاں بھی ہوئی شکار کھیل رہی ہیں اور خلق یا بھولوں ان کے تبادلے میں سڑ رہے ہیں۔

ان سب مستزاد سرشار کی جد سے بڑھتی ہوئی وطن پرستی ہے۔ بقول شاعر ؎

جو طرف اٹھائیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ ہے

بمبئی ہے تو لکھنؤ، قسطنطنیا ہے تو لکھنؤ، میدان جنگ ہے تو وہاں بھی لکھنؤ کا بول بالا ہے۔ اور دریائے ڈینوب کے اس پار بھی لکھنؤ آباد ہے۔ مصنف کو موقع ملتا تو ہوا کا فرد لکھنؤ بیٹھ ہی نہ سکا۔ "عام [illegible] رشتی زبان، گھیٹے، تراب علی اور جن کے کیرکٹر [illegible] کی تصویریں، ان کا مکالمہ اس دور کی بہترین حالی، اخلاق و عادات کا آئینہ ہیں۔ سب کچھ پڑھ کر ایسا لگتا ہے، عمارت کی بھاگی ہوئی اسٹیٹیں آہستہ آہستہ کھڑی ہو رہی ہیں اور [illegible] ہیں۔ [illegible] ہے۔ [illegible] واز اگر اس

چاہتا ہے۔ اب چت بیٹھ جائے کا خطرہ ہے۔ کسی معیار اور کسوٹی پر نہ پرکھے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ سرشار نے جادو ٹونا، دیو پری، اژدر کھٹولے اور کامل فقیروں کی مدد کے بغیر چلتے پھرتے، جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں ان کی کہانی کا ہر فرد اسی سرزمین سے رزق حاصل کرتا ہے اور اپنے اعمال نیک و بد کا ذمے دار ہے۔

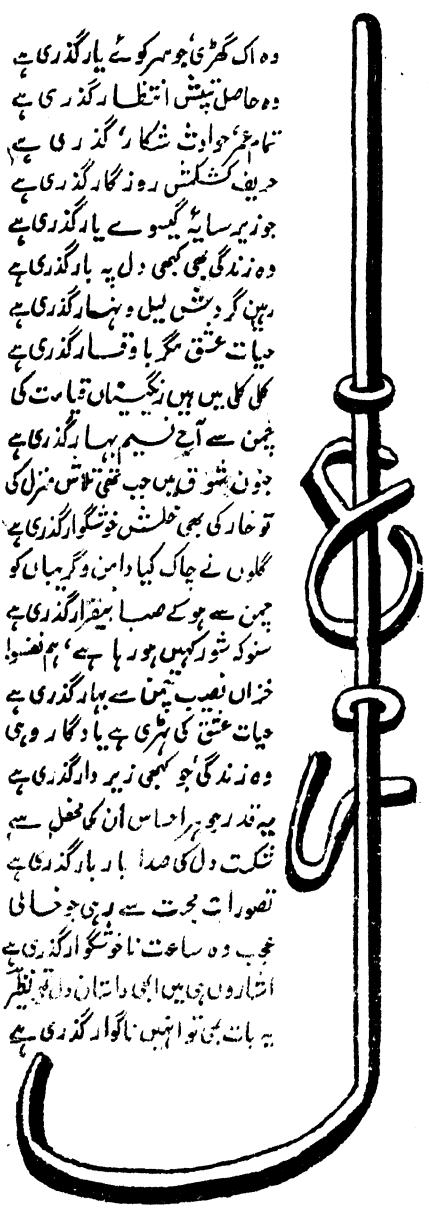
ہم شناسی کی اودھ کی زبان کا تاریخ اور ادب پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ان کے قلم نے لکھنؤ کے انیسیوں، کہاروں اور کھاروں تک کو لافانی بنا دیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ فیر پلاٹ، ترتیب اور نظم کے کہانیاں کیسی کہانیوں کے مجموعے لکھ ڈالے جنہیں ناول کہتے ڈر لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سرشار کو جدید علوم سے بہت دلچسپی تھی، لیکن اخبار نویسی اور ناول نگاری کا پیشہ اختیار کر بیٹھے۔ زبان پر بڑا لکھنؤ میں رکھی جا چکی تھی، لوکریاں بھر بھر کے ہوتی ساری کتاب میں انڈیل دیے، مگر برابر کے چن کر ایک خوبصورت ہار نہ گوندھ سکے۔

پیسا کوڑی کے فضول خرچ تو بہتیرے دیکھے ہیں لیکن ایسا سخی داتا نظر سے نہیں گذرا جس نے اپنے علم و ذہانت کا خزانا لٹا ڈالا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادیب، شاعر اور اہل علم سب عمر کے ساتھ ساتھ گہرے اور پختا ہوتے چلتے ہیں، لیکن یہاں الٹا کمال کو زوال ہوتا گیا۔ اتنا بڑا ذہین و ذی علم انسان "فسانۂ آزاد" اور "جام سرشار" اور "سیر کہسار" کا مصنف ظرافت و خوش طبعی کا ارشاد، زبان و بیان کا گنجینہ جب سارا لٹا پٹا کے تو مشہور "کرم دھرم" اور "پی کہاں" کی بھانسی لگا کر اس نے خودکشی کر لی ہے

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

لیکن سب سے بڑی خوبی تو یہ تھی کہ وہ عناصر کی ظہور ترتیب کے قایل نہ تھے۔ موت سے پہلے ہی انہوں نے ان اجزا کو پریشاں منتشر کر دیا تھا، جس سے حیات انسان کی تعمیر ہوتی ہے اور اپنی ادبی و جسمانی فضول خرچی کی بدولت مفلس و

سعادت نظیر



وہ اک گھڑی جو سر کوئے یار گذری ہے
وہ حاصل تپش انتظار گذری ہے
تمام عمر حوادث شکار گذری ہے
حریف کشمکش روزگار گذری ہے
جو زیر سایۂ گیسوے یار گذری ہے
وہ زندگی بھی کبھی دل پہ بار گذری ہے
رہین گردش لیل و نہار گذری ہے
حیات عشق مگر با وقار گذری ہے
کلی کلی میں ہیں رنگینیاں قیامت کی
چمن سے آج نسیم بہار گذری ہے
جنون شوق میں جب بھی تلاش منزل کی
تو خار کی بھی خلش خوشگوار گذری ہے
گلوں نے چاک کیا دامن و گریباں کو
چمن سے ہو کے صبا بیقرار گذری ہے
سنو کہ شور کہیں ہو رہا ہے، ہم نفسو!
خزاں نصیب چمن سے بہار گذری ہے
حیات عشق کی ہڑبڑی ہے یا دگار وہی
وہ زندگی جو کبھی زیر دار گذری ہے
یہ قدر رہ ہر احساس ان کی محفل سے
شکست دل کی صدا بار بار گذری ہے
تصورات محبت سے رہی جو خالی
عجب وہ ساعت ناخوشگوار گذری ہے
اشاروں ہی میں ابھی داستان دل تھی نظیر
یہ بات بھی تو انہیں ناگوار گذری ہے

ہم سفر

رام لعل

مجھے اسٹیشن پر بہت سے لوگ چھوڑنے کے لیے آئے تھے، بیوی، بچے، والدین، بھائی، بہنیں، دوست اور دوسرے کئی لوگ، جن میں سے کچھ کو تو میں جانتا بھی نہیں تھا، ہو سکتا ہے اپنی ملازمت کے طفیل انجانے میں مجھ سے کبھی ان کی خدمت ہو گئی ہو۔ بہرحال ان سب نے مجھے پھولوں سے لاد دیا اتنے زیادہ پھولوں سے کہ میں ان کا بوجھ یقیناً محسوس کرنے لگا تھا، لیکن ان کی عقیدت کے اتنے بڑے مظاہرے کے سامنے مجھے گاڑی چھوٹنے تک گاڑی کے دروازے میں کھڑا رہنا پڑا، مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ منزل پر پہنچتے ہی سب کو خط لکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے گاڑی چھوٹنے سے ایک آدھ منٹ پہلے کسی نے کہہ دیا، یہ ڈبا رستے میں کٹ جائے گا۔ یہ انکشاف میرے اور میرے دوستوں کے نزدیک ایک بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کوئی اسٹیشن اسٹاف سے تصدیق کرنے کے لیے لپکا، کوئی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں سے پوچھنے لگا۔ میں بھی گھبرایا، اتنے سارے سامان کے ساتھ رستے میں کہاں مارا مارا پھروں گا، لیکن شکر ہے کہ اسی وقت کوئی یہ خوشخبری لے کر آ گیا کہ میرا ڈبا رستے میں نہیں کٹے گا، میرے کمپارٹمنٹ میں الجی تک صرف ایک ہی مسافر تھا۔ برتھ چار تھے۔ جب گاڑی روانا ہوئی اور میں سب کی طرف ہاتھ لہرا کر پلٹا تو اپنے ہم سفر کو ایک برتھ پر اطمینان سے کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ میرا خیال تھا وہ میرا شاندار فیئرویل دیکھ کر میری طرف ضرور متاثر اور مرعوب نظروں سے دیکھ رہا ہوگا، لیکن خیر!

میں نے پھولوں کے ڈھیر سارے پھول اتار کر اپنے برتھ پر رکھ دیے، اور انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگا، ان گنت رنگ تھے اور کئی طرح کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے پھول تھے۔ ایسے پھول پیش کرنے والوں سے میں کتنی بار لڑا ہوں گا، الجھا ہوں گا۔ انہیں سخت سست کہا ہوگا، ان کے کئی کام پورے نہیں کیے ہوں گے۔ وہ بھی مجھ سے ناراض اور نالاں رہے ہوں گے، لیکن آج کا دن کتنی مسرتوں اور حسرتوں کا دن تھا۔ کاش میں کسی سے لڑا نہ ہوتا۔ اگر ابھی اسی وقت میں لوٹ جاؤں، میرا تبادلہ سوچ ہو جائے۔ میں ایسی محبت بھری دنیا چھوڑ کر اتنی دور کیوں جا رہا تھا۔ جانے اجنبی شہر میں مجھے پھر اتنی محبت کرنے والے ساتھی ملیں نہ ملیں۔ میں نے پھولوں کے ڈھیر کو پھر چھوا۔ ان کی خوشبو کو ناک کے ذریعے اندر لے جا کر جیسے اپنی روح میں اتار لیا، اور پھر جی چاہا رات بھر ان پھولوں سے لپٹ کر سویا رہوں، اگر میں کمپارٹمنٹ میں تنہا ہوتا تو سچ مچ ایسا ہی کرتا، لیکن وہاں ایک ہم سفر! میں نے ہم سفر کی طرف دیکھا اور دل پر ایک ہلکا سا صدمہ محسوس کیا کہ اس نے ابھی تک میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسی طرح قلم ہلانے میں مصروف تھا۔ دبلا پتلا، چھوٹا قد، کرتا پاجامہ اور جواہر جیکٹ پہنے، کم عمر، لیکن ہلکی ہلکی داڑھی مونچھ اگائے اور سر کے بال بہت سنوارے جیسے کوئی بہت بڑا افلاطور ہو۔ اور گرد و پیش سے بیخبر ہی بنا ہو۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس روک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں ملازمت کے گذشتہ بیس سال گذارے تھے، وہ مقام تیزی سے پیچھے ـــــ بہت پیچھے سرکتا جا رہا تھا۔ میرے حلق میں جیسے کوئی چیز آ کر اٹک گئی۔ آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک سکتے تھے، لیکن میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے ہم سفر سے اس لیے مخاطب ہوا کہ کمپارٹمنٹ کا تکلیف دہ خاموشی بہرصورت ٹوٹنی چاہیے تھی۔ معاف کیجیے ـــــ یہ ڈبا رستے میں کٹے گا تو نہیں؟ میں نے اس کی طرف دیکھا انتظار کیا۔ ہونٹ بھینچے، تلملایا، لیکن وہ خاموش رہا۔ نگاہ بھی نہ اٹھائی۔ اسی طرح قلم ہلانے میں مصروف رہا، جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر سوچا ممکن ہے اونچا سنتا ہو! معاف کیجیے گا ـــــ آپ کہاں تک جائیں گے؟ اس نے ابھی تک برتھ پر بستر ہی نہیں بچھایا تھا۔

ایک کونے میں اس کا لوہے کا ٹرنک، ایک اٹیچی اور بند ہولڈال پڑا ہوتا، لیکن اس نے میرے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں نے خود کو بہت ہی ہیچ محسوس کیا، بہت ہی کمتر۔ اس نے میری توہین کی تھی، میرا دل غصے اور نفرت سے بھر گیا۔ اپنا سوٹ کیس کھول کر رات کا لباس پہننے لگا۔ کھڑکیوں کے شٹر بند کیے۔ چھت پر دو پنکھے تھے۔ ایک چل رہا تھا، دوسرا بند تھا۔ جو چل رہا تھا اس کا رخ میرے ہم سفر کی طرف تھا۔ میں نے بند پنکھے کو اون کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں چلا، شاید خراب تھا۔ میں نے پنکھے کو ادھر ادھر ہلایا۔ گھمایا، لیکن وہ بند ہی رہا۔ میری جھلاہٹ کچھ بڑھ گئی۔ چاہا پنکھے کو توڑ کر باہر پھینک دوں۔ پھر میری نگاہ مع خطرے کی زنجیر کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے لپک کر زنجیر کھینچ لی۔ فرسٹ کلاس کا کرایا دے کر بھی پنکھے کا سکھ نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

گاڑی ہی رک گئی، لیکن میرا ہم سفر بالکل نہ جھکا۔ میں دانتوں کے جبڑے کو سختی سے دبائے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر دیکھا۔ اندھیرے میں انجن کی طرف سے ایک فائرمن اور گارڈ کے آخری سرے کی طرف سے گارڈ ہاتھ میں لیمپ اٹھائے چلے آرہے تھے۔ کیا ہوا سر؟ میں نے انہیں بند پنکھا دکھایا اور شکایت کرنے کی دھمکی دی۔ گارڈ نے بھی پنکھے کو چلانے کی کوشش کی۔ پھر ہار کر معذرت کرتے ہوئے بولا ـــــ اگلے بڑے اسٹیشن پر اسے ٹھیک کرا دیا جائے گا۔ تھوڑی دیر کی زحمت اور گوارا فرمایئے ـــ میرا غصہ تو فرو نہیں ہوا تھا، لیکن اب رہتے ہیں کیا بھی کیا جا سکتا تھا، ناچار گاڑی کو آگے بڑھنے دیا۔ اپنے برتھ پر واپس آیا تو ہم سفر کو اسی طرح لکھنے میں مصروف پایا۔ اسے کیا پروا ہو سکتی تھی؟ اس کی طرف تو پنکھا چل رہا تھا۔ چند منٹ تک بے حس و حرکت بیٹھا رہنے کے بعد میں نے اچانک اٹھ کر چلتا ہوا پنکھا اپنی طرف گھما لیا۔ سوچا، اس نے کچھ کہا، تو معذرت کر لوں گا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوا کا رخ میری طرف ہوا بھی تھا، لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا، اور پنکھا میری طرف ہوا پھینکتا رہا۔ اس بات کی مجھے ندامت بھی تھی۔ تھوڑی دیر ہوا کھانے کے بعد جب پنکھے کا رخ پھر اس کی طرف گھما دیا تب بھی اس کے منہ سے شکریے کا ایک لفظ سننے کو نہیں ملا۔ میں نے پھولوں کے ہار ایک ایک کر کے کھونٹی پر لٹکا دیے۔ سارا کمپارٹمنٹ خوشبو سے بھر ہوا تھا، میں نے آئیس بکس میں رکھی ہوئی بیر کی بوتل نکالی۔ میرے پاس گلاس دو تھے، لیکن ہم سفر کی لاپروائی کے پیش نظر اپنے سامنے ایک ہی گلاس رکھا اور دھیرے دھیرے پینے لگا۔ بیر کی خوشبو نے بھی اسے متاثر نہ کیا۔ وہ اسی طرح مست اور بے خبر بیٹھا لکھنا رہا۔ میری جھلاہٹ اب حیرانی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نمونہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ہو سکتا ہے بلکل ہی بہرا ہو، لیکن دیکھ تو سکتا تھا! اس نے میری کونسی حرکت نہیں دیکھی تھی، اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ ایک بار بیت الخلا میں بھی گیا تھا، لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اس نے میری طرف بلکل توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے ایسے ہم سفر کی موجودگی سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ اگلے اسٹاپ پر گاڑی رکی تو گارڈ اپنے ساتھ ایک بجلی کیتلی کو لے کر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ اس کمپارٹمنٹ میں کسی اور کے لیے برتھ ریزرو نہیں ہے۔ گارڈ نے اپنے چارٹ دیکھ کر بتایا۔ ایک خاتون کے لیے ہیں سے ریزرو ہے۔ یہ سن کر میں بہت خفا ہوا۔ میرا پنکھا بھلے ہی ٹھیک نہ ہوتا، لیکن مجھے ایک ایسے ہم سفر کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ باتیں کرتا رہے، دو تین باتیں ہی۔ میں اس خاتمی سے سخت گھبرایا ہوا تھا جو پچھلے دو گھنٹے سے میرے ڈبے پر طاری تھی۔

لیکن میری بدقسمتی کہ وہاں سے نیا مسافر سوار نہ ہوا۔ گاڑی چل دی، میں اپنے بستر پر بہت بے دلی سے لیٹ گیا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا، کبھی اس کروٹ۔ کبھی ٹانگیں اٹھا کر کھڑکی کے اوپر رکھ دیتا۔ کبھی خدکھڑکی کھول کر باہر جھک جاتا۔ سخت بے چینی کی کیفیت میں سفر کٹ رہا تھا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ساڑھے دس بج گئے تھے۔ صبح پانچ بجے گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ ڈبا، کہیں سویا رہا تو کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ گارڈ کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ اپنے ہم سفر سے ایسی توقع کرنا فضول تھا۔ مزید آدھ گھنٹا میں نے صبح کے باسی اخبار اور ایک ہفتہ وار پڑھنے میں گذار کر سونے کا فیصلا کر لیا۔ بتی آف کرنے کے لیے اٹھا، تو دیکھ گیا وہ ابھی تک قلم چلانے میں مصروف تھا۔ میں نے کہا۔ اگر

آپ اجازت دیں تو لائیٹ آف کر دوں۔ یہ پوچھ کر میں خشی بھی ہوا کہ اگر اس نے انکار بھی کر دیا تو میں بدخشی سر تسلیم خم کر دوں گا۔ میں چاہتا تھا وہ کسی طرح ایک بار اپنے لب وا کرے، لیکن خوب کی بات کہ اس نے میری طرف بس ایک لمحے کے لیے گھور کر اپنے برتھ کے ساتھ لگی ہوئی بیڈ لائیٹ روشن کر لی۔ جس سے روشنی صرف اسی پر پڑ سکتی تھی اور وہ میرے آرام میں خلل ڈالے بغیر لکھ پڑھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ چبا کر لائیٹ آف کر دی۔ اور لیٹ گیا۔ وہ اپنی ننھی اور دھندلی روشنی میں بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا کمپارٹمنٹ کی ہر چیز دھندلی اور پراسرار نظر آنے لگی تھی میں بند کھڑکی کے بند شیشے پر لیٹے لیٹے باہر جھانکنے لگا۔ جیسے کوئی بچا سوتے سوتے ماں کا جسم ٹٹولنے لگتا ہے۔ اور پھر میں نہ جانے کب سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اسے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے پایا۔ وہی اپنی آس پاس بکھری ہوئی کتابیں اور کاپیاں۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر دیکھا روشنی پھیل چکی تھی ــــ گھبرا کر پوچھا کیا دلی گذر گیا؟ یہ سن کر اس نے مجھے گھورا۔ حیرانی سے گھورا۔ مجھے فوراً احساس ہوا۔ میں نے پھر اپنی بے وقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایسے لاپروا شخص کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن خلاف توقع وہ مسکرا دیا۔ اور کہنے لگا۔ دلی تو آنے والا ہے۔ کیا آپ دلی جائیں گے؟ اسے اپنے ساتھ ہمکلام ہوتا دیکھ کر مجھے بے حد خشی ہوئی۔ اگر چہ ایک لمحے کے لیے جی میں یہ بھی آئی کہ اسے جواب نہ دوں۔ اب میں بھی ویسا ہی روپا اختیار کروں جو اس نے میرے تئیں شب بھر اختیار کیے رکھا تھا۔ لیکن میں نے جلدی جلدی اپنا بستر سمیٹتے ہوئے اس سے کہا ــــ جی نہیں! مجھے مراد آباد جانا ہے۔ دلی پہنچتے ہی مراد آباد کی گاڑی مل جاتی ہے۔ اچھا وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی اور سر کے بال سنوار رہا تھا۔ اس کے ساتھ بات کرنے کی خشی سے میرے جذبات امنڈ آئے تھے۔ میں نے اس سے شکایت کرنے میں دیر نہ لگائی۔ کل سے آپ نے میری طرف جو بے توجہی برتی ہے۔ اس کا مجھے سخت رنج ہے۔! یہ سن کر وہ مجھے گھورنے لگا۔ بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دیکھا، جو بعد میں مسکرا دیں۔ اس نے برتھ پر سے ایک بڑی کاپی اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، کیا کہا آپ نے، میں نے آپ کی طرف بے توجہی برتی؟

میں نے کاپی میں دیکھا ساری کاپی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویروں سے بھری پڑی تھی۔ جو میری تھیں۔ میری۔ ہر نوع میں، ہر زاویے میں، ہر کیفیت کی، غصا، بے چینی، جھنجلاہٹ، سرور، بھوؤں پر جھکا ہوا، پنکھے کے ساتھ الجھتا ہوا، اور رات کے دھندلکے میں بس کھڑکی کے شیشے پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا ہوا۔ جیسے کوئی بچا نیند میں ــــ!

اعلیٰ اور نفیس قسم کے برقی سامان کا اہم مرکز

اے۔ ٹی الیکٹریکل اسٹورس

شہور شہور کمپنیوں کا ہر قسم کا برقی سامان ہمارے ہاں موجود ہے، جو آپ کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

ہر قسم کا برقی سامان نہایت ہی واجبی دام پر سپلائی کیا جاتا ہے۔

الکٹریکل وائیرنگ کا کام تجربہ کار انجنیر کی نگرانی میں ماہر وائیرمینوں کے ذریعہ انجام دلایا جاتا ہے۔

ہمارا فرم ایک عرصہ سے آندھرا پردیش میں پبلک کی خدمات نہایت ہی احسن طریقے پر انجام دے رہا ہے۔ آزمائش شرط ہے صرف ایکبار ہماری خدمات حاصل کیجئے اور نیول کے پتہ پر تشریف لائیے یا لکھکر معلومات حاصل کیجئے۔

جنرل منیجر و اڈوائیزر

اے۔ ٹی الیکٹریکل اسٹورس (دیجلر کوارٹرس)

معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔

غذا (خوراک)

منظور الحق ہاشمی بی۔ اے

ایک کتابچہ میں نے جنوری ۱۹۴۸ء میں مفید، کارآمد اور مرغوب معلومات "ہماری غذا" کے نام سے شایع کیا تھا، جسے بہت پڑھی، سمجھی گئی، اور خوش اسلوبی کے ساتھ مرغوب اور مقبول بنانے میں بتایا گیا تھا کہ کون کون سی سبزیاں، اور پھل، فروٹ کہاں تک ہمارے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ اور ہم اپنی غذا کس طرح تیار اور استعمال کریں، تاکہ وہ ہمارے جسم کو اور ہم اس کے ذریعے طاقت، صحت اور تندرستی حاصل کر سکیں۔ اس کتابچے کے مضامین کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ باب اول میں سبزیوں کا ذکر تھا۔ ان کے کھانے پکانے کے طریقے بتائے گئے تھے۔ باب دوم میں پھلوں کا ذکر تھا۔ پھلوں کے فائدے تھے۔ ان کی غذائی اور شفائی اہمیت پوری دستی طرح کی گئی تھی۔ باب سوم میں غذا کا ذکر تھا، اور کھانے پینے کے متعلق ضروری اصول و قواعد بتائے گئے تھے۔ قیام صحت کے لیے چند اغذیا کے نام، اور ان کی دو زانا کی مقدار دیں، مرکبات تھیں۔ نیز وٹامن۔ ان کے نام، فائدے، اور ان اشیا کا ذکر تھا جن میں وٹامن پائے جاتے ہیں۔ اسی جا کے اندر ایک نقشہ بھی دیا گیا تھا جس میں مختلف اغذیا کے حصص کی مقدار دکھائی گئی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میرے اس کتابچے کو خریدار اصحاب اور دوستوں نے بہت پسند کیا تھا۔ آج اتفاق سے مکرمی منظور الحق ہاشمی بی۔ اے کا لکھا ہوا مضمون "غذا" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جسے پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے چاہا کہ اس قسم کے عمدہ مضامین کی جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے کی جائے، تاکہ عوام کالانعام ان مضامین کو پڑھ کر فائدہ اٹھا سکے، چنانچہ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کر دھا ہوں، جسے پڑھ کر آپ ضرور محظوظ ہوں گے۔ (جگت منگی)

سب سے پہلے اس ایشور، پرماتما اور مالک کل کا ہمیں تہ دل سے شکر گذار ہونا چاہیے، جس نے ہمیں ایک خوبصورت اور مضبوط جسم عطا فرمایا ہے، یعنی انسانی چولا بخشا، پھر اس جسم کی طاقت برقرار رکھنے کے لیے طرح طرح کی چیزیں مہیا کیں۔ روٹی پکانے کے لیے گیہوں، جوار اور مکئی وغیرہ پیدا کیں۔ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے طرح طرح کی دالیں، ماش، مسور، مونگ اور مٹر وغیرہ پیدا کیں۔ قسم قسم کی ترکاریاں، شلغم، گوبھی، کدو، ٹماٹر، بھانت بھانت کے ساگ وغیرہ بھی پیدا کیے۔ پلاؤ وغیرہ کے لیے چنوا، چاول اگائے۔ یہ تمام غذائیں بہت اہم کام انجام دیتی ہیں، جس طرح موٹر بغیر پٹرول کے نہیں چلتی، ریل کا انجن بغیر کوئلے اور پانی کے نہیں چلتا، اسی طرح ایک انسان بغیر غذا کے کام نہیں کر سکتا۔ اگر کھانا نہ ملے تو طبیعت ستانے لگتی ہے نہ اٹھنے کو جی چاہتا ہے، نہ چلنے کو اور نہ کسی کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ موٹر اور انجن اپنی غذائیں پا کر بڑتے نہیں، لیکن انسان کا جسم دن بدن بڑھتا جاتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ کوئی وقت تھا کہ تم گدے پر بیٹھے انگوٹھا چوستے تھے، اٹھ نہیں سکتے تھے، دودھ پی کر ذرا تگڑے ہوئے، اٹھنے لگے، پھر گھٹنوں کے بل چلنے لگے۔ پھر دوڑنے کے قابل ہوئے۔ اب تم مدرسے جانے لگے ہو، پھر کبھی جوان ہو جاؤ گے۔ گویا یہ غذا تمہارے جسم کی پرورش کے لیے ضروری ہے۔ ایک اور لحاظ سے انسان کا جسم مشینوں سے مختلف ہے۔ موٹر کا ٹائر گھس گیا اسے رنماں پھینکا، دوسرا نیا چڑھا دیا۔ بیٹری خراب ہو گئی اسے بدل دیا۔ نئی لگا

دی، لیکن انسان کے جسم کے اعضا کبھی بدلے نہیں جاتے اگر کسی عضو میں خرابی پیدا ہو جائے تو یہی اغذیہ اور ادویہ اس خرابی کو دور کرتے ہیں۔ اور پھر اسے صحت مند بنا دیتی ہیں۔ کان میں درد ہو تو اسے کاٹ کر نہیں پھینک دیتے، بلکہ اس کان کو درست کرنے مناسب دوائیں اور غذائیں دی جاتی ہیں، اور وہ کان اچھا ہو جاتا ہے۔ پس اس مالک کل کی رحمت ہے کہ ہماری پرورش، صحت اور توانائی کے لیے بے شمار چیزیں ہمیں عطا کر رکھی ہیں۔ لہذا غذا سے متعلق یہ تین اہم باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

۱۔ غذا سے انسان کے جسم کو گرمی اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ غذا سے انسان کا جسم بڑھتا ہے اور نشوونما پاتا ہے۔

۳۔ بیماری کی وجہ سے اگر کسی حصے جسم میں خرابی پیدا ہو جائے تو غذا اس کا علاج کر کے اسے درست کرتی ہے، مگر غذا ایسی نہ ہو اور نہ اتنی کہ تم اس کے استعمال سے اتنے موٹے ہو جاؤ کہ چلنا دشوار ہو جائے، رکشا میں بیٹھو تو رکشا والے کا دم نکل جائے۔ ٹانگہ میں بیٹھو تو ٹانگا اوالا رہو جائے، ذرا چلیں یا زینے پر چلیں تو ہانپنے لگیں۔ یاد رہے ایسا موٹاپا ایک گونا عذاب ہوا کرتا ہے، پس اگر موٹاپے سے بچنا چاہتے ہو تو غیر مناسب غذاؤں کا استعمال ہرگز نہ کرو، اور روزانہ ورزش کیا کرو۔ برعکس اس کے بعض لوگوں کو تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ اتنے کمزور اور دبلے پتلے ہیں کہ پھونک مارنے سے اڑ جائیں وہ ذرا سا بھی کام کریں تو تھک جاتے ہیں۔ بیٹھ کر اٹھتے ہیں تو سر چکرانے لگتا ہے۔ خدانخواستہ ذرا سی ٹھنڈی ہوا لگ جائے تو زکام بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی قسم کی بیماریاں انہیں گھیرے رکھتی ہیں۔ ایسے حالات میں ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ خدا کرے ہم ہر بلا سے محفوظ رہیں اور خوب تندرست و توانا رہیں تاکہ ہمارا ملک چین اور امن کا گہوارا بن جائے۔ مگر نہ رہے کہ ہماری یہ چاہ جب ہی پوری ہو سکتی ہے، جبکہ ہم غیر مناسب غذاؤں کا استعمال ترک کر دیں گے۔ یہی تو ہے جسمانی خرابی کی اصل وجہ یہی غیر مناسب غذائیں ہیں۔

وہ غذائیں جو انسان کو صحت مند رکھتی ہیں

چربی غذاؤں کی کئی قسمیں ہیں۔ غذاؤں کی پہلی قسم وہ ہے جو جسم کو حرارت پہنچاتی ہے۔ جس طرح موٹر کے لیے پٹرول اور انجن کے لیے کوئلے کی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی جسم کو ایسی غذاؤں کی ضرورت ہے جو حرارت پہنچانے والی ہوں۔ حرارت پہنچانے والی غذاؤں میں چربی والی اشیا ہیں۔ ان غذاؤں میں کاربن پایا جاتا ہے جو جل کر حرارت مہیا کرتا ہے۔ ان غذاؤں میں گوشت کی چربی، دودھ، مکھن، بالائی، تل، سرسوں اور مونگ پھلی کا تیل شامل ہیں۔ اور ان کا استعمال کرنا گوشت میں اضافا کرتا ہے۔ ان روغن دار غذاؤں کو مناسب مقدار میں استعمال کرنا چاہیے، اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے رہے تو بہت زیادہ موٹے ہو جاؤ گے اور وہ موٹاپا تمہارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ سوائے چارپائی پر پڑے رہنے کے تم سے کوئی کام نہ ہو سکے گا۔

(۲) کاربوہائیڈریٹ غذاؤں کی دوسری قسم کاربوہائیڈریٹ کہلاتی ہے، اس قسم میں شکر اور نشاستا شامل ہیں۔ نشاستا جب جسم میں داخل ہوتا ہے تو شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور یہ شکر جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ شکر والی غذاؤں میں شکر، گڑ، شہد اور پھلوں کا رس ہے جو جسم کو براہ راست شکر مہیا کرتا ہے۔ نشاستے والی غذاؤں میں چاول، آلو، ساگودانا، جوار، باجرا، دال، موٹی، گاجر۔ ان غذاؤں کے استعمال سے گوشت بڑھتا ہے۔

(۳) پروٹین عمارت کو بنانے کے لیے جس طرح اینٹ اور گارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کو بنانے کے لیے پروٹین ضروری ہے۔ پروٹین والی غذاؤں میں کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن شامل ہیں ان تین چیزوں کے علاوہ ان غذاؤں میں گندک اور فاسفورس بھی موجود رہتا ہے۔ پروٹین سب سے زیادہ انڈا، مچھلی، گوشت اور پنیر میں پایا جاتا ہے۔

ان غذاؤں کے استعمال کرنے سے ہڈیاں بڑھتی اور مضبوط

ہوتی ہیں۔ اناجوں، ترکاریوں اور میووں میں بھی پروٹین پایا جاتا ہے، مگر ان میں پروٹین کی مقدار کم ہوتی ہے، اس پروٹین کو جو ترکاریوں اور اناجوں میں پایا جاتا ہے اسے حیوانی پروٹین کہتے ہیں۔ حیوانی پروٹین جلد ہضم ہو جاتا ہے، اور زیادہ مفید ہوتا ہے۔ بچوں کو مضبوط اور تندرست بنانے کے لیے حیوانی پروٹین کا استعمال بہت ضروری ہے۔

(۴) نمک پروٹین کی طرح نمک بھی جسم کو مضبوط بناتا ہے، نمک کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک نمک وہ ہے جسے تم روزانہ استعمال کرتے ہو۔ یہ نمک سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کیلشیم دھات کا نمک ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے، یہ نمک سبزیوں اور پتوں میں پایا جاتا ہے، لوہے کے نمک سے خون میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نمک ٹماٹر، سیب امرود میں کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت سمندروں اور پھلوں اور ترکاریوں میں بھی بھری پڑی ہے یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے۔

(۵) حیاتین۔ وٹیمن غذائیں صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں۔ تازا غذائیں اگر استعمال نہ کی جائیں تو آدمی ایک قسم کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نام اسقربوط ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے جسم کے جوڑوں میں درد ہونے لگتا ہے۔

پرانے زمانے میں سیاح بڑے لمبے سفر کئی کئی مہینوں تک کرتے رہتے تھے، ان بیچاروں کو تازا غذائیں کہاں مل سکتی تھیں۔ مہینوں کا اسٹاک جمع کر کے رکھ لیا کرتے تھے، اور اسی اسٹاک کو استعمال کرتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اسقربوط کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور بیماری ہے جسے انگریزی میں بری بری کہتے ہیں۔ یہ بیماری ان لوگوں کو ہو جاتی ہے، جو پالش کیا ہوا چاول کھاتے ہیں، اور چاول کی پیچ نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ تجربات سے معلوم ہوا کہ چاول کے اوپری حصے میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو صحت کے لیے بہت مفید ہے، اور جس کے نکل جانے سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ تازا ترکاریوں میں بھی کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو باسی ترکاریوں میں ضایع ہو جاتی ہیں، یا بہت زیادہ پکانے اور بھوننے سے بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان اجزا کا نام حیاتین (وٹیمن) قرار پایا۔ اس سلسلے میں جن ڈاکٹروں نے تجربات ان میں سے دو مشہور نام یہ ہیں۔ ایک کا نام ہاپ کنز اور دوسرے کا نام ڈاکٹر نک ہے۔

حیاتین کیا ہوتے ہیں

تمہیں اب معلوم ہو گیا کہ حیاتین یا وٹیمن دو چیزیں ہیں جو نظر تو نہیں آتیں، مگر پھلوں، ترکاریوں، دودھ، انڈا، پھل وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، اور انسان کی صحت کے لیے بہت ضروری ہیں، اگر وہ چیزیں نہ ملیں تو انسان بیمار پڑ جائے۔ وٹیمن یوں تو بہت سی قسموں کے ہوتے ہیں، مگر ان میں چار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

وٹیمن۔ اے بچوں کی نشو و نما کے لیے وٹیمن اے بہت ضروری ہے، اگر یہ وٹیمن نہ ملے تو پھیپھڑوں، آنتوں اور آنکھوں کے بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی چیزیں خرید کر استعمال کرو جن میں وٹیمن اے پایا جاتا ہے وٹیمن اے والی چیزیں یہ ہیں۔ انڈا، دودھ، مچھلی، گردے، کلیجی، اصلی گھی، مکھن، گاجر، شکر قند، پالک، شلجم، مولی کے پتے اور پودینا۔ اب سوچو کہ کتنی مفید چیزوں سے تو تم نفرت کرتے ہو اور کتنی فضول چیزیں ہضم کر جاتے ہو، اچھا اب ان چیزوں کے نام بھی سن لو جو تم استعمال کرتے ہو، مگر وٹیمن، اے، ان میں ہوتا ہی نہیں، یہ چیزیں ہیں، بناسپتی گھی، سوکھی گھاس کھانے والے مویشیوں کا دودھ، بناسپتی گھی کے اشتہارات پڑھ کر اب تمہیں ہنسی آئے گی، اور معلوم ہو گا کہ دنیا کس قدر جھوٹ بولتی ہے۔ جھوٹ بولنے والے لوگ تمہاری صحت کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور خدا کے عذاب سے بالکل نہیں ڈرتے۔

وٹیمن بی یہ وٹیمن اگر نہ ملے تو جسم کے جوڑوں میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور آدمی مرض اسقربوط یا بری بری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اگر وٹیمن بی والی چیزیں

استعمال کرتا رہے تو اعصاب میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور صحت ٹھیک رہتی ہے۔ وٹیمن بی کی نعمت اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں رکھی ہے گیہوں کا آٹا، مٹر پھلی، ٹماٹر، سیم، دودھ، انڈا، یعنی اوپر جتنی چیزیں گیہوں اور چاول کا ہوا چاول بہت پسند ہوگا، اور وہ روٹی بھی بہت پسند ہوگی جس میں بھوسی بلکل نہ ہو، مگر سنو، پالش کیا ہوا چاول اور بھوسی نکالا ہوا آٹا وٹیمن بی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر واقعی وٹیمن بی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو بہت زیادہ چھنا ہوا آٹا مت استعمال کرو اور چاول کی بیچ نکال کر مت پھینکو۔

وٹیمن - سی یہ وٹیمن بھی تمہارے لیے بہت ضروری ہے اگر وٹیمن سی نہ ملے تو ہاتھ پاؤں میں سوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ مسوڑے خراب ہو جاتے ہیں ان سے خون آنے لگتا ہے۔ وٹیمن سی سبزیوں اور پھلوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ پالک، ٹماٹر، کچی گاجر، موسمی، لیموں اگلے ہوئے چنے اور مٹر وٹیمن سی کی دولت اپنے اندر رکھتے ہیں، انہیں تم خوب کھاؤ۔ طاقت آئے گی، لیکن یاد رکھو کچی حالت میں کھانا بہت مفید ہوگا، اگر تم نے ابالا تو سمجھو کہ وٹیمن سی سے ہاتھ دو بیٹھے۔

وٹیمن - ڈی ذرا اپنی ہڈیوں کو ٹٹول کر دیکھو چوڑی اور مضبوط ہڈیاں ہیں یا پتلی پتلی اور کمزور۔ اگر کمزور ہیں تو انہیں مضبوط کس طرح بنایا جائے ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لیے وٹیمن ڈی بہت ضروری ہے اگر یہ وٹیمن بچوں کو نہ ملے تو سوکھے کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وٹیمن ان چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ انڈا، دودھ، مکھن، مچھلی کا تیل۔

غریب لڑکے سوچتے ہوں گے کہ وٹیمن ڈی تو صرف ان ہی چیزوں میں پایا جاتا ہے، جن کا خریدنا اور کھانا کوئی آسان بات نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بھی ایک نہایت سستا اور آسان ذریعہ مہیا کر دیا ہے، جب سورج نکلے تو بدن میں تیل لگا کر ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھ جاؤ۔ وٹیمن ڈی کی تمام برکتیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی، کیوں ہے نا سستا نسخہ!

وٹیمن - ای ۔ یہ وٹیمن زیادہ تر انڈے اور بادام میں پایا جاتا ہے



کل نصف شب کی تیرگیوں میں ترا خیال
ماضی کے پھول کنج قفس میں سجا گیا
جس پر ٹھٹک گیا تھا مرا دل، ترا جمال
حالات کا وہ موڑ مجھے یاد آ گیا

احمد

کتنی لطیف تھی تری آنکھوں کی روشنی
کتنی بسیط تھی مرے جذبات کی فضا
اتنا حواس گیر تھا وہ لمحۂ جمیل
تیرے بغیر پوری خدائی میں کچھ نہ تھا

نادم

برسوں کے بعد آج بھی اے شمع زندگی
تو میری دوست بھی ہے مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر۔ میرا فسانہ، مری زباں
تو میرا فن بھی ہے، مرا موضوع فن بھی ہے

قاسمی

جب بھی میں اپنے ذہن سے چھوتا ہوں نیرا جسم
مٹھی میں دیکھتا ہوں طنابیں حیات کی
ہو قفل کی کراہ، کہ زنجیر کی پکار
کڑیاں ہیں اک شکستہ و درماندہ رات کی

سوویت یونین میں ٹیگور کے خواب کی تعبیر

ترون چٹرجی

ٹیگور کا "یونیورسٹی" "وشوابھارتی" کے اغراض و مقاصد میں ایک شق یہ بھی ہے۔

"مشرق و مغرب کے درمیان مشترک برادری کی کوشش اور اس کا حصول اور پھر اس کے ذریعے عالمی امن کی بنیادوں کا استحکام۔"

اسی مقصد کے پیش نظر راینڈرناتھ ٹیگور نے ۱۹۳۰ء میں سوویت حکومت کی دعوت قبول کی۔

"..... اگر میں اس ملک کو جانے کا دعوت نامہ قبول نہ کرتا جہاں زبردست تاریخی قربانی کی جارہی تھی تو یہ ناقابل معافی جرم ہوتا" ٹیگور نے لکھا۔

۱۲ ستمبر کو "ووکس" (غیر ملکوں سے رابطہ قایم کرنے والی انجمن) کے استقبالیہ میں انجمن کے صدر پروفیسر فرن۔ پیتروف نے کہا۔ "جناب! آپ کا نام پورے روس میں مشہور ہے۔ اور آپ سے پورا ملک محبت کرتا ہے۔ آپ کی تصانیف کی پچیس جلدیں اسوقت ہمارے یہاں موجود ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں ان کو پڑھتے ہیں۔ عظیم شاعر کے لیے یہ ایک پرمسرت انکشاف تھا۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد وہ اس ملک کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، لیکن یہ ملک ان سے اچھی طرح واقف تھا۔

اور ٹیگور نے جواب میں کہا۔

"میں اس ملک میں سیکھنے آیا ہوں..... کہ آپ اس ملک میں عالمی تہذیب کے مسئلے کو کس طرح حل کر رہے ہیں۔ نئی تہذیب کے ماتحت انسان کی شخصیت پنجرے میں مقید پرندگی باقی سماج سے اس کا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ آپ نے اپنے ملک میں اس برائی کی جڑ کاٹ دی ہے..... آپ کے خیالات میرے ان خلیوں کی طرح ہیں جو میں فرد کی بھرپور زندگی کے متعلق دیکھتا رہتا ہوں..... آپ فرد کو تخلیقی شخصیت عطا کر رہے ہیں۔ اس طرح آپ انسانیت کا سب سے بڑا اور بلند ترین مقصد پورا کر رہے ہیں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ آپ انسانی دماغ کے ڈھکے چھپے جوہروں کو منظر عام پر آنے کا موقع دے رہے ہیں....."

ٹیگور کا یہ بیان اس جھوٹ کی تردید کرتا ہے کہ سوویت یونین میں انفرادی آزادی نہیں ہے۔

جس طرح ٹیگور کو سوویت یونین کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی پیاس تھی اسی طرح سوویت عوام کو بھی ہندستان کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا اشتیاق تھا۔ سوویت عوام کے اس اشتیاق کا ذکر ٹیگور نے اس طرح کیا ہے۔

"ماسکو میں میری تصویروں کی نمایش ہوئی۔ یہ کہنا فضول ہے کہ تصویریں غیر معمولی ہیں۔ وہ صرف غیر ملکی ہی نہیں بلکہ ان پر کسی ملک کی چھاپ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی شائقین کا زبردست ہجوم تھا!"

جب انہوں نے پائنیر کیمپوں اول کے بچوں سے باتیں کیں، جب وہ کسانوں کے مرکزی ایوان میں گئے، جب انہوں نے سائنسدانوں اور طالب علموں سے باتیں کیں تو یہی صحت مند اشتیاق ٹیگور نے سوویت یونین کے ابھرتے ہوئے سماج کی مختلف شاخوں میں دیکھا۔ انہوں نے سوویت سماج کے متعلق اپنی رائے کا مختصر طور سے یوں اظہار کیا ہے۔

"ہر جگہ مجھے انسان کا ذہن بیدار نظر آیا جو خودداری سے پیدا ہونے والی مسرت سے سرشار ہے۔ ہندستانی مزدور کی تو بات ہی الگ ہے۔ سوویت مزدور اور برطانوی مزدور کے درمیان بھی کافی فرق ہے۔ ہم جو کچھ صرف اپنے "شانتی نکیتن" میں کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ پورے ملک میں کر رہے ہیں۔"

"اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے اس کا یقین کبھی نہ آتا کہ کروڑوں انسانوں کو ان پڑھ پن اور ذلت کے گھور اندھیرے سے نکال کر صرف ان کو فرض شناس ہی نہیں بنایا گیا ہے بلکہ ان کو وہ

عزت بھی دی گئی ہے جس کا ہر انسان مستحق ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی قوم ہی کی طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ دوسری قومیتوں کا بھی خیال کرتے ہیں۔ مذہبی لوگ ان کو مذہب کا دشمن کہتے ہیں۔ کیا مذہب مقدس کتابوں اور نعمتوں تک محدود ہے؟ کیا عوام کو روٹی دینے اور بسانے والے خدا سے کوئی واسطہ رکھتے ہیں؟

یہ ہمارے ٹیگور کا جواب ان لوگوں کے لیے جو سوویت یونین کا مذہب دشمنی کا پرچار کرتے ہیں۔

سوویت یونین سے اپنے چھوٹے خط میں انہوں نے لکھا ہے۔

"یہ لوگ تین چیزوں میں بہت مصروف ہیں، تعلیم، زراعت اور مشین... لیکن اگر مشین چلانے والا ہی انسان کہلانے کا مستحق نہ ہو تو مشین بے کار ہے۔ یہاں کے لوگ زمین اور ذہن دونوں کو سنوار رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ تعلیم کا تعلق زندگی سے ہونا چاہیے۔ آپ تعلیم کو عملی زندگی سے الگ کر دیں تو تعلیم کو ٹھڑی میں جکڑ دیں گے۔ اس کو غذا کی طرح کبھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔"

سوویت نظام تعلیم نے، خصوصاً نئی اصلاحات نے ٹیگور کے نظریوں کی تصدیق کی۔

جنگ کے بعد آج تک سامراجی طاقتوں کی جو ڈپلومیسی رہی ہے، انہوں نے ادارۂ اقوام متحدہ میں جو رول ادا کیا ہے، جنرل عام غارت گری کے ہتھیاروں سے دست بردار ہونے سے جان چرائی ہے، اور تخفیف اسلحہ سے بچنے کے لیے کنائی کاٹی ہے اس کو دیکھ کر ٹیگور کی بصیرت کا خیال آجاتا ہے۔ انہوں نے روسی سے خطوط" میں لکھا ہے۔

"مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ ان لوگوں نے انجمن اقوام میں تخفیف اسلحہ کا مسئلہ پیش کر کے چھوٹے اور دوسروں کو حیران کر دیا تھا۔ سوویت عوام وحشیانہ طاقت کے مشتاق نہیں ہیں۔ وہ پورے عوام کی تعلیم صحت اور زندگی کا معیار بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کو سب سے زیادہ دلچسپی امن کی ضرورت ہے، لیکن انجمن اقوام کے مداری غنڈا گردی کی زبردست تیاریوں کو روکنا نہیں چاہتے، حالانکہ ایک آواز سے نعرا لگاتے ہیں کہ وہ امن چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سامراجی ملک میں زرعی پیداوار کے مقابلے میں اسلحے کے پرخار جنگل کہیں زیادہ ہیں۔

آج ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ سوویت عوام ٹیگور کی سویں سالگرہ منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو ان کے بڑے دوست سوویت عوام ٹیگور کو امن اور عالمی دوستی کا شاعر سمجھتے ہیں۔



نیلوفر ناہید

مہ و انجم و کہکشاں یاد آئے
محبت کے رنگیں نشاں یاد آئے
وہیں چشم حسرت نے موتی لٹائے
خدا کی قسم تم جہاں یاد آئے
کبھی باغباں نے جلایا تھا جن کو
وہ جلتے ہوئے آشیاں یاد آئے
وہیں ہم نے سجدے لٹائے ہیں اکثر
جہاں اس قدم کے نشاں یاد آئے
محبت میں برباد غم ہو گئے جب
تمہیں آج ہم مہرباں یاد آئے
ملا تھا نہ جب تک ترا آستانہ
ہزاروں ہیں آستاں یاد آئے
یہ ہستی کی شام اور یہ صبح قیامت
وہ یاد آئے بھی تو کہاں یاد آئے
جو دیکھا کبھی چاک دامن گل کو
مجھے اپنے زخم نہاں یاد آئے
جو ہم منزل دل میں ناہید پہنچے
غم و درد کے کارواں یاد آئے

آندھرا پردیش میں

بہت سے پروجکٹ مکمل ہو چکے ہیں جن سے نئے نئے علاقے سیراب ہو رہے ہیں جو پہلے آبپاشی سے محروم تھے۔ ان میں کرشنا بارج پروجکٹ، گنجدرا کی بجلی سطح کی نہر اپر پینار پروجکٹ، روپیرو اسیکم اور الاپاڑ جیسے پروجکٹ شامل ہیں۔ عظیم ناگارجن ساگر پروجکٹ کی تعمیر بالکلیہ آندھرائی انجینیروں کی نگرانی میں جاری ہے۔

ہر سال چار سو دیہات میں برقی قوت مہیا کی جا رہی ہے۔

کوئلے کی پیداوار جو ۱۹۵۶ء میں ۷۰ ملین ٹن تھی، اب سالانہ ۱ و ۲ ملین ٹن تک پہنچ گئی ہے۔

چار نئے میڈیکل کالج، دو نئے انجینیرنگ کالج اور بہت سے دوسرے فنی ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ اجتماعی ترقیات کی تحریک شاندار رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔

اور رسالہ آندھرا پردیش میں، جو ریاست کے ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ کی جانب سے ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے آپ ان ترقیوں کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں جو اس رسالے کے مضامین اور تصویروں میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ماہانہ رسالہ تین زبانوں انگریزی، تلگو اور اردو میں ایک ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کی برائے نام قیمت (۱۸) نئے پیسے فی پرچہ یا (۲) روپے سولہ (۱۶) نئے پیسے سالانہ ہے۔ محکمۂ نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش، حیدرآباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

بنگلا زبان

(ایک تاریخی جائزہ)

الطاف گوہر

میں شہروں کے ہنگاموں سے دور مشرقی بنگال کے ایک نیم جزیرہ گاؤں کھنکھا پور میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں شام کے نرم اور گداز رنگوں میں دھان کے کھیت لہراتے، ہلکی پھلکی کشتیاں جنہیں مقامی بولی میں "یک ملاحی" کہتے ہیں، لمبے کھیتوں میں اوپر سے اوپر نکل جاتیں، دھان کے سبک پودے ایک لمحے کے لیے اپنی آغوش وا کرتے اور جوں ہی کشتیاں بڑھ جاتیں، وہ خلا کو پر کرنے کے لیے پھر ابھر آتے۔ کبھی کبھی کھال میں بجرے والے یہ گاتے ہوئے آتے۔

"امو ہا آسی پولاں یاں
گگا آشیرے پانچ پایں"

اللہ تعالیٰ نگہبان

اور پھر ایک ساتھ "بدر بدر" کہتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ شام کے سائے کشتی بانوں کے آبنوسی جسموں سے لپٹ گئے، وہ اپنی اپنی کشتیوں میں جھک کر دھان کے پالے سے دھوکر تے اور ڈولتی کشتیوں میں نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ گھر پہنچ کر یہ اپنے معصوم بچوں کو یہ لوریاں گا کر سلاتے۔

چھیلے گھمائی لو، پاڑا جڑائی لو
بسو دکی ایلو ما پیٹے
بلی تے دھان کھائے چے لو
کھا جاؤ یہ کتے!
رانی پوائی دو یان بھائی لو
آجا ما بوکی؟
ارے کو ٹا مان صابر کہاں
ریشی بنائی چے!

سو گئے بچے، سو گئے گاؤں
دیس میں برگی آئے۔
پنکھ پکھیرو کہاں گئے سب کچے
کوئی کہاں سے لائے۔
دھان بھی نے گے پان ہوئے گے
لے گئے جو بھی آئے۔
اور کوئی دن صبر کرو
فصل نئی آجائے۔

ان میں کوئی کہن جانی بڑا تھا، کوئی "روحل میاں" تھا، ہر ایک یادگار تھا، اس تمدن کا جس کا آغاز افغانوں کے دور میں ہوا اور مغل حکمرانوں کے زمانے میں پھلا پھولا، چند صدیوں سے ظلم و ستم نے اس تمدن کے قریب قریب سارے نقوش مٹا ڈالے، اور جو کچھ باقی تھا پہچانا نہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ گمان ہوتا تھا یہ گاؤں شاید خانخانان معظم خان کی یادگار ہو، جسے سو برس صدی میں اکبر اعظم نے بنگال کا گورنر مقرر کر کے بھیجا تھا جہاں کہیں سپرد خاک کیا گیا، اور مکھن جانی بدا، شاید خان جہاں مرزا کی عظمت کا رہین منت ہے۔ یہ ہلکی ہلکی یک ملاحی کشتیاں شام کی افسردگی میں، اسی تمدن کے گورستان کے کتبوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اس ماحول میں مجھے یہ خیال آیا کہ ان یادگاروں سے اس تمدن کا مطالعہ کرنا چاہیے، جس کی بنگال میں مسلمانوں کی چھ صدیوں کی حکومت کے دوران میں نشو و نما ہوئی۔ اس مطالعے کا ایک پہلو بنگالی مسلمانوں کی زبان کا تاریخی ہے۔ اس مضمون میں اسی پہلو پر موجودہ مقامی اور معاشرتی مسایل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اس تمدن کا آغاز آج سے سات سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب خلجیوں نے بہار میں اپنا اقتدار قایم کیا اور بنگال فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قطب الدین، شاہ ولی اللہ، اور محمد بختیار خلجی نے صلیبی یورپ کا بیشتر حصہ اسپین میں ہے اور یورپ مشرقی پاکستان کو صلیبی کشتیوں میں فتح کر لیا۔ اور گوڑ کو، جو بعد میں لکھنوتی کہلاتا تھا، اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس زمانے میں بنگال میں تبلیغ اسلام کی تحریک شروع ہوئی۔ بنگال میں جتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کا تناسب برصغیر کے دوسرے علاقوں سے بہت زیادہ رہا۔ تحریک اسلام کے آغاز سے بنگال کے مختلف علاقوں میں ایک نئی معاشرت کی ابتدا ہوئی۔ افغانوں اور خلجی

کی سرپرستی میں چھ سو سال تک اس نئی معاشرت کی نشوونما ہوتی رہی۔ بنگال کے یہ سات سیاسی ہنگاموں اور افراتفری کے عالم میں گذرے، اور ان ہی ہنگاموں میں نئی معاشرت بنگال کے صاحب اقتدار طبقے کے تمدن سے برسرپیکار رہی۔ مسجدیں مکتب، مدرسے، تعمیر ہوتے رہے۔ سترھویں صدی کے آخر تک فارسی اور عربی کی تعلیم کے یہ سرکاری بنگال کے کونے کونے میں قایم ہو چکے تھے۔ یہ مدرسے، یہ مکتب آج بھی مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں موجود ہیں۔ انہیں ضلعوں میں گھومتے پھرتے، ایک سیاحی کشتیوں میں کمال اور دریا عبور کرتے، کشتی بانوں کے گیت سنتے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ وہ کلچر، وہ تمدن، وہ زبان کیا ہوگی جس کے آثار یہاں کے گیتوں، ناموں، رسموں، اور طریقوں میں موجود ہیں۔ سات سال تک فارسی بنگال میں عدالتی زبان رہی۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک بنگال میں فارسی علم و ادب کی زبان بن چکی تھی۔ ان حالات میں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ بنگال میں اس معاشرت نے اپنے اظہار کے لیے اپنی کوئی زبان نہ ڈھونڈی ہو۔ سب اس معاشرت سے ہندستان کے ہر حصے میں بول چال کی ایک نئی زبان پیدا ہوئی تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ بنگال جو اس معاشرت کا سب سے حریص خواستگار تھا، اس سے نا آشنا رہا؟

جدید تحقیق کے مطابق انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے بنگالا ادب کا سرمایا بہت ہی محدود تھا۔ اس وقت تک کاشی داس کی "مہابھارت" اور رام پرساد کے گیتوں کے علاوا کوئی بھی بنگالی کتاب شایع نہ ہوئی تھی۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بنگالی زبان جس شکل میں آج کل رایج ہے اس کا ادب ڈیڑھ سو سال پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ عام لوگوں کی بولی آجکل کی بنگلا سے بہت مختلف تھی۔ عام لوگ خصوصاً مسلمان پنڈتوں اور ان کی بنگلا زبان، جو دراصل سنسکرت ہی کا ایک ارتقائی صورت تھی، سے نفرت کرتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ چند پنڈتوں کے علاوا جو سنسکرت کے عالم تھے بنگلا زبان اور ادب سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس زمانے میں فارسی شاہکار علم و ادب کا کمال تصور کیے جاتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگلا اور سنسکرت ختم ہو رہی تھیں۔ اور ایک نئی معاشرتی زبان تکمیل پانے کو تھی۔ اس زمانے میں عیسائی مبلغوں اور سری رام پور مشن کے پنڈتوں نے ایک مردہ زبان کو پھر سے زندہ کرنے کا فیصلا کیا۔ اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے فایدا اٹھا کر اس نئی معاشرتی زبان کو پھر ڈالا جو دراصل بنگال کے مسلمانوں کی زبان تھی۔ اس تحریک کی وضاحت پروفیسر ڈے کی کتاب "انیسویں صدی کا بنگلا ادب" کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے۔

> "وہ وقت آ رہا تھا جب بنگلا سرکاری اور پبلک دونوں طرح سے عوام کی زبان بننے والی تھی۔ پادری ہیڈلے اور فارسٹر، بنگال کے اولین مغربی مصنفوں نے اس بات پر زور دیا کہ فارسی کو پرائمری اور ہاٹ بازار کی زبان بنانے رکھنا بے معنی بات ہے اور لازم ہے کہ اس زبان کی جگہ بنگلا زبان کا پرچار کیا جائے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال کی نئی معاشرتی زبان زیادہ تر عدالتوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ ہاٹ بازاروں اور گھروں کی روزمرہ بھی اسی سے تھی۔ یہی وہ معاشرتی زبان تھی جسے دبانے اور معاشرے سے خارج کرنے کے لیے عیسائی مبلغوں اور برہمنوں نے ایک بھرپور انتقامی تحریک چلائی۔ انیسویں صدی کا سارا بنگالی ادب جو جدید ادب سمجھا جاتا ہے عیسائی مبلغوں کا مرہون احسان ہے۔ ان مبلغوں میں سب سے اہم نام ہنری ولیم کیری کا ہے۔ جس نے سری رام مشن کی بنیاد رکھی۔ بنگلا گرائمر کا مطالعا کیا، اسے سائنٹفک نظر سے ترتیب دیا اور سب سے پہلا بنگلا کا چھاپے خانا قایم کیا۔ ولیم کیری کے ساتھیوں پنڈتوں نے اس بات کا پرچار شروع کیا کہ بنگال کی صحیح ورثا اس وقت تک نہیں سیکھی جا سکتی جب تک سنسکرت پر پوری قدرت حاصل نہ کر لی جائے۔ اس زمانے کی سب سے اہم اور مستند کتاب رام باسو کی "پرتاپ دتو" ہے جس کا انداز اور اسلوب فارسی سوانح نگاری سے مستعار تھا۔ اس کتاب میں جابجا

ایسے جملے ملتے ہیں "بادشاہ ایر خدام پل بندی کریا راستہ نمودا کری ہین ـــــ جے کالے دلی ایر تخت ہایون بادشاہ چھیلو مکھان سلیمان چھیلو، کیول بنگاو بہار ایر نواب"۔

سر ام باسو فورٹ ولیم کالج کا پنڈت تھا۔ اسے فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ یہ شخص رام موہن رائے کا ساتھی تھا اور ان دونوں مصنفین کی پہلی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ بنگال میں اسلامی معاشرت کے زیر اثر جو زبان پیدا ہوئی وہ اٹھارویں صدی کے وسط تک علمی اور ادبی زبان بن چکی تھی۔ سری رام پور شن والوں کے ان دونوں مصنفین کی کتابوں خصوصاً "پرتاپ دتو" پر جو ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی بڑی ہی بیدردی سے تنقید کی اور یہ کہا کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اسی زبان سے سنکرت کلچر جو دراصل بنگال کی روح ہے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے گا۔

پروفیسر ہی اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کی زبان سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی زبان کو اس زمانے میں کس قدر بے جا فوقیت حاصل تھی اور کس حد تک فارسی نے بنگلا کو مسخ کر دیا تھا"۔

اس بات کا پروفیسر ڈے بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس زمانے میں عوام کی بول چال کی ایک نئی زبان پیدا ہو چکی تھی۔ اور خود ولیم کیری نے مختلف طبقوں کے لوگوں کے جو مکالمے لکھے ہیں ان کی زبان میں کہیں کہیں ابتدائی زمانے کی ہندستانی کی جھلک نظر آتی ہے۔ عیسائی مبلغوں کی تحریک کا جو اثر ہوا وہ اس سے ظاہر ہے کہ رام موہن رائے اور رام باسو نے اپنی دوسری کتابیں خالص بنگلا میں لکھیں۔ جن میں فارسی اور عربی کے عنصر مفقود ہیں۔

علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ اس زمانہ کے اخبارات کی زبان بھی وہی مخلوط معاشرتی زبان تھی جو فارسی اور عربی کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی۔ ابتدائی بنگلا ادب اور اخبارات کا تذکرہ کرتے ہوئے جیمس لانگ لکھتے ہیں۔

"اخبارات کی زبان فارسی اور بنگلا کا امتزاج تھی اور اس کی وجہ وہ قبیح اسلامی اثر تھا جس سے ہندستان کی کوئی بھی سنسکرت زبان محفوظ نہ رہ سکا"۔

اس زمانے کے لوک گیتوں، کہانیوں اور دوہروں کی زبان بھی بہت حد تک وہی تھی معاشرتی زبان ہے جسے عیسائی مبلغوں اور برہمنوں نے "پاک اور اسلام زدا کہہ کر بدنام کیا۔ کوی رتن کی ایک "پنڈی" کے دو بند ہیں۔

شہر سلیما راج پتا نے ساجن راج
ہو تھے ہیو کی گوپی نالہ
تیار تعلقے باتھی دامن نالی چاشنی
نباش پریش پہر سات

۱۸۰۸ء کی ایک عدالتی درخواست یوں شروع ہوتی ہے۔

"شری رام غریب نواز سلامت، قاعدہ داری کہ بوں تا ہار دوئی گوم دیا شکی ہوئیا چھے"۔

اس دور کی زبان کے متعلق پروفیسر ڈے کا یہ خیال غور ہے "ایک طرف سنکرت اور دوسری طرف فارسی کے زیر اثر ایک متوازن معاشرتی زبان عیسائی مبلغوں اور خسرتا پرست برہمنوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئی"۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں بنگلا زبان پر جو گذری اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر گریرسن لکھتے ہیں۔ "اس دور کی بنگلا سے زیادہ اصل بنگلا الفاظ کو زبان سے خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ سنسکرت کے لفظوں نے لے لی"۔

یہ دور وہ رجحان ہے جس کی ابتدا عیسائی مبلغوں سے ہوئی اور انتہا بنکم چندر چٹرجی کے زمانے میں اس رجحان کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب "بنگلا زبان کا آغاز اور نشو و نما" میں لکھا ہے۔

"بنگلا زبان کو سنسکرتی بنانے کا رجحان سترہویں صدی کے وسط ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن جب فورٹ ولیم کے پنڈتوں نے نثر میں لکھنا شروع کیا تو سنسکرت کے غیر مانوس لفظوں کا

بنگلا الفاظ سے جوڑتے چلا جانا اسلوب تحریر قرار پایا۔"

بنگال کی معاشرتی زبان اور سنسکرتی بنگلا کی کشمکش انیسویں صدی کے وسط تک پورے زوروں سے جاری رہی اور آخر کار انگریزوں اور ہندوؤں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے معاشرتی زبان کو دب جانا پڑا۔ اسی زمانے میں معاشرتی زبان کی ترویج کے لیے چاٹگام کے علاقے میں ایک اہم قدم اٹھایا گیا۔ مسلمانوں نے اپنی معاشرت کے تحفظ کے خیال سے اپنی معاشرتی زبان کو عربی رسم خط میں لکھنا شروع کر دیا۔ ایک مصرعے سے دو مصرعے درج ہیں۔

آپ آتش خاک باد اجزای مقام
من کی یا شو تو بھی جانو جنی نام

پانی، آگ، زمین، ہوا، ہیں یہ چار مقام
دل سے سن تو یہیں کہہ دوں ان ساروں کے نام

فارسی اور عربی الفاظ عوام کی زندگی میں ایک مستقل جگہ حاصل کر چکے تھے۔ دیوانی اور مالیا کی عدالتوں میں فارسی الفاظ آج بھی بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً قاضی، امین، فوجدار، وغیرہ اسلامی لفظوں سے جو لفظ زبان زد خلق ہوئے وہ اب تک رایج ہیں۔ تیر، کمان، تخت، قفل، قلعا، برج، ہزاری، فتح مورچا اور ایسے کئی لفظ روزمرا میں شامل ہیں۔ مذہب کے زیر اثر، قلم، قرآن، بہشت، دوزخ، جہنم، گناہ، ثواب، پاک، پیر، پیغمبر، خدا، خدمت، سلوک، تدارک، تدبیر، کتاب، حج، سنت، حرام، حلال، نماز، اور اسی قسم کے سیکڑوں الفاظ بنگال کے ہر حصے میں عام بول چال کا جز بن گئے ہیں۔ راے بہادر یوگیش چندر راے ودیا نیدھی کی بنگلا لغت میں ۵۴۰ فارسی زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس سے اندازا ہو سکتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے جب بنگالی مسلمانوں کی معاشرتی زبان اپنے کمال پر تھی تو عام بول چال میں فارسی اور عربی الفاظ کی تعداد کیا ہوگی۔ ہرو سوندھو چودھری کی کتاب "رعیت ارکتھا" میں ۷۵۸ الفاظ میں سے ۱۸ الفاظ فارسی کے ہیں۔ اس معاشرتی زبان پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر ڈے لکھتے ہیں۔

"ایک طرف فارسی اور دوسری طرف سنسکرت کے زیر اثر ایک متوازی زبان پیدا ہو رہی تھی جو اپنے گرد و پیش کا مزاج اور توانائی لیے ہوئے تھی۔ ابتدا میں جب بنگلا کی کتابیں لکھی جانے لگیں اسوقت اردو اور فارسی ہاٹ، بازار اور عدالت کی زبانیں تھیں اور یہ زبان بچے صرف اسکول ہی میں نہیں پڑھتے تھے۔ عام بول چال میں بھی فارسی الفاظ کا استعمال بے حد وسیع تھا۔"

مسلمانوں نے اپنی معاشرتی زبان کو بچانے کی کوششیں کیں، مگر وہ تحریک جس کی ابتدا عیسائی مشنریوں نے کی اور انتہا سنکر چندر ودیاساگر کے دور میں ہوئی۔ اس معاشرتی زبان کو دبا کر اس پر ایک خیر مانوس سنسکرتی بنگلا مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہی وہ بھاشا ہے جس کے متعلق پروفیسر گریرسن لکھتے ہیں۔

"انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں کے بنگلا سے زیادا کریہہ المنظر کوئی چیز تصور نہیں کی جا سکتی، نوے فی صدی سے زیادا الفاظ کو زبان سے خارج کرنے کے بعد سنسکرت کے لفظوں کو ان کی جگہ ٹھونس دیا گیا ہے۔"

اس رجحان کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب "بنگلا زبان کی ابتدا اور نشو و نما" میں لکھا ہے۔

"بنگلا زبان کو سنسکرتی بنانے کا رجحان سترہویں صدی کے وسط ہی سے شروع ہو گیا تھا، مگر جب سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کی لڑیوں کو بنگلا الفاظ سے پرو کے چلے جانا اسلوب تحریر پر پڑا، یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معاشرتی زبان جس کی نشو و نما میں چھ سو سال صرف ہوئے ناموافق حالات میں معدوم کیونکر ہو گئی، ہندستانی کو بھی ہندوستان کے ہر حصے میں ایسے ہی ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ بدستور اپنا مقام سنبھالے رہی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ بنگال کے لوگوں نے مسلمانوں کے دور حکومت میں ایک بھرپور معاشرتی زبان نے اپنی ساری روایات سمیٹ کر ایک مردانہ زبان کا لبادا اوڑھ لیا۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ بنگال کی تاریخ کے

یہ چھ سو سال سیاسی بحران، ہنگاموں، سازشوں، اور غیر یقینی حالات کا مرقع تھے۔ اس لیے وہ معاشرت جو مغلوں کے عہد میں ہندستان کے دوسرے علاقوں میں بڑی اور پھولی، پھلی، بنگال میں خصوصاً ان دریائی علاقوں میں جن کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان میں شامل ہے، پوری طرح سے پنپ نہ سکی۔ بنگال کے مسلمان حکمران ہمیشہ ہی کوشش کرتے رہے کہ دلی سے نکل کر خود مختار اور مطلق العنان حکومت قایم کریں۔ ان چھ سو سالوں میں بیسیوں مرتبہ ایسا ہوا کہ شہنشاہ دلی نے اپنے کسی قابل اعتماد جرنیل کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا، مگر وہ اس سرزمین میں پہنچتے ہی وہ شاہ بنگال بننے کا خواب دیکھنے لگا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بنگال کے بیشتر گورنر صف اول کے مغلوں میں سے نہ تھے۔ ان سے پہلے افغان اپنی جاگیروں کا انتظام ہندوؤں ہی سے کرواتے، یوں بھی افغانوں کی حکومت کا نظام بہت ہی محدود تھا۔ ایک قلعے پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ دوسرے علاقے چھوٹے چھوٹے نایبین میں بانٹ دیتے۔ اس لیے افغانوں کے زمانے میں کوئی ایسے مستقل معاشرتی مراکز قایم نہ ہو سکے جہاں سے نئے معاشرتی رجحانات کو باقاعدہ تقویت پہنچتی رہتی۔ جوں جوں سیاسی حالات بگڑتے گئے، اہل علم و فن کا بنگال میں آنا بند ہو گیا۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد بنگال ایک بار پھر خود مختار ہو گیا، اور اس عہد کے بعد کے عالا درجے کے ترک، افغان اور عرب اہل علم و ہنر نے بنگال کی طرف بہت کم رجوع کیا اور ان کی جگہ ہندوؤں نے لی جو فارسی زبان پر پوری دسترس رکھتے تھے یہی ہندو مغلوں کے آخری دور میں نئی معاشرت کے نمایندے بن گئے اور جب سنسکرت کی طرف رجحان بڑا تو ان لوگوں نے فارسی کو چھوڑ کر سنسکرت کو اپنا لیا۔ رام باسو اور راجا رام موہن رائے جن کا ذکر میں نے کسی قدر تفصیل سے کیا تھا، وہی لوگ تھے جو عمر بھر فارسی اور عربی کا دامن سنبھالے رہے، مگر برہمو تحریک کے شروع ہوتے ہی اپنی ساری روایات کو چھوڑ کر سنسکرت زبان کو اپنانے پر مجبور ہو گئے۔

بنگال خصوصاً مشرقی بنگال کے دریائی علاقوں کی آب ہوا اور جغرافیائی صورت حال بھی مغلوں کو راس نہ آئی۔ اس وجہ سے معاشرتی روایات اداروں کی صورت اختیار نہ کر سکیں اور نہ ان روایات کو پوری سرپرستی میسر ہوئی۔ مغربی بنگال کے بیشتر صوبوں میں مسلمان آج بھی بڑی آسانی سے ہندستانی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مغل حکمران مغربی بنگال کی بہ نسبت زیادہ آسودہ حالات میں رہے اور معاشرتی روایات کی سرپرستی کی طرف کسی قدر زیادہ متوجہ ہو سکے۔

بہرحال وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر مشرقی بنگال کے علاقوں میں وہ معاشرت جس کی نشوونما افغانوں اور مغلوں کے عہد میں ہوئی اس رفتار و قوت کے ساتھ ترقی نہ کر سکی جو ہندستان کے دوسرے علاقوں میں اسے نصیب ہوئی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے بنگال میں اس معاشرت کو پوری طرح سے دبا دینے کی بڑی منظم کوششیں ہوئیں اور بنگال کے مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ شاید برصغیر ہندستان و پاکستان کے کسی علاقے کے مسلمانوں کو پیش نہ آئیں۔

انگریزوں اور برہمنوں کی اس سازش کے خلاف بنگال میں گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ایک بغاوت پلتی رہی ہے۔ یہ بغاوت کبھی پوری طرح ظاہر نہ ہو سکی، مگر بنگال کے ہر مسلمان کے دل میں اس سازش کی قوت اور اپنی شکست کا احساس موجود تھا۔ یہی وہ بغاوت تھی جس نے اپنے اظہار کے لیے پاکستان کے مطالبے کو پورے جوش اور خلوص سے اختیار کر لیا۔ بنگال کے لیے پاکستان کا مطالبا روحانی طور پر اس معاشرت کی تکمیل کا مطالبا تھا جو برہمنوں اور انگریزوں کی وجہ سے بنگال میں ادھوری رہ گئی تھی۔



شاعری میں شاگردی استادی

ڈاکٹر منوہر سہائے انور رام۔ایل۔ٹی ایچ۔ڈی

ہندستانی میں شاگردی استادی کا دستور ریختہ گوئی کے زمانے آغاز سے چلا آتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک چلتا رہے گا۔ آپ تذکرۃ الشعرا میں سے کوئی تذکرہ اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو ہر شاعر کے ترجمے میں اس کے والد کے نام کے ساتھ استاد کا نام بھی نظر آئے گا۔ اس التزام سے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص والد کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی بے استاد کے شاعر بن جانا ممکن نہیں۔

یورپ میں جو لوگ اردو نہیں پڑھ سکتے، ان کو ہندستانی شاعری میں شاگردی استادی کے دستور کا دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ اس حیرانی کا سبب ظاہر ہے: ہاں وہی لوگ شاعری اختیار کرتے ہیں جنہیں خدا نے اسی کام کے لیے دنیا میں بھیجا ہوتا ہے۔ ان کے اذہان شاعری میں شاگردی استادی کے تخیل سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی افکار کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اقتضائے باطن سے لکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام کلام ان کے انفرادی امیال و عواطف سے بھرپور نظر آتا ہے۔

ہندستانی شاعری میں شعرا کی انفرادیت کا نشان تلاش کے باوجود نہیں ملتا، اگرچہ بعض صورتوں میں انداز بیان کے کسی حد تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کلام پیش نظر ہے وہ از روئے قیاس کس کا کس کا ہو سکتا ہے۔ اصل میں ہندستانی شاعری ہیئت سے مقید رہی ہے۔ شروع شروع میں شعرا نے جو مضامین تمام کر لیے تھے وہ آگے چل کر معتقدات کی شکل اختیار کر گئے۔ جن سے انحراف کرنا ایسا ہی مذموم قرار دیا گیا جیسا ملحد ہو جانا۔ آپ کو ہندستانی شاعری میں معشوق و محبوب، رقیب، نکوکار، ندیم، رازدار، ناصح، حق گو، زاہد، ریا اور عاشق بے وفا کہیں نظر نہ آئے گا۔ آپ اس میں جتنے مضامین دیکھیں گے وہ سب کے سب بندے ٹکے ہوں گے۔ جب انہیں مضامین کو بحر، قافیہ اور ردیف کے اختلافات کے ساتھ بار بار نظم کیا جاتا مقصد زندگی ٹھہر گیا اور ان کے انداز بیان کے لیے نئے نئے پیرائے تلاش کیے جانے لگے تو نوآموزوں کا کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ناگزیر تھا۔ سنار، لوہار، موچی، حجام اپنی اپنی کاریگری باقاعدہ سیکھتے ہیں۔ شاعری بھی اسی قسم کی کاریگری بن چکی تھی اس لیے وہ بے سیکھے کیسے آجاتی۔

ہندستانی میں چند ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جو کسی پر شاگرد نہ تھے اور انہوں نے اپنی ہی کوشش سے سب کچھ سیکھا، مگر انہیں اس میں بہت وقت صرف کرنا پڑا۔ متعدد کتابیں خریدنے اور سمجھنے کے مقابلے میں کسی استاد سے مشورہ کر لینا یقیناً آسان تر ہے، اگر آپ کو کسی چاندی کے سکے کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا ہو تو اس کے دو ہی طریقے ملتے ہیں۔ آپ یا تو ان تمام تدابیر سے کام لیں جو اصلی چاندی اور ملاوٹی چاندی میں امتیاز کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں یا بید سے صراف کے پاس چلے جائیں۔ پہلا طریقہ مشکل اور دوسرا سہل ہے۔ پہلا ضروری سامان کی فراہمی اور کسی حد تک محنت چاہتا ہے۔ اور دوسرے میں ان دونوں کی ضرورت نہیں صراف کو سالہا سال تک سکوں کی پرکھ کرتے کرتے ایک خاص قسم کی نظر حاصل ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ تسکا دیکھتے ہی کھرا کھوٹا بتا سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ حقیقی شاعری میں شاگردی استادی کا تصور داخل محالات ہے اور محض شاعری یعنی شعر گوئی کی صنعت میں کسی استاد کا شاگرد بنے بغیر گزارا نہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ آج سے پچاس سال تک شاگرد، استاد کا طریقہ کیا تھا اور آجکل کیا ہے؟

پہلے یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی استاد کی خدمت میں شاگرد بننے کی غرض سے حاضر ہوتا تھا تو استاد اس سے کسی آسان طریقے پر دو تین اشعار اپنے سامنے لکھوا کر اس کی موجودہ استعداد اور آئندہ صلاحیت کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اور اسی اندازے پر اس کے رد و قبول کا انحصار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں شاگرد اور استاد کا تعلق بیٹے اور باپ کے رشتے کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ شاعری کی تاریخ بتاتی ہے اور دیکھا بھی گیا ہے کہ جہاں ایک طرف شاگردوں نے استادوں کی چلیں بھر بھر

جوانیاں بیدی کیں، اور ان کی حمایت میں لڑائیاں لڑیں، وہاں دوسری طرف استادوں نے بھی شاگردوں کے کلام میں الفاظ، تراکیب، محاورات روزمرا وغیرا کی اغلاط درست کرنے، مضامین بدلنے اور ضرورت پڑنے پر غزل لکھ دینے سے کبھی جی نہیں چرایا۔ شاگرد استادوں کا نام روشن کرتے تھے، اور شاگردوں کو چمکاتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا تھا جب شاگرد صنعت شعر گوئی میں مہارت حاصل کر کے فارغ الاصلاح ہو جاتے تھے اور استاد کی اجازت سے خود بھی استادی کے فرائض انجام دینے لگتے تھے۔ استاد مرکھپ جاتے تھے مگر شاگرد عمر بھر ان کے نام پر مرتے رہتے تھے۔ ذوق کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہو گیا تھا۔ ان کے شاگرد داغ نے تمام ہندستان کے ہندستانی شاعروں کو ماند کر کے جہاں استادی کا ڈنکا بجا دیئے کے باوجود ذوق کا حق استادی کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کا ایک مقطع ان کی وفات یعنی ۱۹۰۵ء سے چند سال پہلے کا دیکھیے۔

یہ بہار داغ ہے گلزار ابراہیم کی ذوق کہتے ہیں مجھے فیض اس استاد کا

یہ تو عام شاگردوں، استادوں کا ذکر تھا۔ اب خاص شاگردوں، استادوں کا فسانہ لیجیے۔ کسی والیٔ ریاست کو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو کر نقارے دوام حاصل کرنے کا خبط سمایا اور اس نے کسی سربرآوردہ استاد شاعر کو جاگیر یا تنخواہ دے کر اپنا استاد مقرر کر لیا۔ بس اس کے ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر بن جانے میں کوئی حالت منتظر باقی نہیں رہی۔ استاد اپنی شاعری کی طرف سے غافل ہو کر آقا کا شعر پرداز بن گیا۔ سرکاری شاعر جلد از جلد منعقد ہونے لگے۔ اور ساری ریاست میں سرکار دولت مدار کی نغز گوئی کی دھوم مچ گئی۔ استاد کو ملک الشعرا کا خطاب مل گیا، اور جو شاعر ملک الشعرا کی وفات پر اس کی جانشینی کی امید ہوا لیے بیٹھے تھے سرکاری غزلوں کی تخمیس کر کے اپنا حق بیش از بیش ثابت کرنے پر اتر آئے۔

مجھے ایک والیٔ ریاست کی استعداد شاعری کا علم ہے۔ ان کی علمیت قرآن حفظ کر لینے تک محدود ہے۔ لکھنا نہیں جانتے تھے، ان کے دستخط دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کھدال کی نوک سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر پھیر دی ہے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف استادوں کے شاگرد رہے۔ پچھلے تین استادوں کے نام معلوم ہیں۔ یہ تھے سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی، شاگرد شیخ محمد ابراہیم ذوق، افتخار الشعرا مولوی افتخار حسین مضطر خیرآبادی، شاگرد مفتی امیر احمد امینائی، نواب محمد سلیمان خاں اسد لکھنوی شاگرد تدبیر الدولا، منشی مظفر علی خاں اسیر، میں نے مضطر اور اسد کو دیکھا ہے۔ مضطر داغ کا موچھ مروڑایا کرتے تھے۔ وہ شاعر کم اور نظر اور نوت کار زیادہ تھے۔ اسد بہت بوڑھے۔ نہایت پختا گو اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

خاص شاگردی استادی کیا تھی؟ بین دین اور لین دین۔ خاص استاد کو بہت اس بات کا دھیان رکھنا پڑتا تھا کہ کہیں اپنی غزل شاگرد کی غزل سے نہ بڑھ جائے۔ اس غرض کے لیے ایک سہل حکمت یہ اختیار کی جاتی تھی کہ ایک طویل غزل کی دو غزلیں بنا لی جائیں اور زیادا جچتے ہوئے اشعار خاص شاگرد کی غزل کے لیے محفوظ رکھ کر کم جچتے ہوئے اشعار اپنی غزل کے نصاب میں داخل کر لیے۔

اب دیکھیے آجکل کی شاعری استادی کا ڈھنگ کیا ہے؟

شاعری اب بھی ایک قسم کی صنعت یا کاری گری ہے۔ لوگ اب بھی شاگرد بنتے اور بناتے ہیں، مگر شاگردی استادی کے تعلق کی حیثیت بہت کچھ بدل گئی ہے، نہ شاگردوں میں عقیدت ہے اور نہ استادوں میں شفقت۔ ایک طرف شاگرد سیکھنے میں محنت نہیں کرتے، دوسری طرف استاد محنت نہیں کھپاتے۔ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض استاد کچے نکمے جنس بے بہا شاعر کا پورا مجموعۂ کلام حذف کر دیتے ہیں، لیکن جب وہ شاعر کسی حد تک مقبول ہو جاتا ہے تو شاگرد استاد کا نام لینے سے کتراتا اور اپنے آپ کو ہی شاعر ظاہر کرتا ہے یا شاگرد کو استاد سے نہایت کم فیض حاصل ہوتا ہے اور اس کے کلام کی ساری خوبی اس کی صلاحیت کی مرہون منت ہوتی ہے، مگر استاد جا بجا اس پر اس انداز سے فخر کرتا پھرتا ہے گویا اسی نے شاعری گھول کر پلائی ہے۔

قابل شاگرد اور لائق استاد اب بھی ہیں، لیکن بہت کم۔

آجکل کے بیشتر شاگردوں کی اقسام یہ ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جنہیں خدا کی طرف سے ملکۂ شاعری ودیعت نہیں ہوا، اور جو کسی اور حیثیت سے مشہور ہونے کی قابلیت نہ رکھنے کے باعث شاعری کو ناموری حاصل کرنے کا آسان طریقہ سمجھ لیتے ہیں، یہ جو کچھ کہتے ہیں بالکل غلط کہتے۔ ان کا تمام کلام غلط، استاد ہوتا ہے یہ استاد کے لیے بلائے بے درماں ثابت ہوتے۔ جب ان کا کلام اخبار

شاعری میں شاگردی استادی

ڈاکٹر منوہر سہائے انور ام۔اے، پی ایچ۔ڈی

ہندستانی میں شاگردی استادی کا دستور رہا گو کسی زمانے آغاز سے چلا آتا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک چلتا رہے گا۔ آپ تذکرۃ الشعرا میں سے کوئی تذکرا اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو ہر شاعر کے ترجمے میں اس کے والد کے نام کے ساتھ استاد کا نام بھی نظر آئے گا۔ اس التزام سے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص والد کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی بے استاد کے شاعر بنا جا نا ممکن نہیں۔

یورپ میں جو لوگ اردو نہیں پڑھ سکتے ان کو ہندستانی شاعری میں شاگردی استادی کے دستور کا درس کرنے میں بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ اس حیرانی کا سبب ظاہر ہے: وہاں وہی لوگ شاعری اختیار کرتے ہیں جنھیں خدا نے اسی کام کے لیے دنیا میں بھیجا ہوتا ہے۔ ان کے اذہان شاعری میں شاگردی استادی کے تخیل سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی افکار کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اقتضائے باطن سے لکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام کلام ان کے انفرادی امیال و عواطف سے بھرپور نظر آتا ہے۔

ہندستانی شاعری میں شعرا کی انفرادیت کا نشان تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملتا، اگر ہے بھی تو بہت معمولی صورتوں میں۔ انداز بیان سے کسی حد تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کلام پیش نظر ہے وہ از روئے قیاس کس کا ہو سکتا ہے۔ اصل میں ہندستانی شاعری ہیئت سے مقید رہی ہے۔ شروع شروع میں شعرا نے جو روایات قائم کر دیے تھے وہ آگے چل کر معتقدات کی شکل اختیار کر گئے۔ جن سے انحراف کرنا ایسا ہی مذموم قرار دیا گیا جیسا ملحد ہو جانا۔ آپ کو ہندستانی شاعری میں معشوق و نامہ بر، رقیب، کوکار، ندیم، راز دار، ناصح، حق گو، زاہد، ریا اور عاشق بے وفا کہیں نظر نہ آئے گا۔ آپ اس میں جتنے مضامین دیکھیں گے وہ سب کے سب بندے سے ہوں گے۔ جب انہیں مضامین کو بحر قافیہ اور ردیف کے اضافات کے ساتھ بار بار نظم کیا جانا مقصد زندگی ٹھہر گیا اور ان کے انداز بیان کے لیے نئے نئے پیرائے تلاش کیے جانے لگے تو نوآموزوں کا کسی استاد کے آگے زانوے ادب تہہ کرنا ناگزیر تھا۔ معمار، لوہار، موچی، حجام اپنی اپنی کاریگری باقاعدہ سیکھتے ہیں۔ شاعری بھی اسی قسم کی کاریگری بن چکی تھی اس لیے وہ بے سیکھے کیسے آجاتی۔

ہندستانی میں چند ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جو کسی پر شاگرد نہ تھے اور انہوں نے اپنی ہی کوشش سے سب کچھ سیکھا، مگر انہیں اس میں بہت وقت صرف کرنا پڑا۔ متعدد کتابیں خریدنے اور سمجھنے کے مقابلے میں کسی استاد سے مشورا کر لینا یقیناً آسان تر ہے۔ اگر آپ کو کسی چاندی کے سکے کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا ہو تو اس کے دو ہی طریقے ملتے ہیں۔ آپ یا تو ان تمام تدابیر سے کام لیں جو اصلی چاندی اور ملاوٹی چاندی میں امتیاز کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں یا سیدے صراف کے پاس چلے جائیں۔ پہلا طریقہ مشکل اور دوسرا سہل ہے۔ پہلا ضروری سامان کی فراہمی اور کسی قدر محنت چاہتا ہے۔ اور دوسرے میں ان دونوں کی ضرورت نہیں صراف کو سالہا سال تک سکوں کی پرکھ کرتے کرتے ایک خاص قسم کی نظر حاصل ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ سکا دیکھتے ہی کھرا کھوٹا بتا سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ حقیقی شاعری میں شاگردی استادی کا تصور داخل محالات ہے اور بھوشیہ شاعری یعنی شعر گوئی کی صنعت میں کسی استاد کا شاگرد بنے بغیر گزارا نہیں۔

(ب) دیکھنا یہ ہے کہ آج سے پچاس سال تک شاگرد نے استاد کا طریقہ کیا تھا اور آجکل کیا ہے؟

پہلے یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی استاد کی خدمت میں شاگرد بننے کی غرض سے حاضر ہوتا تھا تو استاد اس سے کسی آسان طریقے پر دو تین اشعار اپنے سامنے لکھوا کر اس کی موجودا استعداد اور آئندا صلاحیت کا اندازا کر لیتا تھا۔ اور اسی اندازے پر اس کے رد و قبول کا انحصار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں شاگرد اور استاد کا تعلق بیٹے اور باپ کے رشتے کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ شاعری کی تاریخ بتاتی ہے اور دیکھا بھی گیا ہے کہ جہاں ایک طرف شاگردوں نے استادوں کی چلیں بھریں

جوبیاں بیدی کیں اور ان کی حمایت میں لڑائیاں لڑیں، وہاں دوسری طرف استادوں نے بھی شاگردوں کے کلام میں الفاظ، تراکیب، محاورات روزمرا وغیرہ کی اغلاط دور کرنے، مضامین بدلنے اور ضرورت پڑنے پر غزل لکھ دینے سے کبھی جی نہیں چرایا۔ شاگرد استادوں کا نام روشن کرتے تھے اور شاگردوں کو چمکاتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا تھا جب شاگرد صنعت شعر گوئی میں مہارت حاصل کر کے فارغ الصلاح ہو جاتے تھے اور استاد کی اجازت سے خود بھی استادی کے فرائض انجام دینے لگتے تھے۔ استاد سرکیپ جاتے تھے مگر شاگرد عمر بھر ان کے نام پر بوار ہتے تھے۔ ذوق کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہو گیا تھا۔ ان کے شاگرد داغ نے تمام ہندستان کے نہ رسانی شاعروں کو ماند کر کے جہاں استادی کا ڈنکا بجا دیئے کے باوجود ذوق کا حق استادی کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کا ایک مقطع ان کی وفات یعنی ۱۹۰۵ء سے چند سال پہلے کا دیکھیے۔

یہ بہار داغ ہے گلزار ابراہیم کی ذوق کہتے ہیں مجھے فیض اس استاد کا

یہ تو عام شاگردوں، استادوں کا ذکر تھا۔ اب خاص شاگردوں، استادوں کا تعلق لیجیے۔ کسی والیٔ ریاست کو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو کر نقارے دوام حاصل کرنے کا خبط سمایا اور اس نے کسی سربرآوردہ شاعر کو جاگیر یا تنخواہ دے کر اپنا استاد مقرر کر لیا۔ بس اس کے ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر بن جاتے ہیں، کوئی حالت منظر باقی نہیں رہی۔ استاد اپنی شاعری کی طرف سے غافل ہو کر آقا کا شعر پردار بن گیا۔ سرکاری شاعر بے جلد از جلد سنعقد ہونے لگے۔ اور ساری ریاست میں سرکار دولت مدار کی نغز گوئی کی دھوم مچ گئی۔ استاد کو ملک الشعرا کا خطاب مل گیا، اور جو شاعر ملک الشعرا کی وفات پر اس کی جانشینی کی امید ہوتا لیے بیٹھے تھے سرکاری غزلوں کی تخمیس کر کے اپنا حق پیش از وقت ثابت کرنے پر اڑ گئے۔

مجھے ایک والیٔ ریاست کی استادِ شاعری کا علم ہے۔ ان کی علمیت قرآن حفظ کر لینے تک محدود ہے۔ معنا نہیں جانتے تھے، ان کے دستخط دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کدال کی نوک سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر پھیر دی ہے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف استادوں کے شاگرد رہے۔ مجھے تین استادوں کے نام معلوم ہیں۔ یہ تھے سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی، شاگرد شیخ ابراہیم ذوق، افتخار الشعرا مولوی افتخار حسین مضطر خیرآبادی، شاگرد مفتی امیر احمد امینائی، نواب محمد سلیمان خاں اسد لکھنوی شاگرد تدبیر الدولا، مفتی مظفر علی خاں اسیر، ان میں مضطر اور اسد کو دیکھا ہے۔ مضطر داغ کا مونچھ چڑایا کرتے تھے۔ وہ شاعر کم اور نطرب اور نرت کار زیادہ تھے۔ اسد بہت بوڑھے۔ نہایت پختا گو اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

خاص شاگردی استادی کیا تھی؟ یقین دین اور بس۔ خاص استاد کو ہمیشہ اس بات کا دھیان رکھنا پڑتا تھا کہ کہیں اپنی غزل خاص شاگرد کی غزل سے نہ بڑھ جائے۔ اس غرض کے لیے ایک سہل حکمت یہ اختیار کی جاتی تھی کہ ایک طویل غزل کی دو غزلیں بنا لی جائیں، یا زیادہ پختے ہوئے استاد خاص شاگرد کی غزل کے لیے مخصوص رکھ کر کم پختے ہوئے استاد اپنی غزل کے نصاب میں داخل کر لیے۔

اب دیکھیے آجکل کی شاعری استادی کا ڈھنگ کیا ہے؟ شاعری اب بھی ایک قسم کی صنعت یا کاری گری ہے۔ لوگ اب بھی شاگرد بنتے اور بناتے ہیں، مگر شاگردی استادی کے تعلق کی حیثیت بہت کچھ بدل گئی ہے، نہ شاگردوں میں عقیدت ہے اور نہ استادوں میں شفقت۔ ایک طرف شاگرد پختہ میں محنت نہیں کرتے، دوسری طرف استاد محنت نہیں کھپاتے۔ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض استاد کچے شعرا جنھیں بے پیر شاعر کا پورا مجموعۂ کلام حذف کر دیتے ہیں، لیکن جب وہ شائع ہو کر کسی حد تک مقبول ہو جاتا ہے تو شاگرد استاد کا نام لینے سے کتراتا اور اپنے آپ کو بھی شاعر ظاہر کرتا ہے یا شاگرد کو استاد سے نہایت کم فیض حاصل ہوتا ہے اور اس کے کلام کی ساری خوبی اس کی صلاحیت کی مرہونِ منت ہوتی ہے، مگر استاد جا حاسا اس پر اس انداز سے فخر کرتا پھرتا ہے گویا اسی نے شاعری گھول کر پلائی ہے۔

قابل شاگرد اور لائق استاد اب بھی ہیں، لیکن بہت کم۔

آجکل کے بیشتر شاگردوں کی اقسام یہ ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جنھیں خدا کی طرف سے ملکۂ شاعری ودیعت ہوا، اور جو کسی اور حیثیت سے مشہور ہونے کی قابلیت نہ رکھتے کے باعث شاعری کو ناموری حاصل کرنے کا آسان طریقہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں بالکل غلط لکھتے۔ ان کا تمام کلام غلط استاد ہوتا ہے یہ استاد کے لیے بڑے بے درماں ثابت ہوتے۔ جب ان کا کلام اجنبی

اور رسالوں میں شایع ہوتا ہے تو اس کی خوب نمایش کرتے ہیں۔ بہرحال ان میں ایک عجیب صفت یہ ہوتی ہے کہ استاد کی طبیعت اچاٹ ہونے نہیں دیتے۔

۲۔ وہ لوگ جن میں تافیا پیمائی کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن شعر گوئی کے لیے ایسی زبان اختیار کر لیتے ہیں۔ جس پر انہیں پوری تو کیا ادھوری قدرت بھی حاصل نہیں ہوتی، یہ استاد کو زیادہ دور نہیں دیتے۔ ان کو مصنوعی شاعری کی زبان سیکھتے سیکھتے بڑی مشکل آجاتی ہے۔

۳۔ وہ لوگ جن میں اپنی ذات کے سوا اب کچھ ہوتا ہے یہ ایک مدت کے بعد تشکیک کی وادی سے گذر جاتے ہیں اور اچھے شعرا میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

آج کل کے بیشتر استادوں کے انواع یہ ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کو شاعر گر بھی ہونا چاہیے یہ روپیے بھانے ہر کسی کو شاگرد بنا لیے پر آمادہ رہتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جنہیں استاد مشہور ہونے کا خبط ہوتا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح پیغمبر کے لیے امت ضروری ہے۔ اسی طرح استاد کے لیے شاگردوں کی جماعت ناگزیر ہے۔ یہ لوگ شاگردوں کو پکے سکھاتے ہیں اپنے۔ اس کا علم خدا کو ہوگا۔ البتہ حد ادب یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ وہ شاگردوں کی تعداد کثیر کے بل بوتے پر بے حد چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ یہ شاگرد ان سے کسی قسم کی نذر یا پیشکش کے طالب نہیں ہوتے، بلکہ انہیں اپنے خاندان سالانہ عرس کرنے کے لیے اپنی گرہ سے ڈاک خرچ ادا کر دیتے ہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو اصلاح کے کام کو کاروبار اور وقت گذارنے کا اچھا مشغلہ بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں اور ان کی نیت قابل تعریف ہوتی ہے۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ معلوم نہیں شاگردی استادی کا سلسلہ کب سے چلا آرہا ہے۔ یہاں میں یہ بات دوسرے الفاظ میں کہتا ہوں۔ جب تک ہندستانی شاعری مصنوعی رہے گی۔ مصنوعی شاعری کی صلاحیت رکھنے والے یا محض شہرت کے خواہش مند لوگ استاد کی تلاش میں رہیں گے، اور استاد بھی شاعر گر نہ سہی زیادہ تر

THE
NIZAM SUGAR FACTORY
LIMITED
ANDHRA PRADESH
دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ
آندھرا پردیش
مشرق کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری
سفید، شفاف شکر اور نیفا "NIFA" برانڈ
کنفکشنری اور نہایت ہی لذیذ مٹھائیاں اور ٹافیاں
"TOFFEES" حفظان صحت کے اصولوں
کے تحت، جدید ترین خودکار "AUTOMATIC"
مشینوں کے ذریعہ تیار کی جاتی ہیں۔
CONFECTIONERY
کنفکشنری
اعظم آباد۔ حیدرآباد دکن
AZAMABAD-HYDERBAD-DN.
HEAD OFFICE (P.O.BOX.No.117) ABID ROAD, HYDERABAD-NO. 1, (ANDHRA-PRADESH.)
ہیڈ آفس
عابد روڈ۔ حیدرآباد
FACTORY, SHAKAR-NAGAR, (C. RLY.)
PHONES.No. 5605, 4996, 4876, 34450,
فیکٹری
شکر نگر۔ یو دھن

گورنمنٹ سرامک فیاکٹری گڈور

جو محکمہ صنعت و تجارت حکومت آندھرا پردیش کا ایک ڈویژن ہے

یہ فیاکٹری حسب ذیل اقسام کا سامان تیار اور سربراہ کرتی ہے

چینی کے برتن — حفظ صحت سے متعلق سامان

اعلیٰ درجے کے چائے کے سٹ — سفید، صاف و شفاف

پلیٹیں — مشتاب وغیرہ

قیمتوں اور تفصیلات کے لئے اس پتے سے مراسلت کیجئے

سرامک ایکسپرٹ

گورنمنٹ سرامک فیاکٹری گڈور

رشتا

بلونت سنگھ

سکھ جاٹ کی دو چیزوں میں جان ہوتی ہے۔ اس کی لاٹھی اور اس کی سواری کی گھوڑی (یا گھوڑا) اگر یہ چیزیں چوری ہو جائیں تو انہیں تلاش کرنے میں وہ زمین و آسمان ایک کر دیتا ہے، اگر کوئی جاٹ سے اس کی یہ چیزیں چھین لینے کی کوشش کرے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اگر دشمن بھاری پڑے اور اس کی یہ چیزیں چھن جائیں تو وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہے۔

کہانیں سنگھ کے ساتھ پہلی قسم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کی تیز خرام گھوڑی چوری چلی گئی تھی۔

وہ ایک بارعب، خاصا زمیندار تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ اس سے مقابلہ کر کے گھوڑی چھین لے جاتا۔ گھوڑی کے چور نے چلے جانے پر بھی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن لاچار تھا۔

چار پانچ دن گذر گئے، اس نے کچھ سے اس حادثے کے بارے میں کچھ نہیں کہا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کچھ سے ضرور رائے لے گا اگرچہ میں اس کا نوکر تھا اور وہ کچھ سے بڑی بڑی طرح پیش آتا تھا پھر بھی وہ اہم معاملوں میں اکثر میری صلاح لیتا تھا۔

وہ بھی بات ہوئی۔ صبح کا وقت تھا، میں گاؤں سے آدھ کوس دور طریلے کے قریب لگے ہوئے کوئلوں میں سرسوں پیل رہا تھا کہ چھتو کمانستا جو میرے پاس آکر بولا تھا تیلے میں، سردار تجھے بلا رہا ہے۔

میں اصل معاملہ بھانپ گیا۔ میں ابھی تک سوچ نہیں پایا تھا کہ اگر گھوڑی کے بارے میں پوچھے تو میرا مشورہ کیا ہونا چاہیے یوں بھی میں اس کے سامنے سے جانے سے کتراتا تھا، کیونکہ وہ بنا گالی گلوچ کے بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی بے وقت کا بھی آتا تو خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ کوئی بیر کوئی اور چارہ نہ کار نظر آتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آخر شیر اور بکری کا مقابلہ بھی کیا۔ اگر بکری کو موقع دیا جائے تو وہ شیر کا اس کی کئی دفعہ خون پی لیتی ہے، اگر اپنے گاؤں قتل نہ کیا جائے تو وہ [illegible] کا سوال حل نہیں ہو سکتا تھا۔

چھتو کی بات سن کر بھی اٹھنے کو جی نہیں چاہا، کیونکہ اس وقت صبح کی مدھم دھوپ میں دل کو بڑا آنند محسوس ہو رہا تھا، لیکن اٹھنا ہی پڑا ــــ سردار کے موقع کون آئے۔

میں نے چھتو سے کہا کہ وہ میری جگہ بیٹھ کر ذرا بیل کو ہانکتا رہے، مگر چھتو بولا کہ وہ اس وقت کھیتوں کو جا رہا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا ــــ تھوڑی دیر تو بیٹھو، میں طویلے سے لڑکے کو بھیج دوں گا۔ پھر چلے جانا۔

وہ بیٹھ گیا اور پگڑی اتار کر سر کے پٹوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور پھر پگڑی جھاڑ کر اسے از سر نو سر پر بیٹھنے لگا.....

جب میں طویلے کے لمبے چوڑے صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کرنال سنگھ بڑے تھکڑے کی مرمت کروا رہا تھا۔ دوسرے دن گھر کی عورتیں میلے کو جانے والی تھیں۔ اسی کے سلسلے میں یہ تیاری ہو رہی تھی، مستری بسولے کی الٹی طرف سے پہیے کی ٹھکائی کر رہا تھا، اور سردار اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ ست سری اکال سردار جی۔

اس نے مجھے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور نہ میری طرف دیکھا ہی بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے میری موجودگی کا احساس ہی کافی دیر تک میں بات بیٹھے بیٹھے باندے کھڑا رہا، اور سردار کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پینتالیس برس سے اوپر ہو چکا تھا۔ کچے بال ذرد پک گئے تھے، لیکن اس کے جسم میں ذرہ برابر کمزوری نہ دکھائی دیتی تھی۔ چوڑے ٹھنٹوں والی مردانہ ناک، ہونٹ بھرپور داڑھی اور سر کے بال گھنے [illegible] ــــ میں اس کے [illegible] بڑے بڑے [illegible] ــــ دیکھتے ہوئے دل میں سوچنے لگا کہ کاش میں اس سے بھی رنگنے ڈیل ڈول کا مالک ہوتا تو اسے گیند کی طرح اچھال کر پرے پھینک دیتا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ میں اپنا

بھاری بھرکم باز واٹھا کر وہ ہات دیتا کہ گردن مڑ جاتی، پگڑی پرے جا گرتی۔ اور اس کا سر کیچڑ میں دھنس جاتا، اگلے چار دانت ٹوٹ جاتے اور نتھنوں سے خوں بہنے لگتا۔ میں نے ہمیں تک نتھا کھینچا تھا کہ سردار اپنے سخت مخالف سے بھاری آواز نکال کر بولا ــــ "اوے بھوتیا"۔

"جی سردار جی! ــــ میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتا تھا۔ میرے سر کے بال جوڑے کے قابو میں نہیں آتے، اور داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی اڑے اڑے سے رہتے تھے۔ میری اسی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا "اوے تیرا نام تو بھوت سنگھ ہونا چاہیے"۔

(اب آپ ہی غور فرمائیں کہ بھوت سنگھ اور بھوتیا میں کتنا بڑا فرق ہے۔

"بھوتیا! گھوڑی کا پتا نہیں چلا؟" مجھے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ابتک میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر سردار بولا۔

"اوے بولتا کیوں نہیں بھوتیا؟" اب بھوتیا سے بھوتیا بنا دیا گیا۔ میں نے ہڑبڑا کر سوال کیا۔ "آپ نے تھانے میں رپٹ نہیں لکھائی؟"

"بھوتنی وا" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "پولیس کیا کرے گی۔ اگر میں کسی کی گھوڑی لاکر اپنے طبیلے میں باندھ لوں تو بتا پولیس کیا کرے گی..... اور پھر پولیس کو کبھی کرنا کیا مردوں کا کام ہے..... ہیں؟"

جھوتیا، بھوتنی وا اور بھوتنی وا ــــ سچے سچے گالی دینے میں سردار کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے سردار اکثر معاملوں میں مجھ سے صلاح مشورہ کرتا تھا، لیکن مجھے ایسا تیر بہدف مشورہ کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ لائلپور کے علاقے میں ان دنوں چوروں کی کمی نہیں تھی۔ اس زمانے میں مسلمان خانہ بدوش بھی پائے جاتے تھے جن کے مرد بڑے وجیہہ اور عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔ ان کا داؤ لگتے تو بات مار جاتے تھے پھر بار کا علاقہ بھی قریب ہی تھا، جہاں کے سکھ ان سے بھی بڑے چور تھے، اور جہاں ایک سے ایک دھماکہ موجود تھا۔ کون جانے اس کام میں کسی کا ہاتھ تھا۔ دو باتیں ہمارے ظاہر تھیں۔ اول یہ کہ گھوڑی کا چور شوقین مزاج تھا۔ ورنہ گھوڑی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چرا لے جاتا۔ اور دوسری بات یہ کہ چور کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ کرنیل سنگھ کے علاقے بھر میں شہرت تھی اور ہر شخص پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی گھوڑی چرانے کا کام کسی معمولی انسان کا کارنامہ ہو ہی نہیں سکتا۔

کچھ دیر تک خاصی طاری رہی، سنتری کے بسولے کی کھٹا کھٹ کی آواز گونجتی رہی، لیکن جب چھکڑے کی مرمت ہو چکی تو سردار نے دھیرے سے میری گردن کو نیچے میں دبوچا، اور ایک گونسے میں مجھے ہلا کر بولا "یہ کام کسی بڑے حرامزادے کا ہے"۔

"ہاں جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز کو بمشکل باہر نکالتے ہوئے کہا"۔

میں دل ہی دل میں تک رہا تھا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا اور پھر بولا "معاملہ ٹیڑھا ہے اس لیے کسی بڑے آدمی کی مدد سے ہی نکلنا چلے سکتی ہے۔ مجھے یہ میرا گلا بھی مختلف ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سردار کی بھاری آواز گونجی۔

"کل چلے میں جاکر آنکھیں کھلی رکھنا کسی کو بھی نہ کوئی اصلی حرامزادا نہیں نظر آ جائے گا۔ چکانا ہے پیسہ پورا اترے تو اس سے سودا ہو سکتا ہے۔ ایسے آدمی کو جو گھوڑی لے آئے میں پانچسو روپے انعام دوں گا کہتا رہوں۔ اور اگر حرامزادے چور کا پتا مل گیا تو پانچسو روپے انعام دے سکتا ہوں..... بس ایک بار مجھے میرے چنگل میں آجانے تو سالے کی گردن مروڑ دوں گا کہ آگے کو سب کو کان ہو جائیں..... بچے نے آپ کے بیٹا بڑی بمشکل سے جواب دیا "جی سچا"۔

میں جانتا تھا کہ اب کے بھی میں نے ذرا سا ہلا دیا تو گالیوں کی بوچھاڑ پڑے گی۔ سر پر آئی بلا ٹل جائے گی اور گلیوں کو بھی گردن پر اور کس کر کہا "ہوشیار ہو جاؤ ہم چلے ہی چلتا ہوں گا....."

دوسرے دن کوٹھی پر گئے اور کچھ دیر کی عورتیں ہٹا کیاں اور پھر چھکڑوں پر لدے گئے۔ میں ایک گھوڑی پر سوار

ہوگیا۔ اس شان سے ہمارا قافلہ میلے کو روانا ہوا۔

آہا! پنجاب کے میلے بھی کیسے پیارے ہوتے ہیں۔ جنگل میں منگل کا سماں بندھا جاتا ہے۔ دور دور تک خیمے اور قناتیں لگ جاتی ہیں، گرد و آلود راہوں پر خوب چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ ناچ رنگ، گانا بجانا، ہوٹلوں کی خوب یہ کہ ہر قسم کی رونق نظر آنے لگتی ہے، رات کے .... سے: سیکڑوں گیسوں کی روشنی میں دکانیں اپنی بہار الگ دکھاتی ہیں، ان دکانوں میں دیہاتیوں کے ذوق اور ضرورت کی اشیا بکتی ہیں۔

یہ ہمارا میلا جس کا ذکر میں کر رہا ہوں، متواتر چھ سات دن تک لگتا تھا، ہمارا پورا گراؤ بھی چار چھ دن رہنے کا تھا۔ اس لیے ہم اپنا خیمہ، آٹا دال، گھی اور ایندھن وغیرہ سب کچھ اپنے ساتھ لے گئے تھے، چونکہ سردار کے گھرانے کے کئی لوگ ہمراہ تھے اس لیے ہمارے خیمے میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ سب سے زیادہ رونق سردار کی سب سے بڑی لڑکی لالی کور کی وجہ سے تھی، اسے سب لالی کے نام سے پکارتے تھے، اپنی جوانی اور حسن کے باعث وہ اپنے باپ سے کم شہرت نہیں رکھتی تھی۔

میلا کیا تھا جنگل میں ایک چھوٹا سا نگر بس گیا تھا۔ پیکوڑے سٹی کے برقی، مالے دار پاٹ اور مٹھائیوں کی دکانیں تو قدم قدم پر موجود تھیں۔ دیگر کئی قسم کی دکانوں کے علاوہ تفریح کے کئی سامان بھی موجود تھے۔ کہیں پر تے پو، اور بہروپیوں کی ٹولیاں تماشائیوں کے حلقے میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتیں، کہیں بہر رانجے کا قصہ سوز بھری آواز میں گایا جاتا، اور کہیں قوالیوں پر لوگ سر دھنتے، کہیں بولیاں اور ٹھولیاں۔

اب کے میلے میں جو نئی چیز دیکھنے میں آئی وہ تھا بولتا، چلتا پھرتا بائیسکوپ۔ میں نے شہر کے کئی بائیسکوپ دیکھے تھے جن کے تماشے میں یہ بالکل ہیچ تھا، پھر بھی ان دیہاتیوں کے لیے جنہیں شہر جانے کا موقع کبھی ملا تھا، یہ ایک حیرت انگیز چیز تھی۔ تاروں بھرا آسمان، اس بائیسکوپ کی چھت، چاروں طرف قناتیں پردہ! یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے کئی دھونیوں کو سی کر بنایا گیا ہو۔ ایک جمبو پیڑی میں مشین رکھی تھی۔ باہر ٹکٹ نہیں بکتے تھے فقط چار آنے نقد دینے پر آدمی کو زمین پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ وہ آٹھ آنے دے کر آدمی بغیر بازو کے لوہے کی کرسی پر بیٹھ سکتا، کھیل شروع ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو کھیل شروع کر دیا جاتا۔ شین ایک تھی، اس لیے ہر دس بارہ منٹ کے بعد بچے سنٹ کا وقفہ ہو جاتا۔

ایک شام گھر کے سب لوگوں نے بائیسکوپ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، چنانچہ رات کے کھانے سے فرصت پا کر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ ہم سب آٹھ آٹھ آنے کی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ کافی دیر انتظار کے بعد دو ریلیں (REELS) ہو چکیں تو میں نے دیکھا کہ تین چار جوان بڑے دھڑلے سے اندر داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ دو ریلیں ہو چکی ہیں، انہوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازے کسنے شروع کیے۔ مالک آیا تو اس سے کھیل پھر سے شروع کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ کھیل از سر نو شروع کر دیا گیا۔ باقی لوگ بھی خوش تھے کہ ان کے دام پھر سے وصول ہو رہے ہیں۔ یہ اجارہ دیکھ کر میں ذرا چوکنا ہو گیا۔ کچھ تو وہ اور دو بیٹھے ہوئے تھے، اور کچھ تاریکی کی وجہ سے میں ان کی صورت اچھی طرح دیکھ نہیں سکا، لیکن ایک بات صاف عیاں تھی کہ وہ دھاگڑ لوگ تھے، کیونکہ ہر ایرے غیرے کے کہنے سے کھیل پھر سے شروع نہیں کیا جاتا تھا۔

میں پچھلے تین روز سے اپنے مالک کے کہنے کے مطابق ایسے آدمی کی جستجو کرتا رہا جو ہمارے کام آ سکے، لیکن ابھی تک مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اب میں نے کیا کہ ان جوانوں کا پیچھا ضرور کروں گا، ممکن ہے ان میں سے کام کا آدمی مل جائے۔

شو ختم ہونے کے بعد باہر میں نے گیس کی روشنی میں دیکھا تب مجھے یقین ہوا کہ وہ اصلی دام دھاگڑ جوان ہیں۔ یوں تو وہ سب کے سب نوجوان، لمبے تڑنگے، مضبوط اور اکھڑ تھے، لیکن ان میں سے ایک خاص طور پر میری نظر میں جچ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں نہ صرف سب سے طاقتور اور وجیہہ نظر آتا تھا، بلکہ بات چیت کرنے کے ڈھنگ سے بھی ہشیار معلوم ہوتا تھا۔ میں موقعہ پا کر باتوں ہی باتوں میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد ان کا گروہ ایک دکان پر رک گیا۔ اس وقت ایک پیک اس نوجوان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، دور سے پیڑ کی اوٹ ایک عورت کی جھلک دکھائی دی، اور وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر ادھر کو چل دیا۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے ہو لیا ــــ

وہ دونوں کھیتوں میں بنے ہوئے رہٹ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ میں پودوں کی اوٹ میں لمبا چکر کاٹ کر ان کے قریب پہنچا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں، لیکن وہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ کچھ بھی سمجھنا ناممکن تھا۔

میں دھندلی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھ رہا تھا عورت یا لڑکی میری طرف پیٹ کیے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے منہ پھیرا تو میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ــــ وہ لالی تھی۔

عجیب بات تھی، آخر ان کی محبت کب شروع ہوئی تھی، یہ ضرور بنایا پریم تھا، کیونکہ اگر پرانی کھچڑی پک رہی ہوتی تو اب تک یہ بات مشہور ہو گئی ہوتی، کیونکہ اگر اس نوجوان کی ہمارے گاؤں میں آمد و رفت رہی ہوتی تو مجھے ضرور پتا چل جاتا، سبھی کے سب ہی اسے جاننے لگتے۔

کچھ دیر تک ان میں گھٹ گھٹ کر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جب لالی جانے لگی نوجوان نے بڑھ کر اس کا بوسہ لیا ــــ اس پر وہ بلبلا کر بات چھڑا کر پرے بھاگ گئی اور دور سے مسکرا مسکرا کر اسے انگوٹھا دکھانے لگی۔

نوجوان بھی مسکراتا ہوا دوسری جانب چل نکلا۔ میں بدستور اس کے پیچھے ہو لیا۔ چلتے چلتے بیلے میں داخل ہونے سے پہلے وہ ایک دم رکا اور گھوم کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے لیے بھاگ جانا یا چھپ جانا ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر پاس سے گذر جاؤں گا۔ جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے اپنی لمبی لاٹھی آگے بڑھا کر میرا راستہ روک لیا۔

میں نے جھکی ہوئی آنکھیں دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں، کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ پھر وہ بولا "کہو استاد یہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو، یا اگر اپنی زندگی سے ہی تنگ آ چکے ہو تو بتلاؤ، دوں میں ایک بات؟"

میں نے بات بنا کر جواب دیا: "دیکھو سردار بہادر، بھلا مجھے تمہارا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، لیکن میں محض اس لڑکی کی وجہ سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیوں؟ اس لڑکی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"کیا تم جانتے ہو وہ کس کی بیٹی ہے؟"

"نہیں۔"

"واہ! جس کے ساتھ پریم کے جھولے جھولا کرتے ہو، اس کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتے؟"

"دو تین دن کی ملاقات ہے۔ ابھی اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی ــــ لیکن تم کون ہو؟"

"وہ سردار کرپال سنگھ کی بیٹی ہے، اور میں ان کا پرانا نوکر ہوں۔"

یہ سن کر وہ لحہ بھر کو چپ رہا، پھر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ ہاں کرپال سنگھ کا نام تو میں نے بھی سنا ہے۔ بڑا زمیندار ہو گا، علاقے بھر میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔"

اس نے تنی ہوئی مونچھوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا "بھئی تم تو بڑے کام کے نکلے۔ آؤ، ذرا اونٹنیوں کا دودھ پلائیں تمہیں، وہیں پر دل کھول کر باتیں ہوں گی۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلا دیے۔ ہمارا راستہ بہنہ کے قد آور درختوں میں سے ہو کر جاتا تھا، میں ایسے لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے ڈر محسوس کر رہا تھا کہ کہیں ایسا ہو کہ ایک ہاتھ دے اور میں یہیں پیڑ کے تنے کے قریب ڈھیر ہو جاؤں، مگر وہ ایسا کمینہ نظر نہیں آتا تھا، وہ چاہتا تو مجھے دن دھاڑے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

میلے کے ایک سرے پر پیڑوں کے سہارے پر کچھ اونٹنیاں بلبلا رہی تھیں، ادھر ادھر کچھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم ایک چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔

ہاں ہاں تو پھر کیا؟ اس نے مونچھیں چوستے ہوئے کہا۔

"بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ لالی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"

میں نے بہت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"پر میں صاف کہہ دوں کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔"

وہ بے پروائی سے ہنسا "یہ آگ واگ کی دھمکیاں مت دو۔ سیدی بات یہ ہے کہ اس بونڈیا کو اپنی چورہ بنانے کا ارادہ ہے میرا۔۔۔ اب چاہے سیدی انگلیوں سے گھی نکلے یا ٹیڑھی سے۔"

میں نے ایک بار پھر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس میں گبرو جوان والی سب ہی خوبیاں موجود تھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا "دیکھو سردار بہادر، ہم تو انتا جانتے ہیں کہ کام یوں کرے کہ سانپ مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"چلو یوں ہی سہی" وہ مسکرا دیا ۔۔۔ میں کچھ دیر تک چپ چاپ سوچتا رہا۔ پھر پینترا بدل کر بولا "اگر تم ہمارے سردار جی کا ایک کام کردو تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہو جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"بات یہ ہے کہ ہمارے سردار جی کا گھوڑی چوری ہوگئی ہے، اس کا اب تک کچھ سراغ نہیں ملا۔ اگر تم اسے ڈھونڈ نکالو تو بخدا روپیا نقد ۔۔۔ کے روپیا اور ۔۔۔ کے کہ وہ اتنے خوش ہوں گے کہ انہیں تم سے چین دان سے لالی کا رشتہ کرنے سے بھی انکار نہ ہوگا۔"

"یہ بات ..... اچھا ....." یہ کہہ کر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا "یہ ہے ذرا ٹیڑھی کھیر ....."

"ٹیڑھی کو سیدھی کرنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ....."

"لیکن کیا؟ میں تمہیں گھوڑی کا حلیہ بتائے دیتا ہوں ..... آخر تم کس چکر میں پڑے ہو؟ کام مشکل ہے تو انعام بھی تو بڑا ہے۔ اگر تمہیں روپے کی پروا نہیں تو لالی کی پروا تو ہے۔"

مجھے میری طرف دیکھ کر ہنسا "بات یہ ہے کہ مجھے اور سب کام چھوڑ کر یہ کام کرنا ہوگا ..... اچھا حلیہ تو بتاؤ۔"

اس پر میں نے گھوڑی کا حلیہ بتایا، اور رنگ کا پورا پتا بتادیا۔ سب کچھ سن کر وہ بولا "یار یوں لگتا ہے کہ یہ گھوڑی میں نے کہیں دیکھی ہے ....." پھر وہ انگلیوں سے ماتھے کو دبانے لگا، پھر دفعتہً بولا "اچھا استاد ہات ملاؤ ..... مجھے امید ہے کہ کام بن جائے گا۔" میں نے اس کے ہات پہ ہات رکھ دیا۔

"کیوں کچھ یاد ہے۔"

"ہاں ..... آیا تو۔"

"تو پھر کب تک امید رکھی جائے۔"

"دیکھو استاد علاتے ہیں ایک سے ایک دھاکڑ پڑے ہیں۔ پر ہم شیر کی مونچھ کے بال اکھاڑ لانے والے آدمی ہیں ..... بس اب تہیا کرلیا ہے کہ یہ کام کرکے لالی کو حاصل کرلوں گا۔ لیکن یاد رکھو اگر لالی کا معاملا کھٹائی میں پڑ گیا تو تمہاری خیر نہیں ....."

"ہاں ہاں، بے شک ۔۔۔ لیکن ہیں مالک سے کیا بتاؤں کہ تم کتنے دن کے اندر یہ کام کرسکو گے ....."

اس نے پھر کچھ دیر غور کیا اور پھر بولا "اچھا صرف دس

[illegible]

[illegible] ہوگئی۔ میں نے [illegible] سے [illegible] کہ میں نے سردار کو بتایا کہ [illegible] آگیا ہوں۔ [illegible] کی تلاش اور [illegible] سوالات پوچھنے لگا۔ میں نے اس کی خوب تعریف کی، اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کہیں لالی سے اس کا رشتا ہوجائے تو جوڑی خوب رہے، لیکن میں نے ان کے عشق کا راز نہیں کھولا۔

یہ سن کر سردار نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اور گالی دیتے دیتے رک گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ نیم رضامند ہی تھا، ورنہ اس کے منہ میں لگام کون ڈال سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ ایک دو، تین ۔۔۔ یہاں تک کہ نو دن گذر گئے اور دسواں دن آن پہنچا۔ اس وقت تک ہم خاصے ناامید ہوچکے تھے۔ سردار نے صبح کے وقت ہی مجھے دو چار گالیاں سنائیں، لیکن زیادہ اکراری گالیاں رات کے لیے محفوظ رکھیں۔

میرے دل میں اب بھی امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی۔ آخر کام بھی تو جوکھوں کا تھا۔ نہ جانے بیچارے کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ ..... لیکن مجھے وہ آہنی ارادے والا جوان معلوم ہوا، یہ ناممکن تھا کہ وہ تہیہ کرلے اور پھر ناکام رہے۔ سردار اس ہیرو کو دیکھنے اور گھوڑی واپس پانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس خیال سے کہ شاید چور کا بھی سراغ مل جائے، کچھ لٹ بازوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا تاکہ موقع پر کام آئیں۔

وقت گذرتا گیا، دوپہر ڈھلنے لگی..... لیکن اس جوان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اب میرے مالک کا دماغ سچ مچ بگڑنے لگا۔ اور میں اس ڈر سے کہ کہیں اس کے قہر کا نشانہ میں نہ آجاؤں طویلے کے باہر رہٹ کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ میں دور دور تک نظر دوڑا رہا تھا۔ ہر راہ گیر پر اسی کا دھوکا ہوتا۔ اسی اثنا میں طویلے سے سردار کی آواز آئی "ارے بھوتیا!"

آواز کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب میرے خیر نہیں، لیکن اندر جانے کے سوا چارہ کار نہیں تھا۔ جاتے جاتے میں ٹھٹکا۔ دور بہت دور سے ایک سوار دکھائی دیا۔ یوں تو اس قسم کے کئی اور سوار آتے جاتے دکھائی دیتے ہی رہتے تھے۔ اور پھر اس قدر دور سے یوں بھی اسے پہچاننا مشکل تھا، لیکن اس سوار کے ہاتھ میں ایک اور لگام تھی، جسے وہ زیری سے بھگائے لیے آرہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی گھوڑی کو پہچان لیا، اور پھر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ سوار بھی وہی نوجوان تھا۔

اس پر میں وہیں سے چلا اٹھا "سردار جی گھوڑی مل گئی"

سردار باہر نکل آیا۔ اس وقت تک نوجوان اور قریب آچکا تھا۔ ہم نے آگے بڑھ کر اس کا سواگت کیا۔ سردار گھوڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے بڑی گرم جوشی سے اس سوار سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنی گھوڑی کو پچکارتا ہوا طویلے کے اندر لے گیا۔

گھوڑی صحن میں باندھ کر سردار نوجوان کا ہاتھ تھامے اس دو کمروں میں سے بڑے والے میں لے گیا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا رہتا تھا، اور چھوٹا کمرا صرف موسم سرما میں بیشوں کے باندھنے کے کام آتا تھا، بڑے کمرے میں لوہے کی چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی، یہ سردار کی امارت کی نشانیاں تھیں۔ اکثر مہمانوں کی مہمان داری یہیں پر ہوا کرتی تھی

اس وقت نوجوان کی شکل وصورت قابل دید تھی۔ وہ ایک لمبا سلک کا کرتا پہنے تھا، اس پر معتدد سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ، نیچے موٹگیا رنگ کا ہتھ نر۔ پاؤں میں نیلی سے چمڑے ہوئے بھاری بھرکم دیسی جوتے، سر پر کلف لگی ہوئی طرادار پگڑی۔ جس کی وجہ سے وہ لمبا جوان اور لمبا دکھائی دیتا تھا۔

سردار نے اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا، اور پانچسو روپے کے نوٹوں کی گڈی میز پر رکھ کر کہا "نوجوان یہ پانچسو روپیا ہے... ہاں بھوتیا ذرا سی شربت کا انتظام تو کرو۔"

نوجوان نے کہا "دیکھیے ایسی شربت کی آپ تکلیف نہ فرمائیے کہ مجھے فوراً واپس جانا ہے..... البتا مجھے آپ سے پانچسو روپے اور بھی لینا ہے۔"

سردار بولا "وہ تو چور کو میرے سامنے لے آنے پر مجھے اس کے پاس لے جانے تو....."

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔" سردار نے ذرا تامل کیا، پھر بھاری آواز میں بولا "اچھا تو یہ بات ہے..... میں سمجھا کہ شاید چور تمہاری جان پہچان کا ہے اور تم اس کا پتا بتانا نہیں چاہتے۔"

نوجوان نے چمکدار آنکھیں اوپر اٹھائیں "یہ ٹھیک ہے، لیکن ایسے معاملے میں، میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔"

"تو ٹھیک ہے..... گویا تم ہمیں چور کے پاس لے چلوگے۔"

"ہاں ـــــ آپ کے آدمی تیار ہیں کیا؟"

"ہاں! ہمارے آدمی تیار ہیں۔"

"تو پس ٹھیک ہے..... میں چور سے آپ کا سامنا کرادوں گا اور اپنی راہ لگوں گا۔ اس کے بعد آپ جانیں اور وہ چور۔"

"منجور ہے۔"

"پرانا مانیے تو وہ روپیا میرے حوالے کر دیجیے، کیونکہ میں روپیا لینے کے لیے واپس نہیں آؤں گا۔" سردار نے نوٹوں کی گڈی اٹھالی، اور میز پر رکھ دی اور رعب سے کہا "سب آدمیوں سے کہو گھوڑیاں کس لیں۔" میں نے دروازے میں سے باہر جھانک کر

صحن میں کھڑے آدمیوں سے پکار کر کہا۔ "سردار جی کہتے ہیں گھوڑیاں کس لو سب لوگ۔"

نوجوان نے ایک گدڑی، ہنبند کے دائیں پہلو اور دوسری گدڑی بائیں پہلو میں بیٹھی اور کس کر انہیں ہنبند کے اندر مضبوطی سے اڑس لیا۔ پھر اس نے اپنی بائیں مضبوط لاٹھی پر چمکیلی چھڑی چڑھائی اور دیوار کی طرف پیٹھ کر کے وہ بیدار سا ہیا نا انداز سے کھڑا ہو گیا مونچھوں کو انگلیوں سے چھو کر بھر پور آواز میں بولا۔

"آپ کی گھوڑی کا چور آپ کے سامنے کھڑا ہے۔" اس کی بات مجھے یوں لگی، جیسے بم کا گولا پھٹ گیا ہو۔ ..... مجھے تعجب ہوا کیا واقعی؟ ــــ لیکن بیچ بچاؤ ہمارے سردار کی گھوڑی چرانا معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ..... وہ سہرے ہوئے لمحوں میں مجھے خشکی کا احساس ہوا۔ دیکھا یہ تھا کہ اب سردار کیا کرتا ہے، کیوں کہ اتنے برسوں میں، میں نے کسی کو اس قدر جرأت کے ساتھ سردار کو للکارتے نہیں دیکھا تھا۔

ادھر سردار بت بنا کھڑا تھا، یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے سارے بدن کا لہو اس کی آنکھوں میں دمک رہا ہو۔ مارے غصے کے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، لیکن بات منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ غالباً سردار دوسرے آدمیوں کو بلانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا، ادھر وہ نوجوان بڑی دل جمعی سے پانی کے گھڑے کی طرف بڑھا، قریب پڑے ہوئے کانسے کے کٹورے کو اٹھا کر اس میں پانی بھرا، اور اطمینان سے گھونٹ در گھونٹ پینے لگا۔

سہما سہما دروازے کے قریب کھڑا اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ ..... لیکن کچھ بولا نہیں ..... نوجوان نے پانی پی کر انگوچھے سے ہی مونچھیں پونچھیں اور چھری والی لاٹھی کو بائیں ہاتھ میں تول کر دروازے کی طرف بڑھا، جدھر سردار کھڑا تھا، کیونکہ اس دروازے کے سوا باہر جانے کا اور کوئی اور رستا نہیں تھا۔

سہما سہما کی مٹھیاں بند ہو ہو کر کھل رہی تھیں، اور کھل کر بند ہو رہی تھیں۔ نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے دھیرے قدم بہ قدم اس کے پاس پہنچا، ٹھٹک کر رکا، لمحہ بھر کو دونوں کی آنکھیں ملیں، یوں سوچ رہا تھا کہ اب وار ہوا کہ ہوا، لیکن سردار نے بات اور پر نہیں اٹھایا۔

نوجوان آگے بڑھا اور طویلے کے صحن میں بڑے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ سردار قدرے تامل کے بعد اس کے پیچھے گیا اور طویلے کے صحن کے بڑے دروازے پر جا کر رک گیا۔ .....

چار لٹھ باز سردار کے حکم کے منتظر تھے۔ وہ نوجوان بے اعتنائی سے چلتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا، اور سوار ہونے سے پہلے اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا، مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھوٹ رہی ہو۔ جیسے وہ مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سہما سہما نے لٹھ بازوں سے اب بھی کچھ نہیں کہا، یہاں تک کہ گھوڑا مدھم دھوپ میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ میں سردار کے پیچھے کھڑا تھا، جبکہ وہ ایک کنارے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیکے چپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے اس کا چہرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے یہ جاننا محال تھا کہ اس کے چہرے کے جذبات کیا ہیں .....

خفقانی دیر بعد اس نے میری جانب دیکھے بغیر بے کیف اور بھاری آواز میں سوال کیا۔ "تم اسی نوجوان کا رشتہ لالی کے ساتھ کرنے کو کہہ رہے تھے؟"

میرے ہونٹ، زبان اور حلق چشم زدن میں خشک ہو گئے۔ اور میں ڈر کے مارے کچھ جواب نہیں دے سکا ..... اس پر سردار نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔

ــــ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر گھنی مونچھوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے ..... ایک موہوم سی مسکراہٹ جنم لے رہی تھی۔



کمراہ ہشیارپوری

نعرۂ امن

سر جھکانا پڑے گا موجوں کو
منہ کی کھانا پڑے گا موجوں کو

سر بہ خم امن کی حضوری میں
آج آنا پڑے گا موجوں کو

ظلم اور جور کو مٹائیں گے
ایسے کچھ انقلاب آئیں گے

جابروں کے یہ خون کے دھندے
چل چکے اب نہ چلنے پائیں گے

پیار کی کشتی بڑھتی جائے گی
لاکھ طوفان ہوں رک نہیں سکتی

سو پھریرے ہوں جنگ کے کمراہ
گردن امن جھک نہیں سکتی

حیدرآباد کے سب سے قدیم بینکنگ ادارے میں
آپ اپنا بینکنگ کاروبار کیجئے!
جی۔ رگھوناتھ مل بینک لمیٹڈ

ڈپازٹ کی رقمیں دلفریب شرح سود کے ساتھ وصول کرتا ہے۔
سیونگس بینک ۳½ فی صد سالانہ اسپیشل سیونگس بینک ۴ فی صد سالانہ
مقدمہ اور مطالباتی ڈپازٹ رقموں پر خاص شرحیں بھی دیجاتی ہیں۔ اس خصوص میں ہم سے معلومات حاصل کیجئے۔
قیمتی اشیاء کے بحفاظت رکھنے کے لئے واجبی شرح پر سیف ڈپازٹ لاکرس بھی [illegible] ہیں۔
ہمارا سیاحتی ادارہ دنیا کے کسی بھی حصہ کے لئے، سندری، ہوائی اور ریل کے سفر [illegible] انجام دیتا ہے۔ براہ کرم ٹیلیفون نمبر (۴۶۵۳) TELEPHONE No. 4653 سے رجوع حاصل کیجئے

تفصیلات کیلئے حسب ذیل پتہ پر لکھئے
TELEPHONE NOS. 4040- 4041 A. SITARAMAIAH, SECRETARY, G. RAGHUNATHMULL BANK, LTD. HYDERABAD, (A.P.) GRAMS "SINGHVEE"

آندھرا پردیش کے مشہور لوم کپڑے

ہینڈ لوم

"ساڑیاں اور دھوتیاں"

گدوال، سدی پیٹھ، پوچم پلی، پدا پنڈیال، آرمور، جنگاؤں وغیرہ

"بیڈ شیٹ اور زیبایش کے کپڑے"

سکندر آباد، کریم نگر، ورنگل وغیرہ

"چولی کے کپڑے"

جنگاؤں، گدوال، سدی پیٹھ وغیرہ

"قمیص اور کوٹ کے کپڑے"

سکندر آباد، پدا پنڈیال، ورنگل، حضور آباد، کوسگی وغیرہ

"شطرنجیاں"

ورنگل

فی ٹ۔ سوتی ہینڈلوم کپڑوں کی چلر فروخت پر ۲ یا ۲ سے زیادہ روپے کی خریدی کی شکل میں ۶ نئے پیسے کی کمی دیجاتی ہے۔

HYCOFABRICS

خریدیئے!

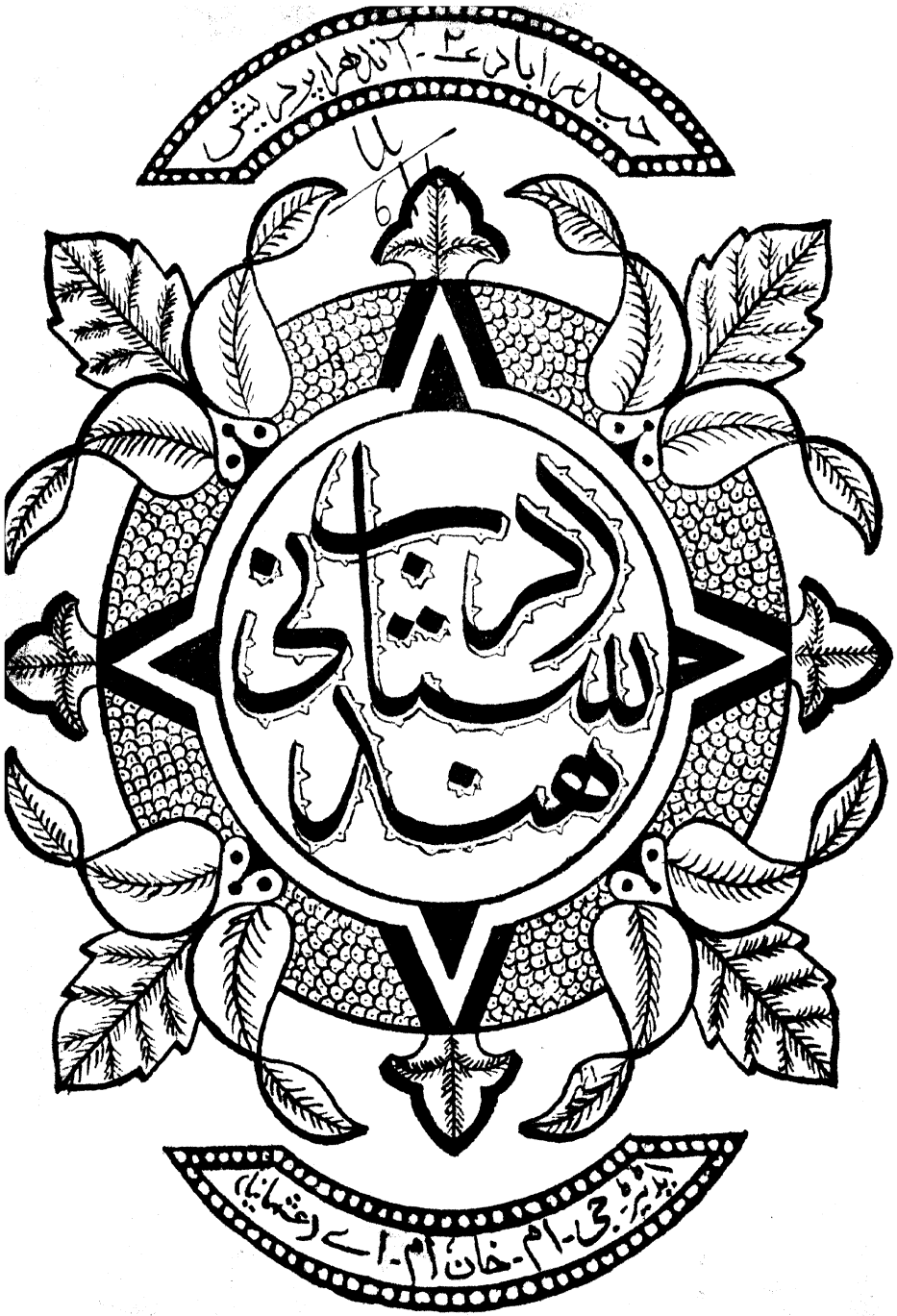
مقامی ایمپوریا

(۱) نارائن گوڑہ (۲) نام پلی (۳) سلطان بازار نمبر (۱) نزد مسجد (۴) سلطان بازار نمبر (۲) روبرو دلشاد ٹاکیز (۵) مہاتما گاندھی روڈ سکندر آباد

حیدرآباد ہینڈلوم ویورس سنٹرل کوآپریٹو سوسیٹی لمیٹڈ

(حیدرآباد دکن)

جی۔ ام۔ خان، نے بطبع ابراہیمیہ کیپٹل منڈی، حیدرآباد ۱ میں چھپوایا۔


حیدرآباد دکن - آنارھرا پردیش
ہدایت
پیر بی۔ ایم۔ خان ایم۔ اے (عثمانیہ)

ٹرڈ نمبر — ایچ (۱۸۴)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

جلد (۲۰) — نمبر (۵)

ہندستانی ادب

سالانا — آٹھ روپے

۱۳۶۹ف — سنہ ۱۹۶۰ء

وردی — فروری

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا) — شکریے کے ساتھ

	عنوان	نام		
	۔ ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
	۔ حقایق و معارف	لسان الحقیقت افتر موہانی وارثی	۴	
	۔ غزل	ناخدا آسخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۵	
	۔ سابرمتی کا سادھو	ساغر نظامی	۶	
	۔ گاندھی	جگناتھ آزاد	۶	
	۔ سہاگ رات	خالد شفائی	۷	شاعر
	۔ اعتبار الملک دلی شاہجہانپوری	اختر علی ظہری	۸	
	۔ غزل	اعتبار الملک دلی شاہجہاں پوری (مرحوم)	۹	
	۔ رباعیات	شفیق بینائی	۹	
	۔ ماتم دل	ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۱۰	رہنمائے تعلیم
	۔ رعنائیاں	ابراحسنی گنوری	۱۰	
	۔ سوتیلی ماں	مالک رام ام۔ اے	۱۱	پگڈنڈی
	۔ غزل	بتول احمد دہلوی	۱۴	عفت
	۔ غزل	راہی فیض آبادی	۱۹	
	۔ شاد عارفی اپنی نظر میں	شاد عارفی	۲۰	افکار
	۔ غزل	شاد عارفی	۲۲	پگڈنڈی
	۔ ہندستانی تھیٹر کا معمار۔ جگناتھ شنکر سیٹ	ڈاکٹر اے۔ اے۔ نامی	۲۳	نوائے ادب
	۔ غزل	سہیل احمد سہیل	۲۷	
	۔ موج رنگین	فاروق مخمد بدایونی	۲۸	خاتون مشرق
	۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!	ایڈیٹر	۲۹	
	۔ دلی میں اردو کا خاتمہ	صاحبزادا مستحسن فاروقی	۳۱	پیام مشرق
	۔ عبدالحق اکاڈیمی	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۳۲	

ہمارے خیالات

بحیثیت ڈائجسٹ "ہندستانی ادب" کا تیسرا کامیاب سال

فروری ۱۹۵۸ء میں ہم نے اس رسالے کو "ڈائجسٹ" کی شکل دی تھی۔ دو سال نہایت ہی کامیابی کے ساتھ گذر گئے اور اب رسالے نے اس نمبر سے تیسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سال اور بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔ اسلیے کہ تبادلے کی فہرست کافی طویل کر دی گئی ہے۔ ان رسالوں میں ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہوار، سہ ماہی، چھماہی اور سالانہ نمبر بھی شامل ہیں۔

یہ کام آسان نہیں بلکہ بڑا ہی کٹھن ہے۔ سچ جانیے کہ ہم پر ایک غیر معمولی آفت اور مصیبت نازل ہو گئی۔ ہم پر صبح آرام حرام ہو گیا ہے۔ راست مضامین کی صورت میں صرف ایک ایک ہی مضمون دیکھنا ہوتا تھا، مگر اس انوکھے انتخاب کی شکل میں کئی کئی مضامین دیکھنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک افسانے ہی کو لیجیے۔ ہمارے اصولوں اور معیار پر پورا اترنے والے افسانے کی تلاش میں کئی ایک رسالوں کے افسانے دیکھنے پڑتے ہیں۔ یہی حال مضامین اور نظموں وغیرہ کا بھی ہے۔ بہرحال ہر مہینہ ایک "ڈائجسٹ" کا تیار کرنا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔

ہم نے پہلے بھی لکھا تھا اور آج پھر سے اس بات کو دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ رسالا سو میں سو ڈائجسٹ نہیں ہے۔ جو حضرات شخصی طور پر مضامین بھیجنا چاہیں، وہ سیدھی سے بھیج سکتے ہیں۔ ہم اس طریقے کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ مضامین رسالوں سے بھی نقل کیے جائیں اور راست آئے ہوئے مضامین کو بھی ساتھ ساتھ جگہ دی جائے۔

کچھ پچھلے نمبر کے بارے میں

"جمہوریا" نمبر کافی دیر سے نکلا جس کا ہمیں آخر تک ملال ہے۔ اس رسالے کی تیاری کے زمانے میں ہم سخت بیمار پڑ گئے تھے، جب کبھی ہم فریش ہو جائیں تو کام کو پورا کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ تھوڑی بہت صحت کے بعد، پھر سے خدمتیں کو کام بانٹ میں لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں ہم نے اس ادھورے کام کی تکمیل کی۔ ہم نے صرف آخری ۹ تا ۶۴ کا پروف دیکھا تھا، درمیانی دو پروف کی حد تک پریس کو ذمہ دار کر دیا تھا۔ کام کی جلدی تھی، اس لیے بجائے کام رات ہی میں کر دیا، اس لیے ابتدائی ۱ تا ۱۶ صفحوں کا پروف پریس نے ہمارے ہاں نہیں بھیجا اور نہ خود دیکھنے کی زحمت گوارا کی۔ نتیجہ یہ رہا کہ کتابت کی بعض ناشی اور ناگوار اغلاطیاں رہ گئیں۔ مثال کے طور پر ــــ ایڈیٹوریل میں صفحہ تین سطر تین میں لفظ "بعد" اور سطر ۷ میں لفظ "نے" لکھائی سے رہ گیا ہے۔ اس کے بعد سطر ۱۲ کے نصف آخر سے سطر ۱۴ کے نصف اول تک کی عبارت سرے سے لکھی ہی نہیں گئی ہے۔ صفحہ ۱۶ پر نظم "تسمت جمہور" کے چوتھے مصرع میں "شانے" کی بجائے "سانے" پڑا جائے، اور ۱۲ ویں مصرع میں "گونجتے" کے بعد "جہاں" کا لفظ لکھائی سے رہ گیا ہے۔

غضب تو یہ ہے کہ صفحہ ۲ کے آخر میں اظہار افسوس کے لیے ہم نے جو نوٹ دیا تھا، اس کے "بیجا" الفاظ "کو افسوس ہے" مشین کے دانتوں کی بیدردی کا شکار بن گئے! بہرحال، ان تمام بدعنوانیوں کے بدلے ہم پھر سے اظہار "افسوس" کیے دیتے ہیں۔ آشا ہے کہ "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والے اس بول چوک کو نظر انداز کر دیں گے!

اعتبار الملک دل شاہجہانپوری

"ہندستانی ادب" کی ایک بدبختی یہ تھی کہ ہندستان کے ایک چوٹی کے شاعر اعتبار الملک دل شاہجہانپوری سے بہت دیر میں ربط پیدا ہوا تھا، اور دوسری بدبختی یہ ہے کہ یہ رسالا ان کی سرپرستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا، لیکن ہم فلک بختی کے دور سے بھی کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس رسالے کو مرحوم کا مسلسل قلمی تعاون حاصل تھا۔ ہم ان کے اس احسان کا حق کس طرح پر ادا کر سکتے ہیں ــــ سوائے اس کے کہ "ہندستانی ادب"

دلی شاہجہانپوری نمبر نکالیں ــــ مگر اس کے یہ معنی پہلی شرط یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کے دونوں صاحبزادے شبیر حسن خاں اور شفیق حسن خاں، ہماری ہر طرح سے اور پوری پوری مدد کریں۔ مضامین اور نظموں کی فراہمی بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ یہ ان حضرات کا کام ہے کہ دلی (مرحوم) کے جاننے پہچاننے والوں اور شاگردوں کو توجہ دلا کر حضرت دلی پر مضامین اور نظمیں وغیرہ فراہم کر کے ہمارے ہاں بھیجیں۔ ضروری مواد کی فراہمی کے بعد ہم اس رسالے میں خاص نمبر کے نکالنے کا اعلان کریں گے، ورنہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا اعلان آفتر میں چل کر بے معنی سا بن کر رہ جائے گا۔

حالی مرحوم کی زندگی، ان کی سیرت، خوش اخلاقی، فکر مزاجی اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور قابلیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہم اس میں اضافہ ہی کیا کر سکتے ہیں سوائے اس کے یہ کہیں کہ "دنیائے شاعری کا جب دلی ہی چلا گیا، تو دنیائے شعر بے دلی سی ہو گئی!"

ہماری عوام کے تمام پسماندہ دلی ہمدردی ہے اور خصوصاً شبیر حسن خاں صاحب اور شفیق حسن خاں صاحب شفیق میانی سے ہم خاص طور پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔

اُردو "پاکستان کی زبان ہے!
یہ ایک حقیقت ہے

حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے اور ہم بھی تو انکار نہیں کرتے ہمارا بھی تو کہنا ہے کہ "اردو" پاکستان کی زبان ہے۔ ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں اس نمبر کے صفحہ ۳۲ پر عبدالحق اکاڈمی (پاکستان) کا ایک اعلان دیکھیے۔ اس کے سکریٹری پاکستان کے مشہور اور قابل ادیب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "بابائے اردو" "پاکستان کی نو سالہ سالگرہ" کے سلسلے میں ایک اعلان نامہ بھیجا، اور ہم نے بلا تکلف اسے شایع کر دیا۔ ہم یہ پورے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ "اردو" ہی کے پروپگنڈے کے سلسلے میں ہے۔ رہا کرے، "یہ اردو" سے کب پیار ہے" جو ہم اس زبان کی مخالفت کریں۔ دنیا کی ان گنت زبانوں میں سے "اردو" بھی ایک زبان ہے۔ جس طرح ہمیں دنیا کی اور زبانوں سے پیار ہے ہم "اردو" سے بھی پیار کرتے ہیں، اور جب ہم یہ جانتے ہیں کہ "اردو" پاکستان کی زبان ہے تو پھر اس سے پیار کرنے میں کوئی بعد نظر نہیں آتی۔

ہندستان کے وہ ادارے جو اردو کے پروپگنڈے سے ملے ہوئے اعلانات اور اطلاعات بھیجے تھے، ہماری اس محبت پر ناخوش ہے نہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہمارے ان خیالوں کا مذاق بھی اڑائیں! ہمیں اس کی ذرا بھی پروا نہیں، اس لیے کہ ہمارا کھلے طور پر یہ کہنا ہے کہ اردو کو ہندستان کی زبان سمجھنا بجائے خود ایک حسین فریب اور نہ دوست دھوکا ہے۔ اردو کی نام نہاد دستوری حیثیت سے ہم آپ سے زیادہ واقف ہیں، اس لیے کہ آپ کی طرح ہم اس مکر کے جال کا شکار تو نہیں ہیں۔ اس فریبی جال کے بارے میں ہم برسوں سے جو کچھ لکھتے آئے ہیں، آج دیوانے پرستاران اردو، خدا ہی اس خصوص میں بھلا اٹھے ہیں۔ اگر ہماری بات پر یقین نہ آتا ہو تو ایڈیٹر "پیام مشرق" دلی کے ایڈیٹوریل نوٹس" دلی میں اردو کا خاتمہ" اس نمبر کے صفحہ ۱۳۱ پر پڑھ لیجیے، تب تو آپ کو یقین آئے گا کہ اردو کی مخالفت میں ہم جو کچھ لکھتے آئے ہیں وہ سوفیصد سچ ہے۔

اور بھی ایک بات سنائیں آپ کو، سنیے! بڑے ہی مزے کی بات ہے، اور مزہ لیجیے!!

"ہندستان کی تمام ۱۲ زبانوں میں نیوز ریل کی تیاری"

"نئی دلی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء۔ پارلیمانی امور کے اسسٹنٹ کا اعلان کیا گیا ہے کہ فلم ڈویژن آف انڈیا آئندہ سے ہندستان کی تمام ۱۳ زبانوں میں نیوز ریل تیار کرے گا۔

موجودہ صورت میں نیوز ریل مرتب پانچ زبانوں میں تیار کی جاتی ہیں ــــ ہندی، تامل، تیلگو، بنگالی اور انگریزی۔ آئندہ سے نیوز ریل باقی ان زبانوں میں بھی تیار کی جائیں گی۔ کشمیری، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، کناڑا، ملایالم، اڑیا، اور آسامی" (پی۔ ٹی۔ آئی)

پولیس ٹرسٹ آف انڈیا کی خبر ہے یہ۔ اس کے صحیح ہونے میں آپ کو کوئی شبہ تو نہیں ہوگا؛ ذرا حقیقت کی عینک لگا کر اس خبر کو پڑھ ڈالیے ــــ نہیں، نام و نشان تک نہیں ہے اس مستند خبر میں آپ کی پیاری "بی" اردو کا ــــ ابھی رونے پیٹنے اور واویلا کرنے سے کیا حاصل!

ہوش کے ناخن لو، سوچو! سمجھو!! کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم تو اس کو مداری کے تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور یہ سوال کہ آخر ہم کہنا کیا چاہتے ہیں ــــ یہی کہ ہندستان کی عام اور ملی

شکر خدا کہ مل گئی تجھ کو متاع دو جہاں
میری جبین شوق ہے یار کا آستاں

کم تھی بقدر شوق دل فرصت عمر جاوداں
حشر میں کہہ رہا ہوں میں باقی ابھی ہے داستاں

کتنو ہے عبرت آفریں اہل چمن کی داستاں
آج قفس نصیب ہیں کل تھے بہار آشیاں

دونوں جہاں تھے بے خبر طاعت و کفر سے جہاں
ایسا بھی اک تھا آستاں دیر و حرم کے درمیاں

آنے لگے ہیں اب نظر منزل یار کے نشاں
جاتی ہے چھوڑ کر مجھے عمر گریز پا کہاں

غازۂ روے دو جہاں تاج سر جہانیاں
سرمۂ چشم عاشقاں یار کی خاک آستاں

جا کے قفس سے کیا کریں جب یہ چمن کا حال ہو
کیسی بہار گلستاں آتی نہیں نظر خزاں

اس کی نظر کی رفعتیں کس کی نظر میں آسکیں
جو کہ بتوں کے عشق میں سمجھے خدا کو درمیاں

مست فضا بہار مست، سبزہ و لالہ زار مست
رنگ گل و ہزار مست، آہ یہ وہ نظر کی مستیاں

عمر رواں کی گردشیں کب رہیں ایک حال پر
کل جو تھے میر کارواں آج ہیں گرد کارواں

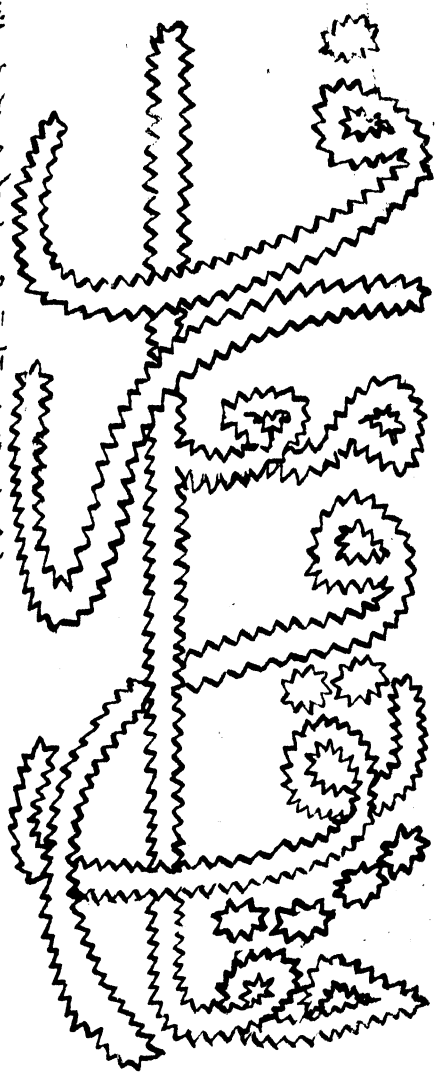
دہر کے ذرہ ذرہ میں گونجی صدائے بازگشت
جبکہ سہانی رات میں بولا پپیہا پی کہاں

خانۂ دل میں کیوں رہے تیرے سوا تیرا خیال
غیرت حسن کو تری بانیٔ جور کیا ہوا

ہوتے ہوئے ترے میں ہوں وقف جفا آسماں
لائق سجدہ آستاں آیا نظر نہ جب کوئی

رہ گئے سر جھکا کے ہم دیر و حرم کے درمیاں
اس کا سر نیاز ہے دیر و حرم سے بے نیاز

جس کا ہو کعبۂ یقیں یار کا افقر آستاں



لسان الحقیقت
افقر موہانی
وارثی



مجھ کو کبھی کرے نہ تیری انجمن سے دور
ہے یہ امید گردش چرخ کہن سے دور

ایک ایک عضو تن ہو ہمارے بدن سے دور
یہ کانٹ چھانٹ بھی نہیں اس تیغ زن سے دور

کیوں ہوں نہ بے قرار طیور نفس نصیب
ان سے چمن بھی دور ہے یہ بھی چمن سے دور

اہل وطن تو دور غریب الوطن سے ہیں
یا وطن نہیں ہے غریب الوطن سے دور

آئے گی فصل گل تو کھلائے گا یہ بھی گل
دست جنوں ابھی ہے میرے پیرہن سے دور

اے باغباں پہنچ نہیں سکتا کسی کا ہاتھ
وہ گل ہے خوش نصیب جو بلبل چمن سے دور

آنے کے وہ نہیں اسے نہلائیں اقربا
رکھی ہوئی ہے لاش ہماری کفن سے دور

دیکھوں نگاہ اٹھنی ہے ان کی کب اس طرف
بیٹھا ہوا ہوں میں بھی الگ انجمن سے دور

دنیا کا دوسرا بھی ہے اک نام غمکدہ
ممکن نہیں رہے کوئی رنج و محن سے دور

صد حیف اس مسافر بے کس کی موت پر
غربت میں رہ گیا جو مزار و کفن سے دور

ہر وقت برق و صرصر و صبا کا خیال ہے
میں آشیاں بناؤں گا اپنا چمن سے دور

دیتا تھا میں دعا جنہیں کرتے تھے جو سلام
پیارے میرے وہ ہو گئے پیارے وطن سے دور

اے جذب عشق لیلیٰ وہ محمل میں کو کیا ہوا
مجنوں سے یہ ہے دور وہ ہے کوہکن سے دور

باتیں جو منہ ہی منہ میں ہو کیا ان کا پوچھنا
یعنی ترا دہن نہ ہو میرے دہن سے دور

صحرا کا گشت سیر گلستاں کے ساتھ ساتھ
میں ہوں کبھی چمن میں کبھی ہوں چمن سے دور

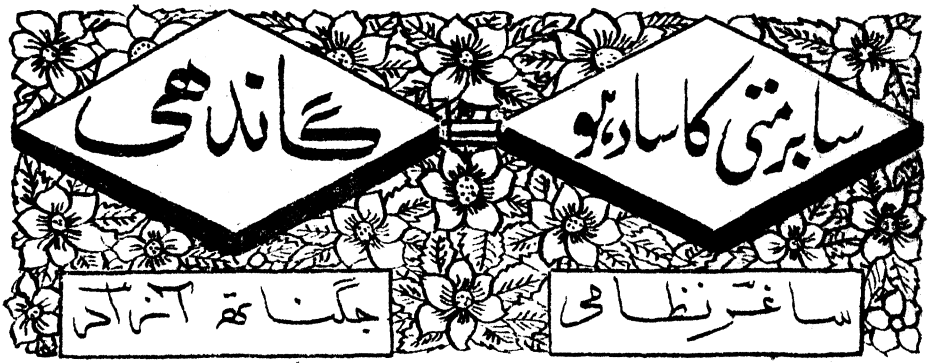
رنج و محن میں جس نے مجھے مبتلا کیا
یارب رہے مدام وہ رنج و محن سے دور

آ کر مزار پر وہ چڑھائیں گے پھول خاک
مٹی کا عطر بھی ہے ہمارے کفن سے دور

وہ دن خدا دکھائے کسی دن خدا کرے
عیش و خوشی کے پاس ہوں کرب و محن سے دور

ہنگام نزع دل بہت اپنا ہے بیقرار
میت بھی ہو کہیں نہ تڑپ کر کفن سے دور

اے نوح جیتے جی وہ دوبارہ ملیں گے کیا
اہل وطن گئے جو نکل کر وطن سے دور



ہزار انجم افشاں نچوڑ کر تو نے
شب سیہ کو کیا مطلع سحر تو نے

سحر تھی نور سے خالی تو شب تھی انجم سے
شب و سحر کو بنایا شب و سحر تو نے

ہر اک شعاع تھی جس کی امیر تاریکی
سنائی رات کو اس صبح کی خبر تو نے

دل خواص کو تو نے غم عوام دیا
عطا عوام کو کی چشم فتنہ گر تو نے

فغان نیم شبی کو نئی تڑپ بخشی
دعا کی بے اثری کو دیا اثر تو نے

نزاکت گل و لالہ کو دی سلاست برق
مزاج کاہ کو بخشا دم شرر تو نے

جو اپنی قوت پر در بھول بیٹھے تھے
لگا دیا انہیں ذروں میں مثل در تو نے

جو کانپتے تھے مہیبوں کے جھمیلے سے
عطا کیا انہیں شاہین کا جگر تو نے

جو فتنہ و سنگ کا اک ڈھیر تھے تباہ و بیاں
اگا دیا انہیں کھنڈروں میں مثل در تو نے

نہ موج ہی کو تپھوا اور نہ سبزہ و گل کو
کچھ اس طرح کیے آزاد بحر و بر تو نے

بہار کو تشنہ کر دیا ہونے تیرے
چمن کی خاک کو بخشا لباس زر تو نے

دل زمانہ دمکتا رہیگا صدیوں تک
لہو سے ثبت کیا نقش کا لجر تو نے

آیا وہ خواب مست غلاموں کی دیس میں
بیداریٔ حیات کی دنیا لیے ہوئے

ہاتھوں میں لے کے پرچم آزادی بشر
چلتا رہا خلوص کا جذبہ لیے ہوئے

دنیائے قید و بند کا رتبہ بڑھا گیا
ہاتھوں میں جو ہتھیار کا پودا لیے ہوئے

ہر گوشۂ حیات کو پر نور کر گیا
حسن عمل کا جلوۂ زیبا لیے ہوئے

گرم ستیز سطوت افرنگ سے ہوا
آزادیٔ وطن کی تمنا لیے ہوئے

ٹکرا کے سامراج کے سنگین دور سے
اہل وطن کے عشق کا سودا لیے ہوئے

اس نے ظلم توڑا سامراج کا
اک عظمت بشر کا سہارا لیے ہوئے

وہ پیکر نحیف وہ اک ناتواں سا جسم
آدم کی قوتوں کا خزانہ لیے ہوئے

ہندوستاں کی خشک زمینوں پر پھر گیا
بیٹھے ہیں اپنے عزم کا دریا لیے ہوئے

پہنچا وطن جو منزل مقصود کے قریب
آزاد زندگی کی تمنا لیے ہوئے

یہ پیکر نحیف گرا کار زار میں
سینے پہ زخم درد وطن کا لیے ہوئے

اور زندگی درد کا پالا ہوا بشر
رخصت ہوا شہید کا رتبہ لیے ہوئے

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

خالد شفائی

آج کی رات ہے کس درجہ حسین و شاداب
آج کی رات بہاروں کے چمن کھلتے ہیں
زیست کی نغمہ بہ لب پیار بھری راہوں پر
دو محبت بھرے، دو اجنبی دل ملتے ہیں

کہکشاں شوخیٔ خلعت پہ بصد شوق نثار
لے کے آئے ہیں ستارے بھی محبت کا پیام
آج نس نس میں ہے کیف جوانی رقصاں
اور بیتاب چھلکنے کو ہیں شادوں کے جام

گنگناتی ہے فضاؤں میں ہواؤں کی یہ لے
رقص فرما ہے تصور میں خلا کی دلہن
جگمگاتے ہیں نگاہوں میں جنوں خیز دیے
تیز ہوتی ہی چلی جاتی ہے دل کی دھڑکن

چاند شرماتے ہوئے جھانکتا ہے روزن سے
چاندنی پیار سے اٹھلاتی ہوئی آتی ہے
ہر طرف جلوۂ رنگیں ہیں ہے اک نور ہی نور
عود و عنبر میں فضا ساری مہکی جاتی ہے

دل ہے غلطیدہ مسرت کے بھرے ساغر میں
آرزو شاد و نیا بار ہوئی جاتی ہے
انکھڑیاں بادۂ مستی سے ہیں بوجھل بوجھل
زندگی مست و نشہ بار ہوئی جاتی ہے

ڈھلتے جاتے ہیں جس رات کے رنگیں سائے
اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے جذبات کی آگ
یہ حسیں رات دبے پاؤں یونہی بیت نہ جائے۔
ہاں جگادے کوئی نغمہ کوئی جادو کوئی راگ

ایک مدت سے دھڑکتا تھا یہ دل جس کے لیے
اپنے جلووں کو لیے آج وہ دن آ ہی گیا
ہر طرف کیف ہے، رنگینی و رعنائی ہے
توڑ دے سحر خموشی مگر اے جان حیا

اور پازیب کہ تیری، یہ چمکتے گھنگرو
منتظر ہیں کہ ترے پاؤں کی انگڑائی لیں۔ ہیں
جگمگاہٹ لیے اپنی یہ جڑاؤ کنگن
چاہتے ہیں کہ تیری صندلی سی کلائی میں سجیں

دیکھ گوندھے ہوئے پھولوں کا یہ رنگیں گجرا
مضطرب ہے ترے جوڑے کی کماں بن جانے
کب سے بیچین ہے مہکی ہوئی کلیوں کی یہ سیج
تیری شاداب جوانی کا جہاں بن جانے

یہ دمکتی ہوئی بندیا تیری پیشانی پر
کتنی بے تاب ہے پھر نو جہاں بننے کو
یہ چمکتا ہوا جگنو ترے سینے کے قریں
ہے تمنائی اجالوں کا نشاں بننے کو

آج کی رات ہے کس درجہ طرب خیز و حسیں
آج کی رات بہاروں کے چمن کھلنے دے
زیست کی نغمہ بلب پیار بھری راہوں پر
دو محبت بھرے، دو اجنبی دل ملنے دے

آج کی رات نیا عہد ہمیں کرنا ہے
تیرے کاکل کی، تری مانگ کی افشاں کی قسم
لب لعلیں کو ترے چوم کے یہ کہنا ہے
ساری دنیا کو محبت کی طرف لائینگے ہم

وہ محبت کہ جو ہے آدم و حوا کا جمال
ہجر کا نور یہی اور یہی صبح وصال

اعتبار الملک دلؔ شاہجہاں پوری

اختر علی ظہیری

ہندستان اور پاکستان کے مشہور شیریں بیان نغز گو شاعر جناب حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۹ء بروز پنجشنبہ رحلت فرمائے ملک بقا ہوئے۔ آپ کے دل گداز سانحۂ انتقال سے ایوان شاعری کا ایک بڑا رکن گر گیا۔ انجمن سخنوری کا ایک فروزاں چراغ بجھ گیا۔ جناب دلؔ شعر و سخن کے ایک مخصوص دبستان دہلی کے یادگار تھے۔ مشرقی اخلاق و آداب کے پاکیزہ اقدار کی حامل نسل کے نمایندہ تھے۔ ۱۸۷۶ء میں شاہجہانپور کے ایک نمودار خانوادے میں آپ کی ولادت ہوئی۔ جناب امیر مینائی مرحوم کے ممتاز ترین تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ خود اپنے مقام پر ایک مسلم الثبوت استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ فن شعر کے رگ و ریشے سے مکمل طور پر واقف تھے۔ ہندستانی شعر و ادب کے تنازع مسایل پر آپ کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا۔ آپ کے لاتعداد تلامذہ کی ایک بڑی جماعت ہے جو ہندستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے دو سعید فرزند موجود ہیں۔ بڑے کا نام شبیر حسن خاں ہے جو شاہجہانپور میں وکالت کرتے ہیں اور چھوٹے کا نام شفیق حسن خاں ہے جن کی دو رباعیاں شفیق رباعی کے نام سے اکثر ذوق نواز پڑھتے رہتے ہیں۔

جناب دلؔ میں نفاست و شرافت اور وضعداری کی خصوصیتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ آپ کو فطرت سے صاف ستھرا ذوق سخن ملا تھا۔ فن کی مہارت اور برسوں کی مشق نے ان کے اس جوہر طبع کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ ان میں تو ملا کر ان کے کلام کو ایک نیا ذہن، ایک نیا مزاج، ایک نیا لہجہ دے دیا تھا۔ بیعت میں ان کے تلمذ کی آواز میں مٹھاس اور بھی رسیلا پن تھا، انفرادیت تھی کیف تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے حادثۂ ارتحال پر نہ صرف شاہجہانپور ہی سوگوار نہیں ہوگا، بلکہ ہندستان اور پاکستان کے تمام ادبی حلقے ماتم گسار و نوحہ خواں ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ دلؔ کا انتقال نہیں ہوا ہے، بلکہ عروس غزل کا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ ع ایک شیریں کلام تھا نہ رہا

ان کی غزلوں کا مجموعہ عادت دوام ہوئی "نغمۂ دل" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "ترانۂ دل" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس پر یو۔ پی گورنمنٹ کی طرف سے ان کو انعام بھی ملا تھا۔ چار پانچ سال سے مرکزی حکومت کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے صلے میں وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ شاہجہاں پور کی ہر ادبی محفل کی ہر شعری انجمن کی زینت ہوتے تھے، اور اپنے دلنواز کلام سے سامعین کے ذوق کی ضیافت فرماتے تھے۔ ادھر تین سال سے ان پر امراض کا مسلسل ہجوم رہنے لگا تھا، اور ادبی محفلوں کی شرکت سے معذور ہو گئے تھے، مگر ہم نیازمندان دور و دولت پر حاضر ہو کر ان کی زبان فیض ترجمان سے شعر و سخن کے متعلق رموز و نکات سنتے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ آہ! اب اس کا بھی موقع نہ رہا۔ حضرت دلؔ کی شاعری پر تفصیلی مقالہ تو پھر حاضر کیا جا سکے گا۔ اس وقت تو صحیح پرسہ کے جذبات کی پورش ہے ایسے عالم میں کسی تفصیلی مضمون کی تحریر کا سوال ہی کیا۔

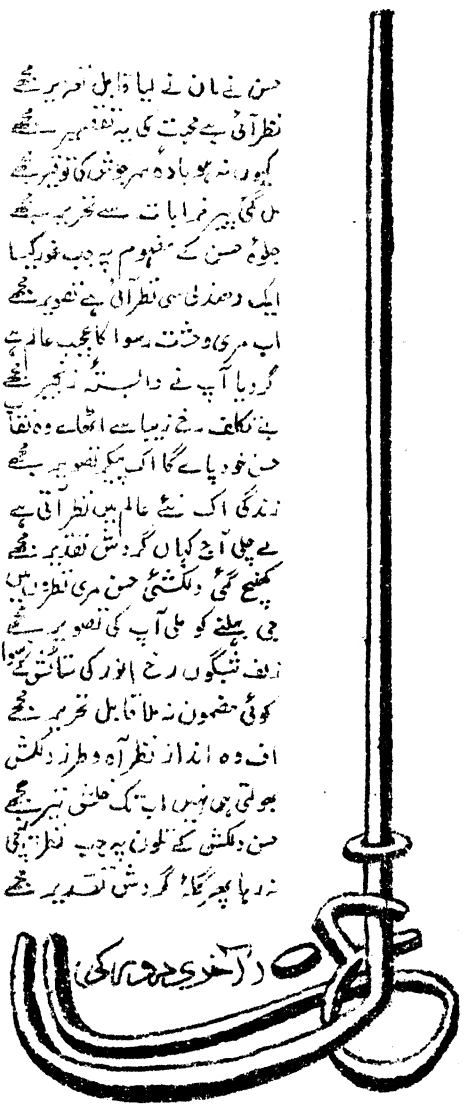
جناب دلؔ ہی کے ایک شعر پر یہ فسانۂ الم ختم کیا جا رہا ہے —

مرا حال تھا جہاں تک وہ ادا ہوا زباں سے
جو کہیں گے اشک رنگیں وہ الگ ہے داستاں سے

نوٹ — دلؔ مرحوم سے متعلق نہایت ہی تفصیلی اور معلوماتی مبسوط مقالہ لکھ بھیجیے تاکہ اس رسالے میں شایع ہو سکے۔
ایڈیٹر

اعتبار الملک مرزا شمشاد بھوپالی

(مرحوم)



حسن نے مان نے لیا قابل تحریر مجھے
نظر آئی ہے محبت کی یہ تقدیر مجھے

کیوں نہ ہو بادۂ سرجوش کی توقیر مجھے
مل گئی پیر مغاں سے خط تعمیر مجھے

جلوۂ حسن کے مفہوم پہ جب غور کیا
ایک دھندلی سی نظر آئی ہے تصویر مجھے

اب مری وحشت رسوا کا عجب عالم ہے
گر دیا آپ نے دانستہ زنجیر مجھے

بے نقاب رخ زیبا سے اٹھائے وہ نقاب
حسن خود پائے گا اک پیکر تصویر مجھے

زندگی اک نئے عالم میں نظر آتی ہے
لے چلی آج کہاں گردش تقدیر مجھے

کھنچ گئی دلکشیٔ حسن مری نظروں میں
جی بھلنے کو ملی آپ کی تصویر مجھے

زلف شبگوں رخ انور کی ستائش کے سوا
کوئی مضمون نہ ملا قابل تحریر مجھے

اف وہ انداز نظر آہ وہ طرز دلکش
بھولتی ہی نہیں اب تک خلش تیر مجھے

حسن دلکش کے فسوں پہ جب نظر پہنچی
نہ رہا پھر گلۂ گردش تقدیر مجھے

(آخری دور کی)

رباعیات

شفیق میناؔئی

اس خانۂ ویراں کو سجاؤں گا ضرور
جشن جمہوریت مناؤں گا ضرور
چمکا ہے ستارا مری قسمت کا شفیق
میں بھی کے چراغ جلاؤں گا ضرور

جب اپنے چمن کی یاد آئے گی۔
جب گنگ و جمن کی یاد آئے گی۔
فردوس میں تڑپ اٹھوں گا شفیق
جب خاک وطن کی یاد آئے گی

آرام نہیں صحن چمن میں مجھکو
راحت نہیں کوئی صحن چمن میں مجھکو
جیسے غربت میں جی رہا ہوں میں شفیق
محسوس یہ ہوتا ہے وطن میں مجھکو

یہ لالہ و گل سرو و سمن روئیں
جتنے ہیں رفیقاں کہن روئیں
یاد آئیں گے جب ہم سے پرستار
مل مل کے گلے اہل چمن روئیں

ہے سادہ روی جاہ حشم سے بہتر
ذوق عمل امید کرم سے بہتر
ہالہ آئے جو خود اپنی مشقت سے وہ گل
بخشے ہوئے گلزار ارم سے بہتر

نوٹ۔ ہمیں افسوس ہے کہ دفتری بھول کے سبب یہ رباعیاں "جمہوریا" نمبر میں نہ دی جا سکیں اور اب پیش ہیں ——— ایڈیٹر

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی

ماتم دلؔ

ابراحسنی گنوری

قطعہ

قہر توڑا لہر کسی کی جان پر دم توڑ کر — حضرت دلؔ چل دیے سب کو تڑپتا چھوڑ کر
چھ دن لے نوح رہنا تھا انہیں وہ رہ چکے — اب رخ دنیا کا دیکھو کیجئے نوح اپنا موڑ کر

نظم

کیا کہوں نوحؔ ماجرائے وفات — مٹ گیا لطف بزم آرائی
پھٹ پڑا سر پہ آسمان ستم — دفعتاً طرفہ تر بلا آئی

شاعر خوش بیان ضمیر حسن — پرنبائے کمال گویائی
باغبان علم وفن کا رہ نہ گیا — شاخ نخل عروض مرجھائی

تھا خطاب ان کا اعتبار الملک — ختم ان پر تھی شان یکتائی
بستر مرگ سے پھر اٹھ نہ سکے — چوٹ گر کر کچھ ایسی کھائی

ساٹھ سنہ ساٹھ برس کا ساتھ چھٹا — ہو چکی ان کی میری یکجائی
اب برادر نہ وہ لکھیں گے مجھے — اب ان کو لکھوں گا میں بھائی

ہجر و بیباک کے زمانے میں — پہلے پہلی ہم شناسائی
سوجھتا کچھ نہیں نگاہوں کو — ایسی ادبار کی گھٹا چھائی

ہائے شبیر اور ہائے شفیق — کاپ اٹھا قلب روح تھرائی
دونوں لڑکوں کو باپ کے غم میں — کوئی لفظ نہیں شکیبائی

ان کو جس بیکسی کا وہم نہ تھا — ساعت بد وہ سامنے لائی
کر گئے انتقال حضرت دلؔ — جانشین امیر مینائی

۲۶ دسمبر کو ملک کے معتبر اور مسلم الثبوت اعتبار الملک دلؔ تاجیا پوری ہم سے ہمیشہ ہمیشا کو رخصت ہو گئے۔ یوں تو کسی شاعر کو غم نہ ہوگا کہ جوان سے مذہبی ربط رکھتے تھے، ان کے غم کا کوئی انداز اکرے۔ تاہم المیہ وہ بھی ان کی شخصیتوں کا مرہون منت ہے ——— ابراحسنی

ہر اک دل آبدیدہ مرہون تعب ہے — جدائی حضرت دلؔ کی عنقریب ہے
غزل کے چہرہ کا اترا ہے غازہ — کمال فن کا اٹھا ہے جنازہ
جمال شاعری ہے قہر و تب میں — صف ماتم ہے ہر بزم ادب میں
بہت مسرور ہے صیاد اردو — بپا ہے ہر طرف نوحہ یاد اردو
طبیعت شاعری سے ہٹ گئی ہے — سخن کی قدر و قیمت گھٹ گئی ہے
کرے گا کون اس کی پاسبانی — چلے سر پھیر رہی ہے نکتہ دانی
دقائق بند ہو کر رہ گئے ہیں — دقائق آبرو کھو کر رہ گئے ہیں
بتائے کار موزونی شاعری کون — سنبھالے گا مزاج شاعری کون
غزل باب تباہی پر کھڑی ہے — ردائی چاروں شانے چت پڑی ہے
بلاغت پٹخنی پھرتی ہے سینہ — بنور میں ہے فصاحت کا سفینہ
نصیب شعر میں تھی جس کا جاں — ترش رو ہو گئی شیریں کلامی
سروت کھائی پھرتی ہے جھکوٹے — شرافت پھر رہی ہے بال نوچے
کہاں اخلاق میں اب استواری — پریشاں پھر رہی ہے وضعداری
نہ معلوم دلجوئی کی گھاتیں — کرے گا کون اب شفقت کی باتیں
ہر طرف کھیلا ہے ایک ماتم — بجا ہے موت عالم موت عالم
اجل یہ تیر کیا تو نے مارا — نہ اب دو ہو گئی ہے بے سہارا
ابھی تھی حضرت دلؔ کی ضرورت — ابھی زندہ ہے اردو کی قسمت
یہ تھا شاید مشیت کا اشارہ — کہ دل ہو جائیں سب کے پارہ پارہ
پڑے گا بے گوارا صبر کرنا — کسی صورت ہو ممکن صبر کرنا
اگرچہ ضبط کا یارا نہیں ہے — دعاؤں کے سوا چارہ نہیں ہے
کشادہ کر خدا رحمت کا دامن — بنے فردوس مولا تا مکن
نپیدہ دل کی سن اللہ فریاد — مغفرت کر رہیں شاگرد و اولاد

"رعنائیاں"

(برج لال جگی رعنا کا مجموعۂ کلام)

مالک رام، ام۔ اے

رباعی بہت مشکل صنف فن ہے۔ کتنی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بیسویں اور غزل اور مثنوی میں سیکڑوں شاعروں نے شہرت حاصل کی۔ اور ان میں سے اکثر کا کلام قابل تعریف ہے، لیکن کامیاب رباعی گو شعرا اتنے بھی نہیں کہ ان کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ فارسی میں لے دے کے خیام اور سنجانی تھی اور سلطان ابو السعید ابو الخیر کے نام سامنے آتے ہیں یہی حال ہندستانی کا ہے، اگرچہ جگر بھی ہر ایک شاعر نے رسماً چند رباعیاں ضرور کہی ہیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں، جنہوں نے اس میں کوئی امتیاز حاصل کیا ہو۔ انیس کی رباعیاں مشہور ہیں۔ یگانہ کی رباعیوں کا مجموعہ "ترانہ" بھی کامیاب کوشش ہے۔ جگت موہن لال رواں نے بھی اچھی خاصی رباعیاں لکھی ہیں۔ قریب کے زمانے میں جوش کی رباعیاں "جنون و جوش" قابل ذکر ہیں۔ امجد حیدر رباعی کے اصول کے موضوع پر اچھی رباعیاں لکھی ہیں۔ چونکہ یہ ان کا "تخلص" نہیں بلکہ "دادا" ہے۔ اس لیے ان کی رباعیاں بعض حلقوں میں انہیں حیم الشعراء کے نام سے خطاب کیا جاتا ہے۔ حال گذشتا تو کچ بہ مرحوم کی رباعیوں کا مجموعہ "رباعیات مرحوم" کے نام سے شائع ہوا۔

چونکہ رباعی کی دقت کا مجھے اندازہ تھا، اس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ برج لال رعنا نے اپنی رباعیوں کا مجموعہ "رعنائیاں" کے عنوان سے شائع کیا ہے تو تعجب ہوا، کیونکہ تمام مشہور شاعر رباعی کی طرف اس وقت توجہ فرماتے ہیں جب وہ غزل یا نظم کی گرفت سے اپنے کو چھڑا لیتے ہیں۔ مگر "رعنا" کو "دست جوانی" ہو، لیکن میرے نزدیک "پختہ شاعر" رباعی گو "بھی ہے۔ رباعی کا موضوع عموماً دنیا کی بے ثباتی اور فلسفۂ حیات اور عشق و محبت کے گہرے تاثرات رہے ہیں۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ شباب میں ان کا بیان کچے پھل کی طرح ہوتا ہے۔ یہ کچے کہولت اور شیب ہی کے پھر سے پھلتی ہے۔ چونکہ رعنا ابھی اپنی شاعری کی تجرباتی منزلیں طے کر رہے ہیں، اس لیے یہ واقعہ ہے کہ میں نے "رعنائیاں" تعجب اور شبہے کے ملے جلے جذبات سے کھولی لیکن میں جوں جوں اسے دیکھتا گیا میرے جذبات، تعریف اور اطمینان سے بدلتے گئے۔

محبت وہ موضوع ہے، کہ اس پر ہر ملک اور ہر زبان کے شاعر ازل سے لکھتے آئے ہیں، لیکن یہ "سخن ہائے گفتنی" ختم نہیں ہو پاتے۔ رعنا، ماشاء اللہ جوان ہیں، لیکن انہوں نے اس مضمون کی جو رباعیاں لکھی ہیں، ان میں بے جا جوش و خروش کی جگہ "جو فارغ شباب میں، متانت اور گہرائی ہے۔ غالب غم عشق کو زیست کا حاصل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

رعنا بھی زیست کو اسی وقت گوارا کرتے ہیں، جب اس میں عشق و محبت ہو، ان کے عقیدے میں یہ زیست عشق کے بغیر جسد بے روح ہے۔ رباعی ہے۔

ساقی جو نہ ہو، بادہ پرستی کیا ہے
احساس نہ ہو تو دم پرستی کیا ہے
بیکار ہے، گر عشق سے خالی ہے زیست
جب روح نہ ہو، جسم کی ہستی کیا ہے

عشق بے شک آگ ہے، لیکن ایسی آگ، کہ اس میں ہماری تمام آلائشیں جل کر خاک ہو جاتی ہیں اور اس کی کٹھالی سے نکل کر انسان کندن بن جاتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عشق کے بغیر انسان کی ہستی ناقص ہے، وہ کامل انسان کہلانے کا مستحق ہی اس وقت

بتاتے، جب عشق کے امتحان میں پورا اترے۔ رعنا نے یہی مضمون دو رباعیوں میں ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

کیا آگ محبت میں بھری ہوتی ہے
جلتا ہے دل آنکھوں میں تری ہوتی ہے
دم ٹوٹ کے بن جاتا ہے فرمانبردا
چٹکی جو یہ بھٹی تو ہری ہوتی ہے

ہر غم کو غم عشق مٹا دیتا ہے
انسان کو انسان بنا دیتا ہے
آتش کا بھبھوکا ہوا شعلہ رعنا
جو جھوٹ ہو سونے میں جلا دیتا ہے

محبت کی وادی بہت دشوار گزار ہے۔ کتنے مسافر اس کی ابتدائی صعوبتوں ہی سے گھبرا کر حوصلہ ہار بیٹھتے اور اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں، لیکن جو خوش قسمت ان راہوں کو طے کر لیتے ہیں، وہ ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں رنج و راحت، غم و مسرت، خزاں و بہار کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ وہاں کا رنج بھی راحت ہے اور غم بھی مسرت۔ وہاں پت جھڑ کے موسم میں بھی پھول کھلتے نظر آتے ہیں، اس مقام پر پہنچ کر عاشق ہر ایک چیز کو ایک ہی نظر سے دیکھتا اور اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ، جنہیں یہ مقام حاصل ہو جائے، کیونکہ یہی حاصل زندگی ہے۔ رعنا نے اسی حقیقت کو شاعرانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے۔

ہر رنج مسرت کی خبر لاتا ہے — ہر قطرۂ اشک پھول برساتا ہے
آتا ہے محبت میں کچھ ایسا بھی مقام — ہر چیز کا امتیاز اٹھ جاتا ہے

(۲)

جن لوگوں کو دنیا میں کوئی دلکشی اور رعنائی دکھائی نہیں دیتی یہ ان کی اپنی آنکھ کا قصور ہے، اگر کسی کو روز روشن میں ہر طرف تیرگی ہی تیرگی نظر آئے تو اس میں بیچارے آفتاب کا کیا گناہ ہے! اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ خدا اس کے لیے اپنے دیدوں میں نور نہیں۔ اگر آپ اس دنیا میں رہنا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اپنے ذہن اور دماغ میں اس کی خوبیوں کو دیکھنے اور سمجھنے اور ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت پیدا کریں۔ مریض کا کوئی حق نہیں کہ وہ کسی کھانے کی شکایت کرے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے منہ کا ذائقہ درست کرے۔ رعنا کی دو رباعیاں ہیں ؎

دل خوش ہے تو ہر چیز میں رعنائی ہے
غمگیں ہے، تو ظلمت کی گھٹا چھائی ہے
دنیا تو نہ اچھی، نہ بری ہے رعنا
سب اپنی ہی خیال آرائی ہے

تصویر حقیقت میں ہے کچھ ایسا رنگ
یاقوت ہے، نکھرا ہوا اک پارۂ سنگ
رعنا! یہ جمال، یہ بہار عالم
ہے ذوق نظر اور طبیعت کی ترنگ

رعنا دنیا کو بے ثبات سمجھتے ہوئے بھی اسے ترک کر دینے کے قابل نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے رنگ و بو اور حسن و لطافت کو محسوس کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔ جو لوگ اسے وہم و سراب سمجھتے ہیں، وہ انہیں دعوت دیتے ہیں کہ آنکھیں کھول کر ملاحظہ کریں کہ کیا تمہارے ارد گرد کی چیزیں وہم و خیال ہیں، یا حقیقت و صداقت۔ ان کی نظر میں یہ دنیا بے کار نہیں بلکہ اس کا ایک مقصد ہے۔ اس کی تہہ تک پہنچنا، اس سے کام لینا، اس کے نظام کو اپنے لیے مفید بنانا ——— یہ انسان کا کام ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا اس کا فرض۔

ہے شاہد جاں، رونق بام ہستی
لبریز مئے ناب ہے جام ہستی
اے بہت سے بیزار گذرنے والو
آنکھیں ہوں تو دیکھو یہ نظام ہستی

ہے موج غبار، کارواں در آغوش
ہے ذرۂ خاک، یک جہاں در آغوش
اے زیست کو بے کار سمجھنے والو
ہر موج ہے بحر بیکراں در آغوش

وقت اس زندگی کے کارزار میں سہارے نہیں ڈھونڈتے
وہ بھی ابتدا کے ہم نوا ہو کر، اگر خواہی حیات اندر خطر زی کا

نرالا لگاتے ہیں ؎

امید کا دامن دل آرا چھوڑا کمزور سفینے کا سہارا چھوڑا
ہوتا ہو موجوں میں بہا جاتا ہوں آرام سے ہوں جب سے کنارا چھوڑا

(۳)

ہر نیاے تصوف و روحانیت کا کاروبار کچھ عجیب سا ہے وہی باتیں جو عام حالات میں دیوانگی و جنون کہلاتی ہیں، اس عالم میں پہنچ کر نزدیکی و ہوش کا نشانا بن جاتی ہیں۔ اگر آپ کا دل کہیں نہیں اٹکا اور آپ نے ہجر و فرقت کے مزے نہیں چکھے تو اہل معرفت کے نزدیک آپ کی زندگی نامکمل ہے، اور اگر آپ اسے بحر حیات سے بھی وسالم لے کر نکل گئے، تو گویا ڈوب گئے ان کی نظر میں دل کا شکستہ ہونا اولین شرط ہے۔ اگر یہ نہیں تو جینے کا لطف نہیں اور اگر یہ ہو گیا تو گویا آپ حیات جاوداں پا گئے۔ رگھانے نے ایک شعر میں اس کی طرف اشارا کیا ہے ؎

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کے دل سے لازم ہے سلسلۂ دل کا

رعنا نے بھی ایک رباعی میں یہ مضمون لکھا ہے ؎

جب دل میں ذرا شکستگی آتی ہے
تب اس میں بہار زندگی آتی ہے
جب چرخ سے ٹوٹتا ہے تارا کوئی
کچھ اور بھی اس میں روشنی آتی ہے

ایسا دل شکستہ "نگاہ آئینہ ساز" میں "عزیز تر" بن جاتا ہے، اور اگر انسان کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو پھر وہ اس راہ کی تمام تکلیفیں اور مصیبتیں بھول جاتا ہے۔ اس کی وہی مثال ہے کہ تپتی دوپہر کا مسافر سرسبز و شاداب نخلستان میں پہنچ جائے۔ اس کے بعد اسے پروا نہیں ہوتی کہ وہ بھوک پیاس کی کن صعوبتوں سے گذر کر وہاں تک پہنچا ہے، بلکہ یہاں کے آرام و آسایش کے مقابلے میں اسے یہ سودا بہت ارزاں ہونے لگتا ہے۔ جس نے ایک مرتبہ اس کی لذت چکھ لی، اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ اس تجربے کو ہزار بار دہرانے کو تیار ہوگا، اور اسے پا کے اسے کسی قیمت پر ترک کرنے کو آمادہ نہ ہوگا ؎

دل دے کے تجھے یہ داغ ہاتھ آیا ہے
جلتا ہوا ایک چراغ ہاتھ آیا ہے
مٹ کر تیری الفت کی نشانی پائی
گم ہو کے ترا سراغ ہاتھ آیا ہے

یہی حقیقت ہے کہ انسانی روح میں ترقی کی لاانتہا صلاحیت ہے۔ اگر اس کی منزل متعین ہوتی اور اسے کسی مقام پر پہنچ کر رک جانا ہوتا، تو اس کی سرشت میں یہ خواہش پیدا نہ ہوتی۔ نفسیاتی طور پر روح میں اس خواہش کی موجودگی ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا سفر دایمی اور اس کی منزل لامکاں ہے۔ اس لیے جب رعنا کہتے ہیں ؎

قطرہ ہوں، مجھے قطرے سے دریا کر دے
ذرہ ہوں، مجھے ذرہ سے صحرا کر دے
اے حسن! تجھے اپنی تجلی کی قسم
ظلمت ہوں، مجھے نور سراپا کر دے

تو یہ انسانی روح کی پکار ہے، جسے وہ ہر مقام اور ہر منزل پر کہتی رہے گی۔ خیام رباعی کا بادشاہ ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ اس کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ وہ نقد جاں کے مقابلے میں جیتے دو عالم کی پروا نہیں کرتا اور دنیا کا کوئی مسلما اس کے شک و شبہ سے بالا نہیں۔ رعنا کے ہاں بھی اس رنگ کی رباعیاں موجود ہیں۔ دو ایک ملاحظہ ہوں

سبزہ ہے، اب جو ہے، گھٹا ہے ساقی
نغمہ ہے۔ مئے روح افزا ہے، ساقی
ساغر کی چھلک میں ہے جھلکتا تیرا
دنیا ہی میں جنت کا مزا ہے ساقی

شعلے ہیں کہیں اور کہیں ہیں طوفان
آفات میں مبتلا ہے بے بس انسان
شیطان کو سونپ کر نظام عالم
فردوس میں سو رہا ہے شاید یزدان

رعنا نے اس مرحلے پر جو کامیابی حاصل کی ہے، اگر وہ اس پر

سوتیلی ماں

مقبول احمد دہلوی

شکیلا نے جب اپنے نئے گھر میں قدم رکھا تب وہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے دل میں بھی اپنی ہم عمر دوسری لڑکیوں کی طرح امیدوں اور امنگوں نے ہزارہا موجیں لے رکھی تھیں۔ سیکڑوں تہیں اپنے اپنے سے دل میں سجا کر وہ اس نئے گھر میں آئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا بھی ہے اس عمر میں سسرال کی عورتیں جب اس کے شوہر کا ذکر کرتیں تو وہ شرم و حجاب سے سمٹ جاتی۔ لاج سے اس کے سرخ و سفید رخسار اور بھی سرخ ہو جاتے۔ لیکن پھر بھی اس کا دل یہی چاہتا کہ عورتیں اس کے شوہر کا ہی ذکر کرتی رہیں اور وہ چپ چاپ بیٹھی مزے لے لے کر یہ ذکر سنتی رہے ـــــ ابھی تک اس نے اپنے شوہر کو صرف ایک بار پردے کی اوٹ سے دیکھا تھا، لیکن بات چیت کرنے یا ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اسے ابھی تک موقع نہ ملا تھا۔ شادی سے پہلے اسے اپنے باپ کے گھر میں جب اسی کی عمر کی دوسری لڑکیاں اس کی شادی کا ذکر کرتیں اسے گدگدائیں تو وہ رونی سی صورت بنا لیتی تھی، لیکن دل ہی دل میں وہ خاص طرح کی مسرت محسوس کرتی تھی اور اس آنے والی مبارک اور پرسعادت گھڑی کا بے چینی اور بے قراری کے ساتھ انتظار کرتی تھی۔

شکیلا کی قسمت کو اس کے ان سنہرے خوابوں کی روشنی تعبیر شاید قبول نہ تھی، نئے گھر میں آنے کے کچھ گھنٹوں کے بعد اس کی جٹھانی تقریباً اڑھائی برس کی ایک نہایت خوبصورت بچی کو گود میں اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ بھولی بھالی ناسمجھ بچی ایک غیر متعارف عورت کو دیکھ کر ذرا جھجکی، جٹھانی نے بچی کو نیچے اتار کر سکڑی سمٹی بیٹھی شکیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نجا دیکھو یہ تمہاری ماں ہیں۔" "ماں" کا لفظ سنتے ہی شکیلا کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو، لیکن پھر اس نے سوچا شاید اس نے سننے میں غلطی کی ہو، جٹھانی اماجان کچھ اور کہا ہو، لیکن تھوڑی دیر میں ہی حقیقت عیاں ہو گئی۔ اس کی جٹھانی بچی کو اس کی جانب بڑھاتی ہوئی بولیں "لو دلہن! اسے سنبھالو۔ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ آج سے تم اس کی ماں ہو، تم تو جانتی ہو گی کہ آج سے سات ماہ پیشتر اس کی ماں اسے چھوڑ کر چل بسی ہیں۔" جٹھانی نے یہ سب کچھ اس طرح کہہ ڈالا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگی تو کیا سچ ہے کہ میرے "وہ" میرے آنے سے پہلے ہی بیاہ رچا چکے ہیں؟ ـــ لیکن یہ سب کچھ چھپایا کیوں گیا؟ کیا اس لیے کہ اگر مجھے پتا چل جاتا تو شاید میں انکار کر بیٹھتی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ سب اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میرے دل کی ساری مسرت و شادمانی اسی لمحے ختم ہو جاتی ہو..... لیکن اب کیا ہو گا مجھے ہوی کی بجائے کیا ماں بننا ہو گا، ماں بننا کا احساس مجھے پہلے کرنا ہو گا؟ شادی کے بعد کے جو سنہرے سپنے میں نے بُنے تھے۔ کیا وہ سب وقت سے پہلے ہی پرائی ماں بننا کے بوجھ سے کچل جائیں گے؟ ـــ مگر کیوں، میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ کیا جرم ہے میرا جس کی پاداش میں یہ سزا میرے لیے چنی گئی ہے؟ خواہش نہ ہوتے ہوئے، دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں ماں بننے کے لیے مجبور کیوں کی جا رہی ہوں؟

مذکیلا نہ جانے کتنی دیر تک اتنی ان ہی سب خیالوں میں بہتی رہی، تب ہی اس ننھی بچی نے اپنے توتلے لہجے سے اس کے خیالوں کی لڑی توڑ دی، وہ کہہ اٹھی "تم سچی ماں ہو نا؟ میں تمہیں ماں تو کہوں؟" (تم میری ماں ہو نا؟ میں تمہیں ماں کہوں؟)

شکیلا کو جیسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں اب صرف وہ تھی اور معصوم بچی، جیسے ماں

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)

بیٹی کو تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع دینے کے لیے ہی باقی سب لوگ وہاں سے جان بوجھ کر اٹھ کر چلے گئے تھے۔ شکیلا خاموش ہی رہی بچی نے پھر کہا "تم میری ماں ہو نا؟"

شکیلا کے ہونٹوں سے کانپتی ہوئی سی ایک آواز نکلی۔ "ماں؟ میں ماں ہوں؟" اور اس نے دیکھا کہ دو چھوٹی چھوٹی معصوم آنکھیں شفقت اور ہمدردی کی بھیک مانگتی ہوئی اس کی ماتا کو بیدار کر رہی ہیں۔ وہ نئی سی جان اپنی کھوئی ہوئی ماں کی ماتا کو پانے کی طلب کر رہی تھی۔

شکیلا سے رہا نہ گیا۔ بولی "ہاں منی میں تمہاری ماں ہوں" اور اتنا کہتے کہتے اس کے سارے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اور پھر جب سنی نے پیار سے بے چین ہو کر شکیلا کی گود میں سر رکھ دیا تو ایک خاص قسم کی سنسناہٹ شکیلا کے تمام جسم میں اوپر سے نیچے تک دوڑ گئی۔ سردی ہوتے ہوئے بھی اس کی پیشانی پر پسینے پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ بچی نے ایک بار پھر کہا "ماں بولو نا! تم بولتی نہیں؟" یہ سنا اور یہ آواز شکیلا کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر رہ گئی۔ اس نے اس بن ماں کی بچی کو سچے پیار سے اپنی چھاتی سے لگا لیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی "ہاں بیٹی! میں تیری ماں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو گا میں تجھے ماں کے پیار سے محروم ہونے نہیں دوں گی۔ تجھے زندگی میں اب کبھی ماں کا نہ ہونا نہ کھٹکے گا۔" بچی سب کچھ تو نہ سمجھ سکی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ ماں کا پیار اسے پھر سے مل گیا ہے۔ اور وقت گذرتا گیا۔

شکیلا کی گود میں ایک بچی آ گئی۔ اس کا نام رکھا گیا انجم۔ بجا اور انجم دونوں اب شکیلا کی دو آنکھیں تھیں۔ وہ انجم کو جتنا چاہتی تھی اس سے زیادہ ہی بجا کو چاہتی تھی۔ وہ کسی طرح بھی بجا کو یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے، مگر اس کے پیار کی بھی برائی کی جاتی۔ شکیلا کی ساس کہتیں "کسی کام کی نہ ہے گی یہ لڑکی، آخر پرائے گھر جانا ہے۔ آج اگر اس کی ماں اپنی ماں ہوتی تو پیار کرنے کے ساتھ ساتھ بچے تعلیم بھی دیتی۔" اور اگر بجا کے تمرارت کرنے پر شکیلا ناراض ہو پڑتی تو اس کی جٹھانی صاحبا بول اٹھتیں "ارے پرائی بیٹی ہے سوتیلی ماں کو کیوں اچھی لگنے لگی بھلا؟" پھر بچی کو گود میں اٹھا کر پیار بھرا انداز میں کہتیں "مار نا ہی مارنا جانتی ہو کبھی چھاتی سے لگا کر پیار کرنا بھی آتا ہے۔"

شکیلا اس مسئلے پر نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرتی اس کا صحیح حل ڈھونڈنے کے لیے خیالات کی گہرائیوں میں اترتی مگر کوئی رستا سامنے نظر نہ آتا۔ آخر کار ایک روز اس نے بہت سوچ اور بے بس ہو کر فیصلہ کیا کہ اس کی اپنی بچی اور بجا کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ لوگ تمام عزیز اقارب سے کہیں دور جا کر رہنے لگیں۔ نہایت قریبی حلقہ بات اس نے شوہر کو سمجھائی۔ شوہر کے دماغ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے اس کی خواہش کے مطابق ایک دور کے شہر میں رہنا شروع کر دیا۔ اور وقت گذرتا گیا۔ وقت گذرتا رہتا ہے۔ دن ختم ہوتے جاتے ہیں۔ اور مہینا گذر جاتا ہے۔ اور مہینوں کے گذرتے رہنے پر سال آتے ہیں اور پھر بھی وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ وقت کا یہ چکر چلتا رہتا ہے اور اسی چلے کے ساتھ زندگیاں گذرتیں اور آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے انقلاب آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ بچپن گذر کر جوانی آتی ہے، جوانی آگے بڑھ کر بڑھاپا بن جاتا ہے اور فطرت کے اسی نظام کے تحت بجا نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا۔ انجم بھی شباب کی حدود میں قدم رکھنے کے لیے تیار تھی۔ بجا بڑی تھی۔ فطرتاً وہ نہایت خاموش طبیعت اور سنجیدہ مزاج کی لڑکی تھی۔ ساتھ ساتھ سگھڑ اور سلیقہ مند بھی تھی۔ ماں کو بے حد چاہتی تھی۔ انجم چھوٹی تھی۔ اس کے مزاج میں ابھی تک بچپن جھلک رہا تھا۔ بات بات پر وہ بگڑ جاتی، روٹھ جاتی، شرارت کرتی اور ناک میں دم کیے رکھتی، لیکن بڑی بہن بجا کو بھی بے حد چاہتی تھی، دونوں بہنوں میں بلا کا انس و محبت تھا۔

شکیلا کے سر میں آج بہت درد ہونے لگا۔ دونوں لڑکیاں کالج جانے تیار تھیں۔ بجا نے ماں کی طبیعت ٹھیک نہ دیکھ کر کالج جانا ملتوی کر دیا۔ تیل کی شیشی لے کر وہ ماں

کے سر میں الش کرنے بیٹھ گئی۔ انجم نے جب دیکھا کہ بڑی بہن کالج نہیں جا رہی ہے تو بولی "ماں کے سر میں تو روز روز بھا درد ہو جاتا ہے۔ اب ہم روز روز ناغا کرنے لگیں تو بس ہو چکا پڑھائی۔" تو تو چلا جا کالج۔" بجما بولی "میں ماں کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" انجم چلی گئی۔ بجما ماں کی خدمت اور گھر کی دیکھ بھال کرنے لگ گئی۔

شکیلا نے کہا "بجما! ایک بات پوچھوں بیٹی؟" تو میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے؟ انجم تو کبھی بات بھی نہیں پوچھتی" ماں کی بات سن کر بجما ہنس پڑی، بولی "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ماں! میں بڑی ہوں وہ ہے چھوٹی۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ انجم میں ابھی بچپنا ہے۔ بڑی ہو گی تو سب سمجھنے لگے گی۔ پھر میرے ہوتے ہوئے اسے فکر بھی کس بات کی ہے؟"

شکیلا چپ ہو رہی۔ اسے اپنی گذشتا اپنی زندگی یاد آئی۔ وہ سوچنے لگی بجما میری لڑکی تو نہیں مگر میں اس کی ماں ہوں۔ میرے ساتھ یہ انصاف ہوا ہے یا ناانصافی؟ اگر ناانصافی ہوئی ہے تو میں نے اسی وقت بغاوت کیوں نہیں کی؟ کیوں اسے چپ چاپ اسے قبول کر لیا؟"

شکیلا کو اپنے اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا۔ سیکڑوں بار اس کے دل میں یہ سوال ابھر چکا تھا اور ہر بار اس کا کوئی جواب وہ سوچ نہیں پائی تھی۔ بجما چپ چاپ ماں کا سر دباتی رہی۔ وہ اکثر دیکھتی تھی کہ ماں خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہے، لیکن اس نے کبھی دل جلاتے ہوئے بھی ماں سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا سوچتی ہے۔

شکیلا کی آنکھ لگ گئی۔ بجما آہستہ سے اٹھی۔ ماں کو چادر اڑا کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ کھانا تیار کرنا تھا اسے، باپ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک تانگا عین گھر کے دروازے میں آ کر رکا بجما نے چک کے پیچھے سے دیکھا، تائی اماں تانگے پر سے اتر رہی تھیں۔ اس شہر میں آنے سے پہلے بھی وہ انہیں ایک بار دیکھ چکی تھی، دوڑ کر دیوڑھی میں پہنچی اور انہیں ساتھ ساتھ اندر لے آئی۔ ماں کے کمرے میں لے کر جانے کی بجائے اسے انہیں باورچی خانے کے ساتھ صحن میں ایک پلنگ بچھا کر اس پر بٹھا دیا۔ "اری بجما شکیلا کہاں ہے؟" تائی ماں نے برقعہ اتار کر پلنگ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "ماں کے سر میں درد تھا۔ ان کی ابھی آنکھ لگی ہے۔ آہٹ پا کر وہ جاگ نہ جائیں۔ اسی لئے میں آپ کی چائے تیار کر رہی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔ ابا جان آتے ہی ہوں گے۔" بجما نے جواب دیا۔ "اور انجم کہاں ہے؟" تائی اماں نے پوچھا۔ "کالج گئی ہے۔" "اور تم نہیں گئیں تمہاری پڑھائی ہے کیا؟" "نہیں چھوٹ تو نہیں ہے مگر مجھے پڑھنے کا خاص کام نہیں تھا۔ اور پھر ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے حالانکہ" بجما نے اسی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "ارے میں سب سمجھ جانتی ہوں۔ دودھ پیتی بچی نہیں ہوں شکیلا کی نورنگاہ رگ رگ سے واقف ہوں۔ آخر یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں ہوئے ہیں۔" تائی اماں کے لہجے میں جلن اور نفرت تھی۔ "لیکن ہوا کیا؟" بجما نے حیرت و تعجب سے پوچھا۔ "ارے تو ابھی نہیں جانتی؟ مجھے تو شکیلا نے اتنے اندھیرے میں رکھا ہے بیٹی کہ بس کیا کہوں۔ مجھے تو ترس آتا ہے۔ آخر گھر سے اتنی دور کے شہر میں جو تم لوگ رہتے ہو وہ کس لیے؟ ارے ہمارے ساتھ رہتی شکیلا تو ہم کیا کاٹتے تھے؟ دل بہلا کھاتی تھی، وہ بھی رہتی تھی۔ کیا مجال جو ناک پر مکھی بیٹھ جائے۔ بس ایک بات تھی ہم سوتیلی بیٹی پر ظلم و ستم نہ ہوتے دیتے تھے۔ آخر میں بھی تو خدا کو منہ دکھانا ہے۔" تائی ماں کا چہرہ نفرت سے بھرا جا رہا تھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کون ہے سوتیلی بیٹی؟ ——— کیا ظلم و ستم؟ ——— میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔" بجما نے بھولے پن سے پوچھا۔ "سمجھ میں آئے گی۔ پگلی تجھے تو اپنے پرائے میں ہی تمیز نہیں رہی۔ ہم نے تو لاکھ بار سمجھانے کی کوشش کی، لیکن شکیلا نے کٹنا پے کے آگے ہماری ایک نہ چلی، اور اب دکھی رہنے کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟" لیکن تائی اماں آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" بجما نے پوچھا

ہوئے پوچھا: "آخر کچھ بتایئے تو سہی۔ کیا پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہیں؟" "پہیلیوں میں نہیں بیٹی۔ وہی کہہ رہی ہوں جو سب کہتے ہیں۔ اری بچا اگر تو شکیلا کی بیٹی ہوتی تو کیا آج اس طرح چولا پھونکتی ہوتی؟ انجم کی طرح رانی بن کر نہ رہتی؟ کام تم کرتی ہو، عیش وہ کرتی ہے۔ تیری ماں سر کے درد کا بہانا کر کے تیری پڑھائی بند کروانا چاہتی ہے۔ سمجھی یا اب بھی نہیں؟" اور نانی ماں کے چہرے پر ایک خاکا، مگر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نانی اماں آپ یہ سب کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ پچھلی بار آئی تھیں تب بھی ایسی ہی کچے باتیں آپ نے کہی تھیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ ہم ماں بیٹی میں پھوٹ پڑ جائے، مگر ایسا نہیں ہوگا۔ آپ ابھی چلی جائیں اور یہاں کبھی نہ آیا کریں۔" بچا کے لہجے میں غصے کے ساتھ ساتھ نفرت بھی تھی۔ "بگڑتی کیوں ہے لڑکی؟" نانی اماں بولیں۔ "میں سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ یقین نہ ہو تو اپنی سوتیلی ماں سے پوچھ دیکھ، شاید اس سے پہلے تو نے کبھی پوچھا ہی نہ ہوگا۔" بچا ڈرنے لگی کہ حقیقت میں یہ بات کہیں سچ نہ ہو۔ آہستہ سے اس نے کہا "پوچھ کر کرتی بھی کیا؟ کبھی اس کی نوبت ہی نہ آئی۔"

نانی اماں شاید اس سے آگے بھی کچھ کہتیں۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کہ کمرے کی دہلیز پر شکیلا کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بات بدلنے کے خیال سے وہ جلدی سے بولیں "دلہن، تم یہاں کب سے کھڑی ہو؟ میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" "ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے، لیکن آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں؟ جو کچھ آج آپ نے کہا ہے وہ میں آج پہلی بار نہیں، بیسیوں بار آپ کے علاوہ اوروں کے مونہہ سے بھی سن چکی ہوں۔" پھر بچا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ بولی "بیٹی جس بات کو آج تک میں نے تم سے چھپائے رکھا وہ چھپی نہ رہ سکی۔ چاہتی تو یہی تھی کہ تمہیں کبھی پتا نہ لگے کہ میں تمہاری اصلی ماں نہیں ہوں، لیکن کچے بھی ہو میں نے تم سے کبھی کوئی زیادتی نہیں کی۔ جو کچھ بھی کیا ہے تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے۔" بچا نے ماں کے مونہہ سے یہ باتیں آج پہلی بار سنیں۔ ایک انجانے خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ اس کے مونہہ سے جواب میں ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ سسکیاں لیتی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ پھر نہ جانے کتنی دیر وہ وہاں پڑی سسکتی اور روتی رہی۔

اس اچانک واقعے کے بعد بچا کے مزاج میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی آ گئی۔ اس کی طبیعت جیسے یکسر بدل گئی۔ وہ پہلے جیسی خصومیت، سنجیدگی اور چہرے پر ہر وقت چھائی رہنے والی مدھر مسکان جانے کہاں غائب ہو گئی اور اس کی جگہ لے لی چڑچڑے پن اور خفگی نے۔ اس کا کھانا پینا آدا ہو گیا۔ اس نے انجم سے بولنا چھوڑ دیا۔ انجم بے چاری جب کبھی ڈرتے ڈرتے "باجی" کہہ کر اسے مخاطب کرنا چاہتی تو بچا اسے گھور کر جھڑک دیتی اور اس پر بلاوجہ بھی لال پیلی ہونے لگتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ بچا کی صحت اور بھی روز بروز گرنے لگی۔

شکیلا اسے جتنا ہی سمجھانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس کا نوجوان دل بغاوت کی آگ میں سلگتا۔ وہ اپنے دل سے سمجھوتا نہ کر پاتی کہ اس کے لیے صحیح رستا کون سا ہے۔ اور وہ رستا اسے کون دکھائے گا۔ وقت گذرتا گیا۔ بچا کی صحت بگڑتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنی سوچنے کی قوت کھو چکی ہے۔ اسے ذرا دیر پہلے کی اپنی کہی ہوئی بات ہی یاد نہ رہتی، لیکن شکیلا کے ساتھ پھر وہی سوال اٹھا تھا۔ کیا یہ حقیقت میں بیماری ہے۔ اگر ہے تو کس کے ساتھ، میرے ساتھ یا انجم کے ساتھ؟ بہت سوچنے پر بھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔

شکیلا کو شوہر پیتا سے خاص طبیعت کے آدمی تھے اپنے گھر کے پرسکون ماحول سے وہ مطمئن تھے، لیکن اب وہ گھر کی تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتے ــــ بچا کا غصہ ماں کے ساتھ روز صبح گھریلو کام پر چھوٹی چھوٹی بحثوں میں اٹھا بیٹھنا، بیچ بیچ کر کام کرنا، پھر وقت مونہہ میں بڑبڑاتے رہنا کچھ بھی تو ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہا تھا۔ سب کچھ سوچ بچار کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچا جتنی جلد ممکن ہو شادی ہو جانی چاہیے۔ شادی کی فکر انہیں پہلے بھی تھی، لیکن اب وہ

دام جلد سے جلد ادا کر دینا چاہتے تھے۔ ایک روز انہوں نے موقع پا کر شکیلا سے اس بارے میں ذکر چھیڑ دیا کہنے لگے۔

"شکیلا میں روز دیکھتا جا رہا ہوں کہ گھر کا سکون خراب ہو رہا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم اور نجا الگ الگ رہنے لگو۔ اس کا آسان طریقہ ہے اس کی شادی۔ لڑکا میری نظر میں ہے اگر تم کہو تو بات پکی کر دوں۔" "لیکن وہ لوگ کون ہیں" شکیلا نے پراضطراب لہجے میں کہا۔ "تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کھاتے پیتے گھر کا اچھا خاندانی لڑکا ہے۔ گھر میں ساس نندوں یا دیورانی جٹھانی کا جھگڑا بھی نہیں ہے۔ گلبرگ میں ایک فلیٹ میں تنہا رہتا ہے۔ عمر ہوگی یہی کوئی چھبیس ستائیس سال۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔" "کیا کہا، لڑکا ایک بار شادی کر چکا ہے اور....." اور اب....."

شکیلا اپنی بات پوری بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اس کے شوہر بات کاٹ کر بولے "دو برس کا ایک بچا بھی ہے۔" "آپ کیا کیا چاہتے ہیں۔ یہ آپ نے اپنی لڑکی کے لیے رشتہ تلاش کیا ہے یا ایک باپ نے؟ آپ اتنے سنگ دل ہو گئے، مگر کیوں؟ کیا قصور کیا ہے نجا نے؟" شکیلا کے لہجے میں حیرت تھی۔ "مگر اس میں برائی ہی کیا ہے۔ نجا کو وہاں کیا تکلیف ہو سکتی ہے، نوکر چاکر ہیں ــــ اتنا بڑا فلیٹ ہے ــــ چھوٹی سی ایک موٹر بھی ہے ــــ غرض سب طرح کا آرام ہے وہاں۔ ہماری نجا رانی بن کر راج کرے گی وہاں۔" نجا کے باپ نے کہا۔ "ایسی رانی بننے سے تو وہ رشتے کی بھکارن بھلی ہے۔ شکیلا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آپ چاہتے ہیں کہ جس آگ میں میں خود جلتی رہی ہوں، جس سکھ کا کڑوا مزا میں نے چکھا ہے، اسی آگ اور سکھ کے مزے کا تجربہ کرنے کے لیے معصوم نجا کو چھوڑ دوں؟ یہ دنیا میں کنوارے لڑکے ختم ہو چکے ہیں؟" شکیلا تم یہ کیسا لہجہ دکھا رہی ہو، ذرا سوچو جہیز کی مانگ کے اس دور میں کنوارے بیٹے ملنا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اگر کوئی ملتا بھی ہے تو ان کی رقم کے مطابق جہیز بھی نہیں دے سکتے۔ اس وقت تو کاروبار ذرا ہے نہ دو تین برس بعد جب ہاتھ میں کچھ پیسا ہو جائے گا تب تم انجم کی شادی اپنی مرضی کے مطابق کر لینا۔" وہ بولے۔

"تو کیا ضروری ہے کہ نجا کی شادی ابھی کر دی جائے؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ میری نظر میں نجا اور انجم میں فرق ہے؟ تمہارا وہم ہے۔ نجا بھی آج اسی وہم کا شکار ہو چکی ہے ــــ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ جب اپنی عادتیں ابھی ہو گی تب ہی کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈ کر نجا کی شادی کر دیں گے۔ اور پھر جو غلطی ایک بار ہو چکی ہے اسے میں اپنے جیتے جی دوہرا نہیں سکتی۔" شکیلا کے سامنے اس کی اپنی زندگی تھی۔ "غلطی؟ کیسی غلطی؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم سے میری شادی ایک بھول تھی۔ ایک غلطی؟ مگر کیوں؟ تم تو آج تک کبھی اس کے خلاف نہ بولیں، یہاں تک کہ اپنے احساسات کبھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم میرے ساتھ رہ کر فیر مطمئن اور ناخوش نہیں ہو؟" "یقین کیجیے کہ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے ساتھ رہ کر میں ناخوش اور مطمئن نہیں۔" شکیلا نے شور کو سجاتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں ایسی شادیوں کے حق میں نہیں ہوں جیسے ستر اسی سے میرے دل میں ایک سوال طوفان کی طرح امڈتا رہا ہے۔ ابھی تک میں اس کا جواب نہیں پا سکی ہوں۔ اسی لیے نجا کو میں اس آگ میں جھونکنا نہیں چاہتی۔" "میں نہیں اب تک سمجھ نہ سکا" شوہر بولے۔ "اور کبھی سمجھ بھی نہ سکو گے۔" شکیلا نے کہا "سوچیے تو سہی یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک لڑکی اس شخص کے ساتھ بیاہی جائے جو خدا اس کی ماں بننے سے پہلے ہی باپ بن چکا ہو۔ عورت مامتا کا سکھ اپنے خاوند کے ساتھ اکٹھا محسوس کرنا چاہتی ہے، پھر یہ ظلم و ستم عورت پر کیوں؟ کیوں نہیں وہ رانڈ آدمی بچے والی بیوا سے شادی کر لیتا، مگر نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرے گا۔ سماج تو اس پر بھی لعنت ملامت کرے گا وہ خدا ہی پر ایا بوجھ کبھی نہ اٹھائے گا۔ پھر عورت پر یہ بوجھ کیوں؟" شکیلا کے لہجے میں اپنے حقوق کی جادہ جھلکتی "مگر تم بھی تو انہیں حالات میں آئی تھیں۔ تب تو کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی تھی اور تم نے تو نجا کو خدا کی بیٹی سے زیادہ پیار کیا ہے۔" شوہر نے دلیل پیش کی۔ "وہ میرا

فرض تھا۔ جب بچا مجھے ماں کہتی تو میں سر سے پیر تک کانپ اٹھتی تھی، لیکن میں فتح پا جاتی تھی۔ اپنے جذبات اور احساسات کو دبا کر رکھنے کی مجھ میں طاقت تھی۔ بس وہی طاقت تھی جس نے آج تک مجھے اپنے فرض سے غافل نہ ہونے دیا۔ پھر بھی دنیا نے ہتیاچ پر لعن طعن کی۔ اور یہ شادی اگر ہو گئی تو پھر دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ سوتیلی ماں، سوتیلی ماں ہی ہوتی ہے اور ستر اسالوں میں جو پیار اور محبت میں نے بچا پر نچھاور کی ہے۔ اس میں بٹا لگ جائے گا۔ ادھر جب سے ہتیاچ آئی نہیں بچا کا پیار سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ مجھ سے اب کھنچی کھنچی رہنے لگی ہے۔ اس کی اس بات سے مجھے بڑا قلق ہے" شکیلا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "آپ صاف انکار کر دیجے اس رشتے سے"

شکیلا ابھی جوش میں شاید اور کچھ بھی کہتی کہ اتنے میں بچا تیزی سے سامنے آئی۔ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر شاید وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ آتے ہی سسکتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی اور روتی "ماں مجھے معاف کر دیجے۔ میں نے بڑا بھاری قصور کیا ہے۔ میں نے آپ کی نافرمانی کی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں۔ آپ میری سوتیلی ماں نہیں، سگی ماں سے بڑھ کر ہیں۔ لوگوں کو کہنے دیجے"

شکیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بچا کو اس نے چھاتی سے لگا لیا۔ پھر کہا "بیٹی تو نے قصور ہی کیا کیا ہے۔ میرے لیے تو تو جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے" پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا "بیٹی! آج مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے بچے والے رانڈ سے شادی کر لینے پر جو ماتا اچانک ہی بیاہتا پر آ پڑتی ہے اس کا نباہ وہ چاہے تو کر سکتی ہے، اور سوتیلے پن کے خیال سے لڑ جھگڑ کر اس پر فتح بھی پا سکتی ہے" اور بچا کے ابا نے دیکھا کہ سوتیلے پن کے ناپاک اور مطعون خیال پر پیار کی فتح ہو رہی ہے۔ زمانہ بدل رہا ہے، تاریخ بدل رہی اور اندرونی مسرت کی ایک کومل مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

غزل

فیض احمد فیض

یہ کیف و کم کی حکایت ہے ہیچ کی کیا ہے
پیام درس جنوں ہے یہ عاشقی کیا ہے
جو تیری کیف نظر شامل شراب نہ ہو
تو کیا ہے لذت مے، لطف میکشی کیا ہے
شہید نغمۂ مستانہ کر دیا مجھ کو
مگر نہ مطرب رنگیں یہ بات ہی کیا ہے
بھڑک ہی شائد ندرت نے زلف پیشاں کو
کوئی بتائے ستاروں کی روشنی کیا ہے
غم و الم کی حکایت، وہ راز دل کے مزے
یہ زندگی جو نہیں ہے تو زندگی کیا ہے
کلی جو کھلتی ہے ہنس ہنس کے گل سے کہتی ہے
حیات موت ہے دو دن کی زندگی کیا ہے
شکست شیشۂ دل سے صدا یہ آتی ہے
زندگی ہے اک آواز، زندگی کیا ہے
جو ترے جلووں کے پرتو کی آب و تاب نہیں
چمک ہے کیسی ستاروں میں روشنی کیا ہے
آں سوز غم زندگی یہ کہتا ہے
جو زندگی ہے خوشی کی، وہ زندگی کیا ہے
ادھر ہے دل سے لگی اور ادھر ہنسی پہ ہنسی
یہ دل لگی جو نہیں ہے تو دل لگی کیا ہے
کہا یہ چپکے سے شبنم کے کان میں گل نے
یہ روز روز کا رونا ہے زندگی کیا ہے
کبھی شباب مکمل، کبھی بہار تمام
یہ دل کشی جو نہیں ہے تو دلکشی کیا ہے
ہزار شورش طوفان، ہزار حزن و ملال
یہ زندگی ہے جو راہی تو زندگی کیا ہے

شاد عارفی اپنی نظر میں

شاد عارفی

مکرم و محترم! السلام علیکم۔ آپ کا کارڈ ملا۔ بظاہر تو یہ ایک معمولی کارڈ ہے، مگر افسانوی زبان میں "طویل و مختصر" کا جو محاورہ ہے وہ اس پر چسپت ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو میری سوانح حیات کا اعاطہ تیڑی کھیر ہے۔ اس لیے کہ اس "بن جلیبی کے سے پھیر" اور اونٹ کے سے "کیف خلقت" کے اتنے موڑ، اتنی الجھنیں، اور ایسے ایسے نشیب و فراز ہیں کہ "سفینہ چاہیے" اس کے لیے۔ اختصار کے ساتھ تو میرے اس مطلع میں سب کچھ ہے ؎ کہہ نہیں سکتا بطرز داستاں ہو یا نہ ہو / دیکھئے کوشش تو کرتا ہوں بیاں ہو یا نہ ہو

اور تفصیل اس کی یوں ہے۔

میں خالص افغانی الاصل ہوں۔ میرے والد اور نانا تقی خان محمد عارف اللہ خان اور خان سید ولی خان (یہ سید نام کا جز ہے تو اس نہیں ہے "جنتی" میرے بڑے بھائی کا نام خان سید احمد خان ہے) افغانستان سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے رامپور آئے۔ اس لیے کہ یہاں کا مدرسۃ العالیہ ایک مستند مدرسہ تھا۔ مولوی فضل حق جیسے اساتذہ اور مولانا شبلی جیسے شاگرد وہیں پائے جاتے تھے، فتاکہ ہادی مولانا آزاد نے بھی یہیں تعلیم پائی، جس کو انہوں نے "جامد از ہر" سے استعارا کیا تھا۔ بات کا رخ ایسا آگیا کہ اب مجھے تفصیل میں جانا پڑے گا۔ مولانا آزاد کے والد اور دادا وغیرہ اب رامپور کے کھاتے پیتے "دھنے" تھے۔ "روئی دینے والے" مگر تجارت نے انہیں اس پیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ لوگ اور ان کے خاندان کے افراد اب بھی تھانہ زرڈر رامپور میں موجود ہیں۔ یہ تھانہ زرڈ میری نانی کے دادے منسوب ہے۔ اس لیے میرے کئی رشتے دار وہاں آج بھی رہتے ہیں۔ مولانا آزاد کے والد کے تمام عزیزوں سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد کے والد جو مدرسۃ العالیہ کے تعلیم یافتہ مولوی تھے۔ انہوں نے ایک بیرا عرب عورت سے یہیں رامپور میں شادی کر لی تھی۔ اسی سے مولانا آزاد پیدا ہوئے، اور یہیں پلے، بڑھے، یہیں تعلیم پائی، جو کچھ مولانا میں احساس کمتری کا بانی تھا، اس لیے انہوں نے ہمیشہ اپنے اس کمزور پہلو کو چھپایا۔ اور کہیں بھی صاف طور سے یہ نہیں کہا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ان کی خودنوشت کوئی بھی سوانحعمری اٹھا کر دیکھیں۔ وہ اپنی والدہ کے بارے میں گول مول الفاظ استعمال کریں گے۔ باپ کے بارے میں صاف اڑا جائیں گے کہ وہ کون تھے؟ کیا تھے؟ اور کہاں تھے؟ بہرحال اس پر میں تحقیق کے بعد ایک مضمون لکھنے والا ہوں۔ اب یہاں آیئے کہ میرے والد اور نانا نے اسی مدرسۃ العالیہ سے فارغ التحصیل ہو کر نانا مولوی خان ولی خان تھے) منطق اور فلسفے کی مدرسی کر لی، اور والد صاحب (محمد عارف اللہ خان) ابھی کہیں ملازم نہیں ہوئے تھے۔ نانا صاحب کے ملازم ہو جانے پر رامپور کے مشہور پٹھان عثمان خان رزڈنے اپنی لڑکی کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا۔ اسی دوران میں بزمانۂ کلب علی خاں صاحب نواب لوہارو واپس تشریف لائے اور اپنے ولیعہد کے لیے ان سے ایک مولوی کی فرمائش کی، نواب کلب علی خان صاحب نے میرے نانا صاحب کی تعریف کی۔ وہ یعنی نواب لوہارو خود بھی مولوی تھے، اس لیے انہوں نے بلا کر وحدۃ الوجود کے مسایل پر ان سے بحث کی اور مطمئن ہو کر انہیں اپنے ساتھ لوہارو لے گئے۔ میرے والد صاحب ساتھ گئے۔ وہیں چونکہ میرے والد صاحب کو لوہارو اسٹیٹ میں تعلیم داری دیدی گئی، اور میرے نانا نے اپنی بڑی لڑکی خورشید بیگم کا نکاح میرے والد سے کر دیا۔ میں وہیں لوہارو میں پیدا ہوا، میرے والد چونکہ مولوی تھے۔ اس لیے کوئی ایسی ڈائیری ان کے پاس نہیں تھی جس میں اولادوں کی پیدائش کی یادداشت رکھی جاتی۔ اس لیے میری پیدائش کی تاریخ اور سنہ میں اختلاف ہے۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوا تھا، اور والد صاحب کہتے تھے کہ نہیں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ بہرصورت میری پیدائش ۱۹۰۲ء سے لیکر ۱۹۰۳ء تک دیکھ ہے۔ زیادہ بوڑھا ہونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا، اس لیے میں بھی ۱۹۰۳ء کے موقف میں ہوں۔ ۱۹۰۹ء میں ہم لوگ والد صاحب اور نانا صاحب کی پشتینی

ہو جانے کے بعد رامپور چلے آئے اور جب سے میں یہیں ہوں۔ بقیہ تعلیم یہیں حاصل کی۔ میرے والد اور نانا مجھے مولوی بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ عرف و نحو انہوں نے خود پڑھائی، اور ہندستانی تعلیم حکیم غلام حیدر صاحب کے مکتب میں پائی، اور پھر اپنے ماموں کی سفارش سے بڑی لے دے کے بعد انگریزی ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ دسویں جماعت میں پہنچا ہی تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال سے جو نامرادی بوجھ مجھ پر آ پڑا وہ میری عمر کے اعتبار سے (پندرہویں سال میں) بہت گمبھیر تا لیے ہوئے تھا، مگر احساس شرافت نے کافی مددگار بندائی، اور میں نے ٹیوشن کر کے گھر کا کام بھی چلایا اور پڑائی بھی جاری رکھی۔ شاعری کا چسکا اسکول کی ساتویں جماعت سے شروع ہو گیا تھا، مگر اس نے حرفی کیفیت پیدا نہیں کی تھی، مگر منشی امیر احمد صاحب مینائی کے خاندان والے جو ہمارے پڑوسی تھے اور میل ملاپ اپنوں جیسے تھے، دن رات ان کے ہاں بیٹھا اٹھا رہا۔ امیر مینائی کے پوتے حامد علیخاں کے استاد جرم کے ہاں جو شاعرانہ صحبتیں رہیں، یا ان کے لڑکے اسماعیل صاحب خیر سے دوستی اور مولوی منہاج الدین مینائی کے رعبت دلانے والی رایوں میں نے شاعری باقاعدہ التزام شروع کر دی، اور ایک دوست علی حسن خاں ماہر کی رائے سے باقاعدہ شاگردی کی دھن سمائی۔ رامپور کے تمام اساتذہ کا جائزہ لیکر مولانا محمود صاحب شفق کو استادی کے لیے چنا اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ شفق صاحب صرف غزل کے استاد تھے نظمیں اپنی طبیعت سے کہتا رہا۔ اور مولوی منہاج الدین مینائی کے جو شاعر نہ تھے مگر عربی کے فاضل، اور عربی ادب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ان کے متورے مزدر نظموں کے بارے میں شامل حال رہے۔ آپ ہی کے تقاضوں پر میں نے نظمیں رسایل کو بھیجنی شروع کیں۔ میری پہلی نظم "انتظار" ہمایوں لاہور میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے رسایل میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ میرا اپنا ایک مخصوص زاویۂ فکر ہے جو طنز اور سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے "ندرت ادا" میرے نزدیک شعر کی جان ہے۔ اس لیے میں کسی بھی رنگ میں ندرت ادا" کو بات سے جانے نہیں دیتا، مگر یہ تو شاعرانہ انداز فکر کی بات ہوئی۔ اس کا سوانح حیات سے کیا تعلق۔ اس لیے میں پھر آپ کو یہاں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے ہیتا قوم و وطن کی خامیوں پر طنز کیے ہیں۔ اس لیے تو سب سے پہلے زیارت رامپور کے نوابوں سے ٹکراؤ ہوا جس کی بنا پر مجھے بہت مصیبتوں کا سامنا رہا، مگر میں نے ہمت نہ ہاری حکومت کے وفادار میری ٹیوشنوں تک کے درپے رہے، چنانچہ اکثر ٹیوشنیں اسی بنا پر چھوڑنا پڑیں کہ وہ زیارت کے گھر کے تھے۔ ہیں ملازمتیں تو میں نے ہتا فیکٹریوں میں کہیں اکاونٹنٹی کہیں سپروائزری کہیں وے بیغی کی۔ اور اپنے خاندان کی نگہداشت میں سرگرداں رہا، لیکن فرائین حکومت کے آگے سر خم نہیں کیا۔ آخری وار جو حکومت نے مجھ پر کیا وہ یہ تھا کہ مجھ پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا اور میری ڈاک کیا، میری نقل و حرکت پر پابندیاں عاید کر دیں۔ اس دوران میں میرے سامنے کانگریسی دور تھا اور سوچتا تھا کہ یہ زیادتیاں ختم ہوں تو کانگریسی دور حکومت عوام کیلیے بہت سازگار ہوگا، مگر انجام کار اپنے اس تصور پر پشیمان ہوں۔ اس لیے کہ جس کانگریسی کے لیے میں نے خانقاہ تک کیے وہ مجھے خشامدی نہ ہونے کی وجہ سے لایق اعتنا سمجھی۔ یہی نہیں، بلکہ مجھے ملازمت سے بھی علحدہ کر دیا۔ اور آج آٹھ سال ہونے کو آئے، پراویڈنٹ فنڈ تک کی رقم نہیں ملی بلکہ اے۔ جی آفس سے صاف جواب مل گیا کہ "ہوا کھاؤ" اور "خاک پھانکو"۔ ریاست دوہادو سے والدہ کی پنشن تھی وہ بند کر دی گئی یقین مانیے تیس روپے کی رجسٹریاں کیں، مگر کوئی جواب نہ ملا اور والدہ صاحبہ چند برس تک پنشن کا انتظار کرتے کرتے راہی دار البقا ہو گئیں۔ آج میری یہ حالت ہے کہ کچے شاگردوں اور کچے اظہروں کے معاوضے سے چاے پانی میسر آجاتا ہے۔ میں نے جیسا کہ پہلے کہا ہے میری پوری دوہارا افغانستان میں ہے۔ میرے ایک چچا خان دولت خان رامپور آئے تھے۔ میرے سر پر ہے کہ میں ان کے ساتھ چلوں، مگر میری خواہش یہی ہے کہ یہیں بھارت میں مروں۔ بھارت میں بھی اس طرح کہ میں ہوں آئے۔ تاکہ میری شاعری کی تلخی پر بھرنگ جائے۔ پاکستان سے دوستوں اور عزیزوں کے ہزاروں تو پھر بھیجے ہیں، مگر بے شمار خط آئے، مگر میں اپنے اس نظریے کے نوٹ نہیں جانا چاہتا کہ

منظر ہے یا گلشن آدھیق جاوید رگا — زمین کے مرغ پر طبع آزماوں گا
چاہتا ہوں بھارت نام اور لوچاہو — سوچتا ہوں سے جو زباں ہوں گا

مضمون پر بات چل نکلی تو ایک قصہ اور سنو!

پہنچ گیا ہوں وہاں میں کہ واقعات نویس
لکھے کی طغرہ میں تھا سفر و شور مرا

تو اے حکومت کے فہم و ناشناس ادب
شراب توڑ کے بیچوں تو کیا قصور مرا

اپنے خانہ ان کی نگہداشت کے سلسلے میں طے کیا تھا کہ خدا دی نہیں کروں گا، مگر والدہ صاحبا کی عمر ۵۰ برس کی ہو گئی اور ان کی آنکھیں جواب دے گئیں تو مجبوراً چالیس برس کی عمر میں شادی کی، مگر وہ ڈیڑھ سال زندہ رہ کر انتقال کر گئیں۔ زندگی کا یہ رخ بھی دیکھا، اور اب یہ رخ بھی دیکھ رہا ہوں ع

بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد

فوٹو کی اشاعت اور سوانح حیات کی "رسوائی" کے سلسلے میں کئی بڑے رسالوں نے فرمائش کی، مگر میں کوئی نوجوان شاعر تو ہوں نہیں کہ فوٹو اور سوانح کی اشاعت باعث فخر سمجھوں اس لیے ٹالتا رہا، مگر آپ کا سلوک میرے ساتھ انتہائی اخلاق کا ضامن رہا ہے اس لیے یہ سوانح اکٹھی حاضر ہے اور فوٹو بھی۔ اب اس تفصیل کے اجمالی کی طرف آیئے۔ میرا نام احمد علی خاں عرف لڈن خاں ہے

جدّ و جہد

یہ ایک علمی ادبی اور اصلاحی ماہنامہ کا جو ملک کے مشہور و معروف شاعر مکتہ داں اور نقاد مولانا اختر واصفی صاحب کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ جدّ و جہد کے نرے ایک ادبی رسالہ ہونے کا دعویٰ نہیں۔ مگر روایات سے تغافل کر ضرور ہے یہ جریدہ ندرت اور جدت کا داعی ہے۔ بلکہ نئی اور پرانی کے اندھیرے میں وہ مینار نور ہے جو منزل بھی ہے اور منزل کا بھی۔ اگر آپ کے دل میں اپنے معاشرہ کی ترقی و اصلاح کی تڑپ اور کسک ہے تو جدّ و جہد کے صفحات اور ادبی شعری اور نثری تخلیقات پڑھ کر آپ کو اپنی تنقید پڑھنے کی آزادی ہے اور اگر آپ علم و ادب کی موجودہ راہ روی سے بیزار ہیں تو یقین جانیے کہ آپ کے لئے جدّ و جہد کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں آپ ماضی کی صداقتوں اور حال کے شور کو دوش بدوش پائیں گے۔ ضخامت ۶۴ صفحے سالانہ چھ روپے نمونہ آٹھ آنے

منیجر۔ ماہنامہ "جدّ و جہد"۔ قلعہ گوجر سنگھ۔ لاہور
(پاکستان)

شاد عارفی

کیا ہرج ہے جو کوے بتاں آگیا!
راہ میں "وقفۂ دربیاں" آگیا

جب ہمیں لطف ضبط فغاں آگیا
تو بھی اے ناصح مہرباں آگیا

بڑھ کے شور اسیری یہاں آگیا
اب فلاں، اب فلاں، اب فلاں آگیا

تیری محفل کو ایسا نہ سمجھا تھا میں!
سوچنا پڑ رہا ہے۔ کہاں آگیا

گفتگو موسم گل کے بارے میں تھی
ذکر ویرانیٔ گلستاں آگیا!

وہ مصیبت ہے ہر حال قائم رہی
جس مصیبت پہ "ان کا بیاں آگیا!"

اب وہ اکتا کے محفل سے اٹھنے کو ہیں
وقت رنگینیٔ داستاں آگیا

جانے والے چمن سے پلٹ آئیں گے
جب کبھی نرم دل باغباں آگیا

ہیں کہیں کا نہ رہتا، مگر مسکدہ
درمیاں۔ یقین و گماں آگیا

کر کے بیگانۂ آستان وفا
ہاتھ کیا تیرے اے آسماں آگیا

شادؔ برپا ہے طوفان عرض سخن"
کون اتنا بڑا قدرداں آگیا

ہندستانی تھیٹر کا معمار جگناتھ شنکر سیٹ

ڈاکٹر اے۔ اے۔ نامی

"بمبئی تھیٹر" (جدید) جس میں ہندستانی کا پہلا تماشا راجا گوپی چند اور جنڈیر" ۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو پہلے پہل گرانٹ روڈ بمبئی میں اسٹیج ہوا، جگناتھ شنکر سیٹ کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔ اگر وہ کوشش نہ کرتے، اپنا روپیہ نہ لگاتے اور سب سے زیادہ ڈائریکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ اس طرف مبذول نہ کراتے تو شاید ہی وہ عالم وجود میں آتا اور وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آتا بھی اور اگر آتا بھی تو شاید ایک مدت مدید کے بعد۔

جگناتھ شنکر سیٹ کو خدا نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ صاحب دولت تھے، صاحب جاہ و حشم تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں عہدیداروں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، جب کبھی وہ کسی عہدے دار سے کوئی بات کہتے تو وہ اسے سنتے اور توجہ دیتے، پیر تھے ہوتا تھا، جگناتھ شنکر سیٹ کا عوام پر بھی کافی اثر تھا اگر کوئی تھی تو صرف اس بات کی کہ ان کا تعلق کسی عالا برہمن خاندان سے نہیں تھا اور غالب یہی وجہ تھی کہ پونا کے معزز برہمن مورخوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر جیاکر اپنی حالیا تصنیف میں لکھتے ہیں۔ "یہ کہنا غلط ہے کہ مرہٹا قوم کی اصلاح کا کام پونا اسکول میں شروع ہوا۔ اس سے نصف صدی قبل جگناتھ شنکر سیٹ اس کا افتتاح بمبئی میں کر چکے تھے۔" بمبئی ایسوسی ایشن" کے روح رواں جگناتھ شنکر سیٹ تھے۔ ہندستان کے علاوہ انگلستان کے اخبارات بھی ان کی خدمات ملکی و ملی کے معترف تھے۔ "بمبئی ایسوسی ایشن" کے اصول پر "بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن" قایم ہوئی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس کے کرتا دھرتاؤں نے جگناتھ شنکر سیٹ کے اصولوں پر دسمبر ۱۸۸۵ء میں اس کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا۔

ڈاکٹر جیاکر چونکہ غیر برہمن نہیں تھے (ان کا تعلق

اس لیے وہ بیدی عادی ان کو گوپی چند کہہ کر بیان کرتے ہیں) پونا اسکول سے مراد وہ برہمن ہیں جن کی دنیائے سیاست اور تعلیم میں اجارہ داری ہے اور "بمبئی اسکول" سے مراد وہ عوام ہیں جو ہماری پرندہ ابا یا ہیئت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ڈاکٹر موصوف یہ کہتے ہیں کہ جگناتھ شنکر سیٹ چونکہ عالا ذات کے برہمن نہ تھے، اس لیے پونا اور ناسک کے برہمنوں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور ان کی خدمات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

جگناتھ شنکر سیٹ اپنی پیدائشی کمزوری کے باعث تاریخ میں جگہ نہ پا سکے۔ کیونکہ برہمن مورخین نے ان کی طرف توجہ نہ دی، اگر کبھی ان کی تاریخ مرتب ہوئی تو اس کے ماخذ وہ انگریز ہوں گے جو اب بھی بمبئی گورنمنٹ کے آرکیوز میں محفوظ ہیں یا دوسرا سلسلہ ہوگی جو گورنمنٹ اور ہوم ڈپارٹمنٹ سے رہی اور جس کی نقول اب بھی محفوظ ہیں۔ مطلوبہ دلیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جس قدر حالات جگناتھ شنکر سیٹ کے دستیاب ہو سکیں چاہے وہ رسالوں سے ہوں یا اخباروں سے ہوں یا حقہ دار اخبارات سے، ملک سے ہوں یا سوانح عمریوں اور سفرناموں سے ایکجا کر دیے جائیں۔

جگناتھ شنکر سیٹ قدرت کی طرف سے ایک عالا دماغ لے کر آئے تھے۔ دولت اور عزت و عظمت نے اس میں چار چاند لگا دیے اور اس کے باوجود کہ ۱۸۳۲ء تک مغرور، خود سر اور خود غرض اس کے حامی نہ تھے کہ "نیٹیو" ان کے تھیٹر میں آئیں لیکن جب انگلش ایجوکیٹڈ اور تھیٹر کل کمپنین کو ان کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ بلائے جاتے تھے، وہ ہیتا گو ریز کا نڈر ایجیٹیٹر اور ریفارمر جسٹس سے مساویانہ اصول پر ملتے اور دل کھول کر انگریزوں کی مدد کرتے تھے، بمبئی تھیٹر کے عہدہ دار اس وقت ان کو خوش آمدید کہتے اور ان کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے تھے۔

فنِ اخلاق، نیک سیرت اور فرشتہ صفت انسان تھے، وہ نہ صرف بمبئی ایجوکیشنل سوسائٹی کی وقتاً فوقتاً امداد کرتے، بلکہ دوسرے کئی اداروں کی بھی اعانت کرتے تھے، چنانچہ جب "میوزیل فنڈ" جو یادگار اور آرٹ کا مشہور مرقع ہے ۱۸۲۹ء میں بمبئی آیا اور جگناتھ شنکر سیٹ سے امداد کا طالب ہوا تو انہوں نے اسے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ فنِ مدد کی اور اپنے دوستوں کی مدد سے دو موتی اور سازی موسیقی کے پروگرام مرتب کرائے، اسی طرح جب کابل کے پرچگیر تھیٹر کے منتظمین نے امداد طلب کی تو جگناتھ شنکر سیٹ نہ صرف تماشے اسٹیج کرائے، بلکہ مالی صورت میں بھی مدد کی (۱۸۳۰ء) جگناتھ شنکر سیٹ نے اس طرح "موسیو ڈومانکٹ" کی بھی امداد کی جو بوڈی جنرل کی اسپریل تھیٹر کا مشہور رقاص تھا، یہی نہیں کہ صرف اس کو تھیٹر دلایا، بلکہ اس کے فن کے مظاہرے کرائے اور اس کے مصارف برداشت کیے۔

جگناتھ شنکر سیٹ "دی فرسٹ سٹی زین آف بمبئی" کہلاتے تھے۔ ان کے دادا بابل سیٹ ساناد، تھیل مرباڈ، ضلع تھانا کے تاجر تھے اور انگریزوں کے ایجنٹوں سے تجارتی لین دین رکھتے تھے، بعض دوستوں کے مشورے سے وہ اپنے بیٹے شنکر کے ساتھ گھوڑبندر گئے اور وہاں کافی عرصہ قیام کے بعد بمبئی کا رخ کیا۔ بعض کا بیان ہے کہ وہ ۱۷۳۰ء میں اور بعض کے نزدیک ۱۷۳۵ء میں بمبئی وارد ہوئے۔

چونکہ اس زمانے میں انگلش، پرچگیز اور ڈچ کے درمیان خطرناک بحری اور بری لڑائیاں ہو رہی تھیں، اس لیے یہ تینوں قومیں اپنی تجارت اور اپنے تاجروں کی حفاظت کے پیش نظر اپنے اپنے ایجنٹوں کی حفاظت کرتی رہتی تھیں تاکہ ضروری اشیا کی سپلائی کا سلسلہ برابر جاری رہے۔

نوجوان شنکر کو بمبئی کی آب و ہوا بہت راس آئی اور اس نے جلد ہی نہ صرف اپنے باپ کے کاروبار کو اپنے قابو میں کر لیا بلکہ انگریزی جہازوں کا ایجنٹ بھی بن گیا۔ خاص کر ان جہازوں کا، جو مشرقی بنیدر اور چین کے ساتھ تجارت کرتے تھے، چونکہ پرچگیز اور ڈچ مشتر کا طور پر انگریزی جہاز کو ڈبو دیتے تھے، اس لیے مصلحت کے پیش نظر وہ اپنے جہازوں کے اسلامی نام رکھتے اور عرب اور ہندستانی ملازمین کے ذریعے تجارت کرتے تھے، شنکر نے اس قسم کی تجارت میں حصا لینا شروع کر دیا۔

شنکر سیٹ نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک بچپن ہی میں مر گیا، دوسرا پاگل ہو گیا، دوسری بیوی سمات بھوانی سے پہلے لڑکی پیدا ہوئی پھر لڑکا ہوا، یہی لڑکا جگناتھ کے نام سے مشہور رہا، اس کی تاریخ و ساعت پیدائش ۱۰ر فروری ۱۸۰۳ء رات دو بجے ہے۔

جگناتھ کو علا تعلیم دی گئی، الفنسٹن کالج کے دو انگریز اس کی علا تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ ایک انگریز، انگریزی پڑھاتا تھا اور دوسرا تاریخ اور فلسفا، اسی طرح ایک پنڈت سنسکرت پڑھاتا تھا اور دوسرا مرہٹی، شنکر سیٹ نے ارادتاً اپنے بیٹے کو کانونٹ یا پرائیوٹ انگلش اسکولوں میں نہیں بھیجا، کیونکہ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ عیسائی مبلغین اپنے مدرسوں میں انگریزی تعلیم کے پردے میں تثلیث کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان ہندستانیوں کو عیسائی بنایا جاتا ہے۔

جوان سال جگناتھ نے بعد تحقیق یہ معلوم کیا کہ یہ امر واقعی ہے اور اب تک کافی ہندوؤں کو عیسائی بنایا جا چکا ہے اور حکومت کی سرپرستی اور سرکاری امداد سے عیسائی مشن کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں، "بمبئی آکزلری اسکاٹش مشن سوسائٹی" اسی اسکول چلا رہی ہے، ان میں ۲۸۵۲ لڑکے اور ۲۷۰ لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۰۶۱ لڑکیاں مشن کے دوسرے چھ مدرسوں میں ہیں۔ طلبا کی تعلیم کے لیے اب تک مشن ۲۲ ہزار کتابیں چھاپ چکا ہے۔ جگناتھ شنکر سیٹ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسائی مبلغین کے متعلق جو باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر صحیح ہیں۔

جگناتھ شنکر سیٹ نے یہ خیال کر کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، اور جہالت کا علاج صرف تعلیم ہے، اپنی پوری توجہ ہندستانیوں کی تعلیم کی طرف مبذول کی۔ لڑکیوں کے لیے بھی ایک مدرسا قایم کیا اور اپنے خرچ سے اس کے لیے ایک عمارت بنوائی۔ اس زمانے میں مرہٹے اپنی لڑکیوں کو اسکول میں بھیجنے کے مخالف

کیا کہ وہ آیندہ بھی مدد کرتے رہیں گے اور ہدایت کی کہ وہ ہر ہفتہ میں کوتاہی نہ کرے اور پردوں کا خاص خیال رکھے جو کافی پرانے ہو گئے ہیں۔

یورپ کے مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کے باعث جگناتھ شنکر سیٹ کو انگلستان اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کافی معلومات ہو گئیں تھیں۔ ریویو میوزیکل دبحوالۂ فارن کوارٹرلی ریویو مورخہ مارچ ۱۸۳۲ء صـ۷۷) کے حوالے سے وہ اپنی یادداشت میں کہتے ہیں۔

"پھر وہ شئے جس کا تعلق تفریح سے ہے تباہ کن ہے، میں نے یورپ کے تھیٹروں کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر جن لوگوں نے اس کاروبار میں ہات ڈالا ان کو نقصان کثیر برداشت کرنا پڑا اور اپنی قسمت پر رویا پیٹا کی مہربانی کرانی پڑی، سوائے منظوم ڈراموں کے اور وہ بھی شاید و باید۔ آج کل جس قدر تھیٹر جرمنی میں ہیں وہ سب روسا کی امداد کے محتاج ہیں اور وہ تمام تھیٹر جو اٹلی اور انگلینڈ میں ہیں یا ہمارے ملک خاص کر پیرس میں ہیں وہ سب فیڈرن کی طرح تباہ حال ہیں، لیکن کیا اس سے یہ نتیجا نکالا جا سکتا ہے کہ ہم کو تھیٹر کی ضرورت نہیں ہے؟ کہنا یہ ہوتا ہے، عوام کے اخلاق کی اصلاح کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم تھیٹروں کو تباہ نہ ہونے دیں۔

جگناتھ شنکر سیٹ نے اپنے دوستوں سے مشورا کیا کہ اگر انگریزی اسٹیج پر مرہٹی ڈرامے دکھلائیں جائیں تو کامیاب ہوں گے یا نہیں؟ دوستوں نے مشورا دیا کہ وہ اس قومی کام میں مزید تاخیر نہ کریں۔ جگناتھ شنکر سیٹ کو اپنے دوست ڈاکٹر جاوداجی لاڈ کی ہمت پر بہت بھروسا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جس وقت بھی مرہٹی اسٹیج کی تاسیس کا کام وہ ان کے سپرد کریں گے وہ تن من دھن سے اس کام میں لگ جائیں گے اور بخوبی انجام دیں گے۔

لیکن اس کام میں دشواریاں بھی تھیں، مرہٹے تعلیم میں بہت پیچھے تھے، وہ حکومت کو اور حکومت انہیں شبہ کی نظروں سے ہمیشہ ہی دیکھتی تھی۔ اس زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے جگناتھ شنکر سیٹ کو اپنی جاری ہوئی اسکیم کئی سال کے لیے ملتوی کرنی پڑی۔

۱۸۳۷ء میں بمبئی تھیٹر کی مجلس انتظامی کے واحد ممبر آنریبل مینون ہم اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر وطن جانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے حکومت بمبئی سے درخواست کی کہ ان کو تھیٹر کی ذمے داری سے سبکدوش کیا جائے۔ اور درخواست کی کہ تھیٹر کو نیلام کر کے اس کا قرض ادا کر دیا جائے، حکومت نے یہ تجویز منظور کر لی۔

آنریبل مسٹر مینون ہم کی خدمات جلیلا کے پیش نظر بمبئی امیچورس نے گاے میزنگ نامی تماشا ۱۱ دسمبر ۱۸۳۷ء کو دکھلانا منظور کیا۔ یہ تماشا اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ جملہ سرکاری ممبر سرکاری عہدے داروں نے شرکت کی۔ امیچورس نے ۹ مارچ ۱۸۳۸ء کو "اسپیڈ دی ہو" دکھلا کر ہمیشا کے لیے تھیٹر کو موت کی آغوش میں سلا دیا۔

نیلام سے پہلے مسٹر مینون ہم اور دوسرے انگریز دوستوں نے شنکر سیٹ کو یہ مشورا دیا کہ وہ تھیٹر کا قرض ادا کر کے اسے اپنے قبضے میں کر لیں، اس کے بعد سول اور ملٹری عہدے داروں کی ایک کمیٹی کی بناڈالی کہ اسٹیج کو زندہ رکھیں، لیکن جگناتھ شنکر سیٹ نے یہ مشورا قبول نہ کیا کہ اگر ان کو نصف لاکھ سے زیادہ رقم خرچ کرنا ہی ہے تو وہ قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کیوں نہ خرچ کریں۔

[illegible] ان کے انکار کرنے پر تھیٹر نیلام ہو گیا۔ ۳۱۳۳ روپے میں پراپرٹی لائبریری، سین اور فرنیچر اور ۵۱۰۰ میں عمارت زمین کے ساتھ فروخت ہوئی۔ تھیٹریکل فارسی اسٹیج کمپنی کا ۳۲ ہزار روپیا قرض تھا، لیکن ہندوستان تھیٹر کی سفارش پر کمپنی نے دس ہزار معاف کر دیے۔ ادائیگی قرض کے بعد جو رقم بچی وہ سرکاری خزانے میں جمع کر دی گئی۔

روپے کا خزانے میں جمع ہونا تھا کہ پبلک میں کھلبلی مچ گئی، تجویزیں پیش ہونے لگیں، کسی نے ہسپتال بنانے کی تجویز

تھے۔ جگناتھ سیٹ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کی لڑکیوں کو اس اسکول میں داخل کیا۔ اس کے بعد اپنے دوستوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی لڑکیوں کو اس اسکول میں بھیجیں۔ یہ بہار اشٹر کا پہلا گرلز اسکول تھا۔

۱۸۴۲ء میں وہ "بمبئی نیٹو اینڈ اسکول سوسائٹی" کے ممبر بنے، اور صبح و شام ہزاروں روپے کی امداد سے اس کو عوامی تعلیم خدمت کے قابل بنایا۔ مرہٹی، گجراتی، اور ہندستانی کتابیں لکھوائیں اور طبع کرائیں اور لکھنے والوں کو معقول معاوضہ دیا۔ اس سے پہلے ہندستانی میں درسی کتابیں نہیں تھیں۔ پہلی بار محمد ابراہیم مقبر نے تیار کیں، جو اس وقت حکومت بمبئی کے انٹر پریٹر تھے۔

۱۸۲۷ء میں سوسائٹی نے یہ طے کیا کہ بمبئی میں ایک کالج قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایک کالج کے قیام کا پروگرام بنایا گیا چونکہ مانسٹورٹ الفنسٹن اس وقت گورنر بمبئی تھے، اس لیے انہیں کے نام پر الفنسٹن کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ جگناتھ شنکر سیٹ نے "الفنسٹن فنڈ" قائم کیا تھا اس لیے سوسائٹی نے مشترکاً ان ہی کو ٹرسٹی مقرر کیا۔ جگناتھ سیٹ نے ہزاروں روپے اسٹیٹ میں دیے اور دوسروں سے دلوائے۔ اس طرح الفنسٹن کالج تعمیر ہوا۔

جگناتھ شنکر سیٹ کی اب کلی توجہ عالا تعلیم کی طرف تھی، پہلے گرانٹ میڈیکل کالج بنوایا۔ پھر لا کالج کی بنیاد رکھیں، ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے پہلے حکومت بمبئی نے ان کو "جسٹس آف دی پیس" کے خطاب سے نوازا۔ اس کے بعد گرانٹ جوری کا ممبر مقرر کیا۔ بعد میں کونسل کی ممبری بخشی۔ جگناتھ شنکر سیٹ جہاں رہے انہوں نے ہمیشہ ملک و ملت کی خدمات کو اپنا فرض سمجھا۔

۱۸۴۲ء میں جگناتھ شنکر سیٹ کے والد کا انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی اور وہ بلا شرکت غیرے بیس لاکھ روپے نقد، وسیع تجارت اور متعدد بنگلوں کے مالک تھے۔ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود جگناتھ شنکر سیٹ نے اس میں اضافہ کیا اور جو عزت و عظمت شنکر سیٹ ان کے پیر کر گئے تھے اس میں اضافہ ہی کرتے رہے۔

جن جن سے مشاغل کے ساتھ ساتھ وہ "بمبئی تھیٹر" سے بھی دلچسپی لیتے تھے، اس لیے یہ تھیٹر صرف انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ ۱۸۳۰ء تک اس میں ہندستانیوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف وہ ہندستانی جا سکتے تھے جو خاص خاص موقعوں پر مدعو کیے جاتے تھے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ جگناتھ شنکر سیٹ پہلی بار ۱۸۲۷ء میں سر آلگزنڈر ہارٹ کی دعوت پر بمبئی تھیٹر گئے تھے۔ اس دن گورنر اپنی بیگم اور صاحبزادوں کے ساتھ شریک تھے۔

اس کے بعد تھیٹر کے ساتھ ان کی دلچسپیاں بڑھ گئیں اور وہ وقتاً فوقتاً اس میں جانے اور اس کی کارروائیوں میں حصا لیتے رہے، یہی نہیں کہ انہوں نے اس تھیٹر میں تماشے دیکھے بلکہ تھیٹر کے انتظامی معاملات میں بھی مداخلت کی اور ہر قسم سے مجلس انتظامی کی مدد کی۔

جگناتھ شنکر سیٹ وقتاً فوقتاً اور مختلف طریقوں سے بمبئی تھیٹر اور منتظمین کی امداد کرتے رہتے تھے۔ کبھی غریبوں کی مدد کے فنڈ میں، کبھی تباہ حال آتشزدگی باشندوں کے سلسلے میں اور کبھی تھیٹر کی تعمیر نو، پوشائی اور دوستی کے سلسلے میں لیکن اس تمام خلوص، ہمدردی اور امداد کے باوجود انگریز یہ بالکل پسند نہ کرتے تھے کہ وہ تھیٹر کے اندر قدم بھی رکھیں۔ جگناتھ شنکر سیٹ کو اس کا بخوبی احساس تھا، لیکن وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے، اور ہر ممکن امداد سے فن ڈراما کو ترقی دینے اور مقبول عام بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔

فنون لطیفہ سے قریبی تعلق کی وجہ سے وہ ڈراما کی خوبیوں اور برائیوں سے بخوبی واقف ہو گئے تھے، ایک موقع پر جبکہ "چارلس دوم" دکھایا جا رہا تھا تو انہوں نے اپنے دل میں ان پر سخت نکتہ چینی کی، ان کو یہ دیکھ کر خفگی ہوئی کہ مقامی انگریزی اخبارات نے بھی ان ہی برائیوں اور کمزوریوں کا ذکر کیا ہے اور گن گن کر وہی خرابیاں بیان کی ہیں، جو ان کے پیش نظر تھیں، اس سے ان کو اپنی ڈرامائی صلاحیتوں کا احساس ہو گیا۔ دوسرے دن جب بمبئی امیچورس کا ڈائریکٹر ان سے ملنے آیا اور کاروبار میں نقصان کی شکایت کی تو انہوں نے اس کی کافی مدد کی، اور وعدا

پیش کی گئی نے میڈیکل کالج کی سفارش کی، کسی نے جنرل لائبریری بنانے کا مشورہ دیا، غرضکے جتنے موقعہ اتنی باتیں۔

بعض لوگوں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ تھیٹر کے روپے سے تھیٹر ہی بنایا جائے، درجنوں دستخطوں سے ایک طویل سراسلا شریف بمبئی کی خدمت میں پیش کیا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ باشندگان شہر کا ایک جلسہ طلب کیا جائے۔

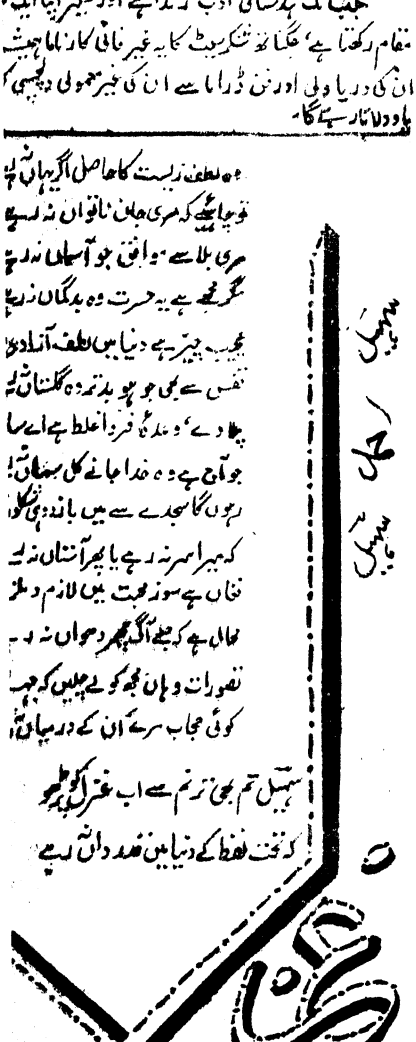
اس درخواست کے پیش نظر ڈبلیو۔ سی بروس شریف بمبئی نے سرشتہ ۲۶ر اپریل ۱۸۳۶ء کو رایل ایشاٹک سوسائیٹی کی بمبئی برانچ میں بوقت ۱۲ بجے جلسہ طلب کیا گیا، طویل بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ آنریبل ڈائیرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی سے درخواست کی جائے کہ نئے تھیٹر کی تعمیر کے لیے پرانے تھیٹر کا "بقیا روپیا" منظور کیا جائے۔

خط کتابت کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ۲۸ر دسمبر ۱۸۳۱ء کو سکریٹری حکومت بمبئی مسٹر ڈبلیو۔ آر ماس نے جگناتھ شنکرسیٹ اور دوسرے دستخط کنندگان کو مطلع کیا کہ کورٹ آف ڈائیرکٹرز نے ۸۸۷۰ روپیا بسلسلۂ تعمیر تھیٹر منظور فرمایا ہے۔ اس رقم سے صرف تھیٹر تعمیر ہوسکتا ہے "بقیا رقم" کسی دوسرے کام میں صرف نہیں کی جاسکتی، مجلس انتظامی تھیٹر کمپنی کو اپنی تفتیش کے دوران میں پتا چلا کہ بقیا رقم حکومت کی منظور کی گئی رقم سے زیادہ ہے۔ جگناتھ شنکرسیٹ نے پھر خط کتابت شروع کی۔ حکومت نے آخرکار ۱-۱۱-۳۷۶۵۱ روپیا منظور کرلیا۔

جگناتھ شنکرسیٹ نے یہ دیکھ کر کہ اس تھیٹر سے نہ تھیٹر بن سکتا ہے اور نہ زمین ہی خریدی جاسکتی ہے۔ اپنی جائداد کا ایک قیمتی پلاٹ جو گرانٹ روڈ پر واقع تھا تھیٹریکل کمپنی کے سپرد کردیا۔ مجلس نے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ زمین کے علاوہ جگناتھ شنکرسیٹ نے کمپنی کو مالی امداد بھی دی، چونکہ تھیٹر کی تعمیر میں نصف سے زیادہ رقم ان کی تھی اس لیے مجلس انتظامی میں ان کی آواز سنی جاتی تھی۔

جگناتھ شنکرسیٹ کی کوششوں سے اسی تھیٹر میں مرہٹی، گجراتی اور ہندستانی تماشے دکھلائے گئے۔ ہندستانی کا پہلا ڈرا "راجا گوپی چند اور جلندھر" ۲۶ر نومبر ۱۸۵۳ء کو اسی تھیٹر میں دکھلایا گیا۔ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۵ء تک جو ہندستانی ڈرا اس تھیٹر میں دکھلائے گئے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جاچکی۔

جب تک ہندستانی ادب زندہ ہے اور تھیٹر اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے، جگناتھ شنکرسیٹ کا یہ غیر فانی کارنامہ ہمیشہ ان کی دریا دلی اور ان ڈراما سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا یاد دلاتا رہے گا۔



وہ لطف زیست کا حاصل اگر یہاں نہ ہے
تو چاہیئے کہ مری جاں ناتواں نہ رہے
مری بلا سے موافق جو آسماں نہ رہے
مگر مجھے ہے یہ حسرت وہ بدگماں نہ رہے
عجیب چیز ہے دنیا میں لطف آزادی
نفس سے بھی جو ہو بدتر وہ گلستاں نہ رہے
پلا دے، وہ مئے فرد اغلط ہے اے ساقی
جو آج ہے وہ خدا جانے کل سماں نہ رہے
رہوں گا سجدے سے میں باندھ کر یہی نکتہ
کہ میرا سر نہ رہے یا پھر آستاں نہ رہے
فغاں ہے سوز محبت میں لازم و ملزوم
مجال ہے کہ جلے آگ پھر دھواں نہ رہے
تصورات وہاں مجھ کو لے چلیں کہ جہاں
کوئی حجاب سرے ان کے درمیاں نہ رہے

سہیل تم بھی ترنم سے اب غزل کو چھیڑو
کہ تخت نطق کے دنیا میں قدردان نہ رہے

جھرمٹ

فاروق بخشی
بدایونی

وہ رات کی آغوش میں اک لہر سہانی
جگنو سے چمکتے ہوئے دریا کے کنارے
اب تک ہے مجھے یاد وہ جمنا کا کنارہ
ہر ذرے میں رنگینیٔ تصویر محبت
کھلتے ہوئے پھولوں کے وہ گلرنگ کٹورے
وہ بادۂ کوثر سے برستے ہوئے جھالے
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں اک آئینہ بندی
بہتی ہوئی موجوں کا وہ آپس میں الجھنا
تھی انجمن چرخ کی تصویر نمایاں
وہ مست ہوائیں وہ ہواؤں میں ترنم
نظروں کی پہنچ تک تھے ستارے ہی ستارے
خاموش سا ساحل میں بھیروں کے ترانے
ناگاہ کہیں دور اچھلنے لگیں موجیں
اک سرو خراماں تھا ہم آغوش تماشا
اب تک میں اسی فکر میں ہوں سرگرداں
وہ عارض پرنور و نکھرا ہوا چہرہ
بازو و نخنے کہ صندل کی لچکتی ہوئی شاخیں
اللہ رے یہ رعب کہ تھراتی تھیں موجیں
پھرتا ہے نگاہوں میں وہی حسن سراپا
دریا کی پری گلشن فردوس کی ساکن
دیکھا جو کنکھیوں سے مجھے محو نظارہ

جھرمٹ میں ستاروں میں وہ کلیوں کی جوانی
مہتاب کی کرنوں سے دمکتا ہوا پانی
بھولا ہوں نہ بھولوں گا یہ دلچسپ کہانی
ہر شے سے امڈتا ہوا طوفان جوانی
بہتے ہوئے پانی پہ حبابوں کی روانی
وہ ساغر تسنیم میں اک جوش جوانی
پیڑوں کے گھنے سائے میں دریا کی روانی
سبزے میں وہ انگڑائیاں لیتا ہوا پانی
ہر موج تھی صد غیرت نقاشی مانی
وہ چاندنی رات اور وہ بہتا ہوا پانی
پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پانی
گویا ہمہ تن گوش تھی دریا کی روانی
جنبش سی ہوئی ماہ کو ہلنے لگا پانی
جلتے ہیں پیے تھی اسے موجوں کی روانی
اک پیکر دلکش تھا کہ تصویر جوانی
پانی میں کوئی چاند تھا یا چاند میں پانی
بکھری ہوئی زلفیں تھیں کہ کملے میں تھا پانی
بچے بچے کے نکل جاتا تھا اک سرت کو پانی
گویا تھا اگر جسم تو پوشاک تھی دھانی
آرائش ہر بزم ہر اک بزم کی رانی
نزدیک مرے آنکھ کی خود عشق کی بانی

بایں ہمہ سرشاری و بایں ہمہ مستی
اک خواب ہے محشر یہ مرا عہد جوانی

"ہمارے بھی ہیں مہربان کیسے کیسے!"

مولانا افقر موہانی صاحب کے متعلق دو باتیں

ماہنامہ "ہندستانی ادب" حیدرآباد میں ہر مہینہ "حقائق و معارف" کے عنوان سے افقر صاحب موہانی کا کلام بڑے احترام کے ساتھ مدیر صاحب شایع فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا افقر صاحب ایک کہنہ مشق شاعر اور ان کے بہت سے شاگرد ہیں؛ لیکن عاشقانہ غزلوں میں عنوان کے لحاظ سے کوئی شعر ایسا نہیں ملتا جس سے "حقائق و معارف" کا پتا چلتا ہو۔ علاوہ اس کے جب جولائی کا نمبر دیکھتا ہوں تو اسی نمبر میں ان کا کلام جو شایع ہوا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیری مریدی کے علاوہ ان کو فن سے واقفیت نہیں۔ پانچواں شعر اسی غزل کا۔

اب مشق تصور ہے مری مشق تصور
جس سمت انہیں دیکھنا چاہا نکل آئے

اسی شعر میں نکل آنے کی جگہ نظر آنے کا پہلو نکلتا ہے۔ ردیف بلکل نامناسب ہے اور چسپاں نہیں۔ چھٹواں شعر۔

وہ مطلب دل بے کہے اے کاش سمجھ لیں
خاموشی میں پہلو کوئی ایسا نکل آئے

خاموشی کی (ی) تقطیع سے باہر ہے۔ اردو، ہندی الفاظ کے فارسی یا عربی کے الفاظ میں حروف علت کا دنیایا وزن سے باہر ہونا جایز نہیں، اگر الف وصل آگے ہو تو جایز ہے، لیکن خاموشی کے بعد الف وصل نہیں مصرع اس صورت میں بھی موزوں ہو جاتا ہے۔

خاموشی میں پہلو کوئی ایسا نکل آئے

آٹھواں شعر۔ سجدے سے جو اٹھنے میں توقف ہو جبیں کو
دل پہلو سے کرتا ہوا سجدہ نکل آئے

اس شعر میں بھی پہلو کا (و) تقطیع سے باہر ہے الف۔ واؤ (و) حروف علت ہیں۔ یہ مصرع یوں ہی موزوں ہو جاتا ہے۔

دل پہلو سے کرتا ہوا سجدہ نکل آئے

تیرواں شعر۔ ایسا ہو تو سب دیکھ لیں پھر پیار کا جلوہ
لاکھوں میں کہیں حضرت موسیٰ نکل آئے

(اس شعر کا دوسرا مصرع قابل لحاظ و غور ہے۔ نکل آئے کی جگہ "نکل آئیں" کی طرف خیال جاتا ہے، کیونکہ حضرت کے ساتھ نکل آئے کا پہلو نہیں۔

مجھے امید ہے اس بیری انتقادی کو مولانا معاف فرمائیں گے اور مدیر صاحب رسالا ایسے غلط اشعار کے چھاپنے سے احتراز کریں گے۔ فقط۔ ایک نقاد۔

★ ——— یہ "دو بڑوں" کی باتیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ مولانا خود ہی اس کا جواب دیں۔ "ہندستانی ادب" کے صفحے ہر وقت کھلے ہیں۔ یا یہ صورت پسند نہ ہو تو تاج الشعرا نوح ناروی صاحب۔ بی۔ او، ایند ڈبلیو نارا۔ ڈسٹرکٹ الہ باد (یو۔ پی) کے پتے پر خود ہی جواب دے لیں۔ ایڈیٹر

لکھنؤ

۱۰-۱۲-۵۹ء

عزیز محترم خان صاحب زاد لطفہ

سلام مسنون و دعائے خیر۔ نمبر کا پرچا ملا، مگر افسوس کہ اکتوبر کا نہ مل سکا۔ پہلے بھی لکھ چکا ہوں، نہ ملے جائے غنیمت ہے، آپ کی نوازشات۔ پرچے کی تہذیب خلاف وضع دیکھ کر افسوس بھی ہوا تعجب بھی۔ یعنی میری غزل کی جگہ شروع سے ہٹا کر آخر میں کہیں کر دی گئی ہے۔ وجہ نامعلوم، قصور ندارد، وضعداری بڑی چیز ہوتی ہے۔ خیر یہ تو مزاع تھا۔ کوئی بات نہیں، یہ خیال نہ فرمایا جائے۔ اپنی چند غزلوں کی ایک نتھی علحدہ ہے۔ اور شاعر نے واردات کی بعض چیدہ غزلوں کی ایک نتھی علحدہ اور دانا کی جاتی ہے۔ ہر شاعر کا پتا غزل کے نیچے لکھ دیا گیا ہے۔ پرچا چھپنے پر ہر ایک کو بذریعہ کارڈ

نوٹ: ہمیں سخت افسوس ہے کہ بعض ناگزیر حالات کے سبب فروری کا پرچا بھی کافی دیر سے شایع ہوا۔ ادارہ

دلی میں اردو کا خاتمہ

وہی ہوا جس کا ہمیں یقین تھا۔ وزارت داخلا چاہتی تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی

صاحبزادہ امتحن فاروقی

اسے دلی میں انگریزی کا نہیں اردو کا خاتمہ کہا جائے گا کہ دلی کارپوریشن نے جو لسانی کمیٹی اس مسئلے پر غور کرنے کیلئے مقرر کی تھی کہ انگریزی کی جگہ ہندی لے وہ صرف ہندی کے بارے میں سفارش کر سکتی ہے اردو کیلئے نہیں۔ اس مسئلے پر تقسیم آرا کا نتیجہ ۳ کے مقابلے میں ۵ نکلا اور اس طرح جن سنگھی ممبران اردو کا راستہ مسدود کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہر چند دلی کے کانگریسی اور کمیونسٹ ممبران نے اردو کیلئے زبردست کوشش کی مگر جن سنگھی والے ایک ووٹ سے کامیاب ہو گئے لیکن ہم اس کا الزام ہندستان کی کانگریس گورنمنٹ اور کانگریس ہائی کمان کو دیے بغیر نہیں رہ سکتے، اسلئے کہ اردو کو جس طرح مٹایا جا رہا ہے وہ سب کارروائیاں کانگریسی عہد حکومت میں ہو رہی ہیں اور جہاں جہاں سے اردو کو دیس نکالا ملا ہے، وہاں سب جگہ کانگریسی حکومتیں تھیں مگر انہوں نے وہ کام کیا جو جن سنگھیوں اور ہندو مہاسبھائیوں کو کرنا چاہیے تھا۔ پنجاب میں تمام کاروبار اردو میں ہو رہا تھا اور آفیشل بھی بہت کچھ ہے۔ دلی اور یو۔پی میں اردو کا قتل پہلے ہو چکا تھا، مگر دلی میں اب ہو گیا۔ اگر کانگریس ہائی کمان سختی سے اردو کی تائید کرتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اردو کو یوں مٹایا جاتا۔ جس طرح یو۔پی اور پنجاب سے اردو کو ختم کیا گیا ہے۔ پنڈت نہرو اپنے عہد حکومت میں یو۔پی سے اردو کا خاتمہ کر چکے تھے۔ جب دلی میں اردو کا قسمت کا فیصلا ہونے والا تھا تو وہیں آ بیٹھے اور چونکہ دلی اسٹیٹ ختم ہو گئی اور دلی ایڈمنسٹریشن مرکزی وزارت داخلا کے تحت آ گیا اسلئے دلی سے بھی اردو کا خاتمہ ہو گیا۔ ہم پنڈت پنت جی کو وزارت داخلا کو ملامت نہیں الزام دیرہے اسکے لیے ہمارے پاس ثبوت ہے اور وہ یہ کہ دلی گورنمنٹ نے جو لسانی کمیٹی مقرر کی تھی اسکے اتفاق رائے سے اردو کو دلی کی ثانوی زبان بنانے کے حق میں فیصلا کیا تھا اور دلی اسٹیٹ ختم ہو جانے کے بعد اس فیصلے کو منظور کرنا وزارت داخلا کا کام تھا، مگر وزارت داخلا نے اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور جب کبھی پارلیمنٹ میں اس سے پوچھا گیا تو یہ جواب دیا گیا کہ ابھی کوئی فیصلا نہیں ہوا اور معاملا زیر غور ہے، یہاں تک کہ دلی کارپوریشن قائم ہو گئی اور کارپوریشن نے اس معاملے کو پھر سے اٹھا کر [illegible]

اب وہ کام کرنے کی کامیابی کی جو وزارت داخلا کی خواہش کے مطابق ہے اور اگر ہوم منسٹری ایماندارانہ سے اردو کو ختم کرنا نہیں چاہتی تو اس کی دشمن نہیں ہے تو پھر ہمیں یہ بتانا ہے کہ اسنے دلی گورنمنٹ لسانی کمیٹی کا فیصلا کیوں منظور نہیں کیا۔ یہاں یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ دلی کا اردو کا کیا رشتا ہے یہ تو کوئی بچا بھی نہیں سکتا ہے اور نہ آج مشترکہ تہذیب و تمدن کی دہائی دینے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی اس کی کوئی قیمت ہمارے حکمرانوں کی نظر میں ہوتی، اگر وہ ایماندارانہ سے ایک سیکولر اور سوشلسٹ سماج بنانا چاہتے تو ایک نہیں ایک لاکھ پاکستان بھی بنجاتے ان کے پاس جتنا بھی ہندستان رہتا وہ اس میں ہر زبان، مذہب، اہل دیہاں کے لوگوں کو محل انصاف کرتے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے، لیکن ان کی زبان پر تو یہ سب چیزیں نہایت ہی دلکش نعروں کی صورت میں موجود ہیں، مگر عملی طور پر انہوں نے زندگی کے کسی بھی شعبے میں اس کو پورا کرکے نہیں دکھایا۔ کم سے کم مسلمانوں کے معاملات اور اردو کے بارے میں تو یہ بات لفظ بہ لفظ زیادہ سچی ہو سکتی ہے باقی دوسری زبانوں کے سامنے ایک جگہ اور ایکبار نہیں بار بار سر جھکایا ہے، لیکن دوسری زبانیں پنجابی اور اردو جن کا زیادہ تعلق دو اقلیتوں یعنی سکھوں اور مسلمانوں سے تھا ان کے ساتھ انتہائی تنگدلانا برتاؤ کیا ہے۔ پنجابی کو پھر بھی کچھ نہ کچھ درجا حاصل ہو گیا ہے اور جس صوبے میں وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اسے مٹایا نہیں گیا، لیکن اردو کو تو ایک ایک جگہ سے مٹایا گیا ہے ہم پوچھتے ہیں کیا یہ اردو دشمنی نہیں ہے کہ جن صوبوں میں ایک اردو میں کاروبار ہونا چاہیے وہاں کے قانون اور نوٹسوں کے ذریعے اردو کو ختم کیا گیا اور ہندی کو جبراً ٹھونسا گیا جنہیں جھگھوں کے اردو کا چلن تھا اور آج بھی اردو والے مطالبا کر رہے ہیں۔ ان سب میں سوا آندھرا کے کہیں بھی اردو کو ثانوی زبان تک کا درجا حاصل نہ ہو سکا۔ حالانکہ پہلے وہ عمل سرکاری زبان کا درجا رکھتی تھی اور آندھرا میں بھی ابھی تک اردو والوں کی شکایات جاری ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی ہندستان کی واحد اردو یونیورسٹی تھی، مگر اسے بیک جنبش قلم اور شب بھر میں ہی وہ یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ ریاستی اسٹیٹس پر سے اسٹیٹس کی اردو داں لوگ [illegible]

دلی میں اردو کا خاتمہ

وہی ہوا جس کا ہمیں یقین تھا۔ وزارت داخلا چاہتی تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی

صاحبزادہ امتحسن فارو قی

اب وہ کام کرنے میں کیا رکاوٹ ہے جو وزارت داخلا کی خواہش کے مطابق ہے اور نا اگر ہوم منسٹری ایمانداری سے اردو کو ختم کرنا نہیں چاہتی اور اس کی دشمن نہیں ہے تو پھر ہمیں یہ بتانا ہے کہ اسے دلی گورنمنٹ لسانی کمیٹی کا فیصلہ کیوں منظور نہیں کیا۔ یہاں یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ دلی سے اردو کا کیا رشتہ ہے یہ تو کوئی بچا بھی بتا سکتا ہے اور نہ آج شہر کی تہذیب متحد اور جمہوریت کی رہائی دینے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی اس کی کوئی قیمت ہمارے حکمرانوں کی نظر میں ہوتی اگر وہ ایمانداری سے ایک سیکولر اور متحد اسماج بنانا چاہتے تو ایک نہیں ایک لاکھ پاکستان بھی بنا جاتے ان کے پاس ہندستان رہتا وہ اس میں ہر زبان مذہب اہل دیال کے لوگوں سے محل انصاف کرتے اور کسی کا حق نہ دیتے لیکن ان کی زبان پر تو یہ سب چیزیں نہایت ہی دلکش نعروں کی صورت میں موجود ہیں مگر عملی طور پر انہوں نے زندگی کے کسی بھی شعبے میں اس کو پورا کر کے نہیں دکھایا۔ کم سے کم اسلامیوں کے معاملات اور اردو کے بارے میں تو یہ بالکل فوٹو زیدہ ہی جا سکتی ہے باقی دوسری زبانوں کے ساتھ ایک جگہ اور ایک رہنمیں بار بار سر جھکایا ہے لیکن زبانیں پنجابی اور اردو جن کا زیادہ تعلق دو اقلیتوں سکھوں اور مسلمانوں سے تھا ان کے ساتھ انتہائی تنگدلانہ برتاؤ کیا ہے۔ پنجابی کو پھر بھی کچھ نہ کچھ درجا حاصل ہو گیا ہے اور جس صوبے میں وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اسے مٹایا نہیں گیا لیکن اردو کو تو ایک ایک جگہ سے مٹایا گیا ہے ہم پوچھتے ہیں کیا یہ اردو دشمنی نہیں ہے کہ جن صوبوں میں ایک اردو میں کاروبار ہوتا آیا ہے وہاں سے قانون اور نوٹسوں کے ذریعے اردو کو ختم کیا گیا اور ہندی کو جبراً ٹھونسا گیا جبکہ جمہور کے اردو کا میلان تھا اور آج بھی اردو والے مطالبا کر رہے ہیں۔ ان سب میں سوا آندھرا کے کہیں بھی اردو کو تانوی زبان تک کا درجا حاصل نہ ہو سکا۔ حالانکہ پہلے وہ عمل سرکاری زبان کی دو بار تھی اور آندھرا میں بھی ابھی تک اردو والوں کی شکایات جاری ہیں۔ عثمانیا یونیورسٹی ہندستان کی واحد اردو یونیورسٹی تھی مگر اسے ایک جنبش قلم اور شب بھر میں کی یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ رہا سوا اسٹیٹس کے اردو ناموں کو

لیجیے دلی میں انگریزی کا ہیں اردو کا خاتمہ کہا جائے گا کہ دلی کا ریورینشن نے جو لسانی کمیٹی اس مسئلے پر غور کرنے کیلیے مقرر کی تھی کہ انگریزی کی جگہ ہندی لے وہ صرف ہندی کے بارے میں سفارش کر سکتی ہے اردو کیلیے نہیں۔ اس مسئلے پر تقسیم آرا کا نتیجا ۳ کے مقابلے میں ۵ نکلا اور اس طرح جن سنگھی ممبران اردو کا راستہ مسدود کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہر چند دلی کے کانگریسی اور کمیونسٹ ممبران نے اردو کیلیے زبردست کوشش کی مگر جن سنگھی والے ایک ووٹ سے کامیاب ہو گئے لیکن ہم اس کا الزام ہندستان کی کانگریس گورنمنٹ اور کانگریس پارٹی کمان کو دیے بغیر نہیں رہ سکتے اسلیے کہ اردو کو جس طرح مٹایا جا رہا ہے وہ سب کا روائیاں کانگریسی عہد حکومت میں ہو رہی ہیں اور جہاں جہاں اردو کو دیس نکالا ملا ہے وہاں سب جگہ کانگریسی حکومتیں تھیں اگرچہ انہوں نے وہ کام کیا جو جن سنگھیوں اور ہندو مہاسبھائیوں کو کرنا چاہیے تھا۔ پنجاب میں تمام کاروبار اردو میں ہو رہا تھا اور آفیشل بھی بہت کچھ ہے۔ دلی اور یو پی میں اردو کا مثل پہلے ہو چکا تھا مگر دلی میں اب ہو گیا۔ اگر کانگریس پارٹی کمان سختی سے اردو کی تائید کرتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اردو کو یوں مٹایا جاتا۔ جس طرح یو پی اور پنجاب سے اردو کو ختم کیا گیا ہے۔ پنڈت پنت اپنے عہد حکومت میں یو پی سے اردو کا خاتمہ کر چکے تھے۔ جب دلی میں اردو کی قسمت کا فیصلا ہونے والا تھا تو وہیں جا آپہنچے اور چونکہ دلی اسٹیٹ ختم ہو گئی اور دلی ایڈمنسٹریشن مرکزی وزارت داخلا کے تحت آگیا اسلیے دلی سے بھی اردو کا خاتمہ ہو گیا۔ ہم پنڈت پنت جی کو وزارت داخلا کو ملامت نہیں الزام دیرہے اس کے لیے ہمارے پاس ثبوت ہے اور وہ یہ کہ دلی گورنمنٹ کی جو لسانی کمیٹی مقرر کی تھی اس کے اتفاق رائے سے اردو کو دلی کی تانوی زبان بنانے کے بارے میں فیصلا کیا تھا اور دلی اسٹیٹ ختم ہو جانے کے بعد اس فیصلے کو منظور کرنا وزارت داخلا کا کام تھا مگر وزارت داخلا نے اسے ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا اور جب کبھی پارلیمنٹ میں اس سے پوچھا گیا تو یہ جواب دیا گیا کہ ابھی کوئی فیصلا نہیں ہوا اور معاملا زیر غور ہے یہاں تک کہ دلی کا ریورینشن قایم ہو گئی اور کابینہ نے اس معاملے کو پھر سے اپنے اختیارات میں لے لیا۔



عبدالحق اکاڈیمی

(پاکستان)

مدیر محترم "ہندستانی ادب" حیدرآباد دکن (ہندستان)

سلام مسنون ۔ میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں گا اگر آپ ذیل کا اعلان اپنے موقر جریدے میں شائع فرمادیں ۔

مخلص ۔ شوکت سبزواری ۔ ۶ر جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

بابائے اردو کی تصویریں، تحریریں اور مکاتیب

عبدالحق اکاڈیمی کی طرف سے مئی سنہ ۱۹۶۰ء میں بابائے اردو کا نوّے سالہ یوم پیدائش بڑے اہتمام سے منایا جارہا ہے ۔ اس موقع پر دوسری بہت سی تقریبات کے ساتھ ایک علمی نمائش بھی منعقد کی جائے گی جس کا ایک شعبہ بابائے اردو کی ذات گرامی سے متعلق ہوگا ۔ اس میں بابائے اردو کی تصویریں اور تحریریں رکھی جائیں گی ۔ جن حضرات کے پاس مولوی صاحب قبلہ کی تصویریں اور تحریریں ہوں وہ ذیل کے پتہ پر بھجوادیں ۔ نمائش کے بعد یہ اشیاء پوری حفاظت کے ساتھ متعلقہ حضرات کو واپس کردی جائیں گی ۔

اس موقع پر مولوی صاحب کے مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع کیا جارہا ہے ۔ میں ان تمام حضرات سے جن کے پاس مولوی صاحب قبلہ کے خطوط ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ خطوط یا ان کی نقلیں مجھے ارسال فرمادیں اصل خطوط کی صورت میں نقلیں رکھ کر خطوط فوراً واپس کردیئے جائیں گے ۔

(ڈاکٹر) شوکت سبزواری

رکن عبدالحق اکاڈیمی ۔ اردو کالج، اردو روڈ، کراچی نمبر ۱ (پاکستان)

جی ۔ ام ۔ خان نے مطبع ابراھیمیہ کٹل منڈی حیدرآباد دکن میں چھپوایا ۔



ایڈیٹر - جی - ایم - خان، ایم - اے (عثمانیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

رجسٹرڈ نمبر — ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا — ایچ (۱۸۴)

محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

جلد (۲۰) — نمبر (۶)

ہندستانی ادب

چندا سالانا — آٹھ روپے

سنہ ۱۳۶۹ف — ایڈیٹر — سنہ ۱۹۶۰ء

اردی بہشت — جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیہ) — مارچ

نمبر	عنوان	نام	صفحہ	تکیے کے ساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۳	
۳	طوفان نو	ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۴	
۴	مرحلے	میر ہاشم	۵	شاعر
۵	دو آوازیں	نریش کمار شاد	۶	خیال
۶	دلہن بیٹی سے	افسر واصفی	۷	جد و جہد
۷	ساون	اشفاق حسین بیجو وارثی	۸	
۸	غزل	حیات وارثی لکھنوی	۸	
۹	عزم جواں	ام۔ نسیم بریلوی	۸	
۱۰	نانی — حریف مے مرگ	ڈاکٹر سیدہ جعفر	۹	صبا
۱۱	رام لعل اور اس کا فن	دریندر دوہرا	۱۴	خیال
۱۲	قمر جہاں	ڈاکٹر علیم ام۔ اے، پی ایچ۔ ڈی	۲۰	روشنی
۱۳	امریکا کا ایک عظیم شاعر۔ رابرٹ فراسٹ	یوسیس	۲۲	
۱۴	گل جان	ایرینا گورو	۲۴	سوویت عورت
۱۵	تیسرے پنچسالا پلان (منصوبے) میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ	دریکا پرساد ویسکمکھ چیرمن سنٹرل آئل ولیفیر بورڈ	۲۹	
۱۶	آج کے مدرس کا جواب	صاحب کوہیری	۳۱	
۱۷	ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ایڈیٹر	۳۲	

ہمارے خیالات

تیسرے پانچسالا منصوبے میں مدرسوں کی تعمیر کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے

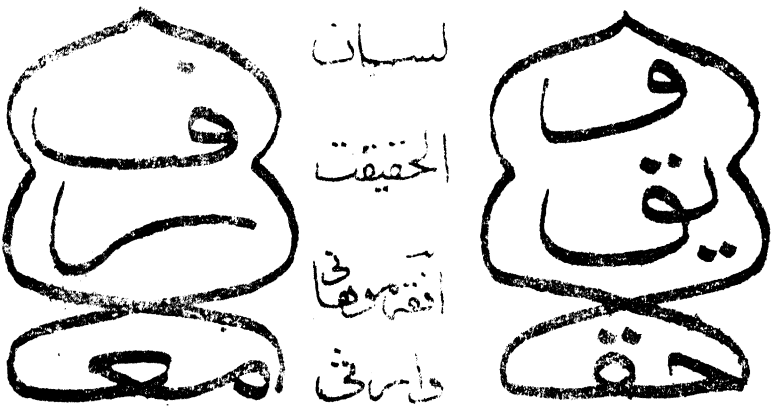
حال ہی میں ڈاکٹر شریمالی یونین ایجوکیشن منسٹر نے تیسرے پانچسالا منصوبے کے سلسلے میں وزارت تعلیم کی ضرورتوں کو ظاہر کرتے ہوئے پلاننگ کمیشن کے ہاں تو اب اسّی کروڑ کے مطالبات پیش کیے ہیں، اور یہ رقم دوسرے منصوبے کے ۳۴ گنا اور پہلے منصوبے سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ وزیر تعلیم نے یہ مطالبات پیش کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ ہمارے مطالبات "حقیقت پر مبنی" ہیں، اور اس تصویر کا دوسرا رخ انہوں نے یوں ظاہر کیا ہے کہ دوسرے طریقے پر جانچا جائے تو "حرص پر مبنی" معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کا کہنا ہے کہ یہ اعتراض اسلیے غلط ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ۶ تا ۱۱ سال کی عمر والے بچوں کیلئے "لازمی" تعلیم کی اسکیم بھی رکھی ہے۔

وزیر تعلیم نے خرچ کی بڑی مدات کی وضاحت یوں کی ہے: پرائمری ایجوکیشن ۵ ارب ۲ کروڑ ۴۶ لاکھ، سیکنڈری ایجوکیشن ۳ ارب ۴۷ کروڑ ۸۹ لاکھ، یونیورسٹی ایجوکیشن (تکنیکی امداد) ۱ ارب ۳۳ کروڑ ۶۹ لاکھ۔ وزارت تعلیم نے سوشل ایجوکیشن کے لیے ۳۵ کروڑ ۶۴ لاکھ کا مطالبا کیا ہے، اور معذور بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں ۳ کروڑ ۲۱ لاکھ کی رقم مانگی ہے۔ ۷۰ لاکھ اسکالرشپ کے لیے۔ ۶ کروڑ ۲۷ لاکھ ہندی اور سنسکرت کی ترویج کے سلسلے میں، اور ۱۹ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے کا مطالبا متفرق پروگراموں کے سلسلے میں کیا ہے۔

وزارت تعلیم نے اپنے مسودے میں اس بات کو خاص طور پر ظاہر کیا ہے کہ وہ تیسرے پانچسالا منصوبے کے ختم تک دیس کے ۲ کروڑ ان پڑھ بچوں کو تعلیم کے میدان میں لانا چاہتی ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ دیس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ کم سے کم "LITERATE" بنا دے۔ وزارت کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس "حریص" اسکیم کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں ۱۷ لاکھ ٹیچروں کو ٹریننگ کرنا ہوگا، جس پر تقریباً ۳ ارب روپے کا خرچ بیٹھے گا۔ اور وزارت تعلیم ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے کہ ڈر ہے کہ اتنی ساری رقم واقعی فراہم ہو سکے گی یا نہیں ــــ!

خواہ ہو یا نہ ہو، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم وزیر تعلیم سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ مدرسوں کی تعمیر کی مدّ انہوں نے رکھی ہے یا نہیں ــ اگر نہیں ــ تو کیوں؟ آیا یہ مد تعلیمی سلسلے کی ایک اہم کڑی نہیں۔ کیا ہمارے لائق وزیر تعلیم اس حقیقت سے واقف نہیں کہ بچے مدرسوں کی عمارتوں میں نہیں، بلکہ ہوتلوں کے رہنے کے مکانات اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ پہلے ہی پانچسالا منصوبے سے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور دوسرے، تیسرے منصوبے میں بھی اس کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اگر دونوں منصوبوں میں اس مد کیلئے کافی بھاری رقم الاٹ کی جاتی تو اب تک ہزاروں چھوٹی بڑی عمارتیں حکومت کی ملک ہو جاتیں اور لاکھوں ہی طالب علم پرسکون ماحول میں تعلیم حاصل کرتے۔

ہم وزیر تعلیم کو یقین دلاتے ہیں کہ بعض مدرسوں کی عمارتیں قبرستانوں اور مسانوں کا سا بھیانک منظر پیش کرتی ہیں، اور ان میں ہماری نئی پود تعلیم جیسی متبرک شے بہرا اور ہوتی ہے۔ اس قسم کی نامناسب اور ناموزوں عمارتوں پر سارے دیس میں سالانا کروڑوں ہی روپے کرائے کے سلسلے میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اگر وزارت تعلیم پرائمری اور سکنڈری مدرسوں کی تعمیر کی طرف توجہ دے تو چند ایک سال میں ایک خاص بھاری نمونے کی چند ایک ہزار عمارتیں ضرور کھڑی ہو جائیں گی اور آئندہ منصوبوں کی حد تک بھی یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ ہمیں آشا ہے کہ ڈاکٹر شریمالی وزیر تعلیم ہمارے ان اہم وچاروں پر ضرور دھیان دیں گے! اس لیے کہ پہلے پانچسالا منصوبے سے مدرسوں کی تعمیر کو بالکل ہی نظر انداز کر



مل جاتا ہے جب کوئی حسیں راہ گذر میں
وہ سامنے آجاتے ہیں ہر بار نظر میں

خورشید قیامت کے ہیں آثار نظر میں
ہے جلوہ فگن حسن رخ یار نظر میں

پنہاں ہے جو وہ ابروئے خمدار نظر میں
اک نیم کشیدہ سی ہے تلوار نظر میں

مٹنا تیرا پھر کیوں نہ ہو دشوار نظر میں
کوشش ہے مری کوشش بے کار نظر میں

دیکھے ہیں ستم ایسے زمیں والوں کے ہم نے
آتا ہی نہیں چرخ ستم گار نظر میں

جب سے نہ رہا اپنا گلستاں میں نشیمن
ہر پھول گلستاں کا ہے اب خار نظر میں

افسانۂ منصور کو گذرا ہے زمانہ
پھرتے ہیں ابھی تک رسن و دار نظر میں

اللہ رکھے حسن پرستی کا یہ عالم
دو چار حسیں دل میں ہیں دو چار نظر میں

تکمیل جنوں ہے یہی اے پنجۂ وحشت
باقی نہیں دامن کا کوئی تار نظر میں

محشر میں نہ جس پر تری رحمت کی نظر ہو
ایسا تو نہیں کوئی گنہ گار نظر میں

جس طرح نیا رنگ بدلتا ہے زمانہ
آتا ہے یوں ہی جلوۂ دلدار نظر میں

اٹھ جائیں گے جتنے ہیں حجابات محبت
آتے جو رہے تم یوں ہی تا بار نظر میں

اب نہ حضرت موسیٰ ہیں نہ وہ برق تجلا
افقر ہے مگر جلوہ گہہ یار نظر میں

طوفان نو

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی

بہر خدمت ہر گھڑی حاضر رہا کرتے ہیں ہم
اور پھر ہم پر ستم کہنا ستم اتنا ستم

بس یہی ساعت ہے ساعت کج ادائی دم بدم
پھنس گئے دل دے کے اس ظالم کو کس وقت میں ہم

جو عدو ہے طالب و مطلوب دونوں کو بہم
ہو گئے نا واقف وہ راز غم سے واقف ہو گئے

رو رہا ہوں دیکھ کر حال نفاق و اتفاق
ہے فقط دونوں کے دم سے ابتدا حسن و عشق

ایک صورت پر ہمیشہ آپ کیوں قائم رہیں
یہ سمجھ کر میں انہیں بھولے سے خط لکھتا نہیں

وقت پر جو کچھ بھی ہوگا غیر دیکھا جائے گا
صرف کہنے کو یہ دو ہیں ورنہ دونوں ایک ہیں

ہے ضروری عشق میں اچھے برے دل کا لحاظ
بت پرستی ہے تعلق حق پرستی سے گریز

یہ جہاں سے آئے دنیا میں وہیں پھر جائیں گے
دیکھئے دل کس طرف لے جائے ہم کو کھینچ کر

ہو جیسی چیز ویسا اس کا بدلا چاہیے
کیوں نہ دل لے کر ہمارا دل میں پیدا ہو غرور

لغزش ضعف نے اتنا نکمہ کر دیا
کہئے کہئے آپ کا ارشاد تھا یہ بار بار

مبتدا پھر بار آئے آپ کی الفت سے ہم
روز شب شام و سحر آٹھوں پہر آزار و غم

وہ محبت بس محبت ہے محبت کی قسم
کہہ دیا آہ و فغاں نے ضبط الفت کا بھرم

اس زمانے میں جو چاہا وہ زیادہ یہ ہے کم
تیسرا کوئی نہیں بس ایک تم ہو ایک ہم

لطف تو جب ہے کہ ہو اکثر ستم اکثر کرم
پھیر دیں گے حرف مطلب پر قلم وہ یک قلم

کیوں کہ جس دنیا میں تو ہے ہیں اسی دنیا میں ہم
مرے دل سے کوئی پوچھے وقعت زیر و حرم

چاہئے لینی چاہیے تم کو کمی کھوٹی رقم
یا محمد کہنے کے بدلے کہہ رہا ہوں یا صنم

ہے بشر کے واسطے اول عدم آخر عدم
ایک جانب تکیہ ہے دوسری جانب حرم

کیا تماشہ ہے وہ دم لے کے مجھے دیتے ہیں دم
بے تردد ہی ترے ہاتھ آ گئی ایسی رقم

دو قدم چلنا ہے مرے واسطے دو سو قدم
سنیئے سنیئے داستان عشق اب کہتے ہیں ہم

آ گیا طوفان نو کشتی کر اپنی درست
نوح دیتا ہوں جناب نوح کی تم کو قسم

مرحلے

میر ہاشم

یہ سمجھا تھا چلو دل ہی بہل جائے گا
غمہ و رقص بھی فکر و ں کا مداوا نہ بنے
بادہ و جام سے بھی کوئی تسلی نہ ہوئی
یہ مشاغل بھی غم دل کا سہارا نہ بنے

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں میں نے چاہا
کہ زمانے کی کڑی دھوپ کی پروا نہ کروں
بھول جاؤں غم امروز بہ یک جلوۂ رخ
مرمریں باہوں میں فردا کا تقاضا نہ کروں

تیری زلفوں کے خم و پیچ سلجھتے ہی رہے
مسئلے زیست کے کچھ اور الجھتے ہی رہے

نکتہ کاوش سے مسائل کبھی کوئی حل نہ ملا
ہر طرف تھا جو اندھیرا وہ اندھیرا ہی رہا
اور پھر میں نے "دعاؤں" کا سہارا ڈھونڈا

یہ سمجھ کر علاج غم دوراں ہے یہی
یوں تھا مخمور مئے ناب ملی ہو جیسے
دل تھا مسرور کہ ہر درد کا درماں ہے یہی

کتنی خوابیدہ تمناؤں نے انگڑائی لی
کتنے بے نام سے ارمان دل بیتاب میں تھے
شیش محلوں کے شبستانوں کے مہ پاروں کے خواب
ان گنت خواب مرے دیدۂ بیخواب میں تھے

آرزو ٹوٹ گئے خواب و تخیل کے طلسم
حاصل خواب اندھیرے کے سوا کیا ہوتا
سینۂ آب پہ کیا نقش اجنتا ہوتا

"معجزہ" کوئی خداوند کو منظور نہ تھا
وہ جو چاہے تو اٹھے سینہ صحرا سے سحاب"
اس کے احکام سے مہر تابی کا بدلنا ہے یہی
گو یہ ناراض ہے وہ خالق تقدیر و کتاب

اس کے ہی قبضۂ قدرت میں نظام دوراں
اس نے پیدا کیا تھا جوں کو زرداروں کو
مصلحت اس کی جسے چاہا نوازا اس نے
مہ وری بخش دی کچھ اور سیہ کاروں کو

ان خیالوں سے بھی تسکین دل و جاں نہ ہوئی
طبع افسردہ نہ بیتوں سے غزلخواں نہ ہوئی

آج اوہام کی زنجیر ہے پارا پارا
حلقۂ دام مشیت سے نکل آیا ہوں
آدمی صورت حالات بدل سکتا ہے
آسمانوں کی اطاعت سے نکل آیا ہوں

اب مرے ہاتھ میں شمشیر ہے زنجیر نہیں
وہم و امید بنے عزائم کے عناں گیر نہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ میں دیکھ نہ پاؤں وہ سحر
وہ سحر جس کے لئے قلب تپاں رکھتا ہوں
وہ سحر جس کے لیے عزم جواں رکھتا ہوں
وہ سحر جس کے لیے سوز نہاں رکھتا ہوں

میرے ہاتھوں میں کبھی جام و سبو ہو کہ نہ ہو
چاک داماں و گریباں یہ رفو ہو کہ نہ ہو
لیکن یہ ہے کہ کوئی تشنۂ مہپانہ رہے
غم امروز و غم شورش فردا نہ رہے

ان گنت ہاتھ اٹھے ہیں پئے تعمیر حیات
آج تلوار کی جھنکار ہے للکاروں میں
چشم نرگس ہوں کہ خاموش تماشائی نیوں
میری تلوار بھی شامل رہے تلواروں میں

زندگی میں ابھی کچھ رنج و محن اور بھی ہیں
راہ میں مرحلۂ دار و رسن اور بھی ہیں
ایک دن صورت حالات بدل جائے گی

آدمی صورت حالات بدل سکتا ہے

دو آوازیں

پہلی آواز

مانتا ہوں دل نشیں اشعار کہہ سکتا ہے تو
تیری فکر عنبریں ہے اک بہار رنگ و بو
تیرے کیف انگیز نغموں سے فضا مسحور ہے
اور دنیائے ادب میں تو بہت مشہور ہے
دل نشیں اشعار لیکن پیٹ بھر سکتے نہیں
بے نیاز تلخیٔ حالات کر سکتے نہیں
زندہ رہنے کے لیے نان و نمک درکار ہے
زندگی نغمہ نہیں تا بیٹھ کے اک جھنکار ہے
اس لیے اس شاعرانہ بانکپن کو چھوڑ دے
زندگی میں مصلحت سے کام لینا سیکھ لے
افسروں کی چاپلوسی کو بنا اپنا شعار
چاپلوسی پر ہے دنیاوی ترقی کا مدار
دفن کر دے فائلوں میں نازک احساس کو
اور پہلے باندھ لے آئے خبر اس بات کو
شاعری ہے ایک تند خو سی نازنیں
جو رقیب اپنا کبھی برداشت کر سکتی نہیں
شعر کہنے کے مرض میں ہو گیا جو مبتلا
شعر کہنے کے سوا ہر کام سے جی جاتا رہا
شاعری دیوانگی ہے چھوڑ یہ دیوانہ پن
تجھ کو رہنا ہے اگر دنیا میں دنیادار بن
شاعری تیرے وطن میں مشغلِ آزار ہے
یہ کوی کی فکر کر فکرِ سخن بے کار ہے
بھول جا اے شادؔ اپنی شاعری کو بھول جا
"کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا"

دوسری آواز

مانتا ہوں ظلمتِ ماحول میں ہے تو اسیر
کم نظر ہیں پھر بھی جو تجھ کو سمجھتے ہیں حقیر
تیرگی میں تیری فکر و نظر دیتی ہے لو
تیرے احساسات میں ہے نوبہ نو بھیوں کی نمود
جہر بہتی کر نہیں سکتا تری ہمت کو پست
تیری خودداری کو دنیا دے نہیں سکتی شکست
تیری فطرت میں ہے شامل رنج و غم سے کھیلنا
سیکھ اگر زندگی کی سختیوں کو جھیلنا
تپ کے آفاتِ جہاں کی دھوپ میں اے آجان من
اور بھی نکھرے گا تیری شاعری کا بانکپن
مصلحت کے در پہ جھک سکتی نہیں تیری جبیں
تو زمانہ ساز بن جائے یہ ممکن ہی نہیں
تیرا احساس تپاں بے سوز ہو سکتا نہیں
جاگ کر تیرا شعور شعر سو سکتا نہیں
تیری شہریانوں میں ہے ہر اِن آدم کا لہو
جب کوئی بھی زخم کھائے گا تڑپ اٹھے گا تو
ٹھیک ہے یہ دور سیم و زر کا اک بازار ہے
اور اس بازار میں جنس سخن بے کار ہے
زندگی اس دور کی لیکن ہے بالکل مختصر
چند دن تک اور ہے ناقدریٔ اہل ہنر
یہ معاشی الجھنیں دو چار دن کی بات ہیں
کل تو ہو سکتے نہیں ہیں آج جو حالات ہیں
فکر کیا اس دور کے جاں کاہ ظلم و جور کی
شادؔ تو ہے اک امانت آنے والے دور کی

دلہن بیٹی سے

اختر واصفی

ذرا سن غور سے بیٹی مجھے کچھ تجھ سے کہنا ہے
یہ وہ گہنا ہے جہاں جس کے اندر راز عصمت ہے
اسی گہنے سے ہوگی تیری عزت ساری دنیا میں
بتاتا ہوں تجھے جو مرحلے ہیں زندگانی کے
بہن بیٹی تو ماں بیوی ہو مادر یہ ہیں سب نام عورت کے
عدو ہیں یہ جو عورت ان کو توڑے خوار ہوتی ہے
بہن بیٹی کہو تو نے خوب بن کر دکھایا ہے
لڑکپن میں نہیں کھلتا کھری ہے یا کہ کھوٹی ہے
کہیں گمراہ نہ ہو ناسن کے باتیں پند مہینوں کی
یہ نکتہ قیمتی اک بات سے پہلے دل نشیں کر لے
سنبھل جا اب ذرا تجھ کو بتا گر اک بہانا ہے
کشش ایسی کر اپنی ادا ہر بات میں پیدا
نہ ہرگز بھولنا اس کو یہ فرمان بھید ہے
کہ ہر سانس تیری زندگی کا اس کی خدمت ہیں
ستم بھی اس کے سہہ کر یہ سمجھنا ہے کرم اس کا
وہ دن بھر کام کر کے شام کو جب اپنے گھر آئے
تو سے ہر کام میں شامل رہے اس کی رضا تیری
امور خانہ داری ہوں کہ اخراجات ہوں گھر کے
ہمیشہ کام لینا علم و عجز و انکساری سے
وہاں برتاؤ کو اپنا سب سے یوں بالزم گھتا ری
غرور و غصہ و بغض و عداوت نفرت و کینہ
طبیعت میں حجاب اور آنکھ میں شرم و حیا رکھنا
ترا شغل پسندیدہ نماز پنجگانہ ہو
تلاوت اور ساکیں اقربا اولاد اور بھائی
مگر مشکل ہے اب بیٹی تجھ کو کس کس کا بتاؤں کیا
بھلا نا سب زنانیں ہوں رخ بدخواہ کا لا ہو
مری لخت جگر ہیں اور نکالوں خود بھے گھر سے
مرے بس میں نہیں ہے گھر میں تجھ کو آج رکھ لینا
ملیں اکرام حق سے جا تجھے انعام دنیا کے
پھلو پھولو جہاں میں شاد ہو آباد ہو بیٹی
یہ دنیا بیچ ہے بیچ اس کا سارا ساز و سامان ہے
یہ دولت مال و زر رتبے سب نہیں رہ جائیں گے آخر
بنانا اس کو حرز جاں یہ اک انمول گہنا ہے
یہی ہے حسن عورت کا اسی سے اس کی زینت ہے
یہی گہنا تیری پیشش کا باعث ہوگا عمر بھر
کیے ہیں چار حصے حق نے بچپن اور جوانی کے
یہی عورت کی دنیا ہے یہی ہیں کام عورت کے
وہ عورت ننگ و ناموس وطن پر بار ہوتی ہے
زن و مادر بھی اب بن کر دکھانے وقت آیا ہے
یہ شادی اصل میں عورت کے جوہر کی کسوٹی ہے
ترے ہاتھوں میں ہے اب دیکھ عزت سب عزیزوں کی
ملا تجھ کو وہی جو تھا مقدر میں یقیں کر لے
جدا اپنوں سے ہو کر اجنبی لوگوں میں جانا ہے
کہ ہو جائیں دل و جاں سے ترے وہ بھی شیدا
کوئی غمخوار خدا سمجھے کے قابل ہو تو ہو تیرے
جئے تو اس کی خدمت میں مرے تو اس کی خدمت میں
بچانا اپنی آنکھیں واں جہاں آئے قدم اس کا
تجھے ہنستی ہوئی اور گھر کو اک جنت کدہ پائے
بس اتنی بات ہے جو سچ مچ جس سے ہوتا ہے فدا بیٹی
کوئی بھی کام ہو کرنا نہیں نیک و بد کر کے
ادا کرنا فرائض سب بڑی ایسا ذمہ داری ہے
نہ ہو تجھ سے کبھی سسرال والوں کی دل آزاری
ہے ہرگز نہ مشکل ان برائیوں کا تار سینہ
پیمبر کی محبت دل میں اور خوف خدا رکھنا
نماز ایسی کہ جیتے جی کبھی اک بھی قضا نا ہو
خدا نے ان کے حق بھی تجھ پہ کچھ فرض فرمائے
مجھے معلوم ہیں سب دقت تھوڑا ہے بتاؤں کیا
جہاں میں پھر جناب فاطمہ کا بول بالا ہو
ہے ناممکن مگر تجھ پر رہیں حکم پیمبر سے
سمجھتی ہوں فقیر گھر میں لاج رکھ لینا
سنوارے حق تعالیٰ تیرے سارے کام دنیا کے
تری مونس تری ہمدم خدا کی یاد ہو بیٹی
اسے سب کچھ سمجھ لینا فریب عقل انساں ہے
عمل ہوں گے جو اچھے بس وہی کام آئیں گے آخر
کرے گی قدر دل سے تو اگر اختر کی باتوں کی
جہاں میں چرخ شہرت پر شاں مہر چمکے گی

سے یہاں "دنیا" کے تلفظ کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ساون

اشفاق حسین بیخود وارثی

اے میرے دیدۂ پرنم کے سہارے ساون
میرے رنگین اداجان سے پیارے ساون

سبزہ آغاز ترے حسن فسوں گر کی قسم
تیری رعنائی کا لہراتا ہے ہر سو پرچم

تیرے ہمراہ جو ہے مست گھٹاؤں کا ہجوم
ہو رہی ہے دل پرشوق میں جذبات کی دھوم

فیض سے تیرے گہربار ہے ابر نیساں
در مقصد سے ہے پر دشت و جبل کا داماں

سبزہ و گل تری رحمت سے ہوئے ہیں شاداب
دلربائی کا ہر ایک شئے پہ برستا ہے شباب

بلبلیں گاتی ہیں رقصاں ہیں چمن میں طاؤس
جلوہ افروز گلستاں میں ہے فطرت کی عروس

نازک اندام حسینوں نے ہیں جھولے ڈالے
رخ گلفام پہ لہراتے ہیں گیسو کالے

خوشنما آموں کے گوشے ہیں لٹکتے ہر سو
گرقی پھرتی ہے ہر اک شاخ پہ کوئل کو کو

مست و سرشار و غزلخواں ہیں جوانان چمن
آج ہر شئے سے نمایاں ہے بہار ساون

کاش ایسے میں کوئی آ کے گلے مل جائے
کاش میرے دل غمگیں کا کنول کھل جائے

غزل

جرأت رانچوی

کہاں تک ہے نہ جلووں کا تعین لامکاں تک ہے
وہیں تک بس وہ دیکھے گا نظر جس کی جہاں تک ہے

قفس سے آشیاں تک آشیاں سے گلستاں تک ہے
تباہی کا مری ہمدم خدا جانے کہاں تک ہے

نظر آئیں گے پھولوں کی جگہ کانٹے گلستاں میں
بہار گلستاں جو کچھ ہے میرے آشیاں تک ہے

بڑی دریا دلی کی داستانیں سن کے آیا ہوں
مجھے بھی دیکھنا ہے آج ساقی کو کہاں تک ہے

اٹھے گی پھر نہ کوئی موج غم آغوش ساحل سے
یہ طوفان حوادث کشتیٔ عمر رواں تک ہے

محبت میں کبھی لب پر نہ حرف آرزو آئے
مزہ اس داستاں کا بس زبان بے زباں تک ہے

پھر اس کے بعد اے ذوق نظر جلوے ہی جلوے ہیں
حجاب حسن جو کچھ بھی ہے قید جسم و جاں تک ہے

نئے میخانہ کی فطرت نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا
وہ زاہد جس کی دنیا صرف گلزار جہاں تک ہے

سنے گا کون پھر آکر حیاتؔ افسانۂ الفت
یہ ساری گرمیٔ محفل ہماری داستاں تک ہے

غزل

ام نسیم بریلوی

جہاں حاصل سکون دل نہیں ہے
وہ کچھ بھی ہو مگر منزل نہیں ہے

گھٹائیں شام غم کی چھا گئیں ہیں
درخشاں صبح مستقبل نہیں ہے

میں بندہ ہو کے بھی ہوں بجھ سے غافل
خدا ہو کر بھی تو غافل نہیں ہے

کریں اس دل کو کیا پہلو میں رکھ کر
جو دل اب درد کا حامل نہیں ہے

وہی دل حاصل کون و مکاں ہے
جو تیری یاد سے غافل نہیں ہے

بعزم نوجواں اے جذبۂ دل
کوئی مشکل کبھی مشکل نہیں ہے

پلائی ہے جسے آنکھوں سے تم نے
وہ میکش ہوش کے قابل نہیں ہے

محافظ ہے ہماری موج طوفاں
ہمیں کچھ حسرت ساحل نہیں ہے

نسیمؔ اور مرتبہ ان کا نہ جانے
وہ دیوانہ سہی غافل نہیں ہے

فانی ــــ حریفِ مئے مرگ

ڈاکٹر سیدہ جعفر

غم پرستی اور حزن دوستی ہندستانی شاعری کے لیے کوئی نئی اور چونکا دینے والی چیز نہیں لیکن فانی کے یہاں جو بھرپور اثر انگیزی ان کا جو مخصوص لب و لہجہ اور انفرادیت ہے ہندستانی غزل میں "حرفِ مکرر" نہیں۔ الم پرستی کوئی صحت مند رجحان نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فانی نے غم اور قنوطیت کو ایک نیا مزاج بخشا۔ انہوں نے "حیاتِ عشق" اور "زندگیِ غم" کو نئے آداب سکھائے اور جذباتِ الم کو ایک نئی زبان اور اظہار کا اچھوتا انداز عطا کیا۔ فانی کی شاعری طبیعت انگیز حد تک ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ وہ بدایوں کے ایک متمول خاندان کے ایک فرد تھے مگر قسمت کی ناہمواری نے اس متمولی میں جا بجا کانٹے ڈال دیے اور وقت بھی آیا جب کہ وہ دنیوی سے گھبرا کر انہوں نے اپنی ذات کو تمام تر حالات کے حوالے کر دیا۔ وکالت اور اسکول کی ہیڈ ماسٹری بھی انہیں زیادہ مطمئن نہ کر سکی۔ اصل میں فکرِ دنیا میں سر کھپانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ فانی اپنی زندگی کو تابناک نہ بنا سکے مگر اپنے اشعار کو تابناک بنا دیا۔ زندگی کو برتنے کا جو سلیقہ ہمیں مومن، داغ اور ریاض کے پاس نظر آتا ہے وہ فانی کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ انہوں نے زمانے کو اپنے موافق بنایا نہ اپنے آپ کو زمانے کے موافق بنا سکے۔ "اگر زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز" والا معمولا فانی کی زندگی میں کہیں چسپاں نہیں ہوتا۔ وہ حیات کو کامیاب بنانے کے آخر وقت تک آرزومند رہے فانی نے اپنے اس ہمعصروں کو پروان چڑھتے اور کامرانی اور ظفرمندی کے نشے میں مست ہوتے دیکھا تھا جو ان سے کم علمی اور کم استطاعتوں کے مالک تھے اور ان مرحلوں کو بھی دیکھا تھا جو اپنی فن سے ہمدردی رکھتے ہوئے بھی ان کے درد کو نہ پہچان سکے تھے۔ غالب کے الفاظ میں وہ "مردم گزیدہ آدمی تھے۔ فانی کی شہرت بہت کم ہوئی اور قدر کم۔ اپنے اشعار میں انہوں نے اس بے قدری کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس سلسلے میں "نظام الاوقات" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

کون ہے میرے سوا فیضِ چمن سے محروم
گل بداماں ہے کوئی خار بداماں کوئی

فانی کی ساری شاعری پر ایک پرسوز اور رقت انگیز کیفیت چھائی ہوئی ملتی ہے۔ زخم خوردگی کا ایک بے پناہ احساس ملتا ہے اور یہی احساس جرأت فانی کے غزل کا سب سے زیادہ اجاگر رنگ ہے۔ فانی کے دل نے کہیں چوٹ ضرور کھائی تھی، لیکن انہوں نے سینے کے اس گھاؤ کو چھپایا نہ تھا، وہ آہوں پر مسکراہٹوں کے نقاب ڈال کر اپنی شخصیت کی معکوس زرجانی کے قائل نہ تھے۔ فانی کی شاعری اور ان کی ذات کے درمیان بہت کم پردے حایل ہیں ؎ ہم سے فانی نہ چھپ سکا غم دوست
آرزو بے نقاب ہو کے رہی

انہوں نے غم زندگی کی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی، غم ان کی شاعری میں ایک ناگزیر حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ فانی کی شاعری میں زندگی سے فرار کی سعی جو تو ہو، مگر غم سے فرار کی تمنا نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم ان کے وجود میں سما کر جزوِ حیات بن چکا تھا۔ خود ایک غزل میں وہ لکھتے ہیں ؎

دل سراپا درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

یہی درد ایک خاص حد تک خارجی دنیا کا بھی پروردہ تھا جو بھی حالات کی تلخی اور گرانباری سے میل کھا کے شخصیت کی بھٹی میں تپ کر داخلی دنیا کا درد بن گیا تھا۔ غم دوراں جانی، چکبست اور اقبال کی شاعری میں "روئے تاباں" سے پہچانا جاتا ہے، اور یہی چیز فانی کے یہاں "انداز قد" سے پہچانی جاتی ہے۔

فانیؔ کا ادبی شعور اس وقت بیدار ہوا تھا جب انیسویں صدی ختم ہو چکی تھی اور بیسویں صدی طلوع ہو رہی تھی۔ نئی نئی سائنٹفک ایجادات اور نئے نئے آثار سامنے ہونے لگے تھے۔ تہذیب و معاشرت کی قدریں راہیں بدل بدل کر نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد سے باشعور افراد کو نئے مسایل دعوت فکر دے رہے تھے۔ خاص طور پر یورپ اور ہندستان میں بھی نئے الجھنیں، نئے مسئلے اضطرابیاں اور نئی تشکیک ابھر رہی تھی۔ مروجہ سماجی نظام اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ اس تشکیک اور بے چینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر فنکار مادی حالات کو اپنی تمناؤں اور توقعات سے ہم آہنگ نہ پا کر شمالی دنیا کے تجربوں اور مستقبل کی فکر میں لگ گئے اور کچھ ان سماجی حالات سے منفی انداز میں متاثر ہوئے اور اندوہ پسندی اور المیہ پسندی ان کے فن میں سرایت کر گئی۔ اسی فضا میں فانیؔ کے تخیل کا خمیر تیار ہوا تھا۔ اسی لیے خلش، آشفتگی، پیکار اور احساس ہزیمت ان کی شاعری کے اہم عناصر بن گئے۔ احساس ہزیمت اس لیے کہ فانیؔ بیرونی تناقضات سے مصالحت نہ کر سکے تھے۔ خارجی دنیا سے مفاہمت کا ڈھب نہ پا کر ان کی شکست کھائی ہوئی انفرادیت نے اس جہان آب و گل سے فرار کی راہیں تراشنی شروع کیں۔ ان کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

دل ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہان سے دور
اس آپ کی زمین سے الگ آسمان سے دور

"دونوں جہان سے دور" رہنے کی یہ خواہش پسپائی کی عمازی کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ سماج کے مروجہ آئین مرتوازن اور فرد کی تمناؤں کا درمیانی توازن بگڑ گیا ہے۔ فانیؔ کے کلام پر ان کے انفعالی اثرات کا بھی پرتو دکھائی دیتا ہے۔ حالیؔ جیسے باشعور شاعر نے بھی گرد و پیش کے انتشار اور بے چینی سے اپنی ذات کو منصادم دیکھ کر کہا تھا ؎

حملہ اپنے پر بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے جی ہی اک فتح و ظفر کی صورت

فانیؔ اس سماج سے روٹھے تھے جس کے کڑے اصول "محبت کی لطافت" پر "بار" بن گئے تھے۔ اس محبوب سے روٹھے تھے جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا اور اس خدا سے روٹھے تھے، جس کی مشیت اٹل اور ناگزیر تھی ؎

او از جہان گذشت کہ آخر خدا نبود
او این چنین بزیست کہ گوئی کہ خدا نداشت

اور روٹھنے کی اس معصوم ادا پر خدا کو پیار آ گیا ہوگا۔

فانیؔ شاعر تھے اور ایک دردمند دل رکھتے تھے، ناگوار تجربات نے انہیں رنج و درد اور احساس بنا دیا تھا۔ اسی لیے زندگی کی معمولی ناسازیوں اور محرومیوں کو بھی انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا ــــــ زندگی کی تاریکیوں سے لڑتے لڑتے وہ تھک گئے تھے۔ اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ خدا کی اس محفوظ دنیا میں انسانوں کے ہجوم اور ہنگاموں کے درمیان انسان اکیلا ہے، جہاں نہ فرصت گناہ ہے نہ تلافی کردہ گناہوں کی حسرت کی داد ملتی ہے۔ ان ہی احساسات نے انہیں غم پسند اور مرگ پرست بنا دیا اور دردمندی اور المناکی گویا ان کا مسلک اور عقیدا بن گئی ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

وحشت دل سے پھرتا ہے اپنے خدا سے پھر جا
دیوانے یہ ہوش نہیں ہے یہ تو ہوش پرستی ہے

فانیؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا تصور یہ تھا کہ اس زندگی میں مسرت اور سکون کی تلاش عبث ہے۔ اور جو کام زندگی سے سرانجام نہیں ہو سکتا وہ موت کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔ ان ہی جذبات نے فانیؔ کو زندگی سے برگشتہ کر دیا تھا اور یہی احساسات ان کی شاعری میں خواہش مرگ DEATH WILL کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موت آلام حیات کا حل، بیقراروں کا قرار اور شب غم کی سحر معلوم ہوتی ہے۔ فانیؔ نے زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر موت کے دامن میں پناہ لی تھی اور انہوں نے اسے ایک UTOPIA بنا لیا تھا۔ موت ان کے لیے زندگی سے زیادہ پرکشش اور پیاری تھی، وہ اسے حاصل زیست سمجھتے ہیں۔ زندگی کے پاس ان کے دکھوں کی دوا نہ تھی، مگر موت کے پاس

ان کے زخموں کا مرہم ضرور تھا' اس لیے وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہیں جس سکون کی تلاش تھی وہ موت کے نقطے میں تھا۔ زندگی کے قابو میں نہیں۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے فانی کے لیے موت کے تصور کو حسین بنا دیا تھا۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ محبوب کی تمنا بھی موت کے تصور میں مدغم ہو کر رہ گئی ہے ؎

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

فانی کے یہاں موت کے لیے جتنی حسین تشبیہیں اور جیتے بیٹھے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ کسی اور شاعر کے پاس نہیں ملتے۔ انہوں نے اے اجل! اے جان فانی کہہ کر یاد کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

موت وہ فن بھی دکھا دے مجھے جس پر فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

موت کی نیند آ گئی بیمار کو
غیب سے سامان شفا ہو گیا

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دنیا ہو
خدا رکھے ہی رونق ہے اس اجڑے ہوئے گھر کی

لذت فنا ہر گز گھٹتی نہیں یعنی
دل ہٹ گیا فانی موت کی دعا کر کے

آج روز وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز دنیا

شب فرقت کٹی یا عمر فانی
اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

ناموافق حالات اور زندگی کی محرومیوں نے انہیں تقدیر پرست اور نظریۂ جبر کا قایل بنا دیا تھا۔ فانی کی دانست میں انسانی مجبوری بھی قدرت کا ایک غمزا ہے ؎

فانی تیرے عمل بہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

وہ دوسرے شعرا کی طرح فانی کے یہاں یہ مجبوری کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ شے نہیں ہے۔ قدیم شعرا میں سے بہت سوں نے جبر کے مضامین باندھے ہیں' لیکن اکثر جگہ یہ مضامین' رسمی سطحی اور زیبائشی قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔ میر' درد اور غالب کے یہاں البتہ ایک واضح اور متعین تصور کا پتا چلتا ہے۔ ذوق نے انسان کی حیات اور موت کے متعلق کہا تھا ؎

"اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے"

فانی اسی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

دنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

غالب نے جس "شوخیٔ تحریر" کی دھیمے لہجے میں شکایت کی تھی' فانی اسی کو "شرط رضائے دوست" سمجھ کر سر تسلیم خم کر لیتے ہیں اور اپنی ہستی کو اس مجبوری کی نظر کر دیتے ہیں۔ دوسرے شعرا کے یہاں جبر سے متعلق جو مضامین ملتے ہیں وہ فانی کے اشعار سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اور شعرا کے برخلاف فانی کے پاس شکایت اور اخراں کا رجحان نہیں' بلکہ ایک طرح کی سپردگی اور رضامندی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جسم آزادی میں ہو کی تو نے مجبوری کی روح
تو نے جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

اختیار ایک ادا تھی مری مجبوری کی
لطف سعیٔ عمل اس مطلب حاصل سے اٹھا

اسیر بند دل ہو کر غم دنیا سے فارغ ہوں
مری آزادیوں کا نام ہے مجبور ہو جانا

فانی ہندستانی کے ان چند غزل گو شعرا میں سے ہیں جن کے اشعار کی تہہ میں ان کا ایک مخصوص زاویۂ حیات ملتا ہے۔ فانی کسی مخصوص نظریۂ زندگی کے حامل نہ تھے' انہوں نے کوئی

فلسفا بھی پیش نہیں کیا، پھر بھی ان کی غزلوں میں ایک مستقل فکری ابلاغ نظر آتا ہے۔ سوچ بوجھ کی ایک مسلسل سی ملتی ہے، فکر کا ایک متعین رستا دکھائی دیتا ہے اور زندگی اور موت کا بھید جاننے کی ایک تڑپ اور تلاش ملتی ہے۔ فانی نے زندگی کے راز کو سمجھنا چاہا تھا، لیکن اپنی فکر میں وہ خود الجھ کر رہ گئے اور زندگی انہیں "یوانے کا خواب" نظر آنے لگی اور رستا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ؎

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی کی غزلوں میں فلسفیانہ طرز فکر کا ایک پرتو ضرور جھلکتا ہے، لیکن یہ سوچ بوجھ جس نقطے سے شروع ہوتی ہے وہیں پر آکر ختم بھی ہو جاتی ہے اور کوئی خیال انگیز نتیجہ برآمد نہیں ہو پاتا۔

فانی کی شاعری میں لکھنو کے اثر سے "بوئے کفن" "نالۂ سوزِ غم" "شورِ ماتم" اور "آخری یادگار میت" کی قسم کے مضامین کی کثرت تھی، بعد میں انہیں "فلسفۂ غم" سے زیادہ دلچسپی ہوئی اور یہ گہرائی کیفیت، ایک رچی ہوئی غمگینی، ایک پرگداز سنجیدگی اور ایک سنبھلی ہوئی آزردگی میں تبدیل ہونے لگی۔ فانی کے تغزل پر میر اور غالب دونوں کا اثر ہے۔ ان کے اشعار میں نئی نئی اور بلیغ ترکیبیں ہیں، فانی نے فلسفیانہ غزل کو "آشوبِ ہوش" "نالۂ خموشِ مسلسل" "ابتدائے قیامتِ ملال" "دلِ خراب وفا" "وادیٔ برقِ ناز" "شعلۂ آرمیدہ" اور "آزردہ مشقِ رفو" جیسی اچھوتی اور معنی خیز ترکیبیں دی ہیں۔ میر کی طرح "دردِ غم کہنے کیلئے جمع تو دیوان کیا" والا احساس فانی کے یہاں بھی ہے۔ اور "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک" کا ماتم بھی مشترک ہے۔ میر کی شاعری اور ان کے غم میں ایک میٹھی میٹھی کسک ہے، فانی کے یہاں اس کسک میں مٹھاس نہیں ایک طرح کی تلخی ہے اور جانگدازی ملتی ہے۔ فانی کا تغزل عزیز لکھنوی کی شاعری سے بظاہر شاید معلوم ہوتے ہوئے بھی خاصا مختلف ہے۔ عزیز لکھنوی کے اشعار میں مرثیت کی جو لے اور وجد و لحراش الم پرستی ہے وہ فانی کی نرم اور پرتاثیر اثر انگیزی سے مختلف ہے۔ میر کے یہاں غم عشق آب حیات ہے، فانی کے پاس ہی جذبۂ عشق "وسوسہ" ہوتا ہے اور عزیز کے یہاں یہی چیز زہر آب میں تبدیل ہو گئی ہے۔ فانی کی غزل گوئی جس ادبی ماحول میں نکھری تھی، اس کی فضاؤں میں داغ اور امیر کے نغمے گونج رہے تھے۔ فانی داغ کے تغزل سے کوئی خاص اثر نہ لے سکے۔ داغ کے کلام میں جو رندی اور شوخی تھی وہ فانی کے مزاج سے میل نہ کھاتی تھی۔ اس کے باوجود فانی کے پاس بعض ایسے اشعار موجود ہیں جن میں اپنے ادبی پس منظر کا رنگ نمودار کر گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تیری جوانی تک
غلط انداز لگاہوں کو سنبھال میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ
اور ہی بل ہے تیری زلفوں میں آج کون گرفتار بلا ہو گیا
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے
اداوہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی
کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی
چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

فانی کو "بیوۂ عالم" "سوزِ خواں" اور "یاسین کا الم" کہنے اور سمجھنے کی روایت اتنی عام ہو گئی ہے کہ جب ان کا ذکر آتا ہے تو لوگوں کے ذہن میں اس شاعر کا تصور آجاتا ہے جس نے یہ شعر کہا تھا ؎

چلے بھی آؤ یہ ہے فیصلہ فانی دیکھنے والے
ترا اپنے مرنے والے کی آسانی دیکھے جاؤ

اچھے اشعار بھی، اچھی کتابوں اور نفیس اشیا کی طرح کثرت استعمال اور مسلسل برتنے کی وجہ سے اپنی تازگی اور نیا پن کھو بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ فانی کے اشعار کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ صرف وہی اشعار زبان زد ہو گئے جن میں "نزع" "موت" "قبر" اور "روم و اسیس" کا تذکرہ تھا، اور ایسے اشعار نظر انداز کر دیے گئے جن میں فانی اور امیر کے ماحول کا اثر غیر شعوری طور پر نمایاں ہو گیا تھا۔ اس

کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزل پسند دنیا داغ، امیر اور ان کے رنگ میں لکھنے والے شعرا کے نغمے بہت سن چکی تھی۔ کوٹھوں پر طوائفیں داغ کے اشعار گاتی تھیں، ادبی محفلوں اور بیٹھکوں میں داغ کی غزلوں کا چرچا تھا اور اوب دوست گھرانوں میں داغ کے اشعار پڑھے جاتے تھے، فانی کے تغزل کا انداز اس سے بہت مختلف تھا۔ اس نئے سے ہندستانی غزل کی فضا کچھ دیر کے لیے کانپ اٹھی۔ غزل سننے والے اس نئے سُر سے چونک پڑے اور داغ اور امیر کے ٹھیٹھے فانی کی سسکیوں میں تبدیل ہونے لگے۔ فانی کو اس کا احساس تھا کہ ہندستانی غزل کی تاریخ میں وہ ایک منفرد رنگ اور ایک شخصی لَے کے مالک ہیں۔ یہ رنگ نہ تو ان سے پہلے موجود تھا اور نہ ان کے بعد رہ سکے گا۔

پھر نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز میں ہی تھا اک دکھ بھری آواز

فانی کسی اور شاعر سے قریب ہوں یا نہ ہوں، لیکن اپنی ذات سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ فانی کے طرز ادا میں بڑی انفرادیت، بڑا چوٹیلا انداز اور بڑی روانی اور سادگی ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

مرکز نیرے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دیکے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

تجھے خبر ہے ترے نیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں اٹھتا

جئے جا تیکی تہمت کسی سے اٹھی کسی طرح اٹھی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

بجلیاں کو ندگئیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے بیٹھی ہیں وگا ہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

اللہ رے سکون قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیے

جس زلفا نے دنیا بر ہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

انسان کی ساری ہستی کا متصور ہے فانی ایک نظر

یعنی وہ نظر جو دل میں اتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

کس کی آنکھیں دم آخر مجھے یاد آئی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

میری ہوس کو عیش و دعا بھی تھا قبول
نیرا کرم کے تو نے دیا دل دکھا ہوا

اپنے دیوانے پہ انعام کرم کر یا رب
در و دیوار روے اب انہیں ویرانی دے

سن کے نیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج نیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

فانی کے اشعار میں جو سلاست، سوز و گداز، نشتریت اور جو ناگزیر اثر آفرینی پائی جاتی ہے، وہ ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔ فانی کی غزلوں میں زندگی کی بشارت نہیں، وہ بصیرت بھی نظر نہیں آتی جو احساس کو آفاقیت بخشتی ہے، لیکن ان کے یہاں غم کا ایک عرفان ضرور ملتا ہے، اور زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے اور غم پر چھا جانے کا ایک بھرپور حوصلا اور ایک اٹل عزم ملتا ہے ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مکتبۂ "شمع ادب" کی عظیم پیشکش

گل صد رنگ

جس میں حضرت اثر لکھنوی سے لیکر دور حاضر کے تمام شعراء کا انتخاب کلام کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر شخص اپنی دو غزلیں بھیج سکتا ہے۔ گل صد رنگ کی قیمت ۵ روپے ہوگی، لیکن شعرا کو ۴ میں ملے گی۔ غزلوں کے ساتھ سنہ پیدائش، وطن، سکونت پورا نام و پتہ ہونا ضروری ہے۔ اپنی غزلیں جلد روانہ فرمایئے۔

تفصیل کے لیے جوابی خط لکھیے

منیجر مکتبہ "شمع ادب" نوری ہوٹل، امین آباد لکھنو

رام لعل اور اس کا فن

ورندر وہرا

نارمن میلر قد چار فٹ چھ گول چہرا چوڑا سا ماتھا اور سر پر بے ترتیبی سے ہوا میں اڑتے ہوئے بال۔ ماتھے کے اوپر سے کافی بال جھڑ چکے ہیں۔ داڑھی مونچھ صاف۔ بڑی بڑی تیز آنکھیں جو عینک کے شیشوں کے پیچھے سے غور سے افسانوں کے دلوں کی بات بھانپ لیتی ہیں، بیٹھے ہوئے آدمیوں کے کردار کو پہچان لیتی ہیں اور وہ ان آنکھوں سے آکاش کی وسعتیں اور معرفت کی گہرائی اور ایٹمی تابکاری، مسافر بابو فتا کہ افسرنگ کو پہچانتے ہیں جو تیز نیز کے ساتھ گھومتی رہتی ہیں۔ اور خاکسار طبیعت کھا گھی سے دور ہے دیس کے ادبی حلقوں کا مانا پہچانا ہوا افسانہ نگار رام لعل۔

رام لعل کوئی چوبیس پچیس برس سے افسانے لکھ رہے ہیں انہوں نے شروع شروع میں کوئی اچھے افسانے نہیں لکھے، مگر جوں جوں ان کی افسانہ نگاری کی عمر بڑھتی گئی، ویسے ہی ان کے فن میں پختگی اور طرز بیان میں ایک نکھار سا آنا شروع ہو گیا ہے۔ آج ادبی دنیا میں رام لعل کافی شہرت کے مالک ہیں۔ آج سے کئی سال پہلے ہی انہیں مشہور ہونا چاہیے تھا، مگر ایک کمی یا خوبی کہیے کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی گروہ کے ساتھ منسلک نہیں کر سکے اور اس خود داری نے انہیں کافی نقصان پہنچایا، مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اپنی اچھی سے اچھی تخلیق کو جنم دینے کے لیے خامشی سے لکھتے رہے۔

رام لعل دلوں کی باتوں کو بڑے میٹھے میٹھے درد سے پہچانتا ہے اور اس کو پہچاننے اور سوچنے کے بعد کاغذ کے سینے پر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ان کے افسانے دلچسپی کے ساتھ ساتھ قاری کے لیے ایک نصیحت کا باعث بن جاتے ہیں۔ چھوٹی باتیں صاف کی پکڑ ہوتی ہیں جاگ کا پتا نہیں چلتا، ویسے ہی ان کے افسانے کو پڑھنے کے بعد قاری سوچتا ہے کہ یہ کیا بات بن گئی، جب میں نے افسانا پڑھنا شروع کیا تھا تو وہ کیا بات کہنے جا رہا تھا اور آخر میں آکر کیا بات ہو گئی۔ وہ پڑھنے کے بعد کیا سوچتا ہے اور غور کرتا ہے تو اسے اپنے ہی سینے کا داغ نظر آتا ہے۔ اس تحریر میں اور پھر اچانک ہی وہ اپنے دل میں کہہ اٹھتا ہے کہ رام لعل نے ٹھیک لکھا ہے۔

وہ اپنے ایک مشہور افسانے چتا میں یہ پلاٹ لے کر چلتے ہیں ایک آدمی کی بیوی بڑی تندرست اور بدچلن تھی۔ اس کا خاوند کئی برسوں سے اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ مرجائے یا اسے مار دوں مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور ایک دن وہ اپنی موت آپ مر گئی اور مرنے والے کا خاوند کافی دیر تک چتا کے قریب بیٹھا رہا۔ اور بقول رام لعل وہ یہ دیکھتا رہا۔

"وہ چتا میں سے اٹھتے ہوئے اونچے اونچے شعلوں کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ شعلوں کی آغوش میں ایک عورت کا جسم ہو چکا تھا، ایک داغ مٹ چکا تھا۔ ایک بدعا پوری ہو گئی تھی۔"

یہ ایک درد ہے مرنے والے کے خاوند کے دل میں ہے جو اس کے مرجانے کے بعد اکیلا اس دنیا میں ہے بیوی کی بدچلنی سے اس کے بھائی بہن پہلے ہی سے اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور اسی افسانے کی اگلی کڑی میں فاضل مصنف نے لکھا ہے۔

"چتا کے شعلے سرنگوں ہو چکے تھے۔ چتا لال لال انگاروں کا ڈھیر بن گئی تھی، آس پاس کچھ اور بھی چتائیں تھیں کچھ جلتی ہوئی، کچھ ڈھیر بنی ہوئی، وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر چلا جائے۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد کیا رہ گیا تھا، اس کا سارا اثاثا تو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی وہ تھکے ہوئے بڑھاپے جسم کو لے کر کہاں جاتا اس شمشان بھومی سے واپس لوٹ جانے کے لیے کوئی ہمدرد، کوئی اپنا آدمی بھی تو نہیں تھا۔ اچانک اس نے چتا کی دوسری طرف ایک شخص کو سایا دیکھا جیسے موقعہ پر ہاتھ رکھے کوئی

زور زور سے غرا رہا ہو۔ وہ حیرت سے اٹھ کر
سیدھا ہو بیٹھا وہ کون تھا؟ ایک آدمی چتا کے اس
پاس گھومتا ہوا بالکل سامنے آگیا۔ زمین پر بکھری
ہوئی ادھ جلی لکڑیوں کو اٹھا کر چتا میں پھینکنے لگا
شعلے پھر سر اٹھانے لگے وہ سایا کچھ دیر وہاں رکا کر
پھر شام کے سرمئی دھندلکے میں باہر چلا گیا۔ وہ
کون تھا؟ یہ جاننے کے لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔"

قاری جب ان لائنوں کو پڑھتا ہے تو وہ بے چین سا ہو کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اجنبی شخص کون تھا؟ اور آگے پڑھنے کے لیے بیتاب سا ہو اٹھتا ہے' اصل میں ایک اچھے افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلے اور وہ خود مجبور ہو کر پڑھنے لگے' اور آخر وہاں تک پہنچ جائے جہاں اسے افسانہ نگار لے جانا چاہتا ہے یا جو بات بتانا چاہتا ہے۔ جو وہ اٹھ کر اس آدمی کو ڈھونڈتا ہے تو وہ کیا دیکھتا ہے۔

"وہ آدمی کنوئیں پر نہا رہا تھا۔ اس سے پوچھتا ہے
کیا آپ نہائیں گے؟ اور اس نے ہاں کر لی اور
نہانے کے لیے نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا۔ نہاتے
نہاتے اچانک ہی وہ پوچھتا ہے آپ یہاں کیسے آئے؟
اس آدمی نے کنوئیں کے اندر آتا آتا ڈول لٹکاتے
ہوئے جواب دیا' میں اس مرنے والی کی خبر سن کر
چلا آیا تھا' لیکن میرا خیال ہے اس کی موت پہلے
ہو چکی تھی' بہت پہلے' اس کی موت اس نے
اور بھی حیران ہو کر پوچھا ــــ اس نے پانی کا
بھرا ہوا ڈول منڈیر پر روک دیا اور کنوئیں کی
تاریک گہرائی میں جھانک کر بولا ایک عورت کی
جو شے سے پیار کرتی تھی۔ میرے بن کر رہنا چاہتی تھی'
لیکن ایک ساہوکار نے اس کے ماموں کو سات
سو روپے نقد دے کر خرید لیا تھا اور اس نے
میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ جو شخص ہم دونوں
کا خواب لوٹ کرلے جا رہا ہے اس کا میں سب کچھ
لوٹ لوں گی' ایک تنکا باقی نہ چھوڑوں گی۔ کیا
یہ سچ ہے؟ پانی میرے بدن پر چھوڑ دو' مجھے بہت
گرمی محسوس ہو رہی ہے جانے کیوں؟ سچ تو یہ
ہے کہ میں نے اسے ہیتا از رکھا ہر موقع پر سمجھایا لیکن
ہیتا اس نے ایک ہی جواب دیا تمہیں اس سے کیا
تمہارے لیے میں مر چکی میرا شریر ایک چتا میں جلنے
سے پہلے پورے گھر کو ایک چتا بنا دے گا۔۔۔۔!
پاگل بے وقوف! اور ڈالوں پانی؟ ہاں ہاں اور
ڈالو' ابھی بہت ٹھنڈا ہے۔ لیکن اچھا لگ رہا ہے؟"

خاوند کو ان باتوں کے سننے کے بعد اس کی بیوی سے پریم کرنے دلے پر بے حد غصہ آتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کو ڈنڈے مار مار کر اس کا سر پھوڑ دے' مگر اچانک اس کے ماموں کے خلاف سخت نفرت کا جذبا ابھرتا ہے جو سات سو روپے لے کر ان کی محبت کی دھجیاں اڑاتا ہے' اس طرح ان پر بیبیوں کے علاوا ایک شریف انسان کے لیے بھی جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ دراصل یہی افسانہ نگار کی زبردست کامیابی ہے جو وہ قاری کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ یہ جسموں کی تجارت کئی خاندانوں کی نسل کو خراب کر دیتی ہے جب کہ ان کی مرضی کے خلاف شادی کی جاتی ہے اور اس میں عورت کے انتقام کو بھی رام لعل نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے ــــ رام لعل جس موضوع کو بھی ہاتھ میں لیتا ہے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا ہے ــــ

اپنے ایک افسانے "کوئی بات نہیں" میں ایک کردار حکومت سنگھ کا جو اسٹیشن کے پارسل آفس میں ایک خلاصی ہے وہ حکومت سنگھ شریف بھی ہے اور بدمعاش بھی' وہ دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہے اور دوسرے کی بے عزتی پر وہ غصے میں پھنک جاتا ہے۔ وہ اچھی طرح سے مال آفس کے بابوؤں کو جانتا ہے جو ایک یا دو روپے لے کر زیادہ مال کو کاغذوں پر لکھتے ہیں۔ اصل میں اس افسانے میں رام لعل نے ریلوے کے محکمے کی اس خرابی کو بھی کافی حد تک ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جو بابوؤں اور ٹھیکے داروں کے درمیان ہوتی ہیں۔ اسی لیے

پیے تو رام لعل کے ساتھ کام کرنے والے بابوؤں کو رام لعل کے خلاف سخت شکایت ہے۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ رام لعل کے اس قلم کو توڑ دیں جس سے وہ ان کی چبھتی ہوئی باتوں کو لکھتا ہے، اور لکھتا ہے تو خوب لکھتا ہے، اور ڈمنڈ ورایبٹ کر لکھتا ہے۔ اسی افسانے میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

"ارمی اوگونگی بائیسری ماں کی ادھر ساٹھ آپتلی میلی نیم برہنا گونگی سڑے ہوئے پھلوں کے ڈھیر میں تلاش کیا ہوا ایک کیلا چھلکا نکال کر جسم پر چھوتے ہوئے چیتھڑوں سے بات پوچھتی سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کے بالکل سامنے کھڑکی کے اس طرف ریل کا بابو تھا اور ایک بیوپاری۔ بابو بولا دیوی داس گونگی آگئی دو پیسے نکال، تماشا دیکھیں مذاق و مخنی ایک بات سے پہلے شیشوں والی عینک کو ناک کے بانسے پر جماتا ہوا اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ کے ٹکڑے کو ہونٹوں کے درمیان رکھ کر دھواں چوستا ہوا دیوی داس کہہ اٹھا۔ ہاں یار! اور گونگی کے بدن کو حریص نگاہوں سے گھورتا ہوا کھڑکی کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیزگاری کی بھری ہوئی تھیلی سے دو پیسے نکالے اور بابو کے سامنے پھینک دیے اور لوہے کی جالی کے اس طرف کھڑی ہوئی گونگی کو گھورنے لگا، دیکھ گونگی!

بابو نے دو پیسے کھڑکی کے باہر پھینکے اب ذرا رہو جا بیٹے۔ گونگی پیسوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دی میلے چہرے کی یتیم مسکراہٹ! بہت اداس! بڑی بے بس! اس نے پیسے اٹھانے سے پہلے اپنے کانپتے اور جھکتے ہوئے ہاتھوں سے ایک پستان پر پڑا ہوا چیتھڑا اٹھایا، ایسے نہیں سالی ذرا اور اوپر، ہاں دیکھو دیوی داس کیسے غضب کی چیز ہے! دیوی داس کی آنکھوں کی حریص چمک اور تیز ہو گئی۔ اس نے دو پیسے اور رکھ دیے ایک بار پھر لیکن کھڑکی کے سامنے ایک بھیب سا سایا آکر کھڑا ہو گیا۔ گونگی کے روٹے کھسوٹے ہوئے پستان اوجھل ہو گئے۔ چل بھاگ گونگی ورنا جان سے مار ڈالوں گا۔ حکومت سنگھ گیا کہہ رہے ہو بابو اندر سے چلایا۔ حکومت سنگھ کھڑکی کے سامنے بنے ہوئے لکڑی کے کاؤنٹر پر کہنیوں کے بل جھک گیا اور بولا شرم نہیں آتی۔ بڑے غضب کی چیز ہے یار ــــ حکومت سنگھ ہنس پڑا، بولا اس سے غضب کی چیز تو سالے تمہاری ماں ہے جو چالیس برس کی بھی ہو کر نئی بیاہی عورتوں کے سے نخرے کرتی ہے۔ کل اسے سبزی منڈی میں دیکھا تو سچ مچ وہ ہیں پانی بھر گیا، لیکن چونکہ تمہاری ماں تھی اس لیے سر جھکا لیا۔ حکومت سنگھ میں ایسی باتیں برداشت نہیں کروں گا۔ حکومت سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال کی چٹکی لی۔ اور پھر ہاتھ چوم کر بولا۔ تیرے غصے پر قربان ابھی تو تم خود بھی نمکین ہو۔"

ان لائنوں میں حکومت سنگھ کا کتنا بہترین کردار ہے۔ کتنا وقوف ہو کر وہ اسے کہہ دیتا ہے جس کے ماتحت وہ کام کرتا ہے۔ ان لائنوں میں رام لال کے جینے میں کتنا درد ہے اس گونگی کے لیے اور انسانیت کے لیے۔ ان پیسے والوں پر کتنا بڑا طنز ہے۔ اصل میں رام لعل کے سامنے روزانا ایسے واقعات آتے ہیں اور پھر وہ فنکارانا چابکدستی سے انہیں حسین بنا کر پیش کرتا ہے اس لائنوں میں بظاہر حکومت سنگھ بات کرتا ہے۔ حکومت سنگھ کی بات کے ساتھ ایک ایسا تھپڑ ان کی گالوں پر لگتا ہے جس سے ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ عزت سب کی برابر ہوتی ہے۔ اصل میں ان فقروں میں بات کرتا ہے حکومت سنگھ، مگر ان میں اس افسانا نگار کا بول بالا رہا ہے اس کا خلوص اور انسانیت بول رہی ہے اس کا کیرکٹر بول رہا ہے۔ رام لال کے کئی دوستوں کو اس بات کا شکوا ہے کہ

وہ بہت زیادا لکھتا ہے۔ اصل میں کہنے والے اپنی کمزوری کو بہانہ کہہ کر چھپانا چاہتے ہیں، گھریلو مصروفیات یا کسی اور وجہ سے اگر کہنے والے اتنا نہیں لکھ سکتے جتنا کہ رام لعل لکھتا ہے تو رام لعل کے قلم کو بھی وہ یہ بات کہہ کر شاید روکنا چاہتے ہیں۔ رام لعل اگر بہت زیادا لکھتا ہے تو محض اس لیے کہ ریلوے کے محکمے سے اسے جو تقریباً دو سو روپے ملتے ہیں وہ اس کے خرچے اس کی بیوی اور تین بچوں اور بوڑھے ماں باپ کے لیے کافی نہیں ـــــ یہ شکوا اگر کمکرانوں سے ہوتا تو اچھا تھا، جو ایک آزاد ہندستان میں اچھے ادیب کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔ اور مجبوراً وہ مشین کی طرح تیز لکھ کر اس قابل بنتے ہیں جس سے وہ اپنے اخراجات پورا کر سکیں۔ رام لعل کی بات تو چھوڑ دو اسے ریلوے سے کچھ تنخواہ اور کچھ اس کی کہانیوں کا معاوضہ مل جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچے رہا ہے، لیکن ان ادیبوں کا کیا حال ہے جو اپنی تخلیق کو بیچنے کے بعد بھی اپنے پیٹ کی آگ کو نہیں بجھا سکتے یہ شکایت ہمیں ریلوے والوں سے ہونی چاہیے تھی جبکہ وہ ریلوے ملازمین کو سہولیتیں دینے کے لیے آنا روپیا خرچ کر رہے ہیں، اسکول کھول رہے ہیں اور ان تمام باتوں کے لیے انہوں نے ایک علیحدہ ڈپارٹمنٹ کھول رکھا ہے۔ شاید انہوں نے ریلوے میں کام کرنے والے ان ادیبوں کے متعلق نہیں سوچا جو سب سے زیادا مدد اور توجہ کے حقدار ہیں۔ اسپورٹ پر بے تحاشہ ریلوے خرچ کرے نئے اسکول جو بچوں کے لیے کھل رہے ہیں ان پر خرچ کرے ـــ وغیرہ ڈپارٹمنٹ پر خرچ کرے، اگر وہ اس کے ساتھ ساتھ اچھے ادیبوں کا بھی خیال رکھے جو اس محکمے میں کام کر رہے ہیں تو کتنی اچھی بات ہو، اس طرح کئی ہندستانی اور پنجابی کے اچھے ادیب و شاعر اس محکمے میں کام کر رہے ہیں۔ جیسے رام لعل گھگھ دیش چندر کوہت، ہیرا نند سوز، تلسی رام پرکاش اوپا دھیائے اور اس طرح کے دوسرے دوست۔

(اصل میں اتنی مصروفیت کے باوجود بھی رام لعل نے ان دنوں اتنے اچھے افسانے لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادیب میں مجبور نہیں۔ ہندستانی ادب میں عزت اور فخر کے ساتھ لیے جانے والے رام لعل کے چند افسانے ہیں۔ جن میں "نئی دھرتی پرانے گیت" "ایک شہری پاکستان کا" "پتا" "کوئی بات نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ "نئی دھرتی پرانے گیت" اور "ایک شہری پاکستان کا" یہ دو افسانے ایسے ہیں جو رام لعل کی عزت، شہرت، مرتبے کے لیے بے شک کافی نہ ہوں، مگر ان کے لکھے جانے کے بعد یہ ضرور محسوس کیا جانے لگا ہے کہ ہندستانی کا ایک عظیم افسانا نگار اور بھی موجود ہے۔

بقول خاجا احمد عباس ـــــ ہمارے افسانوی ادب کی عظمت اگر پریم چند اور کرشن چندر، بیدی اور قاسمی سے ہے تو اس کی رونق افسانا نگاروں کے دم سے ہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاجرا مسرور اور خدیجہ مستور کہاں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حیدرآباد کے بعض اچھے لکھنے والوں نے کتنے ہی حسین اور یادگار افسانے تخلیق کر ڈالے۔ بدقسمتی ظہیر اچھی مترجم ہونے کے علاوا اچھی افسانا نگار بھی ثابت ہوئیں جس طرح بیس پچیس برس پہلے آفس کے ایک کلرک راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانے کے پہلے مجموعے "دانہ و دام" سے ہندستانی ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ اسی طرح اب ریلوے کے ایک کلرک رام لعل نے "ایک شہری پاکستان کا" جیسے افسانے لکھ کر چند برس ہی میں اپنا لوہا منوا لیا ہے۔

واقعی "ایک شہری پاکستان کا" رام لعل کے گنے چنے افسانوں میں سے ایک افسانا ہے۔ اس افسانے میں واقعات کی ایک کڑی ہے، ہندستان اور پاکستان بننے پر کتنے ہی لوگوں کے ساتھ ایسے واقعے ہوئے ہوں گے، مگر یہ واقعات رام لعل نے اس افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے سب سے مختلف سب سے دردناک اور غم انگیز ہے۔

"ایک شہری پاکستان کا" میں ایک عورت سرسوتی ہے جو کہ بلدیو کی بیوی تھی اور جب ہندستان، پاکستان بنا تو بلدیو کو معلوم ہوا کہ وہ سب لوگ مارے گئے ہیں اور سرسوتی کے والدین کو معلوم ہوا کہ وہ بھی مارا گیا ہے، مگر دونوں خبریں غلط نکلیں ـــــ سرسوتی اور اس کے دو دھمو کپے ہندستان پہنچے، کیمپوں کی تکلیف، رہنے کی مشکلات میں ایک شخص سردار اس

نے ان کی مدد کی اور یہاں پہنچکر بھی ان کے بڑھاپے کا وہ نوجوان سب سے بڑا سہارا بنا۔ اس لیے سرسوتی کے والدین نے سرسوتی کا ہات سندر داس کے ہات میں دیدیا تھا، لیکن ادھر بلدیو کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ زندا ہیں تو وہ پاکستان سے ہندستان پہنچتا ہے اور گھر آکر دروازے پر جب دستک دیتا ہے تو سرسوتی سمجھتی ہے کہ اس کا پتی آیا ہے، وہ فوراً کپڑوں کو چھوڑ کر بچوں کو ہلانے کے بعد چارپائی پر بٹھا کر دروازہ کھولتی ہے، سامنے بلدیو کو دیکھکر حیران ہو جاتی ہے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ اس کی قمیص جو کپڑے دھونے سے پہلے بچوں کو ہلاتے وقت گیلی سی ہوگئی تھی۔ سرسوتی کے گورے اور سڈول جسم پر چپک سی گئی تھی۔

قمیص کا گیلا ہو جانا اور جسم کے ساتھ چپک جانے میں بھی کتنا رومانی پہلو ہے۔ رام لعل اس میں یہ نہیں بتاتے کہ پتاتی کی گولائی کتنی ہے، راؤں کی گولائی کتنی ہے، کولہے کتنے بھاری یا ہلکے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں بتاتے کہ قمیص کے نیچے کیا ہے، نگر قاری کچھ پڑھنے کے بعد اس کے دل پر فطری جذبات ابھرتا ہے، اور پھر وہ قمیص کے گیلے ہونے کا تصور کرکے اس کے اندر اپنے ہی خیالوں سے اپنے دل و دماغ میں جال بننے لگتا ہے۔ سرسوتی کا دروازا کھولنا اور اپنے سر کے دوپٹے کو درست کرنے میں کچھ تہذیب کی کشش عمدا نمایندگی ہے، اور بلدیو کے سینے سے لگ کر روتے روتے سسکیاں لینے لگتی، مگر ہندستانی ناری کے فرائض اور اس کے بندھن سرسوتی کے رستے میں حایل تھے اس لیے وہ خاموش ہے اور اپنے سر کے دوپٹے کو درست کرنے لگتی ہے۔ بلدیو جب اندر آکر بیٹھ جاتا ہے تو سرسوتی اس کو خوب غور سے دیکھتی ہے۔ اس کے ماتھے پر کئی ہزار بوندیں جیسے ایک ساتھ ابھر آئیں۔ بوندوں کا ابھرنا سرسوتی کے افسوس اور دلی خوف کا اظہار ہے خوف اس لیے کہ اب کیا ہوگا، اور افسوس اس لیے کہ وہ اپنا ہات سندر داس کے ہات میں دے چکی ہے یا پکڑا دیا گیا ہے۔

"سرسوتی کی ماں آتی ہے اور جب بلدیو اس کے پاؤں چھوتا ہے تو وہ خوش ہونے کے بجاے حیران رہ جاتی ہے۔ وہ بدنامی کے خوف سے گھبرا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں محلے کی کئی عورتیں آجاتی ہیں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ سرسوتی کا پتی سندر داس اور سرسوتی کا باپ لالا بودھ راج بھی آگیا تھا۔ اور بلدیو نے سندر داس کے ایک چہرے کے نشان کو دیکھ کر پہچان لیا تھا اور بلدیو اس نشان کو دیکھتا ہی رہا۔ اس کے زخم کو دیکھ کر پچھلے پندرا برس کا واقعا یاد آرہا تھا جس میں سندر داس کی لڑائی بلدیو سے ہوئی تھی اور کھیتی کے پیچھے کھلے کھیت میں آزادانا لڑائی ـــــ اور اس لڑائی کی یادگار یہ زخم تھا اس زخم اور زخم کی وجہ کو سرسوتی اچھی طرح سے جانتی تھی۔"

اس میں افسانا نگار نے بتایا ہے کہ سرسوتی کو حاصل کرنے کے لیے ان دونوں نوجوانوں کی پہلے ہی سے ان بن تھی، اور حالات سے فایدا اٹھا کر سندر داس نے جیسے بلدیو کے گاؤں پر ایک تھپڑ مارا ہو، مگر اس تھپڑ سے وہ تھپڑ اہم ہے جو سندر داس کے گالوں پر تھا اور وہ نشان ہتیا کی یادگار بن کر رہ گیا تھا۔ یکایک سندر داس جو بیٹھ کو دیکھ کر اندر چلا گیا تھا باہر آتا ہے اور بلدیو سے خاطب ہو کر کہتا ہے "اگر تم چاہو تو عدالت کا دروازا کھٹکھٹا سکتے ہو" اس میں بغض عناد اور نفرت کا وہ جذبا ابھرتا ہے اگر حالات اجازت دیتے یا اس کا بس چلتا یا سرسوتی ایسا چاہتی تو اب بھی بلدیو اس سے لڑائی کرکے سندر داس سے اس سرسوتی کو حاصل کرسکتا تھا جو اس کی اپنی تھی، مگر وہ ایسا نہیں کرسکا۔ صرف یہ کہا۔

"سرسوتی میری ہوتا ہے وہ میری محبت کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس کو دوبارا حاصل کرنے کے لیے آپ مجھے عدالت کا دروازا کھٹکھٹانا چاہتا ہے۔ عدالت انصاف کرے گی، مگر کب، اور کتنے سالوں میں۔ میں یہاں ایک اور عدالت کا دروازا کھٹکھٹانا چاہتا ہوں۔ اب اور ابھی مجھے اس سے پورا پورا انصاف

ملے گا اس کا گلا رو ندگیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز سے کہنے لگا کہ سہرسوتی۔ اسی وقت کمرے میں دلدوز چیخ بلند ہوئی اور سہرسوتی زور زور سے رونے لگی۔ سب عورتیں گھبرا کر اندر بھاگ گئیں۔ اسی وقت گلی کے دروازے پر ایک شخص نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک کاغذ تھا اندر آکر کہنے لگا یہاں پاکستان کا شہری آیا ہے اور اسی گھر میں آکر ٹھہرا ہے۔ بلدیو نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا کچھ لمحوں تک اسے پڑا اور پھر اسے لوٹاتے ہوئے بولا! آج ہی چلا جائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی اشکبار آنکھیں آستینوں سے پونچھیں اور اپنا لاٹھی والا پرانا کمبل اور بیگ لے کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔"

اس میں بلدیو کا کھلی عدالت کے سامنے انصاف مانگنا اور کھلی عدالت اسے انصاف نہیں دیتی وہ اس سہرسوتی سے پوچھتا ہے جو حقیقتاً اس کی بیوی ہے تو اس کے ایک دردناک چیخ نکل جاتی ہے اور جب وہ زور زور سے روتی ہے تو اس میں سہرسوتی کے دل میں کتنا درد ہے کتنا پیار ہے کتنی محبت ہے جو اپنے آنسوؤں سے ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ حالات سے مجبور تھی اور آخر میں اس خاموشی کو توڑنے کے لیے رام لعل نے کتنے نازک موقع پر اس آدمی کو پیش کیا ہے جو سچا ہی ہو سکتا ہے اس کا کاغذ دینا اور اس کاغذ کو بلدیو کا پڑھ کر واپس لوٹاتے وقت یہ کہنا کہ آج ہی چلا جاؤں گا، اور پھر اپنے کمبل اور بیگ کو اٹھا کر باہر چلا جانا قاری کے ذہن پر ایک اور جھٹکا دینے کے لیے کافی ہے۔ رام لعل کتنی چالاکی سے اس خاکی کاغذ والے آدمی کو پیش کیا ہے۔ یہ رام لعل کی فنی بلندی ہے کہ کس بات کو کہاں کہنا ہے اور کس آدمی کا کیا کردار ہے اور اسے کہاں پیش کرنا ہے اور جب قاری اس بات کو پڑھتا ہے تو اس کا دل اچانک ہی بلدیو کی مدد کے لیے تڑپ اٹھتا ہے، اور بیٹھے ہی بیٹھے اس سفید داس کے خلاف کتنا غصہ آتا ہے جس نے وقت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔

یہی افسانہ نگار کی خوبی پڑھنے والے کو ہر بات کا احساس ہو جانا چاہیے۔ افسانہ نگار نے بلدیو کے کردار کو کس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتنا بہترین کردار ہے، اس سہرسوتی کا جسے بلدیو سے بھی زیادہ سماج کی کچھ قدریں عزیز ہیں۔ اور وہ ہیں اس کے دو بچے جنہیں وہ کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑ سکتی، جنہیں وہ اپنی کوک سے جنم دے چکی ہے۔ اگر یہ بچے چھوڑ کر بلدیو کے ساتھ چلی جائے تو تامتا کی ساکھ کو کتنا بڑا بھاری دھکا لگے اور ہم اور آپ، اس سہرسوتی میں اور بازار کی رنڈی میں کچھ امتیاز نہ رکھ سکیں گے۔

اس طرح یہ رام لعل کے فن کی خوبی ہے کہ پڑھنے والے کو آخر میں آکر چونکا دیتا ہے اور اس بات کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ افسانے کے متعلق سوچے یا افسانہ نگار کے ارد گرد کے ماحول اور اس کے حالات کا جائزہ لے اسے اپنانے یا نہ اپنانے پر بھی اس کی مرضی پر ہے ہاں رام لعل اتنی بات ضرور کرتا ہے کہ قاری کی خامش رگ کو تیز کرنے کے لیے آخر جھٹکا دے دیتا ہے جس سے وہ کچھ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرے یہی بات ہمیں رام لعل کے ہر افسانے میں ملے گی۔ اور میرے نزدیک ایک فنکار کی سب سے بڑی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ کہانی یا افسانے یا نظم یا اپنے فن کی کسی اور خوبی کو اس کے پڑھنے دیکھنے اور سننے والے پر اس کے اثرات چھوڑ جائے۔

بیشک رام لعل کا مستقبل خوب صورت ہوگا، مگر حال بھی کم خوبصورت نہیں۔ آج بھی ہندستان اور پاکستان کے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خاجا احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، ہاجرا مسرور اور خدیجہ مستور کے بعد اس صف کے آخر میں رام لعل کا نام بھی آتا ہے۔

"ہندستانی ادب" کے لیے خریدار پیدا کرنے ہمارے کام میں ہاتھ بٹائیے۔ شکریہ!

ثمر جہاں

ملکۂ نور جہاں کی لڑکی اور شہنشاہ جہانگیر کے لڑکے کی داستان عشق

ڈاکٹر علیم، ام۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

۱۶۰۶ء کی ایک دلنواز صبح کا ذکر ہے کہ اودی گھٹائیں آسمان پر چھا رہی تھیں، ہوا کے دوش پر ورجھونکے چل رہے تھے اور اکبر آباد میں شہنشاہ نور الدین جہانگیر کی تخت نشینی کا جشن جاہ و جلال کے ساتھ منایا جا رہا تھا۔ چھ ہفتوں تک محتاجوں کو بے شمار مالی خیرات کیا گیا، اور نقارہ زن کی رسم کی گئی، جس وقت کہ یہ رسمیں ادا کی جا رہی تھیں قصر شاہی میں بردوان علاقۂ بنگال سے مغل خواتین کا ایک قافلہ چلا جس کے ساتھ ایک حفاظتی فوج تھی۔ اس قافلہ میں شیر افگن کی بیوی مہر النسا، شیر افگن کی لڑکی ثمر جہاں اور مہر النسا کی ماں کاکی مہر اشامل تھیں۔ شہزادہ پرویز اور شہزادہ شہریار نے اس قافلے کا شاندار خیر مقدم کیا۔

جشن تخت نشینی کے اختتام پر مہاراجا مان سنگھ والی بے پور نے یہ اہم تقریر کی۔

"ہم اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ آج ہمارے ملک کا زماں روا وہ شخص ہے جو عدل اور انصاف کی تصویر ہے، جو فرائض شہر کو نہایت نیک نیتی سے انجام دیتا ہے۔ جس کے شاہانہ اقبال کی برکت سے آج ملک کا نظم و نسق عالا حیثیت سے قایم ہے۔ ہماری مرکزی حکومت نہایت ہی طاقتور ہے۔ جس کے احکام پر بہ ایک وقت تمام صوبوں میں یکساں طور پر عمل ہو رہا ہے، شہزادہ خرم، شہزادہ پرویز، شہزادہ شہریار اپنے محترم والد ماجد کے نہایت ہی وفادار اور جاں نثار ہیں، اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کامل امن اور سکون ہے اور ہر طرف خوش حالی و آسودگی کا دور دورا ہے، اس ملک کی صنعت و حرفت، اور تجارت و زراعت ترقی پر ہیں۔ مظلوموں کی فریاد رسی اور دادخواہی کے لیے مناسب انتظام ہے۔ ہمارا فرماں روا رحم دل، نرم مزاج، حلیم، بردبار، عدل و انصاف کا حامی، پاکیزہ دل اور روشن دماغ کا مالک ہے۔"

تقریر کے بعد تخت نشینی کا جلسہ ہوا۔ نور الدین جہانگیر نے ملک کے نظم و نسق پر ایک نظر ڈالی، اور تحصیل مالگزاری کے قوانین میں ترمیم کی۔ شہزادہ خرم اور پرویز کو دکن کے حالات کی اصلاح کے لیے مقرر کیا، شہزادہ شہریار کو درباری معاملات کا مختار بنایا گیا اور قلعۂ اکبر آباد کے بڑے برج سے دریا کے کنارے تک ایک طلائی زنجیر عدل لٹکا دی گئی تا کہ مظلوم آسانی سے انصاف حاصل کر سکیں۔ مہر النسا بیگم قصر شاہی کے شمالی حصے میں مقیم تھیں، جہاں انہوں نے چار ماہ دس دن سوگوار انداز میں بسر کیے۔ عدت گذرنے کے بعد شہنشاہ نور الدین جہانگیر اور مہر النسا بیگ مرزا غیاث الدین کا باقاعدہ نکاح ہوا، اور اسی دن مہر النسا کو ملکۂ سلطنت، بادشاہ بیگم نور جہاں کا خطاب دیا گیا۔ اور سرکاری سکے پر یہ شعر کندہ کیے جانے کا فرمان صادر ہوا۔ یہ حکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

اب قصر شاہی میں مہر النسا کی حیثیت صرف زوجۂ جہانگیر ہی کی نہیں تھی، بلکہ ایک صدر اعظم کی تھی۔ عہد جہانگیری کا مشہور مورخ برہان الدین، ترک جہانگیری کے دیباچے میں لکھتا ہے۔

"ملکۂ نور جہاں کو یہ جاہ و جلال صرف اس کے حسن و جمال کی وجہ سے حاصل نہیں ہوا تھا، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ اپنے ذوق سلیم، بلند نظری، فیاضی، بلند ہمتی، شجاعت و استقامت، ذہانت طبعی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھی۔ ترکی اور فارسی ادب سے نور واقف تھی جو فرائض اس کے سپرد کیے گئے تھے وہ ان کو نہایت مستعدی اور پابندی کے ساتھ انجام دیتی تھی اور حسن انتظام میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔"

قصہ محبت کی اس تعمیر کے بعد اس گلشن عشق میں نئی کلیاں نمودار ہوئیں۔ شہنشاہ جہانگیر کے چھوٹے لڑکے شہریار اور شہزادی تہمتاز میں شیر افگن میں گہری محبت پیدا ہو گئی۔ اگر شہریار کو بھی اہم کام کے سلسلے میں اکبرآباد سے باہر چلا جاتا تو شہزادی تصویر درد اور دریا اضطراب بن جاتی اور اگر شہزادی کسی تقریب کے سلسلے میں دلی یا الہ باد جاتی تو شہریار کے لیے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتی۔ عشق محبت کا یہ طوفان روز بروز تیزی سے آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ شہنشاہ جہانگیر کو بھی یہ داستان محبت معلوم ہو گئی لیکن اس سے پہلے جہانگیر ایک امیر الامرا کی دختر سے شہریار کی شادی منظور کر چکا تھا اس لیے اس نے اس طوفان عشق کو روکنے کی کوشش کی اور امیر الامرا کی دختر نیک اختر کے ساتھ فوری طور پر شہریار کی شادی کر دی گئی۔

شادی کے موقع پر شاہانہ تزک و احتشام کا اظہار کیا گیا عیش و نشاط کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ غریبوں کو زر و مال دیا گیا لیکن جس وقت شہریار کی شادی کے یہ عظیم الشان جلسے منعقد ہو رہے تھے شہزادی کی دل کی کائنات میں ایک طوفان عظیم برپا تھا۔ آخر ایک ماہ بعد عیش و نشاط کی یہ محفلیں ختم ہوئیں اور شہریار نے اپنا آشیانہ دلہن کی محبت میں ڈوب کر شہزادی کو دل سے فراموش کر دیا، لیکن شہزادی کے دل میں محبت کا ایک آتش کدہ روشن تھا اور اس کے شعلے اس کی روح کو تڑپا رہے تھے۔ دن اسی طرح گذر رہے تھے صبح ہوتی تھی شام ہوتی تھی

عمر یوں ہی تمام ہوتی تھی

اور اس کی راتیں سکون سے محروم تھیں۔ وہ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر آہ و زاری کرتی۔ اس کی مجبور اور بے کیف آنکھیں آنسوؤں کے پودے سے اکثر جھکی جھکی رہتیں۔ تارے اس کے غم پر مسکراتے اور نسیم سحر کے جھونکے اس کے آنسوؤں سے کھیلتے۔ ماہ ربیع الاول کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ شہزادی جمنا کے کنارے چہل قدمی کر رہی تھی شہریار بھی آگیا اور اس نے شہزادی کے قریب پہنچ کر کہا۔

"شہزادی! میں دیکھتا ہوں کہ تم اکثر اداس اور غمگین رہتی ہو، بتلاؤ اس کا کیا سبب ہے؟"

شہزادی نے نگاہیں نیچی کر لیں اور کوئی جواب نہیں دیا شہریار نے پھر سے دریافت کیا "شہزادی! کیا تم میری بات کا جواب نہیں دو گی؟" وہ مجسم سوال بن گیا تھا۔ شہزادی نے غمگین انداز میں کہا۔

"شہزادے! آپ میری داستان غم سن کر کیا کریں گے، ایک شکستہ حال کا ماجرائے درد سنکر آپ کا دل بھی اداس ہو جائے گا"

شہریار نے شہزادی کا ہات اپنے ہات میں لے لیا اور دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "شہزادی! آج تمہیں اپنی داستان غم سنانی ہی پڑے گی"

"میں دنیا کے حالات پر غور کرتی رہتی ہوں اور بعض واقعات دیکھ کر اداس ہو جاتی ہوں"۔ شہزادی کی آنکھیں غمناک تھیں اور لہجہ اداس، میں نے ایک داستان سنی ہے جسے سن کر میرا دل غمگین ہو گیا ہے"

شہریار نے کہا "خدا کے لیے مجھے بھی وہ داستان سنا دو"

شہزادی نے کہا "شہزادے! داستان یہ ہے کہ ایک عظیم الشان شہزادہ تھا، نہایت شاندار خوبصورت، نہایت فیاض اور بلند ہمت۔ شہزادوں کی محفل میں اس کا تزک و احتشام مشہور تھا اس کی ذہانت و طباعی کو سب مانتے تھے، چوبیس کروڑ روپیہ نقد اور سولہ کروڑ روپے کا سونا چاندی ہر وقت اس کی تحویل میں رہتا تھا۔ اس نے ایک غمزدہ لڑکی سے یہ وعدہ کیا کہ میں تم سے شادی کروں گا، مجھے تم سے بیحد محبت ہے اور میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لڑکی نہایت بے وقوف تھی، اس نے اس وعدے پر یقین کیا اور اس شہزادے کو اپنے دل کے سمندر کا دیوتا بنا لیا، لیکن شہزادہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہا، اور اس نے ایک خوبصورت امیرزادی سے شادی کر لی، اور غمزدہ لڑکی کو ٹھکرا دیا۔ لڑکی مجبور و بے بس تھی، وہ کوئی شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی، شہزادے کی بے التفاتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی سراپا اضطراب اور دیوانہ بن گئی"۔ اتنا کہنے کے بعد شہزادی خاموش ہو گئی۔ شہریار بدستور رات کے جمنا کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ شہریار نے پوچھا "شہزادی! پھر اس لڑکی کا کیا حشر ہوا؟"

شہزادی نے دریا کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا "شہزادے! جب اس لڑکی کا رنج و غم حد سے بڑھ گیا تو وہ اس طرح دریا میں کود پڑی" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی شہزادی جمنا کی لہروں کی آغوش میں تھی

شہزادہ اس المناک نظارے کو دیکھ کر سخت پریشان ہو گیا، اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کو پانی سے نکالیں، چند سپاہی دریا میں کود

امریکا کا ایک عظیم شاعر — رابرٹ فراسٹ

یو سلیسی

رابرٹ لی فراسٹ امریکہ کے ایک ملک الشعرا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ نیچے کے مضمون میں ان کی زندگی پر مختصر سی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ ۲۶ مارچ کو آپ ۸۶ ویں برس میں قدم رکھیں گے۔ اب اس عمر میں تندرست و توانا اور لائبریری آف کانگریس میں شاعری کے شعبے کے مشیر ہیں۔

عجب ہیں شگوفے عجب برگ و بار
کہ پھر پھر کے اگتے ہیں پھر بار بار
خزاں ہے کبھی اور کبھی ہے بہار
سمجھا کوئی حکمت کردگار

امریکا کے عظیم شاعر رابرٹ فراسٹ کے بارے میں اوپر کے خیال سے واضح ہوتا ہے کہ وہ قدرت اور زندگی کے عمیق اسرار و رموز سے واقف ہیں اور ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ؎

اس سے پہلے کہ کبھی بہار آئے — باغ و گلشن میں برگ و بار آئے
لازمی ہے کہ آئے دور خزاں — سونی سنسان ہو یہ بزم جہاں
رنج سہہ کر ہی ملتی ہے راحت — بزم عالم کی ہے یہی فطرت

(اس الناکی، تاریکی اور پژمردگی کے بعد پھر نئی زندگی اور نئی بہار آئے گی، لیکن پھر وہی بیت جھڑ شروع ہوگی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ حیات و مرگ کے اس بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والے چکر اور آواگون سے انسان کو آخر کب نجات ملے گی؟ فراسٹ کے پاس اس کا براہ راست کوئی جواب نہیں، لیکن جس کائناتی سفر کا تصور ان کے قلب و دماغ میں جاگزیں ہے اور جس کی منزل مقصود نامعلوم ہے۔ وہ انہیں اپنی راہ پر گامزن ہونے سے نہیں روکتا۔ وہ کہتے ہیں ؎

یہ گہرے گھنے جنگلوں کی بہار — ہے دعوتِ پیام قیام و قرار
ہے اک اک قدم منزلِ نفسِ رواں — سفر ہی سفر ہے یہاں جاوداں
کسی سے ہے ملنے کا قول و قرار — کوئی کر رہا ہے مرا انتظار
نہیں لمحہ بھر کی بھی فرصت مجھے — کہ منزل رسی کی ہے محبت مجھے

فراسٹ کے فلسفے میں "کرم" یعنی عمل پیہم پر اصرار ہی کلید ہی نکتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے انہیں ایک "کرم یوگی" سمجھنا ضروری ہے۔ وہ ایک ایسے مسافر ہیں جو سفر کی صعوبتوں سے آگاہ ہیں۔ راہ کا دھندلکا، کہر اور دھند، سمندری خطرات اور اس پر ٹوٹا ہوا چپو اور شکستہ بادبان — لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود وہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں، ان کے لیے کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہر اعتقاد و یقیں کی بنا وقت غم ہے
ہو خون قتل بھی انصاف کا یہاں کم ہے

نہیں ہے بس میں یہ انسان کے بات یہاں
حیات حنیفہ بنتی ہے یا گل خنداں

رابرٹ فراسٹ اب کے ۲۶ مارچ کو ۸۶ ویں سال میں قدم رکھیں گے۔ وہ سان فرانسسکو میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور اس وقت ان کا انتقال ہوا جب رابرٹ ابھی گیارہ برس ہی کے تھے۔ ان کی والدہ ایک اسکول میں استانی تھیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے سسر یعنی رابرٹ کے دادا کے پاس سانفرانسسکو چلی گئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

امریکا کے اس شمال مشرقی گوشے سے جسے نیو انگلینڈ کہتے ہیں، نوعمر رابرٹ کی قدرت شناسی اور اس سے قربت

کا آغاز ہوا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی وسیع خوبصورتی، قدرتی مناظر اور باغ و بہار سے ان کا رگاؤ اور انس بڑھتا ہی گیا۔ اس کے پرسکون سنجیدہ اور متین دیہی مقامات اور وہاں کے لوگوں اور ان کی زبان نے ان کے بیشتر کلام میں بڑا دخل پایا ہے۔ ان باتوں کا ان پر اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "ادب کا آغاز ہی جغرافیا سے ہوتا ہے"۔

مثلاً "سنڑوک جھونپڑی" "کائی کا لچھا" "برج کا فخل نو" "پہلی برف باری" "ایک شرمیلی پہاڑی بیوی" "ایک بھاگا ہوا بچھیرا" "کہسار میں برف پگھلنے کا منظر" "کالے جنگل" ان کی نظموں کے جیسے موضوع انہیں کے اس دیس سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جانے پہچانے اور روز روز مشاہدے میں آنے والے منظر ان کے نزدیک محض موضوع مضمون ہی نہیں بلکہ یہ عمیق، صوفیانا پاکیزہ تر وجدان و فیضان کا سرچشمہ ہیں۔

اپنا پہلا مجموعۂ کلام شایع کرنے سے پہلے وہ ایک کسان تھے اور کھیتی باڑی سے اپنی روزی کماتے تھے۔ زراعت اور کاشتکاری کے ان برسوں میں بیچ بیچ میں کچھ ناغے بھی ہوئے اور وہ ایک کارخانے میں کارکن کے طور پر اسکول کے معلم اور دیہی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے لیکن زمین سے ان کا انس اور کھیتوں اور کھلیانوں میں کھلی اور تازہ ہوا انہیں بار بار اور ہر بار کھینچ کر کھیتی باڑی کی طرف کھینچ لاتی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں ان کی پہلی تصنیف "ایک لڑکے کا عزم" کے نام سے لندن میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد بوسٹن کے شمال میں" نام کی دوسری تصنیف چھپی۔ اسے بھی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اور خوبصورت اور گھرے گھنے جنگلوں میں سے تنہا اور انتھک سفر کے گوناگوں تجربوں میں انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے دوسروں کو بھی شریک کیا۔

آپ کے ہم وطنوں نے ان کی کوشش و کاوش، ذہانت سوزی اور جگر کاوی کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا چنانچہ امریکا کے سب سے بڑے ادبی انعام "پلٹزر پرائز" سے انہیں اب تک چار دفعا سرفراز کیا گیا ہے۔ پہلی بار جب انہوں "یونیمپ شائر" کے نام سے ۱۹۲۴ء میں مجموعۂ کلام شایع کیا۔ اور آخری انعام ۱۹۴۳ء میں "ایک شاہد درخت" کی اشاعت پر حاصل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں امریکی سینیٹ نے اپنی مختلف اور کثیر مصروفیتوں کے باوجود ان کی ادبی خدمات اور شاعرانہ کمالات کے سلسلے میں خراج عقیدت و احترام ادا کرنے کے لیے ایک خاص قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا ہے کہ ان کے کلام اور ان کی تصانیف نے امریکی فکر و نظر اور تصور و تخیل کی خوش طبعی اور دانشمندی سے بھی سمت میں رہبری کرنے میں مدد دی ہے اور اس طرح اپنی ذات اور ساری نوع انسانی کے متعلق قابل اعتبار جایزے سے خبردار کیا ہے۔

پچھلے برس ان کو واشنگٹن لائبریری آف کانگریس کے شعر و شاعری میں دو برس کے لیے مشیر مقرر کیا گیا اور اسی طرح امریکا میں ملک الشعرا کی جو قدردانی ہوتی ہے اس کا ثبوت دیا گیا ہے۔

فراسٹ کا کہنا ہے کہ شاعری کا آغاز دل پر رقت طاری ہونے، وطن کی یاد، محبوبا کے فراق اور عشق جنوں خیز سے ہوتا ہے۔ یہ اپنے جذبات کے اظہار اور تسکین قلب کے حصول اور جی ہلکا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ایک مکمل اور جامع نظم وہی ہو سکتی ہے جس میں جذبات کو خیال کا اور خیال کو الفاظ کا موزوں جامہ ملا ہو۔ زندگی کی اسی المناک وسعت بعد سے آگاہی اور اسی ناگزیر المیا کا احساس علم اور معاصت اسے سعی مسلسل اور عمل پیہم کی تحریک دیتی ہے۔ یعنی اس کو پہلے اس کے "عرفان" اور پھر عالم وجود میں تمام رہنے کی تاکید کرتی ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں ناانصافی اور بےچینی اس حد تک پائی جاتی ہیں کہ وہ یہ مانتے کو تیار ہیں کہ ہم جن چیزوں سے محبت کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی یا جیسی کچھ بھی ہیں اسی بنا پر ان سے محبت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن ان کا یہ اعتراف تقریباً خدائی اعتراف ہے۔ "یہ ایک عاشق صادق کا سچا اور پرخلوص اعتراف ہے۔ انہیں نوع انسانی سے عشق ہے اور نوع انسانی میں جو خامیاں

گل جان

ایرینا گورو

چاندنی رات سیگ چلی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں کی کھدائی ختم ہو چکی تھی ایسا لگتا تھا کہ کپاس کے کھیتوں میں یہاں وہاں بکھرے ہوئے برف کی ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں۔ کھیت سے دور گھاس کے میدان لگ رہے تھے۔ بعض بعض جگہ تو کپاس کے بڑے بڑے گٹھے نظر آنے لگے، کسے سلیقے سے سجایا گیا تھا ان گٹھوں کو۔ انہیں ڈوریوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ آج شام تک تو لوگ باگ یہاں کام کرتے نظر آرہے تھے۔ مزدوروں نے موم جامے کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے گٹھوں کو ڈھک دیا۔

کپاس کے پھول چننے والی مشینیں دور سے بڑی بڑی چوڑیوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ دودھ جیسی اجلی چاندنی میں دھات کی چمک مشینوں کو عجیب عجیب روپ دے رہی تھی۔

میاں بس کے انتظار میں مزدوروں کی ٹولیوں سے ذرا پرے چائے خانے میں بیٹھی تھی۔ ان میں سے بعض میرے جان پہچان والے تھے۔

چھدری داڑھی والا دبلا پتلا لمبا بڈھا بیٹے کی درگت پر کارونا رو رہا تھا۔

"ملے جلے والے لاکھ سمجھائیں، کان پر جوں ہی نہیں رینگتی اس کے۔ باپ کہہ کہہ کر ہار جائے مگر وہ تو اپنی ہی کرے گا۔ اس کی تو مرضی ہے کہ دن بھر پتنگ توڑتا رہے اور بس۔"

اون بھاڑ عمر والے موٹے دکاندار عزیز بیگ نے تجسس بھری آواز میں پوچھا "حضرت! آپ کے بیٹے کی پہلی بیوی سے ایسی ویسی درگت ہو گئی کیا؟"

بڈھے میاں بڑی اداسی سے ہاتھ جھٹک کر خاموش ہو گئے۔ ان کے بجائے کالی مونچھوں والے چالیس سالا مرد نے جواب دیا جو چیکٹ بھرے رنگ کی ٹوپی اور سفید انگرکھے میں ملبوس تھا۔

"ایسی ویسی حرکت سے کیا مطلب ہے؟ گل جان بہت اچھی عورت ہے۔ ہمارے پنجایتی فارم میں بڑی عزت ہے اس کی۔ کام میں شیرنی ہے شیرنی، اور گھر پر دیکھو تو ننھی سی کبوتری کی طرح نازک نازک۔ عثمان عطا صاحب آپ کے صاحبزادے تو حد کی آگ ہیں تو جل مرے" وہ بڑے میاں سے مخاطب ہو گیا۔ عثمان عطا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میاں بیوی تو جیسے چاہیں ویسے رہیں، مگر پوتا یوتی کو دیکھ کر کلیجا منھ کو آتا ہے۔ بے باپ کے بچوں کی زندگی ہی کیا! انگیٹھی کے گرے ہوئے انگارے سے بدتر ہیں سلگ سلگ کر بجھ جائیں گے۔

"کیا؟ کیا فرمایا.... بے باپ کے بچے؟" کالی مونچھوں والا چونک گیا۔ "گل جان رحمت اللہ سے الگ ہو گئی کیا؟"

"چلی گئی۔ جس روز وہ نئی فوٹیلے کر گھر آیا۔ اسی دن چلی گئی۔ گل جان خود بھی گئی اور بچوں کو بھی لے گئی۔"

ظاہر ہے پوتے پوتی کے خیال سے بڑے میاں کا کلیجا پھٹ رہا تھا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ بے حد سہمے بیٹھے گئے۔ نظریں نیچی تھیں اور ہاتھ انگرکھے کی آستینوں میں دبے ہوئے۔ خالی پیالا ان کے سامنے رکھا تھا۔

چائے خانے میں سناٹا چھا گیا اور آخر جھنجھناتی ہوئی مردانہ آواز نے خاموشی کا دل چیر دیا۔ یہ آواز عبداللہ مرزا فاجا کی تھی۔ عبداللہ کے گنجے سر پر بڑی آن بان سے سفید عمامہ بندھا ہوا تھا، اس کی عمر کا پتا لگانا ناممکن تھا۔ عبداللہ تیمور لنگ کے تقریبے کا نگران تھا۔ سمرقند کا یہ تقریب اب عجائب گھر بن گیا تھا۔ عبداللہ کاہلی کی تصویر بخاری پر نیم دراز تھا۔ "بابا عثمان عثمان عطا میرے خیال میں آپ کی بہو

بے سبب گرم ہو گئی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے بیٹے نے کبھی ان سے تڑخ کر بات نہیں کی، کبھی انگلی بھی نہیں چھوائی۔ شادی کی ہوئی عورت کو کسی حالت میں بھی شوہر سے الگ ہونا روا نہیں۔"

کالی سوتھنوں والے نے ٹھیٹھ کر جواب دیا "نہیں یہ بلکل غلط ہے۔ زمانا بدل چکا ہے حضرت!" مرزا خاجا اپنا ہات ہلا ہلا کر بحث کرنے لگا۔

"اس سے سوویت حکومت کو کوئی دھکا نہیں پہنچتا نہیں، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ جنگ میں ہمارے بہت سے ہمارے مرد کام آ گئے۔ آج ہمارے یہاں عورتیں زیادا ہیں اور مرد کم۔ کسی نے دوسری شادی کرلی تو اس میں برائی کیا ہے۔ دو بیویاں ہوں گی تو زیادا بچے پیدا ہوں گے اس سے خاندان اور حکومت کا فائدا نہیں ہوگا تو کیا نقصان ہوگا۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں بھائی۔" عثمان عطا نے مرزا خاجا کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"ہمارے کس کام کی تمہاری رائے۔ تمہارا ٹھکانا مقبر میں ہے اور ہمارا واسطا ہے جیتے جاگتے انسانوں سے۔"

"میں کوئی کسی کو فائیل معقول تو کر نہیں رہا ہوں تو بھائی بس خدا لگتی کہتا ہوں۔" عبداللہ نے لڑائی جھگڑے سے دامن بچاتے ہوئے کہا۔

میں سڑک پر نکل گئی کہ دیکھوں کسی دور دراز موڑ سے بس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں یا نہیں۔ پھاٹک کے قریب مجھے علاقے کی تعلیم عاما کمیٹی کی نگران زمرد غنیف مل گئیں۔ سلام پیام کے بعد ہم باتیں کرتے کرتے نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ زمرد غنیف نے سر سے ریشمی رومال سرکا کر موٹی موٹی چوٹیاں درست کیں جو اس علاقے کے رواج کے مطابق سر پر لپیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے میں بیحابی سی کیفیت تھی۔ چائے خانے میں بیٹھے ہوئے مردوں میں سے کسی کی آواز آئی۔

"چار دیواری کے پاس کون ہے یہ؟"

"زمرد آپا" سماوار والے نے جواب دیا۔ اور پھر مرزا خاجا کی کھنکھناتی ہوئی آواز آئی۔ "اچھا صاحب میں تو چلا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" وہ بڑی شاہانا چال سے چلتا ہوا آہستا آہستا ہمارے قریب سے گذرا۔ زمرد غنیف کو دیکھ کر وہ سیدھے ہاتھ رکھ تعظیم جھکا۔

"بڈا کوا!" اس کے گذرنے کے بعد زمرد بڑبڑائیں "اس کا بس چلے تو ہم سب کو....."

"کزیل کوشون" پنچایتی فارم والا فصا تو سنا ہوگا تم نے۔ رحمت اللہ عثمان نے دوسری شادی کر لی۔" میں نے بتایا کہ میں نے ابھی ابھی چائے خانے میں اس کا تذکرا سنا۔

"بڑی بیوی کا نام گل جان ہے نا؟"

"اور یہ بڑی بیوی چوبیس سال کی ہے حضرت!" زمرد نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "ارے ہاں تم تو جانتی ہو گی اے! کپاس مزدور عورتوں کا وہ سمپلن یاد ہے نا؟"

"اب میں سمجھی کہ کس عورت کا قصا ہے یہ۔ بوٹے سے قد کی ایک عورت کی تصویر میری نظروں میں پھر گئی۔ شوخ اطلس کا لباس اس کے شانوں پر جھول رہا تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں حسین نہیں مانی جاتی ہوگی۔ چپٹا سانولا رنگ کچے بے تکا سا بھدا چہرا! "چاند سی صورت والی حسینا" کا چہرا تو ایسا نہیں ہوتا اور پھر چیچک کی ٹھڑی۔ گل جان کی بھوئیں ناک کے اوپر جڑی ہوئی تھیں، آنکھوں پھیلوں کی طرح ترشی ترشائی۔ انہوں نے گل جان کی چھوٹی، نگ موتی کی طرح چمکدار آنکھوں پر نیم دایرا سا بنا دیا تھا۔ ان آنکھوں کی دیکھت میں جیسے دن کی روشنی، زندگی کا رنگ اور ملاقاتوں کی مسکراہٹیں سمٹ آئی تھیں اور زندگی کے ان تمام رنگوں اور مسکراہٹوں کے جواب میں ان مخمور آنکھوں میں بڑی گرم اور بھیگی بھیگی سی چمک پیدا ہو جاتی۔

زمرد نے مجھے کہا کہ پنچایتی فارم چل کر رحمت اللہ سے بات کرو، اور میں فوراً تیار ہو گئی۔ پنچایتی فارم "کزیل کوشون" زیادا دور نہ تھا۔ ہم پیدل ہی روانا ہو گئے۔ ذرا سی دیر بعد ہم سڑک چھوڑ کر کچے رستے پر مڑ گئے۔

یہاں شاہراہ الاشور نگا اور چھل پہل نہ تھی، لیکن زندگی کی گونا گوں سرگرمیوں کا اثر یہاں بھی موجود تھا۔ مشین ٹریکٹر اسٹیشن کا ٹرک تھیرکے سازوسامان سے بھرا ہوا گذرا، منڈی کی طرف سے خالی گاڑیاں آئیں، گودام کا کفایت شعار نگراں خالی بوروں کا انبار ٹرک میں لیے گذر گیا۔

بہت سوں نے ہمیں دیکھ کر سلام علیک کیا، لیکن عام رواج کے برخلاف کسی نے بھی ہم سے نہ کہا کہ مرجا رہی ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ سب پہلے ہی جانتے ہوں کہ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ بوڑھے مالی نے ہمیں دیکھ کر بڑی اداسی سے سر ہلایا۔

شاہی حرم بہت تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے کردار کی خصوصیت تھی یہ۔ وہ ہمیشہ ناگزیر منزل کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتی تھی۔ رستے بھر وہ گل جان اور اس کے بال بچوں کا ذکر کرتی رہی۔

"بڑا عثمان گل جان سے بہت محبت کرتا ہے۔ عثمان کی چھوٹیاں ہیں، مگر ایک نے بھی اس لگن سے اس کی خدمت نہیں کی جس طرح گل جان نے کی۔ میں بڑے میاں کی شکایت نہیں کرتی، مگر ہرے بھرے پودے کو کیڑا لگ جائے تو مالی کو برا بھلا کہا ہی جاتا ہے۔ عثمان صاحب نے اولاد کی مناسب تربیت ہی نہیں کی۔ رحمت اللہ بڑا لاابالی، لاڈوں میں بگڑا ہوا اور بہت ہی خدپرست ہے، لیکن اسے کم سے کم یہ تو عقل ہونی چاہیے کہ گل جان اور بچوں کی زندگی کو اس طرح تباہ و برباد نہ کرے۔ میں اس سے بات کروں گی۔ اس خاندان کو ڈوبنے سے بچانا ہوگا۔"

ٹیلے کے موڑ پر اچانک گاؤں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ عثمان زیاموف نکڑ پر کھڑا تھا۔ بائیں باغ کے احاطے کی موٹی موٹی پکی دیوار سڑک کے ساتھ ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ پرانے رواج کے مطابق گھر کی کھڑکیاں اندر کے صحن میں کھلتی تھیں۔ چھوٹا دروازا کھلا ہوا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دروازا بڑی بیزاری اور نفرت سے چرچرا اٹھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پتے دنوں کا سایا عثمان زیاموف کے صحن میں گھس گیا۔ دائیں طرف گھر کی سنسان اور تاریک کھڑکیاں جائیں جائیں کر رہی تھیں۔

"یہیں رہتی تھیں" گل جان اور ان کے بچے۔ دیکھ رہی ہو دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔" زمرد نے گھٹی ہوئی سی آواز میں کہا اوپر بالاخانے کے بڑے کمرے میں روشنی جل رہی تھی ہم لڑکی کے زینے سے اوپر چڑھے۔ دستک دیتے ہی دروازا کھل گیا۔ دو چھوٹی بچیاں پردوں کے قریب ایک جوان کھڑا تھا، اس کے نقوش بہت نازک تھے۔ ایک حد تک نسوانیت لیے ہوئے، مگر رانا ہی گستاخی ٹپک رہی تھی۔ وہ چہرے سے بڑا جو کوئی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر ریشمی قمیص تھا۔ کمر پر ریشمی پٹکا اور پاؤں میں صاف ستھرے چکدار جوتے۔

شاہی حرم نے نیرباں کے سلام کا جواب دیا۔ خیر و عافیت کی زحمت اٹھائے بنا کھٹ سے بولی۔

"کیا کہیں مہمان جا رہے ہو رحمت اللہ؟"

"نہیں زمرد آپا، میرے ہی گھر پہ کچھ لوگ مہمان آ رہے ہیں۔" جوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظروں میں ابھی تک وہی چالاکی اور گستاخی تھی اور اس کی نگاہیں ہمارے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

شاہی حرم آپا قالین پر بیٹھ کر رومال سے چہرے کو ہوا دینے لگیں۔ تیز تیز چڑھنے سے ان کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور وہ بالکل خاموش تھیں۔

"پارٹی سکریٹری آئے تھے اور بریگیڈیر بھی۔ زمرد آپا میں جانتا تھا آپ بھی ضرور آئیں گی!"

"ہوں" زمرد نے کہا۔ "یہ تو بتاؤ رحمت اللہ کہ تم نے اپنی نئی بیوی کو بلایا کیوں نہیں ہم سے؟" جوان پل بھر کے لیے گھبرا گیا۔

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے آخر۔" اس نے اداسی سے کہا۔ پردے سرسرائے اور ایک نوجوان اور حسین لڑکی تیزی سے بھاگتی نظر آئی۔

چھت میں لٹکا ہوا جلی کا بلب مدھم مدھم روشنی بکھیر

رہا تھا۔ کمرے نہ نہ جانے اور اجاڑ پڑا تھا۔ ہر چیز گندی اور بے ترتیب پڑی نظر آ رہی تھی۔ لڑکی خدمتی سر جھاڑ مونچھ پہاڑ نظر آئی۔ رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی اور بال پریشان۔

اس کے چہرے سے بیک وقت شرمندگی اور غرور، بے چارگی اور عزم کی کیفیت جھلک رہی تھی۔ ہمارے سامنے پہنچکر وہ رکی اور اچانک جیسے چیخ اٹھی۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے بیوی بچے ہیں! ہمارا گاؤں بہت دور پہاڑوں میں ہے۔ میں نے کبھی اس کے بیوی بچوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میری بیوی مر گئی ہے....." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی زمرد غالین سے اٹھ کھڑی ہوئی، وہ کبھی سر کا رومال کھولتی اور پھر کبھی باندھنے لگتی۔

"رحمت اللہ" اس نے دھیرے سے کہا۔ "تم نے ہر طرف دھوکا ہی دھوکا دیا۔ تم نے اپنی بیوی کو دھوکا دیا، ہم سب کو اپنے ہم وطنوں کو دھوکا دیا۔ تم نے اس دکھیا لڑکی کو دھوکا دیا۔ میں پل بھر بھی تیرے گھر کی فضا میں سانس لینا نہیں چاہتی۔"

رحمت اللہ کا رنگ فق ہو گیا۔ سچ کہتی ہوں زمرد غصے کے موقعہ سے ایسی باتیں سن کر اس طرح خاموش رہ جانا ہر مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ خاموشی سے نیچے اتر گئے۔ کوئی بھی ہمیں رخصت کرنے دروازے تک نہ آیا۔

گل جان کے کمرے کی کھڑکی سے تیز روشنی چھن رہی تھی۔ "وہ آ گئی! دیکھیے دیکھیے، گل جان لوٹ آئی!" میں بے اختیار چلائی۔ زمرد نے سر ہلایا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ دروازا کھلا اور چوکھٹ پر گل جان نظر آئی۔

"کون ہے؟" اس نے اندھیرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے دوست!" زمرد نے جواب دیا۔ ہم دروازے کے اندر چلے گئے۔ کمرے میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ پلنگوں پر بچے کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ دو ایک صندوق کھلا پڑا تھا۔

"ابھی ابھی لیکی چلی آ رہی ہوں سامان باندھنا ہے" گل جان نے مختصر اپنی روداد سنائی۔ "صبح برگیڈیر نے وعدہ کیا تھا کہ سامان کے لیے موٹر بھجوا دیں گے، مگر دن میں تو وقت ہی نہیں ملتا..... ان میرے خدا! آپ کی کیا خاطر کروں بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں یہاں تو!"

گل جان ہم سے نظریں چرائے جلدی جلدی بول رہی تھی۔ بیکار ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی جیسے کمل کر بات کرنے کے خیال سے گھبرا رہی ہو۔ اور پھر اچانک جیسے اسے احساس ہوا کہ اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہے، اور وہ پھٹ پڑی۔

"میں خالا! میں خوب جانتی ہوں آپ کیوں آئی ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کیا کیا کہیں گی۔ آپ کہیں گی، گل جان خاندان کا شیرازہ نہ بکھیرو، بچوں کو باپ سے نہ چھڑاؤ، گل جان! میں جانتی ہوں میرے بھلے کو سب کہیں گی۔ آپ اس وقت سے مجھے جانتی ہیں جب میں شانوں پر چھوٹی چھوٹی چوٹیاں لٹکائے ادھر ادھر بھاگتی پھرتی تھی۔ جب آپ کے بالوں میں چاندی کا ایک تار بھی نہ تھا، لیکن اب میں پل بھر بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی! یہ عورت چلی بھی جائے، تب بھی نہیں رہوں گی۔"

گل جان تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آواز سے وہی اضطراب جھلک رہا تھا جو میں نے اس وقت بھی محسوس کیا تھا جب وہ جلسے میں تقریر کر رہی تھی....

"میں پنچایتی فارم کی سب سے گئی گذری کارکن نہیں ہوں۔ بہت سے ایسے لوگ جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ تو پھر شوہر کے گھر میں اس بھی پرانی دوری سے بدتر حیثیت کیوں ہو میری؟"

اچانک اس کی نظر زمرد خفی کے چہرے پر پڑی اور اس نے نہ جانے کیا دیکھا کہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

میں نے گل جان کو اپنے قریب کھینچ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا اور سوچ میں ڈوبی ہوئی پر خلوص آواز میں بہت آہستہ آہستہ کہا۔ ان کی یہ آواز ہمارے

گاؤں کی بہت سی عورتوں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی تھی۔

"میں تم سے وہ سب نہیں کہوں گی جو تم سمجھ رہی ہو۔ خاندان کی بنیاد تو محبت اور عزت پر ہوتی ہے" وہ کہہ رہی تھیں۔ اس کے بعد ہم نے رحمت اللہ کا ذکر کیا نہ اس کی ترکتوں کا۔ ہم گل جان سے پوچھتے رہے کہ اب اس کی گھر گرہستی کیسے چل رہی ہے، اس کے بچے پہلے کی طرح اب بھی بالک گھر جا رہے تھے نا۔ اور پھر ہم لوگ بہت دیر تک گل جان کے کام نجاتی نام کے مسلوں اور دنیا زمانے کے سوالات پر بات چیت کرتے رہے، مگر گل جان نے ہمیں ہلنے ہی نہ دیا۔ وہ ہمارے لیے چائے بنانے لگی۔ اور پھر وہ ہمیں چھوڑنے باہر آئی، مگر ہم نے اس کو کہہ سن کر اسے واپس بھیجدیا۔

"تمہیں صبح سویرے اٹھنا ہے" زمرد نے کہا۔ صبح سے شام تک کام ہی کام پڑا ہے بیٹیا!" اور میں اور زمرد آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔

"ہمارے زمانے میں رحمت اللہ جیسے آدمی کیوں پیدا ہو گئے؟" میں نے بآواز بلند سوچا۔

"میں بتاتی ہوں کیسے ہوئے۔ زمرد نے حسب معمول بڑی تیزی سے کہا۔ عثمان زیادہ سے زیادہ کے چھ بیٹوں پر پہلا ایک بیٹا ہے۔ اکلوتے بیٹے نے اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی صبح سے شام تک بس ایک ہی تراتا سنا کہ وہ خاندان کا ہیرا ہے، خاندان کا لعل ہے۔ بیٹوں نے بھی یہ راگ سنا اور باپ سے الگ تھلگ ہو گئیں۔ بیٹے صاحب خود پرستی کا شکار ہو گئے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ کام میں کسی سے ہلکا ہے:... نہیں، بلکل نہیں۔ کام بہت اچھا کرتا ہے۔ اسے نام پیدا کرنے کا بہت شوق ہے۔ رحمت اللہ جانتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے کارکن کی بڑی عزت ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ عزت حاصل کرنی ہے تو زندگی بھر اس پورے کو سینچنا پڑے گا۔ چاہے خانے بھیکر ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ عثمان عطا ابھی تک وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے لیکن اس دفعہ ان کے پاس سماوار والے کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ شاید بڑے میاں گھر جانے سے کترا رہے تھے۔ میں شہر جانے والی بس میں بیٹھ گئی، لیکن گل جان کا خیال دیر تک میرا

ملکیت وغیرہ سے متعلق تفصیلات نشر ماہوار رسالا

"ہندستانی ادب"

تحت ضابطہ۔ فارم۔۴۔ قاعدہ نمبر (۸)

۱۔ چھپائی کا مقام	حیدرآباد (دے۔پی)
۲۔ چھپائی کا وقفہ	ماہوار
۳۔ پرنٹر کا نام	مرزا عمر بیگ
قومیت	ہندستانی
پتا	کٹلمنڈی۔ حیدرآباد (دے۔پی)
۴۔ پبلشر کا نام	جی۔ام۔خان
قومیت	ہندستانی
پتا	۹۹۔اے۔اعظم پورا شرقی پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد ۵۰۰ (دے۔پی)
۵۔ ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتا	جی۔ام۔خان، (ہندستانی) ۹۹۔اے۔اعظم پورا شرقی حیدرآباد ۵۰۰
۶۔ دو مہر شریک حضرات کے نام اور پتے وغیرہ	اس کام میں ہمارا کوئی بھی شریک نہیں ہے

جی۔ام۔خان ..... اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی تفصیلات سو میں سو صحی ہیں۔

دستخط

پبلشر کی دستخط — تاریخ پہلی مارچ ۱۹۶۰ء

ہے کہ گل جان اور اس کے بچے اور ان کے بچے اور ان کے بچے اور ان

تیسرے پانچسالا پلان (منصوبے) میں سوشل ولفیر کی اہمیت

درگا بائی دیس مکھ، چیرمن سنٹرل سوشل ولفیر بورڈ

پہلے پانچسالا پلان میں حکومت نے سماجی فلاح و بہبود کی ایک ایسے موضوع کی حیثیت سے شامل کیا تھا جس کی کچھ ذمہ داریاں حکومت نے راست خدلے لی تھیں، چنانچہ مرکزی حکومت نے اس سلسلے میں سنٹرل سوشل ولفیر بورڈ قایم کر دیا تھا عورتوں، بچوں اور معذور اشخاص کی فلاح و بہبود کے کام اسی بورڈ کے سپرد کر دیے گئے تھے، لیکن فلاح و بہبود کی کچھ خدمات مختلف وزارتوں کی تحویل میں کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ شروع میں ریاستی حکومتوں نے سماجی فلاح و بہبود کی وزارتیں اور محکمے قایم کیے تھے، لیکن بعد میں سنٹرل سوشل ولفیر بورڈ کی فلاح و بہبود کے پروگراموں کو کام میں لانے کی غرض سے سوشل ولفیر ایڈوائزری بورڈ قایم کر دیا گیا۔

یہاں تمام اقدامات پہلے پلان کے آخری دو سالوں میں کیے گئے تھے اور دوسرے پلان میں صرف مختلف تجربات کو آزمایا گیا تھا کچھ عرصے تک عام سماجی خدمات اور خاص سماجی فلاح و بہبود کے درمیان امتیاز کی وضاحت بھی کرنی ضروری ہو گئی تھی۔

دوسرے پلان میں سماجی فلاح و بہبود کی صورتحال

سماجی فلاح و بہبود کی تحریک کو چند کوتاہیوں کے باعث جو نقصان پہنچا تھا، دوسرے پانچسالا پلان میں اس کا ازالہ کیا گیا اور اس کے لیے مضبوط بنیاد بھی کی گئی۔ اس سلسلے کی اہم کوتاہیاں یہ تھیں کہ پہلے پلان کی طرح سے دوسرے پلان میں بھی بہت سی ریاستی حکومتوں نے ان اسکیموں کی شمولیت کو نظر انداز کر دیا تھا جو سماجی فلاح و بہبود کے موضوع میں شامل ہونی چاہیے تھیں۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومتوں نے مالی انتظامات کو مختلف محکموں کے بجٹوں میں گڈمڈ کر دیا تھا اس لیے مختلف مالی انتظامات کو معلوم کرنا اور ان کی مجموعی حیثیت کا اندازا لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ آسام اور اڑیسا جیسی چند ایک ریاستوں میں کوئی بھی ایسا ذاتی محکمہ قایم نہ تھا جس کے سپرد اسکیموں کی پلاننگ، نگرانی اور تال میل کا کام ہوتا۔ اور بہت سی ریاستی حکومتیں پلان سے متعلق مالیات کے موجودا انتظامات سے بھی ناواقف تھیں اور مخصوص رقم کی ایک بہت بڑے جز کو استعمال نہیں کیا گیا تھا جس میں نوجوانوں کی فلاح، بہبود اور سنگر ڈے ولے اور ازموں کی فلاح و بہبود کے بارے میں رقوم شامل تھیں۔

بنیادی مقصد

تیسرے پانچسالا منصوبے میں اگرچہ اغراض و مقاصد وہی رہیں گے جو پہلے دونوں پلانوں کے دوران میں وضع کیے گئے تھے، انتظامیہ اور پروگراموں میں ماضی کے تجربات کی روشنی میں کچھ ردوبدل منظور کیا جائے گا۔ بنیادی مقصد یہ رہے گا کہ موجودا سروسوں کو مجتمع کیا جائے۔ سماجی فلاح و بہبود کے کام میں مشغول تمام اداروں کی جدوجہد میں ربط قایم کیا جائے تاکہ اس کام سے مستفید ہونے والے اشخاص یا طبقوں کو زیادا سے زیادا فایدا پہنچے۔ اس کے علاوا مقصد بھی ہوگا کہ فلاح و بہبود کی تمام متعلقا سروسوں کو سماجی فلاح و بہبود کے تحت کر دیا جائے۔

سماجی فلاح و بہبود کی ترقی کے لیے جو محدود وسایل میسر ہیں، ان کے پیش نظر سماجی فلاح و بہبود کے ورکنگ گروپ نے کچھ ترجیحات بھی تجویز کی ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادا توجہ بچوں کی ضروریات پر دی گئی ہے، کیونکہ بچے قوم کا سب سے زیادا اہم اثاثا ہیں۔ بچوں کی فلاح و بہبود کی سرویسیں ربوط طریقے سے خدمات سرانجام دیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی خاص خاص ضروریات، فلاح و بہبود کے پروگراموں

کے ذریعے پورے کرنیکی تجویز ہے۔ بچوں کے متعلق جو امور سوشل ویلفیر کے ذیل میں آتے ہیں ان میں اسکول سے پہلے کی تعلیم، وہ بچے جن کی صحت کی مہریں ہیں اور وہ مہریں جن کی ادائی مہریں سماجی یا اخلاقی خطرات میں پڑنے والے بچوں کیلئے مہریں، جسمانی اور دماغی لحاظ سے معذور بچوں کی مہریں اور جرم پیشہ کی مہریں شامل ہوں گی۔

عورتوں کی فلاح و بہبود

عورتوں کی ضروریات خصوصاً تعلیم اور روزگار کے ایسے مواقع کو دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے جن کی بدولت عورتیں سماج میں اپنا پورا مرتبا حاصل کر سکیں ہو جائیں گی۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو اسکیمیں تجویز کی گئی ہیں ان میں سماجی اقتصادی پروگرام، امتحانات کی تیاری کیلئے تربیت کے جامع پیمانے کام کرنیوالی عورتوں کیلئے ہوسٹل، قلیل آمدنی والے طبقوں کیلئے سستے مکانات کے انتظامات اور حاجت مند عورتوں کیلئے قانونی امداد کا انتظام کرنا شامل ہیں۔ فلاح و بہبود کی توسیع کیلئے پروجیکٹوں کا پروگرام سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے پہلے پانچسالہ پلان کے دوران میں شروع کیا تھا اور اس میں دیہی علاقوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اب اس پروگرام کو تیسرے پانچسالہ پلان کے دوران میں اجتماعی ترقی کے پروگراموں کے تال میل کیساتھ تمام ملک میں جاری کرنے کی تجویز ہے۔

سماجی دفاعی اسکیمیں

سماجی دفاع کی ایک اہم زمرے کو وسیع کرنے کی تجویز ہے وہ سماجی دفاع کا شعبہ ہے۔ اس شعبے میں نوعمر مجرموں کے انسداد اور انطلاق کی مہریں اور ان امراض عضوی بیماریوں کے متعلق پروگرام انسداد بیدادفروشی کے قانون کا نفاذ، بھیک مانگنے کا انسداد جیلخانوں میں فلاح و بہبود کی مہریں خصوصی قیدخانوں میں عورتوں اور ان کے بچوں کیلئے مہریں شامل ہیں۔ پہلے دو پانچسالہ پلانوں کے تجربے میں تیسرے پانچسالہ پلان میں جسمانی اور دماغی اعتبار سے معذور لوگوں پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے گی۔ اس زمرے میں اندھے، بہرے، گونگے، لولے لنگڑے، بوڑھے اور کمزور افراد شامل ہیں۔ فلاح و بہبود کی جو مہریں پہلی مرتبا تیسرے پانچسالہ پلان میں شامل کرنیکی تجویز ہے۔ ان میں غیر طالب علم نوجوانوں کیلئے فلاح و بہبود کی مہریں، مثلاً نوجوانوں کے ہوسٹل، لیڈرشپ کی تربیت، زراعت اور دستکاریوں وغیرہ کی تربیت اور گندے علاقوں کے لئے فلاح و بہبود کی مہریں شامل ہیں۔ گندے علاقوں کی صفائی کے شعبے میں فلاح و بہبود کے شعبوں کیلئے خاص مالی انتظامات کرنے کی تجویز ہے۔

عملے کی تربیت

فلاح و بہبود کے پروگراموں کے مختلف شعبوں میں، علاوہ زائد افزوں تعداد میں درکار ہوگا۔ اسلئے فلاح و بہبود کے عملے کی تربیت پر خاص توجہ دیجائیگی۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مختلف سطحوں سے متعلق فلاح و بہبود کے عملے کی تربیت کے معیاروں کو زیادا بلند کرنے کی غرض سے ایک مرکزی ادارا قائم کیا جائے جو تربیت کے مختلف پروگراموں کی معیار بندی کرے۔ چنانچہ اس شعبے میں تحقیق اور جائزے کیلئے کافی رقم مخصوص کرنیکی سفارش کی گئی ہے۔ بعض ضروری معاملات پر پہلے ہی سے توجہ دیجارہی ہے مثلاً سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ زرامداد دینے کی غرض سے آیا، عام نہم دستور مرتب کر رہا ہے جو تمام رضاکار اداروں کیلئے قابل عمل ہوگا۔ اس کے علاوا ایک مبدانی مشاورتی مہرس کا خاکا مرتب کیا جارہا ہے یہ مہرس سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں کام کرنیوالے اداروں کیلئے مسلسل تال میل پیدا کریگی۔ پلان پروجیکٹوں کی کمیٹی نے سماجی فلاح و بہبود کی ایک مطالعا ٹیم مقرر کی تھی۔ اس ٹیم نے رضاکار اداروں کے بارے میں ایک اہم سفارش یہ کی ہے کہ ان اداروں کو بھی اس طریقے سے منظر کیا جائے جس طریقے سے آجکل تعلیمی اداروں کو منظور کیا جاتا ہے۔ ان اداروں کو ریاستی حکومتیں سماجی فلاح و بہبود کے ریاستی مشاورتی بورڈوں کی وساطت سے مستقل طور پر سالانا زرامداد دیں اور سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ تربیتی پروگرام اخراجات کیلئے زرامداد دے۔ یہ ایک بہت اہم سفارش ہوگی اور امکان بھرا سے جلد اختیار کر لینا چاہیے۔ اس سفارش کی

"آج کے مدرس کا جواب" اصابت کوہری

ہے بجا ہم قوم کی تقدیر کے معمار ہیں
اپنے مسلک کے فقط ہم حاشیہ بردار ہیں

پہنچی مغرب کے اندھیروں میں تھی ہم سے ہی ضیاء
تھے سلف اپنے جنہوں نے ہند کو اونچا کیا
ہر زمانے میں ہر اک ذی فہم نے یہ ہے کہا
"منزل انسانیت کا ہند ہی ہے رہنما"

قوم کی بدبختی ہے، جو آج ہیں عزت نہیں
قوم میں بے غیرتی ہے، پہلی سی غیرت نہیں
اپنے استادوں سے اب وہ شفقت و الفت نہیں
کامیابی چاہیے، منظور ہا نہیں محنت نہیں

معاوضہ گھٹانا ہر دم آپ کا شیوا ہوا
کر کے نفرت دل بٹھانا آپ کا شیوا ہوا
بے وجہ باتیں بنانا آپ کا شیوا ہوا
خواہ مخواہ تہمت لگانا آپ کا شیوا ہوا

علم کی خود باقی اب پہلی سی وہ رفعت نہیں
علم تو موجود ہے، حاصل کرنے کی قدرت نہیں
جستجوئے علم کی پاکیزہ وہ خصلت نہیں
علم سے ہٹ کر پیشے کی کوئی صورت نہیں

ہے بجا ہم قوم کی تقدیر کے معمار ہیں
اپنے مسلک کے فقط ہم حاشیہ بردار ہیں

راستی کو رکھ دیا خود قوم نے بالائے طاق
اپنے مقصد کیلیے ہر شخص ہے چوبند و چاق
لیڈروں میں قوم کے اب وہ نہیں ہے اتفاق
قوم کا پھر کس طرح ہو دور یہ بغض و نفاق

روح کا کس کو خیال ہے فکر ہے بس جسم کی
اتحاد افضل ہے، پوشاک ہو ہزاروں قسم کی
اصل ہیں افعال ہی عادت نہیں کچھ اسم کی
بے ثمر ہیں آپ، ہے تعلیم ہی اس قسم کی

کہہ دیا کس نے اب تعمیر ہو سکتی نہیں
قدر ہو معمار کی تا قیام ہو سکتی نہیں
صرف باتوں میں کوئی تاثیم ہو سکتی نہیں
ایسے بدخوابوں کی تعبیم ہو سکتی نہیں

قوم کی اولاد ہی اس قوم کا ہوتی ہے دھن
فرض ہے سب کا سنواریں اس کا اب چال و چلن
پہلے ہے لازم کہ آسودہ ہو معمار وطن
تاکہ پوری طرح اس جانب لگے اس کا ذہن

رہ نشد تو نہ، فتاح ہو ۱۱ حاصل ہو،

ہمارے بھی ہیں مہربان کیسے کیسے!

صاحب کو ہیری (منشی فاضل)
۵۲۵ - جلا کوچہ
حیدرآباد ۲ - آندھراپردیش

مکرمی تسلیم!

آپ کے پرچے کی اگست ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں "رانا گورکھپوری" کی ایک نظم "آج کے استاد سے خطاب" نظر سے گذری۔ آپ ہی کے حوالے کے بموجب یہ نظم رہنمائے تعلیم میں شایع ہوئی تھی۔ مذکورہ رسالے کے ایڈیٹر "ابر احسنی گنوری" نے جس ٹوٹ کے ساتھ اس کو شایع کیا تھا وہ بھی آپ نے شایع کیا۔ موصوف نے تو میں جو حقیقت اور واقعات نظائر پیش کی ہیں وہ قابل توجہ ہیں اس کے باوجود مصرف ہوطنی کے وقت انہوں نے اس نظم کو شایع کیا ہے۔

"ابر احسنی گنوری" کا کردار کے عنوان سے جو مضمون اس اشاعت میں شایع ہوا ہے اس پر آپنے جو نوٹ لکھا ہے اس میں مدیر کا اعتراف ہے کہ "ہندستانی ادب" کا یہ اداریہ تعلق "یونیورسٹیوں کے طلبا" اور "کالجوں اسکولوں اور پرائیوٹ لائبریریوں اور ریڈنگ روم" سے ہے، جہاں لازمی طور پر اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

"بیلہ ریڈنگ روم" شاہ گنج میں جس کا میں بھی ممبر ہوں یہ نظم میری نظر سے گذری اور اس کے بعد دو سے زیادہ بہت سے ساتھیوں نے اس کا ذکر کیا۔ بہ حیثیت مدرس ہونے کے میں بھی کچھ متاثر ہوا کہ پورا دوش آج کے روح فرسا حالات سے آنکھیں بند کر کے مدرس کے سر پر ڈالدیا گیا ہے۔ عام طور پر مدرس برادری میں عدم دلچسپی پائی جاتی ہے لیکن آج زندگی کا کون سا شعبہ پاک و صاف ہے، عناصر جیسا ہوگا اسی قبیل کے افراد ہوں گے۔ اور جو طالب علم اس معاشرے سے نکلیں گے وہ مزید برائیاں لیے ہوئے نکلیں گے۔ ان کے گرد و پیش ہر برائی اور بدکرداری کے سیکڑوں رستے دعوت خرام دیتے رہتے ہیں۔ غرض یہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔

فی الحال یہ عرض ہے کہ ؎

"امر بمعروف نگفتہ تا شد — عیب و نہی منکر نہفتہ باشد
ہر پیشہ گماں مبر کہ خالیست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

اس پیشے میں اب بھی اہل کردار اور صاحب علم موجود ہیں لیکن "خواہی نشوی رسوا ہمرنگ جماعت شو" کے اصول پر کاربند ہیں، کیونکہ ؎

پیچے عقیل خویش نداند کہ دد — آنے را کہ بد کند نیکو باشد

مختصر یہ کہ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ مدرس برادری کی اشک شوئی اور اپنے ضمیر کی تسکین کی خاطر کچھ لکھوں۔ یوں تو بہت کچھ مواد موجود تھا، لیکن میں نے "رانا گورکھپوری" صاحب کے ہی ردیف و قوافی کو برقرار رکھ کر مضامین و خیالات بدل دیے ہیں امید کہ جناب اس نوٹ کے ساتھ اس نظم کو شایع کر کے طبقۂ اساتذہ کی نمایندگی فرمائیں گے۔ — صاحب

★ اوپر بیان کی گئی نظم اس نمبر میں پیش ہے۔ ایڈیٹر

ہاتی تھان - شاہجہاں پور (یو۔پی)
۵ر جنوری ۱۹۶۰ء

مکرمی تسلیم! آپ کا تعزیتی پوسٹ کارڈ موصول ہوا آپنے والد مرحوم کے ساتھ دعائیہ الفاظ میں ہم لوگوں سے اظہار ہمدردی فرمایا ہے اس کا شکریہ قبول فرمایئے۔

والد مرحوم کے متعلق لکھنؤ کے اخبار قومی آواز میں فانا اختر علی تہری کا ایک مضمون شایع ہوا تھا فی الحال اس کی ایک نقل ارسال ہے براہ کرم اگلے نمبر میں مع اپنے نوٹ کے اس کو شایع کر دیجئے ساتھ ہی ساتھ ان کے آخری دور کی ایک غزل بھی منسلک ہے۔ اپنی چند رباعیاں وجہ دقت سے متعلق ہیں ارسال کر رہا ہوں اگر آپ کی نظر میں مناسب ہوں تو شایع فرمادیجئے گا۔

نیازمند — شفیق مینائی

آپ کی رباعیاں مجبوریاں ہیں شامل نہ ہو سکیں، جو ضروری کہ پرچے میں شامل کر لی جائیں — ایڈیٹر

ع۔ ام۔ خاں ۔ مطبع ابراہیمیہ کٹلی سنڈی حیدرآباد ۱ میں چھپوایا۔

حیدرآباد۔۲ آندھراپردیش
Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN.)
U
27/

سندھ ساگر

پیر حسام الدین راشدی

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)
جلد (۲۰)
نمبر (۷)
چندا سالانا آٹھ روپے
سنہ ۱۳۶۹ف
خرداد
سنہ ۱۹۶۰ء
اپریل

ہندستانی ادب

حیدرآباد ۱ - آندھرا پردیش
ایڈیٹر - جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت الفقر موہانی وارثی	۳	
۳	غزل	ناغداے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۴	
۴	مقصود	نریش کمار شاد	۵	شاعر
۵	غالب	رشید کیفی	۶	خیال
۶	شکار ماہی	شاد عارفی	۷	افکار
۷	دلہا داماد سے	اختر واصفی	۸	جد و جہد
۸	نسیم سحر	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۹	قومی زبان
۹	محمد علی - جدید مصر کا بانی	محمود الحسن ندوی	۱۲	برہان
۱۰	غزل	ڈاکٹر مانا پرشاد نیر بریلوی	۱۶	رہنماے تعلیم
۱۱	روشن دان	ظفر محمود الدانشی	۱۷	شہنامہ
۱۲	ہندستان کی تعمیر تاریخ بنانے میں کتبات کا کردار	ڈاکٹر بہادر چند چھابڑا	۲۱	
۱۳	ہار جیت	عفت موہانی ام - اے	۲۴	حریم
۱۴	ذوق بحیثیت ایک حرماں نصیب شاعر	ظفر احمد	۲۸	
۱۵	ساہتیا اکاڈیمی (دہلی) کی غلط کارگذاریاں	اسرک آنند ایڈیٹر "پگڈنڈی"	۳۰	پگڈنڈی

ہمارے خیالات

پروکٹوریل کورٹس PROCTOR COURTS

برطانیا کی بعض یونیورسٹیوں میں پروکٹر کورٹس کا طریقہ رائج ہے۔ اس طریقے میں پروکٹر کو مجسٹریٹ کے اختیارات دیے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر طلبا قانونی خلاف ورزیاں کریں تو انہیں پروکٹر کورٹ میں پیش کرکے مناسب سزا دلائی جائے، تاکہ وہ دوسرے طالب علم اس سے سبق حاصل کریں اور یونیورسٹی کے احاطے میں امن اور ڈسپلن قایم رہے۔ لڑکیوں کے مقدموں کے سننے کے لیے عورت پروکٹر مجسٹریٹ کو مقرر کیا جاتا ہے۔

یہ طریقہ بہت ہی اچھا ہے، اس لیے کہ یونیورسٹی کے طلبا قانون کے خلاف عملی کرنے کے باوجود عام عدالتوں میں جانے سے بچ رہتے ہیں۔ اس طریقے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پروکٹر مجسٹریٹ کورٹ میں، یونیورسٹی طلبا کی موجودگی میں مجرم طالب علم پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اگر جرم ثابت ہو تو قانون کی روشنی میں سزا دیجاتی ہے، ورنہ اس کو بری کردیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے دوسرے طلبا پر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے، اور وہ غیر قانونی حرکتیں کرنے سے امکان بھر بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خبر ہے کہ دلی یونیورسٹی میں بھی پروکٹر مجسٹریٹ کا طریقہ رایج کیا جانے والا ہے، اور اس کی بھی اطلاع ہے کہ دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے برطانوی پروکٹر کورٹ کے اصول سے ہٹ کر قواعد وضوابط بنائے ہیں۔ یہ بڑی اچھی چیز ہے، اس لیے کہ ہماری ہر چیز اپنے ماحول کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم برطانوی یا کسی اور ملک کے بہتر اصولوں کو بنیاد قرار دیں، اور انہیں اپنے قواعد وضوابط کے سانچوں میں ڈھال لیں۔

اس بھید اسکیم کے چلانے کے لیے وائس چانسلر نے طلبا کی ایک جماعت بنائی ہے، جس کا کام یہ ہوگا کہ یونیورسٹی کے تمام طالب علموں کے اعمال کا جایزہ لے۔ اگر کسی طالب علم سے قانونی خلاف ورزی ثابت ہو تو اس کی اطلاع وائس چانسلر کو دی جائے۔ وائس چانسلر کی اجازت کے بعد اس مجرم لڑکے کا مقدما مقررہ طریقے کے مطابق پروکٹر کورٹ میں پیش ہوگا۔ اس طریقے میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جان بوجھ کر تاخیر کرنے والی جماعت وائس چانسلر کے ہاں کوئی غلط رپورٹ پیش نہیں کرسکتی۔

پروکٹر کورٹس کا طریقہ بڑا ہی اچھا ہے، ہم دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے اس فیصلے کا سواگت کرتے ہیں۔ ہمیں آشا ہے کہ ہندستان کی دوسری یونیورسٹیاں بھی اس سنہرے اصول پر ضرور عمل کریں گی۔ اس طریقے کے رایج کرنے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ہونہار طلبا کے بعض برے کارنامے منظر عام پر آنے سے بچ رہیں گے۔ ان کی آیندہ زندگی میں کردار بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی، اگر بعض نادان طلبا سے قانونی بھول چوک ہو جائے تو انہیں اس کی سزا یونیورسٹی کی عدالت میں مل جاتی ہے۔ اس سے انہیں سبق بھی ملتا ہے اور ساتھ ہی ان کی اخلاقی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں یونیورسٹی کے احاطے کے اندر رہتی ہیں، اور جب پروکٹر کورٹ کا سزا یافتہ طالب علم یونیورسٹی چھوڑ کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہاں اس کا کردار بے داغ ہی رہتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر یونیورسٹی کے کسی مجرم طالب علم کو عام عدالت میں سزا ملے تو اس کے کردار پر دھبا آجائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ایسے سزا یافتہ طالب علم کو نشوا یو کا سامنا کرنا پڑے، بلکہ بعض شکلوں میں تو اسے صاف انکاری جواب مل جائے گا۔

بہرحال یونیورسٹیوں کے طلبا کی بھلائی اور بہتری کے نقطۂ نظر سے پروکٹر کورٹس کا قیام نہایت ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ عثمانیا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہمارے ان وچاروں پر ضرور دھیان دیں گے، اور اس یونیورسٹی میں بھی پروکٹر کورٹ قایم کریں گے۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش کی دوسری یونیورسٹیوں میں پروکٹر کورٹس قایم ہونے



کیا سماں دیکھا بہار نے آکر دکھا دیا
ہیرا نشیمن آتش گل نے جلا دیا
ذوق سجود نے اثر اپنا دکھا دیا
ہر نقش پا کو آستاں ان کا بنا دیا
دیکھا سفینہ کو ساحل کے جب قریب
ساحل کو بڑھ کے موجوں نے طوفاں بنا دیا
تیری عطا کا میری طلب کا شمار کیا
بندہ ہوں تیرا تو نے مجھے جو دیا دیا
ہیں خود ہی اپنی ہستی کو بھولا ہوا ہوں جب
پھر کیا کہوں کہ آپ نے مجھ کو بھلا دیا
دنیا اسی کا نام ہے دار المحن ہے یہ
اک غم نہ مٹ سکا تھا کہ غم دوسرا دیا
اے دینے والے تیری عنایت کے ہیں نثار
دل بھی دیا ہو تو نے تو درد آشنا دیا
کب بارگاہ عشق سے خالی پھرا کوئی
مجھ کو اگر صنم نہ دیا تو خدا دیا
اس التفات خاص کے قربان جائیے
خود اٹھ کے اس نے بزم سے مجھکو اٹھا دیا
نا آشنا سے سجدہ تھی میری جبیں جسے
اس آستاں نے سجدے کے قابل بنا دیا
اک سر سے قتل کرنے کا اللہ رے اہتمام
ہر اک ادا کو یار نے حکم قضا دیا
آتے ہیں لوگ نقش کف پا کو دیکھنے
تربت کو میری یار نے تربت بنا دیا
شرمندۂ مسیح نہ افقر کیا مجھے
اس نے دیا جو درد بھی لاد وا دیا

لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی

غزل

ہر کسی کے عشق میں یہ کام کرنے جائیں گے
قتل کی حسرت میں ہم یہ کام کرتے جائیں گے

غیر ممکن ہے کہ بدلے باغ فطرت کا نظام
ہاں یہیں کہنا ہمارا اس کو مانیں گے نہ ہم

ہو سکے گا یا نہ ہو اے دل کا جتنا بھی علاج
کر چکے وہ سب کا ماتم رکھ چکے وہ سب کا لاج

روکے دے گا کون ان کو یہ جسارت کس میں ہے
نالہ و فریاد و شیون ان کا ٹھہرا شغلہ

زندگی بھر دل لگانے سے نہ باز آئیں گے ہم
شام ہو گی صبح ہو گی صبح سے پھر ہو گی شام

نوح یہ طوفاں اٹھانے پہ نہیں کچھ منحصر
مر چکے ہیں مر رہے ہیں اور مرتے جائیں گے

دم میں جب تک دم ہے دم فیضر کا بھرتے جائیں گے
گل سو رنگ جائیں گے غنچے نکھرتے جائیں گے

جی میں جو آئے گی اپنی ہاں وہ کرتے جائیں گے
لالہ و گل کی طرح پیہم ابھرتے جائیں گے

روز یوں ہی چاہنے والے جو مرتے جائیں گے
تیر ناز ان کے مرے دل سے گذرتے جائیں گے

اپنے اپنے کام اہل عشق کرتے جائیں گے
اس کے یہ معنی ہوئے بے موت مرتے جائیں گے

عمر کے ایام اپنے یوں گذرتے جائیں گے
اک نہ اک الزام مر سر وہ دھرتے جائیں گے

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی

مفدور

نذیش مکلا — شاذ

(ایک نوجوان دوست کی خودکشی کی خبر سن کر)

مرے ندیم! تری زندگی کے چہرے پر
ترا نصیب لکھے تھے ریگ زاروں کے

تجھے خبر ہے تری پیاس کے تجسس کو
کوئی بھی پھول نہ تھا تیری رہگذاروں میں

تجھے یہ غم تھا تری ننھی اُمنگوں سے
تری نگاہ تو خوش رنگ ہے بہت لیکن

شدید ہو کے اسی ایک غم کی تلخی نے
یہ زہر ہضم نہ جب کر سکا شعور ترا

مگر یہ تیری ہلاکت ثبوت ہے اس کا
تو اپنی ذات میں محبوس ہو گیا، ورنہ

غم حیات سے لطف حیات ملتا ہے
جہاد زیست میں مشکل ہے مرد جنا ہی

تری نگاہ مصائب کی دھوپ میں تپ کر
کچھ اور دیر بھڑکتی اگر یہ پیاس تری

تھکن تھی درد کا احساس تھا اداسی تھی
بہت حسیں تھے، مگر تیری روح پیاسی تھی

خلوص و مہر کے چشمے ہیں سراب ترے
جہاں کہیں بھی گیا زخم بے حساب ترے

یہ کائنات ہم آہنگ کیوں نہیں ہوتی
حیات اتنی ہی خوش رنگ کیوں نہیں ہوتی

ترے شعور میں نفرت کا زہر بھر ڈالا
خود اپنے آپ کو تو نے ہلاک کر ڈالا

کہ جد و جہد مسلسل ترا شعار نہ تھی
یہ کائنات کچھ اتنی بھی ناگوار نہ تھی

غم حیات کا حاصل نہیں ہے مر جانا
جہاد زیست میں مشکل نہیں ہے مر جانا

خود اپنے رنگ میں دنیا کو ڈھال سکتی تھی
پہاڑ کاٹ کے چشمے نکال سکتی تھی

میں تیری موت پہ رونے کو رو تو سکتا ہوں
مگر قبول نہیں زندگی سے تیرا گریز
بقول شاعر مشرق مرا تو مسلک ہے
"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"

غالب

راشید کیفی

اے کلیم طور معنی اے حکیم نکتہ داں
اے خداوند سخن اے غالب معجز بیاں
اے کہ تیری ذات وجہ نازش ہندوستاں
اے کہ نازاں ہے تری تحریر پر اردو زباں

کھل رہے ہیں لب تری مدحت سرائی کیلئے
عجز نطق آمادہ ہے معجز نمائی کے لیے

یوں تو سنتے آئے تھے مدت سے آواز سخن
تو نے اس انداز سے چھیڑا اگر ساز سخن
رفعت افلاک کو پہنچی آئی پرواز سخن
اہل گیتی پر کھلے معنی اعجاز سخن

شعر کا بے جا پیکر نغمہ گانی پا گیا
تھا جو فانی وہ حیات جاودانی پا گیا

فارسی کا ذوق اہل ہند میں باقی نہیں
اور اگر ہے تو تجھ سا اب کوئی ساقی نہیں
دلربا اردو تک تری محدود خلاقی نہیں
خود ترا دعویٰ ہے یہ مضمون الحانی نہیں

"فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست"

اپنی فطرت کا تجھے احساس تھا آغاز سے
جانتا تھا تو کہ مستقبل ہے شہرت کی اساس
گو ذرا تاخیر سے داد سخن کی تھی نہ آس
پھر بھی کہہ اٹھی تری خوش اعتمادی بے ہراس

"کوکبم را دیدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

تو نے بتلایا کہ فکر صرف زیر و بم نہیں
تو نے سمجھایا کہ دنیا عرصۂ ماتم نہیں
زندگی میں شادمانی بھی ہے غم ہی غم نہیں
تجھ سے بڑھ کر بذلہ سنجی کا کوئی مجرم نہیں

ہے تری تحریر میں ترکیب اجزائے لطیف
تیرے حالی نے کہا ہے تجھ کو "حیوان ظریف"

تو نے دکھلایا کہ مر مر کے جیا کرتے ہیں یوں
اہل ہمت رنج و غم میں مسکرایا کرتے ہیں یوں
زندگی کی تلخیوں کو مسکرا لیا کرتے ہیں یوں
سختیوں کو موت کی آساں کیا کرتے ہیں یوں

"بے تکلف در بلا بودن بہ از ہم طالت
تحفہ دریا سلسبیل و روئے دوہا آشفت"

نطق و لکنت کے سبب مسند نشین دل ہے تو
رشک عرفی فخر طالب ہمسر بیدل ہے تو
سچ تو یہ ہے آپ اپنی ذات سے محفل ہے تو
ہے جدا ان سب سے گو اس بزم میں شامل ہے تو

"ہم بعالم زاہل عالم برکنار افتادہ
چوں الف تنہا سجدہ بیروں از شمار افتادہ"

تھا جدا اہل جہاں سے مسلک و شیوہ ترا
الفت و اخلاص سے معمور تھا سینہ ترا
تنگ ظرفی سے ہوا امن نہ آلودہ ترا
گونجتا ہے آج تک کانوں میں یہ نغمہ ترا

"خوش بود گلخن زبند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن"

کاش یہ مسلک ترا ہندوستاں میں عام ہو
ہر قفس میں عام ہو ہر آشیاں میں عام ہو
محفل یزداں میں ایوان بتاں میں عام ہو
ایک ہندستان کیا سارے جہاں میں عام ہو

"دہر دوخوابست می خواہم کہ بیدارش کنم
پارۂ غوغائے محشر کو کہ در کارش کنم

شکر ماہی

عارف

رات بھر ایک جھیل پر "جھک مار کر"
صبح کو پلٹا ہوں۔ ہمت ہار کر
دل میں ہے "مچھلی نہ پھنسنے کی جلن"
ہیں وبالِ جان "تیرِ شستیں" و "ڈگن"
کوششیں برباد جانے کا ملال
جاگنے کا، اوس کھانے کا ملال
"مصروف تعطیل" کی بے حاصلی
رات بھر کوفے پہ اک "لاچی" ملی
اپنی استادی کے دعووں کا لحاظ
شرط کا افسوس، وعدوں کا لحاظ
دوستوں کے مسکرانے کا خیال
"طنز گوئی" یا تیں بنانے کا خیال
ایک ... وہ حضرت، کس قدر مہمل سوال
دوسرا ... اس جھیل کے سارے سوال!!
تیسرا ... دیکھیں چلو وہ ڈھیر بھی
جس میں کچھ "روہو" بھی ہیں "ماشیر" بھی
چائے کی عادت سے "تنگ آیا ہوا"
پائے "پامردی" میں "لنگ آیا ہوا"
پھر سے پگڈنڈیاں، شیطان کی آنت
عاجزی ... رہ رہ کے چمکاتی ہے دانت
ڈاک بنگلے کا تصور .... الاماں
"منزلِ مقصود پر طاری دھواں"
کھل گیا اک بوٹ کا فیتہ مگر
جھک نہیں سکتی نقاہت سے کمر
باڑھ کے جھاڑ جھنکاڑ چلے آتے ہیں ساتھ
کون ڈالے کوٹ کے دامن پہ ہاتھ
دور کرنی چاہتا ہوں دل کی جھانجھ
ڈھالتا ہوں شعر میں منزل کی جھانجھ
جب نہیں ملتا شکاری کو شکار
سامنے جو آئے کر دیتا ہے وار
یعنی آ پہنچا ہے وہ موضع قریب
بس رہے ہیں جس میں دہقانی غریب
حلقہ ہائے بنگ ہیں یہ گاؤں ہے
چھپروں میں "نیستی" کی چھاؤں ہے
"راستہ ناپید" کیچڑ بے حساب
پاؤں بہکا ... موچ ... اور کیڑا خراب
پاس ہی مندر کے وہ تالاب ہے
جس میں پانی کی جگہ تیزاب ہے
مچھروں کا مامن و مسکن ہے یہ
"نقضِ صحت" کے لیے دیرین ہے یہ
وہ کنواں کہتے ہیں جل داتا جسے
"آبِ حیواں" بھی نہیں پاتا جسے
ہو چکی جس کی "جگت جذب زمیں"
عقل کہتی ہے ... علامت کچھ نہیں
آدمی ... جس سے ... نہاتا ہے یہاں
پھر وہ پانی "چوس لیتا ہے کنواں
پاک ہونے کے لیے آتے ہیں لوگ
اور بھی ناپاک ہو جاتے ہیں لوگ
بے در و دیوار سا۔ ہر گھر یہاں
قصرِ سرمایہ کا "پس منظر" یہاں
رہتے ہیں کیٹوں میں یکجا "گاؤ خر"
"پونڈ" میں انسان آتے ہیں نظر
یہ ہمارے بھائی وہ دہقان ہیں
جن کے ہم پر "سیکڑوں" احسان ہیں
ہو چکا "ان کی طمانیت" کا ناس
ہر گھڑی .... فکر بقایا ... آس پاس
کھا چکا کھیتوں کی پیداوار سود
قرض پر دارومدارِ ہست و بود
روز افزوں "مہرِ بہرہ کاری" کی مد
اور اس کے بعد پٹواری کی زد
رات بھر اک جھیل پر "جھک مار کر"
صبح کو پلٹا ہوں ہمت ہار کر

دلہا دادا سے

اختر واصفی

مبارک ہو مرے بیٹے تجھے شادی مبارک ہو
بفضل حق تعالیٰ خانہ آبادی مبارک ہو
بلاشک و شبہ قسمت ہے یاور خوب ہی تیری
کہ تجھ کو مل گئی صد ناز نیواں مل گئی بیوی
نہیں ہے خود ستائی اور غلو اس میں مدامت ہے
مری پوتی بڑی ہی نیک سیرت پاک طینت ہے
بوقت سنگنی میں نے کہا جب اس سے اے بیٹا
بتا کیا رائے ہے تیری تو یوں کہنے لگی ابا
رضا ماں باپ کی ہے جو وہی ہے بس رضا میری
سر تسلیم خم ہے پوچھتے ہو رائے کیا میری
اگر ارشاد ہو تو کو دجاؤں گی سمندر میں
سمجھ لوں گی کہ لکھا تھا یہی میرے مقدر میں
مجھے جس گھر میں دیدو گے اسی گھر میں ہو گی میں
اسی گھر میں جیوں گی میں اسی گھر میں مروں گی میں
مرا ایمان ہے عرض و ہوا ہی روک ہیں دل کا
سوا صبر و قناعت کے سکون دل نہیں ملتا
ہوس مٹتی نہیں کہتے ہیں قارون کے خزانے سے
مٹا دوں گی اسے یکسر غنا کے تازیانے سے
ادا اپنے فرائض یوں کروں گی جاں فشانی سے
سبق لیں گی بنات قوم میری زندگانی سے
مجھے سنکر بہت حیرت ہوئی اس کے خیالوں پر
بزرگی عقل پر موقوف ہے بیشک نہ سالوں پر
کب ایسی بیویاں ہر مرد کو دنیا میں ملتی ہیں
یہ کلیاں خوش نصیبوں ہی کے گلزاروں میں کھلتی ہیں
بجائے جا خوشی کے شادیانے ہاں بجائے جا
مسرت کی گھڑی ہے یہ نہ رو گوہر لٹائے جا
نہ ہو گر بار خاطر تو مری بھی اک گذارش سن
حقیقت ہے نہیں ہے کوئی ناجائز عارش سن
سیانوں سے بڑھ کے بیوی تحفہ شادی ان کرتی ہے
وہ دولت صرف کرتا ہے یہ جاں قربان کرتی ہے
وطن بھائی بہن ماں باپ سب کچھ چھوڑ دیتی ہے
یہ شوہر کے لیے دنیا کے رشتے توڑ دیتی ہے
وہ اس کا ہو گیا تو ہو گئی بس حق رسی اس کی
وگرنہ قابل صد رحم ہے پھر زندگی اس کی
ہے نازک صنف اس کا شیشۂ دل ٹوٹ جاتا ہے
جو سچ پوچھو تو چھوئی بیماری کا مقدر پھوٹ جاتا ہے
مری بچی بہت حساس ہے اور بھولی بھالی ہے
نہ ہو کیوں لاڈلی نازنیم سے میں نے پالی ہے
یہ ہے نور نظر میری تو اماں کی دلاری ہے
بہن بھائیوں کو بھی دنیا کی ہر اک شے سے پیاری ہے
جدا اب اس کو ہم سب باول ناشاد کرتے ہیں
بٹا کر اپنے گھر کو گھر ترا آباد کرتے ہیں
تجھے لخت جگر کے ساتھ ہم کچھ مال دیتے ہیں
ترے قدموں کے نیچے آج اپنے بال دیتے ہیں
کسی صورت جو دل اس کا دکھا وہ کر نہ گزرے گی
کریں گے ہم خدا کے سامنے فریاد محشر میں
خدا کے فضل سے تم صاحب فہم و فراست ہو
کوئی کمسن نہیں جس کو نصیحت کی ضرورت ہو
نہ رہ جائے مگر تبلیغ حق کا فرض ڈرتا ہوں
ضروری چند باتیں اس لیے میں عرض کرتا ہوں
میاں بیوی لباس ایک دوسرے کا ہیں زمانے میں
ہیں دونوں کے لیے تقویٰ ہم شادی کرانے میں
حقوق ازدواجی میں یہ شوہر کے برابر ہے
مگر اک رنگ میں عورت بیشک مرد برتر ہے
جہاد اس سے نہیں ہوتا ضعیف اسکی عبادت ہے
یہی باتیں ہیں جن سے مرد کو اس پر فضیلت ہے
مگر واللہ یہ مطلب نہیں ہے اس فضیلت کا
کہ حق نے ہی نہیں رکھا کوئی مردوں پہ عورت کا
بقائے نسل انسانی کا اس میں راز پنہاں ہے
قصور اس کا نہیں بلکہ خدا کا تم یا احسان ہے
جو بیجا فائدہ ہاں اس فضیلت سے اٹھائے گا
خدا شاہد ہے گھر اپنا وہ دوزخ میں بنائے گا
ادا سب حق کرو اس کے کہ فرض اولیں یہ ہے
نہ دل اس کا دکھاؤ حکم خیر المرسلیں یہ ہے
خدا حافظ دعا اختر کی ہے پھولو پھلو دونوں
ہمیشہ دہر میں نیکوں کے رستہ پر چلو دونوں

نسیم سحر

(قصۂ سسی و پنوں)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سسی پنوں شمال مغربی ہندستان کا مشہور و معروف قصہ ہے، سندھ، کچھ، بلوچستان اور پنجاب کی لوک روایتوں میں اس قصے کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ بعض نیم تاریخی روایتوں کے مطابق اس قصے کا تعلق علاقۂ سندھ سے ہے، لیکن اسے جو حسن قبول پنجاب میں ملا وہ بیان سے باہر ہے۔ گوسندی، کچھی اور بلوچی زبانوں میں یہ قصہ بار بار لکھا گیا ہے، لیکن اس کے سب سے زیادہ نسخے پنجابی زبان ہی میں ملتے ہیں۔ ہرنام سنگھ شان مرتب سید ہاشم نے ایسی پچاس سے زیادہ پنجابی تصانیف کے نام پیش کیے ہیں۔ سسی فارسی میں بھی بہ تصا متعدد بار لکھا گیا ہے۔ نمونہ روایتوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ سسی پنوں۔ از سید علی ٹھٹھا کے ایک صاحب تقدس بزرگ نے ۱۰۵۳ھ میں سندی زبان سے ترجمہ کیا۔

۲۔ زیبا و نگار۔ از حاجی محمد رضا رضائیہ سنہ ۱۰۵۳ھ

۳۔ سسی و پنوں۔ از جیونت رائے منشی، سنہ ۱۱۴۰ھ

۴۔ نامۂ عشق۔ از انوجیت منشی، سنہ ۱۱۴۰ھ

۵۔ دستور عشق یا گلستان رنگین۔ از جیونت پرکاش سنہ ۱۱۴۳ھ

۶۔ شہید ناز۔ از قاضی مرتضیٰ خاں سواتی بعہد محمد شاہ۔

۷۔ حسن و ناز۔ میر محمد بھکری

۸۔ تحفۃ الکرام مخدومی سنہ ۱۲۵۶ھ

۹۔ وقائع پنوں۔ محمد حسین حسینی (المتوفی سنہ ۱۲۵۱ھ) اور شہباز خاں سیالکوٹی۔

۱۰۔ سسی و پنوں۔ فرح بخش کمتو سنہ ۱۲۵۸ھ

۱۱۔ بہر دماہ، پیر محمد اوڈھی، مطبوعہ سنہ ۱۲۹۵ھ

۱۲۔ مثنوی سما بہ حسن و عشق، مشتمل بر قصۂ سسی پنوں مصنف نامعلوم۔

ہندستانی نسخے

۱۔ مثنوی اسرار محبت، نواب محبت خاں محبت، شاگرد جرأت۔ سنہ اختتام سنہ ۱۱۹۷ھ۔ یہ مثنوی حسرت موہانی نے "اردوئے معلی پریس" علی گڑھ سے شایع کی تھی۔

۲۔ مثنوی سسی پنوں، کیسر سنگھ جہانگیر۔

۳۔ مثنوی سسی پنوں، سالک

۴۔ مثنوی نالۂ بھجور، لالہ سنگھ مہر منشی ریذیڈنٹ کشمیر۔

۵۔ سسی پنوں (نثر) مقبول احمد خلف قدرت احمد فاروقی گوپاموی سنہ ۱۲۶۵ھ۔

۶۔ امجد علی تلق نے اپنی مثنوی بہر و شتر کا (سال تصنیف سنہ ۱۸۶۰ء) میں لکھا ہے کہ اس نے سعد الدین شفق رئیس کمالیہ کی فرمایش پر سسی پنوں کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا، لیکن موصوف کے انتقال سے طبیعت مکدر ہو گئی اور قصہ نامکمل رہ گیا۔

۷۔ قصۂ سسی پنوں (نثر) عبد الحلیم شرر نے اسے مخدومی کی فارسی "تحفۃ الکرام" سے اخذ کر کے دلگداز" میں شایع کیا۔

۸۔ سسی پنوں (نثر) نیاز فتح پوری نے فارسی روایت حسن و ناز (میر محمد بھکری) اور شہید ناز (قاضی مرتضیٰ سورتی) کی بنا پر اس قصے کو نگار میں شایع کیا۔

۹۔ مثنوی نسیم سحر، مشتمل بر قصۂ سسی پنوں، پنڈت جیالال خستہ دہلوی سنہ ۱۸۸۴ء

سرورست اسی آخری مثنوی کا تعارف کرانا مقصود ہے۔

خستہ دہلوی کی یہ مثنوی مطبع افتخار دلی سے ۱۸۸۴ء میں شایع ہوئی تھی صفحات کی کل تعداد ۲۳ ہے اور ہر صفحے میں ۱۲ ابیات ہیں۔ مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء ہے، جیسا کہ مصنف کے مطلع تاریخ سے ظاہر ہے۔

جبکہ یہ داستاں تمام ہوئی دل ناشاد باغ باغ ہوا
سال تاریخ کا ہوا جو فکر ہاتفی نے کہا فراغ ہوا

شاعر نے قصے کے بارے میں اپنے مآخذ کا پتا نہیں دیا البتہ اتنی صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ مثنوی اپنے ایک دوست میر صادق علی کی فرمایش پر لکھی۔

فصولما جو ہیں میر صادق علی خبردار سر خفی و جلی
لکھا جن کے کہنے سے قصہ تمام رہیں تیری رحمت سے فرخ مدام

مثنوی کی ابتدا اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اور حمد خدائے کریم سے کی ہے۔ ایک پنڈت پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کی شان میں کس خضوع و خشوع سے اپنا عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ ان اشعار میں ملاحظہ کیجے۔

لکھوں پہلے حمد خدائے کریم کہ ہے نام اس کا غفور الرحیم
ہوا عشق کا بھی اسی سے ظہور کیا یعنی پیدا محمد کا نور
وہ ساقی کوثر رسول امیں بنا جن کی خاطر زمان و زمیں
امام رسل ختم پیغمبراں محب خدا سرور دو جہاں
ہیں اصحاب اس کے جو والا گہر عروج فضیلت کے شمس و قمر
ابوبکر صدیق عالی خطاب! سپہر کرامت کا اک آفتاب
دوئم عمر عادل مبارک شیم لے نوشیرواں جس کے جھک کر قدم
سوئم حضرت عثمان عالی وقار چہارم علی سرور نامدار
ثنا میں کروں ان کی جو کچھ رقم وہ بیشک ہے کم بلکہ کم سے بھی کم

قصے کا آغاز شہر بھن بھور اور شاہ بھن بھور کے بیان سے ہوا ہے۔ محبت خاں محبت کی بہ نسبت خستہ دہلوی کی یہ مثنوی سید ہاشم کی اصل روایت سے قریب تر ہے، گو اس میں بھی اختلافات ہیں، لیکن نظر بظاہر خستہ دہلوی کی اختراع نہیں۔ غالباً اس نے سسی پنوں کے قصے کو جس طرح دلی میں سنا ویسے نظم کردیا۔

بھن بھور کے بادشاہ کا لاولد ہونا، منتوں مرادوں سے سسی کا پیدا ہونا، منجموں کا پیشین گوئی کرنا کہ شہزادی فتنۂ عشق کا شکار ہوکر ننگ و ناموس کو بٹا لگائے گی اور اس کے عشق کا خانہ ساز ہوکر لوگ لیلا مجنوں کو بھول جائیں گے۔ بادشاہ کا بیٹی کو صندوق میں بند کرکے دریا میں بہا دینا، صندوق کا اماد ھوبی کے ہات لگنا اور سسی کا دھوبی کے گھر جوان ہونا، دریا کے کنارے بادشاہ کے بنوائے ہوئے محل میں رہنا؛ غیر اقصے کی مستند روایت کے عین مطابق ہے۔ خستہ دہلوی نے ان واقعات کو مفصل بیان کیا ہے، اور تقریباً نصف مثنوی انہیں پر ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد کا قصہ کسی حد تک مختلف ہے۔

ھاشم کی روایت کے مطابق سسی نے کیچ کے سوداگروں کے پاس پنوں کی تصویر دیکھی اور اس پر فریفتہ ہوگئی۔ خستہ دہلوی کے ہاں کیچ کے دو سوداگر تجارت کی غرض سے بھن بھور سے گذرتے ہیں۔ سسی انہیں محلوں میں بلوا کر پوچھتی ہے کہ کیا کیچ میں پنوں نامی کوئی نوجوان رہتا ہے۔ نجومیوں کے کہنے کے مطابق قسام ازل سے اس کا رشتہ پنوں سے مقرر ہوچکا ہے۔ سوداگر جواب دیتے ہیں کہ پنوں انہیں کا بھائی ہے۔ اس پر سسی سوداگروں سے کہتی ہے کہ اگر جان بخشی چاہتے ہو تو کیچ سے اپنے بھائی کو بھن بھور لے آو۔ ان میں سے ایک سوداگر وہیں رہتا ہے اور دوسرا پنوں کو لانے کے لیے کیچ پہنچتا ہے۔ ان کی ماں یہ ماجرا سن کر پنوں سے کہتی ہے۔

گوارا نہیں تیری فرقت مجھے جو دوں واں کے جانکی رخصت تجھے
بنادے اگر واں تو آوٗ رچا رہے بھائی تیرا بھید گراں
عجب سخت مشکل ہوئی آکے پیش ادھر زخم تیزہ ادھر زخم خویش
دلے جبطرح ہوسکے آجو اں رہا کہ کے بھائی کو لا تو یہاں

پنوں بھن بھور پہنچتا ہے اور اسے سسی دیکھتے ہی مست و بیخود ہو جاتی ہے۔

در باغ پر جا کے دیکھا جو نہیں تو آیا نظر وہ جوان حسیں

اسی دم ہوئی جان و دل سے نثار نہ کچھ ہوش اس کو رہا نہ ہوا
نظر سے نظر جو ملی یک بیک رہی مشق وحشی اسی جا ٹھٹک

یہی حالت پنوں کی بھی ہوئی۔ چند روز باہم رازونیاز رہا۔ اس کے بعد دونوں نے نکاح کی ٹھانی۔ اس دھوبی سے اجازت طلب کی گئی، اس نے پنوں کو اپنے فن میں آزمایا اور اس کے بعد اسے اپنی داماد ی میں قبول کر لیا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دونوں خوشی خوشی دریا کے کنارے محل میں رہنے لگے۔ واقعات اصل قصے سے مختلف ہیں۔ ہاشم کے ہاں نکاح کی نوبت ہی نہیں آئی۔

پنوں کے بھائی جب وطن لوٹے تو اس کی ماں نے یہ سرگذشت سن کر سر پیٹ لیا۔

ہوئی ایسی کیا مجھ سے بھاری خطا ہوا پور میرا جو مجھ سے جدا
لگی کہنے بیٹوں سے جا و شتاب وہ سسی ہے کون ایسی خانہ خراب

کسی طرح پھندے سے اس کے چھڑا یہاں لاؤ پنوں کو بہر خدا

دونوں بھائیوں نے عورتوں کا لباس زیب تن کیا اور خیرات گری کے بہانے بھنبھور میں وارد ہوئے سسی نے ان کی شہرت سنی تو انہیں محل میں طلب کیا۔ رقص سرود کی محفل گرم ہوئی اور رات گئے تک بینا و ساغر کا دور رہا۔ پنوں کے بھائی تو اس موقع کی تاک میں تھے انہوں نے سسی اور پنوں دونوں کو بے سدھ پایا تو پنوں کو بے ہوشی کے عالم میں اپنے ساتھ لیے راتوں رات بھنبھور کے علاقے سے باہر نکل گئے۔ پنوں کو شراب پلا کر بے ہوش کرنے کا واقعہ ہاشم کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن پنوں کے بھائیوں کا عورتوں کی وضع میں بھنبھور آنا اصل روایت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

صبح سویرے سسی کی آنکھ کھلی تو پنوں کو قریب نہ پاکر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔

وہ الٹھ بینا و ساغر کو توڑ چلی حال میں اپنے ان کو چھوڑ
تکایت کبھی چرخ دوار کی کبھی یاد اس ماہ رخسار کی

کبھی دے یہ باد صبا کو پیام کہ اے پیک عشاق نیکو خرام
پتہ گل کی تو جا کے کر جستجو کسی طرح لا دے مجھے اس کی بو

اس کے بعد کے قصے سے خستہ دہلوی نے پورا انصاف نہیں کیا اور اسے نہایت مختصر طور پر ایک آدھ صفحے میں ختم کر دیا ہے

یہ جاتی تھی کرتی ہوئی شور و غم فغاں زیر لب دم بدم چشم نم
ہوئی تشنگی سے جو محبوب رخت ہوئی دل میں غمگین و رنجور سخت
پڑے پاؤں میں سو کے چھالے تمام نہ چلنے کی طاقت نہ تاب قیام
وہ ریگ بیاباں و جنگل کی دھوپ کہ دیکھے سے کالا ہو آہو کا روپ
کہاں وہ کف پا سے نرگس نگار کہاں اس قدر جنگل خار دار
ہوئی مضطرب غم سے وہ ماہ تھا گری ہو کے بے ہوش غش آگیا
کہاں وہ خواصیں کہاں وہ سہیلیاں کہاں بزم رنگیں کہاں وہ بہار
اکیلی پڑی تھی نہ تھا کوئی پاس ضعیف و نحیف و پریشاں اداس
ذرا ہوش آیا تو کی ایک آہ کہ جس سے ہوا رنگ صحرا سیاہ
زباں پر تھا نام صنم بادیا تاسف سے روتی تھی وہ زار زار
اٹھا سر کو پتھر پہ پٹکا وہیں ہوا سارا از خمی سر زمیں
مرض ہوئی اس کی پھر تن جاں الم سے ہوا تیرہ سارا جہاں

اس کے بعد چرواہے کا سسی کو دفن کرنا، پنوں کا بیچ سے پلٹ کر آنا، قبر دیکھ کر ٹھٹکنا، چرواہے سے ماجرا سننا، قبر کا شق ہونا۔ پنوں کا اس میں سما جانا وغیرہ واقعات وہی ہیں جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے، البتہ سسی کا پتھروں سے سر مار مار کر مرنے کا واقعہ قدرے بدلا ہوا ہے۔ ہاشم کے ہاں سسی پیاس کے مارے تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہے۔ مثنوی کے آخری اشعار دعائیہ ہیں۔ اس کے بعد مصنف اور اس کے احباب کے کہے ہوئے دس قطعات تاریخ ہیں۔ یہ مثنوی ادبی اعتبار سے محبت خان محبت کی مثنوی کو نہیں پہنچتی۔ خستہ دہلوی کو بیجا رنگ آمیزی اور قصے کی نوک پلک سنوارنے کا مطلق خیال نہیں، اس نے واقعات پر نظر رکھی ہے اور انہیں سیدھے سادے طور پر نظم کر دیا ہے وہ شیوا بیان نہ سہی، صاحب بیان مرزا رسوا کی دہلوی لب و لہجا صاف سلیس الفاظ اور بے تکلف بول چال کا سا انداز مثنوی میں لطف دے جاتا ہے۔

پہلی قسط

محمد علی ۔ جدید مصر کا بانی

محمود الحسن ندوی

پیدائش اور ابتدائی حالات

محمد علی ۱۷۶۹ء میں قولانی کاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں قسطنطنیا سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اسکے باپ کا نام ابراہیم آغا تھا۔ محمد علی کے ستر اسی بھائی تھے، مگر اسکی سوا سب کا انتقال ہو گیا۔ محمد علی جب چار برس کا تھا تو اسکے والدین کا انتقا ہو گیا۔ اس طرح بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گیا اس کی حالت سے متاثر ہو کر محمد علی کی کفالت اس کے چچا نے اپنے ذمے لے لی، مگر چند ہی دنوں بعد طوسون آغا بھی حکومت کے حکم سے قتل کر دیا گیا، اس طرح اس کا آخری سہارا بھی جاتا رہا، اس کے بعد باپ کے ایک دوست نے اپنے گھر بلا لیا مگر اس صورت حال سے وہ برابر کڑھتا رہا، اس کا اظہار وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس طرح کرتا ہے۔

"میرے والد کے ستر لڑکے تھے، ان میں سے صرف میں زندہ بچ سکا، اس لیے میرے والد مجھے بہت چاہتے تھے، ان کے انتقال کے بعد تنہی کا دور شروع ہوا، عزت ذلت میں بدل گئی، میں اس جملے کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے خاندان والے کہا کرتے تھے "اس بیچارے یتیم کا کیا ہو گا" جب بھی یہ جملا میرے کانوں میں پڑتا، میں نظر انداز کر جاتا، مگر اس کا جو اثر ہوتا وہ عجیب و غریب ہوتا۔ اسی احساس نے میرے اندر ایسا احساس پیدا کیا جس نے مجھے حرکت و عمل کا سبق سکھایا، میں ہر وہ کام کرتا جس کے کرنے کی میرے اندر سکت ہوتی، میں کئی کئی دن بھوکا رہ کر کام کرتا، نیند بھی بہت ہی کم آتی دوسری مصیبتوں کے علاوہ ایک بڑی مصیبت یہ آئی، میں ایک بار بحری سفر کر رہا تھا، میری کشتی ڈوبنے لگی میں بچا تھا، جو بڑے تھے انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور پار لگ گئے میں پانی کی قوت سے برابر لڑتا رہا، اور اونچی اونچی موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہا، کہیں کہیں پتھر کی چٹانیں آجائیں، آخر میں میرے ہات شل ہو گئے اور مشکل سے جزیرے تک پہنچا، یہی جزیرہ آج میری مملکت کا ایک حصہ ہے۔"

محمد علی نے وہ سب کچھ سیکھا جو اس علاقے کے بچے سیکھ سکتے تھے، جوان ہونے پر خاندان ہی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی، لڑکی چونکہ کافی دولت مند تھی، اس لیے اسکے سرمایے سے تجارت کرنی شروع کر دی، اس میں خوب ترقی ہوئی اور بڑی دولت ہات آئی۔

یہی زمانا اصل میں عثمانی حکومت کے زوال کا تھا، مملوک خاندان نے اپنے مفاد کی خاطر فرانسیسیوں کو اپنا حلیف بنا کر انتظام ملکی میں انہیں بھی شامل کر لیا تھا۔ یہ طرز عمل اگر ایک طرف دولت عثمانیا کے لیے ناپسندیدا تھا تو دوسری جانب انگریز اس کو اپنی بین قومی پالیسی کے خلاف نقصان رساں سمجھتے تھے، کیونکہ انہیں اندیشا تھا کہ اگر فرانس کا مصر پر اقتدار ہو گیا تو ایشیا کی انگریز نو آبادیاں انگلینڈ سے کسی وقت بھی کٹ کر رہ جائیں گی، چنانچہ انگریزوں سے انگریز نے مل کر فرانس کے اثر کو ختم کرنے کا پکا ارادا کر لیا، اس کی تکمیل کے لیے ایک بحری و سہ ابری لشکر روانا کیا گیا۔

محمد علی اس بحری بیڑے میں شامل تھا، یہ سوا لاکھ فوجوں کی قیادت علی آغا کے سپرد ہوئی، جب یہ دستا ابوقیر کے پاس پہنچا تو علی آغا اس دستے کی قیادت محمد علی کے سپرد کر کے اپنے وطن چلا گیا، اس کے بعد وہ بیگا شی کے عہدے پر متعین کر دیا گیا۔ عثمانی فوجیں انگریزوں کی مدد سے فرانسیسیوں کو مصر سے نکالنے میں کامیاب ہو گئیں، مگر مملوک کا زور مصر کے مختلف حصوں پر باقی تھا، ان کے امراء اب بھی بعض علاقوں کے حکمراں تھے، عثمانی فوجوں کے متعدد دستے

ملک کے مختلف حصوں میں ان ممالیک کی سرکوبی کے لیے بھیجے گئے۔ اس سلسلے میں ایک دستہ صعید کے مملوک کی بیخ کنی کے لیے خسرو پاشا نے بھیجا تھا، جو متعدد جنگوں کے بعد بھی انہیں زیر نہ کر سکا۔ اس کے بعد محمد علی کو ۴ ہزار فوج کا قائد بنا کر روانا کیا گیا، مگر محمد عالم کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ شکست کھا کر لوٹ چکا تھا۔ اس دستے کا کمانڈر محمد علی سے بہت کینہ رکھتا تھا، اس نے خسرو پاشا کو یہ سمجھایا کہ شکست کی اصلی وجہ محمد علی کی سستی اور تاخیر تھی۔ خسرو پاشا اس کے بہکانے میں آ گیا، چنانچہ خسرو نے محمد علی کو ملک بدر کرنے کا تہیہ کر لیا، خط لکھ کر رات کے بارہ بجے اسے طلب کیا، اس میں یہ لکھا تھا کہ بہت اہم کام درپیش ہے، مگر محمد علی بھانپ گیا اور دعوت رد کر دی۔

محمد علی اب اتنا عاجز ہو گیا تھا کہ سوائے مملوکوں کو دوسرا اس کا مددگار نہیں ہو سکتا تھا، اس نے ان سے ساز باز کر کے خسرو پاشا کو قاہرہ سے نکال دیا، اس نے دمیاط کی راہ لی، اس کی جگہ طاہر نے لی، مگر وہ بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد احمد پاشا والی شرطا حاکم ہوا، مگر مملوکوں نے اسے بھی باہر نکال دیا، اس کے بعد خسرو پاشا کے خلاف تیاری کی، دمیاط میں ہی جنگ کر کے اس کو قید کیا اور قاہرہ لا کر سنگسار کر دیا، چنانچہ اس ابتری کی اطلاع جب قسطنطنیا پہنچی تو وہاں سے علی پاشا والی بنا کر بھیجا گیا، یہ بڑی مشکل سے قاہرہ پہنچا۔ اس نے مملوکوں اور محمد علی کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی چالیں چلیں، مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی، اسکے برخلاف خود مملوکوں میں پھوٹ پیدا ہو چکی تھی، ان کے دو لیڈر آپس میں نبرد آزما تھے، الفی نے اپنی قیادت مستحکم کرنے کے لیے انگلینڈ کا سفر کیا، جب یہ واپس آیا تو محمد علی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر فرولیسی کے خلاف اس کو خوب اکسایا، سازشوں کا جال بچھایا، مگر الفی بھاگ نکلا اس کے بعد فرولیسی نے بھی سمجھا کہ اب وہ قاہرہ میں تن تنہا ہے، سازشوں کے بادل چھٹ گئے ہیں

مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ محمد علی اپنے عزائم کی تکمیل میں پس پردہ مصروف کار ہے۔ محمد علی نے البانوی فوج کو بھڑکایا، انہیں سمجھایا کہ وہ فرولیسی کے خلاف بغاوت کریں، اس سے روپے کا مطالبہ کریں، چنانچہ ان لوگوں نے اسے دھمکایا، اس نے مجبور ہو کر قاہرہ کے باشندوں پر ٹیکس لگائے، اس کی تحصیل میں سختی سے کام لیا، اس سے ہر شخص بدظن ہو گیا، لوگ مشتعل ہو گئے، آخر کار فرولیسی کو قاہرہ چھوڑنا پڑا، اس طرح کی اور متعدد سازشیں کر کے، محمد علی نے قاہرہ کے باشندوں کو اپنے حق میں استوار کر لیا، تاہم حالات ایسے تھے کہ بغیر کسی والی کے کام نہیں چل سکتا تھا، اس کے لیے خرشید پاشا پر نظر پڑی جو اس وقت اسکندریا میں تھا، علما اور مشیوخ مصر نے یہ بھی فیصلا کیا کہ اس کا نایب خود محمد علی ہو۔

چونکہ فوج کا البانوی حصا محمد علی سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا، اس لیے خرشید کو خطرے کا احساس ہو گیا، چنانچہ اس نے ولاۃ نامی ایک نئی فوجی تنظیم شروع کی، اس کا یہ منشا تھا کہ یہ فوج البانوی فوج کے مقابلے میں کبھی کام آئے گی، خرشید پاشا نے اسی فوج کو مملوکوں سے لڑنے کے لیے روانا کیا، چنانچہ ان لوگوں نے خوب جی بھر کے لوٹ مار کرنی شروع کر دی، عوام کی عزت و آبرو سب خطرے میں پڑ گئی، لوگ ظلم و ستم سے چیخ اٹھے، یہ صورت حال ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے نظر انداز کر دی جاتی، چنانچہ مصر کے سمجھدار طبقے نے اس کی جانب فوری توجہ کی، انہوں نے اس سے چھٹکارا پانے کی ٹھان لی، اسی اثنا میں جدہ کی ولایت کا پروانا محمد علی کے نام آیا، خرشید پاشا نے اسے وہ تمام سامان دیے جو اس عہدے کے لیے مخصوص تھے، محمد علی جدہ کے ارادے سے نکلا تو، مگر قاہرہ سے باہر جانے پر تیار نہ ہوا، اس کی دوربیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے، فوج نے بھی تنخواہ کا مطالبہ کر دیا، محمد علی نے جواب دیا کہ اس کے لیے پاشا موجود ہے

اسی سے مطالبا کرو' یہ کہہ کر وہ اپنے سفر پر روانا ہوگیا رستے میں اس نے بڑے مال وزر لٹائے' اس سے رعایا کے دل میں اس کی عزت پیدا ہو گئی' اس واقعے پر تین ہی دن گذرے تھے کہ علما اور مشایخ محمد علی کے پاس آئے' سبھوں نے ایک آواز ہو کر مطالبا کیا "ہم خرشید پاشا کو اپنا والی تسلیم نہیں کرتے" محمد علی نے پوچھا' پھر کس کو چاہتے ہو' سب نے متحد ہو کر کہا "ہم تو صرف آپ کو پسند کرتے ہیں" یہ جواب سن کر محمد علی نے ایک کامیاب سیاستداں کی طرح انہیں سمجھایا کہ خرشید پاشا بہت مناسب اور بہتر حاکم ہے' اس پر سب کو اعتماد کرنا چاہیے' مگر سب برابر اپنے مطالبے پر جمے رہے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر سلطنطنیا سے محمد علی کی ولایت کا فرمان ۹ رجولائی ۱۸۰۵ء کو جاری ہوا۔ کیا معلوم تھا کہ یہی محمد علی آیندا چل کر عثمانی خلیفا کے لیے دردسر بن جائے گا۔

محمد علی ایک بیدار مغز سیاستداں کی طرح ہر وقت اس فکر میں کوشاں رہتا کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ جن سے عہدا برآ ہونا دوسروں کے لیے ناممکن ہو' کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ نظم ونسق کا اختلال' معاشی بحران' امن و امان کی کمی ہی ایسے امرا اور پاشاؤں کے مقابلے میں کامیاب بنا سکتی ہے' اس لیے اس بحرانی کیفیت کو پیدا کرنے میں پس پردہ خدیو بھی حصا لیتا اور برابر اسے اس میں کامیابی ہوتی گئی' حتا کہ میدان اس کے حق میں بلکل صاف ہو گیا۔

چونکہ محمد علی کا رجحان زیادا تر فرانس کی جانب تھا' جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ جب محمد علی آغاز شباب پر تھا تو ایک فرانسیسی موسیو لبوں نے اس کی بڑی مدد کی تھی' یہ فرانسیسی اس کی ذہانت وفطانت بھانپ گیا' اس لیے اس نوجوان کی ہر طرح مدد کرتا رہا' چند سالوں کے بعد موسیو لبوں اپنے وطن چلا گیا' محمد علی نے اس کو آخر دم تک یاد رکھا' جب حکومت ہاتھ میں آئی تو اسے بلایا' مگر وہ رستے ہی میں مر گیا' دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں البانوی عیسائی تھی جو کچھ لگ تھی' کوئی بھی وجہ ہو' محمد علی انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کو پسند کرتا تھا۔ انگریز محمد علی کے عروج سے بہت فکرمند تھے' چنانچہ مصر کو فرانسیسی اقتدار سے بچانے کی آڑ لے کر' انہوں نے مصر پر حملا کر دیا' آٹھ ہزار فوج کی قیادت جنرل فریزر کے سپرد تھی' ۱۷ مارچ ۱۸۰۷ء کو اسکندریا پہنچی اور وہیں چھ مہینے تک رہ گئی۔ چند جھڑپیں ہوئیں' البانیوں نے ان سب پر کامیابی حاصل کی' اسی اثنا میں سلطان مصطفا نے استعفا دیدیا' اس کی جانشینی عبدالحمید کے سپرد ہوئی' انگریزی فوج صلح کر کے واپس آگئی۔

محمد علی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی' اصلاحی کاموں کی جانب توجہ کی وہ خوب سمجھتا تھا کہ ایسے وقت میں اسے کن لوگوں سے کام لینا چاہیے' بھروسے کے قابل کون لوگ ہیں' چنانچہ انتظام ملکی میں اس نے اپنے عزیز اقربا اور حامیوں کی بڑی تعداد شامل کی' ان کو بڑے بڑے عہدے دیے۔

اسی زمانے میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک بڑے زوروں سے پھیل رہی تھی' عثمانی حکام کے لیے جزیرۃ العرب پر اپنا اقتدار باقی رکھنا مشکل ہو گیا' چنانچہ محمود ثانی کو اس کی بڑی فکر ہوئی' اس نے اس کام کے لیے محمد علی ہی کو مناسب سمجھا۔ محمد علی کی دیرینا آرزو بر آئی' کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ مصر کو ایسی مملکت میں بدل دے جس کے زیر اثر میں تمام عرب علاقے آجائیں' اسی ذاتی غرض کی بنا پر اس نے اس تحریک کو دبانے کا عزم کر لیا۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں محمد بن سعود کا بڑا ہاتھ تھا۔ محمد بن عبدالوہاب اور محمد بن سعود' دونوں نے مل کر نجد پر اپنا اقتدار قایم کر لیا' لوگ جوق در جوق ان کی دعوت پر ٹوٹ پڑے ریاض کے لوگوں نے کچھ گریز کیا' مگر طاقت کے آگے انہیں بھی جھکنا پڑا' اس واقعے کے بعد جزیرۃ العرب پر اچھا خاصا اثر پڑا' اس کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی رہی' اور بہت جلد وہ ایک بڑا لشکر بنانے میں کامیاب ہو گئے' ان

لوگوں نے شام و عراق کے گورنروں کو دھمکی دی کہ بلا پر حملہ کرکے وہاں کی قبروں کو جس سے قبر پرستی کا خطرہ تھا توڑ ڈالا یہ باتیں عثمانی حکومت کے لیے ہیجان انگیز تھیں، محمد علی بھی اس لہر سے بچا ہوئی صالح قوت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔

چنانچہ اس نے عثمانی حکومت کی ایما پر اس کو کچلنے کی ٹھان لی، مگر وہ جانتا تھا کہ ملوک اس کی تاک میں ہیں، حکومت چھن جانے کا زخم اب بھی ان کے سینے میں تازہ ہے، معمولی سی غفلت بھی ان کے حوصلے بڑھا سکتی ہے، اس لیے اس نے تہیا کرلیا کہ پہلے ان سے نمٹ لیا جائے، اس کے لیے دعوت مرتب کی گئی، اس میں ۴۰۰ ملوک مدعو کیے گئے، اس میں ان کے ممتاز لیڈر شاہین بک تھے، جب یہ پوری جماعت قلعے کے اندر پہنچی تو محمد علی کے اشارے پر قلعے کا دروازہ بند کردیا گیا، البانوی فوج اندر موجود تھی، اشارا پاتے ہی ٹوٹ پڑی، چشم زدن میں چار سو آدمیوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپا دی گئیں، اس کے بعد محمد علی کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ تمام مخالفین ایک ایک کرکے نہایت بیدردی سے قتل کر دیے گئے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ آسانی سے بحر و حجاز پر حملہ کرکے وہابی تحریک کو دبا سکتا تھا۔

محمد علی کے اس ارادے کا پتا سعود کو مل چکا تھا۔ اس نے ۵۰ ہزار مصریوں کے مقابلے کے لیے تیاری کی، محمد علی نے اپنے بیٹے طوسون کی قیادت میں بحری فوج روانہ کی، یہ فوج کہیں تو کامیاب رہی اور کہیں ناکام، تاہم مجموعی طور پر اس کا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ ادھر گرمی آ گئی۔ عرب کے اس تپتے ریگستان میں مصری فوج کا لڑنا تباہی کو دعوت دینا تھا، بہرحال اس موقع سے وہابی فوج نے فائدہ اٹھایا، مصری فوج پر حملہ کرکے مکہ اور مدینہ دوبارہ چھین لیا، اسکی اطلاع جب محمد علی کو پہنچی تو وہ بذات خود اس مہم پر روانہ ہوا، بہت بڑی فوج لے کر آیا، مگر پورے جزیرۃ العرب کو فتح نہ کرسکا اور واپس مصر چلا گیا، لیکن ابھی یہ کام پورا نہیں ہوا تھا اس لیے ایک اور بھاری فوج اس تحریک کو کچلنے کے لیے روانہ کی گئی، اس نے متعدد جنگوں میں کافی نقصان پہنچایا، ان کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہوئے، اس فوجی کارروائی سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب سیاسی طور پر اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا، مگر یہ عارضی تھا۔ محمد علی کو اس کارعظیم پر انعام ملا اور دربار قسطنطنیا سے خان کا لقب عطا کیا گیا۔

اب محمد علی کی نگاہیں بار بار سوڈان اور شام پر اٹھتی تھیں وہ اپنے حوصلے کامرانی میں اتنا مسرت تھا کہ اس کے اتنی معمولی بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس کامیابی سوائے امت کی مجموعی قوت میں کمزوری کے اور کیا ہوگا۔ حکومت کی گھٹتی ہوئی طاقت میں مزید ضعف پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آخر ان دونوں ملکوں کو بھی جو دولت عثمانیا کے زیر اثر تھیں اپنی نوکرشاہیوں کی آماجگاہ بنایا، ایک کے بعد ایک ان علاقوں کو فتح کرلیا، اس کی ہمت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ ناطولیا پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگا، اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے عثمانی حکومت کو ایک اور حریف سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے مصر، شام اور فلسطین پر اپنے چنگل گاڑ دیے تھے۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ محمد علی کا بڑھتا ہوا اقتدار انگریزوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، انہوں نے اس موقع پر مداخلت کی، عثمانی حکومت نے مجبور ہو کر اس سے صلح کرلینی چاہی، مگر شرائط صلح پر محمد علی راضی نہ تھا، وہ مستقبل میں خاندانی آزاد حکومت کے قیام کا خواہش مند تھا مگر حکومت عثمانی اس پر راضی نہ ہوئی، اس نے خاندانی ولایت کے اس پیشکش کو اس شرط کے ساتھ منظور کرنا چاہا کہ اقتدار عالا حکومت کو حاصل رہے، اور دولت عثمانیا اپنی مرضی کے مطابق اس خاندان میں سے جس کو چاہے گی، مصر کا حاکم بنا دے گی، محمد علی نے کچھ تردد کے بعد اسے منظور کرلیا، اس طرح دربار عثمانی سے منصب حکومت کا فرمان ۱۲ فروری ۱۸۴۱ء میں جاری ہوا، اس فرمان کی چند دفعات جرجی زیدان کی کتاب "مصر الحدیث" میں یوں درج ہیں۔

۱۔ جب والی کی جگہ خالی ہوگی تو یہ عہدہ اس شخص

کے سپرد کیا جائے گا، جسے عثمانی حکومت نے محمد علی کے خاندان سے چھین لیا تھا۔ انتخاب اسی طرح مردوں کی جانب سے ہوگا، اگر اولاد میں کوئی مذکر نہ ہو تو پھر لڑکیوں کی اولاد میں سے وارث نہیں ہوگا۔

۲۔ جس کو وارث چنا جائے گا، اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ آستانے میں حاضری دے۔ مال گذاری اور ٹیکس وغیرہ سلطان عثمانی ہی کے نام سے وصول ہوں گے۔

۳۔ حالت امن میں ۱۸ ہزار فوج اندرونی نظم و نسق کا برقرار رکھنے کے لیے رکھی جا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں رکھ سکتے، مگر چونکہ مصری فوج کی حیثیت ایسی ہے جیسی کہ عثمانی حکومت کی تمام افواج کی اس لیے حالت جنگ میں اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ مناسب ہوگا۔

یہ اور ایسی متعدد دفعات کے ساتھ مصر محمد علی کے سپرد کر دیا گیا، اس کے کچھ دنوں کے بعد محمد علی کی بیادت سوڈان پر بھی تسلیم کر لی گئی، لیکن شام اور فلسطین سے محمد علی کی فوجوں کو نکلنا پڑا۔ اس طرح محمد علی کی دیرینہ آرزو کسی حد تک پوری ہو گئی، افسوس یہ کامیابی بہت بڑی اسلامی قوت کو کمزور کر کے حاصل ہوئی۔ اس طرح ایک گمنام بے مایا نوجوان محض اپنی ذکاوت، دلیری اور مدبرانہ صلاحیت سے مصر اور سوڈان کا فرمانروا بن گیا۔

محمد علی نے آخر عمر میں آستانا کا سفر کیا۔ سلطان نے اسے بڑے اعزازات اور انعامات دیے، بڑی خاطر و مدارات کی، خشم و حرم و طنا تو اسکندریا میں عوام نے بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا ۱۸۴۸ء کے نصف میں محمد علی ذہنی عارضے میں مبتلا ہو گیا اس وجہ سے وہ معاملات حکومت کے قابل نہیں رہا، اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے باپ کی جانشینی کی، اور آستانا سے ولایت کی بھی سند لی گئی، مگر اچانک ۱۰ نومبر ۱۸۴۸ء کو مر گیا، اس کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی عباس جانشین ہوا، اس عرصے میں محمد علی اسکندریا ہی میں مقیم رہا، اس کا مرض برابر بڑھتا گیا جسمانی طور پر بیحد کمزور ہو گیا، اس کی موت کے دن قریب آ گئے اور وہ ۲ اگست ۱۸۴۹ء کو اس دنیا سے چل بسا۔

اس کے بعد دوسرا بھائی عباس جانشین ہوا۔

غزل

ڈاکٹر تاپرشاد زیبؔ بریلوی

دل کی دھڑکن آج انداز بیاں تک آ گئی
روح نغمہ جھومتی لب تک زباں تک آ گئی

چشم و دل سے کائنات دو جہاں تک آ گئی
سرمئی خوف و فا کون و مکاں تک آ گئی

ہستیٔ فانی مقام جاوداں تک آ گئی
رخ بدل کر زندگی میری کہاں تک آ گئی

ضبط نے گیتوں میں در در زندگی پیدا کیا
رفتہ رفتہ نغمگی آہ و فغاں تک آ گئی

گیت گانے کی بھی گنجائش کہاں باقی رہی
یہ بھی پابندی نفس سے آشیاں تک آ گئی

آرزوئیں کروٹیں لیتی رہیں دونوں طرف
خامشی بڑھ کر حد وہم و گماں تک آ گئی

کیا ارادہ ہے بتا اے ناخدائے زندگی
موج طوفاں کشتی عمر رواں تک آ گئی

جذبۂ وحشت نے کیں صحرا میں وہ گلکاریاں
بات ویرانوں کی صحن گلستاں تک آ گئی

موجد حق الیقیں ہے میرا ذوق بندگی
خود جبین شوق جھک کر آستاں تک آ گئی

اے حد ضبط ستم مجبوری اظہار غم
پہلے دل تک تھی، مگر اب تو زباں تک آ گئی

یہ تباہ موجوں سے ٹکراتی ہوئی اے ناخدا
کشتی عمر رواں آخر کہاں تک آ گئی

آتش سوز محبت ضد ہے شام زندگی
بڑھتے بڑھتے دل سے چشم خونچکاں تک آ گئی

روشن دان

نظر محمود وا دانش

بہت دوڑ دھوپ اور کئی مہینے کی کوششوں کے بعد مجھے صرف ایک کمرے کا کوارٹر مل سکا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا، مگر جس کھلی جگہ میں ان ایک ایک کمرے کے کوارٹروں کی لائن ہے وہ ہوا کے بلکل مخالف سمت ہے، یعنی کمرے میں ہوا کا گذر تک نہیں۔ باہر اونچا نیچا پتھریلا میدان جس میں جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔

میرا کوارٹر سب سے آخر میں ہے، اور سڑک کوارٹروں کے پہلو سے گذرتی ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں کہ کھلی فضا سے بہت اکتا کر انسان سڑک کی چہل پہل سے ہی لطف اندوز ہو سکے۔ پچھلی طرف ایک روشن دان ہے، جو کہ کافی بڑا ہونے کے علاوہ زیادہ اونچا بھی نہیں، اسی کے نیچے میں نے چارپائی بچھالی ہے، جس پر کھڑے ہو کر آسانی سے روشن دان سے باہر کی خاموش دنیا دکھائی پڑتی ہے۔

چند گز کے فاصلے پر حلقے کے ایس۔ ڈی۔ او صدیقی صاحب کا بنگلا ہے۔ تھوڑی دور پر کچے جھونپڑیاں ہیں۔ سڑک سے اتر کر جھونپڑیوں کو جانے والے لوگ ہماری دیوار کے نیچے سے گذر کر جاتے ہیں۔ اور کھلے روشن دان کے شیشوں سے ان کا عکس چارپائی لیٹ کر بخوبی نظر آتا رہتا ہے۔

شیشوں پر پتلا میدان نظر پڑتا ہے جو کہ دوپہر کے وقت دھوپ کی تمازت سے خوب چمکنے لگتا ہے۔ مجھے روشن دان میں ہر جانے والے کے پہلے جوتے نظر آتے ہیں، پھر ٹانگیں نمودار ہوتی ہیں، اس کے بعد سر ابھر آتا ہے، یعنی ہر انسان الٹا نظر آتا ہے۔ سر نیچے اور پاؤں اوپر۔ ان لوگوں کی ذرا سی آہٹ اور سانسیں تک مجھے بخوبی سنائی دی جاتی ہیں۔

مگر چند روز سے جانے کس وجہ سے صدیقی صاحب نے یہ رستا خار دار تاروں سے بند کروا دیا ہے، اور ہماری بیوی کے ساتھ چھوٹا سا گیٹ بنوا دیا ہے۔ مجھے روشن دان سے جھانکنے پر بھی یہ گیٹ نظر تو نہیں آتا، مگر مستریوں کاریگروں کی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ گیٹ بنا رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ ٹھکا ٹھک کی آوازیں تھم گئیں، پھر اوزار سمیٹنے کی آواز جو کہ شاید تھیلے میں بھرے جا رہے تھے۔ اس کے بعد تالا لگنے کی آواز، پھر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ آخر خاموشی گہری خاموشی۔

سامنے سستا چلنے والے آتے اور تالا پڑا ہوا دیکھ کر واپس لوٹ جاتے "افوہ! تالا پڑا تالا" اور پھر بڑبڑاتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ یہی رستا اور اس کی رونق مجھے کچھ دیر کو غم دوراں سے بہلا لیتی، مگر آج کئی روز کے بعد مجھے دن میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا میں نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور پنکھا کھول کر کہانیوں سے لطف اندوزی چاہی، پر طبیعت نہ لگی۔

"اف! کس قدر گھٹی گھٹی فضا ہے، ان کواڑوں کی ادھر ادھر کچھ نظر ہی نہیں پڑتا۔"

مجھے اس وقت مطالعے سے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اور میرا دل باہر جھانکنے کو چاہ رہا تھا۔ دروازے کے باہر نکل کر کھڑے رہنا بھی ایک پاگل پن ہی تھا۔ اس کے علاوہ کوئی منظر ایسا نہ تھا جس سے ذرا طبیعت بہلتی۔ لے دے کے یہی نظارہ رہتا وہ بھی بند۔ اب کسی چلنے والے کا عکس شیشوں پر دکھائی نہ پڑتا۔ اب کسی کی آہٹ اور کوئی سانس وہاں نہ ابھرتا۔ افوہ! دل گھٹ کر ہی تو رہ گیا۔

یکلخت میرے کانوں سے "کھل سم سم" کی آواز ٹکرائی میں نے محسوس کیا کہ میرا وجود "علی بابا کی طرح سمٹ کر ہمہ تن گوش ہو گیا ہے۔

"کھل سم سم" ایک دفعا، پھر دوسری دفعا اور ساتھ ہی جھلا دار قہقہہ بلند ہوا "عقب کا شوخ اور ظریف طبع ہوگا کوئی" میں نے سوچا اور اس نے "نیلماں نیلماں" دبی دبی سی آواز سے پکارنا شروع کر دیا۔ دو ہی منٹ بعد میں نے دیکھا، دو حسین سے ٹخنے پاؤں شیشوں پر ابھرے، پھر پینٹ کا سوٹ اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے وجود کے ساتھ موٹی موٹی اونیری سے گھومتی ہوئی آنکھوں والا خوبصورت چہرا۔

عکس پارے کی طرح پھسل رہا تھا۔ کبھی دو چوٹیلے نظر پڑتے، اور کبھی خوبصورت، مگر ننگے پاؤں کبھی ذرا سی کلائی نظر پڑتی جو کہ گہری سبز چوڑیوں سے جھلملاہٹ سی پیدا کر رہی تھی۔

"نیلماں"

"یہ گیٹ آخر کیوں لگا دیا یہاں" آواز میں بے چینی تھی۔

"کیا کہوں، مجو بابو جانے بڑے بابو کے دل میں کیا آئی جو یہ رستا بند کرا دیا۔"

"آخر تم لوگ کس طرف سے نکلتے ہو؟"

"نکلنے کو تو پرلی طرف سے رستا ہے، مگر...."

"ہاں مگر کیا؟"

"مگر کچھ نہیں" اور ہنسی کی ہلکی سی جھنجھناہٹ بکھر گئی۔

"بڑی چنچل ہو، اور میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"ہوں، دم کیوں گھٹنے لگا، اس قدر کھلی جگہ میں بھی کہیں دم گھٹتا ہے۔"

"ٹھہرو ابھی بتاتا ہوں، اس نے خاردار تاریں نیچے کو دبا کر اور پھلانگ کر نیلماں کے برابر آ کھڑا ہوا۔"

"مجو بابو ہم تو ہتیں مل سکتے ہیں یہیں اسی جگہ۔ ذرا ذرا سا ہٹنے پر بھی، وہ دیکھو اس جھونپڑی کے لوگ یہیں دیکھ سکتے ہیں"

"نیلماں" اور اس نے اس کا ہات تھام لیا۔

"کہیں بیٹھ کر باتیں کریں، تمہارے ہاں کوئی ہے اس وقت"

"ہاں مجو جی تو ہیں بھاگی تمہاری آواز سنتے کے ساتھ۔ میں نے سوچا کہیں مجو اندر ہی نہ آ جائے۔"

"پھر کیا ہوتا نیلماں میں اندر چلا آتا" اس کی آواز میں شرارت تھی۔

"اونہہ! بڈھی اٹھ جاتے تو....."

"سچ مچ نیلماں، میں اکثر سوچتا ہوں قدرت بھی مذاق ہی کرتی ہے، بعض لوگوں کے ساتھ، کس قدر ظلم ہوا تمہارے ساتھ۔"

"مجو" اور ایک لمبی آہ بھر کر رہ گئی۔

"آخر تمہاری ماں نے کیا سوچا تھا؟"

"چھوڑو مجو بزدلوں کی سی باتیں نہ کرو۔"

"بزدلوں کی سی، کیسی بزدلی۔"

"بزدلی ہی تو ہے، جو گذری باتوں کو روتے ہو، بہادروں کا کام آیندہ کے لیے کچھ سوچنا ہوتا ہے۔"

"تمہاری شامت آئی ہے نیلماں" آواز میں شوخی اور شرارت تھی۔

"کیسی شامت"

"بڈھی کو پتا چل گیا تو...." پھر دور سے کسی کی آواز پر وہ چونک گئے۔

"کون ہے، گیٹ کس نے کھولا، کس نے دی چابی۔" کوئی زور زور سے چلا رہا تھا۔ منتشر ہوتے ہوئے دونوں عکس شیشے پر ابھرے اور غایب ہو گئے۔ ایک لمحے کو لمبا سایا، اس کے بعد شیشے میں چمکتا ہوا سایا بلکل خالی تھا۔ دم بھر کو دو آدمی دبی ہوئی تاروں کو درست کر رہے تھے۔ جہاں سے مجو پلانگ کر آیا تھا۔

"پہچانا نہیں گیا، خیر پتا لگا کے رہوں گا جا سے گا کہاں بچ کے۔"

"پرلے رستے سے یہ لوگ آ جا سکتے ہیں پھر نہ جانے کیوں۔" اور اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی، گرما کی چلچلاتی دوپہر، گہرا سناٹا۔ جانے کب مجھے نیند نے آ دبایا۔ پھر آنکھ کھلی ہے تو چار بج چکے تھے۔

کمرے کی ویران فضا میں یہ روشن دان پر دیکھنے سے کم نہیں تھا۔ دل پر بیٹھی ہوئی اداسیاں کچھ اسی کے ذریعے

جہاں جاتی تھیں۔ نیلماں اور مجو مجھے ایک اہم کردار معلوم ہو رہے تھے، مگر کئی روز گذر جانے پر بھی وہ لوگ یہاں نہیں آئے تھے۔ مجھے اس سے پہلے شیشے پر کبھی کسی عکس کا انتظار نہیں ہوتا تھا، لیکن اب جانے کیسی کرید تھی، جو میرے دل کو طرح طرح کے واہموں میں مبتلا کر رہی تھی۔ بارہا مجھے جھلاہٹ سی ہوئی۔ آخر مجھے کیا پڑی کسی کے متعلق، مگر لیٹتے ہی غیر شعوری طور پر مجھے ان کا انتظار ہونے لگتا۔ اور بہت دن یوں ہی گذر جانے پر مجھے ناامیدی سی ہو گئی۔ ایک دن اچانک "مجو تم آ گئے" کی جانی پہچانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میری تمام تر دلچسپی سمٹ کر شیشوں پر پہنچ گئی۔

"مجو" آواز میں بے پناہ درد پایا جاتا تھا۔

"ہاں" شدت ضبط سے آواز گھٹ رہی تھی۔

"میں تمام رات سو نہیں سکی مجو"

"میں بھی نہیں سویا نیلماں"

"تم ہمت کرو تو....."

"ہاں تو..... کیا"

"سب مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں اور کیا"

"مگر نیلماں مارشل لا ہے۔ تلاشی گرفتیں اب معمول نہیں رہیں"

"مجھے معلوم ہے مجو، مگر مجھے تم سے بڑی امید ہے، آہ تمہاری سانسیں کس قدر میٹھی ہیں۔ اور مجو"

"ہاں کہو"

"بڈھوں کی سانسوں میں مٹھاس کیوں نہیں رہتی"

مجو ہنسی روک نہ سکا۔ نیلماں کے چہرے پر کچھ قدرے جھینپ سی پیدا ہوئی دوسرے ہی لمحے شیشے پر مجو کی پشت سے نیلماں کا سر لگا ہوا تھا، اور وہ اس کی نرم و نازک قمیص کو انگلیوں سے مسل رہی تھی۔ آنکھیں بے خودی کی سی کیفیت میں بند تھیں۔

"جانے تم نے کیا جادو کر دیا ہے نیلماں میں سب کچھ بھولے ہوئے کھنچا آ رہا ہوں"

"مجھ سے نہیں کٹتی یہ زندگی مجو تمہارے بغیر جب تک تمہیں نہیں دیکھا تھا کچھ زیادہ احساس نہیں تھا، مگر....."

عکس کانپ رہا تھا اور میں نے دیکھا سیاہ آنکھیں موتی بکھیر رہی ہیں۔

"نیلماں، گھبراؤ نہیں..... مجھے بھی چین نہیں پڑتا تمہارے بغیر میں کچھ سوچوں گا"

"ضرور، ضرور میرے اچھے مجو" پگھلتے ہوئے موتی سمٹ گئے۔ کمزوری دور ہو گئی۔ اور وہی چلبلاہٹ پھر سے آ گئی۔

"اچھا اب میں جاتی ہوں۔ کہیں وہ ٹالسٹائی سنبا قابو سے باہر نہ نکلے"

"اچھا نیلماں" دھیرے سے دانتوں کی موتیوں کی سی لڑیاں چمکیں اور عکس منتشر ہو گئے۔ کیتلی میں چائے ابھی گرم تھی۔ میں نے پیالی میں انڈیلی چسکیاں شروع کر دیں اور کاغذ قلم سنبھالا لیا، لیکن بہت کچھ سوچ بچار اندازے لگانے وغیرہ کے باوجود کہانی تشنہ ہی معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے ٹیبل پر پھیلے ہوئے کاغذ کے دستے سمیٹ دیے، اور لیٹتے ہوئے امید بھری نظروں سے روشن دان کی طرف دیکھا، دو سہ دن اور پھر تیسرا دن بھی بیت گیا، مگر چلچلاتی دھوپ سے چمکتے میدان پر کسی کے قدم ابھی تک نہیں ابھرے تھے۔ میری آنکھیں بے چین ہو کر بارہا شیشوں کی طرف اٹھ چکی تھیں۔

شام کو کافی دیر تک مجھے باہر رہنا پڑا۔ رات ہو چکی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کر کے بتی گل کر دی اور پنکھا کھول لیا۔ صدیقی صاحب کے گھر کی روشنی میرے روشن دان پر پڑ رہی تھی۔ یہ روشن دان جو اس وقت کوئی بھی عکس قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پہلو بدلا۔ طرح طرح کے خیالات کا ہجوم نیند سے کوسوں دور لیے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں صدیقی صاحب کی بتیاں بھی گل ہو گئیں، اور چاروں طرف گہرے سناٹے چھا گئے۔ دفعتہً دبے دبے قدموں کی ہلکی چاپ اور کھسر پھسر سنائی دی۔ میں نے سیدھے لیٹتے ہوئے روشن دان کو دیکھا جہاں مکمل تاریکی تھی۔

"جلدی کرو مجو"

"ہٹو، کمبخت کانٹے دار تار ہیں۔ اور کہیں الجھ جاؤں

تو مصیبت ہی آجائے گی"

"چپ، چپ..... شاید کوئی..."

"نہیں کچھ نہیں تمہارا وہم ہے۔"

"میرا دل دھڑک رہا ہے۔"

"ڈرو نہیں..... میں جھکتا ہوں، تم میری پیٹھ پر کھڑی ہو کر پھلانگ جاؤ۔"

لمحا بھر بعد تاروں کی جھنجھناہٹ اور دھپ سے کسی کے کودنے کی آواز ابھری۔ میں نے ہولے سے بستر پر کھڑے ہو کر آنکھوں کی پوری قوت سے کام لیتے ہوئے دیکھنا شروع کیا۔ دو سائے تیزی سے سڑک کی جانب بڑے چلے جا رہے تھے تھوڑی دیر میں وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی خاموشیاں، وہی سناٹے چاروں طرف بکھر گئے۔ گھنٹا بھر پہلو بدلتے رہنے کے بعد مجھے نیند نے آ دبایا۔ پھر آنکھ کھلی ہے تو افق سے ابھرتے سورج کی اولین کرنیں روشن دان پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے انگڑائی لی اور منتشر بالوں پر ہات پھیرا۔

"آکھوں آکھوں" کوئی کراہتا ہوا لاٹھی کے سہارے روشن دان تلے آ رہا تھا۔

"آکھوں آکھوں..... ہوں جانے کہاں چلی گئی۔"

"کسے ڈھونڈ رہے ہو بابا جی" مہترانی کی جانی پہچانی آواز گونجی جو کہ سپر سپر میدان میں جھاڑو لگا رہی تھی۔

"نیلماں کو دیکھا ہے کہیں تو نے جمعدارنی؟"

"نہیں بابا" اور جھاڑو کی آواز رک گئی۔

"جائے کہاں چلی گئی..... آکھوں... آکھوں، رات بھر آوازیں دیتا رہا آ آ آکھوں۔"

"یہاں بڑے بابو کے ہاں پوچھو، شاید ادھر آ نکلی ہو۔" اور جمعدارنی نے خدا ہی بڑا کر صدیقی صاحب کے کواڑ کھٹکھٹا دیے۔ ذرا دیر میں صدیقی صاحب رات کے کپڑوں میں آنکھیں ملتے ہوئے نکلے۔

"کیا ہے بابا" انہوں نے بھاری آواز میں پوچھا

"وہ ادھر تو نہیں آئی..... ہوں ہوں۔"

"کون"

"نیلماں بابو جی، شاید کسی کام سے آپ کے ہاں چلی آئی ہو، رات بھر پکارتا رہا ہے چارا بایا۔" جمعدارنی کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔

"نہیں بابا ہمارے ہاں کوئی نہیں آیا۔ نیلماں تمہاری بیوی ہے نا۔ وہی جوان لڑکی سی۔"

"ہاں ہاں بابو جی" اور وہ کراہتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔ ادھر سے اور سیرورانی بھی آن کھڑے ہوئے۔ مجھے اس وقت نیلماں اور مجو کے علاوہ اخدا اپنے مجرم ہونے کا احساس چبھ رہا تھا۔ اور باوجود کوشش کے صدیقی صاحب اور بابا کے سامنے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

"میں لٹ گیا بابو جی..... میں برباد ہو گیا... ہائے۔"

"اس آزادی کے زمانے میں بھلا بے جوڑ زندگیاں کٹ کے رہ سکتی ہیں۔" صدیقی صاحب نے ورانی صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تھوڑے ہی دن تو ہوئے ہمارے مزدور تیار ہے تھے کہ نیلماں اور ایک اجنبی سا مرد اس گیٹ کے اندر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پکارنے پر وہ مرد پھلانگ کر بھاگ گیا۔ پہچانا نہیں گیا۔ بابا کے لحاظ سے میں نے نیلماں سے بھی پوچھ کچھ نہیں کی۔"

"ہاں اسی قسم کی بیہودگیوں سے تنگ آ کر میں نے یہ رستا بند کروایا ہے، مگر....."

"وہ دیکھو اس طرف سے تاریں جھکی ہوئی ہیں۔ ضرور کوئی نکل کے گیا ہے۔"

"آکھوں..... ہوں..... ہائے آپ نے مجھ سے کہا ہوتا بابو جی میں اسی وقت ٹانگیں توڑ دیتا اس کی۔"

"ورانی صاحب اس باڑ کو اور اونچی کرا دو، آدمی کے سر سے بھی اونچی۔ تھوڑی دیر میں سب چلے گئے۔ بابا کی آکھوں آنکھوں دیر تک میدان میں گونجتی رہی، جو کہ بلغم تھوکتا ہوا بھی روشن دان کے شیشوں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی اور میں خیالات کا ہجوم بستر پر ہی اتار پھینکا۔ پھر دوپہر تک میں نے دیکھا خاردار تاروں کی باڑ واقعی آدمی کے سر سے اونچی تھی اور اب

ذوقؔ بحیثیت ایک حرماں نصیب شاعر

ظفر احمد

آیا ہوں نورلے کے میں بزم سخن میں ذوقؔ
آنکھوں پہ سب بٹھائیں گے اہل سخن مجھے

غزل ہندستانی شاعری کی جب بات آتی ہے تو ہماری نظر شیرازؔ ذوقؔ پر تھوڑی دیر کے لیے آکر رک جاتی ہے۔ چونکہ ذوقؔ اپنے دور کے ایک ایسے شاعر ہیں جو نہ صرف آسمان شاعری پر ایک روشن ستارے کے مانند طلوع ہوئے، بلکہ ہندستانی کو زبان و بیان کے لحاظ سے نئی دھرتی اور نیا آکاش بھی دیا ہے۔ جہاں آج بھی ان کی کیف آور غزلیں، رنگین رباعیاں، حسین مثنویاں، پرشوکت قصیدے، پرعظمت سہرے اور دلکش قطعے درخشاں ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور ان حسین راہوں کا پتا دیتے ہیں جن پر چل کر ہندستانی زبان میں نکھار و بہار آئی اور اس میں کچھ ایسا حسن و شگفتگی، تازگی و توانائی اور شیرینی و گھلاوٹ پیدا ہوئی کہ آج ایک صدی گذر جانے کے باوجود وہ تاثر جو معنی و دلکشی و رعنائی کے لحاظ سے بے پناہ اور بھرپور ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں ؎

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے
تمہیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

ذوقؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسے دور میں جبکہ غالبؔ اور مومنؔ جیسے مشہور شاعر فارسی کی شکل ترکیبوں، محاوروں اور لفظوں کی تبلیغ کر رہے تھے، ایک ایسی زبان کو اپنایا جس کے سرچشمے عوام کے دلوں سے پھوٹتے تھے، جو گلیوں، کوچوں، بازاروں اور گھر کے آنگنوں سے لیکر شاہی دربار و تک پروان چڑھی اور سجی جاتی تھی۔ جو اپنی پاکیزگی، روانی، سادگی اور خوبصورتی میں بے مثال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی باوجود بے پناہ عظمت کے غالبؔ کی مشکل پسندی کے مقابلے میں ذوقؔ کی ہندستانی ترکیبوں، تشبیہوں، محاوروں اور نازک و گداز لہجے کا بانکپن اور اس کی کھنک دلوں کو تڑپا جاتی ہے اور ہم ان کی شاعری پر وجد کرا اٹھتے ہیں، ان کے خیال کی نزاکت اور نفاست پر جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ غالبؔ فرماتے ہیں ۔

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے جان عزیز

اب ذرا ذوقؔ کی سادگی ملاحظہ ہو ؎

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

غالبؔ فرماتے ہیں ؎

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

اور ذوقؔ اسی مضمون میں اپنے انداز بیاں سے جو حسن کاری و سحر کاری پیدا کرتے ہیں وہ معنی و تاثر کے لحاظ سے بے پناہ اور بھرپور ہے ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسی طرح مرزا لبواں بخت کی شادی میں جب مرزا غالبؔ نے اپنا مشہور سہرا شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جس کا مقطع تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

تو ذوقؔ نے اسی روز اسی وقت اور اسی قافیے اور ردیف میں جو جوابی سہرا لکھا وہ نہ صرف غالبؔ کے سہرے سے بڑھ گیا

ان حالات میں ہمیں مختلف قسم کے کتبات میں سے معلومات کے خصوں کو جمع کرنے کی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور انہیں جوڑ کر داستان تیار کی جاتی ہے۔ بہرحال کسی کتبے سے حاصل کی ہوئی معلومات کو نہایت معتبر خیال کیا جاتا ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ کتبے میں بیان کیا گیا ہے وہ لازمی طور پر حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کتبے کی تحریر کے کسی خاص حصے کی ترجمانی میں اختلاف رائے ہو۔ ایک ہی واقعے کے متعلق مختلف کتبات پر درج کیے بیانات میں ٹکراو موجود ہو' یا تحقیق کے بعد کوئی کتبا جعلی ثابت ہو' یہ باتیں تو بطور معترضہ کے طور پر بیان ہوئیں' لیکن کتبات کی شہادت بڑی حد تک ناقابل تردید ہوتی ہے۔

دھات اور پتھر پر کتبات

اگرچے کتبات ہر قسم کی اشیا پر کھودے گئے ہیں' لیکن دھات اور پتھر پر کتبات کی تعداد بہت زیادہ ہے' اگرچے سونے اور چاندی کے پتروں پر بھی کتبات کی مثالیں موجود ہیں' لیکن کانسے' پیتل اور تانبے کے برتنوں' مورتیوں' پلیٹوں وغیرہ پر کتبات کہیں زیادہ تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ لوہے کی چیزوں پر کتبات بہت کمیاب ہیں۔ دلی کے قریب مہرولی میں لوہے کی لاٹ ان کتبات کی ایک اچھی مثال ہے' اگرچے عام طور پر کتبات کھدے ہوئے ملتے ہیں' لیکن چند ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن میں کتبات کی نقاشی کی گئی ہے یا روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔

قدیم کتبات

اب تک ہندستان میں جو قدیم کتبات دریافت کیے گئے ہیں وہ ہڑپا اور موہن جوداڑو کی مشہور عالم مہروں پر کھدے ہوئے ملے ہیں' جو ایرق کی بنی ہوئی ہیں۔ ایسی ہی کھدی ہوئی مہریں ہڑپا عہد کے دوسرے مقامات مثلاً مشرقی پنجاب میں روپڑ اور سوراشٹر میں لوتھل میں بھی ملی ہیں۔ ان کا بعید معلوم کرنے کی مسلسل جد وجہد کے باوجود یہ چھوٹے چھوٹے کتبات ابھی تک ایک معما بنے ہوئے ہیں' لیکن یہ بات یقینی ضرور ہے کہ کتبات کا رسم خط برہمی حروف کا پیش رو ہے' جس کی موریا خاندان کے شہنشاہ اشوک کے کتبات میں پوری پوری نمایندگی کی گئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان میں کتبات کے رموز کو پڑھنے کی ابتدا اشوک کے فرمانوں سے ہوئی۔ یہ کتبات ٹریڈسو سے بھی زیادہ ہیں اور تمام ہندستان میں پھیلے ہوئے ہیں' ان میں سے کچھ کتبات مغربی پاکستان اور افغانستان میں بھی موجود ہیں۔ ہندستان میں جو کتبات ہیں وہ دو رسم خط یا پراکرت زبان میں ہیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم پر اشوک کی ایک شہنشاہ اور ایک پرجوش مبلغ کی حیثیت اس کے انہیں کتبات کی بدولت ظاہر ہوئی ہے۔

کتبات کی زبان

یہ بات بہت نمایاں ہے کہ ہندستان میں اشوک سے پہلے کے زمانے کے چند ہی کتبات دریافت ہوئے ہیں۔ قبل اشوک اور اشوک کے زمانے نیز اشوک کے بعد کے زمانے کے تمام قدیم ترین کتبات پراکرت زبان میں ہیں۔ جبکہ ویدوں' پرانوں' رامائن اور مہابھارت کی قدامت کے پیش نظر اس بات کی توقع کی جائے گی کہ ہندستان کے قدیم کتبات میں سنسکرت کی بھی مناسب نمایندگی کی گئی ہوگی۔ ہندستان میں قبل مسیح عہد کے سنسکرت کے جو کتبات ملے ہیں' ان کی تعداد صرف دو یا تین ہے اور وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی کے بعد سے ہندستان میں سنسکرت غالب آگئی تھی اور اس نے عملی طور پر پراکرت کی جگہ لے لی تھی۔

قدیم کتبات ہمارے لیے ایک راز سربستہ ہوتے' لیکن ہم اس میدان کے پیش رو اشخاص کی جد وجہد کے مرہون منت ہیں اور ہم بیسنر پرنسپ کے بھی خاص طور پر ممنون ہیں کہ موصوف نے اشوک کے فرمانوں کے رموز کی ترجمانی کی اور ہندستان کے قدیم ترین اور تاریخی رسم خط برہمی کو پڑھنے کے لیے ایک خاص ذریعہ مہیا کردیا۔

اس سلسلے کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہندستان کے تمام جدید رسم خط مثلاً دیوناگری' گجراتی' بنگالی' اڑیا' تیلگو' انڈونیشیا اور سیلون وغیرہ کے رسم خط کی اصل برہمی حروف ہی ہیں' جو اشوک کے فرمانوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

تاریخ کی از سر نو تدوین

یہ تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندستان کی قدیم تاریخ بنانے میں کس حد تک مدد ملی ہے' البتہ یہ بتانا کافی ہوگا کہ اس سنسکرت تاریخ کے لیے باب ضرور مہیا ہوئے ہیں' جو اس مختصر سے مضمون میں

ہار جیت

عفت سوہانی ایم۔ اے

"کیا یہ شکل کسی انسان کی ہے؟"... شہدی آئینہ سامنے رکھے سوچا کرتا۔ اگر اسے دنیا میں آنا ہی تھا تو بچے ڈھنگ کی نکلی لے کر آتا۔ اف ـــــ اب تو راتوں کو باہر نکلتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔ کمزور دل لوگ جنہیں مارنے لگیں گے۔ بچے ڈر کر بے ہوش ہو جائیں گے۔ اور لڑکیاں تو دہشت کے مارے ہی جائیں گی۔ یہ بھی کوئی صورت ہے۔ عجب طرح کا سیاہی مائل بھورا بھورا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں... موٹے موٹے ہونٹ تو بس ایسے کہ سڑک کا سائیکل پنکچر جہاز دیکھے تو غش کھا جائے۔ پہاڑ جیسا بے ڈھنگا ڈیل ڈول۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں۔ خدا غارت کرے۔ وہ بنا کر رہ جاتا۔

شہدی لیے سانس لینے کے لیے ایک ناک بھی ہے، سنے کو دو کان اپنی خوبصورت دنیا دکھانے کے لیے اللہ میاں نے دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ یا اللہ..... کہاں بھاگ جاؤں..... کدھر صورت کو دفن کروں۔ یہ سب لوگ دیکھ دیکھ کر ہنستے ہیں۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں... ادھر... ادھر... سڑکوں پر..... جیسے پنجرا گھر کا جانس چلا جا رہا ہو..... اب کیا بتائیں کہ پنجرا کیا ہوتا ہے۔

پہلے بھی یہ احساس تھا، مگر اتنی شدت سے نہیں۔ کالج کے لڑکے اسے دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے تھے، مگر کالج کے بعد یونیورسٹی کی زندگی نے اسے نمایاں کر کے رکھا تھا۔ اول روز وہ ایسی چانسلر کے اجلاس سے باہر آ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہانک لگائی "مصر کے بازاروں کی کھوئی ہوئی لڑکی"۔ پھر جو ہنسنے لگے ہیں تو وہ بد حواس ہو کر رہ گیا۔ وہاں سے بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ کسی ستم ظریف نے چپراس لگا کر ڈھیر کر دیا۔ اور اس کے بعد قہقہوں کی گونج کے سوا کچھ سنائی نہ جا سکا۔

اب یہ چپراسے مستقل طور پر قہقہوں پر دھر لیا گیا۔ اس کی دلی تمنا پوری ہو گیا تھا۔ خیال تھا دو تین دن یہ سب کچھ ایک وقت کے بعد ختم ہو جائے گا، مگر جیسے یونیورسٹی کی چہل پہل بڑھتی گئی، دل شکن فقرے اور تیز ریمارک بھی بڑھتے گئے۔ یونیورسٹی میں تعلیم پانے اور ملک بھر کے آدھے پڑھے لکھے سارے دلولے سر پر چڑھے جا رہے تھے۔ وہ پہروں اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہتا، اور روتا رہتا۔ ماں کے پاس کوئی مداوا نہیں تھا لڑکوں کے ریمارک کی کسی صدمک سہہ بھی لیے جاتے، مگر لڑکیوں کی دبی دبی مسکراہٹیں اسے کسی طرح برداشت نہ کی جاتیں۔

وہ اپنی بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ اس بھری پری دنیا میں کون تھا جو اس کے سر پر ہاتھ رکھتا، تسلیاں دیتا، سمجھاتا، اس کا غم بانٹتا۔ اب تو وہ ہے اور اس کا ٹوٹا پھوٹا دل۔ اس نے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دن رات بستر پر پڑا ہوا سوچتا رہتا۔ کاش! کاش! وہ بھی حسین ہوتا، اور پھر سوچ کی اڑان اسے پریوں کے دیس اڑا لے جاتی۔ جہاں وہ پریوں کا شہزادہ ہوتا۔ ننھی ننھی پریاں موی پاؤں میں چاندی کے گھنگرو باندھے اس کے اطراف رقص کرتیں۔ وہ مسکراتا، اور پھر چند ساعتوں کے لیے ہی سہی اپنے اس بھدنگ اور بے کیف ماحول سے نکل جاتا، مگر جب گھنگرو کی جھنکار کرفت اور دل آزار قہقہوں سے بدل جاتی، وہ سوچتا، کاش اس میں مر جانے کی ہمت ہوتی، وہ مر جاتا..... مرتے مرتے کہہ جاتا کہ خوبصورت دنیا کے رہنے والو کیا تم نے اسی خطا پر مجھے مارا کہ خطا کار نہ تھا میں تمہاری طرح حسین نہیں تو کیا ہوا۔ میرا دل دیکھ کر دیکھو میرا دل بہت خوبصورت ہے۔ تمہاری شکل سے کہیں زیادہ۔ مجھ پر نہ سہی خدا پر رحم کرو۔ رحم کرو۔

اس کے ہاتھ اپنے پھیکے ہوئے چہرے پر پہنچ جاتے! سب سے زیادہ تکلیف اسے زیدی اور حسین سے پہنچتی تھی! زیدی یونیورسٹی کا ہیرو تھا! نوجوان... ہرا بھرا جسم... نیلی آنکھیں... دلآویز حسین۔ یونیورسٹی کی "کوئن آف بیوٹی" بنی جاتی۔ زیدی حسین کو اپنا سمجھتا... اور اسی لیے وہ مغرور تھا... اتنا سے زیادہ وہ مشہدی کو چھیڑتا اپنا فرض حال کرتا۔ ایک دن وہ مشہدی کو چھیڑتا

کس رہا تھا! جیسمین ہنس رہی تھی! اس دن مشہدی نے کہہ ہی دیا۔

"زیدی صاحب بچ پر نہ بیٹھیے میں نے اپنی صورت نہیں بنائی ہے اگر صورت بنانے پر قادر ہوتا تو آپ کا سا کیوں نہ بن جاتا۔"

جیسمین تو خاموش رہی، مگر زیدی نے جھوٹتے ہی کہا۔

"ارے بھیا! تو پھر اپنے حصے کی مٹی اللہ میاں سے مانگ لی ہوتی۔ میرے جیسے بن جاتے!"

سب ہنس پڑے۔ مشہدی کا دل بھر آیا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور پھر بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو پڑا۔ اس کی سمجھ میں یہی آرہا تھا کہ یونیورسٹی چھوڑ کر چلا جائے! ام۔ اے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نوکری ملنی ہوگی تو ملے گی۔ ورنہ رکشا چلا لے گا۔

اور پھر وہ اسی روز گھر چلا آیا۔ سب سے پہلے بھابی دوڑی آئیں۔ اسے مضمحل اور افسردہ دیکھ کر بہت ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے بھیا، تم یونیورسٹی سے ایک دم کیسے چلے آئے"

تو یہ بھابی کیوں اتنی ہمدردی کرتی ہیں۔ اسی لیے نا کہ وہ ہمدردی اور محبت کا محتاج ہے۔ پھر اسے غصہ آگیا۔

"پھر کب تک دوسروں کے طنز سہتا.... کب تک لوگوں کے قہقہے برداشت کرتا۔ اگر میں بدشکل ہوں تو انہیں مجھ پر ہنسنے کا کیا حق ہے، خطا کار میں نہیں! میرے بنانے والے نے مجھے ایسا کیوں بنا دیا۔ اس سے کیسے پوچھوں۔ اس نے مجھے یہ بدنصیبی کیوں دی ہے؟ نہیں بھابی.... صبر و ضبط کی ایک حد ہوتی ہے اب میں کچھ نہیں سہہ سکتا۔ میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گا... کبھی نہیں، بلکے اس گھر میں بھی نہیں رہوں گا۔ وہیں چلا جاؤں گا جہاں سے آیا تھا۔"

"پاگل نہ بنو مشہدی بھیا!" بھابی نرم اور آہستہ آواز میں سمجھانے لگیں۔ "اچھے لوگوں پر ہنسنا دنیا نے انگلیاں اٹھائی ہیں۔ پرائی بدنصیبی کے پیچھے اپنی ناک نہیں کاٹتے! تم بدصورت نہیں ہو۔ مشہدی بھیا، تم ہزاروں سے زیادہ خوبصورت ہو، کیونکہ تمہارا دل خوبصورت ہے! صورت خاک میں مل جاتی ہے، مگر سیرت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔"

اس کے دماغ سے پردا سا ہٹ گیا۔ بھابی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ پھر اس نے کچھ سوچا نہ سمجھا۔ اسی دن یونیورسٹی واپس چلا گیا، لیکن اب وہ پہلا سا مشہدی نہ تھا! ان سب کے خلاف.... نفرت اور بغاوت کی زبردست آگ نے اس کی ساری کمزوری اور بزدلی بھسم کر کے رکھ دی تھی! اب وہ پھر اپنا پختہ بن گیا تھا۔

یونیورسٹی کے حلقے میں یہ خبر گرم تھی کہ "بھوت ٹوکر بھاگ گیا" مگر پھر اچانک ہی بھوت کو دوبارہ دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے تھے زیدی نے تمسخرانہ انداز میں کہا "بدصورت بلا پھر منحوس ہو گئی"

ہاسٹل کے طلبہ کے درمیان اس کا قہقہہ سب سے زیادہ بلند اور طویل تھا! اپنے تحیر اور تعجب میں یہ کسی نے محسوس نہیں کیا۔ اس کے قہقہے میں کیسا زہر بھرا ہوا تھا۔ زیدی بھی اسے اپنا شریک سمجھ کر کچھ خوف زدا سا ہو گیا تھا۔ سبھوں کو حیرت تھی! ایک ہی دن میں کیا کایا پلٹ ہو گئی تھی؟ کہیں کسی سے ٹکر پڑی! اکر تو نہیں دم کر آیا۔ کمزور سا بدصورت آدمی۔ جو دن بھر پڑا اپنی تقدیر پر آنسو بہاتا رہتا تھا۔ اب بجلی کی طرح ساری یونیورسٹی میں کوندتا پھرتا ہے۔ پروفیسر اس کی ذہانت کا لوہا مان گئے تھے۔ ان کی تعریفوں میں جھلکنے لگی تھی۔ تقریر ہو یا تحریر مشہدی بازی مار لے جاتے!..... امتحان میں نمایاں رہتا، اس کی تقریر ہو گئی تھی! بہرحال اب وہ تھا اور اس کے مداحوں کا وسیع حلقہ.... اس نے میٹھی زبان سے بہتوں کو جیت لیا تھا۔

نمایاں ہی چکرا کر رہ گیا تھا! اسے شدید حیرت تھی، مگر وہ اب بھی مشہدی کو بھوت، ٹوٹے کا جن، سلیمان کا گمراہ اور عوج بن عنق کہنے سے باز نہ آتا.... مشہدی ایک زوردار قہقہہ مار کر کہتا... "بہت اچھے زیدی صاحب! مجھے بناتے وقت اللہ میاں نے بھی اتنے نام نہیں سوچے ہوں گے.... جو آپ نے مجھے بخشے ہیں، شکریا! بہت بہت شکریا!"

"ہمارے دیکھو تو! ٹوٹے کا جن اب ہمارے منہ بھی آنے لگا" زیدی دوستوں سے داد طلب کرتا۔

"میں بے چارا آپ کے منہ کہاں لگ سکتا ہوں، مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اپنی طرح مجھے بھی سمجھیے جس طرح آپ کو جینے کا

حق ہے، مجھے بھی ہے، کیا میں مسکرا بھی نہیں سکتا؟"

"کیوں نہیں.... کیوں نہیں!.... اپنے چاند سے مکھڑے پر دل کھول کر مسکرایئے۔"

"چاند سا مکھڑا تو آپ کا ہے.... آپ میرے دوست ہیں، اپنے دوست کی خوبصورتی پر میں اتنا مسکرا دوں گا۔"

"گھٹے ہو۔ پالیٹشین ہو۔ یار! مونہہ دھو رکھو... مشہدی صاحب ادھر تمہارا کوئی دوست نہیں۔"

"چلیے! دشمن ہی سہی.... لاگ کو ہم لگاؤ سمجھ لیتے ہیں۔"

"یہاں کچھ بھی نہیں ہے، براہ کرم دھوکا نہ کھایئے گا!" زیدی نے حقارت سے کہہ ہی دیا۔

اسے کیا پتا تھا کہ دھوکا وہ خد کھا رہا تھا!.... اصل میں اسے جیسمین سے ناامیدی تھی۔ وہ بھی مشہدی کو "اندھیرے کا چمگادڑ" "علاما کارٹون" وغیرہ کہتی رہتی۔ اسے اس کے کردار سے سخت نفرت تھی، مگر اس کی ہر ایک چھیڑ چھاڑ اور ریمارک کا جواب مشہدی کی مسلسل خاشی تھی۔... اور یہی کردار جیسمین کو متاثر کر گیا، اور اب جبکہ اندھیرے کا چمگادڑ رہنا ہے ختم ہو گیا تھا، اور جگمگاتا ہوا آفتاب نکل آیا تھا، جیسمین اس کی تیز روشنی میں نہا گئی تھی، مشہدی کا سنہرا مستقبل اس کے سامنے مسکرا رہا تھا! صورت سے وہ بہت واہیات تھا، مگر سیرت سے ساری یونیورسٹی کا دل موہ لیا تھا۔

نہ بیل ہی تملا کر رہ گیا تھا.... پہلے تو وہ صرف شرارت مشہدی کو سناتا تھا، مگر اب وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے طنز اور دلشکن ہوتے گئے۔ اسے اس سلوک سے اور غرض کہ مشہدی جواب میں کچھ کہتا کیوں نہیں.... اسے اس کی قطعی توقع نہ تھی کہ جیسمین ایک دن مانس کی تائید کرے گی.... زیدی کیا.. جس نے سنا اسے حیرت ہوئی، مگر جیسمین کی اس تبدیلی کی خبر مشہدی کے فرشتوں کو بھی نہ تھی۔

اسے خبر بھی ہوئی تو اچانک.... انگلش کلاس میں سب جمع تھے۔ پروفیسر صاحب کا انتظار تھا۔ مشہدی سب سے الگ تھلگ بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا۔ اگلی قطار میں لڑکیاں تھیں۔ ان کے پیچھے زیدی وغیرہ۔ اچانک ہی سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مشہدی کے سر سے ٹکرائی اور اتفاق سے اس کے سخت گھنگریالے بالوں میں اٹک کر وہیں رہ گئی۔ مشہدی کے بوکھلانے پر کلاس میں ایک زوردار قہقہہ پڑا

"ہوائی جہاز کھجور میں اٹک گیا!" زیدی ہنسی کے مارے بیٹھا جا رہا تھا۔

"مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ زیدی صاحب" اچانک جیسمین بولی۔ زیدی سٹپٹا گیا.... مگر مشہدی کی آنکھیں بیٹی کی بیٹی رہ گئیں۔ شاید بات بڑھ جاتی، مگر پروفیسر صاحب آ گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی.... آج پھر اس نے دل لگا کر نہیں سنا۔ رہ رہ کر اس کی نگاہ جیسمین کی طرف اٹھ جاتی.... اس نے آج ہی سوچا.... وہ بہت خوبصورت تھی۔ اور وہ خد ــــ کہاں حور اور کہاں لنگور.... وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"مسٹر مشہدی!" پروفیسر نے طنز آمیز لہجے میں پکارا

"او! ایکسیوزمی.... سر!" مشہدی گڑبڑا کر بولا۔

مگر پڑھنے میں جی نہیں لگ رہا تھا! کلاس کے بعد وہ لائبریری میں جا کر بیٹھ گیا.... اور دنیا ما فیہا سے بے خبر ہی سوچنے لگا۔ جیسمین جو ہیٹا بڑھ چڑھ کر اسے چھیڑا کرتی تھی اس کی طرفداری کیوں کی تھی۔

"کیا میں آپ کا تھوڑا سا وقت لے سکتی ہوں؟" وہ چونک کر اپنے سامنے کھلے ہوئے پھول کو تکنے لگا.... کچھ کہہ نہ سکا!

"اب کی بار.... میگزین کی ایڈیٹر میں بھی ہوں۔ کیا آپ کوئی چیز میگزین کے لیے لکھ سکیں گے؟" جیسمین پوچھ رہی تھی

"جی ہاں...." اس نے خد کو سنبھال کر آہستہ سے کہا "شکیا! میں کوشش کروں گا۔"

وہ چلی گئی اور مشہدی کو پھر سوچتا چھوڑ گئی۔ تقریب پر ملاقات آخر کیوں؟ بہرحال اس نے بہت کوشش کر کے تین چار دن میں ایک مضمون تیار کیا۔ اور پھر جیسمین کے حوالے کر دیا۔ اس نے ورق کھولے اور عنوان پر نظر پڑتے ہی بوکھلا گئی.... لکھا تھا۔

"اندھیرے کا گیدڑ"۔

"مشہدی صاحب"! اس نے ہلکی آواز میں کہا "مجھے بہت افسوس ہے، اپنے پچھلے سلوک کی میں.... معافی مانگتی ہوں۔"

"میں نے برا تو نہیں مانا... بس جمیلہ!" مشہدی نے گھبرا سے کہا "جو جیسا ہوگا کہا جائے گا...."

"نہیں نہیں! میں نے بہت برا کیا تھا" وہ بولی "اگر... آج شام کو گھر پر تشریف لا سکیں... تو میں..."

"شکریہ! مس جمیلہ!" اس نے ہونے سے کہا "میں اس قابل نہیں...." اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ جمیلہ اسے دیکھتی رہی۔ عقیدت اور محبت بھرے انداز سے!

اس سچ مچ وہ اس کی منتظر تھی..... اسے حالات کی کچھ خبر نہ تھی! زیدی نے سب ہی کچھ تھا۔ وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ مشہدی جمیلہ کے گھر جائے..... انتقام ماریٹ کر کے لیا۔ مشہدی کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہ سکا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تب وہ ہاسپٹل کی بجائے ہسپتال میں تھا! سر اور ہاتھوں پر پٹیاں بندی ہوئی تھیں۔ اس نے تنہائی میں سوچا..... زیدی نے اس کے جمیلہ کے التفات کا بدلا لیا ہے — جمیلہ کی بے چینی دیکھ کر زیدی نے طنز کیا۔

"شاید بھوت کسی اور پر چلا گیا"

"آپ کو ایسے ڈیک مذاق نہیں کرنے چاہئیں۔ زیدی صاحب" جمیلہ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں! جناب کو اس گوریلے کی تائید کا حق کس نے دیا ہے؟"

"کسی نے دیا ہو... آپ کو یہ پوچھنے کا کیا حق؟"

"جمیلہ تم اتنی بدل گئی ہو؟"

"میں کیوں بدلتی..... جیسے آپ ہم جماعت ویسے وہ"

"اس کے سوا تمہارے پاس میری اور کوئی حیثیت نہیں؟"

"ہرگز نہیں"

"تو تم اب تک مجھ سے کھیل رہی تھیں"

"زیدی صاحب میں ایسے گھٹیا ڈائیلاگ سننے کی عادی نہیں ہوں"

"جمیلہ..... مت بھولو میں تم سے محبت کرتا ہوں! میری نفرت تمہیں مہنگی پڑے گی"

"محبت کرنے والے ایسے بازاری لہجے میں دھمکایا نہیں کرتے! کیا آپ مجھے اس پر مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ کی شکایت وائس چانسلر صاحب سے کر دوں؟"

"ہاں جمیلہ! میں یہی چاہتا ہوں! محبت کرنے کی سزا کچھ تو ملنی چاہیے۔ میرا سلوک مشہدی سے بہت ناروا تھا۔ اسے میں نے سزا دلایا ہے..... دلایا ہے! اس کی سزا مجھے بھی ملے گی"

"آپ کو سزا ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کیا مطلب!"

"اسی لیے تم مجھ سے خفا ہو نا..... تو اب تم مجھے معاف کر دو! مشہدی کی طرف سے"

"آپ جانیں آپ کا کام..... ان کی طرف سے معاف کرنے والی میں کون ہوتی ہوں!" یہ کہہ کر وہ چلی گئی..... زیدی ہکا بکا کھڑا ہی رہ گیا۔

ایک ماہ کے قریب ہو رہا تھا مگر جمیلہ کو مشہدی کا پتا نہ مل سکا! کبھی کبھی تو اس کا دل ہی ڈوب جاتا! کہیں وہ یونیورسٹی چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا۔ اور اب فائنل ایئر کے امتحان کے صرف دو ہفتے اور باقی تھے۔ جمیلہ بہت مضطرب تھی! یونیورسٹی میں امتحان سے قبل چھٹیاں مل گئی تھیں۔ جمیلہ کا بھی امتحان تھا لیکن وہ اپنی تعلیم سے لاپروا! مشہدی کی فکر میں بے تاب ہو رہی تھی۔ خدا جانے بدصورتی کے اس تودے میں جمیلہ کو حسن کی کرنیں کہاں دکھائی دی تھیں۔

اسی پھر ایک دن اسے مشہدی مل ہی گیا..... اسے اسے ایک کیفے کے دروازے پر دیکھا۔ اس کے سر پر ایک پٹی اب بھی بندھی ہوئی تھی! وہ کیفے کے باہر جا ہی رہا تھا کہ جمیلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

"آپ؟" وہ یہی کہہ سکا۔

"آپ کو کیا ہوا..... اتنے دنوں سے آپ کہاں تھے..؟ میں نے کہاں کہاں —" جمیلہ بولتی چلی گئی! "جمیلہ بولتی چلی گئی"..... مشہدی سوچنے لگا..... کیا اس کے لیے بھی کوئی اس قدر پریشان ہو سکتا ہے؟

"بتایئے! کہاں تھے"

"یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں..... آپ گھر جایئے، میں پھر سب کچھ آپ کو بتا دوں گا۔"

"میں نے آپ کا بہت انتظار کیا۔ آپ گھر بھی نہیں آئے۔"

"اوہ! مس جیسین!..... یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں..... میں آپ سے پھر ملنے کی کوشش کروں گا۔" شہدی شرمندہ ہو رہا تھا!..... کیسے میں آئے جانے والے راہی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔

"آپ کے سر پر پٹی کیوں بندی ہے؟"

"چوٹ لگ گئی تھی..... اچھا..... اب آپ جایئے۔" اس نے ٹالنا چاہا..... مگر جیسین نے اسے نہیں چھوڑا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئی۔ شہدی متحیر تھا..... اس بناوٹ کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

گھر پر جیسین کی خاطر تواضع شدت اختیار کر گئی۔ شہدی کی حیرت سے وہ بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

"آپ گھبرا کیوں رہے ہیں، شہدی صاحب؟"

"جی نہیں، کہاں؟" وہ قریب گیا۔

"آپ امتحان کے دنوں میں کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

وہ خاموش رہا۔

"بولیے نا" اس نے اصرار کیا۔

"اس سال میں امتحان نہیں دے سکتا..... میں نے تیاری نہیں کی۔"

"کیا آپ گھر چلے گئے تھے۔" اسے مضمحل دیکھ کر شہدی دھیرے سے بولا۔

"کچھ ساعتوں کے لیے میں اپنے کو خوش نصیب سمجھ بیٹھا ہوں مس جیسین، مگر اس خوش فہمی کے بدلے بہت سے صدمے سہنے پڑتے ہیں، میں کسی کی شکایت نہیں کرتا..... لیکن اس سال کی تباہی میں میرے پرانے مہربان کا ہاتھ ہے؟"

"تو کیا یہ آپ کا زخم.....!" جیسین کانپ اٹھی

"ایسا ہی سخت جان تھا، سو جیسین!" شہدی مسکرا کر بڑبڑاتا ہوا بولا۔

"میں زیدی کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" جیسین شرم و ندامت سے گلوگیر لہجے میں بولی۔

"میں نے اس کا بہت سا قرض دینا تھا..... آپ کو سنانے میں..... رلانے میں..... میں زیدی کی ہمنوائی کرتی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔"

"بھول جایئے ان سب باتوں کو مس جیسین! کیا میں اب جا سکتا ہوں؟"

وہ ہزار تکلف ہونے کے بعد بھی بہت گھبرا رہا تھا۔ اور پھر اس وقت تو اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب جیسین نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی ایک زوردار سسکی پر منہ کھلا ہی رہ گیا۔

"آپ نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ کہیے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔"

"معاف کر دیا!" وہ بوکھلا کر بول پڑا۔

اس جیسے بدصورت آدمی پر اتنی مہربانی؟..... اچانک ہی ایک سوال اس کے ذہن میں گونجا۔ کہیں وہ اب بھی اسے اپنا سمجھ رہی ہو؟ وہ چونک کر اسے گھورنے لگا..... جیسین بھی اسے دیکھ رہی تھی!..... اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی بھیگی بھیگی پلکیں شرمندے انداز میں جھکنے لگیں۔ شہدی ایک بار پھر دم بخود رہ گیا، مگر اتنا بدھو بھی نہ تھا کہ جو نہ جانتا ایک لڑکی کب شرماتی ہے۔

اور پھر اچانک ہی وہ خدا کو دنیا کا سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت انسان سمجھنے لگا، اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"آج کے مدرسے" سے خطاب

یہ نظم جلد ہی کے "ہندستانی ادب" میں چھپی ہے۔ اس نظم میں فنی عیوب بعض خامیاں رہ گئی ہیں۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ بغیر دیکھے یہ نظم لکھائی کے لیے دیدی گئی، اور یہ بدعت چھپائی کے مراحل طے ہونے تک بھی جاری رہی۔ کیسے اور کیوں ہوا یہ کچھ نہ پوچھیے!

ہندستان کی قدیم تاریخ بنانے میں کتبات کا کردار

ڈاکٹر بہادر چند چھابڑا

کسی قوم کی تاریخ کے بنانے کے تین بڑے ذریعے یعنی روایات، ادب اور آثار قدیما ہوتے ہیں۔ روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں اور اکثر منتقل ہونے کے دوران میں اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے تاریخ کا ایک ذریعہ ہونے کی حیثیت سے روایات بہتا دوسرے وسایل کے ذریعے تصدیق طلب ہو جاتی ہیں۔ تحریر میں آجانے کے بعد روایات ادب کا ایک جز بن جاتی ہیں، اگرچہ ادب کو عام طور پر نظم نگاری خیال کیا جاتا ہے، لیکن ایک وسیع نقطۂ نظر کے اعتبار سے ادب ملک میں تحریرات کا ایک اچھا خاصا ذخیرا بن جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو تاریخ وار سوانح اور واقعات ہوتے ہیں اور دوسری طرف رزمیہ نظموں، شاعری، ڈراموں اور افسانوں کے علاوہ مذہبی کتابیں، قصے روایات اور فلسفیانہ مسایل ہوتے ہیں جو جمع کرنے سے تاریخ کے لیے ایک اچھا وسیلا بن جاتے ہیں لیکن یہ اجزا ہمیشہ قابل اعتماد نہیں ہوتے اور ادب میں ان کی موجودگی حقیقی اور سچے بیانات کے بارے میں بھی شک اور شبہ پیدا کر دیتی ہے۔ ادب میں عموماً ایک وسیع خلا ہوتا ہے۔ جس کو عام طور پر مورخ ناپسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں کاٹ چھانٹ کی گنجایش ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔

آثار قدیما

آثار قدیما کو تاریخ کی ایک بہت پر اعتماد خاما خیال کیا جاتا ہے۔ یہ خاما مختلف قسم کی چیزوں کے ذریعے تاریخ کی خدمت کرتی ہے اور ہر چیز اپنی داستان خود ہی بیان کرتی ہے۔ ماہرین آثار قدیما پتھر کے آلات اور اوزار، مٹی کے برتن، مٹی کے کھلونے اور مورتیاں، زر و جواہر، ہتیار، سکے، تمغے، کتبات، بت، سنگتراشی کے نمونے، ستون، عمارتوں کے کھنڈرات وغیرہ آئے دن اپنے کدال سے کھود کر باہر نکالتے ہیں، یہ سب چیزیں قدیم زمانے میں انسان کی سرگرمیوں کے آثار ہوتے ہیں۔ نیز یہ اشیا اپنے دور کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ اور ایک مستند تاریخ کے بنانے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔

کتبات کا کردار

آثار قدیما کی تفصیلات تاریخ کی ترجمانی کرتی ہیں اور ان میں کتبات بہت موثر اور قابل وثوق ہوتے ہیں۔ کتبا ایک تحریر ہے جو کسی سخت سطح پر کھدی ہوتی ہے۔ انہیں کتبات کا گہرا مطالعہ علم کتبات کہلاتا ہے۔

ہندستان میں "علم کتبات" کو ایک خاص مقام حاصل ہے، اور کتبات نے ہندستان میں تاریخ کی سب سے زیادہ امداد کی ہے۔ آثار قدیما نے تاریخ کے لیے جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان میں علم کتبات کا بھاری جز شامل ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ "علم کتبات" کے بغیر ہندستان کی قدیم تاریخ ایک بے معنی سی چیز ہوتی۔ خوش قسمتی سے ہندستان کو کتبات کا ایک وسیع خزانا ورثے میں ملا ہے، اس کے برعکس ہندستان کے پاس نہ ابتدائی زمانے کی تاریخ کی قدیم دستاویزوں کا کوئی ذخیرا ہے، اور نہ ہی تاریخ وار سوانح اور وقایع موجود ہیں، لیکن جو قدیم کتبات دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے اور ہر سال سیکڑوں نئے کتبات دریافت ہوتے رہتے ہیں۔

کتبات کی افادیت

یہ بات بھی قابل ذکر ہے بہت سے کتبات جن سے ہم بہت زیادا تاریخی مواد حاصل کرتے ہیں حقیقت میں اس کام کے لیے کھودے نہیں گئے تھے۔ یہ صورت حال مفید بھی ہے اور غیر مفید بھی۔ مفید اس وجہ سے کہ ایسی اتفاقی تحریر میں تصنع یا جانبداری کا شایبہ نہیں ہوتا۔ غیر مفید اس لحاظ سے کہ کوئی کتبا زیادا معلومات بہم ہو سکتا تھا اگر وہ تاریخ وار سوانح اور واقعات کے صحیح مفہوم کی ترجمانی کرتا۔

لکھے اپنے شاعرانہ وقار، علمی سنجیدگی، تشبیہوں، استعاروں کی رنگینی، پرعظمت تازگی و روانی اور معنی آفرینی کے باعث سہروں کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
اک گہر بھی نہیں ہمدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

بظاہر ذوق کی زندگی عیشوں اور مسرتوں سے پر نظر آتی ہے اور واقعی ایک معمولی سپاہی کے بیٹے ہو کر نہ صرف شاہ نصیر جیسے شاہی استاد کا شاگرد ہونا، بلکہ صرف اکیس ہی سال کی عمر میں استاد سے بڑھ جانا، غالب جیسے شہور شاعر کی موجودگی میں، بہادر شاہ ظفر کا شاہی استاد مقرر ہو کر خاقانیٔ ہند کا خطاب حاصل کرنا، انعام و اکرام سے جاگیریں پانا، ملک گیر شہرت کا مالک ہونا اور ہر موقع پر کامیابیوں و کامرانیوں کا اس کے قدم چومنا وغیرہ وغیرہ، ایسی باتیں ہیں جو ان کی زندگی اور شاعری میں مسرتوں کا سراغ لگانے پر ہمیں اکساتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوق کی شاعری اضطراب کی شاعری ہے، انتشار کی شاعری ہے، نامرادی، بے چارگی، افسردگی اور حرماں نصیبی کی شاعری ہے۔ چونکہ وہ فطرت سے ایک ایسا آزاد دل و دماغ لے کر آئے تھے جو دربار کی گھٹن اور باتا باتی پر اخلاق اور ضابطے کی کوکلی بندشیں برداشت نہیں کر سکتا تھا، وہ خدا اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ فکر و شاعری کے لیے جو وسعت و آزادی درکار ہے وہ دربار میں ممکن ہی نہیں، چلکے ناممکن ہے، اور جب انہوں نے یہ کہا تھا تو اس سے ان کی یہی مراد تھی ؎

ذوق مرتب کیونکر ہو دیواں شکوۂ زر سے کس سے کریں ہم
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

لیکن ذوق کے ساتھ کچھ ایسی مجبوریاں اور لاچاریاں بھی تھیں جن سے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے اور عملی طور پر ان زنجیروں کو نہ توڑ سکے جس کے خلاف انہوں نے ذہنی بغاوت کی تھی۔ فکر و عمل اور احساس کی اس ناکامی نے ذوق کے لہجے، ذوق کے فلسفے، ذوق کی شاعری، ذوق کی زندگی غرض ہر شے میں ایک عجیب تضاد پیدا کر دیا۔ اپنی ناکامی کے اس احساس کو بھلانے اور اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے آزاد انہوں نے صدیوں کی دبی پرانی اور فرسودا راہ اپنائی جس کا رستا مذہب و تصوف کی وادیوں سے ہوتا ہوا ناکامیوں اور نامرادیوں کے ان گمنام غاروں میں جا کر گم ہو جاتا ہے اور جہاں تیشے سے پتھر توڑنے والا ذوق بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎ کیا فائدہ فکر کم و بیش سے ہوگا

ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ــــ ترے کرم سے ہوا
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

اور یہی جب کرم کی بارش بھی بہرہ ثابت ہوئی، جب دل کے سارے سہارے ٹوٹ گئے، جب امید کی ساری قندیلیں ایک ایک کر کے بجھ گئیں، تو ترک دنیا کی سوجھی، مگر ؎

اے ذوق کرے گا کوئی کیا دنیا ترک
دنیا ہے بری بلا رے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا
جب تک نہ کرے آپ اسے دنیا ترک

اور تنوط و یاس کی اس گہری تاریکی میں گھر کر ذوق صرف اتنا ہی کہہ سکے ؎

دنیا کے الم ذوق اٹھا جائیں گے
ہم کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
اب جائیں گے اوروں کو رلا جائیں گے ۲

۲ اور آخر ۶۴ سال کی بیش بہا ادبی خدمات کے بعد محفل ادب کی یہ شمع آنے والی نسلوں کو ایک گراں قدر سرمایا دیکر محفل کی زینت بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ؎ کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا

* ذوق کی موت کے بعد ان کے شاگرد آزاد نے ان کا خاکہ اپنی مشہور کتاب آب حیات میں لکھا ہے۔ اس خاکے کا اقتباس ہم نے اس مضمون کے شروع میں دیا ہے۔ (ادارہ)

امریک آنند ایڈیٹر چنڈی گڑھ

ساہیتا اکاڈیمی (دلی) کی غلط کارگذاریاں!

مفلس اور غیر قوم کا لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے

اقربا نوازی کے سبب اکاڈیمی میں اندھیر اور لوٹ مچی ہوئی ہے

شری راجگوپال چاری ایسے بدنام ادارے سے استعفا دیدیں!

ساہیتا اکاڈیمی ہندستان کا عالا تارین ادبی ادارا ہے۔ اس کے صدر ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور نائب صدر ملک کے نامور اور معروف زبین ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن ہیں۔ اس کی مجلس عمومی میں شری راجگوپال چاری، سردار پانیکر، سی۔ ڈی دیشمکھ، پروفیسر ہمایون کبیر، خاجا غلام السیدین، ڈاکٹر ملک راج آنند جیسے چوٹی کے اہل قلم اور ادیب شامل ہیں۔ اس کے اہم مقاصد ہندستانی ادبیات کے لیے عالا الاقوامی سیعاد قایم کرنا، مختلف علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانا اور ملک میں تہذیبی ایکتا پیدا کرنے میں مدد دینا ہے۔

اکاڈیمی ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر سال لاکھوں روپے خرچ کرتی ہے۔ پچھلے سال ۱۹۵۹-۶۰ء میں ۴ لاکھ ۳۷ ہزار دو سو چونتیس روپے کا صرفا ہوا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اکاڈیمی کا سالانا بجٹ ایک لاکھ روپے سے کچھ ہی زاید تھا۔ گویا چار برسوں میں اکاڈیمی کا خرچ چار گنا بڑھ گیا ہے، اس میں سے ایک لاکھ روپے دفتری تنخاہوں، ڈیڑھ لاکھ روپے کتابوں کی اشاعت، پچاس ہزار روپے انعامات، ۲۷ ہزار روپیا سفر خرچ، چھ ہزار روپے فرنیچر اور تقریباً ایک لاکھ روپے متفرق کاموں پر خرچ ہوا ہے۔ اس کے باوجود کام کی رفتار وہی ہے جو روز اول تھی۔

یہاں صرف ہندستانی زبان و ادب سے متعلق اکاڈیمی کی سرگرمیوں کا جایزا لینا مقصود ہے۔ ۱۹۵۵ء کی رپورٹ میں اعلان کیا گیا تھا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندستانی کتابوں کی بھاشا وار اردو، عربی، فارسی، ہندستانی تاریخ، ہندستانی شاعری سے انتخاب اور WRITERS WHO'S WHO کا کام شروع ہو چکا ہے، لیکن پانچ سال کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود ابھی ان میں سے ایک کتاب بھی منظر عام پر نہیں آئی۔ جدید رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بھاشا وار تاریخ اور شاعری کے انتخاب پر کام مکمل ہو چکا ہے، لیکن اگر ان کتابوں کے شایع ہونے میں مزید دو برس صرف ہو گئے تو اکاڈیمی کی تیز رفتاری پر کون کافر داد نہ دے گا۔ ساہیتا اکاڈیمی کو قایم کیے ہوئے چھ برس گذر گئے ہیں۔ اس دوران میں اس نے آٹھ عدد کتابیں ترجما کرا کے ہندستانی میں شایع کی ہیں یعنی اوسطاً ۱۳۳ کتاب فی سال شایع کی گئی۔ ہندستانی پر ساہیتا اکاڈیمی کا اوسطاً فی سال خرچ ۲۷ ہزار روپے ہے۔ اس قدر قلیل سرمایے سے اتنی زیادہ کتابیں شایع کرنا اکاڈیمی کا ایسا کارنامہ ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مزید برآں ظاہر ہے کہ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو "ہیملٹ" منظر شاہ کو "وار اینڈ پیس"، سردار جعفری کو LEAVES OF GRASS پروفیسر محمود حسین خان کو انتخاب COMMENTARIES، پروفیسر اختر اورینوی کو "والڈ اینڈ گوسٹس"، پروفیسر مجیب کو "ایڈیٹ"

اور پروفیسر آل احمد سرور کو ڈان کوئیزوٹ کے ترجمے کا کام

۱۹۵۷ء میں سونپا گیا تھا۔ پانچ برس گذرنے پر ان میں سے ایک صاحب نے بھی اپنا کام ختم کرکے مسودہ ساہتیا اکاڈیمی کو نہیں دیا۔ آفرین ہے اکاڈیمی کے صبر اور حوصلے پر کہ وہ ان پتھروں کو پانی کرنے پر تلی ہوئی ہے، کیونکہ ؎

گوہند سنگ لعل شود در مقام صبر
آرے شود ولیک بہ خون جگر شود

اور یہ خون جگر ہندستان کے کروڑوں عوام کے روپے سے نچوڑا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ ساہتیا اکاڈیمی کے نزدیک ان کتابوں کے ترجمے فقط یہی حضرات کرسکتے ہیں، دو تا برس دو برس کے انتظار کے بعد فیصلے میں ترمیم کی جاسکتی تھی۔ حقایق کی تسم ظریفی دیکھیے کہ ہندستان کی بھری پڑی دنیا میں سوائے اوپر کے حضرات کے کوئی دوسرا دیب ان کتابوں کے ترجمے کا اہل ہی نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان میں سے بعض ہمارے مخلص دوست، بعض مہربان اور بعض قابل قدر بزرگ ہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ "جان سخن" کا تقاضا حق گوئی ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی شیوہ ہی گرم ذوق فزوں ہوتا ہے

چاہیے کہ اکاڈیمی ہر کام کے لیے ایک میعاد مقرر کردے۔ اگر اس مدت کے اندر اندر کام ختم نہ ہو، تو اسے کسی دوسرے کے سپرد کیا جائے اور جس شخص نے وعدے کے باوجود کام نہ کیا ہو، اسے پھر ترجمے کا کام نہ دیا جائے، لیکن افسر پروری اور دوست نوازی کی گنجایش کہاں سے نکلے گی۔ لگے ہاتوں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ چھ برس پہلے ایک صاحب کو ایک خاص کتاب کے ترجمے پر مامور کیا گیا۔ چونکہ وہ حکومت ہندستان میں ایک ذمے دار عہدے پر فایز ہیں سرکار نے اجازت دینے سے بالکل کورا جواب دیا۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، اور جوڑ توڑ کے ذریعے تین برس کے بعد کسی نہ کسی طرح اجازت لے ہی لی، لیکن اس عرصہ میں وہ ترجمہ کسی دوسرے صاحب کو دے دیا گیا تھا۔ ساہتیا اکاڈیمی کی غلطی ظاہر ہے کہ دوسری ہی میٹنگ میں ان صاحب کو بھی ترجمے کے لیے ایک اور کتاب الاٹ کردی گئی۔

یہ ملک کے عالا ترین ادبی ادارے کی غیر ذمہ داری کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے، ادیبوں کو مالی منفعت پہنچانے کا سب سے موثر طریقہ انہیں ترجمے کا کام دینا ہے، کیونکہ ترجمے کا معاوضہ بنیاد حقوق ہے، معمولی سی کتاب پر مترجم کو ہزاروں روپے مل جاتے ہیں، چنانچہ ساہتیا اکاڈیمی کے ہندستانی مشاورتی بورڈ نے سب سے پہلے اپنی خدمات اس کام کے لیے وقف کردی ہیں۔ مشاورتی بورڈ کے اراکین کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور۔ ان میں سوائے ذاکر صاحب اور پروفیسر سروری کے دوسرے تمام حضرات کسی کسی کتاب کے ترجمے پر مامور ہیں۔ لیکن ہے ذاکر صاحب کو بھی پیشکش کی گئی تھی اور انہوں نے انکار کردیا تھا۔ سروری صاحب نئے نئے رکن بنے ہیں۔ امید واثق ہے کہ عنقریب کسی جلسے میں انہیں بھی یہ اعزاز بخشا جائیگا۔ طاہر خواجہ ہندستانی کا مشاورتی بورڈ، بعض مترجمین کا بورڈ بن کر رہ گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی روح اپنے خوابوں کی یہ تعبیر دیکھ کر کیسے مسرور نہ ہوتی ہوگی! ان کا تو یہ خیال تھا کہ نقطہ چوٹی کے اہل علم زبان و ادب کی خدمت میں زندگی کھپا چکے ہوں گے، اکاڈیمی کے رکن بنائے جائیں گے۔ اس تصور سے اکاڈیمی کے رکن کا جو تقدس سامنے آتا ہے، اس پر نظر رکھیے اور موجودہ اراکین کے بے لوث، بے غرض اور مخلص ہونے پر غور کیجیے، ان کی فرض شناسی کی داد دیجیے اور ہوسکے تو نئے ہندستان کی امید افزا جمہوریت کے حق میں دعائے خیر کیجیے۔ مشاورتی بورڈ کے دس میں پانچ اراکین کی تو دہری ذمے داریاں ہیں، یعنی وہ ایک سے زیادہ اکیڈیمیوں کے ممبر ہیں۔ ڈاکٹر (زور) ذاکر صاحب، پروفیسر مجیب، سروری صاحب اور احتشام صاحب مجلس عمومی کے رکن بھی ہیں۔

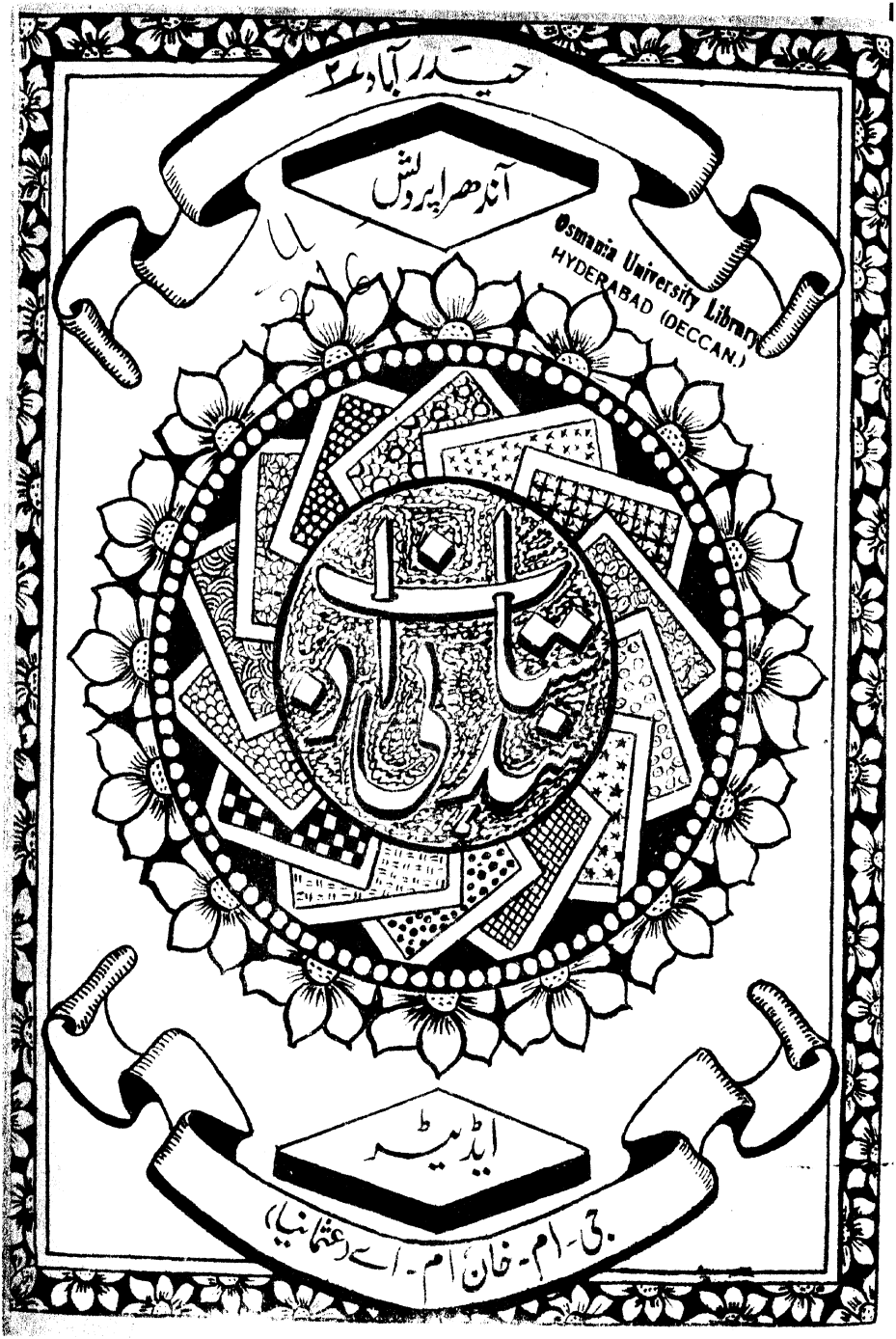
علم وادب کے اعتبار سے ان حضرات کا وہ پایا ہے کہ ان کی دانشمندی اور عقل وفہم کی قسم کھائی جا سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود اکاڈمی کے بعض فیصلے اس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اراکین اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اکاڈمی کے کام میں پوری دلچسپی نہیں لیتے، جس کا نتیجہ ہے اقربا پروری، اختصار کو کھیل بنانے کا موقع مل گیا ہے۔ ایک ترجمے تک تو بات پھر بھی اس قدر قابل اعتراض نہیں، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اکاڈمی بعض حضرات کے دانی پر مسلسل عنایت فرما رہی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس احباب نوازی کی کوئی وجہ بھی ہے یا مثل سجاد ظہیر کو کاندیدہ اور "مایہ" دو ناولوں کے ترجمے کے بعد کتاب "انتخاب" کا کام بھی سونپا گیا ہے۔ اسی طرح پرکاش پنڈت بھی "مٹی کے ٹیلے" اور "بھگوان بدھ" دو کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں، اور انہیں حال ہی میں ایک اور کتاب "آدم خود" کے ترجمے پر نوازا گیا ہے۔ ظفر حسین خاں "طوفانی کنگ فوزی" کے علاوہ "ٹاوٹی چنگ" کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں۔ ظفر شاہ کو پہلے "وارانڈ پیس" کے ترجمے کا کام دیا گیا تھا، "ایسٹ وِیسٹ" کا ترجمہ انہیں سپرد کیا گیا ہے۔ ہم ساہتیا اکاڈیمی کے ہندستانی شاوری بورڈ سے یہ پوچھنے کی جرات کرتے ہیں کہ آخر ترجمے کا یہ کام کس بنا پر تقسیم کیا جاتا ہے اور ان حضرات میں وہ کونسی صلاحیتیں ہیں جن کی بدولت انہیں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کتاب کا کام سونپا گیا۔ کیا ان کے علاوہ ہندستانی ادب میں ان ترجموں کا اہل کوئی دوسرا ادیب نہیں؟ آخر وہ کیا وجوہ ہیں، جن کی بنا پر انہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، مالک رام، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر منوہر سہائے انور، آصف فیضی، امتیاز علی عرشی اور ضیا احمد بدایونی جیسے دوسرے بڑی کے اہل قلم کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دیا گیا ہے۔ غلط بخشی کی چند بڑی مثالیں یہ ہیں کہ بعض ایسے حضرات کو بھی ترجمے دیے گئے ہیں جو ابھی اپنی ادبی خدمات کی ابتدائی منزلوں میں ہیں۔ ہماری مراد پرکاش پنڈت، مظفر شاہ، رضی عظیم آبادی اور سن موہن تلخ سے ہے۔ پرکاش پنڈت ہندستانی کے اچھے ناقد ہیں، اور اب غالب فلموں کے لیے لکھتے ہیں۔ مظفر شاہ کی ادبی کارگذاریاں دیکھنا ہنوز باقی ہیں۔ رضی عظیم آبادی کے نام سے ہم پہلی بار ساہتیا اکاڈیمی ہی کے ذریعے واقف ہوئے ہیں۔ سن موہن تلخ شعر کہتے ہیں، اور ان کا پہلا نثری کارنامہ وہ ترجمہ ہے جو ساہتیا اکاڈیمی کی نوازشہائے بیجا کی موثر بولتی مثال ہوگا، غالب ان حضرات کو ترجیح دینے کا مقصد نوجوان طبقے کے ادیبوں کی ہمت افزائی قرار دیا جائے گا، لیکن یہ ہمت افزائی بھی ساہتیا اکاڈیمی ہی کا مقصد ہے، کیونکہ نوجوان ادیبوں کی صفوں میں ہندستانی شاوری بورڈ کی نظر ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عظمی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر گیان چند، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، کنہیالال کپور، ڈاکٹر اسلوب احمد، عتیق صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، عالم خوندمیری، عابد رضا بیدار، دیوندر اسر، اور مہیار زالدین رفعت میں سے کسی پر نہیں گئی۔ اور تعجب کیا نوانہیں جو کہ زار ادب میں طفل مکتب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ جن بزرگ ادیبوں کی پچھلے چھ برسوں سے ساہتیا اکاڈیمی میں حق تلفی ہو رہی ہے، ان میں ہم نے جناب رشید احمد صدیقی کا نام قصداً نہیں لیا، کیونکہ وہ ہماری مجلس مشاورت کے رکن ہیں اور ان کا نام لینے سے بعض کو ناہ نظر کرم فرما اس ادارے کو کھائے گدائی پر محمول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔ اپنا کہ "چاک گریباں کو بھی ظاہر نہیں کرتے" مبادا جیب دجنوں کی رسوائی کا باعث ہو! آخر میں ہم کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ ساہتیا اکاڈیمی کی کارگذاریوں کا مفصل جائزہ نہیں۔ ہم نے فقط چند سرسری خیالات پیش کیے ہیں۔ اگر ارباب اقتدار ان میں سے کسی ایک پر بھی غور فرمائیں تو ہم سمجھیں گے کہ ملک میں آزادی اظہار کی قدر باقی ہے۔ کہنے کو تو ابھی بہت سی باتیں ہیں۔ اور بعض نہایت اہم مگر

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقف اسرار کہوں یا نہ کہوں

ح۔ ل۔م۔ خاں نے اعجاز مشین پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۲ میں چھپوایا۔


حیدرآباد ۲
آندھراپردیش
Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN.)
ایڈیٹر
جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

رجسٹرڈ نمبر — ایچ (۱۸۴)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں، آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

جلد (۲۰) — نمبر (۸)

ہندستانی ادب

چندا سالانا — آٹھ روپے

حیدرآباد ۲۴ - آندھرا پردیش

تیرہ ۱۳۶۹ف — مئی سنہ ۱۹۶۰ء

ایڈیٹر - جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت انقر موہانی وارثی	۳	
۳	غزل	ناخدا سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۴	
۴	گلابی لہر	سلام مچھلی شہری	۵	افکار
۵	غزل	شاد عارفی	۶	خیال
۶	غزل		۶	〃
۷	قصیدۂ آفتاب و مہرشاہ	پروفیسر سنوور علیگ	۷	سب رس
۸	غزل	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۸	آندھرا پردیش
۹	ملک محمد جائسی	باقر طاہر سعید	۹	
۱۰	یونے ڈنر	نثار احمد فاروقی	۱۳	پاکستانی الطاف
۱۱	محمد علی — جدید مصر کا بانی	سید محمد جعفری	۱۴	برہان
۱۲	گیت	محمود الحسن ندوی	۱۸	جدوجہد
۱۳	بھولے بھٹکوں کی جنت	اختر واصفی	۱۹	اعلم
۱۴	قطعات	عبداللہ خان خویشگی	۲۳	آہنگ
۱۵	غزل	بیخ الہادی	۲۳	
۱۶	آغا حشر کا فن	ڈاکٹر ماتا پرشاد زیب بریلوی	۲۴	قومی زبان
۱۷	غزل	آغا بابر	۲۷	رہنمائے تعلیم
۱۸	خندۂ گل	نندلال پروانہ	۲۸	اسلامی دنیا
۱۹	غزل	ابوالحسنات قاراپی	۳۱	پیام انقلاب
۲۰	مرے عہد کے حسینو	اودے چند آشفتہ	۳۱	شاعر
۲۱	مشہور ماہر علم ہندستان	ساحر لدھیانوی	۳۲	
		ہیلینا سیمیکا		

ہمارے خیالات

"۱۷ سال سے کم عمر لڑکوں کا یونیورسٹی میں داخلا بند کر دیا جائے"

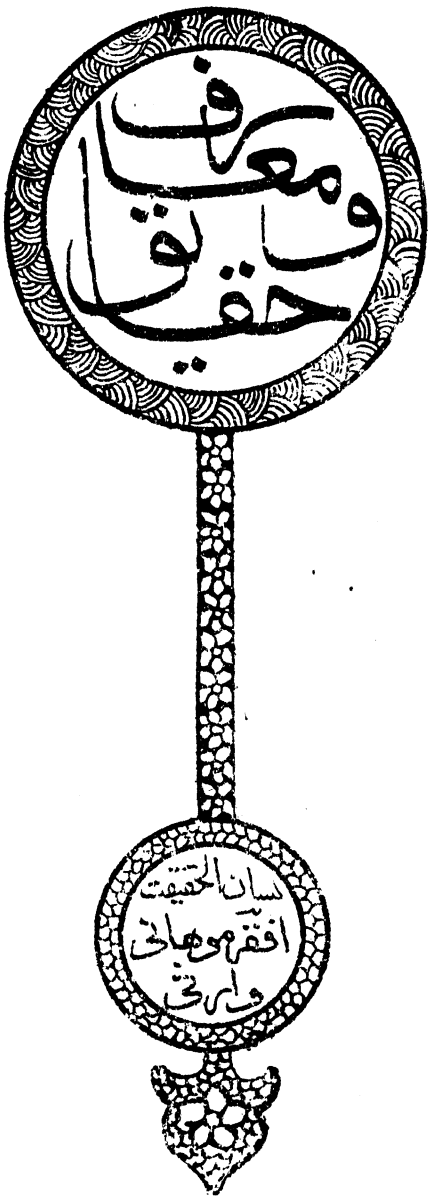
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا ایک غلط فیصلا

یونیورسٹی ایجوکیشن کے مسایل پر کافی چھان بین اور غور و فکر کرنے کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے حال ہی میں اپنی رپورٹ حکومت کے آگے پیش کر دی ہے۔ کمیشن نے جو اصلاحی تدبیریں بتائی ہیں وہ تقریباً سب کی سب قابل قبول ہیں مگر بعض مشورے حد سے تجاوز کر گئے ہیں، جن میں سے مثال کے طور پر ایک یہی ہے کہ "۱۷ سال سے کم عمر لڑکوں کا یونیورسٹی میں داخلا بند کر دیا جائے۔" ہماری رائے میں کمیشن کا یہ فیصلا حق بجانب نہیں ہے۔

ہمیں اس کا پورا پورا علم ہے کہ میٹرک کے امتحان میں شرکت کے لیے ایک خاص عمر کی قید ہے۔ جب تک طالب علم اس عمر کو نہ پہنچے امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ غالباً یہ پابندی اس غلط نظریے کی بنا پر کی ہے کہ ایک خاص عمر کے پہنچنے تک طالب علم کا دماغ پختا MATURE نہیں ہونے پاتا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی غالباً اسی نظریے کے تحت اپنا اوپر کا غلط فیصلہ دیا ہے۔ نہایت ہی مضحکا خیز فیصلا دیا ہے!

یقین جانیے کہ اس کمیشن کے ممبر ہندستان کے چوٹی کے ماہران تعلیم اور صاحبان عقل و فہم ہیں، اور اس کے صدر دلیس کے مشہور ماہر فیزکس پنڈت من دیسمکھ ہیں۔ نہ معلوم ان لوگوں نے میٹرک کے امتحان میں شرکت کی قید والی غلط تقلید کیوں کی ــــ؟ ماہرین تعلیم نے یہ شرط ایک غلط اور تصوری نفسیاتی نظریے کے تحت لگا دی ہے۔ یہ یاد کر لیا گیا ہے کہ ۱۴ یا ۱۵ سال سے پہلے لڑکے یا لڑکی کی دماغی حالت اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ میٹرک کی تعلیم کے بار اور بوجھ کو قبول کر سکے۔ اسی غلط نظریے کی روشنی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ فیصلا دیدیا کہ ۱۷ سال سے کم عمر لڑکوں کا دماغ یونیورسٹی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہوتا، اس لیے اس عمر سے پہلے داخلا نہ دیا جائے۔

ہماری رائے میں میٹرک اور یونیورسٹی دونوں میں شرکت کی جو قید لاگو کی گئی ہے، وہ سراسر غلط اور بے معنی ہے۔ دونوں شرطیں اٹھائی جانی چاہئیں۔ عمر کا لحاظ کرتے کوئی پابندی نہ لگائی جائے، بلکہ ہر اس طالب علم کو جو تعلیمی اعتبار سے اپنے آپ کو اہل ثابت کرے داخلے اور شرکت کی اجازت دی جائے۔ یہ عقل ہی کھلی بات ہے کہ جس طالب علم کا دماغ پختا نہ ہوگا، اس میں صلاحیتیں نہ ہوں گی اور جب دماغی صلاحیتیں ہوں تو وہ اپنے آپ کو اہل ثابت نہ کر سکے گا، اس لحاظ سے اس کی تعلیمی نااہلی خود داخلے اور شرکت میں "شرط" کا سبب بن جائے گی! اور جس طالبعلم کا دماغ باوجود کم عمری کے پختا یا MATURE ہوگا وہ ہر طرح سے اپنے آپ کو اہل اور کامیاب ثابت کرے گا۔ یہ ہیں گویا اس کی خصوصی اور بڑی دماغی صلاحیتیں! جب کسی طالب علم میں ایسی خاص فطری صلاحیتیں موجود ہوں تو اس پر عمر کی قید کی پابندی لگا کر کیوں اس کی قابلیتوں کا خون کیا جائے۔ اسی لیے کہ میٹرک کے امتحان کے کرتا دھرتاؤں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دونوں ہی سے ہماری یہ مخلصانہ اپیل ہے کہ اوپر کے وچاروں کی روشنی میں عمر کی قید کی پابندی اٹھائی جائے اور ہر اس طالب علم کو جو تعلیمی اعتبار سے اپنے آپ کو امتحان میں شرکت کے قابل ثابت کرے لازمی طور پر اس کو شریک ہونے کا موقع دیا جائے، اور جو طالب علم یونیورسٹی میں داخلے کے قابل قرار پائیں، انہیں بھی بلا لحاظ عمر داخلے کی برابر اجازت دیجائے۔ سچ ہے کہ بڑے لوگوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوا کرتی ہیں، چنانچہ اوپر کی دونوں مثالوں میں ہماری لائی



عرش اعلیٰ سے گذر کر لامکاں تک آ گئے
اور ہم سمجھے کہ ان کے آستاں تک آ گئے
یہ نہ پوچھو زندگی میں ہم کہاں تک آ گئے
مختصر یہ منزل عمر رواں تک آ گئے

سنگ در چوما، کبھی بڑھ کر رکھا سجدہ میں سر
ہم اسی صورت سے ان کے پاسباں تک آ گئے
کیا خبر کس حال میں ہیں باقی اہل قفس
چند ایسے تھے جو اپنے آشیاں تک آ گئے
وائے قسمت میرے نالے ہو کے محروم اثر
عرش سے واپس دل ناشادماں تک آ گئے
جتنے سجدے میں نے زیر خنجر قاتل کیے
وہ بھی ارکان نماز عاشقاں تک آ گئے
چھا گیا سارے گلستاں میں اندھیرا ہر طرف
چند جھونکے جب چراغ آشیاں تک آ گئے
اب نہ اپنا ہی پتہ ہے اور نہ کچھ ان کا نشاں
کیا خبر وادیٔ مطلب میں ہم کہاں تک آ گئے
کہہ چکے تھے داستان شوق ان سے ہم، مگر
خاتمہ سے پھر شروع داستاں تک آ گئے
میکدہ میں اب چلے دور صبوحی ساقیا
آنے والے جینے تھے وقت اذاں تک آ گئے
اب کہاں جائیں گے جیتے جی یہاں سے اٹھ کے ہم
جب مقدر سے تمہارے آستاں تک آ گئے
تیکدہ، کعبہ، کلیسا، میکدہ اور صومعہ
اتنی راہوں سے تمہارے آستاں تک آ گئے
دی صدا پھولوں نے جب اسیران قفس
آشیاں کے رہنے والے آشیاں تک آ گئے

ناتوانی اس پہ افقر راہ غربت کا سفر
ہم بہت آگے تو گرد کارواں تک آ گئے

غزل

ناخدائے سخن
تاج الشعرا
نسیم العصر
نوح ناروی

اگر چاہے تو دنیا بھر کو اپنا مبتلا رکھے
خدائی میں تمہارا حسن ایسا ہے خدا رکھے

توقع کیا کرم کی اس سے کوئی باوفا رکھے
جو بے تقصیر بھی تعزیر کا دینا روا رکھے

تڑپ بڑھتی رہی جائے گی سکوں گھٹتا ہی جائے گا
مرے دل پر نہ رکھے ہاتھ اپنا کوئی یار رکھے

حسینوں سے نہ ملنا ہی مناسب ہے زمانے میں
جو اپنی خیریت چاہے وہ اپنے کو جدا رکھے

پتہ چل جائے گا اس کے مکاں کا راہ چلتوں کو
مناسب ہے وہ رستے میں لحاظ نقش پا رکھے

خیال کشتی و طوفاں تو دل میں اس کے پیہم ہے
خدا پر بھی نظر اپنی ہمارا ناخدا رکھے

مریض درد دل کی چارہ سازی کیا کرے کوئی
جو ناواقف ہو الفت سے وہ امید شفا رکھے

اگر بہکا تو بہکا حشر کیا ہوگا بہکنے کا
نظر کے سامنے انسان احکام خدا رکھے

اجازت چاہتا ہوں اس سے میں ترک محبت کی
اگر ملنا نہ ہو تو کیوں تجھے پیش نظر رکھے

وہ کہتا ہے سنا دوں گا، جلا دوں گا، مٹا دوں گا
ترے دل کو بڑے آرام سے میری بلا رکھے

جناب نوح ارمان ہو جسے عیش و مسرت کا
تو بہتر ہے وہ پہلو میں دل بے مدعا رکھے

سلام مچھلی شہری

بوقت سیر گلستاں نے یہ کہا ہوگا
کہ تم بہار کے پھولوں کی شہزادی ہو
سدا مہکتی رہو، یوں ہی مسکراتی رہو

ستار چھوتے ہی تم نے بھی سنا ہوگا
کہ تم حیات کے نغموں کی شہزادی ہو
زبان حسن خموشی میں بھی گاتی رہو

سہیلیوں میں رقیب اگر کوئی ہوگی
تو اس نے چاند میں بھی داغ ڈھونڈ لیے ہوں گے
تمہارے حسن کو معصوم کہہ دیا ہوگا

کسی نظر کو سکوں کی اگر پڑی ہوگی
تو اس نے جسم کا اک باغ ڈھونڈ لیے ہوں گے
تم ہی کو جنت معمور کہہ دیا ہوگا

تمہارے پہ رک کر زمانہ خواں کوئی
خود اپنے زعم تخیل سے پوچھتا ہوگا
یہاں جہاں کی لکیریں سرد سانس بھرتی

تمہارے ذکر پہ کالج کا نوجوان کوئی
بڑے غرور سے ساتھی سے کہہ رہا ہوگا
وہ خود بھی آگ کے شعلوں سے پیار کرتی ہے

مصوروں میں اگر بات چھڑ گئی ہوگی
تو کوئی تم کو مجسم جمال بتلا کر
خود اپنے فن کے لیے نور مانگتا ہوگا

جہاں پرچھائیاں لگے یا دھوپ ڈھل گئی ہوگی
خدا سے عالم خواب و خیال میں آکر
تم ہی کو راہ کا مزدور مانگتا ہوگا

مگر مجھے تو خدائے بہار کہتے ہیں
مجھے خبر ہے کہ تم تشنۂ محبت ہو
چلو اب اپنے خدا کے حضور آجاؤ

ہنو گی تم بھی مرا شاہکار کہتے ہیں
ابھی تو کچھ بھی نہیں مرمٹا ایک عورت ہو
تمہارے حسن کے نقطے میں چور آجاؤ!

شاعر غزل عامر

جب تہیہ کر کے ہم تسہیر نظر کو جانے چلیں
وہ بھی ... حیرت ہے ... اپنی فن پہ فرمانے چلیں
حضرت ناصح ہمارے ساتھ یہ خانے چلیں
اور پھر جس جس کو چاہیں اس کو سمجھانے چلیں
جب لگاموں کی جگہ پی پی کے بیگانے چلیں
کیوں نہ رنگ و خشت کے معنی ہیں پیمانے چلیں
روشنی درکار ہے وارفتگان شوق کو
شمع بزم ناز روشن ہو تو پروانے چلیں
کاروبار دلبران گلشن کی چمن آرائیاں
ساتھ تم ہم کو جو وہ تحقیق فرمانے چلیں
خار زار راستی "دیدہ و دل فرش راہ"
پوچھ ہیں کانٹوں سے دلچسپی وہ دیوانے چلیں
جمع ہو کر بیکس و مجبور محلوں کی طرف
کم سے کم عشرت کے متوالوں کو گھبرانے چلیں
آخری صورت یہی ہے واں سے اٹھ آنے کے بعد
اس کے در پر پھر نہ آنے کی قسم کھانے چلیں
کہہ رہی ہیں ساقی بدمست کی انگڑائیاں
صدر محفل کا اشارہ ہو تو میخانے چلیں
سو اداؤں سے مرتب کر کے حسن سادگی
کون سمجھے گا۔ جو وہ ہم پر ستم ڈھانے چلیں
اس سے پہلے ناصح مشفق کرم فرمائیں شاد

غزل

پروفیسر شور علیگ

نہ نشاط چارہ سازی، نہ ملال کم نگاہی
مجھے اس نے مارا بے گناہ بے گناہی
سر انجمن غنیمت ہے بتوں کی گم نگاہی
کہ سکون دل پہ آتی ہے نظر سے بھی تباہی
یہ سیاست بہاراں ہے خزاں کی بے پناہی
کہ جو جل اٹھے نشیمن تو چمن نہ دے گواہی
تری انجمن سے باہر کبھی آفتاب نکلے
نہ ڈھلی کسی سحر سے کسی رات کی سیاہی
ترے شہر سے نکلتے ہی مزاج دہر بدلا
نہ وہ ربط شبنم و گل، نہ وہ باد صبح گاہی
ترے شہر آرزو میں یونہی کٹ گئی ہیں راتیں
نہ جنوں کی آنکھ جھپکی، نہ خرد نے لی جماہی
دیے تیری رہگذاروں کے جہاں جہاں جلے ہیں
نہ چراغ بتکدہ ہے، نہ چراغ خانقاہی
نہ صنم کدے کی منزل، نہ حرم کا آستانہ
وہ نظر جہاں اٹھی ہے وہیں رک گئے ہیں راہی
کوئی شور یہ تو پوچھے در و بام خسروی سے
یہ لہو ہے کس کے روشن ہے چراغ کج کلاہی
کیوں نہ ہم سب ان کے گھر پر ان کو سمجھانے چلیں

قصۂ پنجۂ آفتاب و مہرشاہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مذنبؔ ارکاٹ کے ایک نواب رئیس الامرا کے ملازم تھے۔ رئیس الامرا کے ماموں نواب والاجاہ اول (متوفی ۱۲۴۰ھ) کے دربار میں حاسدوں نے مذنبؔ کو ٹکنے نہ دیا تو یہ تلاش معاش میں بارا چودا برس تک ادھر ادھر پھرتے رہے۔ آخر کار نواب عبدالحمید خاں رئیس الامرا بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی فقیر الحیاتی کو دیکھ کر ملازم رکھ لیا اور غالباً سات روپے ماہوار مقرر کر دی، اور حکم دیا کہ قصۂ پنجۂ آفتاب جلد نظم کر کے لے آئیں۔ مظفرؔ نے قصے "مہر و ماہ" لکھا تھا، اور یہ قصا اس نے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے یہ تیسرے حصے میں آیا ہے۔ اس کو مکمل کر کے مذنبؔ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

کہا قصۂ پنجۂ آفتاب — تو کر نظم جلد پاس لے آشتاب
مظفرؔ کہا قصۂ مہر و ماہ — گیا ہے گما اسچے یہ احوال راہ
یہ حصہ ہے تیرا اسے بول تو — ملے میں لے در مجھ سے مزا تو
بجا لا میں آداب گر کو گیا — پس یہ داستان نظم کہنے لگا

مظفرؔ کے قصے "مہر و ماہ" کا ذکر مذنبؔ کرتے مخطوطات جلد پنجم میں بھی آیا ہے۔ مظفرؔ نے اپنی مثنوی "مہر و ماہ" کے آخر میں لکھا تھا ؎

یہاں قصۂ مہر و ماہ ہو چکا — یمن کا جو احوال بلتی رہا
سو ہے قصۂ پنجۂ آفتاب — بنے اک علیحدہ ہی خاص کتاب
بجلد دوم ذکر او بالتمام — مفصل ہوا ہے بیان لاکلام
دیکھو دوسرے دفتر کے تئیں جو ہوا — کما حقہ پوری سمجھ ہو گی بات

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفرؔ نے دوسرا حصا بھی لکھا تھا، مگر مذنبؔ کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ مظفرؔ نے اس کو مکمل نہیں کیا، یا تو وہ قصۂ مہر و ماہ لکھنے کے بعد ہی فوت ہو گئے، یا کسی اور وجہ سے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا نہ سکے اور روسیاہ و فقر نواب رئیس الامرا کی فرمائش پر مذنبؔ کو لکھنا پڑا۔

اس مثنوی "پنجۂ آفتاب" میں مذنبؔ نے رئیس الامرا کی مدح لکھی ہے۔ اس کی چند ابیات یہ ہیں۔ یہ مدح اس انداز میں لکھی ہے گویا حکمران وقت کی مدح لکھ رہے ہیں، مگر رئیس الامرا کبھی ارکاٹ کے حکمران نہیں رہے۔ اس وقت عمدۃ الامرا غلام حسین خاں والاجاہ دوم (متوفی ۱۲۱۶ھ) برسر حکومت تھے، اور رئیس الامرا ان کی پھوپی کے فرزند تھے، اور بجائے خود ایک دربار دار رئیس تھے۔

مدح نواب رئیس الامرا

ہے عبدالحمید خاں بہادر نواب — رئیس الامرا ہے جس کا خطاب
یقین ملک ہندوستاں بیچ آج — اسی کو سمجھتے ہیں روشن سراج
کرے عمر اللہ اس کی دراز — بدولت رکھے سر بلند سرفراز
کہاں اس کا سایہ جہاں ہو سچے — بہت خوبیوں میں وہ ایک ہے
کیا اس نے سائل کو جیتا نہیں — عنایات کو اس کی کچھ حد نہیں
بنایا خدا اس کو جوہر شناس — ہر اک چیز کی قدر ہے اس کے پاس
بفضل خدا خوش خصائل ہے وہ — کریموں میں نیکو ستھائل ہے وہ
صلاح اور تقوے میں وہ بختور — بیاد خدا ہے کہ شام و سحر
جوانی میں ایسے ریاضت کہاں — بھی دولت میں پیا نے اہد کہاں
رہے سایۂ والدہ سرا بسر — جیو و فراواں اور اس کا پسر

والدۂ نواب رئیس الامرا سلطان النسا نواب والا جاہ کی بہن تھیں۔ ان کی توصیف اس مثنوی کے آخر میں ہے جس کی چند ابیات یہ ہیں۔

مدح سلطان النسا بیگم

تری والدہ ہے جو سلطان النسا — کہے شاد خرم ایسے نت خدا

خدا کا کرم اس پہ ہے مدام | معین اس کے ہر وقت خیر الانام
عدد نت دوازدہ اماں اسے | ہو دامان خاتون جنت اسے
پناہ غریباں ہے وہ نیک ذات | وہ بھی ذو الکرم ہے بھی حاتم صفات
جو چاہا اس کو وہ دیوے ہزار | دعا میں ہر اک اس کی لیل و نہار
رہو جیتا نواب صاحب میرا | رہے سر پہ تا حشر سایہ تیرا

اس مثنوی کا آغاز اس طرح کیا ہے ۔

اسے حرف کچھ سزاوار ہے | کہ جس کے حمد و کل پر ستار ہے
وہی مالک الملک ہے لا شریک | ثنا اس کی کیا ہو زکلک کیک

اصل واقعات و منقبت امیر و صفت نواب رئیس الامرا کے بعد سب تاریخ شروع کیا ہے ۔ اصل قصہ یعنی آفتاب اس طرح شروع کیا ہے ۔

سر ملک شرق کا جو بادشاہ | وہ کہ شاہزادی مغرب کو بیاہ
لے بامان و شوکت بہت سا فوج | چلا شمل دریا کے بسان موج
دو سر حد میں داخل ہوں کے ہوا | پڑا عام اور خاص میں شور غلا

کوئی ترتیب نہیں ہے ۔ آخر میں سرخ روشنائی میں بیل بوٹے اور پنجۂ آفتاب اور بادشاہ مہر شاہ کی تصویریں بنائی گئی ہیں ۔ دونوں دو تختوں پر ایک دوسرے کے مقابل گاؤ تکیے لگائے بیٹھے ہیں ۔ سروں پر تاج ہیں ۔ پنجۂ آفتاب کے ہاتھ میں ہے اور مہر شاہ کا ہاتھ خالی ہے ۔

یہ پوری مثنوی ایک مسلسل خط میں لکھا گیا ہے ۔ عنوانات اور بعض خاص خاص ابیات سرخ روشنائی میں لکھی گئی ہیں ۔ پہلے صفحے کی پیشانی پر بھی سرخی میں نقش و نگار بنائے گئے ہیں ۔ ۱۲۵۰ھ کے قریب کتابت کی گئی ہے ۔ کاغذ باریک انگریزی معلوم ہوتا ہے ۔

نوٹ: پرچہ ہٰذا کے پچھلے نمبر کی کاپیاں جوڑنے میں غلطی کی وجہ سے صفحہ ۲۱ کی جگہ صفحہ ۲۸ اور ۲۸ کی جگہ صفحہ ۲۱ جوڑ دیا گیا ۔ پیچھے کے بعد اس غلطی کا علم ہوا ۔ بہرحال ہمیں اس غلطی کا سخت افسوس ہے ۔

غزل

بانو طاہرہ سعید

یہ نہ معلوم تھا ایسے بھی گلستاں ہونگے
پتھ پھولوں کی قبا خار مغیلاں ہونگے

ہم نے جھکتے ہوئے دیکھے ہیں سر افرازوں کے
آج مغرور جو ہیں کل وہ پشیماں ہونگے

خود ہی اب پار لگائیں گے سفینہ اپنا
ناخداؤں کے نہ شرمندۂ احساں ہونگے

برق ہو موج ہو گرداب ہو جو چاہے ہو
ان کو کیا خوف جو پیرو رۂ طوفاں ہونگے

آندھرا دیش ہے فنکاروں کا دل والوں کا
اسمیں ہندو نہ مسلمان بس انساں ہونگے

ہم نے مانا کہ زباں بند رہے گی لیکن
دل کے جذبات تو آنکھوں سے نمایاں ہونگے

طاہرہ راستے تاریک سہی منزل کے
خون دل خون تمنا سے چراغاں ہونگے

یہ تنگ نظری ٹھیک نہیں سارے ہندستان میں [illegible]

ملک محمد جائسی

نثار احمد فاروقی

ہر عہد میں شاعری کے کچھ خصوصی رجحانات ہوتے ہیں جو عام ذہنوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندستانی شاعری کو ان میلانات کی بنیاد پر مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا بالکل ابتدائی زمانہ "ویر گاتھا کال" کہلاتا ہے جس میں رزمیہ شاعری آتی ہے۔ "بھگتی یا دور" جس کا مصنف چندر بردائی بتایا جاتا ہے، اس عہد کی نمائندہ تصنیف ہے۔ یہ کال ختم ہوتا ہے تو بھگتی تحریک کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ بھگتی تحریک نے ایک خاص نصب العین حیات پیش کیا، اور شاعری میں وحدت کو فروغ دیا۔ اس تحریک کا آغاز ایسے تاریخی حالات میں ہوا جب ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اودھ یا اتر پردیش میں مسلمانوں کی قوت باقی نہیں رہی تھی جس طرح فارسی شاعری میں تاتاری حملوں کے بعد تصوف کو فروغ ہوا، یا ہندستانی مثلاً میں محمد شاہ کے عہد حکومت سے داخلیت، دردمندی پیدا ہوئی اور روحانی اقدار کی ترجمانی کا کام رواج ہو گیا۔ اسی طرح ہندستانی ریاستوں کے مغلوب ہونے کے بعد "ویر گاتھا" کے عمل ہو گئی اور اس کی جگہ فلسفے اور روحانیت نے لے لی جس کا انجام "ریتی کال" تک آتے آتے دھیرے دھیرے ہوا تھا جو میر اور درد کی شاعری کا حال تھا اور ناسخ اور آتش کے عہد میں ہو گیا۔

جب حاکم و محکوم میں آپسی اتحاد و ارتباط پیدا ہونے لگتا تو ہندی شاعری کے سرمائے میں تصوف کی بھرپور روایت پہلے ہی سے موجود تھی۔ ہندو فلسفے کی ترجمانی کرنے والوں نے اس سے مواد فائدہ اٹھایا اور مسلمان صوفیا نے اسے تمثیلی قصوں کی شکل میں نظم کر کے عوام تک پہنچایا۔ اس تحریک کو چاہے مادی دنیا کی ناسودگی سے فرار کہا جائے یا اعتقاد اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھا جائے۔ بہرحال اس کا ایک بہت ہی خوش آئند فائدہ یہ ہوا کہ "خدا" اور "روحانی قدروں" کے بارے میں مسلمان صوفیہ کے خیالات اور ہندو فلسفیوں کے افکار نے مل کر دونوں مذہبوں کی بنیادی وحدت کو آشکارا کر دیا اور اس طرح دونوں قوموں میں ایک نئی زندہ اور تابندہ روایت کی امین بن گئیں جس نے آنے والی صدیوں کے تاریخی ارتقا سے گذر کر زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور ایک نئے "ہند آریائی کلچر" کی بنیاد ڈالی۔

یہ بھگتی تحریک بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ سگن وادی، وہ جو خدا کا مادی پیکر میں جلوہ آرا ہونا تسلیم کرتے ہیں اور کرشن اور رام کو صفات خداوندی کا مظہر جانتے ہیں اس کے بھی دو سلسلے ہوئے۔ کرشن بھگتی اور رام بھگتی۔ ان کے نمائندہ شاعر سورداس اور تلسی داس ہیں۔

بھگتی تحریک کا دوسرا پہلو "نرگن وادی" شاعری ہے۔ یہ شعرا خدا کا مادی جسم میں جلوہ نما ہونا یا "لباس مجاز" میں نظر آنا تسلیم نہیں کرتے۔ وہ خدا کو "بے جہت" بے نام اور نور مجسم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذات مادی انسانوں کے فہم و ادراک اور بصارت یا قیاس سے "وراء الورا" ہے۔ بقول غالب ؎ ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قرآن میں بھی خدا کو "نور السمٰوٰت والارض" (آسمان و زمین کا نور) کہا گیا ہے اور یہ کہ "لا تدرکہ الابصار" (ہماری آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں) وہ جسم اور مادے سے پاک ہے اور اپنی صفات سے تمام کائنات کو محیط ہے "کل یوم ھو فی شان"۔ یعنی ؎

ہر لحظہ بہ شکل دگر آں یار بر آمد

صلحائے صوفیا کی تعلیم بھی یہی تھی۔ بھگتی تحریک کے نرگن وادی شاعری بھی دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ کبیر شرن اور پریم مارگی۔ پریم مارگی شاعروں نے عشق و محبت کے

کے گیت گائے ہیں اور اپنا فلسفہ تمثیلی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ملک محمد جائسی اسی بھگتی تحریک کے پریم مارگی شاعروں میں سب سے نمایاں، سب سے بڑے اور اہم شاعر ہیں۔

جس طرح حضرت فریدالدین عطار نے "منطق الطیر" میں تمثیلی پیرایا اختیار کیا ہے اور مختلف پرندوں کی زبان سے "سیمرغ" کی مدح سرائی کی ہے یا مولانا رومؒ نے حدیث دیگراں" کے پردے میں "سرِ دلبراں" بیان کرنے کا رمزیا انداز اختیار کیا ہے، بالکل اسی طرح پریم مارگی سلسلے کے صوفی شاعروں نے مخصوص رموز و علامات کے ذریعے اپنا فلسفہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملک محمد جائسی نے اگرچہ "پدماوت" میں پدمنی اور علاء الدین خلجی" کی داستان معاشقا بیان کی ہے، لیکن اس میں دو باتیں صاف طور سے نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ قصہ تاریخ سے مطابقت نہ رکھنے کے باوجود تاریخی کرداروں سے ترتیب دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں اس زمانے کی عام روش کے مطابق قیاس اور تصور سے باہر بیان کیے گئے ہیں۔

پدماوت کا قصہ سننے سے پہلے مختصر لفظوں میں اس کے مصنف کی داستان سن لیجے۔

جائسی کی پیدائش جائس ضلع رائے بریلی میں ۱۴۹۶ء کے لگ بھگ ہوئی۔ یہ بابر کا عہد حکومت تھا، لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اتنی طویل عمر پائی کہ وہ شاہجہاں کے زمانے تک زندہ تھے۔ عربی کا ایک زبردست عالم، اشاپرداز اور شاعر ابوعثمان الجاحظ گذرا ہے۔ یہ کئی کتابوں کا مصنف اور کئی زبانوں کا ماہر تھا، لیکن جتنا منفرد باکمال تھا اتنا ہی بڑا بدصورت اور کریہہ منظر بھی تھا۔ جائسی کو بھی خدا نے ظاہری حسن کی جگہ باطنی اوصاف سے مالا مال کر دیا تھا۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کی ایک آنکھ ضایع ہو گئی تھی، ایک کان سے بہرے، ایک کان سے لولے، ایک پیر سے لنگڑے اور کبڑے بھی تھے۔ چہرا کالا اور اس پر چیچک کے داغ تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار شیر شاہ سوری سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔ جائسی نے فوراً پوچھا۔

"मोहि कहाँ हससि कोहार"

یعنی تو نے مجھ پر ہنسا یا کمار (میرے بنانے والے خدا) پر؟

اس جواب سے شیر شاہ بہت نادم اور معافی چاہی۔

جائسی حضرت نظام الدین اولیا کے سلسلے میں بہت تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ مبارک بودلے سے بھی فیض روحانی حاصل کیے تھے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی اور ایک بزرگ محی الدین کا تذکرا بھی بڑی عقیدت و محبت سے کیا ہے، لیکن صوفیا سے ربط اور تعلق کے ساتھ ہی وہ ہندو فلسفے سے بھی خوب واقف تھے۔ پدماوت کا گہرا مطالعا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی دیومالا پر پورا عبور رکھتے تھے۔ ویدانت کے فلسفے سے واقف تھے اور یوگیوں کی صحبت میں رہ کر ہندو دھرم کے بارے میں اپنی معلومات بہت وسیع کر لی تھیں۔

جائسی کی تصانیف یوں تو تین سے بھی زیادا گنائی جاتی ہیں، لیکن "پدماوت" "اکھراوت" اور "آخری کلام" یہ تین کتابیں دستیاب ہوئی ہیں اور متعدد بار چھپ چکی ہیں۔ پدماوت کا مرتبا ان میں سب سے بلند ہے۔ یہ نہ صرف جائسی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے اور ان کے تقاضے دوام کی ضامن ہے، بلکہ ہندی ادب میں پدماوت کا درجا تلسی داس کی رامائن کے برابر مانا گیا ہے۔ ناقدوں کا کہنا ہے کہ شاعرانا احساس، محاکات کی دل نشینی اور تشبیہات کی سادگی، زبان کی سلاست و شگفتگی اور طرز ادا کی ندرت کے اعتبار سے پدماوت کی مثال دوسری نہیں ملتی۔

پدماوت کا قصا بہت معمولی ہے۔ نیم تاریخی، نیم تخیلی، اس کے کردار صرف انسان ہی نہیں، دیوتا اور حیوان بھی ہیں۔ سنگل دیپ کی راجکماری اپنے حسن و جمال میں بے مثال ہے، اور وہ کسی صورتوں رفیق زندگی کے نہ ملنے سے یوگن رہتی ہے۔ اس کا ایک پالتو طوطا "ہیرامن" نامی ہے، وہ شہزادی کو تنہا دیکھ کر اس سے اجازت طلب کرتا ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا پتی تلاش کروں گا۔ وہاں سے نکل کر ایک چڑیمار کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ وہ ایک برہمن کے

بات مزید تقویت کر دیتا ہے۔ اس کے ذریعے چتوڑ گڑھ کے راجا رتن سین کے محل میں رسائی ہو جاتی ہے۔ ایک دن چتوڑ کی رانی ناگمتی اپنے غرور حسن میں طوطے سے پوچھتی ہے کہ کیا آج تک مجھ سے زیادہ حسین کوئی عورت بھی تیری نظر سے گذری ہے؟ طوطا اثبات میں سر ہلاتا ہے اور پھر پدماوتی کے حسن و جمال کی تعریف میں اپنی زبان کھولتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ۔

سن گیسا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ناگمتی رشک و حسد سے مغلوب ہو کر اس کے مارنے کا قصد کرتی ہے اور ایک کنیز کو حکم دیتی ہے کہ اسے زندگی کے قفس سے ہی رہا کر دے، مگر وہ کنیز ہمدردی سے بجائے مارنے کے طوطے کو چھوڑ دیتی ہے۔ راجا رتن سین، سفر سے واپس آ کر طوطے کو غائب پاتا ہے تو اس کی حالت ہی غیر ہو جاتی ہے۔ جب طوطا حاضر کیا جاتا ہے اور اس کی زبان سے راجا، پدماوتی کے حسن و جمال کی اتنی توصیف سنتا ہے تو ان دیکھے ہی عاشق ہو جاتا ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

آخر ۱۶ راجکماریوں کو ساتھ لے کر یوگیوں کے بھیس میں سنگھل دیپ جاتا ہے اور پدماوتی کو بیاہ کر لے آتا ہے۔

(ذرا سی ناگمتی اپنے شوہر کے فراق میں دیوانہ وار آہ و بکا کرتی ہے اور خاک بسر نکل جاتی ہے۔ جائسی نے اسے خالص ہندستانی عورت کے روپ میں پیش کر کے ہندو بیوی کی وفا داری اور محبت و رفاقت کا بڑا اثر انگیز نقشہ کھینچ دیا ہے، اور اس کے درد و فراق کی آہ و زاری" کا بیان جس زور شور سے کیا ہے اس کے لیے بغیر خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ پوری ہندی شاعری میں بے مثال اور لازوال ہے۔ یہی حال "بارہ ماسہ" کا ہے جس میں ہر موسم کی رعایت سے جذبات عشق اور آلام فراق کی ترجمانی کی گئی ہے۔ "پدماوت" میں رانی پدماوتی کا سمرایا (ٹک سکھی) ناگمتی کا "برہ ورنن" اور "بارہ ماسہ" یہ تین حصے ایسے ہیں کہ جب تک ہندی ادب اور اس کے پڑھنے والے دنیا میں رہیں گے ان کا حسن اور اثر کم ہو گا اور نہ ان کی مثال میں کوئی دوسرا شاہکار پیش کیا جا سکے گا۔

پدماوت کی تشبیہات سادہ اور سامنے کی ہیں اس لیے دل پر اثر کرنے والی ہیں۔ مبالغہ بہت ہے، لیکن اس کے احاطے میں سادگی کا بیان آ گیا ہے۔ "برہ ورنن" میں ایک جگہ ناگمتی کی زبان سے یوں کہلوایا گیا ہے۔

पाऊ हौं बूड़ि पटेसरा हे
पाँइउ हे का
सौं चल बिरह जारै मुहँ
बाँह का चढ़ौं हे राह ना॥

یعنی اے بھونرے اور اے کوئے میرے پیارے پیغام بر جا کر
تم پہنچا دے۔ اپنے کہہ بھیجا کہ تمہارے ہجر کی آگ میں ایسی پھیل
گئی ہے کہ اس کا دھواں نہیں نظر آتا ہے اور ہم سارے پڑ گئے۔
تشبیہ کی سادگی، تاثر کی اور اثر انگیزی دیکھیے ناگمتی درد
فراق سے تڑپ رہی ہے۔ فجر و نجر آفتاب و ماہتاب برہاں بیاں
کوئل اور کوے ہر جاندار و بے جان شے سے مخاطب کرتی ہے کہ
میرا سندیسا میرے پتی کو پہنچا دو، اور ان سے کہہ کہ میرے دل کا مالک
جو تمہارے لطف و کرم سے لبریز تھا، اب سوکھتا جا رہا ہے اور
تمہاری محبت کا کنول بھی مرجھا گیا ہے۔

सवन जो पिंजासा रतन
धार दिहल जब गयाँ मारबाड़ी
अब कुं बीजि फिरि घनु हैं
जौं पिउ खींचे आउ॥

تم ہی اسے اپنی محبت سینچو گے تو پھر یہ تازا اور شاداب ہو سکتا ہے۔ ناگمتی کے "برہ" کو جائسی نے حد امکان تک بیان کیا ہے اور اس میں اتنی شدت پیدا کر دی ہے کہ۔

जाहि परबत कै निमर उइ
रौंरहे तेरहे के बासा।
सोई पंखी जाइ डाढ़ि,
तरिवर होइ निपात॥

وہ جس پرندے کے قریب جا کر اپنے ہجر کا فریاد کرتی ہے،
شدت اثر سے وہ پرند جل کر مر جاتا ہے، اور جس کی آگ

درختوں کے پتوں کو بھی جلا دیتی ہے لیکن آگ کی تکلیف کے باوجود یہ نہیں کہ ایک لمحے کے لیے اپنے محبوب کی یاد سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ اس کا ماننا تو یہ ہے اور بالو کا سا ہے کہ ریت جاتا ہے بار بار بھونتا ہے مگر چنا اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ لاکھوں جوہر دے جب بہار و پھری پھری ہو جی سی غیوں مار ناگمتی بھی یہ تمنا کرتی ہے کہ میں آتش فراق سے جل رہی ہوں مگر کاش مرنے کے بعد میری خاک رتن سین کے رہ گذر میں پہنچ جائے تاکہ اس کے قدموں سے اس طرح جا لگوں۔

یہ تن جاروں چہار کی کپوں کی پوں اڑاو
مکو تیسہی مارگ اڑی پرے کنت دھرے جن پاو

यह तन जारौं छार कै कहौं कि
पवन उडाव!
मकु, तेहि मारग उडि परै कंत
धरै जहँ पाँव।

اس کے بعد تصاویر ہے کہ رتن سین شکست دیپ سے کامران و کامیاب واپس آتا ہے۔ پدماوتی اب اس کی بیوی ہوتی ہے۔ ناگمتی کا درد ہجر بھی لذت دیدار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب ایک نیا فتنہ اٹھتا ہے۔ راگھو چیتن نام کا ایک پنڈت علاؤالدین خلجی سے پدماوتی کے حسن کی تعریف کرتا ہے اور علاؤالدین بھی سوجھ بوجھ سے ذرا پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے اس نے رتن سین کو لکھا کہ "پدماوتی" کو ہمیں دیدو۔ رتن سین راجپوت چوہان تھا اس کی غیرت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جنگ ہو۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور بڑے گھمسان کا رن پڑا، مگر آخر کار ہوگئی گوا رتن سین علاؤالدین کو اپنے قلعے میں لے گیا" یہاں رکھا۔ ہر طرح خاطر مدارات کی۔ راگھو چیتن ساتھ ساتھ تھا۔ ایک جگہ علاؤالدین نے نہایت نازک اندام پری وشوں حسینوں کا جھرمٹ دیکھا، اور چپکے سے راگھو کو اشارا کیا کہ ان میں پدمنی کونسی ہے۔ راگھو نے مسکرا کے کہا عالی جاہ یہ تو سب اس کی باندیاں اور کنیزیں ہیں۔ پدمنی یہاں کہاں ہر حال یہ سب سے آئینے میں پدمنی کا عکس نظر آتا ہے

اور دیکھتے ہی علاؤالدین کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اب تو پدمنی کے حصول کا ارادا اور بھی پختا ہو جاتا ہے۔ رخصت کرتے وقت جب رتن سین قلعے کے دروازے تک آتا ہے تو علاؤالدین اسے دھوکے سے گرفتار کر کے دلی پہنچا دیتا ہے اور اب پدماوتی کو راضی کرنے کے لیے کٹنیاں بھیجتا ہے، مگر بے سود۔ آخر پدماوتی کے اشارے پر وہ غیرت مند راجپوت سورما گورا اور بادل سولہ سو پالکیوں کو ناقوں میں ٹھاکر دلی پہنچتے ہیں، اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ پدماوتی آگئی ہے، مگر وہ پہلے اپنے شوہر سے ملنا چاہتی ہے۔ ساتھیوں میں اس کی باندیاں اور سہیلیاں ناقوں میں سوار ہیں۔ قلعہ جا کے قریب پہنچ کر پالکیوں سے راجپوت تلواریں سونت کر نکل پڑتے ہیں اور رتن سین کو آزاد کرا کے لے جاتے ہیں۔

اب علاؤالدین پھر چتوڑ پر حملہ کرتا ہے۔ اس لڑائی میں رتن سین کام آجاتا ہے اور جب قلعہ فتح کر کے علاؤالدین محل میں داخل ہوتا ہے تو اسے پدماوتی کی راکھ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سب رانیاں اور کنیزیں "جوہر" کر چکی ہوتی ہیں۔

اس تمثیل کہانی میں ملک محمد جائسی نے عرفان کی مختلف منزلوں کو سجایا ہے۔ یہ کہانی تاریخ کے اعتبار سے بالکل بے اصل اور غیر حقیقی۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں کبھی کوئی چوہان راجا برسر حکومت نہیں رہا۔ نہ وہ سرزمین حسن کے لیے سازگار ہے۔ علاؤالدین خلجی کے ہمعصر مورخوں نے اس کے معاشقے کا بیان نہیں کیا، بلکہ کئی سو برس بعد جب "پدماوت" لکھی گئی تو ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا تذکرا کیا اور بعد میں آنے والے مورخ اسے کسی نہ کسی حیثیت میں تاریخی حیثیت کا درجا دیتے رہے، پھر یہ کہ علاؤالدین کے زمانے میں چتوڑ کا راجا سرگ تھا جسے چتوڑی سمرسی بھی کہتے ہیں۔ رتن سین نام کا کوئی راجا اس کے زمانے میں نہیں ہوا۔ گورا اور بادل جو دو اچھوت سردار بتائے گئے ہیں، وہ بھی علاؤالدین کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ "بادل" ایک ہی سردار کا نام ہے جس نے

۱۴۸۸ء میں سلطان غیاث الدین خلجی کو مالوے میں شکست دی تھی۔ غرض مختلف مقامات اور اوقات کے تاریخی واقعات میں ایک ربط پیدا کر کے اس کہانی کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے اور اس کا مقصد تفریحی نہیں، اصلاحی ہے۔ خدا جائسی نے اپنے قصے کے کرداروں کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

تن چیتوڑ، من راجا کیہنا — ہیے سنگھل بدھی پدمنی چیہنا
گورو سوا جو پنتھ دکھاوا — بن گرو جگت کو نرگن پاوا
ناگمتی یہ دنیا دھندا — بانچا سوئی نہ ایہی چیت بندا
راگھو دوت، سیوی سیطانو — ایا علاو الدین سلطانو

یعنی جسم چیتوڑ، دل راجا، بدھی عقل و عرفان ہے، گورو (مرشد) ناگمتی دنیا ہے۔ راگھو شیطان اور علاو الدین مایا جال ہے۔"

یہ قصہ ہندستانی ہے لیکن اس کی تکنیک نہ اسلامی یا ہندآریائی رکھی گئی ہے۔ اس میں تانے وحدت وجود اور تصوف کے دوسرے مسائل کے ساتھ ویدانت کا بیل بھی ہے۔ نظم کا ڈھانچا "باہشت" فارسی کی مثنوی کا ایک روپ ہے۔ اور تصور حسن و عشق بھی خالص ہندستانی نہیں۔ ناگمتی کے "یہ دوہن" میں بھی ہندآریائی اثرات شامل ہیں۔ اس کا شوہر سے محبت کرنا اور اس کے رستے میں خاک بن کر بچھنے کی تمنا کرنا، خالص ہندستانی تصور ہے، لیکن رتن سین کا پدمنی سے عشق اور اس کے حصول کی آتشی جان جوکھم کوششیں ہندستانی روایات سے ہٹ کر ایک نیا تجربا ہیں۔ یہ بات بھی "پدماوت" کے اثرات مابعد اور اس کی مقبولیت کو سمجھنے میں مدد دیگی۔ جس طرح سب سے پہلے میر خلیق نے مدرس کو مرثیے کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کے بعد تمام مرثیہ نگاروں نے اسی صنف میں طبع آزمائی کی اسی طرح پدماوت کی نورم (ہیئت) جو دوہے اور چوپائی پر بنائی گئی ہے آئندہ مقبول ہوئی کہ بعد میں تمام صوفی، کوی اور پریم مارگی شاعر اپنے تمثیلی قصے اسی انداز میں لکھتے رہے۔

ڈنر

سید محمد جعفری

کھڑا ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں
بنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پہ ہو کر سوار کھاتے ہیں
کچھ ایسی شان سے جیسے ادھار کھاتے ہیں
شکم غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سارے میں نوبی پریڈ ہوتی ہے

کھڑے ہیں میز کنارے جو ایک پیٹ لیے
اجی نے کو نئے آپے لیے لپیٹ لیے
ادھر ادھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے
کھڑا تھا پیچھے، سو میں رہ گیا پلیٹ لیے
یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہوگا
پلاؤ کھابیں گے احباب فاتحہ ہوگا

وہ ایک مرغ کی ٹانگ اور رقیب بھاگا
مرا نصیب بھی جاگا تو دیر میں جاگا
کباب اٹھایا تو اس میں لپٹ گیا بھاگا
ڈنر یہ کیا ہے، نہ پوچھا ہے جس کا نے آگا
یہ کیا خبر تھی جب آیا تھا میں ڈنر کھانے
حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے
ڈنر یہ کیا ہے، یہ گھوڑ دوڑ کی سی باری ہے
لگائی بھوک میں جھپٹے جس نے پاری ہے
نہیں تو میری طرح ڈنر میں خوار ہوا

وہ ایک میز، خوانچہ گرد صف آرا
دہن دہن سے رواں گفتگو کا فوارا
میں ایک گوشہ میں بیکار کھڑا ہوں بے چارا
کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارا
اسیر حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہید ستم ہائے کم نگاہی ہیں

دربدر لکھنوی — (۱۰) — آخری قسط

محمد علی — جدید مصر کا بانی

محمود الحسن ندوی

محمد علی کے اصلاحی کارنامے

محمد علی نے حکومت مصر کی باگ ہاتھ میں لی تو ملک کی بدانتظامی تھی، تجارت و زراعت میں کساد بازاری آچکا تھا، بحریہ و افواج کا دور دور اتھا نہ تھا سیاسی و علمی زندگی تقریباً مر چکی تھی، انتظام ملکی حطل ہو چکا تھا فرانسیسی اپنے مفاد کی وجہ سے مصر میں اثر و نفوذ کو روکے تھے انگریز مصر کی طرف سے نظریں بچھائے ہوئے تھے لیکن محمد علی نے اپنی بے انتہا محنت اور قابلیت سے مصر کو حیات نو سے آشنا کیا، زراعت و تجارت کی ترقی کے لیے یورپین کمپنیوں کو اپنا سرمایہ لگانے کی دعوت دی، نئے نئے روئی کے کارخانے قائم کیے، زمین کی پیمائش کرکے اس کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے قابل بنایا۔ جرجی زیدان لکھتا ہے۔

"جب محمد علی مصر کا حاکم ہوا تو اس وقت اس کی سیاسی زراعتی اور علمی و ادبی حالت بہت خراب تھی، اس نے اصلاحات حال کے خلاف پوری کوشش کی۔ اپنی حب مقاصد میں نئی زندگی کا آغاز کیا" اسے ہر میدان میں ترقی یا فتا بنانے کی کوشش کی۔ "کم و بیش انہیں الفاظ کو ایک انگریز مورخ ان الفاظ میں ادا کرتا ہے۔" محمد علی نے اپنے ۴۴ سال کے طویل دور حکومت میں مصر معاشی اور انتظامی ڈھانچہ کو تمام بنیادوں پر قائم کیا اور مصر کو آزاد قوم کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے مغربی ملکوں پر زور دیا۔ اس کام میں فرانسیسی مشیروں سے مدد لی جو اس کے یہاں کام کرتے تھے۔ اس نے مصری فوج کو نپولین فوج کی طرز پر تربیت دے کر جدید فوجی قابلیت کے پہلو پر زور دیا۔ اس نے "کیمیکل تربیت کے ادارے قائم کیے اور میڈیکل اسکول بنائے۔ طلبا کی جماعت یورپ میں تعلیم کے لیے بھیجی۔ اسکندریا کی بندرگاہ کو مزید ترقی دی اور وہاں ——— SHIP YARD قائم کیا۔ متعدد نئی صنعتوں کا آغاز کیا بیرونی سرمایہ کاروں کی ہمت افزائی کی۔ حکومت کو جدید طریقے پر استوار کیا اور اس میں اصلاح کی، اس نے زیادہ تر لوگوں تک محفوظ رہنے والی روئی کی کاشت کو روشناس کرایا۔ آبپاشی کو تقویت دینے کے لیے "قاہرہ بیراج" کی تعمیر کروایا۔"

قبل اس کے کہ ہم محمد علی کی تفصیلی کوششوں کا بیان کریں، ایک بڑی حقیقت کا جان لینا ضروری ہے۔ ناظرین کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ محمد علی نے جو اصلاحات کیں اس میں ان کی ذاتی قابلیت کا زیادہ دخل نہیں۔ محمود ثانی نے ترکی میں ان خطوط کو پہلے ہی سوچا اور اس کو عملی شکل دینے کی کوشش کی، ظاہر ہے محمد علی کو ان تمام مصوبوں اور تقاضوں کا علم و احساس تو رہا ہی ہوگا۔ فرق محض یہ ہے کہ محمود جس عظیم الشان کام کو ترقی کے اندرونی اقتدار اور اختلافات کی بنا پر انجام نہ دے سکا، اسے محمد علی نے اپنی تلوار اور موافق حالات کی مدد سے آہستہ آہستہ پا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

زرعی اصلاحات

محمد علی کے حکم سے مصر کی تمام مزروعہ اور ہر حصہ کا ایک تنظیم مقرر کیا گیا۔ مالگزاری کے جمع و تحصیل کے لئے ملازم رکھے گئے ہر صوبہ قابل زمین کی مالیت کے ——— کے، بیچ والوں میں تقسیم کر دی گئی اس لیے ہر کسی کی کم سے کم ۷ ایکڑ زمین کا مالک ہو گیا تمام اس کے دور میں بھی جاگیرداری کا رواج باقی رہا، ہلکے اسی بنیاد پر زمین تقسیم کی۔ کسان اب بھی اچھی زمین سے محروم تھا

کسان کھیتوں میں ہو کے اور نیگے کام کرتے تھے اور پیداوار چند لوگوں اور خاندان خدیویا کی عیش پرستیوں کے نذر ہو جاتی تھی۔

محمد علی نے پیداوار میں اضافے کی اسی کوشش پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ نئے نئے اجناس غیر ملکوں سے درآمد کیے، روئی کا بیج امریکا سے، انیون کے پودے ایشیائے صغیر سے درآمد کیے، اس کے علاوہ بھی مختلف قسم کے درختوں کے پودے منگوائے گئے، جنہیں ان کا سوتیلا علی تجربا تھا۔ اس نے قاہرا کے ارد گرد بہت سے باغات اور درخت لگوانے تاکہ شہر کی ہوا میں ٹھنڈک ہو اور بارش میں اضافہ ہو۔ لیموں کے باغات روضہ اور ازبکیا میں لگوائے گئے، ازبکیا میں ایک بہت بڑا تالاب تھا، اس میں نیل کا سیلابی پانی جمع ہوتا تھا۔ لوگ مختلف مواقع پر کشتیوں سوار ہو کر یہاں آتے تھے، سیر و تفریح کرتے۔ محمد علی نے اس کے ارد گرد نہر کھدوائی جس سے تالاب کا پانی آتا تھا۔ اس کے دونوں طرف درختوں کے قطار لگوائے جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔

نہری علاقے میں پیداوار بڑھانے کے لیے اس نے متعدد اقدامات کیے۔ ابوقیر پر اس نے ایک پل تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ اس نے متعدد پل، پانی کے خزانے، تعمیر کروائے، گرمی میں فصل اگانے کے لیے نہریں اور کنوئیں تعمیر کروائے، وہ عالا درجے کے مہندسین کی بے حد قدر کرتا تھا، اس نے مصریوں کو فن زراعت میں عالا تعلیم دلانے کے لیے غیر ممالک کو بھی بھیجا، تاکہ وہ فنی، علمی بنیادوں پر اس فن کو حاصل کریں اور ملک واپس آکر زراعتی زندگی میں انقلاب پیدا کریں، تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو، فصلوں کی تو راد بڑھے، عوام کم محنت کر کے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کریں۔ اس سلسلے میں ایک اور عظیم کام خیریا بیراج اس نے بنوا کر انجام دیا۔ یہ بیراج ڈیلٹا پر تعمیر ہوا، اس سے دو شاخیں پھوٹ کر رشید دمیاط میں بہتی ہیں، مگر رشید میں پانی کا بہاو زیادہ تھا اور وہ ضائع ہی ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں دمیاط میں پانی کی بڑی کمی تھی، اس کے باوجود اس کے زراعتی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت تھی، کیونکہ اس سے بہت بڑا علاقہ سیراب ہوتا تھا، اس لیے اس علاقے کی زمین، پانی کی قلت سے خشک ہو جاتی تھی۔ اس بیراج کے بنانے کا مقصد یہی تھا کہ مغربی نہر کا پانی، مشرقی رخ پر موڑ دیا جائے اور زیادہ سے زیادہ زمین زیر کاشت لائی جائے۔

بیراج کے دروں میں، لوہے کے دروازے لگائے گئے، اس طرح پانی پر کنٹرول کر لیا گیا، تاکہ ضرورت کے وقت جس سمت چاہے پانی کو منتقل کر سکتے، اور جب چاہے بند کر دیتے، بیراج کی تعمیر ۱۸۴۵ء میں شروع ہوئی۔ محمد علی نے براہ راست اس میں دلچسپی لی۔ اور جب تک مکمل نہیں ہو گیا برابر اس میں لگا رہا۔ اس کی تعمیر میں ایک فرانسیسی انجینر نے بھی کام کیا، مگر اس کی تعمیر کے بہت دنوں بعد تک اس سے جیسا کہ چاہیے فائدہ نہیں ہوا، بہرحال ان تمام سرگرمیوں کا ایک نتیجہ تو یہ ضرور ہوا کہ زرعی میدان میں ترقی کا دور شروع ہو گیا، مگر افسوس پیداوار اور تمام ترقیوں سے استفادہ عوام کے بجائے چند افراد کرتے تھے۔ خود محمد علی اس قسم کی تجارت کرتا جس سے اس کے خاندان والوں کا پورے ملک کے وسایل پر ایک طرح کا اجارہ تھا۔ محمد علی نے جتنی اچھی اور زرخیز زمینیں تھیں، ان کو خاندانی ملکیت میں لے لیا تھا۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔

"تمام مصری پیداوار کی تجارت پر محمد علی کا ذاتی اجارہ تھا، وہ غلے کو فلاحین سے گماشتوں کے ذریعے اپنی خود شرح پر خریدتا، اور ان کو دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں دگنے بھاو سے بیچتا تھا۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی کو اپنی ذاتی ترقی اور خوشحالی کہیں عزیز تھی، وہ دنیاوی نقطۂ نظر سے سوچتا تھا۔ اس کے ذہن میں عوام اور اسلام کو بنیادی مقام حاصل نہیں تھا۔

فوجی اصلاحات

مصر کی فوج مختلف نسلوں سے تعلق رکھتی تھی، البانوی، الکناری ولاۃ ان فوجوں کا نظام جنگی پرانے طرز کا تھا جو زمانے کے بہت سے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔ محمد علی نے اس کو جدید

طرز پر آراستہ کیا' اس کے سامنے نپولین کی ترقی یافتہ تنظیم تھی جس کے ذریعے اس نے یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں کو زیر کرلیا۔ اس کے اصلاحی اقدام کو فوج کے اکثاری جنے نے پسند نہیں کیا۔ وہ اس تبدیلی کو جدت پر مشتمل کرنے لگے محمد علی نے جب اس پر اصرار کیا تو فوج بغاوت پر آمادہ ہوگئی چنانچہ محمد علی موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا' اس لیے بجائے عجلت کے اعتدال اور میانہ روی کی پالیسی اختیار کی' رفتہ رفتہ فوج ان اصلاحات کے لیے آمادہ ہونے لگی' نئے خطوط پر فوج کی تنظیم و تربیت کے لیے نئے عناصر بھی ملے۔ خاندان مملوک کے بچے جو مال غنیمت کے طور پر ملے تھے۔ انہیں بچپن سے تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا۔ مناسب تعلیمی سہولتیں پیدا کی گئیں۔ جوان ہیں نوجوان فتح ہوئے۔ بعد ازاں فرانسیسی معلمین کے ذریعے تربیت دلوائی گئی۔ چونکہ محمد علی چاہتا تھا کہ اس کام میں جتنی جلدی ہو اتنا ہی مفید ہے۔ مصر میں جدید تعلیم کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ہشیار اور ذہین نوجوانوں کو منتخب کرکے یورپین ممالک میں فوجی تعلیم کے لیے بھیجا۔ فن حرب کے مختلف شعبوں میں کمال پیدا کرنے کے لیے ہر طرح کے انتظامات کیے۔ اس کام میں بہت حد تک کامیابی ہوئی۔ اس نے فوجی ہسپتال قائم کرنے کا ارادہ کیا' تاکہ ایسے ڈاکٹر مل سکیں جو فوجیوں کا نئے طریقے سے علاج کرسکیں' اس ارادے کی تکمیل کے لیے ایک فوجی ہسپتال قائم کیا' نیز ۱۸۶۶ء میں دس طلبا کا ایک وفد فرانس روانہ کیا' تاکہ وہاں ڈاکٹری اور فن حرب کی اعلا تعلیم حاصل کرسکیں' فرانس سے بہت سے ماہرین فن اور ڈاکٹر بلا تنخواہوں پر مصر بلائے گئے اور ملک کے انتظام میں ان سے مدد لی گئی' قاہرہ میں اسلحہ سازی کا کارخانہ قائم کیا۔

محمد علی کے اس شاندار کارنامے کو کامیاب بنانے میں ایک فرانسیسی جنرل سیف کا جو بعد میں مسلمان ہوکر سلیمان پاشا کے نام سے مشہور ہوا' بڑا ہاتھ ہے۔ محمد علی نے اسکندریا میں بارود خانہ قائم کیا جس میں جنگی ہوائی اڈے تک وغیرہ دوسری چیزیں بنائی جانے لگیں' وہیں اس نے ایک اسکول بھی قائم کیا۔ ماہرین اور اساتذہ فرانس اور انگلینڈ سے بلائے گئے' غرض کہ چند سالوں میں محمد علی کی بیدار مغزی اور بے پناہ ہمت نے مصر کی فوجوں کو اس زمانے کی ترقی یافتہ فوجوں کی صف میں لاکھڑا کیا اور انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ یورپ کی تربیت یافتہ اور نئے ٹیکنیک سے واقف فوجوں کا آسانی سے مقابلہ کرسکے۔

تجارتی اصلاحات

زراعت میں اصلاحات کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار میں اضافہ ہوا۔ چونکہ تجارتی ترقی کا انحصار برآمد و رفت کی آسانیوں پر ہے۔ اس لیے اس نے SHIPYARD قایم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے جگہوں پر غور کیا گیا۔ انتخاب اسکندریا کا ہوا' چنانچہ ایک نہر اسکندریا اور نیل کے درمیان کھودی گئی' اس کا نام نہر محمودیہ رکھا گیا' اس نہر میں آمد و رفت شروع ہونے ہی تجارتی سامان کی نقل و حمل میں بڑی سہولت ہوئی۔ چند ہی برسوں میں اسکندریا عالمی منڈی میں بدل گیا' جہاں ہر ملک کے بڑے بڑے تاجر آنے لگے۔ نئی نئی عمارتیں بنائی گئیں۔ عالا اور آرام دہ ہوٹل تعمیر ہوئے غرضیکہ غیر ملکیوں کے لیے ہر طرح کی سہولت پیدا کی گئی' آزاد تجارت کی پالیسی کو اپنایا گیا' یہ محمد علی کی بڑی غلطی تھی۔ اس سے آگے چل کر ملک کو نقصان ہوا اور یورپ کے ملکوں نے خوب فایدہ اٹھایا۔ اس سے ایک اور نقصان یہ ہوا کہ ان کی بھی بھیڑ چال کہ یورپ کے ملکوں کی تقلید کرنے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محمد علی نے ترکی کو نقصان پہنچانے کی ارادی اور غیر ارادی کتنی ہی حماقتیں کی ہیں۔

محمد علی ملک کی تجارتی و زراعتی ترقی پر سخت نظر رکھتا تھا' اس نے پیداوار کو راست بیچنے میں رکاوٹ بھی ڈالی' کیونکہ وہ خود ان اشیا کو خریدتا اور عالمی منڈیوں کا رخ دیکھ کر بڑے منافعے پر اٹھاتا تھا' اس کے باوجود یورپ کی بڑی منڈیوں میں موجود رہتے' اس سے محمد علی کو بڑی آسانی

ہوتی تھی، اس آمدنی سے کچھ تو حکومت اور اس کی انتظامیہ پر خرچ ہوتا تھا، مگر اس کا بڑا حصا اس کے ذاتی خزانے میں داخل کر دیا جاتا۔ فرضکے اس کی کوششوں سے مصر کی مجموعی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اس کا اندازا ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

مجموعی آمدنی سنہ ۱۸۲۱ء میں ..... ۲۶۰ فرنک تھی
" بحالت سنہ آمدنی ہوئی۔ اس کے تیس برس بعد مصر کی مجموعی آمدنی دوگنی ہو گئی۔ ۶۷۷۸۷۵ فرنک تک پہنچ گئی اس میں تجارتی آمدنی ..... ۱ تھی۔

صنعتی اصلاحات

قدرتی بات ہے کہ محمد علی اس میدان میں بھی دلچسپی لیتا۔ نئے کارخانے قایم کیے، روئی، جاجمی کے اوراق، ریشم کی مصنوعات اور اون بافی کے نئے نئے متعدد کارخانے کھلوائے، اسلحہ سازی کا کارخانہ بھی کھولا گیا، مگر یہ سب صنعتیں آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں، کیونکہ ان کارخانوں کو چلانے کے لیے کوئلے کی ضرورت تھی جو مصر میں کمیاب ہے۔

حفظان صحت

ملک میں عطائی صحت کا بیوار تایم کرنے کے لیے اس نے بڑی کوششیں کیں۔ اس نے فرانس سے نامور ڈاکٹر کلوٹ کو بھاری رقم دے کر بلایا ملک میں نئے ہسپتال اور میڈیکل کالج قایم کیے، ان میں "شفاخانہ قصر عینی" میں قایم ہوا، اس میں علم جراحی اور ڈاکٹری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک اور شاندار ہسپتال "ابو زعبل" کے پاس قایم کیا۔ اس کام کو ترقی دینے کے لیے اس نے محکمۂ صحت قایم کیا۔ جانوروں کے علاج کے لیے بھی ہسپتال کھولا۔ سول و ملٹری دونوں شعبوں کے علیحدہ علیحدہ ڈاکٹروں میں سے ایک جماعت کو اس کام پر مقرر کیا گیا۔ ان تمام کاموں میں ڈاکٹر "کلوٹ بک" کا برابر ہاتھ رہا۔ اس نے ملک کے ذہین ہشیار طلبا کو غیر ملک میں اس کام کے لیے روانا کیا، کیونکہ علاج پھانے پر تعلیم کا مصر میں انتظام نہ تھا ان طلبا نے فرانس سے غیر معمولی تجربا اور مہارت حاصل کر کے کئی عہدوں پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ طلبا عام طور پر خدیوی خاندان کے تھے۔ عوام اب بھی دور تھے، نرسنگ اسکول کی بنیاد اسی نے رکھی، اس میں لڑکیوں کو اس پیشے کی معیاری تعلیم دی جاتی، اس کی توجہ اور شوق سے ۵۰ میں جدید پیشے طبابت کو رواج ہوا۔

تعلیمی اصلاحات

محمد علی نے سب سے پہلے جو قدم اٹھایا کہ ایک کمیٹی عام تعلیم کے لیے تشکیل کی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جو حکومت کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کو زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے، تاکہ ان کی صلاحیتیں زیادہ ہوں اور زیادہ اچھے طریقے پر ملک کے انتظامیہ کو چلا سکیں۔ اس سلسلے میں بے شمار مدارس کھولے گئے اور حسب استطاعت طلبا کو بورپ بھیجا گیا تاکہ وہ ادبی اور سائنسی اور علمی علوم سیکھیں۔ شروع میں عام طور پر مدارس فوجی مدارس کے تابع ہوتے تھے، لیکن جب فرانس سے پڑھ کر نوجوان آئے تو انہوں نے محکمۂ تعلیم کو علیحدہ کھولنے کا انتظام کیا، احمد بک کی سرداری میں اس محکمے کا قیام عمل میں آیا، مدارس ابتدائی و ثانوی غیر تعداد میں کھولے گئے جس کا نظام فرانسیسی طرز پر تھا۔ ان مدارس میں قرآن، عربی، ترکی، فرانسیسی، ابتدائی حساب، تاریخ، جغرافیا، خط و غیرہ کی تعلیم ہوتی تھی، عربی زبان کو ذریعے تعلیم جاری کیا گیا۔

علم و ادب کی رفتار ترقی کا اندازا اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ پندرہ سالوں میں محکمۂ تعلیم کے تحت ۷۵ مدارس ہو گئے۔ ان میں ۱۶ عظیم الشان مدارس تھے، پڑھنے والے طلبا کی تعداد ..... ۹ تھی، ان طلبا کے قیام و طعام، لباس و غیرہ کے اخراجات حکومت مصر خود برداشت کرتی تھی، ان لوگوں کی حیثیت سرکاری تھی، کیونکہ ان کو لازماً ملک کے مختلف شعبوں میں خدمت کرنی تھی۔

چونکہ مصر میں فنی اور سائنسی علوم کی تعلیم کے لیے عالا سہولتیں آسانی سے ممکن نہ تھیں، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کتابیں نہیں تھیں، دوسرے ماہرین کی کمی تھی۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس زبان کو سکھایا جائے جس میں یہ دونوں آسانیاں حاصل ہوں، اس لیے پیرس میں حکومت مصر کی ایما پر ایک مدرسہ کھولا گیا، جس کا انتظام ایک مصری عالم اسطفان بک کے سپرد تھا۔

اساتذہ کا انتظام فرانس کے محکمے دفاع نے کیا، اس مدرسے میں مصری حکومت نے اپنے پیسے سے طلبا بھیجے، لیکن کچھ دنوں بعد یہ مدرسہ ختم ہو گیا، یہ ہے علمی و ادبی جد و جہد کا وہ نقشہ جو مصر کی آئندہ نسل کو ایک نئی دنیا سے ہمکنار کرنے والی بن گئی۔

طباعت و پریس کسی ملک کی علمی ادبی سرگرمیوں کی ترقی کا انحصار اب بڑی حد تک چھپائی کے حالات اور ترقی ذریعوں پر ہو گیا تھا، چنانچہ اس طرف سے بے توجہی کسی حالت میں بھی جائز نہیں تھی۔ مصر پر نپولین کے حملے اور عارضی قبضے کی بنا پر اس میدان میں بڑی ترقی ہوئی، جب محمد علی ملک کا حاکم ہوا تو اس نے اس طرف بھی توجہ کی، نپولین اپنے ساتھ بہت کافی عالم اور ماہرین فن لایا تھا، انہوں نے یہاں نشر و اشاعت کے ادارے قایم کیے، جس میں مطبع بولاق بہت مشہور ہوا، محمد علی نے اس مطبع کو نئے سرے سے منظم کیا، یورپ کے ماہرین فن بلائے گئے، انہیں ملازم رکھا گیا۔ ان لوگوں نے حروف بنائے جن کے ذریعے زبان و لغت، تاریخ و ادب کی لاکھوں کتابیں شایع ہوئیں۔ دوسری زبانوں سے ہزارہا کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا، اخبارات اور رسالوں کی بھرمار ہو گئی۔ اخبارات رسالے اور کتابوں کی عالا طباعت نے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ کیا، سیاسی بیداری پیدا ہوئی، ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جسے طبقۂ متوسط کہا جاتا ہے۔

محمد علی کے اوصاف اس شخصیت میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں ملتی ہیں جو ایک دنیادار حکمراں میں پائی جاتی ہیں، وہ عوام سے کافی ملتا جلتا تھا، اس کے محل پر پہرا نہیں ہوتا تھا، محض ایک باڈی گارڈ اس کی حفاظت کرتا، وہ ہتیار نہیں لگاتا اور ویلیرڈ کا بہترین کھلاڑی تھا۔ غیر ملکی سفرا کی بے حد عزت کرتا تھا۔ بڑا علم دوست، عالم نواز اور مدبر انسان تھا، اس کی بردباری میں کوئی شبہ نہیں۔ اس نے عرب قوم پرستی کے سہارے ایسی غلطی کی ہے جس سے اس کا وزن بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ دولت عثمانی کے زوال سے اس نے فائدہ اٹھایا اور اپنی پالیسی سے

گیت

اختر واصفی

پریم منوہر روگ
سکھی ری
پریم منوہر روگ

کیوں ساجن سنگ پریم کیا تھا　　سکھ دے کر دکھ مول لیا تھا
پریم کا کڑوا گھونٹ پیا تھا
پھل کرنی کا بھوگ
سکھی ری
پریم منوہر روگ

کس نے کہا تھا پیت لگانا　　دل دے دینا جان سے جانا
پیت لگا کر کیا پچھتانا
کس کارن اب سوگ
سکھی ری
پریم منوہر روگ

ہنس کر سہہ لو دکھ سہنا ہوگا　　منہ سے کچھ بھی نہ کہنا ہوگا
اب تو من میں رہنا ہوگا
کاہے لیا تھا چوگ
سکھی ری
پریم منوہر روگ

آ بھی جا اب پیارے موہن　　دید کو ترست ہیں دونوں نین
برہا اگنی بھسم کرتی من
ہنسی اڑائیں لوگ
سکھی ری
پریم منوہر روگ

بھولے بھٹکوں کی جنت

عبداللہ خان خویشگی

سرمایہ ستہا ۔ سنگھ ۱۱ اس رنگا کے معتقد شہریوں میں بھولے بھٹکے مسافروں کی رہنمائی کے لیے امدادی انجمنیں قائم ہیں، جن کا باسی امیروں کی فیاضی اور پبلک رضا کاروں کی خدمات کے بھی وسیع پیمانے پر جیل رہا ہے۔ شکاگو کی "انجمن اعانت مسافران" کی ایک روداد کا تو چرچا بھی کیا جاتا ہے۔

لاسالی اسٹریٹ کے ریلوے اسٹیشن پر حسب معمول گھما گھمی تھی۔ گھنٹیوں کے گجروں، لاؤڈ اسپیکر سے گاڑیوں کی خبروں اور خلقت کے اژدھام نے پلیٹ فارم پر اودھم مچا رکھا تھا۔ اس انبوہ کے اندر جہاں سر سے سر کھو اچھل رہا تھا ایک تن تنہا نوجوان لڑکی کسی چیز کی جستجو میں جھجک جھجک کر قدم بڑھا رہی تھی، آخر وہ اس کو مل گئی۔ یہ ایک چٹا روغنی گولا تھا جو کہ ایک ڈیسک میں نصب تھا، اور جس پر نیلے حرفوں میں درج تھا۔

"اعانت مسافران"

یہاں آن کر وہ ٹھٹکی اور ایک رضا کار سے جو کہ اس وقت مسافروں کی خدمت پر مامور تھا پوچھنے لگی "میں کسی بھلے مانس کی تلاش میں ہوں جو میرے لیے مناسب روزگار ڈھونڈ دے۔" وہ لڑکی آسمانی گون، زرد بلی شرٹ، ٹخنوں تک کے سفید پاتا اور کالی پیٹنٹ گرگابیاں پہنے اور بادامی پاپلین کی جاکٹ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھی، اور کوئی سامان ساتھ نہیں تھا۔ اس کی شکل موہنی اور بدن نازک تھا، اور سہاگن ہونے کی علامت کا خیال ناگ میں آویزاں تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی، ڈھالی اور بھولی بھالی سی تھی، اور جب ایک متعلقہ کارکن نے دفتر کے اندر لے جاکر بازپرس کی تو جواب میں رونے دھونے اور چیخیں مارنے لگی۔ یہ روز کا آنا جانا تھا، جس نے عجب تر نہیں تو سے بیسیوں واقعات نگاہ کو ریلوے اسٹیشنوں کے ہنگامہ پرور پر دن رات گذرتے رہتے ہیں۔ اصل میں یہ جگہ قومی شاہراہ حیات کے عبوری چوراہے ہیں، جن پر بھٹکی زندگی سے فراری اپنی جذباتی بھول بھلیوں میں پھنس جاتے ہیں۔ ریلوے ٹائم ٹیبل نے یہ مقام ملک کے مشرق و غرب کے گوشوں کا سنگم بنا رکھا ہے، جہاں اسٹیشن کا گھڑیال اپنی لگاتار ٹک ٹک سے ایسے دل ٹوٹے بھگوڑوں کا جائزہ لیتا رہتا ہے جن کی کوئی منزل مقصود نہیں ہوتی، چنانچہ یہ لڑکی بھی جس نے "اعانت مسافران" سے ملازمت کا سوال کیا تھا، واقعی کسی روزگار کی تلاش میں نہیں تھی، بلکہ اصلی بات یہ تھی کہ لڑکی روٹھ کر گھر سے نکل آئی تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی اور اس کا شوہر تجارت کرتا تھا، کسی معمولی بات پر میاں بیوی میں لڑائی ہو پڑی، اور یہ طیش میں سب کو لات مار کر جلدی سڑکوں پر گذرتی ہوئی موٹر گاڑیوں میں لانگے کا سفر کیا، اور اس طرح تین دن ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ناگاہ رسکاگو میں آنکلی۔ عمر بھر میں پہلی بار اپنے غدار شہر سے سابقہ پڑا، اور اس کی جیب میں صرف دو ڈالر کی کمانیات تھی۔ یہ سونے کا ایک واقعہ اپنی نوعیت میں سستا نہیں ہے، کیونکہ ایسے بیشمار بھٹکے لوگ "اعانت مسافران" کی ڈیسک سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ جن کا سطحی استفسار کی تہہ میں ایک گہرا جذباتی پرکھا پڑا ہے، اعتیاط سے چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کوئی خاتون جو یہاں بظاہر ایک سوئی کا سوال کرتی ہے عین ممکن ہے کہ خود اپنے آپ سے اس کی گریزاں یا اس کی کوشاں ہو اور یہ ہو نہیں سکتا۔ ٹھنڈا کٹھ ہیری ایچ فیرگ جیسے امراض دماغی و رکن

انجمن "اعانت مسافراں" کا قول ہے کہ ۔

"کسی وجہ سے جان چھڑانے کے لیے سفر پر بھاگ نکلنا ایک عام بات ہے، مگر اس سے اندرونی تردد دور نہیں ہو سکتا ۔ فرار اور تنہائی دیوان ذاتی کا فطری خاصا ہے ۔ جب انسان پر مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں یا تو ان کا مقابلہ کرتا ہے یا ان سے بھاگتا ہے، اور جو مقابلے کی تاب نہیں رکھتے وہ فرار ہی میں اپنی عافیت تصور کر کے یہ تصور باندھ لیتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ چل کر رہنے سے ان کے حالات سازگار ہو جائیں گے ۔ جن کی یہ ساری امیدیں بسا اوقات موہوم ثابت ہوتی ہیں۔"

ڈاکٹر موصوف آگے چل کر لکھتا ہے ۔

"سفر بجائے خود کوئی مسئلۂ حیات نہیں، اگر انسان کسی غیر مقصد کے زمین کا گز بن جائے ۔ یا ایک خیالی عافیت کی جستجو میں سرگاڑی یا پیسہ پیسا کر ڈالے، یا لال سودا گر کے روپ پھر کو شہر شہر بھاگتا پھرنے لگے تو آپ یقین جانیے کہ وہ کسی ایسی اندرونی پریشانی میں مبتلا ہے جس کو دور نہیں کر سکتا ۔"

ڈاکٹر موصوف کا اوپر کا نظریا ایک حقیقت واقعی بن کر انجمن "اعانت مسافراں" کے کاغذات میں روز بروز نمایاں ہو رہا ہے ۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ انجمن "اعانت مسافراں" کا دائرۂ عمل صرف سفری حالات تک محدود ہے ۔ یعنی گاڑیوں کی آمد و رفت کا جائزہ لینا، آوارا گرد بچوں کی خبر گیری کرنا، جن مسافروں کے ٹکٹ کھو جائیں ان کو ضروری قرض دینا یا بھٹکے ہوئے اور پریشان حال مسافروں کے رات بسر کا انتظام کرنا ۔ یہ تمام کام بلکہ ان سے بہت زیادہ کام "اعانت مسافراں" کرتی ہے، لیکن اس کا نوے فی صدی وقت اور سرمایہ ان بھولے بھٹکے سیلانی لوگوں کی مدد اور اصلاح پر صرف ہوتا ہے جو کہ حقائق زندگی سے ناواقف ہیں ۔ بعض قارون کے خزانے کی ہوس میں ہوا کے گھوڑے پر چڑھے پھرتے ہیں بعض اپنا غم غلط کرنے کی فکر میں پڑے پھرتے ہیں اور بعض ایک ہمارے اور خشی آبدگذرے ہوئے زمانے کی تلاش میں جو ان کو پھر نہیں مل سکتا مارے مارے پھرتے ہیں ۔

نمایاں اپرانی بات نہیں کہ ایک اسٹیشن ماسٹر چوراسی سالا بڈھے کو "اعانت مسافراں" کی ڈیوٹی پر لے آیا، جس کے بشرے سے وجاہت اور معصومیت ٹپک رہی تھی مگر ضرورت اور احتیاج سے بالکل بے نیاز تھا ۔ ان بڑے میاں نے کہا کہ میری بس اتنی سی خواہش ہے کہ ایک دن آرام کے لیے کوئی جگہ مل جائے ۔ وہ ایک ساقی الجنہ تھا اور بہت کافی رقم اس کے پاس تھی ۔ اس کی ساری عمر لندن اور انڈیا جیسے شہروں میں کٹی تھی اور اب زندگی کی یہ آخری تمنا اور باقی تھی کہ مغرب کی جانب جائے، اور یوں ہی جوتے پہنے ہوئے مر جائے، بس اس کا یہی مقصد سفر تھا ۔

"اعانت مسافراں" نے اس کے لیے ایک کمرا فراہم کر دیا، لیکن یہ غلطی بوڑھا آنکھ بچا کر کھسک گیا، اور ہفتہ بھر کے بعد شہر ڈنس کے ایک اخبار نے اس کی موت کی خبر بدان الفاظ میں شائع کی ۔

"ایک بڑے میاں جن کے کل پونجی نہیں اور جن کو یہ مریادی ہو گیا تھا کہ اپنی زندگی کے گذرے ہوئے زمانے کو ڈھونڈتا پھرتا ہوا جوتے پاؤں میں پہنے مریں گا، مگر جن کو پچھلی ایک بات بھی یاد نہ رہی تھی، عالم غربت میں یہاں چل بسے ان کے کسی عزیز دوست کا کوئی پتا نہ لگ سکا اس لیے ان کی لاش شہر انٹیریو کو روانا کر دی گئی ہے ۔"

اسی قسم کے واقعات "اعانت مسافراں" کو پیش آتے رہتے ہیں اور ایسے ستائے ہوئے بڈھے لوگوں کا اپنی ماضی کی تلاش میں تانتا بندھا رہتا ہے مگر اس سے بھی زیادہ پڑھا لکھا ان اجاڑ لوگوں کا ہے، جو ایک رشتے دار کے گھر سے دوسرے

کے ہاں بے بلائے مہمان بنا کر دھمکا کر دیے جاتے ہیں۔ ایک تیرا سی برس کا بہت ہی بڈھا پھیوں والی کرسی پر بٹھا کر "اعانت مسافران" کی ڈیسک پر لا بٹھایا گیا۔ اس نے بیوروکریٹی ہیتا دہرائی جس سے انجمن کے کارکنوں کے کان بخوبی واقف ہیں۔ اس بیچارے کے بیٹے اور داماد نے قریب کی بستی میں ایک رشتے دار کے یہاں جہاں بھیجنے کا بہانا بنا کے اسٹیشن پر گاڑی میں لا کر بٹھا دیا۔ یہ قریب اس پر جب کھلا کہ بہت دور نکل چکا تھا۔ ٹکٹ دیکھا تو شہر کا گو تھا جہاں اس کا کوئی عزیز آشنا نہیں رہتا تھا۔ وہ غریب دکان سے چور اور بدحواسی سے بدحال تھا۔ "اعانت مسافران" نے کسی رشتے دار کا پتا نشان لگانے تک ایک صحت گاہ میں داخل کرا دیا۔ بڑی چھان بین سے اسکی ایک بیٹے کا نیو پارک میں پتا لگا جو چار برس سے غائب تھا۔ وہ باپ کو لینے گئے تو کہا گو آ گیا، جس پر قسمتی کے مارے بوڑھے کو رسانا تھا۔ اس کو ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ اس کی اولاد میں کوئی باپ کی خاطر اتنی زحمت اٹھائے گا۔ واقعی وہ بہت سے باپوں سے زیادہ خوش نصیب تھا۔ ان فراری مسافروں کی بہ اعتبار درجے چھ خاص شکلیں ہیں۔

۱۔ ضعیف عقل بوڑھے۔

۲۔ گھروں سے بھاگے ہوئے ننھے اور سیانے آوارا بچے۔

۳۔ وہ نوجوان جو والدین یا عزیزوں سے لڑ جھگڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

۴۔ ازدواجی مسایل سے تنگ آ کر گھر بار چھوڑ کر بھاگے ہوئے لوگ۔

۵۔ عادی سیلانی۔

۶۔ اعصابی یا دماغی مریض۔

پچھلے دنوں شکاگو کی "اعانت مسافران" نے ایک بھاگے ہوئے کا کھوج لگانے میں ساری دنیا کے سراغ رسانوں کو مات کر دیا تھا۔ حقیقت میں زندگی سے گریز پائی کا ہر ایک ایسا اچوتی واردات تھی کہ دولت متحدہ امریکا کی تقریباً اڑتالیس ریاستوں کی پولیس اور عوامل کو جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا۔

ایک پولیس مین نے شہر گری ہاؤنڈ کے اندر ایک ننھا بچا سوٹ کیس پر بیٹھا اور روتا دیکھا جس کو وہ "اعانت مسافران" کی ڈیسک پر لا بٹھایا۔ بچے نے بتایا کہ اس کی ماں یہ کہہ کر چھوڑ گئی تھی کہ جب تک واپس نہ آؤں یہیں پر بیٹھا رہنا! جس کا انتظار کرتے دو دن گزر گئے ہیں۔ چنانچہ بچے کو ایک پرورش گاہ میں داخل کر دیا گیا۔ اور دو دن گزر جانے کے بعد وہ عورت بس اسٹیشن کو لوٹ آئی اور ایک عجیب مبہم انداز سے پوچھنے لگی "میرا بچا کہاں گیا؟"

اس نے کسی سرائے میں جا کر عارضی مزدوری کر لی تھی۔ اور دل میں یہ مصمم ارادا رکھتی تھی کہ جس وقت بھی بس کا ٹکٹ خریدنے کے قابل پیسے کما لوں گی بچے کے پاس پہنچ جاؤں گی، تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ اس عورت کے دماغ میں خلل تھا۔ اور ملک کے ضبط صحت کے کسی پاگل خانے سے نکل بھاگی اور اپنے بچے کو بھی گھر سے اڑا لائی۔ اور سال بھر سے اسی طرح شہر شہر کی خاک چھانتی پھر رہی تھی کہ جب پاس کچھ نہ رہتا تھا تو بچے کو کسی بس اسٹیشن پر بٹھا جاتی اور مزدوری کر کے سفر بسر کے قابل پیسے کما لاتی تھی۔ اس کے پاس ایک بھرا ہوا اٹیچی تھا اور دماغ میں صاف خاکہ تھا جدھر جانا تھا۔ اس کا شوہر اور خاندان ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے جو اپنی جانوں کے خوف اور دنیا کی شرم سے اس عاجز کو چھوڑ چکے تھے اور چپ ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ "اعانت مسافران" نے بچے کو تو باپ کے پاس بھجوا دیا۔ اور اس کی دیوانی ماں کو بحفاظت تمام فلنج کلک کے دماغی ہسپتال میں داخل کرا دیا۔

بلاشبہ یہ ایک نادر الوجود حادثہ تھا، مگر زیادہ اسی جیسے دلچسپ آتے ہیں فاقہ اتفاقی نہیں ہوتے، بلکہ کسی سبب سے ان کا نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے وہ سایل زندگانی سے اپنی جان چھڑانے کو بھاگتے پھرا کرتے ہیں، مگر بعضوں میں خصوص، عادی سیلانیوں میں بنیادی محرکات اس قدر گہرے مخفی ہوتے ہیں کہ وقتی مدد کو دینے کے سوا ان کا حقیقی کوئی درمان نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک مخفی شخص

ہوریس نامی جوڑا ہی نستعلیق اور مرد معقول ہے جس کی تہائی پابندی سے آمد و رفت ہے۔ حتاکہ "اعانت مسافران" اس کا ایک مستقل پتا نشان بن گئی ہے، وہ عموماً موسم بہار اور کبھی خزاں میں بھی شکاگو آتا ہے۔ "اعانت مسافران" اس کو سستا کمرا اور آسان سا روزگار فراہم کر دیتی ہے۔ ہر چند اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی سے پس انداز کرکے بوڑھی ماں کو دیکھ آئے جو البامایں رہتی ہے، مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے، اور جب ایک شہر کی تنہائی سے اس کا جی اکتا جاتا ہے تو ایک ریتے چوگی کی طرح کسی دوسرے شہر میں جا بسرام کرتا ہے۔ "اعانت مسافران" کے سپروائیزر مسز بیٹی گارڈن کا بیان ہے کہ ہوریس ہمارے یہاں ہر سال آتا ہے، مگر ہم اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جان سکے ہیں کہ اس نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں کوئی نہ کوئی شدید غلطی کھائی ہے۔ ہمارے کاغذات میں اس کا اندراج مالی مشکلات میں ہے اور ان تین لاکھ سے اوپر انسانوں کے مانند ہے، جن کی ہمارا انجمن سالانا مدد کرتی ہے۔ ہوریس بیچارا بھی کسی خاص تکلیف دہ واقعے کے سبب سیلانی بن چکا ہے۔ بعض اوقات کسی نراری کا خاش خیالوں میں ڈوبا ہوا احساس شور، عالم غربت، اجنبی ماحول اور اسٹیشن کے رنگا رنگ سیمابی جلوؤں میں پھر ابھر آتا ہے اور یکایک چونک کر اپنے دل میں کہتا ہے۔

"خدایا! میں نے یہ کیا حرکت کر ڈالی"

اور اگر عبورت ہوتی ہے تو ویٹنگ روم میں ہی چیخ اٹھتی ہے اور پہلی ہی گاڑی سے لوٹ جاتی ہے۔ ایک بیڑن کسی ظاہرت پیشہ شخص کی انیس سالا بیوی، کو ویٹنگ روم کے اندر بیٹھا ہوا رحکیاں اور ہچکیاں لیتے ہوئے پایا۔ جو فوراً "اعانت مسافران" کے کارکن کو بلا کر لے آئی۔ اس نوجوان لڑکی کا ایک پانچ مہینے کا رو دھو پینا بچا تھا سسے کو چھوڑ کر گھر سے نکل آئی تھی۔ جب ذرا دل ٹھکانے آیا بتانے لگی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اوہیو سسرال آئی ہوئی تھی مرد کوئی بات گراں گذری جس پر طیش کھا کر نکل کھڑی ہوئی۔ دنیا میں اس کا کوئی رشتے دار ہے اور نہ عزیز۔ اور اس کا یقین تھا کہ اس کا شوہر گھر میں نہیں آنے دے گا کیونکہ اس کا کسی دوسرے مقام کو تبادلا ہو چکا تھا۔ سان ڈیگو یا پورٹ لینڈ یا اور کہیں۔ آخر اس کا پتا لگایا گیا اور وہ خود آن کر اپنی بیوی کو واپس لے گیا۔

شکاگو کی انجمن "اعانت مسافران" ۱۸۹۰ء میں قایم کی گئی تھی، جس کا مقصد ریل گاڑیوں پر پہنچ کر ان لڑکیوں کو امداد دینی تھی جو روزگار کی تلاش کے لیے شہر میں آتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کچھ بدچلن عورتوں نے قحبہ خانے کھول رکھے تھے، جس میں نو وارد بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانس لے جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لیے "اعانت مسافران" کے قیام کا خاص مقصد ان شریف لڑکیوں کو آوارگی میں پڑنے سے بچانا تھا۔

آج "اعانت مسافران" میں تقریباً پانچسو مرد اور خواتین حاجت مند مسافروں کی رہنما کارانا خدمات ایجا دیتے ہیں۔ ایک سو تنخواہ دار ملازم ان کے سوا ہیں۔ انجمن کا یہ نظام ہوائی جہازوں، ریل گاڑیوں اور بسوں کے چھ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر پھیلا ہوا ہے، پچھلے سال انجمن نے تقریباً پانچ لاکھ روپیہ پریشان حال مسافروں کو بطور قرض دیا تھا، جس میں ۹۷ فی صدی رقم واپس وصول ہو چکی ہے۔ سرکارڈن اپنے تجربے بیان کرتی ہیں۔

"ہمارے پاس مدد کے لیے آنے والوں میں اکثر دیانت دار، مگر آشفتہ خاطر لوگ ہیں اور وہ حالت فرار میں ایک عارضی تسکین کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کی پہلی اندعا کسی بہت ہی اوچھا خواہش سے شروع ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سینیٹر ہیں یا گاڑی کا وقت، مگر اس کی اوٹ میں ایک جذباتی طوفان امنڈتا رہتا ہے۔ ہم ان معمولی سوالوں کا سہارا پاکر بڑی نرمی اور دلداری سے

دریافت کرتے ہیں۔

"کیا ہمارے لائق اور بھی کوئی خدمت ہے"

جس پر وہ طوفان پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ خدا فراموش اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ چل کر نیا داخلہ لیں گے جو ان کا ایک سہانا خیال ہے۔"

ایک خوب موٹی عورت جس کے پیچھے پیچھے پانچ بچوں کی بیس ڈوری تھی "اعانت مسافران" کی ڈیسک پر آن کر پوچھنے لگی۔

"میرے پاس پورٹ لینڈ کا ٹکٹ ہے، اب میں اس کو مسی سپی کے لیے کیوں کر تبدیل کراؤں"

یہ کہتے کہتے اس کی ہچکی بند گئی۔ گھنٹے بجنے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر بولنے لگا اور اسٹیشن کا بڑا گھڑیال اپنی ٹک ٹک سے جھڑکیاں دینے لگا۔ ایک نئی بھگدڑ جذباتی بھول بھلیوں میں پھنس گئی تھی۔

قطعات

تیغ الہ آبادی

تکلف بر طرف کو تھام لیتا ہوں
جب وہ لمحات یاد آتے ہیں
اس قدر ضبط پر بھی اے ہمدم
اشک آنکھوں میں آ ہی جاتے ہیں

قہقہے، جام، ساز، رقص، سرود
تیری محفل ہے واقعی افسوں
ایک لمحے کے واسطے، لیکن
جی میں آتا ہے بیٹھ کر رو لوں

اب وقت وداع ہے اے ہمدم
کیوں آنکھوں میں اشک بھر آئے
کہہ دیا کوئی کیوں پس چلمن
کچھ ہمارے دل میں بھی چاند چھپ جائے

غزل

بہا کر میں آنسو بجھانے کی حد تک
جلاؤں گا شعلے بجھانے کی حد تک
چلا جا رہا ہوں سنبھلنے کی حد تک
غم عشق کو آزمانے کی حد تک
تعین محبت کی حد یہ بھی ہے
مرے ساتھ آؤ زمانے کی حد تک
رہ زندگی میں بہ عزم مصمم
مٹانا ہے ہستی مٹانے کی حد تک
نہ ہو جائے رسوا خلوص محبت
رلانا مجھے مسکرانے کی حد تک
گوارا ہے احساس تنہائی، لیکن
مجھے یاد کر لیں بھلانے کی حد تک
برائے کرم داستان محبت
ترے بھی چکی ہے فسانے کی حد تک
دبایا ہے درد محبت کو دل میں
عنایت سے تیری دبانے کی حد تک
محبت کے دامن سے داغ محبت
مٹا تو رہا ہوں مٹانے کی حد تک
فریب تبسم کی رعنائیوں نے
ہنسایا ہے اکثر رلانے کی حد تک
یہ منت بہاروں کا اہل چمن ہے
سجے گا چمن آشیانے کی حد تک
پہنچ تو چکی ہے بہ بین محبت
خوشی سے ترے آستانے کی حد تک
پلائی ہے دنیا کو صہبائے تسکیں
سر بزم مستی پلانے کی حد تک
سجو دو عصو رہے بیخود و مضطر
پہنچتا رہیں آستانے کی حد تک
مجھے زیب تن کی کیا فکر ہوتی
ہنسی نے رلایا رلانے کی حد تک

آغا حشر کا فن

آغا بابر

آغا حشر کے فن کا جائزہ لینے سے پہلے اس اسٹیج کا ذکر کر دینا ضروری ہے جس پر آغا حشر کا فن پرکھا جاتا ہے۔ آغا حشر کے زمانے میں عوام و خواص کو عالا میعار کی تفریح بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ اسٹیج تھا۔ صرف اسٹیج کے ذریعے کارزار حیات کا نقشا پیش کیا جاتا تھا۔ اسٹیج کی ہمہ رنگی کا یہ عالم تھا کہ تمام فنون لطیفہ متحد ہو کر دیکھنے والے کو اپنے پر ورش کرتے تھے۔ تمثیل میں چاہے شاعرانہ بلند خیالی ہو یا فلسفیانہ رموز، مصلحانہ باتیں یا ظریفانہ شگفتگی، بقول سید امتیاز علی تاج اُن سب کو ایسی خوش بیانی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھنے والے کرداروں کے طرز عمل سے اثر قبول کرتے۔ ڈرامے کے دوران میں اسٹیج کی سجاوٹ اور خوبصورت پردوں کی صورت میں مصور کا فن ہر امکانی خدمت کے لیے دست بستا حاضر رہتا۔ روشنیوں اور سائے کے طرفہ تماشے دکھاتا اور موسیقی ڈرامے کی اثر انگیزی کو شدید تر بنانے کے لیے الگ جادو جگاتی۔

یہ تھا آغا حشر کا فن تھا جس نے اسٹیج کے تمام مطالبات کو نہ صرف پورا کیا، بلکہ ان کو اس قدر جلا بخشی کہ ڈرامے کی خدمت کرنے اور اسے ترقی دینے والوں میں ان کا نام ہمیشہ سرفہرست رہتا ہے۔ محمد حسین آزاد، شرر، رسوا، شوق، قدر بلگرامی اور مولانا ظفر علی خان کے ڈرامے محض ادبی ڈرامے تھے جو اسٹیج کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ ان میں کتنے ہی عروج بھی اس کمال تاثر اور شدت کے ساتھ ظاہر نہ ہوتا تھا جو اسٹیج پر نکھر سکتا۔ آغا حشر کے معاصرین میں بھی یہی کمی تھی۔ چنانچہ جب آغا حشر نے ڈراما نویسی کی دنیا میں قدم رکھا تھا تو عباس بیگ، احسن لکھنوی، پنڈت ہتیاب دہلوی اور منشی فاضل لکھنوی کا بڑا چرچا تھا۔ حشر کے ڈراموں نے کچھ عرصا بعد ہی وہ دھوم مچائی کہ ان کے معاصرین نے یا تو قرد قرد کنارکشی کر لی یا انداز بدل ڈالا، لیکن پھر بھی آغا حشر کے فن کے سامنے ان کے چراغ کی لو مدھم پڑتی چلی گئی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ آغا حشر کے ڈراموں میں پلاٹ کی کشش، کہانی کا تذبذب، مکالموں کا ادبی حسن اور حزنیا کے تاثر کی دل آویزی اس گہرائی کے ساتھ دیکھنے والے پر اثر انداز ہوتی کہ وہ بہت متاثر ہوتا۔ ان کے فن میں اتنی گہرائی اور وسعت تھی کہ وہ حاضرین کو مسحور کر دیتے تھے۔

ان کی تحریر عام فہم ہوتی تھی۔ جتنا اثر ایک عالم پر کرتی اتنا ہی اثر ایک جاہل اور ان پڑھ پر ہوتا، یہ ان کے ڈراموں کی ایک بڑی خوبی تھی۔ ان کے احباب سے روایت ہے کہ وہ جب کسی ڈرامے کا سین لکھتے تو وہ سین اپنے ملازم کو جو بلکل جاہل اور ان پڑھ تھا اپنے کمرے میں بلا کر سناتے، اگر وہ کچھ کہہ دیتا کہ اس کی سمجھ میں آگیا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو بدل دیتے تھے۔

آغا حشر کی کردار نگاری

ان کے فن کی دوسری بڑی خصوصیت کردار نگاری تھی، جو ڈرامے کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا ہے۔ آغا حشر کے معاصرین کے ہاں کرداروں کا ارتقا اس خوبی سے ظاہر ہوتا تھا جس خوبی سے آغا حشر کے کردار ڈھلتے تھے۔ آغا حشر کے کردار وقت اور زمانے کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویریں ہوتے تھے، اسی لیے ان کے متعدد کردار ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو گئے تھے، انہوں نے اکثر افراد کے کردار پیش کرنے میں اس طبقے کی اجتماعی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ مزدور، مہایا دار سیٹھ، رند، خدا پرست، جواری، شرابی، چور، ڈاکو، طوائف، بادشاہ، وزیر، سپاہی، محب وطن اور باغی غرض ہر مشرب کے کرداروں میں ان کا ایک فرد مجموعی طور پر اپنی اجتماعی سیرت کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

آغا حشر کی کردار نگاری میں یہ خصوصیت بھی بڑا امتیاز درجا رکھتی ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کے کسی کردار کے متعلق کسی دوسرے شخص سے کچھ نہیں کہلواتے بلکہ وہ کردار خود اپنے کردار کا جائزہ پیش کرتا ہے، اسے جو کچھ اپنے کردار کے متعلق کہنا ہے وہ خود

کہتا ہے۔ اس طرح کردار شیکسپیر کے کرداروں کی طرح اپنے عیب اور بھلائی لیے حاضرین کے سامنے خدا آجاتا ہے اور اس طرح ٹوڈائے کاٹاٹر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر "آنکھ کا فتنہ" میں کام لتا اپنی طوائفیت کا بھرم جن الفاظ میں کھولتی ہے ملاحظہ ہو۔

جگل۔ میں نے اپنا چین اور دھرم تجھے قیمت میں دے کر تیرا روپ مول لیا۔

کام لتا۔ جگل بابو اگر طوائف ایک کی ہو کر رہتی تو تم جیسے مانی پرش کبھی اس کا دان نہ کرتے۔

جگل۔ تو روتی اور ہنستی آنکھوں سے وشواس دلانے والی آنسو ٹپکا کر کیوں کہتی تھی کہ تمہاری ہوں۔ کیوں کہتی تھی کہ میں پریم کرتی ہوں۔

کام لتا۔ بے شک میں پریم کرتی تھی۔

جگل۔ جھوٹ سے۔

کام لتا۔ نہیں تمہارے روپے سے۔

جگل۔ تو آج تک جھوٹ سے جھوٹ بولتی رہی۔

کام لتا۔ ہاں! کیونکہ تم لوگ طوائف کے منھ سے جھوٹ ہی سن کر خوش ہوتے ہو۔

جگل۔ خوبصورت ناگن، صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ دنیا ایک پاپ کی دکان ہے، جس میں پریم کے نام سے چھل اور کپٹ بکتا ہے۔

کام لتا۔ بے شک ہم طوائفوں نے تمہارے چھلے چھل کپٹ کی دکان کھول رکھی ہے، مگر اس دکان کے خوبصورت کھلونوں کو کون خریدتا ہے۔ تم لوگ خریدتے ہو۔ یہ چھل کپٹ کی دکان کس کے روپے سے چل رہی ہے۔ تمہارے روپے سے، جب تم اپنے شہروں میں سینکڑوں کو رنڈی کے پھندے میں پھنس کر پیسے پیسے کے لیے بھیک مانگتے دیکھ چکے تھے۔ جب تم ایک نہیں ہزاروں کے منھ سے طوائف کے چھل کپٹ کی کہانی سن چکے تھے۔ تب جیب کا روپیا خرچ کر کے رنڈی کے کوٹھے پر اندھے اور بیوقوف بننے کے لیے کیوں آئے تھے۔

عام فہم مکالمے

آغا حشر زمانے کی ہوا کا رخ پہچانتے تھے "دل کی پیاس" میں "مغربی روشنی کے اثر" سے ہونے طوفان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

ٹھاکر۔ ہندستان بدل رہا ہے اور دھیرے دھیرے ہوا بدل جاتا ہے جو لوگ زبان و قلم سے اس طوفان کو روکنا چاہتے ہیں وہ ہوا میں گرہ دے رہے ہیں۔ نئی تہذیب کو کوسنے اور گالیاں دینے کے بجائے انہیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یورپ سے آئی ہوئی آزادی کی لہر بھارت کے شریر پر بہتے ہوئے نیل کے ساتھ بھارت کی خوبصورتی کو بھی نہ بہا لے جائے۔ میں زنانا تعلیم اور آزادی کا مخالف نہیں ہوں، مگر میری نم ہتی ہے کہ تعلیم پانے کے بعد بھی بھارت کی عورت کو عورت ہی رہنا چاہیے۔ نئی کرتو یہ کا بھولی ہوئی عورتیں اپنے چلن سے نئی تہذیب کو بدنام کر رہی ہیں۔

"سلور کنگ" میں جب افضل کا وفادار نوکر اپنے بہکے ہوئے رستے پر آنے کی نصیحت کرتا ہے تو وہ کہتا ہے۔

افضل۔ کیا تمام دنیا جوا نہیں کھیل رہی ہے؟ کیا اس دنیا میں ہر شخص ایک دوسرے کے ساتھ داؤ نہیں کھیل رہا ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں، وزیروں کے محل میں، سوداگروں کی دکان میں، غرض ہر جگہ قسمت کی بساط پر کوشش کا پانسا نہیں پھینکا جاتا۔ کیا ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو۔ ہر بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو اور ہر بڑی عقل والا چھوٹی عقل والے کو پورا نگل جانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ سب جواری ہیں جو کھیلتے ہیں۔ بادشاہ طاقت سے، وزیر قلم سے سپاہی تلوار سے اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے وہ چتوں سے کھیلتا ہے۔ اگر مطلوں ہیں تو سب ورنا کوئی نہیں

یہ تھی حشر کی عام فہم زبان، مگر لفظوں کی جدت ایسی کہ مکالمے میں ہر طرح کی طراری آتی جائے۔ جب باکمال ایکٹر اسٹیج پر عمدہ عمدہ پوشاکوں میں آکر چلت پھرت اور اشاروں کے ساتھ ان مکالموں کو بولتے اور اسٹیج کی سجاوٹیں اور روشنیاں چکاچوند پیدا کر دیتیں تو عام و خاص ایسا تاثر لے کر جنت کو پھر آتے۔

خیر غور فرمایئے اس بات کو نصف صدی ہو گئی ہے ۱۹۰۸ء کی بات ہے الفریڈ کمپنی جب بمبئی میں ہنری ٹوکلینی کو تیئیس دن کی اجازت ملی۔ مگر حکومت کو سولہ دن کے بعد اسے وہاں چلے جانے کا حکم دینا پڑا۔ شہر کا شہر دیوانا ہو گیا تھا آغا حشر کے کھیل دیکھنے کے لیے بھیڑیوں نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ آغا حشر کے مکالموں میں اتنی جان اور مکالما بولنے والے اداکار میں اتنی صلاحیت اور خوش بیانی ہوتی تھی کہ لوگ ان کے ڈراموں کو دیکھ کر سیر نہ ہوتے تھے۔ کئی ایکٹر جب غمگین اثرات والے مکالمے بول کر اسٹیج سے ہٹ کر ونگ میں آتے تھے کہ ان کی آنکھیں سچ مچ کے آنسوؤں سے ڈگمگا رہی ہوتیں اور کئی تو سچ مچ رو دیتا۔

اس وقت ڈراما مقفا عبارت میں لکھنے کا رواج تھا کیونکہ ماہرین تمثیل کا خیال تھا کہ سامعین کے ذہن پر جتنا اثر مقفا عبارت کرتی ہے اتنا اثر غیر مقفا عبارت نہیں کرتی۔ آغا حشر اس دلیل میں کلام الٰہی کی مثال پیش کرتے جس میں تمام آیات کا سلسلہ عبارت ہی میں نازل ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ مقفا عبارت میں گل بوٹے اس وقت کھل سکتے ہیں جب لکھنے والے کے ذہن رسا کے سامنے اظہار و بیان کی تمام جگمگاتی قندیلیں یعنی حاضر اور زبان الفاظ کا بیش بہا اور کثیر ذخیرہ ایک درت بستا کھڑی ہے۔

آغا حشر کو نہ صرف ہندستانی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا بلکہ انہیں انگریزی پر بھی دسترس حاصل تھی بسکرت ادب ہندی ریومالا اور مذہبی معلومات سے بھی پورے طور پر واقف تھے۔ انہوں نے بنجاب دہلوی کے ڈراموں کے مقابلے میں اپنے ہندستانی ڈرامے لکھے تو ملاحظہ ہو وہ اعتراف جمیل جو پنڈت بنجاب دہلوی کو کرنا پڑا تھا۔ لکھتے ہیں۔

جب حشر کا انداز رقم دیکھتے ہیں
لوگ آپ کے دانتوں میں قلم دیکھتے ہیں
مشکل ہے بیان لطف اے لطیف بیاں
لوگ جانتے ہیں ہم ہی چشم دیکھتے ہیں

مکالموں میں اشعار

ڈراما صرف اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے کیونکہ اسی کسوٹی پر اس کے کھرے کھوٹے کا پتا چلتا ہے۔ ڈرامے کے حسن و جمال اور اثر انگیزی میں ڈرامے کے گانوں کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ڈرامے کے اشعار کا ایک اپنا ڈھب ہوتا تھا۔ تھیٹر کے مکالموں کی طرح اشعار بھی گونجتے اور بولتے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ شعر جس میں دھماکا نہ ہو اور جس کے اتار چڑھاؤ کے ڈرامائی انداز سے سننے والے کے دل پر ضرب نہ لگے تھیٹر یا ڈرامے کا شعر نہیں کہلا سکتا۔ مثال کے طور پر داغ کا یہ شعر لیجیے ؎

بھوئیں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

میں اس شعر کو تھیٹر کا شعر کہوں گا۔ اس شعر کی تصویر کشی اور الفاظ کی نشست و برخاست میں جو بات ہے وہ اسے تھیٹر کا شعر بناتی ہے۔ اسی طرح یہ شعر ؎ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

یہ بھی اپنے انداز میں تھیٹر کی ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے۔ چنانچہ ڈراموں کے گانے اور غزلیں بھی ڈرامے کے مطالبات ہی کو مدنظر رکھ کر لکھی جاتی تھیں۔ گانے کے الفاظ ایک دوسرے سے دھماکوں کے ساتھ ٹکراتے، ان میں گونج پیدا ہوتی پہلا مصرع مضمون اور ادائیگی کے لحاظ سے ایک کیفیت پیدا کرتا پھر دوسرا مصرع مضمون اور ادائیگی ہی سے وہ کیفیت دوبالا کر دیتا۔ اسی طرح شعروں کے کہنے سے ڈرامائی کیفیت کو مدد ملتی اور لفظوں کے دھماکے اور ٹکراؤ سے صوتی لحاظ سے سننے والے کے دل پر ایک ضرب لگتی۔ آغا حشر کا فن اس سلسلے میں بھی امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ یہ گانا املاحظہ ہو جس میں ساری کیفیت مکالمے کی سی ہے۔

تم کون بشر ہو کہاں وطن ہے کیا ہے تمہارا نام
کیوں آئے یہاں پر کیا مطلب ہے تمہارا ہے کیا کام
بلا بلائے باغ میں آئے غضب کے ہو خود کام
تم کون بشر ہو کہاں وطن ہے کیا ہے تمہارا نام

(آفتاب محبت)

اب یہ شعر ملاحظہ ہو پہلا مصرع جو قطعی کی کیفیت لیے ہوئے ہے

دوسرا اسے کس طرح کہتا ہے۔

شکر خدا کہ آج ہمیں میں عزیز ہوں
آقا ہو تم میرے میں تمہاری کنیز ہوں (خواجہ حیدر)

اب غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

مجھے معلوم ہے کچھ اور تمنا کر لو شب غم ہم نے کسی طرح بسر کی
چلے جانے جو مڑ کر دیکھ جاؤ قسم ہے آپ کو تیری نظر کی
(یہودی کی لڑکی)

جب ایک ماہ پیکر تیاروں دے دے کر گاتی ہوئی اسٹیج پر نمودار ہوتی تو تعریف کا دریا کس درجہ بڑھ جاتا ہوگا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر یہ گاتی ہے

لگا کر دل کسی سے ہائے ہم نے
مصیبت مول لی غم بھی تو کم کی

تو لوگ "ونس مور" کا غل مچا کر پنڈال سر پر اٹھا لیتے۔ اب یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ہر ایک میں وہ دھماکا ہے جو شور کو ڈرامے کا شور بناتا ہے۔

تیر خدا سے گر نہ گیا تو زمین میں
کیا ہو گا ظالم جرم نہ تھی ترے دین میں

وہ بات کی جو تھی نہ گماں و یقین میں
اک سانپ میں نے پالا تھا آستین میں

کیا جانتا تھا میں کہ اک آفت ہے تو بھی
آب بقا میں سمجھا تھا جس کو وہ زہر ہے
(یہودی کی لڑکی)

اس وقت اسٹیج نے موسیقی بھی اپنی ہی وضع کی کر لی تھی جس طرح آج فلموں کی موسیقی اپنی قسم کی موسیقی ہے۔ اس وقت بڑے بڑے پکے گانے والے تھے۔ موقع کے راگ کو اس طرح پیش کرتے کہ تمام تماشائیوں پر گراں نہ گذرتے تھے۔ غرض آغا حشر کے ڈراموں کی کردار نگاری، مکالموں کی جان اور گانوں کا رچاؤ حاضرین کو مبہوت کر دیتا تھا۔ آغا حشر کے فن نے نہ صرف اسٹیج کی غرضیت اور امکانات کا احساس پیدا کر دیا تھا بلکہ انہوں نے عوام کو تمثیلی ذوق بھی دیا تھا جو آج کے تمثیلی ذوق کی اساس ہے۔

ڈرامے اور تھیٹر کی دنیا پر آغا حشر کی حیثیت ایک ایسے امام کی سی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی۔ آج ان کو انتقال کو تیس سال ہو رہے ہیں۔ فن کار کی عظمت اسی میں چھپی ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا فن زندہ رہے۔ اس کے فن کی عظمت یہ کیا کم ہے کہ کوئی نصف صدی گذرنے پر بھی ان کا ایک ڈرامہ "آنکھ کا نشہ" خدا یاد آ جاتا ہے۔ جب ان کے فن میں ماہر قصہ خوان مرحوم کی وضعیں کانوں میں رس گھولتی ہیں تو سماں عالم ہی کچھ ہوتا ہے۔ لوگوں پر اس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آغا حشر کو فن ہوئے ربع صدی ہو چکی ہے، مگر ابھی تک گردش روزگار ان کی شہرت نہیں ٹال سکی۔ یہ وشنو جادو داں نہیں کٹ سکتا۔

غزل

نند لال پردانہ بی۔ اے

ہمارا ضبط مقدم ہے بے اثر ہی سہی
مزاج یار بھی مانوس شور و شر ہی سہی

ہمارے عشق کا چرچا بھی ہے زمانے میں
تمہارے حسن کا جلوہ نظر نظر ہی سہی

خود اپنی روح کی آواز سے نہ ہو منکر
تو میرے درد محبت سے بے خبر ہی سہی

نصیب ہی تو نہیں آب حیات اے دوست!
مرے نصیب میں محرومیٔ سحر ہی سہی

ہمارا جذبۂ پرواز تو سلامت ہے!
کسی کے ہاتھ میں تحریک بال و پر ہی سہی

خندۂ گل

(مزاحیہ)

ابوالحسنات فارابی

آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے۔ میرے یہاں کلرشریف کے ایک مہمان صوفی قدرت اللہ بی تشریف فرما ہیں۔ ایسے موقع پر جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ میں نے بیگم صاحبہ کو مہمان کا استقبال کرکہا۔

"بیگم صاحبہ! آج ذرا افطاری چٹ پٹی مصالحے دار قسم کی ہونی چاہیے۔ دیکھو مہمان آیا ہوا ہے۔ میری ناک تمہارے ہاتھ ہے۔ اس کو کٹنے سے بچانے کے لیے جتنے جتن کرسکتی ہو کرلینا۔ صوفی صاحب مرغ مالی کھانے کے عادی ہیں۔ دہی بڑے اور پھلکیاں تو تم روز ہی بناتی ہو، آج ذرا حلوا پوری بھی بنالینا اور تھوڑی سی بریانی بھی ضرور ہونی چاہیئے۔"

بیگم صاحبہ جھلا کر فرمانے لگیں "ہاں کیوں نہیں آپ نے تو مجھے تاروں کا خزانہ بخش دیا ہے نا؟ خدا کی پناہ! سات روپئے میں بھی تو آپ بریانی کے خواب دیکھتے ہیں۔ کیا صوفی صاحب شہنشاہ اعظم سمجھتے ہیں جو ان کے سامنے معمولی کھانوں سے تمہاری ناک کٹ جائے گی۔"

میں نے حسب عادت بیگم صاحبہ کے تیوروں کو نظر انداز کرکے کہا "نہیں بیگم! یہ بات نہیں تم تو جانتی ہی ہو کہ رمضان خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں جتنی زیادہ عمدہ اور مرغن غذائیں کھائی جائیں گی سارے سال برکت رہے گی۔ اللہ میاں بھی کیا کہیں گے کہ میرے بندے نے میری رضا اور خوشنودی کے واسطے روزہ رکھا۔ تمام دن نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔ میں نے آج کے دن اس کے لیے دنیا بھر کی نعمتوں کے دروازے کھول دیے، لیکن اس نے روزہ کو صرف دو کھجور سے افطار کرنے پر ٹرخا دیا ——— خیر یہ تو اللہ والوں کی باتیں ہیں تم ان کو نہیں سمجھو گی۔ میں تو مہمان کی بات کر رہا تھا وہ بے چارا کیا کہے گا کہ کیسے منحوس گھر میں قدم رکھا ہے جہاں سلیقے سے روزہ بھی افطار نہ ہوسکا۔"

بیگم صاحبہ نے حسب دستور جھلا کر فرمایا "خیر ان باتوں کو رہنے دو، میں سب سمجھتی ہوں مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا کروں گی۔"

میں نے اس جواب سے مطمئن ہو کر آگے کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور چپ چاپ اپنی مردانہ نشست میں مہمان کے پاس آگئے۔

چھ بجکر اٹھائیس منٹ پر بیگم صاحبہ نے اطلاع دی کہ کھانا چن دیا گیا ہے اپنے مہمان کو لے کر آجایئے۔ ہم مہمان سمیت دسترخوان پر پہنچ گئے۔ دسترخوان پر رنگ برنگ کھانے نظارہ افطار دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی۔ روزہ افطار کرنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ ہم نے گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں سوئیاں جم کر رہ گئیں ہیں۔ آگے بڑھنے کی قسم کھائی ہے، سیکنڈ کی سوئی کی رفتار بھی سست معلوم ہو رہی تھی۔ یہ آخری دس منٹ پچھلے دس گھنٹوں سے زیادہ بھاری ہو گئے۔ خیر صاحب خدا خدا کرکے وقت پورا ہوا۔ دارالعلوم کے گھنٹے پر موگری پڑی۔ روزہ افطار کرنے کا اعلان ہوا۔ اعلان کے ساتھ ہی کھانے پر یورش بول دیا۔ دہی بڑے، پھلکی، شامی کباب، بریانی، ہگامہ، اوہ حلوا پوری وغیرہ سب کا ذائقہ ایک دوسرے پر فوقیت لیے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک چیز زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے ——— پہلے مجھے، کھایا اور خوب کھایا۔ روزہ افطار کرنے کا حق ادا کر دیا۔ جب پیٹ نے مزید کھانا قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہمارے صوفی صاحب کو نماز کا خیال آیا۔ فرمانے لگے "یار علامہ! کھانے کے چکر میں نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے، آؤ پہلے نماز پڑھیں۔"

"پہلے کیا مطلب! یعنی کہ آپ نماز کے بعد بھی کھانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" میں نے حیرت سے صوفی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جنہوں نے مجھ سے کچھ زیادہ ہی کھایا تھا، مگر ابھی مزید کھانے کی ہمت باقی تھی۔ صوفی صاحب نے جواب دیا۔

"کیوں نماز کے بعد کھانے کی ممانعت تو نہیں ہے؟"

"مگر کھایا کس طرح جائے گا، میرا پیٹ تو جواب دے چکا ہے، لیکن کھانا ابھی تک بچا پڑا ہے۔" وہ فرمانے لگے۔

"علامہ، تم اناڑی ہو، معلوم ہوتا ہے تمہیں جھٹکے دار نماز پڑھنا نہیں آتی، آؤ آج تجربا کر کے دیکھو۔ رکوع اور سجدے ذرا پھولانی کے انداز میں کرنا، پھر دیکھنا یہ کھانا کہاں جاتا ہے۔"

ہم نے اپنے دوست کی ہدایت کے مطابق آج جھٹکے دار نماز شروع کی تو واقعی دو ایک رکعت کے بعد ہی کھانا معدے میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نماز پڑھنے کے بعد اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ ہم نے بچا ہوا کھانا بھی صاف کر دیا۔ کھانے کے بعد مہمان تو سروانے میں چلے گئے۔ بیگم نے آکر جب دسترخان پر نظر ڈالی تو حیرت زدہ رہ گئیں وہ کبھی دسترخان کو دیکھتیں اور کبھی ہمیں۔ تعجب کے ساتھ کہنے لگیں "خدا کی پناہ! کیا آج تم میں کسی متبرک ولی یا بڑے کی روح حلول کر گئی تھی۔ آٹھ آدمیوں کا کھانا دو آدمیوں نے صاف کر دیا۔" میں نے جواب دیا۔

"خدا بخشے مرحوم صوفی صاحب کو، آج ان کی بدولت تیئس روزے کے بعد صحیح معنی میں روزہ افطار کیا ہے، مگر یہ تبلاؤ بچے پر اتنی رونق تھی نہیں، جتنی دسترخان پر نظر آ رہی تھی، آخر ماجرا کیا ہے۔ میری تو عقل حیران ہے۔ آج تو تم نے کمال کر کے رکھ دیا۔" بیگم صاحبہ نے سکرا کر جواب دیا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے، میں نے آج اپنے باپ بھائی بہنوں سب کے ہاں یہ کہلا بھیجا تھا کہ میرے ہاں مہمان آئے ہیں کچھ انتظار بھیج دینا، سب کے ہاں سے کئی کئی آدمیوں کی خوراک آ گئی، اگر تم خدا بچائے ہم لوگوں نے صاف کر کے رکھ دیا۔" میں نے کہا۔

"بیگم! کچھ بھی ہو، آج ہم تمہاری سمجھداری کے قائل ہو گئے۔ بیگم ہو تو ایسی ہو، خیر چھوڑو اس بات کو۔ تمہیں معلوم ہے آج خان بہادر برکت علی کا ختم قرآن ہے۔ صبح ہی سے سوائی ٹھاٹھ باٹ بنانے میں لگے ہوئے ہیں، مسجد کو دلہن بنانے کے شاندار انتظامات کیے گئے ہیں۔ خدا کی قسم بڑا ہی شاندار ختم ہوگا۔ چشم فلک نے بھی ایسا شاندار ختم نہ دیکھا ہوگا، دور دور سے مہمان ختم میں شرکت کے لیے آ رہے ہیں۔ عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ چلو گی؟"

"تو بابا کہو، میں کیوں جانے لگی۔" بیگم صاحبہ نے فرمایا خان بہادر اپنی ریاست کی شان دکھلانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ سب "ریا" ہے اور ریاکاری گناہ ہے۔ میں تو ایسے نمائشی ختم میں جانے کی کبھی بھی رائے نہیں دوں گی۔ بھلا اس طرح روپیہ بہا کر مسجد کو دلہن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"تم جن باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں، ان میں کیوں دخل دیتی ہو، کیا تمہیں معلوم ہے ان امور جمیل میں یحب الجمال یعنی خدا جمال والا ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔ آرائش و زیبائش تو بہت اچھی چیز ہے۔ خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار محمود ہے۔ مذموم تو ان رسوم باتوں کو کہا جا سکتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"خیر بچے بھی ہو، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔ بہشتی زیور میں حضرت تھانوی نے ان سب باتوں سے منع کیا ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"بہشتی زیور عورتوں کے لیے ہے، مردوں کے لیے نہیں، تم جاؤ، مت جاؤ، مجھے کیا، مجھ ایسا عظیم الشان ختم شریف کہیں چھوڑ دینے کی چیز ہے۔"

میں بیٹھک میں اپنے دوست کے پاس آ گیا، وہ چارپائی پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔

"یار علاما، ذرا معاف کرنا" معمول سے زیادہ کھا لیا۔ میں اسے ہضم کر رہا ہوں۔"

"ضرور کرو" میں نے کہا "مجھے بھی تو اپنا کھانا ہضم کرنا ہے۔ خان بہادر کے لڑکے کے ختم کی مٹھائی کھانے کے لیے تو گھنٹوں ورزش کرنا پڑے گی۔"

یہ کہہ کر میں بھی دو سری چارپائی پر دراز ہو گیا، اور صوفی صاحب ہی کے انداز پر کروٹیں لینا شروع کر دیں۔ بڑے دنوں کے بعد ایک ماہر فن سے جس موقع پر سابقہ پڑ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ عشا کا وقت ہو گیا، ملانے اذان کہی اور ہم تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھے۔

وضو کیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد کے قریب پہنچے تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ باب ختم قرآن۔ نوچندی کے گیٹ کو بھی شرما رہا تھا۔ ہزاروں رنگ برنگے گولے جگ مگ کر رہے تھے۔ بجلی کے ماہر میز خصوصی نے اپنی پوری قابلیت ختم کر کے رکھ دی تھی۔ مسجد واقعتہً دلہن معلوم ہو رہی تھی، سڑک پر صفیں بچھا دی گئی تھیں۔ مسجد کا تو ذکر ہی کیا، ہمیں سڑک پر بھی بمشکل جگہ مل سکی۔

جماعت کا وقت شروع ہو جانے کے تقریباً پون گھنٹا بعد نماز شروع ہوئی۔ پہلی رکعت پر معاملا گڑبڑ ہو گیا۔ اور امام جہراً ادے کے پڑھنے کی آواز باہر تک نہیں آ رہی تھی۔ اگلی صفوں کے لوگوں کو دیکھ کر ہماری صف کے لوگ بھی رکوع میں چلے گئے، مگر جب سجدے میں گئے تو وہیں پڑے رہ گئے سبحان ربی الاعلیٰ گیارہ مرتبہ پڑھنے کے بعد ذرا سی گردن اٹھا کر جو دیکھا تو ابھی اس صف کے لوگ سجدے ہی میں پڑے ہوئے تھے۔ پانچ سات دفعہ اور پڑھا اور پھر ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا تو راغ چکر آ رہا تھا۔ اگلی صف کے حضرات دونوں سجدوں سے فارغ ہو کر کھڑے بھی ہو گئے تھے اور ہماری صف کے حضرات ابھی پہلے ہی سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ تو جلدی سے ایک ہی سجدے پر کھڑے ہو گئے۔ کچھ نے بھرتی کے ساتھ دوسرا سجدا بھی کر لیا اسی خدا خدا کر کے فرض پورے ہوئے، سلام پھیرا، اور لوگوں نے شور مچایا۔

"صاحب تکبیر ہونی چاہیے، اس کے بغیر کام نہیں چلے گا، ہماری تو نماز ہی گڑبڑ ہو گئی۔"

تراویح شروع ہوئی۔ بعض حضرات کو ہماری حالت زار پر رحم آ گیا اور انہوں نے تکبیر کہنا شروع کر دی، جوں توں کر کے تراویح بھی ختم ہو گئی، اور اب مٹھائی کی تقسیم کا وقت بھی آ گیا۔ گوہر مقصود بڑی بڑی سینیوں میں بھرا ہوا دیکھ کر لوگوں کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھا اور وہ مٹھائی پر ٹوٹ پڑے متولین کے لیے مجمع پر کنٹرول کرنا ممکن نہ رہا۔ ہر شخص یہی کوشش کر رہا تھا کہ پہلے مٹھائی میں لے بھاگوں ہم نے جب یہ حشر دیکھا تو سوچنے لگے کہ "علاما! آج شرافت کے موڈ میں مٹھائی ہاتھ لگنا ممکن نہیں ہے"۔ دل سے آواز آئی، ہمت کر آگے بڑھیں تو بیگم کو کیا منہ دکھائے گا۔

ہم بھی میدان کارزار میں کود پڑے۔ مجمع کو چیرتے پھاڑتے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے، مگر خدا کی پناہ دو قدم آگے بڑھتے ہیں تو ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑ جاتا ہے۔

دھکے کھاتے ہم مٹھائی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کسی نے پیچھے سے ہماری پگڑی کھینچ ڈالی۔ جلدی سے ایک ہاتھ سے پگڑی سنبھالی۔ نہ معلوم کس جبیت نے یہ ناشائستہ حرکت کی تھی۔ ہم ابھی پگڑی کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پیچھے ہی کی طرف کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ اب پیچھے ہٹنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ آگے دھکا چوکڑی میں ہم مٹھائی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک ہاتھ مٹھائی کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ دوسرے ہاتھ میں پگڑی کا جو آخری کنارا باقی رہ گیا تھا وہ بھی چھوٹ گیا۔

دونوں ہاتھوں میں مٹھائی لے کر بمشکل تمام جب مجمع سے باہر آئے تو پگڑی غائب ہو چکی تھی۔ باتوں میں مٹھائی ہونے کی وجہ سے کف افسوس بھی نہیں مل سکتے تھے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنے جوتوں کی طرف بڑھے تو ایک

رفعا دماغ پھر چکر کھا گیا۔ دیکھا کہ جوتے بھی غایب ہیں۔

ہم نے یہ جوتے عمجتہ الوداع کے لیے آج ہی خریدے تھے۔ عجب چکر میں پھنس گئے۔ اب آخر کیا کیا جاے۔ مجبوراً اپنے پیر کے مطابق ایک اور صاحب کے جوتوں کو تاکا۔ اور ابھی ہم کو چلنے کا ارادا کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی "ابی حضرت! یہ تو میرے ہیں!"

پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر جلدی سے جوتے دکال ڈالے اور اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں یہی جوتے سر پر نہ پڑنے شروع ہو جائیں، سر پر پاؤں رکھا اپنے گھر کی جانب بھاگ پڑے بیگم کی نصیحت رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اپنے تمام دلایل کا کچھ مر نکل چکا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر سانس درست کیا۔ اس کے بعد بڑی احتیاط سے گھر میں جھانک کر دیکھا کہ بیگم کیا کر رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر دم میں دم آیا کہ وہ چوکی پر نماز میں مشغول ہیں۔ دبے پاؤں گھر میں داخل ہوے۔ جلدی سے اپنا پرانا ٹوٹا ہوا چپل پہنا اور میلی پگڑی سر پر لپیٹ

غزل

نوید فصل گل آئی ہے کو بکو پھر بار آئی
کہاں کے غنچہ و گل بادۂ و جام و سبو پھر بار آئی
گھٹا مستانہ وار اٹھی ہوا دیوانہ وار آئی
نشے میں جھومتی گاتی ہوئی فصل بہار آئی
خزاں کے جور نے جو دیکھا تھا بے طرح دل کو
جب ان کی یاد آئی تو خیال آیا بہار آئی
قفس میں دیدۂ خوں بار کی گلکاریاں تو دیکھ
چمن سے بھی سوا صیاد کے گھر میں بہار آئی
ہر اک تنکا، اک غنچہ، ہر اک کانٹا ہے تیرِ گل
قفس میں باغ میں صحرا میں ہر جا پر بہار آئی
لگا دی آگ سی پھر میرے دل میں آتش گل نے
یہ کیسی جی جلانے کے لیے فصل بہار آئی
گریں گی خرمن تو یہ پہ بجلیاں تشنہ
لب ساقی پہ مرے ہیں بہار آئی بہار آئی

وہ ستارے جن کی خاطر کوئی بے قرار ہیں ہیں
میری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جب ایں
کبھی راحتوں پہ لیکن کبھی سختوں میں ہیں
کبھی سوگوار سے ہیں کبھی نغمہ بار جا گیں
وہ بلند بام تارے، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا رہے بے نشان ہمیشہ
وہ حسین وہ نور تارے، وہ خلا کے شہزادے
جو ہماری قسمتوں پہ رہے حکمراں ہمیشہ
جنہیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنہیں خضر راہ جانا
جنہیں کسی نے چاہا کہ لپک کے پیار کر لیں
جنہیں مہ وشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کر لیں
جنہیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پر سجائیں
جنہیں بت گروں نے ڈھونڈا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں انہیں پاس لا کے پوجیں
جنہیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرو لیں
جنہیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمو لیں
جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاکیوں کی بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک
مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دور عشق پہ دور تمہیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے
مرے ساتھ رہنے والو! مرے بعد آنے والو
مرے دور کا یہ تحفہ تمہیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گذرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

کسی دوست نے ہمیں ان اشعار پر کیا گرفت کی ہوگی۔

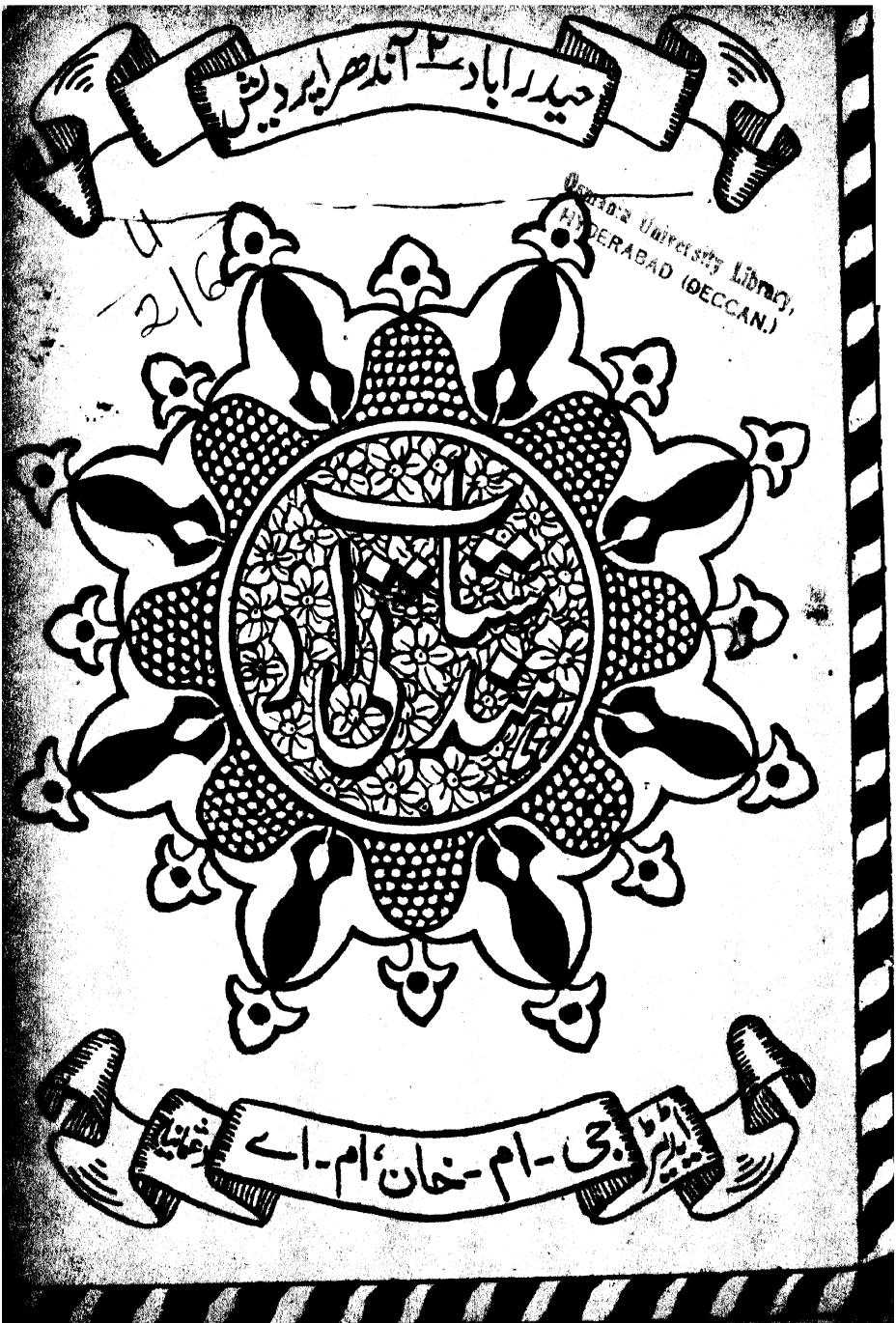
مشہور ماہر علم ہندستان — ایوان منایئف

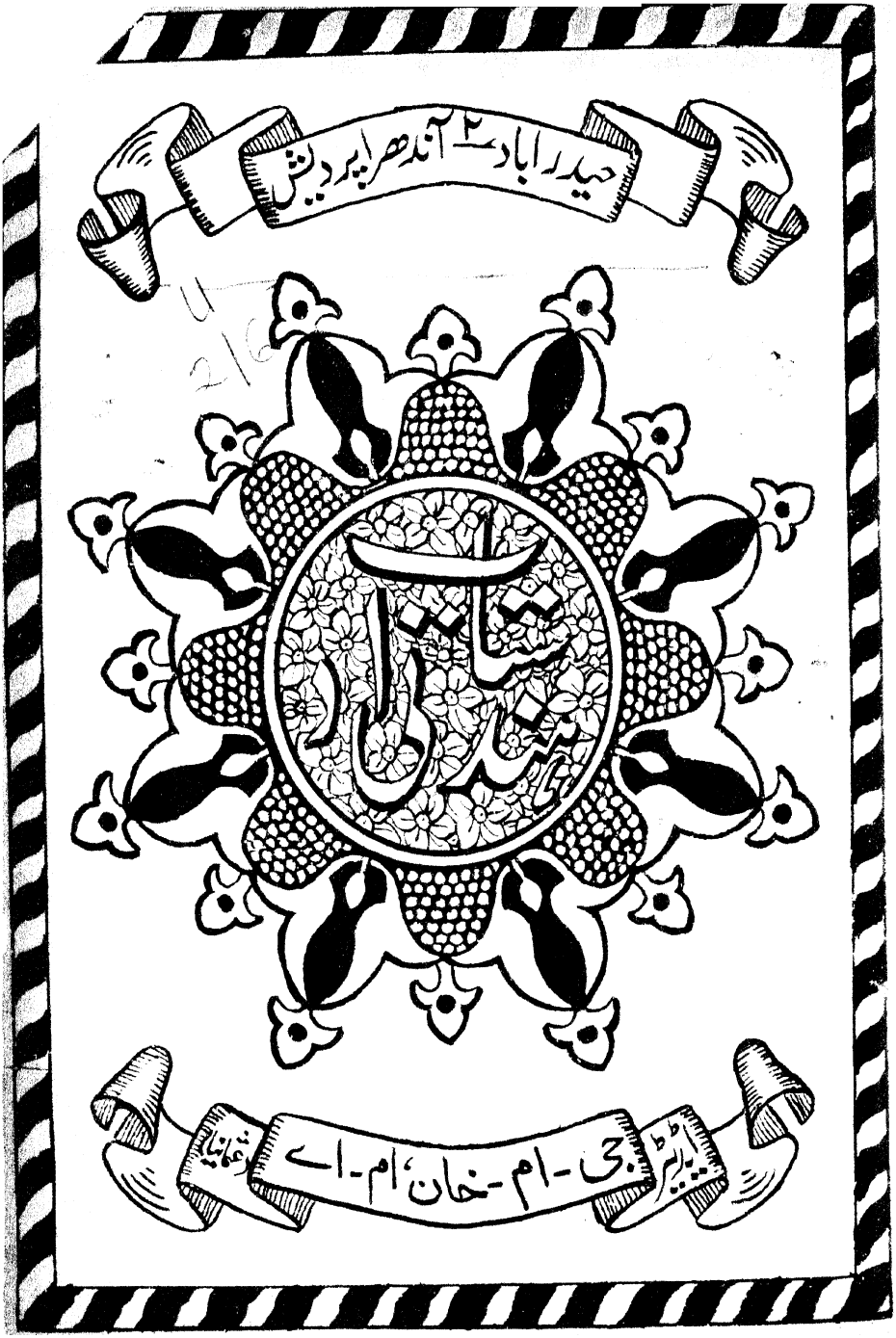
یلینا سیمیکا

ایوان منایئف نے ایک عالم اور ماہر علم ہندستان کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ انہوں نے علم ہندستان کے مختلف پہلوؤں پر بہت مضامین لکھے۔ وہ بیس مرتبہ ہندستان آئے اور بہت سا مواد حاصل کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔ ہندستان کی قدیم اور جدید زبانوں اور ہندستان کے مذہبوں کے متعلق انہوں نے جو تحقیقی کام کیا وہ محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ساری تصانیف میں ایک خیال ہمیشہ ملے گا — قدیم ہندستانی تہذیب کی شان و شوکت سے دنیا کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔

ایوان منایئف ۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ء میں ایک معمولی سرکاری ملازم کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ایک مقامی کالج میں تعلیم کے بعد انہوں نے سینٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں کے شعبے میں داخلہ لیا۔ وہ بودھ مت کے مشہور عالم واسی لیف کے شاگرد تھے۔ واسی لیف ہی نے نوجوان منایئف کے دل میں دلچسپی پیدا کی۔ یونیورسٹی میں منایئف نے ہندستانی زبانوں کا مطالعہ کیا جن کی وجہ سے وہ بودھ مت کے ادب کا مطالعہ کر سکے۔ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ روس سے باہر چلے گئے اور مشہور ماہرین علم ہندستان کی نگرانی میں سنسکرت اور پالی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ برٹش میوزیم میں انہوں نے بودھ مخطوطوں اور پیرس کی قومی لائبریری میں پالی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ پانچ برس بعد وہ وطن واپس آگئے اور بودھ مت کی دعاؤں کی کتاب "پراتی ماکاسوتر" کے روسی ترجمے کی اشاعت کی تیاری شروع کر دی۔ اسے انہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کیا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے پالی زبان کی آواز اور صوتیات کے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا اور سنٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی میں انہیں ہندستانی یورپی زبانوں کی تقابلی گرامر کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ منایئف بالکل تنہائی پسند کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اور اسی لیے وہ سارا وقت تحقیقی کام کرنے میں صرف کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۷۷ء میں زمانۂ قدیم میں مغرب کے ساتھ ہندستان کے روابط کے متعلق ایک مقالہ لکھا۔ اس مقالے نے تمام طلبا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے بودھ کہانیوں "جاتک" کے متعلق کئی مضامین لکھے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے مہتمم کارنامہ ہندستانی کہانیاں اور داستانیں" ہیں جس میں انہوں نے ۱۸۷۵ء میں جمع کیا تھا۔ منایئف کی علمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دیا دا کام سانی سوالوں کے مطالعے کے سلسلے میں کیا۔ پالی زبان کا انہوں نے خوبی مطالعہ کیا کیونکہ انہیں یہ احساس تھا کہ بودھوں کی مقدس کتابوں کے مطالعے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ سنہ ۱۸۷۸ء انہوں نے پالی زبان کی مکمل گرامر شایع کی۔ بعد میں اس کا ترجمہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں کیا گیا اور غدر ہندستان میں اسی ترجمے کی مدد سے ہمارے ملک کے لوگ تک پالی زبان کا مطالعہ کیا جاتا رہا۔ منایئف قدیم پالی اور سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت کا بھی انتظام کرتے۔ یہ کتابیں سینٹ پیٹرس برگ کی مدرسوں میں شایع ہوئیں۔ منایئف کی اصل دلچسپی بودھ مت کی تاریخ اور فلسفے سے تھی۔ بودھ مت کے متعلق ان کی سب سے اہم کتاب "بودھ مت مطالعہ اور ماخذ" ہے۔ بودھ مت فلسفے کے ساتھ انہوں نے بودھ آرٹ کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کی ناوقت نے یہ کام مکمل ہونے نہ دیا۔ انہوں نے جو مواد جمع کیا تھا اسے ان کے انتقال کے بعد ان کی شاگرد اولڈن برگ نے شایع کیا۔ منایئف کے روزنامچے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن میں انہوں نے ایشیا میں اپنی سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ ایشیائی ملکوں کی سیاحت کے متعلق انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے جنہیں بعد میں انہوں نے ایک مجموعے کی شکل میں شایع کیا۔ جس کا عنوان ہے "لنکا اور ہندستان کے تیرتھ" "ایک روسی سیاح کا سفر" اس کتاب کے ایک باب میں منایئف نے ہر ہو سیاح کے رہنماؤں کا تذکرہ

جی۔ ام۔ خان نے اعجاز مشین پریس جھنڈا بازار حیدرآباد میں چھپوایا۔


حیدرآباد ۲ آندھرا پردیش
Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN.)
U
216
سنہ آباد
ڈاکٹر جی۔ام۔خان، ام۔اے


حیدرآباد ۲ آندھرا پردیش
سنہ تا
پیٹر بی۔ ام۔ خان، ام۔ اے

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظور ا

رجسٹرڈ نمبر — انیچ (۱۸۴۲)
جلد (۲۰) — نمبر (۹)
چند اسالانا — آٹھ روپے
سنہ ۱۳۶۹ف — سنہ ۱۹۶۰ء
امرداد — جون

ہندستانی ادب

حیدرآباد ۲۴ - آندھرا پردیش
ایڈیٹر
جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحہ	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت انقر سوہانی وارثی	۳	
۳	غزل	تاج الشعرا افخم النصرفوق نادری	۴	
۴	تبرکات	اعتبار الملک دل شاہجہانپوری (مرحوم)	۵	
۵	رباعیات	شفیق حیدرآبادی	۵	
۶	نوٹ کا چرخہ	کامل شفیقی جونپوری	۶	لوک ہنکاری
۷	منزل	منظور الامین	۷	آندھرا پردیش
۸	ہوائے نفس پرستی	اشفاق حسین بیخود وارثی (ملیگ)	۷	
۹	غزل	رتن پنڈوروی	۸	رہنمائے تعلیم
۱۰	مولانا آزاد غبار خاطر اور کارون خیال	عابد رضا بیدار	۹	برہان
۱۱	پشکن اور اس کی شاعری	پروفیسر کراشینن نیکوف	۱۵	مجلس
۱۲	نگریا — دورنئی	عفت سوہانی	۲۰	خیال
۱۳	بہاراں کرکے چھوڑیں گے	ع - ق - حامدی	۲۶	آہنگ
۱۴	ملیالم کا ادب	محمد اسحاق ایوبی	۲۷	
۱۵	حرف آرزو	بھگوتی پرشاد عاجز بنارسی	۲۹	شمع ادب
۱۶	خندۂ گل	ابوالحسنات فارابی	۳۰	اسلامی دنیا

ہمارے خیالات

"ورکرس ایجوکیشن انسٹیٹوٹ"

۱۶ مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو ڈاکٹر شریمالی یونین ایجوکیشن منسٹر نے اندور میں "ورکرس ایجوکیشن انسٹیٹوٹ" کا افتتاح کیا۔ یہ انسٹیٹوٹ ہندستان میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے۔ اس ادارے میں مزدوروں کے لیے تعلیم اور تفریح کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ یہ اسکیم یونین ایجوکیشن منسٹری کی طرف سے جاری کی گئی ہے۔ اس کے اجرا کا اہم مقصد یہ ہے کہ مزدور طبقے میں سماجی تعلیم اور سماجی ذمے داریوں کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس کا نصاب زیادہ تر گروپ واری مباحثوں اور عام لکچروں پر مشتمل ہے۔ اس ادارے میں "یوتھ کلب" بھی قایم کیے جائیں گے جن کے ذمے مختلف قسم کی سماجی سرگرمیاں رہیں گی۔ ریڈیو سننے کے انتظامات اور سوشل قسم کے ڈرامے اسٹیج کرانا، اسی کلب کا کام ہوگا۔ مزدوروں کے بچوں کی بھلائی، بہتری اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کمیٹیاں قایم کی جائیں گی۔ اس ادارے کو چلانے کے لیے ۱۶ ممبر کی ایک کمیٹی قایم کی جائے گی، جن کا صدر مدھیا پردیش کا لیبر کمشنر ہوگا۔

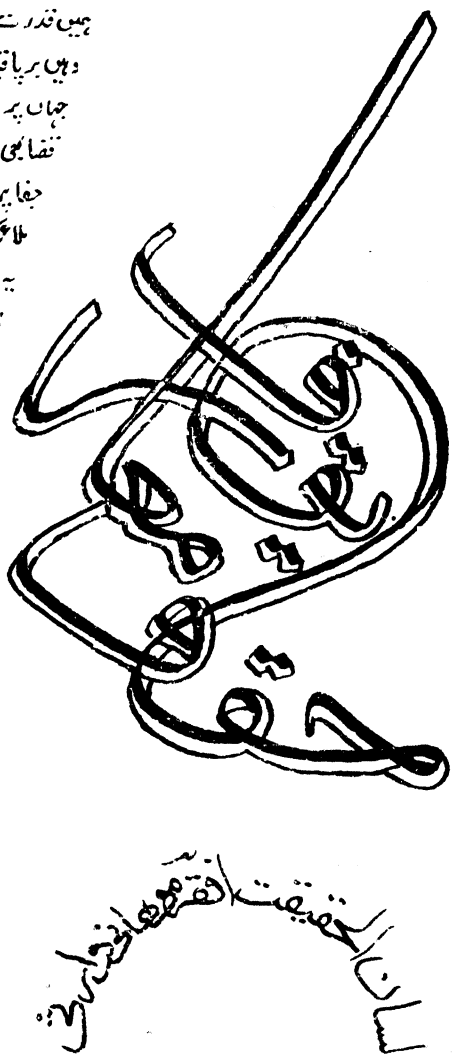
ہندستان کی ہر چھوٹی ترقی کے سلسلے میں جو بھلے کام ہو رہے ہیں، ان میں سے یہ ایک اچھا کام ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کے ہندستان تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے۔ اس کا تعلیمی فیصد مشکل ہی سے ۱۹ ہے۔ صنعت کے ہر شعبے میں تعلیم یافتا لوگوں کی ضرورت ہے۔ جہاں بغیر تعلیم یافتا نہ ہوگا، کارکردگی میں فرق آئے گا، جس کے نتیجے کے طور پر صنعتی پیداوار میں لازماً کمی ہوگی۔ جاپان، روس، جرمنی، برطانیا اور امریکا میں لیبر تعلیم یافتا ہوتا ہے، اس لیے ان ملکوں کی صنعتی نیز زراعتی پیداوار دوسرے ملکوں کے مقابل بہت بڑی ہوئی ہے۔ ہندستان چونکہ مفلس ملک ہے، اس لیے یہاں تعلیم عام نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا مزدور طبقہ ناجاہل ہے۔ ایسے ہی طبقے کی جہالت کو بڑی حد تک دور کرنے کے لیے اوپر کی مفید اسکیم جاری کی گئی ہے۔ ہم اس اسکیم کا سواگت کرتے ہیں اور اس کے جاری کرنے پر یونین ایجوکیشن منسٹری کو دھنیاواد یا مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ بڑی ہی اچھی اسکیم ہے، اس لیے ہم ایجوکیشن منسٹری کو مشورا دیں گے کہ یہ اسکیم سارے ہندستان میں جاری کی جائے اس سے دیس کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

اپنی افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر شریمالی نے ٹھیک کہا ہے کہ صنعتوں کے پھیلاو کے سبب مزدور طبقا دیہاتوں سے شہر کی طرف کھنچا کھنچا چلا آرہا ہے، اور یہ مقناطیسی کشش تلاش روزگار کا باعث ہے۔ شریمالی کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ طبقا شہر کے مزدور طبقے سے بلکل ہی الگ تھلگ رہتا ہے۔ ان دونوں طبقوں میں سماجی میل ملاپ کا کوئی ذریعا نہیں ہوتا۔ مگر اس انسٹیٹوٹ نے دونوں ہی کو باہمی سماجی رشتے میں جکڑ دیا ہے، اس کے ذریعے ان میں میل جول بڑھ جائے گا۔ ان میں سماجی شعور پیدا ہوگا، اور ساتھ ساتھ یہ جاہل مطلق طبقا تعلیم بھی حاصل کرتا جائے گا۔

اس انسٹیٹوٹ یا ادارے کو تجربے کے طور پر کھولا گیا ہے، مگر ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ تجربا نہایت ہی کامیاب ہوکر رہے گا، اور اس سے پہلے وزارت تعلیم کو چاہیے کہ کئی ایک بڑے شہروں میں بھی اس قسم کے ادارے کھول دے، ایسے سب ہی تجربے کامیاب ثابت ہوکر رہیں گے۔ مزدور طبقے میں خود ہی احساس اور شعور پیدا ہو جائے گا، اور خود اپنی بھلائی کی خاطر یہ طبقا اسکیم کے کامیاب بنانے میں سرتوڑ کوشش کرے گا۔

اس سلسلے میں یونیورسٹی ایجوکیشن کو ہمارا ایک اور مشورا یہ بھی ہے کہ لیبر کلاس کے بچوں کو صرف سماجی بھلائی

قسم کھائے جبیں اہل وفا کی
ہمارے سر کسی کے نقش پا کی
جھلک دیکھی جو حسن دلربا کی
ہمیں قدرت نظر آئی خدا کی
وہیں برپا قیامت اک ہوا کی
جہاں پر خاک پہنچی کربلا کی
قضا بھی ایک صورت ہے ادا کی
جفا پیرو کرم نا آشنا کی
ملائک سجدہ کرنے آرہے ہیں
یہ رفعت ہے کسی کے نقش پا کی
ذرا دل میں یہ سوچیں اہل دنیا
کہ دنیا نے بھلا کس سے وفا کی
نشیمن پر جہاں بجلی گری تھی
وہ شاخ آشیاں برسوں ہلا کی
نہیں اک میں ہی شکوہ سنج الفت
زمانہ بھر ستمگر کا ہے شاکی
ٹھکانہ وسعت دل کا بھلا کیا
بہت وسعت ہے کم ارض و سما کی
نہ بھی پھر بھی جلووں کی حد و تک
نظر جلووں میں گم الکشن ہوا کی
سمجھتا ہے ہر اک کو درد والا
یہ حالت ہے دل درد آشنا کی
اٹھا ہے کس ہلاک غم کا لاشہ
صدا ہر سو سے آتی ہے بکا کی
نہ جب تک جل گیا مرا نشیمن
برابر چرخ سے بجلی گرا کی
پلا دے ایک ہی ساغر میں ساقی
مدینہ کی، نجف کی، کربلا کی
جہاں ڈوبی تھی کشتی اپنی افقر
وہاں موج فنا برسوں اٹھا کی



غزلیں

ناخدائے سخن

کس جگہ دل کے لیے ان کی زبردستی نہیں
خوبرو جس میں نہ ہوں ایسی کوئی بستی نہیں
بزم ساقی میں ادب آداب کی پستی نہیں
تیرے غم کو ہے مستی مجھ کو بدمستی نہیں
ہے محبت لوگوں کو ناز اپنے عروج و اوج پر
کیا زمانے میں بلندی کے لیے پستی نہیں
میں نے اتنا مطمئن ان کی نظر کو کر دیا
اب محبت کی کسوٹی پر مجھے کستی نہیں
دل بھی حاضر جان بھی حاضر تمہارے واسطے
ہے یہی دستی مگر اتنی بھی دستی نہیں
ہے بہت مہنگی ہماری رائے میں جنس وفا
یہ ہے ایسی چیز جو بازار میں سستی نہیں
چھیڑتے ہیں مرے دل کو اب مجھ سے تو بہ جبر
اور فرماتے ہیں یہ کوئی زبردستی نہیں
کیا دل غمگیں کو میرے ہو مسرت کا خیال
وہ یہاں رکتی نہیں ٹکتی نہیں بستی نہیں
جینے والوں کو ہوا معلوم یہ مرنے کے بعد
نیستی کے سامنے ہستی کی کچھ ہستی نہیں
ہے گرانی کا یہ عالم عشق کے بازار میں
موت ہی سستی ہے کوئی اور شے سستی نہیں
آج ہم دنیا میں آئے اور کل ہم چل دیے
یہ اگر ہستی ہے تو ہستی کوئی ہستی نہیں
میں الگ دنیا سے رہ کر بے نیاز غم رہا
یہ وہ ناگن ہے جو بے چھیڑے ہوئے ڈستی نہیں
بے بلائے نوحؔ وہ آئیں یہاں تک کیا مجال
یہ ہے ایسی بات میرے دل میں جو جمتی نہیں

نوحؔ ناروی

تاج الشعرا

فصیح العصر

تبرکات

(۱)

اب کوئی غمگسار ہمارا نہیں رہا
دنیا کو اعتبار ہمارا نہیں رہا
اس فرطِ غم میں خون کے آنسو ٹپک پڑا
اب دل بھی رازدار ہمارا نہیں رہا
اس کی حضور پیرِ مغاں میں ہے منزلت
جو عہد پائیدار ہمارا نہیں رہا
ہر داغ ابھر کے زخمِ نہاں رشکِ گل بنا
دل مائلِ بہار ہمارا نہیں رہا
یہ ہے مآلِ صحبتِ زاہد حباب دل
رندوں میں اب شمار ہمارا نہیں رہا

(۲)

جہانِ مہر و محبت میں یادگار رہے
حیاتِ دل ہے یہی تک کہ بیقرار رہے
سمجھ رہا ہوں یہ مقصد ہے لنترانی کا
حدودِ ہوش و ادب میں امیدوار رہے
یہی متاعِ تمنا یہی ہے قسمتِ عشق
تری طلب میں قیامت کا انتظار رہے
لہو کے اشک بہائیں سرِ شام و نفس
کہ یادگار اک افسانۂ بہار رہے
یہی ہے حاصلِ تمنا یہی ہے مطلبِ دل
مری نظر میں ترے حسن کی بہار رہے
گذر چکا ہے حدودِ شکیب ضبطِ خلل
خدا ہی رازِ محبت کا پردہ دار رہے

اعتبار الملک
دل
شاہجہانپوری
(مرحوم)

اے ذوقِ طلب کچھ ترا انجام تو ہے
اک مشغلہ ہماری سحر و شام تو ہے
اس خم کدۂ ہستی میں یہ بھی ہے بہت
رندوں کے لیے درد تہِ جام تو ہے

لیلائے بہار بے وطن ہو نہ سکی
ویران کلوں کی انجمن ہو نہ سکی
تقسیمِ چمن تو ہو گیا اے گلچیں
تقسیم مگر روحِ چمن ہو نہ سکی

پیدا جو عمل میں استواری کر لو
تم چاہو تو جوئے شیر جاری کر لو
کب تک دیکھو گے راہ ابرِ باراں
خود اپنے چمن کی آبیاری کر لو

کل پھر یہ اوراقِ چمن ابھریں گے
جو مٹ گئے وہ نقش کہن ابھریں گے
کیوں خاک کل و سمن پہ گریاں ہے شفق
اس خاک سے پھر گل و سمن ابھریں گے

اے ابرِ سرورِ بار آہستہ گذر
اے موسمِ خوشگوار آہستہ گذر
کیا جانے پھر اس چمن میں کب تو آئے
اے قافلۂ بہار آہستہ گذر

کل ابرِ بہار تھا چمن میں چھایا
اور آج نہیں موسمِ گل کا سایا
جس عالمِ رنگ و بو کا یہ ہو انجام
اس عالمِ رنگ و بو سے ہیں جی بھر پایا

گر داب کے دامن میں گذارا کر لوں
کشتی کی تباہی بھی گوارا کر لوں
مل جائے اگر بحرِ حوادث میں سکوں
میں خود ہی کنارے سے کنارا کر لوں

شفق
میانوی

بوٹ کا چرخہ

کامل شفیقی — جونپوری

رنگینیٔ بہارِ چمن کو ہیں لوٹتے ہندوستاں کی شان کہن کو ہیں لوٹتے
جے چند آرزوئے چمن کو ہیں لوٹتے کچھ میر جعفراب بھی وطن کو ہیں لوٹتے
بجتا ہے آج لوٹ کا ڈنکا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

زرداریٔ دولتِ ملک واری کو لوٹتے سازِ وطن کی زمزمہ سازی کو لوٹتے
مفتی شہر ہمت غازی کو لوٹتے مسجد میں ہیں امام نمازی کو لوٹتے
جاگا ہوا ہے لوٹ کا فتنہ جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

پانی ہوا تو روپ کے دریں ہیں لوٹتے دھرمی ہوا جو من تو برہمن ہیں لوٹتے
کی کیا جائے دھرم کے آسن پہ لوٹتے پنڈے بھی ہاتری کو ہرن ہیں لوٹتے
بجتا ہے آج لوٹ کا دریا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

چکلے دکان حسن لگا کر ہیں لوٹتے تہذیب کا چراغ بجھا کر ہیں لوٹتے
عورت کی زندہ لاش سجا کر ہیں لوٹتے انسانیت کو زہر پلا کر ہیں لوٹتے
رقصِ آخریں ہے لوٹ کی ادا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

نکہت فروش لیتی آنچل ہیں لوٹتے کمخواب لوٹتے کہیں مخمل ہیں لوٹتے
دلکش گھنیری زلف کے بادل ہیں لوٹتے چشم فسوں طراز کے کاجل ہیں لوٹتے
ہے بے نقاب لوٹ کا جلوہ جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

معمار قندر گردش ایام ہو گیا نقاد اسیر سلسلۂ دوام ہو گیا
شاعر شمال رند تہی جام ہو گیا ضائع چند سکوں پہ نیلام ہو گیا
سستا ہے آج لوٹ کا سودا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

رشوت کی اشرفیوں سے تولتیں رنگیں بوجھا دیوی سادھو سے لوٹتیں
زرسازیاں فریب حیلوں سے لوٹتیں چاندی کی کوٹھیاں اسٹیشن سے لوٹتیں
ہے آدمی کے واسطے دھوکا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

عمامہ کوئی باندھ کے سر پر ہے لوٹتا قرآں بغل کوئی سر منبر ہے لوٹتا
پوجا کا کوئی بن کے کل ترہے لوٹتا چندن لگا کے کوئی جبیں پر ہے لوٹتا
سر پہ بندھا ہے لوٹ کے ہر جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

کچھ نافذ اہل من مانی چال میں لوٹتے فارون و شداد تمام عمل میں لوٹتے
بے علم آج خفتہ عامل بنے لوٹتے کچھ ہل نگوٹھ چھاپ کونسل میں لوٹتے
لہرا رہا ہے لوٹ کا جھنڈا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

چہرے پہ ایک خاص طرح دت لیے ہوئے تاریک دل میں لوٹ کی مستی لیے ہوئے
تہذیب کی سزا کا ایک لیے ہوئے سیٹھوں کو دیکھا تو ندر کی تربیت لیے ہوئے
پھوٹے گا کب یہ لوٹ کا بھانڈا جگہ جگہ
چلتا ہے آج لوٹ کا چرخہ جگہ جگہ

یہاں آیا تھا اور سر پر اٹھائے واپس جاؤں گا۔ یہ کشمیر کی جاں پرور آب و ہوا کا قصور نہیں ہے، میرے جسم ناساز کا قصور ہے۔

ہرچہ بہت از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

.....

.....

۱۹ کو جب گلمرگ سے سری نگر آ رہا تھا تو راہ میں ڈاک کھولی اور آپ کا نامۂ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی۔ سرتاپا شکر گذار اور رہین منت ہوئی۔

قلیلٌ منك يكفيني ولا كن
قليلك لا يقال له قليل

.....

.....

.....

.....

.....

.....

یہ خط آپ کے نامۂ منظوم کی رسید ہے۔ مجھے جو لکھنا ہے اس کے لئے مہلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ ایک دو دن کے اندر کسی نہ کسی طرح وقت نکالوں گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

(۴)

نسیم باغ۔ سری نگر

۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم۔ وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے، ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ دہنی طرف جھیل کی وسعت، شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چنار کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چاء پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

لیکن میرے حصے میں ناخوشی و علالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اٹھائے آیا تھا اسی طرح اٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی سراسر ایک بوجھ ہی ہے خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

ما زندہ از ایم کہ آرام نگیرتیم

گلمرگ سے سری نگر آ گیا ہوں اور راک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجملی خاں صاحب نے آپ کا مکتوب منظوم حوالے کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیام محبت کو دل و دماغ نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے، جو غالب نے کہا تھا:

باچوں تو ئی معاملۂ برخویش منت است
از شکوۂ تو شکر گذار تو نیستم ما

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیام دلنواز نہیں بھیجا ہے، لطف و عنایت کا ایک دفتر کھول دیا ہے۔

قلیل منك يكفيني ولا كن
قليلك لا يقال له قليل

ان سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجئے رہائی کے بعد جو کہانی سنائی تھی وہ ابھی تک نوک قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

.....

.....

از ما بپرس دردِ دل ما کہ یک زماں
خود را بجیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

صدیق مکرم۔ .....

.....

.....

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بعد ازیں ما و تو و ذکر تو و دور قمر و جانی

گرفتار ہونے سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا وہ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا تھا۔ بمبئی پہنچکر اجمل خاں صاحب کے حوالے کروں گا کہ نقل رکھ کر ڈاک میں ڈال دیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح گم ہو گیا کہ خط بھیجنے کا خیال نہ رہا۔ ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے تو راہ میں بعض کاغذات دیکھنے کے لئے اٹاچی کیس کھولنا پڑا اور یکایک وہ خط سامنے آ گیا۔ اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے تھے اور ممکن نہ تھا کہ خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر کاغذات کے ایک فائل میں رکھ دیا۔

دس بجے ہم احمد نگر پہنچ گئے اور بیس منٹ کے بعد قلعہ کے اندر مقید تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس میں قلعہ کی چار دیواری کے اندر رہتی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی۔

کیف الجمال اذا سناہ ودد لھا
قلل الجمال وبیھن خیوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ر اگست کو حسب معمول صبح تین بجے اٹھا، چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا۔ میں نے چائے دم دی، فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف گوشوں میں بھٹکنے لگے تھے، اچانک وہ خط جو ۹ر اگست کو (یا ۸ر) لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا، سامنے آ گیا۔ بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ کی طرف پھیر دوں۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلمبند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مختلف مکتوبات قلمبند ہوتے رہے۔ آگے بعض دوسرے احباب

.....

.....

.....۳ر اگست

.....

..... حوالے کروں گا

..... وہ نقل

رکھ کر آپ کو بھیج دیں گے .....

..... اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کر لیا تھا لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا کہ.....

..... احمد نگر لے جا رہے تھے تو بعض کاغذات رکھنے کے لئے راہ میں اٹاچی کیس کھولا اور یکایک وہ..

..... ممکن نہ تھا کہ کوئی خط.....

مسودات کے صندوق میں بند کر دیا اور فائل کو صندوق بند کر دیا۔ دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے..... اور اس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

..... میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے اچانک وہ خط جو ۳ر اگست کو ..... یاد آ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے، چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلمبند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلمبند ہوتے رہے۔

اعزا و غیرا کی یاد بھی سامنے آتی رہی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ بزم سخن آراستہ ہوتی رہی، قید خانے کی باہر کی دنیا سے علائق یک قلم منقطع ہو چکے تھے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریوں نے کچھ ایسا مجبور کر دیا تھا کہ قلم اٹھا لیتا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام نامہ و سے لیا ہے۔ میرے حصے میں عنقا آیا:

ایں رسم و راہ الخ

۱۔ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی سنہ ۱۹۴۳ء کے اواخر تک ان کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد رک گیا۔ کیونکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثے کے بعد طبیعت و ماندۂ حال بھی رک گئی تھی اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔

اس زمانے میں بعض مصنفات کی تحریر کا کام بدستور اپنے مقررہ اوقات میں ہوتا رہا اور جو معمولات تلخہ احمد نگر کی زندگی میں قرار پا گئے تھے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تاہم یہ حقیقت حال چھپائی نہیں جا سکتا کہ یہ جو کچھ بھی قرار و سکون کی حالت تھی جسم و صورت کی تھی، قلب روح کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ملنے سے بچا لیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا۔

دلے دیوانۂ دارم کہ در صحرا است پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ واقعات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں تاہم سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری قائم نہ رہی جو اوائل میں سانحہ دیتی رہی تھی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے بالکل جواب دے دیا تھا۔ اب بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکتا اور کسی بات کی طرف طبیعت متوجہ نہ ہو سکی ——————

تین برس ہوں یا تین دن، تین گھنٹے ہوں یا تین لمحے لیکن جب گذرنے پر آتے ہیں تو گذر ہی جاتے ہیں۔

زیں ہوسہا بگذر یا نہ گذر، می گذرد

..... سامنے آئی

..... گاہ گاہ طبع واماندۂ حال دراز نفسی کرتی رہی

..... دنیا سے سارشتے کٹ چکے تھے

اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ.....

تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل میں سمند پر چھا گئیں کہ قلم اٹھا لیا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی نامہ و سے لیا، کبھی بال کبوتر سے میرے حصے میں عنقا آیا .....

۱۔ اگست سنہ ۱۹۴۲ء سے مئی سنہ ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رک گیا.....

..... اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔

اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں۔ .....

..... تاہم

کرار و سکون کی جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی قلب باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ملنے سے بچا لیا تھا۔ مگر دل نہیں بچا سکا تھا۔

.....

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات .....

..... ۵۵

تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل .....

نے آخری جواب دے دیا۔ .....

..... اور کسی تحریر و تسوید کے لئے طبیعت مستعد نہ ہوئی ——————

.....

.....

رہائی کے بعد جب ۲۱ جون کو کلکتے سے بمبئی آیا اور اسی دوست کے یہاں اسی کمرے میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے ٹھہرا تھا تو یقین کیجئے، ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کا سارا ماجرا کل کی بات تھی اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ اب دیکھ رہا ہوں یہ خواب ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے

جس دن ہاکوڑا میں رہا ہوا تھا یہ تمام مکتوبات لکھے تھے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے تھے۔ خیال تھا کہ انہیں نقل کے لیے دیدوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن شملے میں بعض احباب کی نظر سے بعض مکاتیب گذرے تو وہ مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر طباعت کے لئے دیدوں چنانچہ ایک خوشنویس مراد آباد میں ان کی کتابت کر رہے ہیں، اور تمام مسودات ان ہی کے پاس ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب وہ ایک رسالے کی صورت میں شایع ہو جائیں گے اور میں نقلی مکاتیب کی جگہ مطبوعہ مکاتیب کا نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اس سلسلے کا پہلا مکتوب شملے میں ایڈیٹر صاحب مدینہ نے اجمل خاں صاحب سے لے لیا ہے جو اخبارات میں شایع ہو چکا ہے۔

مکتوبات کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ غیر سیاسی اور سیاسی۔ ابھی پہلے حصہ کی کتابت ہو رہی ہے، اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام ہیں۔

پرسوں ۷ کو یہاں سے دہلی جا رہا ہوں۔ چونکہ امرکن دوستوں کی عنایت سے ہوائی جہاز کا انتظام ہو گیا ہے، اس لئے ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا اور پھر عید وہاں کر کے بمبئی کا قصد کروں گا۔ وہاں سے ۲۱ تک وہیں قیام رہے گا۔

ابوالکلام

بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔

رہائی کے بعد جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لئے ۲۱ جون کو کلکتے سے بمبئی آیا۔ اور اسی مکان اور اسی کمرے میں ٹھہرا تو یقین کیجئے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ۹ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے اور پورا زمانہ ایک صبح و شام سے زیادہ نہ تھا.....

..... یا جو کچھ گذر رہا ہے یہ خواب ہے۔

.....

۵ جون کو جب ہاکوڑا میں رہا ہوا تو تمام مکتوبات نکالے اور ..... جمع کر دیئے ..... انہیں حسب معمول نقل کے لئے ..... لیکن جب اجمل خاں صاحب ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دیدینا چاہیئے۔ چنانچہ ایک خوشنویس کو شملے میں بلا لیا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دیدیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو نقلی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔ شملے میں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے انہوں نے اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوبات کی نقل لے لی تھی وہ اخبارات میں شایع ہو گیا ہے۔

..... اور یہ سیاسی مجموعہ غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے، اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے۔ چونکہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے از راہ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے، اس لئے موٹر کار کی تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤں گا اور ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ عید کی نماز پڑھ کر بمبئی روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۵ تک بمبئی میں قیام رہے گا

ابوالکلام

پہلی پشکن اور اس کی شاعری قسط

پروفیسر کراشینن نیکوف

آج کل ہندستان میں بہت سے لوگ، متعدد عظیم روسی فنکاروں کے نام اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ناول، کہانیاں اور ڈرامے دلچسپی اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور روسی نثر کے شاہکاروں کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ ہندستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو، جس نے طالسطائی، دستووسکی، گورکی اور چیخوف کے شاندار نام نہ سنے ہوں، کیونکہ یہ نام ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

لیکن جہاں تک روسی عوام کا تعلق ہے، صورت حال بلکل برعکس ہے۔ روسی شاعروں کے بارے میں (جن کی تعداد کم نہیں، اور جو تمام روس میں مشہور ہیں) یہاں کے لوگ شاید کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ شاعر کس قسم کے انسان تھے؟ کس ماحول میں رہتے تھے؟ ان کی شاعری کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ ان کے شاہکار کیا ہیں ـــــ ہندستان میں بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ اور ہمیں اس کا بڑا افسوس ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے۔ کسی زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ پھر ہر ایک مترجم اس کام کا اہل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، ایک عظیم روسی شاعر کی کسی نظم کا ہندستانی میں ترجمہ کرنے کے لیے ضروری ہے ـــــ کہ خود مترجم بھی ایک عظیم شاعر ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں پشکن، لیرمونتوف، نیکراسوف، مایاکوفسکی جیسے نام لوگوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

یوں تو گذشتہ دو سو سالوں میں روس میں بہت سے بڑے شاعر گذرے ہیں جن کے نام ادب کے آسمان میں ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں، اور جو روسی عوام کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہیں گے، لیکن میں اہم روسی شاعر پشکن کے بارے میں چند باتیں بیان کروں گا، جن کو ہم روسی عوام بے حد احترام اور پیار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جن پر ہم کو فخر ہے۔

الیکزنڈر پشکن کو روسی ادب اور روسی شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یوں سمجھیے کہ سارے روسی شاعر، روسی عوام کے لیے ایک بیش قیمت انگوٹھی کی حیثیت رکھتے ہیں، تو پشکن اس انگوٹھی کا ایک نگینا ہے۔ پشکن سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ایسا شاعر روس میں پیدا نہیں ہو سکا۔ جس کا پشکن سے مقابلا کیا جا سکے۔ پشکن کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے، اور وہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں یعنی شیکسپیئر، گوئٹے اور بائرن کے ہم پایا ہیں۔ اچھا تو پشکن کہاں اور کس زمانے میں رہتے تھے، کس قسم کے انسان تھے، کس ماحول میں ان کی زندگی گذری؟ ان کے ادبی شاہکار کیا ہیں؟ اور ان کی شہرت کا راز کیا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے چند سوالات کا جواب دینے کی میں کوشش کروں گا۔ عظیم روسی شاعر پشکن ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۳۷ سال کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں اپنی بیوی کی عزت کی خاطر ایک ڈیول لڑتے ہوئے مارے گئے۔

پشکن کا تعلق روسی امرا کے قدیم خاندان سے تھا۔ ان کے آبا اجداد نے روسی سلطنت کی تاریخ میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔ پشکن کی والدہ کے باپ، نوم کے لحاظ سے ایک حبشی تھے۔ اس واقعے کی تہہ میں یہ ہے کہ آج سے ۲۵۰ سال پہلے حبش کا ملک ترکی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ایک مرتبہ حبشیوں نے ترکی جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے بغاوت کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ چند دنوں میں حبشیوں نے شکست کھائی، بہت سے حبشی قیدی بنا لیے گئے۔ ان قیدیوں میں ایک بچا بھی تھا، جس کا نام کتنی بان تھا۔ ترکوں نے اس حبشی بچے کو، روسی زار پیٹر اول کے پاس تحفے کے طور پر بھیج دیا۔ آگے چل کر یہ لڑکا روسی فوج کا مشہور جنرل

اور اس نے روسی جھنڈوں کو شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

پشکن کے بچپن اور جوانی کا زمانا شدید لڑائیوں انقلابی تبدیلیوں اور کسانوں کی بغاوتوں کا زمانا تھا۔ اور واقعی اس زمانے میں دنیا میں عظیم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس میں بورژوا انقلاب ہوا جس نے سارے یورپ میں غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد نپولین نے.... تمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لے کر تمام دنیا کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی، اور ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔ ۱۸۱۵ء میں اٹلی پر نپولین کا قبضہ ہو گیا۔ اٹلی کو نجات دلانے کے لیے مشہور روسی سپہ سالار سووروف اٹلی بھیجے گئے، جو شکست اور خوف سے نا آشنا تھے۔ روس کی فوجوں نے اٹلی پہنچ کر فرانسیسی فوجوں کو شکست دی، اور فخر سے اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے روس واپس آئے تھے۔ پشکن کی پیدائش سے کچھ پہلے، امریکا برطانوی ظلم سے آزاد ہوا تھا۔ یونان اور دوسرے ممالک اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ یہاں ہندستان میں پشکن کے پیدائش کے سال انگریزوں اور مقامی غداروں کے ہاتھوں ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی تھی اور سارا ملک برطانیا کا غلام بن گیا تھا۔

اگرچہ روسی فوجیں یورپ کی جنگوں میں بہادری کے کارنامے دکھا رہی تھیں، اور روس کے نتیجہ یاب جھنڈے سارے سمندروں پر فخر سے لہرا رہے تھے، کیونکہ روسی سپاہی قدیم زمانے سے بہادر رہے ہیں، لیکن خود روس کے اندرونی حالات نہایت خراب تھے۔ روسی عوام کی زندگی تکلیفوں اور صعوبتوں سے بھرپور تھی۔ روس کے کسان غلام تھے، جن کو روسی زمیندار کتوں یا گھوڑوں کی طرح مارتے، بیچتے اور جوا میں ہار جاتے تھے۔ معمولی عوام کی زندگی جانوروں کی سی زندگی تھی۔ دوسری طرف روس کے زمیندار، درباری لوگ، افسر اور خدمتگار تھے، جنہوں نے عوام کے خون اور ان کی لاشوں سے اپنے لیے زمین پر بہشت آراستا کی تھی۔ ۱۸۱۲ء میں جبکہ پشکن ۱۳ سال کا بچا تھا، نپولین روس میں آیا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس جنگ کا کیا نتیجا نکلا۔ روس کے غلام کسانوں نے اپنے وطن کی حفاظت پر کمر باندھی۔ نپولین کو شدید شکست اٹھانی پڑی۔ اور وہ اپنا سا منہ لے کر ناپوسی سے فرانس واپس چلا آیا اور روسی فوجیں پیرس تک پہنچ گئیں۔

پشکن کے دور میں، روسی امرا خود کو عوام سے بہت دور رکھتے، اور اگر روسی بولتے بھی تھے تو فرانسیسی لب و لہجے کے ساتھ۔ تعلیم کی خاطر وہ اپنے بچوں کو یورپ کے دوسرے ممالک میں بھیجتے تھے، جو لوگ باہر نہیں بھیج سکتے تھے، وہ فرانسیسی یا انگریزی ماسٹروں کو مقرر کرتے تھے، جو زیادا تر تنگ لوگ ہوا کرتے تھے۔ روس کے یہ امرا دیکھنے میں تو اچھا لوگ معلوم ہوتے تھے، اچھا کپڑا پہنتے تھے، اچھا کھانا کھاتے تھے، لیکن حقیقت میں وہ غیر مہذب، جاہل، ظالم اور جاہل قسم کے لوگ تھے، جو صرف کوڑے اور زور کی مدد سے روسی عوام پر حکومت کر رہے تھے۔

روسی امرا کے دوسرے بچوں کی طرح اسینکر پشکن بھی بچپن میں روسی زبان سے زیادا فرانسیسی زبان سے واقف تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ابتدائی نظمیں فرانسیسی زبان میں ہیں۔ ان کی تربیت جس ڈھنگ سے ہو رہی تھی، اس سے اندازا ہوتا تھا کہ آگے چل کر اپنے دوسرے ہم عمروں کی طرح وہ بھی ایک معمولی جاگیردار بنیں گے، یا زار کے دربار کے ایک معمولی فوج کے کوئی افسر، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کی قسمت میں روس کا عظیم ترین شاعر، محب وطن اور جدید روسی ادب کا بانی بننا لکھا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس بچے کی دیکھ بھال ایک آیا کے ذمہ تھی، جو پشکن کے والدین کی لونڈی تھی لیکن جس کا نام OZINA RODIONOVNA تھا۔ یہ بوڑی آیا روسی عوام کی کہانیاں سنانے میں بڑی ماہر تھی۔ راتوں کو وہ موم بتی کی مدھم روشنی میں، گھنگھریالے بال والے اس بچے کو، روس کی قدیم لوک کہانیاں سنایا کرتی۔ ایسی کہانیاں جن میں روسی عوام کی امنگیں تھیں، قدیم روسی سورما تھے، جو روس کی سرحدوں پر پہرا دیا کرتے، روسی سرزمین کی حفاظت کرتے تھے۔ آیا کی کہانیوں کے دوسرے ہیرو جانور

بھی تھے' اور ایک خاص کردار بیوقوف ایوان N BAN کا تھا' جو ایک کسان کے لڑکے کا تھا۔ یہ لڑکا بظاہر بیوقوف تھا' لیکن حقیقت میں وہ ایسا نہ تھا۔ اور اپنے عوام کے دشمنوں کو کامیابی کے ساتھ الو بنایا کرتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ آیا یہ کہانیاں خالص روسی زبان میں سنایا کرتی یعنی اس زبان میں جو عام روسی لوگ ـــــ کسان' لکڑہارے' چوکیدار سپاہی اور گھریلو ملازم وغیرہ بولتے تھے۔ آیا کی یہ بے شمار کہانیاں' پشکن کے لیے گویا روسی زبان کا ایک پرائمری اسکول تھیں۔ اسی زمانے میں اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ روسی زبان کس قدر خوبصورت' کیسی لچک دار اور کتنی پر زور زبان ہے۔ یہی وہ دن تھے' جبکہ ان کے دل میں روسی زبان سے گہری محبت اور غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اپنی آیا کی ان کہانیوں کو' بڑے ہو کر وہ نہیں بھلا سکے' ان ہی کہانیوں کی بنیاد پر' انہوں نے چند منظوم کہانیاں لکھیں' جیسے "سونے کا مرغ" "ایک سلطان کی کہانی" "ایک ملاح اور اس کا ملازم" وغیرہ جو اب تک روس کی ہر دلعزیز کہانیاں ہیں۔

پشکن دس گیارہ سال کے تھے' جب انہیں تعلیم کے لیے روسی امرا کے بچوں کے ایک اسکول میں شریک کیا گیا۔ یہ اسکول روس کے پائے تخت پیٹرزبرگ کے قریب تھا اور ـــــ TSORS KOGELSI ELSKYLITSEY کہلاتا تھا۔ پانچ سال تعلیم پانے کے بعد' جب امتحان دینے کا موقع آیا' تو اس وقت ایک واقعہ پیش آیا' جو قابل ذکر ہے۔ کیا عاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم کے لیے ضروری تھا کہ ایک نظم لکھے اور اس کو پڑھ کر سنائے۔ طالب علم ایک کے بعد ایک' ڈرتے ڈرتے اپنی اپنی نظمیں سنا رہے تھے' چونکہ امتحان لینے والوں میں ایک بوڑا آدمی' روس کا عظیم شاعر "دیرژاوین" بھی بیٹھا ہوا تھا۔ دیرژاوین کا نام سارے روس میں مشہور تھا۔ ان کے آگے اپنی نظم پڑھنا بڑی عزت اور ہمت کی بات تھی۔ ان دنوں دیرژاوین بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی بینائی خراب ہو چکی تھی۔ اور وہ بیمار بھی تھے۔ وہ یوں ہی کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھے دیکھ رہے تھے' اور سن رہے تھے' لیکن جب ایک نوجوان لڑکے نے بلند اور دلکش آواز میں اپنی نظم سنائی تو دیرژاوین چونک اٹھے۔ لڑکے کی آواز میں غیر معمولی کشش تھی' اور الفاظ میں گہرائی' وہ اس نظم سے بے حد متاثر ہوئے' بوڑھے شاعر کی آنکھوں میں جس کے لیے اب دنیا میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی' خوشی کے آنسو بھر آئے' وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھے' نوجوان لڑکے کو گلے سے لگانے کے لیے۔ یہ لڑکا پشکن تھا۔ دیرژاوین اور سارے حاضرین سمجھ گئے کہ ایک نیا شاعر پیدا ہوا ہے' اور روس کے ادبی افق پر ایک روشن ستارا ابھر رہا ہے ـــــ خود پشکن' بعد میں اس واقعے کو یاد کر کے لکھتے ہیں۔

بوڑھے شاعر دیرژاوین نے مجھکو دیکھا' میری تعریف کی اور مجھے دعا دی۔ اسی نظم سے پشکن کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس واقعے کے چند سال بعد ان کی شہرت دور دور پھیل گئی' اور وہ روس کے عظیم ترین شاعر مان لیے گئے' اور انہوں نے نئے روسی ادب' اور نئی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ پشکن کے ادبی کارناموں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا اگر میں اس زمانے کے روسی ادب کی حالت کا مختصر طور پر ذکر کروں۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے' روس کے دربار میں جلتے' روسی امرا' اور اونچے طبقے' روسی ادب اور روسی زبان سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب' فرانس کی شاعری' فرانس کا فلسفہ' فرانس کی سائنس' غرض فرانس کی ہر چیز ان کے لیے سونے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روسی ادب جیسا کہ چاہیے ترقی نہیں کر سکا تھا پشکن سے پہلے' اور خدا ان کے عہد میں دو چار شاعر ایسے گذرے جنہوں نے روسی ادب اور روسی شاعری کی ترقی کے لیے بہت کچھ کوشش کی تھی۔ ان میں عظیم روسی عالم' سماجی کارکن اور شاعر لومونوسوف' شاعر دیرژاوین' عظیم روسی شاعر کریلوف' PUSHKIN POOSHKIN پشکن قابل ذکر ہیں۔

سوویٹ ادب کا یہ عبوری دور تھا۔ اور روسی شاعر زیادہ تر SENTENEN TALISM اور DESSI LISM کے شکار تھے۔ حقیقت پسندی کا بس آغاز ہو رہا تھا۔ روسی ادب اور شاعری میں حقیقت پسندی کے بس ابتدائی اور اچھے نمونے پیدا ہو چکے تھے۔ کچے اچھے ناول، اچھے مضامین، طویل نظمیں لکھی جا چکی تھیں، لیکن اس کے باوجود روسی زبان ابھی ترقی کی شاہراہ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس کو ایک ایسی زبردست شخصیت کی ضرورت تھی، جو طاقت اور قوت کے ساتھ نئے رستے پر اس کی رہنمائی کرے۔ یہ فرض پشکن نے انجام دیا۔ انہوں نے انگلو روسی شاعروں کے تجربے کو اپنایا اور حقیقت پسندی کا اظہار کیا۔ انہوں نے قدیم روسی الفاظ، غیر یورپی الفاظ، شاعری کے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر، خالص عوامی روسی زبان میں لکھنا شروع کیا۔

پشکن کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ، ان کی طویل نظم "رسلان اور لیودمیلا" RUSLAN AND LUDMILA ہے۔ یہ نظم انہوں نے ۲۰ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ایک ماسٹر، مشہور روسی شاعر ژوکوفسکی کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ جو مغربی زبانوں سے ترجمے کیا کرتے تھے۔ ژوکوفسکی کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ مغربی ملکوں سے، وہاں کے شیطانوں، دیووں اور پریوں کو روسی سرزمین میں درآمد کرنے کے ذمے دار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ مغرب کے ادبی تصورات سے بہت متاثر تھے، اور ان کو نمونے کی حیثیت سے اپنے آگے رکھتے تھے۔ ژوکوفسکی کی طویل نظموں کی طرح پشکن کی نظم RUSLAN AND LUDMILA کے اہم کردار بھی قدیم روسی سورما، ایک یونانی CBERNONORI قدیم روسی سلطان VOLUDININ جادوگر، اور آب حیات وغیرہ تھے، لیکن اس طویل نظم کی زبان بالکل مختلف تھی۔ پشکن نے روسی شاعری کی تاریخ میں پہلی دفعہ خالص، صحیح، بے حد خوبصورت، لیکن روزمرہ عوامی روسی زبان استعمال کی ہے۔ یہ وہی زبان تھی جو وہ اپنی بوڑی آیا کے منہ سے سنتے تھے۔ یہ طویل نظم اس قدر دلکش، اس کا پلاٹ اس قدر دلچسپ، اور زبان اتنی پیاری اور رواں تھی کہ ہر پڑھنے والا اس سے بے حد متاثر تھا اور خود ژوکوفسکی نے جو اپنے روسی شاعری کے تاجدار سمجھے جاتے تھے، پشکن کو اپنی تصویر، تحفے کے طور پر بھیجی، جس پر لکھا گیا تھا کہ فتح یاب شاگرد کو شکست خوردہ استاد کی طرف سے۔

——— اس طویل نظم میں رومانیت کے نشان صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں، اور حقیقت پسندی کے بھی، لیکن پشکن کی رومانیت، وہ رجعت پسند رومانیت نہیں تھی۔ جس نے نپولین اپنے پڑھنے والوں کو پیچھے کی طرف بلا رہے تھے۔ وہ ترقی پسند رومانیت کی طرف جا رہے تھے۔ جوانی کے زمانے میں پشکن روس کے بہت سے ترقی پسند لوگوں سے ——— گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اس زمانے میں سارا روس، ابلتے ہوئے پانی کا برتن معلوم ہوتا تھا۔ سماج کی بنیاد غلامی تھی۔ ملک میں ووٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ روس کی مثال ایک بوجھل اور طاقتور پہلوان کی تھی، جس کے ہاتھ پیر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ خود روسی امرا میں بہت سے ایسے لوگ نمودار ہونے لگے تھے، جو اس غلامانہ ذہنیت کو روس کے لیے شرم کی بات سمجھتے تھے، اور اس کو بیت و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ پشکن کی بھی یہی رائے تھی، چنانچہ انہوں نے ایسی بے شمار نظمیں لکھیں، جن میں آزادی کے گیت گائے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۰ء میں الیگزنڈر اول نے پشکن کی باغیانہ اور آزاد پسند شاعری سے ناراض ہو کر، کاکیشیا میں جلا وطن کر دیا۔ زار نے کہا تھا کہ "سارا روس پشکن کی باغیانہ شاعری سے لبریز ہو چکا ہے۔ نوجوان اس کو سختی سے پڑھتے ہیں۔ اس کو تو کاکیشیا میں نہیں سائبیریا میں بھیجنا چاہیے۔" اور پشکن کو ۱۸۲۴ء تک جلا وطنی کے عالم میں رہنا پڑا۔

لیکن زار کی امیدوں کے خلاف، جلا وطنی کا زمانہ پشکن اور اس کی شاعری کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس وقت روسی فوجیں، قاف کی آزادی پسند قوموں کے خلاف شدید لڑائیوں میں مصروف تھیں۔ زار، قاف کی قوموں کو

بھی اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ روسی فوج میں بہت سے جلا وطن انقلابی بھی تھے۔ قاف کے پہاڑوں کی خوبصورتی سے، پہاڑی عوام کی بہادری اور حب وطنی سے پشکن بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے بہت سی مختصر اور طویل نظمیں لکھیں۔ جیسے "قاف کا ایک روسی قیدی" "بھائی دا قو" اور "باغچی سرائے کا فوارا" وغیرہ۔ ان نظموں میں نئے قسم کے کردار ہیں۔ پہاڑ لوگ ہیں جو اپنے وطن کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ان کی خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ روسی افسر اور سپاہی ہیں۔ اور خونریز لڑائیوں کے مناظر۔ ان نظموں میں زندگی تھی۔ بہادر لوگوں کے لیے احترام اور بزدلوں کے لیے حقارت تھی ـــــ ان میں حب وطنی تھی، اور ہر قسم کے ظلم سے نفرت ـــــ یہ نئی قسم کی شاعری تھی، جس میں آہستہ آہستہ حقیقت نگاری، رومانیت کی جگہ لے رہی تھی۔

پشکن کو قاف سے شہر اوڈیسا کو بھیجا گیا۔ اس کے بعد انہیں پولیس کی نگرانی میں ان کے والدین کے ایک گاؤں MIKHAILOWSKOYE روانا کر دیا گیا۔ اس گاؤں میں پشکن دو سال یعنی ۱۸۲۵ء تک مقیم رہے، اس زمانے میں انہوں نے ہر قسم کی بے شمار نظمیں لکھیں، اور دو طویل بھی۔ ایک کا عنوان ہے "جپسی" ہے اور دوسرے کا BORIS GODUNOV، جو ان کی لکھی ہوئی پہلی ٹریجیڈی تھی۔ طویل نظم "جپسی" کا پلاٹ یہ ہے۔ ایک لکھا پڑھا نوجوان "الیکو" بڑے شہروں کے گندا ماحول، لالچ، بے ایمانی اور ظالم لوگوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے جپسیوں کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ اس کی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی زیمفیرا سے شادی بھی ہو گئی۔ جپسیوں کی زندگی کس ڈھنگ سے چلتی ہے، سب جانتے ہیں۔ ان کا کوئی گھر ہے اور نہ کوئی وطن۔ جہاں چاہتے ہیں چل کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی قانون کو نہیں مانتے۔ الیکو کو امید تھی کہ وہ بھی جپسیوں کے درمیان جپسی بن کر رہے گا۔ شہروں کو بھول جائے گا، اور اسی زندگی میں مگن رہے گا، لیکن جپسیوں میں رہ کر بھی وہ اسی طرح خود غرض، خود پسند بڑے شہر کا آدمی بنا رہا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی زیمفیرا اور ایک نوجوان جپسی سے محبت ہو گئی ہے، اور اس نے ان دونوں عاشقوں کو پکڑا۔ زیمفیرا نے مرتے وقت اس سے کہا کہ مجھے دوسرے آدمی سے محبت ہو گئی ہے۔ بہتر ہے کہ میں مر جاؤں، لیکن اپنی نئی محبت سے انکار کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ اس نظم میں پشکن نے بتایا ہے کہ کس طرح بڑے شہر انسانی کردار کی سادگی کو برباد کر دیتے ہیں اور یہ کہ محبت موت سے زیادہ طاقتور ہے۔

پشکن کی ٹریجڈی BOZIS GEDUNOV بڑی خاص چیز ہے۔ بورس گودونوف ۱۷ویں صدی کا ایک روسی زار تھا، جس نے تاج کو حاصل کرنے کی غرض سے شاہزادا دا میٹری کو جو چار یا پانچ سال کا بچا تھا مار ڈالا۔ وہ روس کا زار تو بن گیا، لیکن اس کے بعد روس میں سیتوں کا سلسلا شروع ہو گیا ـــــ تمام ملک میں قحط پھیل گیا۔ اس کے بعد پولینڈ کی فوجوں نے حملا کر دیا ـــــ عوام اس ٹریجڈی کے سب سے اہم ہیرو ہیں۔ عوام کو معلوم ہو گیا کہ بورس گودونوف نے شاہزادے کو قتل کیا ہے۔ قاتل زار سے سب کو نفرت ہو گئی، امرا بھی اس کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ چونکہ اس کو عوام کی کوئی حمایت حاصل نہ تھی اس لیے اس کے خاندان کا راج اس سے شروع ہوا، اور اسی پر ختم ہو گیا۔ پانچال کی حکومت کے بعد جب وہ مرا تو امرا نے اس کے بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پولینڈ سے آئے ہوئے ایک جانباز کو اپنا زار مقرر کیا، لیکن عوام اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کون ان کا دوست ہے، اور کون ان کا دشمن۔ جب انہوں نے دیکھا کہ نیا زار بھی پولینڈ سے آئے ہوئے لوگوں کا غلام ہے اور اس کو روسی عوام سے نفرت ہے۔ تو پھر نئے زار کو بھی جلد اپنی زندگی کو خدا حافظ کہنا پڑا۔ اس ڈرامے میں روسی ماحول ہے حقیقی تاریخی واقعات ہیں، زبان صاف اور دلکش ہے رومانیت ROMANCE کا نام و نشان بھی نہیں۔ یہ حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے، اور روسی ادب کا بیش قیمت شاہکار ہے۔ اس ڈرامے میں پشکن نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ روس کی تاریخ میں عوام ایک بڑی طاقت ہے، جس کی مدد اور حمایت کے بغیر کوئی بھی زار آرام سے حکومت نہیں چلا سکتا اور یہ کہ جب عوام کی آواز سنی جائے اور زار اس کے آگے سر جھکا دے تو عوام ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔

نگریا ـــــ دورنئ

عفت موہانی

دالان میں جہیز کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ نانی بی بیٹھی دلہن کے بھاری جوڑوں میں ٹانکے لگا رہی تھیں۔ بڑی آپا کا ایک پاؤں آنگن میں تھا۔ دوسرا دالان میں۔ اماں کمر درد کا پرکھا ہوا کمر دبوا کر کھسک رہا تھا۔ اتنی نڈھال تھیں کہ پلنگ سے نیچے پاؤں اتارنا دوبھر تھا۔ پاندان کا تکیہ بنائے لیٹی محض دل بہلائی کے لیے ہاں ہوں کیے جا رہی تھیں۔ کبھی ان کی ادکھلی چندی آنکھیں نیم کے کمرے پر پڑے سرخ پردے سے ٹکراتیں، اور پان کی جگالی کرتے ہوئے وہ ایک خستگوار آہ بھرتیں۔ بارات ۵ بجے آنے والی تھی۔ دن ڈھلنے والا تھا۔ صحن میں کیلے کے سائے بہت طویل ہونے لگے تھے۔ باورچی خانے سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ زینب آپا اپنے بحر بڑی بڑی دیگوں کے بیچ گھر کر رہ گئیں تھیں۔ اکاد کا سادہ اترنے لگی تھیں، مگر انہیں اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ آٹے میں ہاتھ بھرے ہوئے۔ چھوٹی سی سڑی ہوئی چوٹی کھل چکی تھی۔ ساڑی گھٹنوں سے اونچی کر کے آنچل سے کمر پر کس لی تھیں۔ دھوئیں سے بھر بھر آنے والی آنکھیں ہاتھ کی پشت سے مل ڈالتیں اور دالان کی طرف دیکھے بغیر ہی بچوں کو ایک للکار بتاتیں جو نئی کراکری کی لائین دکھانے پائی جمپ کی مشق کر رہے تھے۔

"اے لکڑ بھگو..... ایک بھی چیز ٹوٹی تو تمہارے گن گن کر اتنے ہی ٹکڑے کروں گی.... ہاں، اماں سجاد... ان مارے بیٹوں کو ـــ"

اماں کو ہانا بات آگیا، جوتی لے کر کھڑاویں پر لپکیں..... کچے نکل بھاگے..... کچے کی پیٹوں پر ایک اور گھساوتی کھاتا گھسنے لگا۔ بناوٹی چنگھاڑوں سے دالان گونج اٹھا۔

"مرے دشمن تمہارے۔ آج کے دن بھی سکون سے دم نہیں لینے دیتے....." اماں کے پاس جدید ترین فحش گالیوں کا ذخیرہ ابھارا کوٹا ہمیشہ ہی تیار رہتا۔

"جھے..... اجڑی کوک میں کہاں کہاں سے..... ہٹ ادھر سور کے بچے....." انہیں یہ ہوش بھی نہ رہتا کہ گالیوں کے جوش میں ابا کو بھی نواز رہی ہیں..... سٹیا گئی ہیں بلکل..... یہاں سن لیں تو ـــ!

"بڑا کلیجا ہے بہن کا پروردگار۔ کتنی پردادار اور سرپیلی نکل نکل بھاگ رہی ہے ہمارے سامنے..... مگر زینب کا دل ہے..... آیہ نانی بی کوئی کام نہیں تو چپ چاپ پان کا جگالی کریں، ان کا صبر لیوں پٹنے مکتی ہیں۔ اب ان خالاؤں اور پھپھیوں کو کون سا بکھیڑا سمجھنا ہے۔ زندگی کی تیز رفتار گاڑی چل چلاؤ پر آخری منزل پر آ کر ہپھر گئی تھی۔ اپنی طرف سے اطمینان تھا۔ بڑے پرسکون اور مطمئن انداز میں دوسروں کی قسمتوں کے فیصلے کیا کرتیں۔ ان سب سے اپنی نفرت ہو گئی تھی..... کلیجا پتھر ہو گیا تھا، ہلکے پتھر بھی بارش کے قطروں سے گھس جاتا ہے۔ جانے کون سی صنفی دھات کا دل سینے میں فٹ کروالائی تھیں پینتیس سال سے ایکساں انداز میں دھک دھک کیے جا رہا تھا سنا تھا کہ دل زور زور سے بھی دھڑکا کرتا ہے، اچھلا کرتا حلق میں آ نکلتا ہے۔ چھوٹی مرواریں، کل کی نوندیاں، بات بات بھر کی، اسکول بھیجیں نہیں کہ عشق بازی سوجی۔ اپنی اپنی داستانیں انہیں سنایا کرتیں۔ اور دل ہی دل میں ہنسی آیا دانت پیسا کرتیں۔ وہ اپنے لیے تو سمجھ گئی تھیں کہ دنیا والوں کے پاس دنیا بنانے والے کے پاس ان کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ بے حس ہو گئی تھیں۔ اب انہیں

کسی کی خوشیوں سے افسوس نہ ہوتا۔ نہ کسی کے غم سے مسرت۔ بہت پہلے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور دبی دبی سرگوشیوں سے سینے کے اندر کوئی ٹیس اٹھتی تھی۔ اب وہ مٹ چکی تھی۔ ان کے اندر اتنی ٹیسیں تھیں کہ ساری زندگی ایک کراہ بن کر رہ گئی تھی۔ خاموش کراہ..... جو کسی کے کانوں سے نہیں ٹکراتی۔ نہ کسی کی ہمدردیاں سمیٹتی۔ آجکل شادیاں کتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ آپا جان گریجویٹ نہیں۔ جانے کہاں سے جوڑ توڑ کر کے اپنا گھر خدا ہی بسا لیا تھا۔ اب وہ چار بچوں کی ماں تھیں۔ گھر میں بہت پہلے دھوم دھڑکا ہوا تھا۔ شہنائیاں گونجی تھیں۔ رات رات بھر ڈھول گمکتی رہتی تھی۔ اور پھر آپا جان کے بدن سا ٹا چھا گیا تھا۔

"اللہ وہ وقت بھی لائے جب میری مجلی امٹھ جائے" نانی اماں جھٹ پٹے وقت اللہ میاں کی طرف ہاتھ اٹھا دیتیں۔ بوڑھے لرزتے ہاتوں میں درازیں اتنی تھیں کہ جو بھی خواہش اوپر سے آتی، دروازوں سے نکل بھاگتی..... نانی بی کو کچھ بھی نہ ملا۔ مجلی آپا کی بھرپور جوانی، ان کے اندر پھنکارتی ہوئی ناگن کی طرح پھن کاڑ کر کھڑی ہو جاتی، اور وہ شرافت اور عزت کا منتر پڑھ کر ناگن کو جذبات کے ٹھنڈے ٹھنڈے پٹارے میں بند کر دیتیں۔ کوئی اپنے موہ سے کہنے کی بات ہے۔ یہ تو دوسروں کے دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہوتی ہے۔ ماں باپ کے سینے پر کوئی ہمالیا پہاڑ بھی دھرے تو چوں نہ کریں۔ دنیا کا نقشا بنانے والے اتنا نہیں جانتے، ہندستان کا سب سے اونچا [illegible] سے وزنی پہاڑ بجا رہا ہمالیا ہی نہیں ہے۔ ہندستان کے ہر گھر میں ہے۔ جس کے قدم دھرتی کے سینے پر نہیں ہوتے۔ یہ ماں باپ کی چھاتی پر کھڑا ہوتا ہے۔ جس کا بوجھ کمر سیدھی کرنے نہیں دیتا۔ ہائے اماں اور ابا بھی جانتے ہوتے یہ بات۔ انہوں نے ایک کہانی سن رکھی تھی۔ کوئی بادشاہ روز محل بنواتا اور روز گر پڑتا۔ اس نے تنگ آ کر کسی سے وجہ پوچھی۔ پتا چلا کہ تنگ جوان شہزادی کنواری بیٹھی ہے۔ جس کی وجہ سے آدھا محل ایسی لگتی کہ ڈھ جاتا۔ شاید اسی لیے ابا جان نے کوئی گھر نہیں بنوایا۔ وہ ابا کی چالاکی پر دنگ رہ جاتیں۔ اگر وہ بنوائیں تو مجلی آپا ایسی فراٹے دار آہ بھریں کہ پورا مکان دھڑام سے ابا کے سر پر آ پڑے۔ تب شاید آنکھیں کھلیں۔ یہ بھی ماں باپ ہیں جو سہرشام ہی سے حلق تک ڈھانس کر خراٹے لینے لگتے ہیں۔ اور انہیں ساری ساری رات نیند نہیں آتی، کیسے عجیب عجیب آفت کے مارے خیالات سر میں گھوڑ دوڑ جاے رکھتے۔ اماں ابا اپنی بے فکری کی نیند میں مدہوش خراٹے بھرتے اور آپا کی نیند حرام ہو جاتیں۔ کبھی ایسے کھسیانے پن میں کوئی کھٹمل کاٹ جاتا، تو وہ روہانسی ہو جاتیں۔ اتنی بے دردی سے کھٹمل کو مسلتیں جیسے..... جیسے انہوں نے اپنے سارے دشمنوں کو کھٹمل کی شکل میں مسل ڈالا ہو۔ ان کا خون پی رہے تھے۔ وہ بڑے فاتحانہ انداز میں بے چارے کی مڑی تڑی لاش دیکھنے لگتیں ــــ

بہت پہلے انہوں نے بھی خواب دیکھے تھے، ننھے منے، ادھ کھلے سیدے سے خواب، جن کی کوئی تعبیر ہی نہیں تھی۔ کبھی سنیما دیکھ آتیں تو گھنٹوں ہیروئنوں کے انداز میں پر وقار طریقے سے چلا کرتیں۔ جوکسی کو محسوس تک نہ ہوتا۔ گھنٹوں دوسرے ماں باپوں پر رکھ رکھ کر بڑی بڑی باتیں بنایا کرتیں۔ کیسے بے شرم لڑکیاں گھر سے نکل بھاگی تھیں۔ کیا کرتیں بے چاریاں، تھوڑا سا پانی ایک جگہ پڑا رہے تو سڑ جاتا ہے۔ کیڑے پڑنے لگتے ہیں۔ وہ تو پانی نہ تھیں، گوشت کا ڈھیر تھیں ــــ! گوشت سڑتا ہے کتنی سڑانڈ پھیلتی ہے! بچے سب کے برے ہوتے ہیں، اماں فرماتیں..... جیسے انہوں نے بچے دیکھے ہوں" حرام کی گٹھری سنبھالے گوگڑیاں کنوؤں، تالابوں میں گر کر پھولا ڈھکتی ہیں....."

نانی بی کچھ سمجھ ہی نہ سکتیں..... ٹکر ٹکر بھولی بچی کی طرح مونہہ تکا کرتیں۔ "لڑکیاں ہر زمانے میں بھاگی ہیں۔" آپا پروفیسرانہ شان میں اپنی قابلیت کا سکا بٹھاتیں۔ کوئی کوڑ مغز انہ سمجھتا..... یا سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ دوسروں پر رکھ رکھ کر سب کو متوجہ کرنا چاہتی تھیں۔ پھر

اماں کبھوں پھٹکنے چلی جاتیں اور نانی بی جانماز پر بیٹھکر یا رحیم یا رحیم کی تسبیح پھیرنے لگتیں۔

پہلا نماز کیسی عبادت کا ہے کی، اگر خدا کے یہاں انصاف ہے، اگر خدا کے یہاں انتقام ہے تو کبھی تمہاری آرزوئیں تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔ آپا کھچا کر بھیانک بھیانک بددعائیں دینے لگتیں، پر کوئی بھی نہ لگتی۔ پھر پر اگھر سدا ہی بھرا پرا رہا۔ نہ کسی کی آئی، کسی کو لگی، نہ کوئی ڈھائی گھڑی کو مرا۔ اور آپا تھک کر رہ گئیں۔ رحیم اور کریم ان کی نہیں سنتا۔ اسے بھی تو اپنے کام ہوں گے۔ ادھر تھوڑے ہی آنکھیں دکھائے بیٹھا ہوگا۔ وہ تو ان جیسا ستا ہکار بنا کرنا زاں ہو گیا اپنی قدرت پر، اے میرے پروردگار، ایک دن یہ میری زندگی گذار کر دیکھ لے، صرف ایک دن، پھر تجھے پتا چلے گا، تیرے مجبور، بے بس اور بے زبان بندے کیسے زندگی کے بجائے موت گذارا کرتے ہیں۔ موت تو پھر بھی نجات ہے، مگر یہ زندگی جو موت سے بدتر ہو جائے۔ بہت دنوں تک سب سے دور اور الگ تھلگ کمرے میں پڑی آنسوؤں کا خزانا لٹاتی رہیں۔ تنہائیوں میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے لیے دعائیں مانگتیں۔ یہ سب کہاں اندھیری کوٹھری کی جالوں بھری چھت میں الجھ کر رہ گئیں، دن بھاگتے رہے، ایک کے پیچھے ایک۔ جیسے بڑے ضروری کام سے جا رہے ہوں۔ دوسری لڑکیاں آندھی پانی کی طرح برسیں اور نکل گئیں، ایک ان کے وجود کا بھاری پتھر تھا، جو جہاں رکھا تھا وہیں دھرا رہا۔

انہیں اماں ابا کی سرگوشیاں سن کر بڑی شرم لگتی پچاس سال تو ہوئے ہوں گے، یہاں بیوی بنے ہوئے کتنی سرگوشیاں کر چکے ہیں، اب کون سی نئی نئی باتیں امڈ پڑی تھیں، گڑیا گڈے کی طرح دونوں کو ایک جگہ بیٹھے دیکھ کر آپا بھاگ کھڑی ہوتیں۔ پہلے تو بہت شرم آتی، مگر جیسے جیسے اماں ابا جوان ہونے لگے، آپا بوڑھی ہوتی گئیں۔ اب انہیں سب باتوں سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ سرگوشیوں سے، طعنوں سے غدر مچانے سے اور اپنے اندھیرے کمرے سے، قیدی بھی اپنی کوٹھری سے پیار کرنے لگتا ہے۔ آپا کو بھی اس کمرے سے بے انتہا پیار تھا۔ جس نے ان کی بے شمار سسکیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ جو کوئی نہیں سن سکا تھا، خدا بھی نہیں۔ یہ دیواریں آپا کی راز دار تھیں۔ تنہائی کی شریک..... بے خواب راتوں.... بے کیف دنوں کی رازداں..... وہ ان دیواروں کے بیچ اپنے لیے پناہ ڈھونڈ لیتیں۔

اور پھر انہیں کسی سے گلا نہ رہا۔ نہ انسانوں سے نہ خدا سے، جو کچھ خدا سے لکھا لائی تھیں۔ وہ تو پورا ہونا ہی تھا۔ اگر بس چلتا تو قسمت کی وہ ساری تیڑی بیڑی لکیریں پیشانی سے کھرچ ڈالتیں، جو اپنے آپ ابھر کر انہیں ڈرا رہی تھیں۔ ایک دن وہ تقدیر پر بھی فاتح ہو گئیں جس دن رفیع نے شادی کر لی۔ اب ان کے پاس آنسو بھی نہ تھے پھر کس کے لیے بہاتیں، بے وجہ، بے کار..... رفیع تو بھاؤ تھا اس نے بھی کچھ نہ سوچا۔ آپا نے تھکی تھکی سانسیں لی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نسیم آنکھوں میں سمانے لگی۔ سب ہی تھکے ہارے مسافر تھے۔ زندگی کی راہ پر آگے بڑھ رہے..... پر جس کے سامنے کوئی راہ نہ تھی۔ اس کی منزل کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ آدھے سنگ میل سے تھکی مسافروں کو چلتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

اماں پر دفعتہً خزاں چھا گئی تھی، بیٹیوں کے سامنے جو بھی کہتیں، بیٹیاں موہ نہ کو لیتیں، مگر ہونے پہلے ہی دن اس سسر کو ایک ہی پلنگ پر تڑپتے تڑپتے دیکھ کر بڑے زور سے تھوک دیا تھا۔ جیسے یہ تھوک اماں اور آپا کے چہروں پر پڑ گیا ہو۔ ابا نے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا۔ اماں ہوکی صورت سے لرزنے لگیں۔ گھر گرہستی بھول کے بیٹھ گئیں۔ آپا نے گھر سنبھال لیا۔ آپا جان کے شوہر بھی یہیں رہتے تھے۔ انہوں نے اس دیوانی کو بھی خشمگیں نگاہوں سے پرلا پرتے دیکھا، اور اپنا جوا اتار کر انہی کے کندھوں پر رکھ دیا۔ البتہ رفیع کی بیوی آتشبازی کی چھچھوندر کی طرح پھٹ گئی۔

"یہ میرا راج کاج ہے۔ میں کسی کو ہات لگانے نہیں دونگی" اور اس نے اپنے جہیز کا سارا سامان سمیٹ لیا۔ گھر الگ ہو گیا' صحن میں دیوار اٹھ گئی۔ چولہے کیا الگ ہو گئے' جیسے کوئی ہار کی گرہ کھل گئی ہو' سب موتی بکھر گئے۔ ہائے یہ کیا ہوا! منجلی آپا دل تھام لیتیں۔ کتنے دنوں تک گھر سنا سنا لاتھا' اب کسی کو ان کی پروا نہ رہی تھی۔ آپا جان ملازم نہیں۔ نسیم بھی نوکر ہو گئی تھی' لے دے کر شمیم رہ گئی تھی۔ اس نے بھی میٹرک کر کے ملازمت کر لی۔ سب ہی اپنے ہاتھ پاؤں کے ہو گئے تھے۔

"ہمارا کون ہے..... میرا کیا سہارا ہے؟" آپا ان سب کو اپنا سمجھ بیٹھی تھیں۔ اب ایک ایک کا موہ دیکھا کرتیں سب کی آنکھیں اماں کے ہات میں جاتیں۔ آخر ان کا بھی تو کوئی حق ہے۔ کبھی کبھار رفیع باہر ہی باہر سے ان کے کمرے میں چلا آتا۔ منجلی آپا ساڑی دیکھیے کیسی ہے؟ بس آپ ہیں لیجیے۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔ آپ کی گنوار کی لٹھ بھابی سنے گی تو..." بھیا! تمہارا آپ پورا نہیں پڑتا۔" آپا پر شرم کے کوڑے برس جاتے۔ "ایک ساڑی میں میرا دیوالا نکل جائے گا؟" رفیع ہنستا۔ ایک دن اڑتی پڑتی ان کے کان میں پڑ گئی۔ نسیم کا رشتہ لگ رہا تھا۔ بات پکی ہو گئی تھی۔ نسیم کی شادی ہو گی۔ انہوں نے سنجیدگی سے سوچا سچ ہے' میری عمر تو بیت گئی ہے۔ مانگ کے پاس سارے بال سفید ہونے لگے ہیں۔ کنپٹیوں کی کھال مرجھا کر لٹکنے لگی ہے۔ اماں کو شرمندگی ہو گی۔ بیسیتیں سال میں آدمی زندگی بیت جاتی ہے' پچھلے ہوئے تنے سے دل کو انہوں نے صبر و صبط کے خوبی کھلونے دکھا بہلا دیا۔ اماں اور آپا سے زیادہ بھرتی سے جہیز تیار کرنے لگیں۔

کوئی بھلا پتہ نہ لے پہن جل رہی ہے۔ نسیم شرم کے مارے مری جا رہی تھی۔ اس نے آپا کو اپنے سے کھتران پڑ بیچ کر ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ یہ آپا اتنا بڑا دل کہاں سے اٹھا لاتی تھیں۔ کسی کے برے سلوک پر ناک بھوں چڑھانا سیکھا ہی نہ تھا۔ "بڑے شرم کی بات ہے' منجلی آپا کے ہوتے" رفیع کے دل میں پھر زور اسا درد تھا۔ "اماں..... آپ اگر چاہیں تو....." "کسی کو آرزو تھی کہ انہیں چھاتی پہ بٹھائے رکھا اپنی تقدیر ہے یہ اب کہاں لڑکے کھو بیٹھے جاؤں گی۔" "جب تک منجلی آپا کی شادی نہیں ہو لیتی۔ میں نسیم کی بھی نہیں ہونے دوں گا....." رفیع بضد تھا۔ "بھیا..... ایک زندگی تباہ ہوئی تو تم دوسری کی بھی تباہ کر دو گے....." شمیم نے کہا..... اسے اپنی فکر ستانے لگی تھی۔ "ہو جائیں زندگیاں تباہ..... مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا....." "وہ پھر بھی نہ مانا" تو نے کیوں کر لی پھر..... بے غیرت..... اب بھاڑ سا منہ لیے بھاڑ کر چلا..... منجلی آپا کی حمایت لیجیے....." اماں نے پھاڑ کھایا رفیع کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ "ارے دیوانے" آپا اسے اپنے کمرے میں کھینچ لے گئیں۔ "یہ دیکھ" انہوں نے سر سے آنچل ہٹا کر سر جھکایا۔ "سارے بال تو سفید سفید دانت نکالے ہنس رہے ہیں..... وہ ہنس پڑیں۔ "یہ عمر تیرے بچے کھلانے کی ہے' یا اپنا بیاہ رچانے کی۔ اب میں شادی نہیں کروں گی' میرے لیے بیکار کے واسطے کسی کا پرانا بن۔ مجھے میرا خیال ہے..... رفو..... یہی محبت ہے؟" اور رفیع پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ لپ جھپ چھاجوں کام آپا نے دونوں میں کر کے رکھ دیا۔ جو اماں برسوں میں نہ سمیٹ سکتیں۔ "بڑی بہن ماں کے برابر ہوتی ہے" نانی بی کھڑے قد سے بلائیں لیا کرتیں۔ ماں کے نام سے انہیں وحشت ہوتی۔ خدا دشمن کی لڑکیوں کو ایسی ماں نہ دے۔ برسوں پہلے سے ان کا اماں سے ناطا ٹوٹ گیا تھا۔ مہینوں ان سے بات نہ ہوتی۔ وہ الگ پڑی رہیں۔ نسیم کو بڑی دھوم دھام سے آپا نے بیاہ دیا۔ زندگی کے چھوٹے سے تالاب میں چند دن بڑے چھوٹے ہلکورے اٹھتے رہے..... پھر سطح پر سکون ہی سکون چھا گیا۔ خاموش تالاب کے نیچے میں کیا کیا ہل چل مچی رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر..... نسیم چلی گئی..... مگر اپنے پیچھے عجیب عجیب اثرات دے گئی۔ "میری مانگ میں افشاں کیا اچھی لگے گی۔" اون نے نظر بچا کر ٹیکی سے افشاں اپنی مانگ میں چھڑک لی۔ آئینہ سب کے سامنے چار برس کے ننھے بھتیجے کو ڈانٹنے لگیں اسے یہ بھی پتا نہ تھا کہ افشاں کہاں چھڑکی جاتی ہے۔

اب کمرے میں گھٹن ہونے لگی تھی۔ نیند میں تو یوں ہی دشمنوں کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔ انہوں نے گلی کی طرف والی کھڑکی کھولی اور اندھیرے میں آدا دھڑ باہر دھکیل دیا اور پھر فوراً ہی ہٹ کر نیچے دبک گئیں۔ "ہائے .... یہ کون نامراد" سامنے گھر کے برآمدے میں کھڑا ادھر ہی گھورے جا رہا تھا۔ انہوں نے کھڑکی بند کر کے دراز میں آنکھ لگا دی ..... "نصیبوں جلے کی آنکھیں ہی پتھم ہو جائیں .... اللہ کرے ... ادھر ہی گھور رہا ہے .... صورت حرام" وہ بڑبڑائیں۔ کتنی دیر تک وہ کھڑا ان کے کمرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جب چلا گیا تو ..... انہیں کچھ الجھن سی ہونے لگی ... شیطان کی طرح پھر موجود۔ "اللہ تو بلائے" وہ گھبرا کر بستر سے اٹھیں۔ موت مردود بھی مر گئی۔ سارا گھر خاب کے گہرے سناٹے میں مدہوش تھا۔ آپا اکیلی آنکھ چولی کھیل رہی تھیں .... جانے کون تھا۔ کہاں سے آ کر رہا تھا۔ پہلے تو بنگلا خالی پڑا رہتا تھا۔ نیا نیا آیا ہوگا۔"

"کوئی اٹھ گیا ادھر ہی منہ اٹھائے کھڑا رہتا ہے۔" ایک دن رفیع نے کہا۔ آپا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیا انتی خشی بھی تھذیر کو نہ بھائے گی۔ راتوں کو بیٹھ کر انہوں نے اپنے سارے بال اکھاڑ پھینکے تھے۔ پڑوس نے کوئی نیا تیل بتایا تھا۔ اپنے کو جو ڑا سمجھ لو تو خیالات بھی سن سفید ہو جاتے ہیں۔ برف کے سے سفید اور برف ہی کی طرح ٹھنڈے پینتیس سال کی عمر کچھ ایسی زیادا تو نہیں ہوتی، شاید .... !

بڑی بے چینی سے وہ راتوں کی منتظر رہتیں۔ اپنا کمرا بند کر کے وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوتیں، اور پھر سامنے برآمدے میں دھندلے بلب کی دھیمی دھیمی روشنی میں ایک مردانا ہیولی نکھرتا۔ کیسا عجیب سا تھا۔ کبھی دل پر ہات رکھ رہا ہے تو کبھی دونوں بازو سینے پر لپٹ رہا ہے جیسے تھا کی رقص کر رہا ہو۔ پہلے ہیں تو آپا کھڑکھڑا گئیں، کبھی کاہے کو ایسی حرکتیں دیکھی ہوں گی۔ غیر مرد کے نام سے ان کی تتی کانپتی تھی، مگر اب کاہے کا ڈر۔ علوا سوہن کی ڈلی تھوڑی ہیں جو کوئی اٹھا کر ہڑپ کر جائے گا۔ سوے ہوئے صبح و شام انگڑائی لے کر جاگتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ انہیں اپنی عمر یاد نہ تھی نہ اپنا پھلا ماحول۔ سب سوتے رہتے، اور وہ بلا مدعا ایک دو سرے کو تکا کرتے" بلکل بے معنی انداز میں۔ آپا کا دل چاہتا کہ وہ عمر بھر اسے تکا کریں۔ ایک رات انہیں بستر پر گڑی مڑی ردی ملی "ہڑجا تشفیع کے نیچے، تجھے نہ کھلا ہو تو" وہ دانت پیستے پیستے دھک سے رہ گئیں۔ سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا، مگر "ناسئے محبت" توڑنا ہی تھا۔ "یہ کیسی محبت ہے؟ گونگی اور بہری، کہیں دیکھی نہ سنی۔ مجھے تو تمہارا نام بھی نہیں معلوم۔ اگر میں یہ کہدوں کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، بہت چاہتا ہوں تو تم برا تو نہ مانو گی۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کب تک یہ اشارے ہوتے رہیں گے۔ ہم تم مل کر بہت سی باتیں کریں گے۔ یا تو تم آؤ .... یا مجھے آنے دو، ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔" تمہارا اپنا" جمیل

"محبت .....؟" دھک دھک کرتے دل میں کوئی چیز کلبلائی۔ ان کی سانسیں پھولنے لگیں۔ کوئی ان سے بھی محبت کر سکتا ہے، جیسے سارا جسم ایک دل بنا دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ سے چیزیں چھوٹی پڑ رہی تھیں .... کیا ہوگا؟ نہ سنتے اور شیطان ایک ساتھ سر میں اچھل پھاند مچا رہے تھے۔ ان کا جی چاہا رہا تھا کہ چیخ مار کر گھر سے بھاگ نکلیں۔ پھر تقاضا شدید ہوتا گیا۔ کیسے ملیں۔ کیسے جائیں۔ ساری ساری رات وہ آنکھیں کھولے چھت کو تکتی رہتیں۔ اور خیالات بے زبان انہیں اپنے رتھ پر اڑائے لے جاتے۔ جمیل کے خطوں کو اپنی زندگی کی بنیاد سمجھ کر انہوں نے کتنے خیالی رنگ محل کھڑے کر لیے تھے۔ کبھی کبھار روح میں کوئی نوکیلا کانٹا چبھنے لگتا۔ یہ تو سب دھوکا دینا ہوا۔ اگر کسی کو پتا چل جائے تو .... اور وہ اڑی ہوئی رنگت چھپانے کے لیے چولے میں پھونکے مارنے لگتیں۔ "افق کے پرے چلے جائیں گے۔" ایک خط میں لکھا تھا۔ آج تک یہ نام نہیں سنا تھا۔ جانے کون سا شہر ہے وہ نخشی افق کے پار جانے پر راضی تھیں۔ بلائے، جہاں بھی بلائیں، مگر اس قید سے نجات ملے۔ یہاں کیا ہے؟ پھیکے پھیکے دن۔

اجڑی اجڑی سی رہا تیں۔ اگر اس ویرانے میں جمیل کے قدم نہ آتے تو..... اللہ..... وہ بچیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے خواب دیکھا کرتیں۔ "پہننے اوڑھنے سے سب ہی اچھے لگتے ہیں" بھابی شفیع کے سر پر ہات پھیرتے ہوئے کہتیں۔ "عمر ہوگئی تو کیا۔ صورت تو اچھی ہے۔" اب کیا اچھی لگوں گی۔ وہ حسرت کی سرخی کو چھپا نہ سکتیں۔ "بیکار کو آپ کا ناس مارا گیا۔ اپنے آدے ورجی بچے ہوتے۔" کم بخت کس نے کہا تھا افسوس کرے۔ پہلے نہیں تھے تو اب ہو جائیں گے۔ وہ کڑھتیں اب تک کیسے جی کو مارے رہی تھیں۔ نہ اچھا کھانے کی ہوس نہ اچھا پہننے کا شوق۔ انہیں اپنے اوپر عورتوں کا شبہ ہوتا۔ سچ مچ ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

"مگی حوریں کھڑکی میں کھڑی ہو کر اشارے بازی نہیں کیا کرتیں۔" اندر سے کوئی کہتا، تو پھر کیا کریں۔ حوروں کو جنت میں غلمان مل جاتے ہوں گے۔ اور اس دنیا کے دوزخ میں صرف حور..... غلمان کوئی نہیں، وہ پھر بھٹکنے لگتیں۔ ان دنوں اماں بیمار تھیں۔ اپنی گھبراہٹ وہ ان کی بیماری میں چھپا دیتیں۔ اس خط نے تو دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ جو ایک سنسان دوپہر کو پڑا تھا۔

"تم مجھے کب تک یوں ہی آس دلا دلا کر بوس کرتی رہو گی! میرے صبر کی کڑیاں ٹوٹنے لگی ہیں۔ خدا کے لیے مجھ سے ملو۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں کل رات یہاں سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ میرا بھی جانا ہے کہ تم بھی ساتھ چلو، کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ پھر ہماری ہی زندگی کا آغاز ہوگا، حسین سی زندگی کا۔ کل رات انتظار کروں تنہا را اپنا

وہ دن ان کا آخری دن تھا۔ جانے کیا بات تھی آج اماں کی کھانسی پہ انہیں بڑا ترس آ رہا تھا۔ بے چاری میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی صحن میں بیٹھی مسلسل کھانس رہی تھیں۔ رفیع کا منا سا بچا انہیں بہت پیارا لگ رہا تھا۔ کتنی بار انہوں نے اسے سینے سے بھینچ بھینچ کر پیار کیے تھے۔ دل میں ہلچل سی مچی تھی۔ کل اس وقت کیا ہوگا۔ شاید ابا کا دم ہی نکل جائے اماں کو آخری کھانسی آئے گی اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں گی۔ رفیع اور آپا جان..... اور..... اور..... وہ سر..... بچا کتنا بہت شکل ہے..... یا اللہ" مگر اس گھر پر شہنائیاں نہیں گونجیں گی۔ بابل کے گیت نہیں ابھریں گے جو انہیں بے حد پسند تھے۔ وہ خود کو دلہن بنی دیکھنا چاہتی تھیں۔ سرخ لہنگا گوٹے کناری کا ڑھے، سر جھکائے وہ اپنے برآمدے والے شہزادے کو دیکھا کرتیں۔ آخر جمیل کو بھی ارمان ہوگا۔ ہلے بھرکی عورتیں اکٹھا ہوں گی۔ گیت بکھریں گے۔ چلی کون سے دیس گجریا توپ ٹھن کے..... پی کے دیس..... وہ اپنے آپ شرما گئیں۔ تھوڑے دنوں انگلیاں اٹھیں گی۔ پھر سب کچھ ایسا ہی ہو جائے گا۔ آپا جان کہتی ہیں "لڑکیاں ہر زمانے میں بھاگی ہیں" مگر ان کے کانوں میں کریہہ جملے گونجنے لگتے۔ اماں کو سب طعنے دیں گے۔ ان کی بیٹی بھاگ گئی۔ "بھاگ گئی اس عمر میں" انہوں نے اچھلتے پیاسے دل کو جکڑ لیا۔ ایک بار پھر کمرے کی چھوٹی سی دنیا، روزانہ کے باہر والی بڑی دنیا سے لڑنے لگی۔ بھاگنے والی لڑکیوں کا کیا ہمیشہ اچھی رہتی ہیں؟ یہ لے جانے والے چند دن موج اڑاتے ہیں۔ پھر لڑکیوں کو تحفتاً اپنے دوستوں کو بخش دیتے ہیں۔ جو گھر سے نکلا پھر واپس نہیں آتا۔ اور یہ جمیل؟ وہ تو یہ بھی نہیں جانتیں کہاں سے آیا تھا، کہاں جائے گا، کچھ پوچھے گچھے یوں ہی نکل کھڑی ہوں گی؟" "بیٹی ذرا سا پانی" اماں کراہیں۔ انہوں نے سنا بھی نہیں۔

"آپا آجکل بہت کچے سوچنے لگی ہیں" شمیم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سوچنے کو اب رکھا ہی کیا ہے۔" ایکبار پھر انہوں نے طے کر لیا۔ اس گھر سے چلی جائیں گی۔ چاہے کچھ ہو۔ اب یہ طعنے نہیں سہے جاتے۔ بڑی رکھائی سے انہوں نے صراحی اماں کے آگے کھسکا دی۔

اس دن کی رات بھی آ گئی۔ باورچی خانے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ جھٹنگے پلنگ پر پڑی جمیل کے ساتھ افق کے

پار کی سیر کر رہی تھیں۔ تم گلتھی پکوالو... زیتب سے۔ نمک مرچ چھلی ہوئی حلق میں لگے گا... پھر ناچو گی...۔" ابا نے لاڈ سے اماں کو ڈانٹا۔ "خاک پڑے اس پیار پر' اماں کے چوٹچلے نہ گئے۔ میری جوتی بھی گلتھی نہ تھوپے گی اب..."

"نہ اجب... ارے بیٹی... رکھلو گی نہیں باہر... پکا ڈالو گلتھی... رات ہو رہی ہے۔" اماں نے پکارا۔ "بس اسی لیے تو پیدا کیا تھا۔ غصے کے مارے ان کے بدن سے شعلے بھڑکنے لگے۔ گلتھی کا مزا چکھاؤں گی' تھوڑی دیر صبر۔" "مردے نکلیں آدی رات کو۔ تن تن کپڑے پڑیں۔" انہوں نے ہونٹوں ہونٹوں میں سنی سنائی عورتوں کی سی گالیاں بکیں' اور پھر مرجھک کر گلتھی تھوپنے لگیں۔

اس رات غیر معمولی سناٹا طاری تھا۔ وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھی کسی آہٹ کی منتظر تھیں' آج یہ کمرا' یہ پلنگ' یہ پنکھا' یہ دیواریں سب چھوٹ جائیں گی۔ بہت بسا ہا پینتیس سال' اب آخری بار مل لو۔" وہ دیوار سے گال رگڑنے لگیں۔

ہر فعتہً رات کے سناٹے میں ایک باریک سی سیٹی گونجی' فرشتے اور شیطان پھر ادھم مچانے لگے۔ وہ اٹھ نہ سکیں۔ ٹکٹکی دروازے کو گھور رہی تھیں۔

"بھاگ چلو... بھاگ چلو..." شیطان چلا رہے تھے۔

"تم متالی بیٹی ہو' حوروں سے زیادا پاک' تمہارے دامن پہ ہم نماز پڑتے ہیں۔ رک جاؤ' رک جاؤ۔" فرشتے دامن پکڑ رہے تھے۔

سیٹی ایک بار اور بجی اور اندھیرے اجالے کے پردے چیرتی سیدھی دل میں اتر گئی۔

پھر یہ رات نہیں آئے گی۔ اب بھی وقت ہے صبح ہوتے ہی پھر یہی گھر... یہی گھر والے... گھٹن... تاریکی... اٹھو... اٹھ جاؤ... وہ اس کے بعد کچھ اٹھ نہ سکیں... جن دیواروں سے اتنا بہنا پایا تھا' وہ ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔

سیٹی آخری بار اور لہرائی... کسی کی بھاری قدموں کی آہٹیں سناٹے میں دور ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئیں..... نہ ڈولی نہ کہار... بابل کے گیتوں کی حسرت زدائے ٹوٹ گئی..... نہ باجے نہ بارات' کچھ تو انتظار کیا ہوتا——

ہر دوسی..... پی کی نگریا کو جانے والا رستا آنسوؤں کے دھندلکے میں کھو گیا..... باوجود کمر پٹخنے کے پھر راہ نہ ملی۔

ہر فعتہً اماں کھانس اٹھیں..... انہیں کسی نے گہری نیند سے چونکا دیا..... تڑپ کر باہر نکلیں... اور کھانستی کراہتی اماں کے ہڈیوں بھرے سینے سے چمٹ کر سسکیاں لینے لگیں!!

بہاراں کہ کے چھوڑیں گے

چمن میں یہ خزاں کیسی؟ بہاراں کر کے چھوڑینگے
ہر اک گوشہ چمن کا گل بداماں کر کے چھوڑینگے
ڈراتے ہیں ہمیں کیوں حلقہ ہائے زلف گیتی اب
پریشاں زلف گیتی کو پریشاں کر کے چھوڑینگے
پریشاں ہم کو کرنے کی انہوں نے کیسے ٹھانی ہے
زمانہ دیکھ لے گا ہم پریشاں کر کے چھوڑینگے
ستم ہم پر وہ ڈھاتے ہیں غضب کی وہ جفا کرتے
انہوں نے درد بخشا ہم بھی درماں کر کے چھوڑینگے
اگر وہ دیکھتے ہیں چشم حیراں سے ہمیں حاوی
یقیں جانو انہیں ہم آہ و حیراں کر کے چھوڑینگے

پہلی ملیالم کا ادب قسط

محمد اسحاق ایوبی

ثقافتی تعلقات کی ہندستانی کونسل واقع نئی دہلی سے عربی کا ایک سہ ماہی رسالہ "ثقافۃ الہند" نکلتا ہے، جو میں ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادب کے بارے میں مضامین کا ایک سلسلہ چھپ رہا ہے، نیچے کا مقالہ اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ محمد اسحاق ایوبی نے اس کا عربی سے ہندستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جو نیچے پیش ہے ——

ملیالم ریاست کیرل کی زبان ہے۔ اسے لگ بھگ ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد بولتے ہیں۔ ریاست کیرل ہندستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کے ایک طرف تو بحیرۂ عرب کا پانی ٹھاٹیں مار رہا ہے، اور دوسری طرف پہاڑیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح یہ خطا سمندر اور پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ کیرل کا رقبہ تقریباً ۱۵۳۵ مربع میل ہے۔ اسے ہندستانی یونین کی سب سے چھوٹی ریاست سمجھا جاتا ہے، لیکن آبادی اور رقبے دونوں لحاظ سے یہ ریاست بلجیم یا ہالینڈ سے بڑی ہے۔ بلجیم کی کل آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہے اور ہالینڈ میں لگ بھگ ایک کروڑ آزاد بستے ہیں۔

عرب جنوبی ہندستان کے مغربی ساحل کو "ملیبار" یا "ملابار" کہتے تھے، لیکن تامل اور کنڑ کی پرانی کتابوں میں اسے "کیرلم" یا "ملیالم" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اصل میں کنڑ زبان کا لفظ "کیرلم" یا "کیرل" تامل زبان کے لفظ "چیرلم" یا "چیرل" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "کیرلم" یا "چیرلم" کے معنی ہیں پہاڑیوں کا سلسلہ، بات یہ ہے کہ کیرل کی مشرقی حد پوری کی پوری پہاڑیوں پر ہی مشتمل ہے۔ چنانچہ "کیرلم" یا "چیرلم" کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔ لفظ "ملابار" مجموعا ہے "ملا" اور "بار" کا۔ لفظ "ملا" یا "مالا" دراوڑی زبانوں میں پہاڑ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے سنسکرت میں بھی اس کے معنی یہی ہیں۔ "بار" فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "زیادہ" یا "کثرت"۔ چنانچہ "ملابار" کے معنی ہوئے پہاڑوں کا دیش" یا "بہت سی پہاڑیوں کا دیش"۔ شروع

شروع میں جن لوگوں نے اس خطۂ زمین کو "ملیبار" یا "ملابار" کا نام دیا وہ تھے جزیرے عرب یا ایران کے ملاح۔ چنانچہ پانچویں صدی ہجری میں عربوں کے ہاں یہی لفظ بول چال ہونے لگا۔ شریف ادریسی (۵۴۸ھ مطابق ۱۲۲۸ء) اور ابوالفدا نے اپنی کتابوں میں اسی لفظ کا استعمال کیا ہے۔

پرانی عربی کتابوں میں ریاست کیرل کو "بلاد الفلفل" (کالی مرچ کا خطا) کہا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے کیرل کی کالی مرچ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے۔

"کالی مرچ کے پودے انگور کی بیلوں سے ملتے جلتے ہیں۔ کالی مرچ کے پودے ناریل کے درختوں کے متصل لگائے جاتے ہیں۔ یہ انگور کے بیل کی مانند اوپر چڑھتے جاتے۔ کالی مرچ کی پتیاں "فیل" کی پتوں سے ملتی جلتی ہیں ان کی بعض پتیاں "علیق" کی بیلوں کی پتوں سے شباہت رکھتی ہیں۔ جب یہ پودے چھوٹے ہی ہوتے ہیں، تبھی سے خوشے لگنے لگتے ہیں۔"

ملیالم کے ادب اور اس کے رجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں کیرل کی تاریخ، وہاں کے عوام اور زبان پر اثر انداز ہونے والے عناصر پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے۔ حضرت مسیح سے پہلے کے دور میں جنوبی ہندستان میں تین حکومتیں

قایم تھیں جو "باتا" "چوار" اور "چیرا" کہلاتی تھیں۔ "باتا" کا دیس دور اجنوب میں تھا۔ دریاے پیلان سے دریاے پالار تک کا مشرقی ساحل "چولا" کے تحت تھا۔ "چیرا" کا سکا کیرل کے سمندری ساحل کے کنارے کنارے کولن سے لے کر راس کماری تک جاری تھا۔ جنوبی ہندستان کی پرانی تہذیب انہیں سلطنتوں کے زیر سایہ پھلتی پھولتی رہی۔ مہاراجا اشوک کے عہد کے کتبوں میں خاندان "چیرا" کو "چیرل تمرا" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس سلطنت کی راجدھانی کو چین تھی۔ جس کے آثار اب بھی دریاے پریار کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چیرا حکمرانوں نے اپنی راجدھانی ترونجی کلم" میں قایم کی جو دریاے پریار کے دہانے پر واقع ہے۔

خطۂ کیرل میں عربوں کی آمد و رفت سکندر اعظم کے عہد سے بہت پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ مالابار کی بندرگاہ موجیرس فارس سے ہوتی ہوئی جزیرہ نماے عرب کے جنوبی ساحل تک پہنچتی تھی۔ وہاں سے عرب مال تجارت جہاز کے رستے شام اور اسکندریہ لے جاتے۔ مغربی ملکوں کے بیوپاری انہیں شہروں میں ہندستان کا سامان خریدتے، اور پھر وہاں سے اپنے دیش کی منڈیوں میں لے جاتے۔ چنانچہ پرانے زمانے میں عرب اور مصر تاجر ہی ہندستان اور روم و یونان کے درمیان تجارتی تعلقات کی کڑی کا کام دیتے تھے۔ تورات کے "عہد قدیم" میں کہا گیا ہے کہ اسرائیلی تاجر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان کے عہد میں کیرل سے تجارت کیا کرتے تھے۔

مشہوری و معروف مسیحی مشنری طامس رسولؑ ۵۲ء میں ہندستان آے تھے۔ وہ پہلے پہل کرانگنور کے مقام پر پہنچے تھے۔ یہ جگہ کیرل کے جنوب میں اور کوچین کی پرانی ریاست کے شمالی خطے میں واقع ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں پہلے پہل مسلمانوں نے اپنا قدم رکھا اور ہندستان میں پہلی مسجد بھی یہیں تعمیر ہوئی۔ اور واسکوڈی گاما اور اس کے ساتھی جس بندرگاہ پر اترے اس کا نام زیلا نیا ہے، جو کیرل کے شمالی حصے میں واقع ہے۔ وہاں سے وہ کالی کٹ پہنچے۔ ..... جہاں انہوں نے ڈیڑھ سال تک قیام کیا۔ واسکوڈی گاما کے آنے کے بعد ہی یورپ کے لوگوں کو ہندستان کا رستا معلوم ہو سکا۔ اس کے بعد یورپ والوں کے راست تعلقات ہندستان سے قایم ہو گئے۔ واسکوڈی گاما اور ان کے ساتھی ۱۱ر مئی ۱۴۹۸ء کو کیرل پہنچے تھے۔ پرتگال کی راجدھانی لسبن سے کیرل کے ساحل پر پہنچنے میں دس مہینے اور نو دن لگ گئے۔ ہندستان کی نسبت کیرل کے تجارتی رابطے غیر ملکوں سے زیادہ قایم رہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی چھاپ ملیالم کے ادب اور اس کے رجحانات پر پڑی ہے۔ چنانچہ کیرل میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے پیرو کار، مثلاً ہندو، بودھ، جینی، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ہی پاے جاتے ہیں۔

ملیالم کے ادبی دور کی ابتدا

نویں صدی عیسوی تک ملیالم کی ادبی تصانیف کا پتا نہیں چلتا۔ ہاں چودھویں صدی عیسوی میں ملیالم کا ادب ایک زندہ زبان کے ادب کے روپ میں ظاہر ہونے لگا۔ ملیالم ادب کی پہلی کتاب جو ہم تک پہنچی ہے اس کا نام ہے "لیلا تلکم" یہ کتاب صرف و نحو اور زبان سے بحث کرتی ہے۔ بعض ادبی حلقوں نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ جب تامل ادب درمیانی عہد میں اپنے عنفوان شباب پر تھا تو ملیالم تامل زبان کی ایک بولی کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس نظریے کے ثبوت میں کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں ہے۔ اگر ہم ملیالم کو علمی ادبی زبان کی حیثیت سے پرکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ملیالم کے قواعد، اسلوب اور بحریں خصوصی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض سنسکرت الفاظ کا استعمال اشعار میں پایا ہے، یہ الفاظ ملیالم کے اصلی عنصر کے ساتھ ساتھ رایج ہے، یہاں تک کہ ان الفاظ میں تفریق کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ انیسویں صدی عیسوی میں کیرل میں تعلیم کا نیا نظام جاری ہوا، جس کا بلا واسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ کلاسیکی سنسکرت کی کتابوں کو ملیالم کا جامہ پہنایا جانے لگا تاکہ اسکولوں میں درکار علاقائی

زبان کی درسی کتابیں مہیا کی جاسکیں۔ ادھر شاعروں کے طائر تخیل نے بلند مقامات پر پرواز شروع کی۔ ان کے خیالات میں نئی زندگی آئی، لیکن جہاں تک تشبیہ اور استعارے کا تعلق ہے انہوں نے سنسکرت رنگ کو ہی اپنائے رکھا۔

اس مکتب کے رہنما "کیرل ورما" (متوفی ۱۹۱۶ء) تھے۔ ان کے دیوان کا نام ہے "میورسندیشم"۔

نیا مکتب فکر

اسی اثنا میں ایک اور مکتب فکر عالم وجود میں آیا، جو نظم و نثر دونوں میں سادا اور سہل طرز بیان کو برتتا تھا۔ اس مکتب ادب کے سربراہ تھے۔ کامریڈ کے نگور اور ذہانی منبوتری یا ذہانی نے اپنی نظموں میں عوام کی بول چال کی زبان استعمال کی۔ اس طرح ملیالم ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، جس سے کیرل کے جدید مصنفین نے خوشا چینی کی۔

پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی تک ملیالم کی نثر میں انوکھی سنسکرت، اصطلاحات اور کلاسیکی طرز تحریر مروج تھی، لیکن کیرل ورما نے سادگی کو اپنایا اور روزمرہ و محاورہ کی تشریح کی۔ اس کوشش کے باوجود اس کے اسلوب بیان میں ثقافت پائی جاتی ہے اور اس کی نثر بجائے صرف ان ہی لوگوں کے پلے پڑتی تھی جو سنسکرت کا اچھا علم رکھتے تھے، چونکہ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مشکل الفاظ اور پیچیدا قسم کی لکھوائی سے پرہیز ضروری ہے، اس لیے اوپر بیان کیا گیا طرز بیان عوام میں مقبولیت کا درجا حاصل نہ کرسکا۔ ادھر اخبار نویسوں کو بھی اپنے روزناموں میں پیچیدا تحریر کو اپنانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ چنانچہ ملیالم میں ایک نیا مکتب ادب عالم وجود میں آیا۔ چیدہ مصنف نے مشہور و معروف قصا "اندولیکا" بول چال کی زبان اور سادا ڈھنگ سے لکھا۔ اس کتاب نے یہ ثابت کردیا کہ زبان پر قدرت رکھنے والا ادیب اپنے خیالات کو عوامی زبان میں اچھی طرح سے ادا کرسکتا ہے۔ اور ادب برائے زندگی کے اصول کو حقیقت کا جامہ بھی پہنا سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور ادیب میدان میں آیا جس نے کلاسیکی طرز تحریر اور بول چال کی زبان کے بیچ بیچ کا راستا اختیار کیا۔ اس کا نام اے۔ آر۔ راجا راجا ورما ہے۔ وہ گزشتہ پانچ عظیم شاعر اور آزاد خیال نقاد تھے۔ گزشتہ سے متعلق ان کی مشہور کتاب کا نام "کیرلا بھیرام" ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ملیالم کو سنسکرت کے لکھائی کے انداز سے جس کا اتباع کیرلا ورما کرتا تھا اور بول چال کی طرز تحریر سے جس کا بانی ذہانی تھا، پاک کیا۔ یہ دور ۱۹۱۰ء میں ختم ہوا۔ اگرچہ وہ نظریاتی اور علمی دونوں لحاظ سے اونچا سمجھا جاتا ہے، لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مختلف قسم کی ادبی سرگرمیوں سے بھرپور رہا۔ اس دور نے ملیالم ادب کو سنسکرت اور انگریزی تصانیف کے ترجمے سے مالا مال کیا۔ اس دور کے مصنفین نے اپنے ڈراموں اور افسانوں میں عوامی زندگی کے جدید نظریات کو اپنایا۔ یہ چیز کوچنی تنبیوں کی کتاب "کلیانی ناٹکم" میں بہت نمایاں صورت میں ہے۔ اس تصنیف میں اس زمانے کی سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاری کی حیثیت سے مریم ناٹکم کا ناٹک "ناویل کراتکان" عیسائی طبقے کی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ غرض یہ کہ اس عصر کی بدولت ملیالم ادب اور زبان میں بہت اضافہ ہوا اور عوام کے ساتھ اس کا رشتا اور مضبوط ہوگیا۔ اس میں نئی تحریکوں کا ساتھ دینے کی قوت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ نئی نئی ادبی سرگرمیوں نے جنم لیا۔

حرف آرزو

بھگوتی پرشاد عاجز بنارسی

زندہ دلی کی شان نہ بدلے
عشق تری پہچان نہ بدلے

تو نے دیا غم ہم نے لیا غم
دیکھ کہیں احسان نہ بدلے

غربت میں بسیرا کرنے والو
رنج و الم کی شان نہ بدلے

جینے کا سامان تو بدلا
کاہے کو انسان نہ بدلے

عشق کو کافر کہنے والے
دیکھ کہیں ایمان نہ بدلے

جس کی بنا پر زیست ہے قائم
آپ کا وہ فرمان نہ بدلے

درد سے دل کی شان ہے عاجز
ضبط کی لیکن شان نہ بدلے

خندۂ گل

ابوالحسنات قادری

"اسلامی دنیا" کے گذشتہ شمارے میں ہم نے اپنی خوش گفت مبارک کا حال عرض کیا تھا۔ اس خوش گفت کو مبارک کہہ دینے سے کلام پاک کے ختم مبارک میں کمی کی جان ناتواں پر جو بیچ بھی گذرے اسے مبارک ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر اپنے اس حال کو نامبارک یا نحوست سے تعبیر کیا گیا تو کبھی کبھی علاقہ میں داخل ہو جائے کا خطرہ ہے۔ "اسلامی دنیا" کے صفحوں کی تنگ دامانی کے باعث ہم اپنے مہمان صوفی قدرت اللہ کی داستان بھی پیش نہ کر سکے۔ ان بے چارہ دو، پر اس ختم مبارک میں کیا گذری، اب وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

خان بہادر برکت اللہ کے صاحبزادے کے ختم قرآن کی مٹھائی کی تقسیم پورے شباب پر تھی۔ ہر شخص یہی کوشش کر رہا تھا کہ یہ تبرک سب سے پہلے میں حاصل کر جاؤں۔ ایسے موقع پر بچانے صبر کا چھلک اٹھنا قدرتی بات ہے۔ صوفی صاحب تو کچھ دیر تک تو اس ہڑبونگ کو ٹالا ٹالتے رہے، مگر آخر کب تک۔ جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ شیرینی کا ان تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، انہیں خود ہی شیرینی تک پہنچنا پڑے گا تو وہ بھی میدان کارزار میں کود پڑے۔ اور دل ہی دل میں الا اللہ کا نعرہ لگا کر مجمع کو چیرتے پھاڑتے شیرینی کی طرف لپکے۔ بھاری بھرکم جسثے کی وجہ سے ان کو آگے بڑھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی، مگر وہ ہتیار ڈال دینے والے لوگوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے سر توڑ کوشش کی اور کسی نہ کسی طرح مجمع کے درمیان تک تو پہنچ ہی گئے۔ مگر اب آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ پیچھے سے مجمع کے زوردار جھٹکے بھی برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ اگر ان کے آگے بھی کچھ لوگ نہ ہوتے تو کبھی کے اوندھے منہ گر چکے ہوتے۔ آخر انہیں ایک ترکیب سوجھی، انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور انہیں سیدھا کر کے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ جو کھولا تو کوئی دائیں گرا اور کوئی بائیں۔ کئی آدمیوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے۔ صوفی صاحب کے خلاف کئی احتجاجی گالیاں بھی بلند ہوئیں، مگر صوفی صاحب دو قدم اور آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ان میں اور مٹھائی میں چند قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ گو ہر مقصود کو سامنے دیکھ کر جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے پھر زور لگایا۔ ادھر پیچھے سے بھی ایک زوردار دھکا لگا اور صوفی صاحب دو قدم اور آگے بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ اب ہاتھ آگے بڑھا کر مٹھائی لینے کا نمبر آ گیا۔

صوفی صاحب نے مٹھائی کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر ان کے برابر سے ایک دوسرا ہاتھ آگے بڑھ گیا اور مٹھائی لے بھاگا۔ صوفی صاحب کا ہاتھ محروم رہ گیا۔ تقسیم کرنے والا سب کو صبر و ضبط کی تلقین کر رہا تھا، وہ برابر کہے جا رہا تھا "ارے صاحب ہڑبونگ نہ مچایئے۔ ذرا صبر کیجئے مٹھائی بہت ہے، سب کو ملے گی" ــــ دو آدمی تقسیم کرنے والے کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے وہ مجمع کو پیچھے ڈھکیل کر تاؤ میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر مجمع پر اس صبر و ضبط کی تلقین کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ صوفی صاحب نے پھر ہاتھ بڑھایا، مگر اس مرتبہ بھی چند ہاتھ ان کے ہاتھ سے آگے بڑھ گئے اور وہ پھر محروم رہ گئے۔

چوتھی دفعہ جب یہی حادثہ پیش آیا تو صوفی صاحب کو غصہ آ گیا اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور انہوں غیض و غضب کے عالم میں مٹھائی کی تھال پر ہاتھ ڈال دیا۔ مٹھائی کی تھال ان کے بھاری بھرکم ہاتھ کی تاب نہ لا کر اوندھے موہ زمین پر گر پڑی۔ تھال کا نقش پر گرنا تھا کہ پیچھے سے ایک زبردست دھکا اور لگا۔ سب سے آگے ہونے کی وجہ سے

صوفی صاحب اس دھکے کی تاب نہ لاسکے اور خود بھی اوندھے منھ سے فرش پر سجدہ کرنے لگے۔ انہوں نے گرتے گرتے اپنے ہاتھ پاؤں دائیں بائیں جو چلائے تو چند آدمیوں کو اپنے ساتھ اور لے مرے۔ اب وہ بیچارے عجیب کسمپرسی کے عالم میں پھنس گئے۔ کئی دفعہ اٹھنے کی کوشش کی، مگر ہر بار کسی سے ایک زوردار دھکا اور لگا، اور کئی آدمی ان پر آگرے، بیچارے کسی طرح بھی اٹھنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کمالیوں کی پارٹی الگ ہورہی تھی، اس کے علاوہ کسی نے پیر کچل دیا اور کسی نے ہنڈلی کو زخمی کردیا۔ ادھر کسی منچلے نے یہ حرکت کی کہ "مین سوئچ" بند کردیا اور اس لڑائی کے میدان میں ہاہو کا عالم مچ گیا۔ تاریکی سے شرارت پسند لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ چیخ پکار سے فضا گونج اٹھی، مگر یہ تاریکی صوفی صاحب کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ خدا خدا کرکے وہ کسی طرح اٹھے اور مجمع سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔

انہوں نے میرے کمرے میں جب قدم رکھا تو بیک نظر ان کو پہچان نہ سکا؛ اور میں نے جلدی سے بوکھلا کر کہا ــــ "ابے کون ہے؟ کمرے میں کیوں گھسا چلا آرہا ہے؟"

صوفی صاحب نے کراہتے ہوئے جواب دیا "ارے میں ہوں قدرت اللہ ــــ جلدی سے ایک لوٹے میں پانی لے کر آؤ۔"

"ارے صوفی صاحب! آپ"۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اب ذرا آپ ہی غور فرمایئے۔ ایسی صورت میں پہچاننے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ صوفی صاحب عجیب حلیے میں میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر "بارہ شاہیاں" اس طرح لکھی ہوئی تھیں، جیسے کسی نے سرخ رنگ کا غلیظ برش پیپ کردیا ہو۔ نہ سر پر پگڑی نہ پیروں میں جوتے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے۔

میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میری بیوی اور بچے ان کو اس حالت میں دیکھ پائیں تو "بھوت بھوت" کا شور مچا کر یقیناً بے ہوش ہوجائیں۔

میں نے بمشکل اپنی حالت پر قابو پایا اور صوفی صاحب سے دریافت کیا۔ "صوفی صاحب! آخر یہ سب ہوا کیسے؟ کیا ختم شریف میں بلوا ہوگیا ہے؟" صوفی صاحب نے کراہتے ہوئے فرمایا ــ

"اللہ کے بندے، یہ سب کچھ بعد میں پوچھنا پہلے پانی تو لے آؤ۔" اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ ایسی حالت میں پوچھنے کا سوال ہی کیا تھا۔ میں دوڑا ہوا گھر میں گیا۔ کئی لوٹوں میں پانی بھر کر لایا۔ صابون، تولیا اور اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا ان کو لاکر دیا۔ صوفی صاحب نے جلدی جلدی ہاتھ منھ دھوکر اپنا حلیہ درست کیا۔ کپڑے بدلے اور چارپائی پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر مزاج پرسی کے طور پر دریافت کیا۔ "صوفی صاحب! خدا نخواستہ کہیں بے جگہ چوٹ تو نہیں آئی، ویسے تو فجرت ہے۔" صوفی صاحب نے جواب دیا "علاما! کیا تمہیں میرا حلیہ نظر نہیں آرہا۔ دیکھتے نہیں سارا بدن زخمی ہوا پڑا ہے۔"

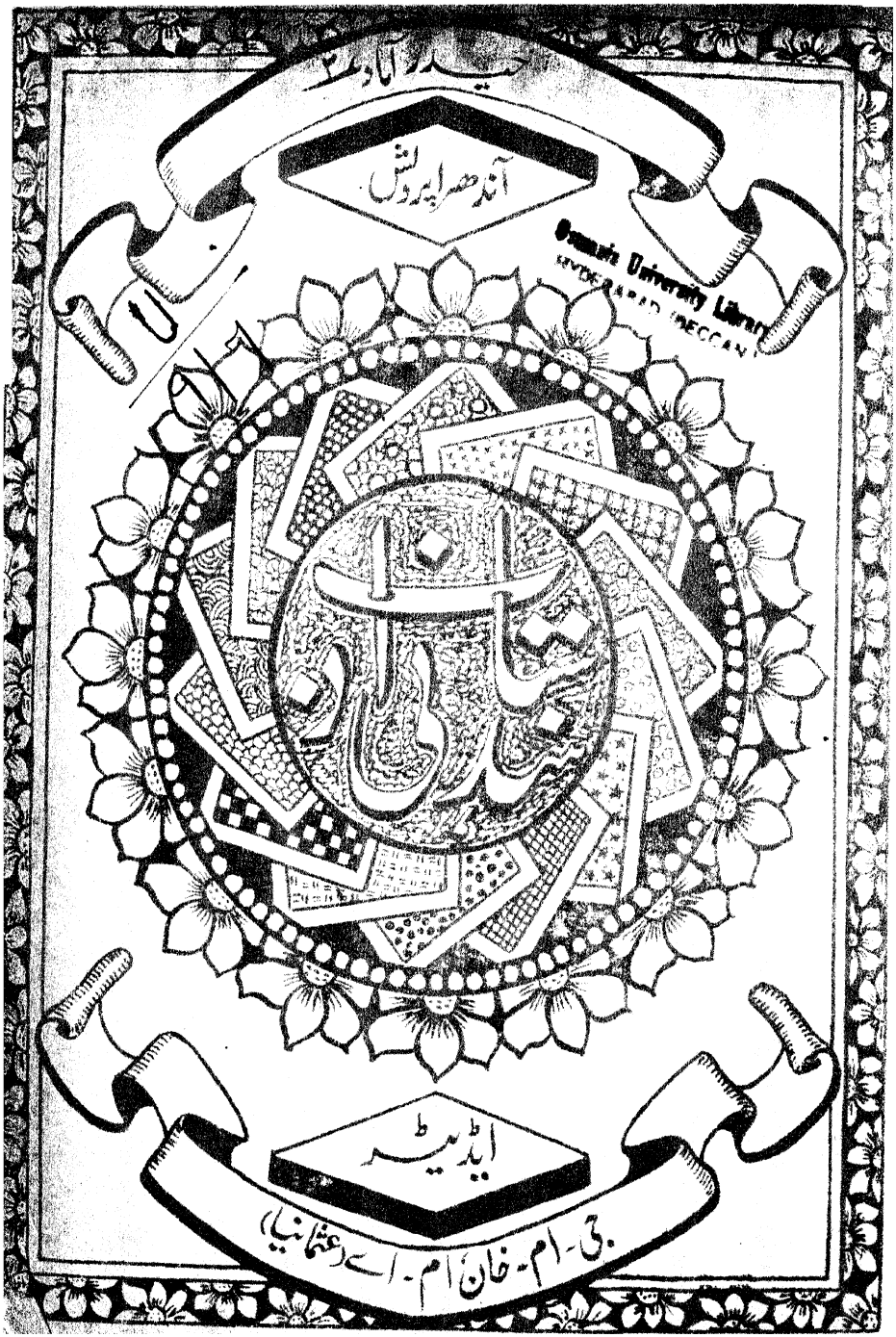
"یار تجھے تو بڑا تعجب ہو رہا ہے، تم جیسا نجانے ہوا آدمی اور یہ حالت۔"

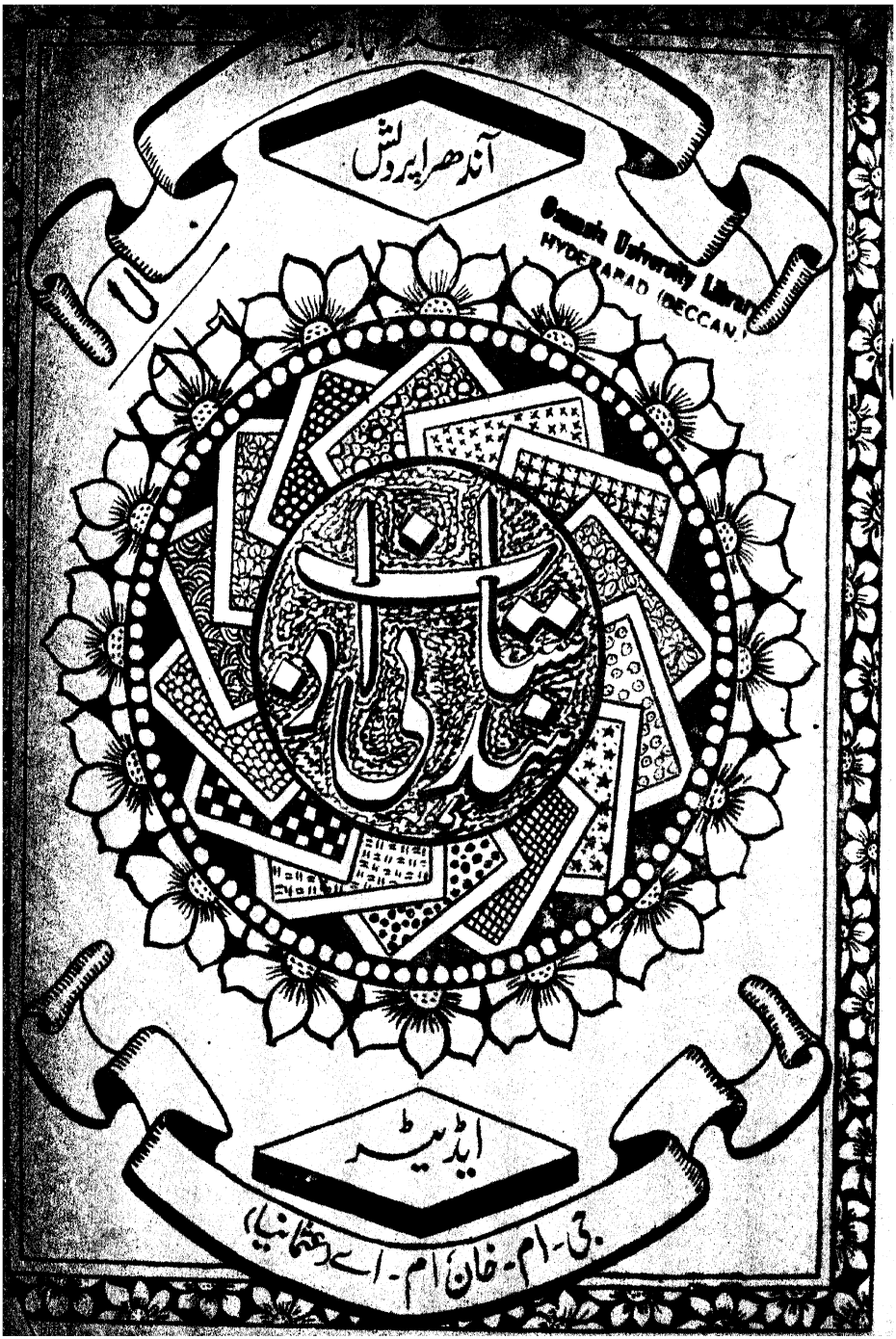
"بس اتفاق ہی تو ہے پھنس گیا، ورنہ ایسے مجمعوں کی میں کب پروا کرتا ہوں۔"

"بھئی میں نے تو کان پکڑا، میں تو اب کسی خان بہادر قسم کے ختم میں شرکت نہیں کروں گا۔ بیگم تو مجھے پہلے ہی منع کر رہی تھیں، مگر میں نے عورت کو ناقص عقل سمجھ کر ان کی بات نہ مانی۔ آج معلوم ہوا کہ عورتیں بھی کچھ عقل رکھتی ہیں۔ میں کبھی اتنا شرمندا نہیں ہوا جتنا اس ختم میں شرکت کے بعد ہوا ہوں۔"

"چوڑیاں پہن لو۔" صوفی صاحب نے جھلا کر فرمایا۔ "تم سر تھوڑا ہی ہو، اگر مجھے پہلے سے خبر ہوتی کہ یہاں ایسا بھی ہوسکتا ہے تو پھر ایسی حکمت عملی سے کام لیتا کہ مٹھائی کی تھال کا بھی پتا نہ چلتا اور جسم پر خراش تک نہ آتی۔ اس قسم کی محفلوں میں شرکت کے لیے ذرا پہلے سے پروگرام بنانا پڑتا ہے۔"

صوفی صاحب کے قیام کو کئی روز گذر گئے۔ ان کے زخم بڑی حد تک ٹھیک ہوگئے تھے۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح چاق


حیدرآباد دکن
آندھرا پردیش
Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)
ایڈیٹر
جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیہ)


آندھرا پردیش
Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)
تذکرہ
ایڈیٹر
جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا
محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کا منظورا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)
جلد (۲۰) نمبر (۱۰)
چند اسالانا آٹھ روپے
شہریور ۱۳۶۹ف سنہ ۱۹۶۰ء جولائی

ہندستانی ادب

حیدرآباد ۲۴ - آندھرا پردیش
ایڈیٹر
جی - ام - خانؒ ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحہ	شکریے کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۳	
۳	غزل	ناخداے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی	۴	
۴	نوجوان بیوہ	ماہر القادری	۵	شہاب
۵	ایک بیوی چاہیے	حمید قادری ذوق	۶	سنگم
۶	آغاز فکر	کاوش بدری	۷	خیال
۷	وفا کا گیت	وفا جالندھری	۷	پیام انقلاب
۸	رباعیات	شفیق بیلائی	۸	
۹	شراب آرزو	ڈاکٹر ماتا پرشاد اسپتالہ زیب بریلوی	۸	
۱۰	ہندستان اور عرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات	قاضی اطہر مبارکپوری	۹	معارف
۱۱	گولکنڈے کے ہیرے	اے - ایس - شام لعل	۱۷	آندھرا پردیش
۱۲	کانگریس راج کی برکات	رتن لال بہار	۲۰	پیام انقلاب
۱۳	علیالم کا ادب	محمد اسحاق ایوبی	۲۱	
۱۴	تسکین خاطر	قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی	۲۳	شمع ادب
۱۵	پشکن اور اس کی شاعری	پروفیسر کراشینن نیکوف	۲۴	مجلس
۱۶	غزل	ارشد انصاری	۳۰	
۱۷	غزل	اختر شیرم بھاگلپوری	۳۰	
۱۸	کتابوں کی باتیں	ڈاکٹر محمد حسین	۳۱	

ہمارے خیالات

لکھنو یونیورسٹی اپنے غلط فیصلوں پر پھر سے غور کرے!

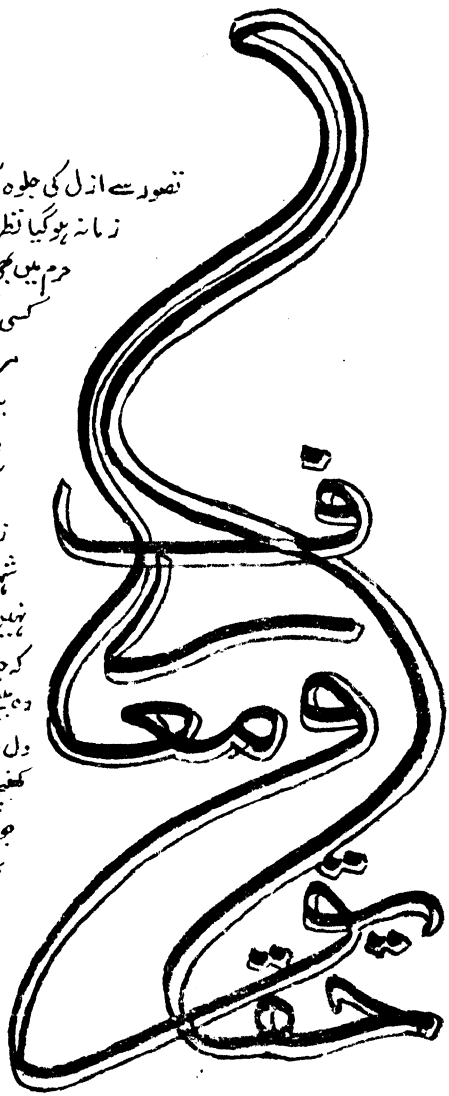
پہلی خبر میں یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکوں کو بے اعتدالیوں سے روکنے کی خاطر، لکھنو یونیورسٹی کورٹ نے یہ فیصلا دیا ہے کہ یونیورسٹی میں شریک ہونے والے ہر طالب علم سے بونڈ لیا جائے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ بعض وقت طالب علم ڈسپلن کی حدوں کو توڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اور یونیورسٹی کے نام میں نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ ہم ایسے برے کاموں کی تائید نہیں کرتے، بلکہ انہیں صفحوں میں، طالب علموں کے ایسے کاموں کی مذمت کی تھی اور انہیں صاحب کردار بننے کی بھی تلقین کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ طالب علموں کی جذباتی حرکتوں کے سبب یونیورسٹی کے کاموں میں کافی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اس سے یونیورسٹی اور طلبا دونوں کا بھاری نقصان ہوتا ہے، اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ طالب علم ہر وقت ڈسپلن کا خیال رکھیں، اور انہیں حدوں میں رہ کر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کریں، اس طریقے میں دونوں ہی کا بھلا ہے۔

طلبا سے بونڈ لکھوانا، پولیس کے محکمے سے کم نہیں۔ محکمہ کا کردار اور بدمعاش افراد سے لیا جاتا ہے۔ محکمہ، بونڈ کا دوسرا نام ہے، جب دونوں برابر ٹھہرے تو پھر یونیورسٹی کے طلبا کے نام پر دھبا آتا ہے۔ بدکرداری وغیرہ کا داغ لگ جاتا ہے، جو طلبا کی پیشانی سے مٹائے سے بھی نہ جائے، اور عمر بھر کلنک کے ٹیکے کا کام کرے گا ـــــ ایسے بدنام طالب علم زندگی کے میدان میں کیا خاک ترقی کر سکتے ہیں ـــــ اس لیے ہم لکھنو یونیورسٹی کے کرتا دھرتاؤں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ ایسی پیداوار کے ذریعے خود یونیورسٹی کو بدنام کرنا چاہتے ہیں؟

اس غلط فیصلے کا افسوس کرتے ابھی ہونٹ خشک نہ ہونے پائے تھے کہ ایک اور بھی غلط خبر، اخباروں میں نظر سے گذری، یعنی یہ کہ لکھنو یونیورسٹی نے یہ فیصلا کیا ہے کہ ۲۵ سال سے زیادا عمر کے طلبا کو لکھنو یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی اجازت نہیں دیجائے گی، بلکہ کسی اور یونیورسٹی میں وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹی کیوں اجازت دے۔ ہندستان کی یونیورسٹیاں سب ہی ایکساں سی ہیں، اس لیے ان سب کا قانون بھی ایکساں ہونا چاہیے۔ ۲۵ سال سے زیادا عمر والے طلبا کے لیے سب ہی یونیورسٹیاں اپنے دروازے بند کر دیں تو پھر یہ طلبا تعلیم کہاں حاصل کریں ـــــ خدا ہی جانے! غور تو کیجیے! کتنا بھونڈا فیصلا ہے یہ! چند ہی مہینے پہلے کی بات ہے کہ ہم نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اس غلط فیصلے کی مذمت کی تھی کہ یونیورسٹیوں میں ۲۶ سال سے کم عمر والے طلبا کو داخلا نہ دیا جائے، اور آج ہمیں لکھنو یونیورسٹی کے اس غلط فیصلے پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے پڑ رہے ہیں کہ ۲۵ سال سے زیادا عمر والے طلبا، اس یونیورسٹی میں تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔

ہم کھلے طور پر کہے دیتے ہیں کہ لکھنو یونیورسٹی کے اوپر کے دونوں ہی فیصلے غلط در غلط ہیں، اس لیے یونیورسٹی کورٹ کو پھر سے غور کر کے ان فیصلوں کو واپس لینا چاہیے، وزارا ایجوکیشن منسٹر حکومت ہندستان کا فرض ہے کہ وہ ان غلط فیصلوں کے ہٹانے کی ضروری تدابیر اختیار کرے

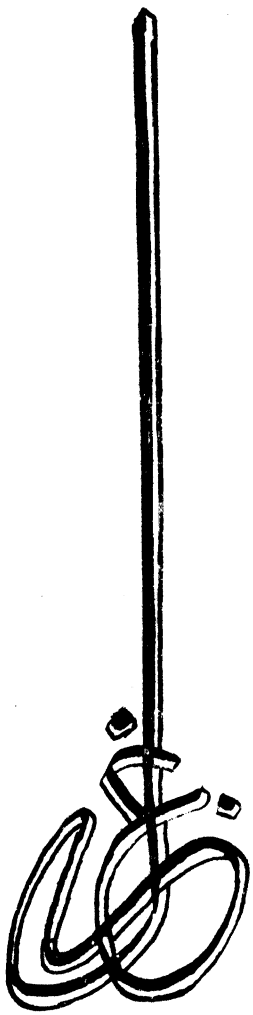


تصور سے ازل کی جلوہ آرائی نہیں جاتی
زمانہ ہو گیا نظروں کی رعنائی نہیں جاتی
حرم میں بھی طبیعت جا کے بہلائی نہیں جاتی
کسی کے آستانے کی جبیں سائی نہیں جاتی
مرے مرنے کا بھی ان کو یقیں اب تک نہیں آتا
یہ عالم ہے کہ خاک قبر تک پائی نہیں جاتی
وہ مسجد ہو کہ میخانہ یہی ہے مشغلہ ہر جا
کہیں بھی میکشوں کی بادہ پیمائی نہیں جاتی
زبان حال سے کہتے ہیں بے گور و کفن لاشے
شہیدان وفا کی لاش دفنائی نہیں جاتی
نہیں ہوتی ہے پوری مدت بیکار قیدی کی
کہ جب تک دو مری زنجیر پہنائی نہیں جاتی
وہ بیٹھے ہیں سرہانے پر مگر ہوش نہیں کیا علاج اس کا
دل درد آشنا کی نا شکیبائی نہیں جاتی
کھنچا نظروں میں ہے نقشہ جمال روئے جاں کا
جو خود کھنچ جائے وہ تصویر کھنچوائی نہیں جاتی
بھٹکتی پھرتی ہے خاک لحد ہر اک بیاباں میں
ترے وحشی کی اب بھی دشت پیمائی نہیں جاتی
گرے ہیں جھوم کر ہم بیخودی میں پاسباتی پر
خرد والوں کی مستی میں بھی دانائی نہیں جاتی
انہیں پہچان لیں گے ہم کہیں بھی وہ ملیں افقرؔ
شناسا سے شناسا کی شناسائی نہیں جاتی

لسان الحقیقت

افقرؔ موہانی

وارثی



ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر

نوح ناروی

لکھتے ہیں وہ خط میں کہ ہم آئیں گے کسی وقت
کیسا یہ کسی وقت جو آئیں تو اسی وقت

وعدہ جو کیا ہے تو وہ ایفا ہو اسی وقت
(ممکن ہے کہ تم قول سے پھر جاؤ کسی وقت)

کیوں منتظر موت رہیں اہل محبت
(مرجانے کو تم کہہ دو تو مرجائیں اسی وقت)

ہر دم ہیں نئے عذر نئے حیلے بہانے
ملتا ہی نہیں وقت انہیں ملنے کا کسی وقت

افسوس کہاں آج وہ ساعت ہے کہاں دن
جہاں مرے گھر میں کوئی کل تھا اسی وقت

اس شوخ کا وعدہ ہے ان الفاظ میں کیا خوب
تخصیص نہیں وقت کی آؤں گا کسی وقت

آغاز بر اعشق کا انجام بھی بد تر
خوش تھے نہ اس وقت نہ ہم خوش ہیں اسی وقت

زندہ نہیں ہونے کے شہیدان محبت
ہیں یاد انہیں بھی، بھول بھی جاؤ گے کسی وقت

تم قتل کے لمحے کو اب آگے نہ بڑھاؤ
دو ٹوک مرا فیصلہ ہو جائے اسی وقت

پہلو میں ہے اب دل کی جگہ ناوک دلدوز
خالی نہیں رہتی مری آغوش کسی وقت

ساقی کا یہ ارشاد کرو زہد سے توبہ
تاکید سی تاکید ہے اس وقت اسی وقت

ہے جذب محبت میں اثر کچھ تو عجب کیا
وہ آئیں کسی رات، کسی روز، کسی وقت

اے نوح سر بزم سخن دیں گے بڑا لطف
ہر وقت یہ الفاظ کسی وقت اسی وقت

نوجوان بیوہ

ماہر القادری

زلف بے ترتیب، کپڑے بھیگے، چہرہ اداس
ایک پژمردہ تمنا، ایک غم انجام آس

پھول سے رخسار کی سرخی میں زردی کی جھلک
ہونٹ کمھلا ہوئے سے شبنم آلودہ پلک

ناخنوں کی کور پر مہندی کے دھندلے سے نشاں
ہاتھ کہتے ہیں ابھی توڑی گئی ہیں چوڑیاں

ہر طرف سے پے در پے بیٹھ کی کاری ناوک
چھن چکی ہیں بجلیاں کانوں کی اور گردن کا ہار

روح بھی غلطاں ہے اس کے دیدۂ خونبار میں
دل کی دھڑکن بھی ہے شامل نفس کی رفتار میں

اک خزاں دیدہ کلی کی طرح مرجھائی ہوئی
سر سے پا تک بیوگی ہی بیوگی چھائی ہوئی

ایک غم کی رات جس کی صبح ہو سکتی نہیں
اک کلی جو اوس سے بھی منہ کو دھو سکتی نہیں

اک بھیانک خواب جس کی خود کشی تعبیر ہے
ایک انساں جو غم و اندوہ کی تصویر ہے

اک جواں امید جو سینہ میں گھٹ کر رہ گئی
اک سہاگن اپنے جیون ساتھی سے چھٹ کر رہ گئی

اک چمن جس پر بہار آتے ہی بجلی آ پڑی
اک مسلسل مرگ، اک پیہم قیامت کی گھڑی

ایک دکھیاری نہیں جس کا کوئی جنم جیسی
ایک لہر کی سحر، جس میں نہیں تابندگی

ایک قصہ جو ابھی پوری طرح گویا نہیں
ایک عورت جس نے دنیا کو ابھی برتا نہیں

ایک شمع آرزو جلتے ہی جو گل ہو گئی
اک صدا جو دل سے اٹھی اور دل میں کھو گئی

ایک نورس پھول جو وقت سحر کھلا گیا
اک جوانی جس پہ دو دن میں بڑھاپا آ گیا

جانتا ہوں تیرے مستقبل کے پیچ و خم کو میں
فطرت گیتی، مزاج ہستیٔ عالم کو میں

مسکراہٹ بھی تیری دنیا کو ہوگی ناگوار
شک میں ڈالے گا جہاں کو تری آنکھوں کا خمار

تجھ سے بیاہی عورتیں ملتے ہوئے کترائیں گی
دور رہ کر تجھ سے ساون کی ملہاریں گائیں گی

تیری پرچھائیں سے دلہن کو بچایا جائے گا
تجھ کو ہر تقریب میں نیچا دکھایا جائے گا

تیرے ہنستے پر اٹھیں گی عورتوں کی انگلیاں
گھور کر دیکھیں گی تجھ کو بن بیاہی لڑکیاں

آرزوؤں پر تری پہرے بٹھا دیے جائیں گے
رنج و غم کے تجھ کو افسانے سنائے جائیں گے

ایک بیوی چاہیے

(مزاحیہ)

حمید قادری ذوقؔ

ایک بیوی چاہیئے اور جلد ہی تر چاہیئے
عمر اس کی بس یہی کچھ سو کے اندر چاہیئے

خوب موٹی، خوب تازی، خوب کالی ہو تو ٹھیک!
یعنی یہ کہ مہہ لقا بہتر سے بہتر چاہیئے

آنکھ چھوٹی، ناک چپٹی، کان بیڑھا، دانت غائب
ہو سکے تو اور بھی کچھ اس سے بڑھ کر چاہیئے

عشوہ و ناز و ادا میں ہو نہ وہ "ٹن ٹن" سے کم
مسخرا پن میں سراپا "جانی واکر" چاہیئے

گر پڑے وہ پیار سے اس جان لاغر پر اگر
جسم کے ہر جوڑ پر سو سو پلستر چاہیئے

مسکرا دے ناز سے تو رو پڑیں ہم خوف سے
اس کی ہر حرکت میں گویا ایک ونڈر چاہیئے

قہقہے سے گونج اٹھے اس کے ساری کائنات
اور رونے کا سلیقہ کچھ نزوں تر چاہیئے

رونا، دھونا، دھول دھپا، طعن و طنز و طشنہ، چیخ چاخ
ہر گھڑی تازہ قیامت اپنے سر پر چاہیئے

گھر میں آتے ہی کرے اپنے پرائے سب سے جنگ
بے وجہ بھی روز سب سے ایک ٹکر چاہیئے

ہو سکے تو وقت بے وقت کر سکے وہ ماریٹ
ایک دم رستم نہیں تو اس کا ہمسر چاہیئے

لکھنا پڑھنا کچھ نہ جانے جھوٹ بولے گپ کرے
لیڈروں کی ساری خوبی اس میں یکسر چاہیئے

خواہ کچھ سمجھے نہ سمجھے، واہ واہ کرتی رہے!
ایک شاعر کے لیے بیوی سخنور چاہیئے

اس کی ہر بھونڈی حماقت پر کریں ہم اس کو پیار
ناز برداری مجھے اس کی برابر چاہیئے

کام دھندے سے جناب کو کوئی رغبت نہ ہو
کھانے پینے کا مگر کچھ ذوق بہتر چاہیئے

یہ سب ہی خوبی اگر ہو میم صاحب میں تو پھر
اور مجھ ناچیز کو کیا اس سے بڑھ کر چاہیئے

ان کو ہر دم بس رہے اپنی سجاوٹ کا خیال
یہ عنایت ان کی مجھ پر زندگی بھر چاہیئے

گھر میں فاقہ ہو تو ہو، لیکن برائے جان من
چوٹی، کنگھی، کریم، اسنو اور پوڈر چاہیئے

ہم اگر دفتر بھی جائیں تو بحکم جاں نواز
ہر قدم پر مجھ کو ان سا ایک رہبر چاہیئے

چلنا، پھرنا، آنا، جانا، سیر سپاٹا سب ختم
سخت پابندی میں اپنی جان مضطر چاہیئے

چائے، سگریٹ، پان، پیڑی سب سے ہم توبہ کریں
شاعری بھی ہم کریں تو ان کا آڈر چاہیئے

ہو اگر منظور سب کچھ، فون پر کریں نکاح
رخصتی بھی جلد تر اور مئی کے اندر چاہیئے

مختصر یہ ہے کہ ہو "بیوی نما" ایک خاص چیز
اس سے زیادہ کچھ نہیں، اے بندہ پرور چاہیئے

آغا فلم کا شاعری

میں نے سوچا تھا تاروں کی بھر میں جگمگاتی ہوئی کوئی رات آئے گی
گنگناتے ہوئے ساز و جام آئیں گے، مسکراتی ہوئی کائنات آئے گی
تیری نوخیز زلفوں میں الجھی ہوئی چاندنی حسن کا نور برسائے گی
تیری خوابیدہ آنکھوں کی آغوش میں میری آنکھوں کو بھی نیند آجائے گی
میرے خوابوں کا عہد وفا تھا غلط، میرے آگے وہی نقش ایام ہے

دیکھتا ہوں پریشان ہیں اوراق دل جن پہ منقوش ہیں کچھ تصویر غم
چہرہ دستی کے مارے یہ گونگے سہی، پھر بھی یہ گوشتے گاتے کراہیں ہیں
ان کے ہاتھوں میں لرزیدہ سازینوں ان کے ہونٹوں پہ آکاتشیں گیت ہے
دیکھنے میں بڑے مضمحل ہیں مگر ایک سے ایک نایاب شہکار ہیں
اور ان شاہکاروں کی ساکت فضا آس کی صبح ہے یاس کی شام ہے

چند تصویر کی نیلگوں آنکھ میں کچھ ادھورے ادھورے سے ارمان ہیں
چند کومل ہتھیلی ہیں درد آشنا، چند جوڑے ہوا سرد کلیاں لیے
گال ہیں نیاز غم رنگ و بو، سرمریں ہات محروم محسوس و فرخ
اچھے اچھے ہونٹوں کے کچھ زاویے، بجھتے بجھتے سے کچھ آنسوؤں سے بھرے
اور کمخواب باندھے ہوئے، پر دیکھتا ہوں تم دست ایام پہ

ہر طرف زخم ہیں روپ دھارے ہوئے زندگی تشنہ درد سے چور ہے
ہر طرف گویا اپنی زندگی، عکس ریز تماشا شاخ جہاں
دیکھتے دیکھتے ساز، اوراق دل، گم ہوئے اس طرح جیسے کچھ بھی نہ تھا
ایک بھٹکتا بھکتا ہوا اٹھ گیا وہ گیا میکدہ میں دھواں ہی دھواں
جانے کیا بات ہے میرے پیش نظر، عرش سے فرش تک ایک کہرام ہے

وفا کا گیت

خدایا زندگی دے مجھ کو ایسی اس زمانے میں
بسر ہو جو کسی مجبور غم کا دکھ مٹانے میں
کروں امداد مظلوم و بیکس کی زمانے میں
کسر باقی نہ چھوڑوں ظلم کی ہستی مٹانے میں
جہاں میں خدمت مظلوم ہو طرز عمل میرا
حیات خود گذاروں دوسروں کے کام آنے میں
نکالوں ذہن انسان سے میں سودہ فساد کو
رہوں ہر دم مگن تعمیر نو کا گیت گانے میں
مثال مہر عالم تاب ہو یہ زندگی میری
رہوں مصروف ہر گمراہ کو رستہ دکھانے میں
کروں کوشش سمجھنے کی کہ خدمت ہی عبادت ہے
ہر اک لمحہ گذاروں مقصد ہستی کو پانے میں
روا داری کروں پیدا ہر اک انسان کے دل میں
بنوں میں رہنما اخلاص کا پرچم اٹھانے میں
کروں پیدا دلوں میں روشنی امید کی یکسر
رہوں مشغول میں تاریکی حسرت مٹانے میں
عداوت کو کروں میں دور ہر ممکن طریقے سے
رہوں کوشاں محبت کا سماں میں بنانے میں
بنا جوش عمل پیدا کرے جو سردہ روحوں میں
کچھ ایسی دلکشی ہو میری ہستی کے فسانے میں
بھروں انسانیت کی روح ہر نہر و ستانی میں
رہوں ہمدرد ہر لحظہ وفا کا گیت گانے میں

وفا جالندھری

رباعیات

جب خواب سے وہ مست خود آرا جاگا
خوابیدہ چمن کا ہر نظارا جاگا
پھول اس نے جو توڑے تو کہا پھولوں نے
صد شکر نصیب آج ہمارا جاگا

شفیق

کچھ بھی نہیں یہ نقش و نگار ہستی
نظروں کا فریب ہے بہار ہستی
روشن ہے جہاں آج شبستان وجود
بن جائے گا کل وہیں مزار ہستی

میناؔئی

ناظر ہو تو حاصل نظر بھی دیکھو
گلشن کو بعنوان دگر بھی دیکھو
کیا محو ہو غنچے کے تبسم میں شفیقؔ
غنچہ کا ذرا زخم جگر بھی دیکھو

امید کا تابندہ ستارا دل ہے
مفہوم حیات کا سہارا دل ہے
نازک ہے بہت حسن کی فطرت بھی شفیقؔ
نازک مگر اس سے بھی ہمارا دل ہے

اس محفل رنگ و بو میں شامل غم ہے
ہر خندۂ گل صوت عنادل غم ہے
اللہ رے افسانۂ ہستی کا فریب
عنوان خوشی ہے اور حاصل غم ہے

شراب آرزو

مذاق جستجو قائم تمہاری جستجو تک ہے
خزاں کی پردہ داری تو کلی کی آبرو تک ہے
تری آنکھوں کے ساغر میں مرے دل کا لہو تک ہے
بہار شام گلشن میں قیام رنگ و بو تک ہے
کلی کی مسکراہٹ میں پیام رنگ و بو تک ہے
محبت کا فسانہ درفسانہ ختم کیونکر ہو
مئے عرفان ہستی عدو جب تک سرشار کرتی ہے
نماز بے نیازی تیرے دیوانے ہی پڑھتے ہیں
جبین آستاں خم ہے پئے تعظیم خود داری
محبت پردہ دار حسن کی ہی پردہ داری ہے
نیاز زندگی سے بے نیاز آرزو ہو جا
قلم کو شاعر جادو اثر مضبوط کر ورنہ
میں ہر منزل پہ پہنچوں گا میں ہر منزل سے لوٹوں گا
میں کیا آئینہ کر پاؤں گا آگے ساری تیرکے

محبت کی حد آخر تمہاری آرزو تک ہے
بہار گل کا ہنگامہ نشاط رنگ و بو تک ہے
شراب کیف میں شامل شراب آرزو تک ہے
سحر کی تازگی میں رنگ و فیض نمو تک ہے
شگفت گل کی مسرتی میں بہاروں کا لہو تک ہے
ہماری گفتگو آخر تمہاری گفتگو تک ہے
شراب زندگی ساقی فقط جام و سبو تک ہے
نماز ہوشمندی آج بھی رسم وضو تک ہے
دل خود دار کے سجدوں کی عظمت قبلہ رو تک ہے
جنوں کی پاکدامانی گریباں کے رفو تک ہے
فریب زندگی شاید فریب آرزو تک ہے
ترنم کی یہ رنگینی لگ ساز گلو تک ہے
قفس میری نہ منزل کا تمہاری جستجو تک ہے
مری عرض تمنا دوست تیرے روبرو تک ہے

ڈاکٹر مانا رستاری
اسمہانہ
کنیڈا

پہلی قسط

ہندستان اور عرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات

قاضی اطہر مبارکپوری ایڈیٹر "البلاغ"

۱۶ شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں ایک علم دوست عرب صحافی الاستاذ احمد زید الیمانی کے توسط سے پانچویں صدی ہجری کے ایک ثقافتی عالم اور مورخ قاضی رشید ابن زبیر کی کتاب "الذخائر والتحف" دیکھنے کا موقع ملا، جسے حال ہی میں حکومت کویت کے "دائرۃ المطبوعات والنشر" نے مطبعہ حکومۃ الکویت" میں نہایت اہتمام سے چھاپ کر شایع کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کو ابھی چند مہینے ہوئے ہیں، اس لیے عجب نہیں کہ جو نسخے ہمارے پیش نظر ہے، وہ ہندستان میں اس کا پہلا نسخہ ہو۔

گذشتہ سال مستشرقین کی کانفرنس نے پہلی بار اعتراف کیا تھا کہ اب عرب ممالک سے بھی علمی نوادر کی اشاعت ہو رہی ہے، اس میں مصر کا پہلا نمبر ہے، سعودی حکومت بھی نایاب و نادر کتابیں شایع کرتی ہے، مگر اس کا دایرا کتاب و سنت سے متعلق کتابوں تک محدود ہے، جو بجائے خود ایک اہم ترین خدمت ہے، شام کا ادارہ "المجمع العلمی" بھی مفید کام انجام دے رہا ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ اب خلیج فارس کی بعض امارتوں اور حکومتوں کو بھی اس طرف توجہ ہوئی ہے، اور وہ علمی کاموں میں دلچسپی لینے لگی ہیں۔ خصوصاً قطر اور کویت کی ریاستوں میں اس کا ذوق بہت زیادہ ہے، کچھ دنوں قبل کویت میں عرب ادبا اور مصنفین کی ایک کانفرنس بھی ہوئی تھی، اور وہاں کی حکومت نے حال ہی میں جدید قسم کا بہت بڑا پریس بھی اپنے یہاں قایم کیا ہے، کتاب "الذخائر والتحف" اسی پریس میں چھپی ہے، اور دائرۃ المطبوعات والنشر کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

اس کتاب کو محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی نے تصحیح اور ترتیب کا شرف حاصل ہے اور اس کے مقدمہ نگار ڈاکٹر صلاح الدین المنجد ہیں، یہ کتاب شروع کے ۲۵ صفحات کے علاوہ جن میں مقدمات وغیرہ ہیں، بڑے سایز کے ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں مختلف قسم کی فہرستیں بھی شامل ہیں، ہر صفحے میں عموماً ۱۸ سطریں ہیں، فہرست کے بعد ۶ تصاویر ہیں جن میں سے اکثر قاطمی دور کے تمدن و حضارت کا نمونا ہیں، ہر ورق پر ایک تصویر ہے۔

مقدمہ ۶ میں ایک صفحے پر "فاتحۃ السلسلہ" کے عنوان سے "رئیس دائرۃ المطبوعات والنشر" کویت کے معروضات ہیں، صفحہ ۵ سے صفحہ ۸ تک تصدیر کے عنوان سے استاذ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کے معروضات ہیں، موصوف نے اس میں دل کھول کر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف اور ان کی علمی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے، اور "دائرۃ المطبوعات والنشر" کویت کی اہمیت و ضرورت اور کتاب "الذخائر والتحف" کی افادیت کو بیان کیا ہے۔

اس کے بعد صفحہ ۹ سے صفحہ ۲۴ تک ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا پر مغز مقدمہ ہے، جس میں موصوف نے قاضی رشید بن زبیر کے حالات تحریر کیے ہیں، چونکہ ڈاکٹر صاحب کو ان کا مفصل تذکرہ کہیں نہیں مل سکا، اس لیے کتاب الذخائر والتحف کے مختلف مقامات سے مصنف کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو نہایت مختصر اور نامکمل ہے، چند دن ہوئے راقم الحروف کی پروفیسر مولانا عبد العزیز میمن راجکوٹی سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا تذکرہ آیا، تو موصوف نے فرمایا کہ قاضی رشید بن زبیر کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ کتابوں میں موجود ہیں، اور ان کی کئی کتابیں اس کے علاوہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ قاضی رشید کی کتاب "الذخائر والتحف" کا صرف ایک قلمی نسخہ ترکی میں، آیون قرہ حصار کے کتب خانے میں موجود تھا، جس میں اصل کتاب کے ساتھ امیر شہاب الدین احمد ابن عبداللہ بن حسن اوحدی مقری شافعی ۸۱۱ھ کے مختارات و زیادات بھی شامل ہیں، اور اصل کتاب کا قلمی نسخہ صرف ۵۸ اوراق میں ہے، پھر نئے سر سے صفحہ ایک پر "مقدمۃ المؤلف" کے عنوان سے قاضی رشید بن زبیر کا مقدمہ ہے، جس سے پوری کتاب کے مضامین کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، رب یسر وأعن یا کریم، ھذا کتاب فیہ ذکر المحل ایا والتحف العظیمۃ الاعلی اس والنفقات فی الولائم والدعوت والاعذ اس ات والحذ اقات والایام المشھورۃ والاجتماعات فی الاوقات المحمودۃ، وغرائب الموجودات، والذخائر المصونات الموجودات بعد الوفیات، والمغانم والفتوحات والکنوز والدلائل فائق والنفقات، وما اخرج من خزائن قصر الامام المستنصر باللہ فی ایام الفتنہ فی سنتین وسنۃ احدی وستین وار بع مأیۃ۔

پوری کتاب میں یہ ابواب ہیں جن سے کتاب کے بارے میں تحقیق اور مضامین کا تفصیلی علم ہو جاتا ہے۔

۱۔ باب المحل ایا ۔ ص ۲ تا ص ۸۷

۲۔ باب النفقات فی الولائم المشھورۃ والدعوات المذکورۃ۔ ص ۸۸ تا ص ۱۱۰۔

۳۔ باب الاعذ اس ات الموصوفۃ والحذ اقات المعروفۃ۔ ص ۱۱۱ تا ص ۱۲۵۔

۴۔ باب الایام المشھورۃ والاجتماعات فی الاوقات المحمودۃ، والمحافل المشھورۃ ص ۱۲۷ تا ص ۱۵۳۔

۵۔ باب الغرائب الموجودات والذخائر المصونات۔ ص ۱۵۵ تا ص ۱۹۹۔

۶۔ التزکر الموروثات۔ ص ۱۲۷ تا ۱۵۳۔

۷۔ ماخلفہ امھات الخلفاء وذوی وھن۔ ص ۲۳۵ تا ص ۲۴۳۔

۸۔ باب المغانم فی الفتوحات والمقاسم فی الغزوات۔ ص ۲۴۵ تا ص ۳۴۶۔

۹۔ باب ذکر الکنوز والدلائن والمطالب القدیمۃ وذکر من دفن لھا۔ ص ۳۴۷ تا ص ۳۴۸۔

۱۰۔ باب النفقات۔ ص ۳۴۹ تا غالباً ص ۲۷۶۔ (افسوس کہ ہمارے پیش نظر نسخے میں آخر کے ۱۶ صفحے غائب ہیں اور ان کی جگہ درمیان کے صفحے ۱۰۳ تا ۱۱۸ مکرر لگ گئے ہیں، اور ان ہی غائب صفحوں میں "فہرست الاسما" کا ایک آدھ ورق بھی داخل ہے۔)

قاضی رشید بن زبیر کے تعلقات مسلم حکمرانوں سے رہے تھے۔ اور بعض کے یہاں اچھے منصب پر فائز بھی، اس لیے انہوں نے اس کتاب میں بہت سے چشم دید واقعات اور معتبر راویوں کے زبانی بیانات درج کیے ہیں، اور شاہی کاغذات اور تمسکات سے بھی استفادہ کیا ہے، اور اعداد و شمار میں بڑی احتیاط کی ہے، پھر بھی کہیں کہیں (دوسرے) حکمرانوں کے ناموں میں غلطی ہو گئی ہے۔ پرانے واقعات اور اعداد و شمار میں انہوں نے قدما کے کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، چنانچہ صفحہ ۱۶۶ پر واقدی کی کتاب "اخبار فتوح بلاد السند" کے حوالے سے سندھ کا واقعہ درج کیا ہے۔ واقدی کا سنہ وفات ۲۰۷ھ ہے۔ اس بیان کی روح سے سند کی اسلامی تاریخ پر ہمارے علم میں یہ پہلی کتاب ہے، حالانکہ ابن ندیم و خلیفہ بن خیاط و واقدی کی

تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، قاضی رشید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پانچویں صدی ہجری تک پائی جاتی تھی۔ نیچے کی کتابوں سے جگہ جگہ استفادا کیا ہے، اور ان کا حوالا دیا ہے۔

کتاب الاجواد للعلائی، کتاب التاریخ لابی محمد فرغانی، سیرۃ المکتفی باللہ، ذیل کتاب بغداد لعبید اللہ بن ابی طاہر طیفور، کتاب الاحجار ارسطو، طبقات الشعراء ابن جدار مصری، السیرۃ فی الدولۃ العلویۃ لعبد عبداللہ بن الندیم، کتاب الاوراق للصولی، کتاب الفتوح، السمومات و دفع مضارہا یحیی بن بطریق، کتاب الوزراء لمحمد بن داؤد بن جرح طیفا ابن سعد، اخبار الخلفاء للحارث بن ابی شامتہ، فضائل مصر لابن جدار، مناقب الوزراء لابی الفتح المسطوق، التاریخ لثابت بن سنان، کتاب الاموال لابی عبید القاسم بن سلام، ان کے علاوا طبری، بلاذری، مصعب زبیری، اور دوسرے مورخین و رواۃ کے حوالوں سے واقعات درج کیے ہیں۔

اس طرح کتاب الذخائر والتحف از اسلام سے لے کر سنہ ۴۶۱ھ تک کے خاص حالات اور واقعات کے لیے ایک نادر و نایاب دستاویز ہے۔ جس میں عہد رسالت سے خلیفا مستنصر باللہ تک مسلمانوں کے تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی معاملات و قضایا کی تفصیل اور ہزاروں لاکھوں صفحات میں بکھرے ہوئے معلومات ایکجا مل جاتے ہیں۔

اس میں مسلمانوں کے اقوام عالم کے سیاسی، علمی اور تہذیبی تعلقات، مکاتیب اور رسایل، مواثیق و معاہدات، ان کی تقریبات و اجتماعات، ولیمے، زفاف، ختم قرآن، ختنے اور دوسری تقریبات کی دعوتوں، کھانوں کی قسموں کے بارے میں عجیب و غریب معلومات ہیں، اور ذاتی املاک، قومی اور سرکاری مالیات، تحفے، ہدایا، وظیفے اور خزانوں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ اس طرح بہت سے ثقافتی و تمدنی الفاظ و اصطلاحات، اور چیزوں کے اسما اور طریق استعمال کی تفصیل بھی ہے، اس لیے معرب و دخیل الفاظ کا ایک خزانا اس کتاب میں موجود ہے۔

اس مضمون میں ہم نے اس نادر و موثق دستاویز سے عرب اور ہندستان کے درمیان قدیم دینی، علمی اور ثقافتی تعلقات کے واقعات چن کر پیش کیے ہیں جو دوسری کتابوں میں بہت ہی کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کتاب سے ہندستان اور عرب کے قدیم تعلقات کے بہت سے مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اور جن کا علم ہم کو پہلی بار ہوا ہے، اس مضمون میں امکان بھر اصل عبارتیں مع ترجمہ نقل کر دی ہیں۔

حضرت معاویہ کی خدمت میں شاہ چین کا خط اور علمی ہدیا

قاضی رشید بن زبیر کتاب الذخائر والتحف میں لکھتے ہیں کہ چین کے بادشاہ نے حضرت معاویہ بن ابوسفیان کے نام حسب ذیل مکتوب روانا کیا۔

من ملک الاملاک الذی تخدمہ
بنات الف ملک، والذی منبت مرارۃ
بلبن الذھب، والذی فی مربطہ الف
فیل، والذی لہ عینان یستقیان
الوحوح والکافور، والذی یرحل رائحہ
من عشرین میلا، الی ملک العرب
الذی یتعبد اللہ ولا یشرک بہ شیئا،

اس شہنشاہ کی طرف سے جس کے اوصاف یہ ہیں، ہزار بادشاہوں کی بیٹیاں اس کی خادما ہیں، اس کا محل سونے کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے، اس کے اصطبل میں ایک ہزار ہاتھی ہیں اس کے ملک میں دو دریا ہیں جو عود اور کافور کو سیراب کرتے ہیں، اس کی خوشبو بیس میل دور سے محسوس ہوتی ہے۔ عرب کے بادشاہ کے نام جو حرف

اما بعد فانی قد ارسلت الیک
هدیته ولیست بهدیته (ص) و
لکنها تحفة، فابعث الی بما جاءه
بینکم من حرام وحلال وابعث
الی من ینبه لی و السلام

اللہ کی عبادت کرتا ہے، اور کسی کو اس کا شریک نہیں
ٹھہراتا۔ اس کے بعد معلوم ہو کہ میں آپکی خدمت میں ہدیا
روانا کر رہا ہوں بلکہ ہدیا نہیں تحفا ہے، آپ میرے
پاس حرام حلال کی تفصیل روانا کیجیے جو آپکے نبی لائے
ہیں، اور اپنا ایک ایسا آدمی بھیجے جو اسکی وضاحت کر سکے۔ والسلام

بہرحال ہدیا ایک کتاب کی شکل میں تھا جس میں اہل چین کے علمی اسرار و حکم کا بیان تھا، کہا جاتا ہے کہ بعد میں یہ کتاب خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاتھ لگی، جس سے وہ کیمیا گری کے بڑے بڑے کام لیتا تھا۔ (ص ۱)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور چین کے علمی و دینی اور ثقافتی تعلقات حضرت معاویہ کے زمانے ہی میں استوار ہو گئے تھے۔ اور علمی کتابوں اور دینی حلومات سے افادہ اور استفادہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے اس قسم کا تعلق پیدا کرنے کی تحریک خود شاہ چین کی طرف سے ہوئی۔ اور اس نے مسلمانوں کے خلیفہ اور امیر کو موحد اور خدا پرست کی صفت سے یاد کیا، اور خدا اپنی صفات میں اس زمانے کی رسم کے مطابق ذاتی اور خاندانی مفاخر کو شمار کرایا، اس مکتوب پر غور کرنے سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور مسلمانوں کے غیر اقوام سے تعلقات کی نوعیت سامنے آتی ہے، اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چینی زبان کی کتاب کا ترجمہ حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں ہوا، اور چین میں عربی جاننے والا کوئی ماہر موجود تھا۔

خلیفہ مامون کی خدمت میں بنگال کے راجا رہمی کا نیاز مندانہ خط اور گرانقدر تحفے اور ہدایا

ہندوستان (بنگال) کے راجا دہمی (رہمی) نے خلیفہ مامون کی خدمت میں (ص ۲۱) یہ خط اور اس کے ساتھ ہدیا بھیجا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من رهمی ملک الصنم العظیم الذی کان
المشرق، وصاحب بیت الذهب،
والذی کان الیاقوت، وفرش القری
الذی قصره مبنی من العود والوطب
الذی اذا اختم علیه قبل الصورة
قبول الشمع والذی توجد رائحة
قصره من عشرة فراسخ، والذی
فی خزائنه الف تاج من الجواهر لالف
اب کانوا له ذهبوا والذی یسجد
له امام البیت الاکبر الذی وزنه
الف الف مثقال من الذهب و
علیه الف حجر من الیاقوت الاحمر

ہندوستان کے راجا دہمی (رہمی) کی طرف سے
جس کے اوصاف یہ ہیں، وہ مشرق کا زبردست
حکمران ہے، اس کے پاس سونے کا محل، یاقوت
کے ستون اور موتیوں کے فرش ہیں۔ اس کا محل
ایسے تر و تازہ اعود سے بنایا گیا ہے کہ جب اس پر
مہر کی جاتی ہے تو موم کی طرح نقش قبول کر لیتا
ہے، اس کے محل کی خوشبو دس فرسنگ محسوس
ہوتی ہے، اس کے خزانے میں جواہر کے ہزاروں
تاج ہیں جو اس کے خاندان کے ہزاروں بادشاہوں
کے ہیں۔ اس کے سامنے سب سے بڑے بت کا
پجاری سجدا کرتا ہے، اس بت کا وزن ایک لاکھ
مثقال سونے کے برابر ہے، اور اس میں ایک بڑا

والاس الابیض والذی یرکب فی یوم السعادۃ وعلی راسہ التاج فی الف موکب کل موکب لہ رایۃ مکللۃ بالدر والجوھر تحتھا الف فارس معلمین بالحریر والذھب والذی ربط الف فیل ابیض خزائمھا من الذھب والذی یاکل فی صحائف الجواھر علی موائد الدر المنضود والذی یستحیی من اللہ ان یراہ خائنا لہ فی رعیتہ بعد ان استکفاہ الامانۃ والریاسۃ علی اھل مملکتہ امابعد فانہ لم یذھب علینا ان ھا انتم ھؤلاء من خرکم ما ایھا الاخ فیما انتسبنا الیہ من الشرف وعلو الحال غیر طائل، ونحن والحمد للہ کما کان الاولی بنا ان نبتدئ بذکر اللہ تعالی نحن (ص۲۳) اسمہ غیر انا اجللناہ ان نبتدئ بذکرک لا لانی مواضع المناجاۃ لہ عابدین وراجیا رحمتہ ترجو علینا بفضیلتک فی العلم لم نجد لھا نظیرا من اشکالک ونحن مشارکوک فی الرغبۃ والمحبۃ والف افتتحنا باب المکاتبۃ وطلب الفائدۃ بان اھدینا الیک کتابا ترجمتہ صفوۃ الاذھان والتصفح لہ یشتمل علی صواب التسمیۃ ولجئنا الیک لطفا بنفسک وما وقع منا موقع الاستحسان لہ فان کان فمن قبلک، ونحن نسئلک ایھا الاخ ان توسع اخاک عذرا فی التقصیر

یاقوت، مرغ اور سفید موتی جڑے ہیں، اور تخت نشینی کے دن جب سوار ہو کر نکلتا ہے تو اس کے سر پر تاج اور اس کے جلو میں ایک ہزار دستے ہوتے ہیں، جن کی سواری کا جانور موتیوں سے سجایا ہوتا ہے، اور ہر سواری کے جلو میں ایک ہزار گھڑ سوار ہوتے ہیں جو ریشم اور سونے سے مزین ہوتے ہیں۔ اس کے اصطبل میں ایک ہزار سفید ہاتھی ہیں، جن کے چھلے سونے کی رسیوں کے ہیں، وہ جواہر کی رکابیوں میں موتیوں کے دسترخوان پر کھانا کھاتا ہے، اور اللہ سے شرم کرتا ہے کہ اللہ اسے رعایا کے بارے میں خائن دیکھے اور اس کو اہل مملکت پر امانت و ریاست دینے کے بعد نااہل پائے۔

اس کے بعد اے بھائی! ہم بھی اس بات سے واقف ہیں کہ ہم نے اوپر اپنی جو تعریف توصیف کی ہے وہ زائل ہونے والی اور بے فائدہ ہے، اور ہمیں چاہیے تھا کہ اس خط کو ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع کرتے، مگر ہم عبادت اور دعا کے موقع کے علاوہ اس کے ذکر سے ابتدا کرنے کو بہت بڑی جسارت کرتے ہیں، اسی لیے ہم نے اس کے نام سے یہ خط شروع نہیں کیا۔ علم میں آپ کی برتری کی خبریں ہمارے پاس آتی رہتی ہیں، ہم نے آپ جیسے کسی حکمران میں یہ علمی فضیلت نہیں پائی، ہم بھی دوستی اور تعلقات میں آپ کے شریک ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے خط کتابت اور استفادے کا دروازا اس طرح کھولا ہے کہ ایک کتاب کا ترجمہ بنام "صفوۃ الاذہان" آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہو جائے گا کہ اس کا یہ نام بالکل صحیح ہے، اس کے علاوہ میں نے آپ کی خدمت میں

انشاء اللہ ..... اور عمدا چیزیں جو ہم کو مناسب اور بہتر نظر آئیں بھیجی ہیں۔ یہ چیزیں اگرچہ آپ کے مقام اور رتبے کے اعتبار سے بہت معمولی ہیں، مگر اے برادر! ہم آپ سے ان کے قبول کرنے اور اپنی تقصیر پر معذرت قبول کرنے کے امیدوار ہیں۔

ہندستان کے بادشاہ نے اس خط کے ہمراہ خلیفہ مامون کی خدمت میں جو ہدیہ بھیجا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ یاقوت سرخ کا ایک جام جو ایک بالشت چوڑا، ایک انگل دبیز اور موتیوں سے بھرا ہوا تھا، ہر موتی کا وزن ایک مثقال تھا، کل موتیوں کی تعداد ایک سو تھی۔

۲۔ ایک فرش اس سانپ کے چمڑے کا جو وادی مہراج (سماترا) میں پایا جاتا تھا اور ہاتی کو نگل جاتا ہے۔ اس فرش کی خاصیت ہے کہ جو شخص اس پر بیٹھ جاتا ہے، اسے سل کی بیماری کا ڈر نہیں رہتا، اور سل کا مریض سات دن اس پر بیٹھ جائے تو اس کا مرض جاتا رہتا ہے۔

۳۔ چھینٹ کے کپڑے، جن میں بہترین چھینٹ وہ تھی، جس میں درہم کے برابر گول بوٹیاں تھیں، ان کے بیچ میں سفید زرد و تری کا کام تھا، جس میں موتی ٹکے ہوئے تھے۔

۴۔ تین مصلے، جن کے ساتھ گاؤ تکیے بھی تھے، یہ گاؤ تکیے صندل نامی پیڑ کے برسے بنے ہوئے تھے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آگ میں ڈالنے سے بھی نہیں جلتے۔

۵۔ تازا عود ایک لاکھ مثقال، جو اس قدر نرم تھی کہ جب اس پر مہر لگائی جاتی تھی تو مہر کا نشان پڑ جاتا تھا۔

۶۔ ۳۳ سیر کافور کی ڈلیاں، ہر ڈلی پستے کی وضع کی اور بادام سے بڑی تھی۔

۷۔ ایک سندی باندی، جس کا قدرست ذرعدا کا تھا۔ وہ جب چلتی تھی تو سر کے بال زمین پر گھسٹتے تھے، بڑی حسین و جمیل تھی۔ اس کے چار چوٹیاں تھیں، دو سر کے اوپر تاج کی طرح رہتی تھیں۔ دو پیچھے کی جانب زمین تک لٹکتی تھیں، بھویں ایک انگل لمبی تھیں، دانتوں کی سفیدی سے گویا بجلی چمکتی تھی۔

یہ خط کاغذی نامی درخت کی چھال پر لکھا ہوا تھا جو ہندستان میں اگتا ہے، اس کی چھال کاغذ اور قرطاس سے بہتر ہوتی ہے، اس کا رنگ زردی مایل ہوتا ہے، خط لاجوردی رنگ کی روشنائی سے لکھا گیا تھا، اور سونے کے پانی کے کام سے مزین تھا۔ (ص ۲۵)

فاضل محقق نے درھمی بالمال کے بارے میں جو کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے، حالانکہ حاشیے میں چند رائیں نقل کی ہیں، اصل میں یہ درھمی نہیں رہمی بالراء ہے، جیسا کہ سلیمان تاجر، ابن خرداذبہ اور مسعودی وغیرہ نے تصریح کی ہے، اور یہ راجا بنگال کا تھا، جیسا کہ ان ہی مورخوں کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا علاقا وادی مہراج کی وجہ سے سماترا یا سندی باندی کی وجہ سے سندبیان کرنا خلاف تصریح اور بے محل ہے۔

بنگال کے راجا رہمی کے نام خلیفہ مامون کا خط اور ہدایا و تحایف

بنگال کے راجا رہمی کے خط کا جواب خلیفہ مامون نے اس طرح پر دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
من عبد اللہ المامون باللہ امیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم
امیر المومنین عبد اللہ المامون کی طرف سے

المومنین، الذی وھب اللہ لہ و
بائہ الشرف بابن عمہ النبی المرسل
صلی اللہ علیہ و سلم (ص۲۵) و علی
آلہ و التصدیق بالکتاب المنزل
الی ذھمی ملک الھند و عظیم من
تحت یدیہ من امم الکنۃ الھند و ارکان
المشرق، سلام علیک فانی احمد اللہ علیک
اللہ الذی لا الہ الا ھو و اسالہ
ان یصلی علی محمد عبدہ و رسولہ
صلی اللہ علیہ و سلم و صل کتابک
فسرت بک بالمحبۃ التی ذکرت
و رفع اتحافک ایانا الموقع الذی
املت من قبول ذالک و کنت علی
ما ابتدات بہ من البر محمودا
موجبا ذالک الی الشکر علیہ و
حسن الذکر لہ، ان السنۃ جاریۃ
بترک تقدیم من لم یکن لنا علی
الشریعۃ من الیاد بما آخذ اما
ترکنا ما یحسن من مبرتک بالتقدم
و الاعتداد بما ذکرنا ہ اھل
التقدیم یمین و انت لہ منا اھل
و قبل اھلون بنا الیک مودتنا لک
و ھی ان نوحظ المتواصلین و اھلینا
الیک کتابا ترجمتہ "دیوان الالباب
بستان نوادر العقول" و مطالعتک
ترجمتہ تحقق عندک فضیلۃ النحلۃ
و منتاھل تک لہ تحقق عندک ما
اسمینا بہ و جعلنا لک عنوانا
من (ص۲۶) المعلن بہ و ھو یطفئ
استقللنا قدرھا لک و لو کانت

کی ذات کو اور جس کے آبا اجداد کو اللہ تعالیٰ نے
اس کے چچازاد بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
سلم پر ایمان لانے اور کتاب اللہ کی تصدیق
کرنے سے عزت و شرافت بخشی ہے، ہندستان
کے راجاؤں کے نام جو ہندستان اور یورپ کے
ماتحت راجاؤں میں سب سے بڑا ہے، تم پر سلام
ہو اور میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں
جو وحدہ لاشریک ہے۔ اور اللہ سے التجا
کرتا ہوں کہ وہ اپنے بندے اور اپنے رسول محمد
صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل فرمائے،
تمہارا خط ملا، جن تمنوں کا تم نے ذکر کیا
ہے، ان سے میں بہت خوش ہوا، اور ہمیں تم نے
جس بات سے ہدیا اور تحفا بھیجا تھا ویسے ہم
نے اس کو قبول کیا۔ اچھی بات کی ابتدا کرنے
کی وجہ سے تم قابل تعریف ہو، اس کا شکریا ادا
کرنا اور اسے یاد رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے،
ہمارا طریقہ یہ ہے کہ جو ہماری شریعت کو نہیں
قبول کرتا ہے اور اس سے اس کو تعلق نہیں ہوتا
ہے ہم اس کی تعظیم و تقدیم کے لیے شرعی الفاظ
اور محاورات استعمال نہیں کرتے، اگر یہ بات
نہ ہوتی تو ہم تمہاری تعظیم و تکریم میں کمی نہ کرتے،
اور یہ عذر کرنا بھی ہماری طرف سے تعظیم ہی ہے،
اور تم اس کے اہل ہو، ہم نے تمہارے پاس اپنی
محبت کا ہدیا بھیجا ہے، جو دو دوستوں کے درمیان
سب سے بڑا تحفا ہے۔ تمہارے پاس ایک کتاب
عربی سے ترجمہ کرکے بھیجی ہے، جس کا نام "دیوان
الالباب و بستان نوادر العقول" ہے، اس کے
مطالعے سے اس اہم نعمت کی قدر تم کو معلوم
ہوگی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کتاب کا نام
بلکل درست ہے، اور ہم نے اس محبت و تعلق کا

الملوك تتفاوتي على اقدار همما	کا سزا ما عدا عمدہ چیزوں کا ہدیا بنایا ہے،
اتسعت لذلك خزائنها، وانما يجري	جو ہمارے نزدیک تمہاری اس شان سے کم
ذلك بينها على قدر ما يميل له على	درجے کا ہے، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اگر سلاطین
حسن النية وجميل الطوية ف	اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تحفے اور ہدیے کا
بالله التوفيق	باہمی معاملا کریں تو اس کے لیے ان کے خزانے
.....	بھی کافی نہ ہوں گے، اس لیے یہ چیز صرف اسی
.....	قدر ہوتی ہے جس سے باہمی تعلق اور جانبین
.....	کا حسن نیت ظاہر ہو جائے، اور اللہ ہی سے
.....	توفیق ہے۔

خلیفا مامون نے بنگالہ کے راجا دھی کے پاس اس خط کے ہمراہ جو ہدیا بھیجا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ایک گھوڑا جس شہسوار اور سامان شہسواری جو عقیق کا بنا ہوا تھا، اور ایک روایت کی رو سے گھوڑا عنبر شہب شجری کا تھا۔

۲۔ سیاہ و سپید مونگے کا ایک خوان (کھانے کی چوکی) جس کی زمین سپید تھی، اور اس میں سیاہ، سرخ اور سبز رنگ کی دھاریاں تھیں، خوان تین بالشت چوڑا اور دو انگل موٹا تھا، اس کے پائے سونے کے تھے۔ یہ خوان ان نوادر میں سے تھا جو بنو عباس کو مروان بن محمد حجدی کے خزانے سے ملے تھے۔

۳۔ کپڑوں کی پانچ قسمیں (گانٹھیں) ہر قسم میں نیچے کے ملکوں کے سو سو کپڑے تھے۔ مصر کے سفید کپڑے، سوس کے ریشمی کپڑے، یمن اور اسکندریا کی چھینٹیں، ملمع خراسانی، دیباج خراسانی، فرش قہرنز، فرش طبری، فرش سوسنجری، جبرا کے ایک سو ریشمی گدے مع تکیوں کے اور سوس کے ریشمی فرش۔

۴۔ فرعونی شیشے کا ایک جام، جو ایک انگل دبیز اور ڈیڑھ بالشت چوڑا، اس کے وسط میں دانت نکالے ہوئے ایک شیر تھا، جس کے سامنے ایک آدمی گھٹنوں کے بل بیٹھا تیر کمان سے شیر کی طرف نشانا لگائے ہوئے تھا۔ یہ جام بھی خوان کی طرح ان ہی چیزوں میں سے تھا جو مروان بن محمد کے خزانے سے ملی تھیں۔ خلیفا مامون کا یہ خط ایک لمبے صحیفے میں دونوں جانب لکھا گیا تھا، اور ایک انگل بلی تھا۔ (دمشق)۔ قاضی رشید بن زبیر نے آگے چل کر اس خوان اور جام کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ دونوں

والی سند جنید کے توسط سے خلیفۂ شام کی خدمت میں ہندستان کے ایک راجا کا طلسمی تحفہ

مدائنی نے ذکر کیا ہے کہ ہندستان کے راجا نے خلیفا ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں جنید بن عبدالرحمٰن کے جب وہ سند کے والی تھے، جواہرات سے مرصع ایک اونٹنی بھیجی، اس کے نتھنوں میں موتی اور گردن میں یاقوت سرخ بھرے ہوئے تھے، یہ اونٹنی چاندی کی ایک گاڑی پر تھی، جب وہ زمین پر رکھ دی جاتی تو خود بخود حرکت کرنے لگتی، جنید نے یہ ہدیا ہشام کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے بہت پسند کیا، جو آدمی اس کو لیکر آیا تھا، اس نے اس کے نتھنوں میں سوراخ کیا تو اس کے اندر کے تمام موتی سونے کے ایک ڈبے میں گر گئے، یہ ڈبا بھی وہ آدمی اپنے ساتھ لایا تھا، اور جب گردن توڑی گئی تو خون کی طرح یاقوت سرخ بہنے لگا، یہ تماشا دیکھ کر ہشام اور اس کے تمام حاضرین مجلس سخت متعجب ہوئے، یہ اونٹنی بنو امیہ کے خزانے میں رہی، یہاں تک کہ جب بنو عباس

---

۲ ان کو اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو ہندستان کے راجا کے پاس ہدیۃً بھیجا۔ یہ خوان مشتری کی شکل پر بنایا گیا تھا۔

۳ یہ چیزیں مروان بن محمد کے خزانے سے ملی تھیں اور بنی عباس کے خزانے میں محفوظ تھیں۔ وہاں تک کہ خلیفا مامون نے

۴ قاضی رشید بن زبیر کی تصنیف کا نام ہے۔

گولکنڈے کے ہیرے

اے۔ ایس شام لال

"گولکنڈے کی سلطنت کو دیکھنا ہیروں کے ملک کی سیر کے برابر ہے"

موسیو تھونا ٹ (ٹریولس ٹو وی انڈیز۔ حصہ ۳ جلد ۲ ص ۹۳)

(بتک دنیا بھر کے قیمتی پتھروں سے واقف ہو سکی ہے، ان سب میں ہیرا نہایت قیمتی اور انتہائی چمک دمک والا پتھر سمجھا جاتا ہے۔ تمام جواہر میں یہ سخت ترین بھی ہوتا ہے۔ یونانیوں نے اس کا نام "اوماس" رکھا، کیونکہ یہ ناقابل فتح تھا اس کی تراش خراش میں اس زمانے کے فنکاروں کو ایسی سہولت حاصل نہیں تھی جیسی کہ دوسرے پتھروں کی تراش خراش میں تھی۔ ایک روایت کے مطابق "اوماس" کو جو زیوس کے بچپن میں اسی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، ستاروں میں بھیج دیا گیا اور وہ غیر معمولی چمک دمک والے پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اسے عربی میں الماس اور سنسکرت میں وجر کہتے ہیں۔ جنوبی ہندستان اور سیلون میں یاقوت، زمرد، لعل، الماس اور ایسے ہی بہت سے قیمتی پتھروں کی بہتات رہی ہے اور ان کی ملکیت دولت و ثروت اور طاقت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ راجا، مہاراجا اپنے جواہر پر فخر کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے انہیں چھین لینے کے لیے جنگیں بھی لڑی گئی ہیں۔ بعض اوقات تو بڑی بڑی سلطنتوں کی قسمت کا فیصلا ایسے ہی جواہر کی بنا پر ہوا ہے اور راجا مہاراجا ان دیسوں کو فتح کرنے کے لیے جہاں ایسے قیمتی پتھر پائے جاتے تھے، آسانی سے اپنی ساری فوجیں روانا کر دیتے تھے۔ دکن بھی ایسے ہی دیسوں میں شامل تھا جہاں قدیم زمانے سے زر و جواہر کی افراط تھی۔ ایسی بہت سی روایتیں اور واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دکن میں ہیرے نکلتے تھے۔ گولکنڈا اور بیجاپور کے ہیرے ساری دنیا میں بھیجے جاتے تھے اور ان کی شہرت مغربی ملکوں کے تاجروں اور بیاروں کو بھی دکن کھینچ لاتی تھی۔ ایسے مشہور یورپی افراد میں فرانسس برنیر، ٹیورنیر، ٹاوری کا نیوسی، موسیو تھیونیو بھی شامل ہیں جنہوں نے نہ صرف اس ملک کا سفر کیا تھا، بلکہ اپنے زمانے کے ہیروں کی کانوں اور ملک میں ان کے کاروبار کے متعلق نہایت قیمتی معلومات بھی چھوڑی ہیں۔ ان میں سے موسیو ٹیاوریر نے، جو ہیروں کا تاجر تھا، دکن میں پائے جانے والے ہیروں اور ان کے کاروبار کے متعلق تفصیلی ریکارڈ چھوڑا ہے اور اس مضمون کے لیے تقریباً سارا مواد اسی کی تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہیروں کی جو پہلی کان اس نے دیکھی وہ سلطنت بیجاپور کے کرناٹک کے صوبے میں واقع تھی جس کا نام رول کنڈا تھا اور گولکنڈا سے اس کے سفر میں پانچ دن اور بیجاپور سے آٹھ یا نو دن لگے تھے۔ اس کان سے نہایت ہی صاف اور شفاف پتھر اور نہایت ہی سفید پانی کے پتھر نکلتے تھے۔

ہیرے کی کان

ہیرے کی کان کے اطراف واکناف زمین ریتلی اور چٹانی ہے۔ ان چٹانوں پر دھاریاں ہوتی ہیں جن میں سے بعض آدمی انگلی کے برابر اور بعض پوری انگلی کے برابر چوڑی ہوتی ہیں۔ کان کھودنے والے جو آلات استعمال کرتے ہیں وہ لوہے کی ایک سلاخ کی شکل میں ہوتے ہیں جن کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا پنجا ہوتا ہے جس سے مٹی یا ریت نکالی جاتی ہے۔ اس مٹی یا ریت کو ٹوکریوں میں ڈالا جاتا ہے اور اس میں ہیرے مل جاتے ہیں، لیکن چٹانوں کی یہ دھاریاں ہمیشہ سیدھی نہیں ہوتیں بلکہ بعض نیچے کی طرف اور بعض اوپر کی طرف بڑھ جاتی ہیں۔ ان کان کنوں کو ان دھاریوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چٹانوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ چٹانوں کے توڑنے اور ریت جمع کر لینے کے بعد وہ ان

دو تین دفعہ دھو لیتے ہیں اور اسی میں ہیرے تلاش کرتے ہیں۔

"ھیروں میں چمک پیدا کرنے کے لیے انہیں تراش کر جلا دینی پڑتی ہے۔ اس لیے ہیرے کی کانوں کے پاس اب بھی بہت سے ہیرا تراش آباد ہیں۔ ہیرا تراشنے والے ہر خاندان کے پاس ایک چکی ہوتی ہے جس پر وہ پانی ڈالتے رہتے ہیں اور جب ہیرے کا سفوف جھڑنا شروع ہوتا ہے تو تیل ڈالنے لگتے ہیں۔ ہیرے کا سفوف بھی قیمتی ہو سکتا ہے، لیکن وہ ضایع ہو جاتا ہے جس کی یہ لوگ کوئی پروا نہیں کرتے۔"

کاروبار

ہیرے کی کانوں پر تاجر آزادانہ طور پر اور نہایت ایمانداری سے کاروبار کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ خریدتے ہیں اس پر دو فیصد کے حساب سے بادشاہ کو محصول ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی جانب سے کان کنی کی اجازت کے لیے بھی محصول وصول کیا جاتا ہے۔ کان کھودنے والے مزدور وہ تمام مقامات جانتے ہیں جہاں ہیرے نکل سکتے ہیں۔ تاجر ان مزدوروں کی مدد سے ایسے مقامات کا تعین کر لیتا ہے اور ان سے تقریباً ۲۰۰ قدم کے فاصلے پر پچاس پچاس یا بعض اوقات ایک ایک سو مزدوروں کو کھدائی کے کام پر لگا دیتا ہے۔ کان کنی کے آغاز کے دن سے اختتام کی تاریخ تک تاجر بادشاہ کو روزانہ دو پگوڈا کے حساب سے رقم ادا کرتا ہے۔ ایک سو مزدوروں کو کام پر لگانے کی صورت میں روزانہ چار پگوڈا (چاندی کا سکہ) ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مزدوروں کو سال بھر میں تین پگوڈوں سے زیادہ رقم نہیں مل سکتی۔ اگرچہ وہ اپنے کام کے ماہر ہوتے ہیں۔ اتنا تھوڑا سا معاوضہ پانے پر بھی مزدور کوئی بددیانتی نہیں دکھاتے، حالانکہ قیمتی پتھروں کو ذاتی اغراض کے لیے چھپانے کا انہیں کافی موقع حاصل رہتا ہے۔ مزدور ہیروں کی کان میں ننگے جسم کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے جسم پر صرف ایک پیٹرا لگا رہتا ہے۔ اگر پھر بھی کبھی کبھی چوری کے واقعات معلوم ہوئے تو تاجر پچاس مزدوروں کے گروہ کے ساتھ اپنے یار ایا پندرا جاسوس لگا رکھتا ہے تاکہ وہ ان پر نگرانی رکھیں۔ اگر کسی مزدور کو اتفاق سے کوئی ہیرا مل جائے جس کا وزن ۱۴ یا ۱۶ قیراط ہو تو وہ اسے فوراً ہی تاجر کے آگے پیش کر دیتا ہے اور تاجر سے ایک "سمرپو" (چھوٹی سی پگوڈی) اور گردھا پگوڑا انعام پاتا ہے۔

"ھیروں کے کاروبار کے لیے جو تاجر یہاں آتے ہیں وہ یا تو نقد رقم سونے کے پگوڑوں کی شکل میں یا اپنے بینکروں کے نام، جو دور دراز مقامات پر رہتے ہیں ہنڈیاں بھرا کرتے ہیں۔" ٹیاوریز کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیروں کے تاجروں کے کمسن لڑکے بھی اپنے ساتھ ایک بازو پر ہیروں کی تھیلی اور دوسرے بازو پر رقم کی تھیلی لٹکائے ہوئے (جس میں سینکڑوں پگوڑے بھرے ہوئے ہوتے تھے) ہیرے فروخت کرتے ہوئے گھومتے تھے۔ یہ لڑکے بھی کافی منافع کماتے تھے جو آپس میں مساوی طور پر تقسیم کر لیتے تھے اور ان کے لیڈر کو چار فی صد زاید ملتا تھا۔ ہیرے کی کان پر بادشاہ کی جانب سے ایک شخص متعین رکھا جاتا تھا، جو ہیروں کا وزن کر کے اس کا اعلان کرتا تھا۔ اس کے اعلان پر خریدار اور فروخت کنندہ دونوں مطمئن ہو جاتے تھے۔ ٹیاوریز نے لکھا ہے کہ اس نے اس کان پر چند ہیرے خریدے اور گولکنڈے کے مقابلے میں ۲۰ فی صد زیادہ منافع حاصل کیا۔

کولور کے ہیروں کی کان

ٹیاوریز نے ہیروں کی ایک دوسری کان تک اپنے سفر کا حال بھی لکھا ہے، جو گولکنڈے کے مشرق میں کولور نامی مقام پر واقع تھی۔ گولکنڈے سے اس مقام تک سفر کرنے میں سات دن لگتے تھے۔ اس کو کولور سے ڈیڑھ میل کے فاصلے تک ایک اونچے پہاڑ کی طرف جانا پڑا، جس کی شکل آدھے چاند کی سی تھی، اس پہاڑ اور قصبے کے درمیان ایک وسیع میدانی رقبہ تھا، جس میں زمین کھود کر ہیرے نکالے جاتے تھے۔ یہ کھدائی پہاڑ کی

جس قدر قریب ہوتی تھی، اسی قدر بڑے بڑے ہیرے ملتے تھے۔ البتا پہاڑ کی چوٹی پر کچھ ہات نہیں آتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کان کی کھدائی شروع ہوئی تو یہاں دوسری کانوں کی نسبت بڑے بڑے ہیرے ملنے لگے، جس کا وزن ۱۰۰ سے ۱۲۰ قراط تک بلکے اس سے بھی بڑا چڑھا ہوتا تھا۔ یہاں ملنے والے بڑے ہیروں میں وہ (۹۰۰) قراط وزن والا ہیرا بھی شامل تھا جسے میر جملہ نے اورنگ زیب کی نظر کیا تھا۔

ٹیاوریئر نے لکھا ہے کہ جب اس نے اس کان کا معائنہ کیا تو اس وقت یہاں تقریباً چھ ہزار افراد کام میں لگے ہوئے تھے۔ جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مرد کھدائی کا کام کرتے تھے، اور عورتیں اور بچے مٹی ڈھو ڈھو کر لے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کان بادشاہ کے حکم سے بند کر دی گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ بازدھو کا بازوں نے ہیروں کے تاجروں کو دھوکا دیا تھا۔ البتا کولور اور راول کنڈا کے درمیان ایک اور کان حال ہی میں دریافت کی گئی تھی، جس کی کھدائی زیادہ منفعت بخش معلوم ہوتی تھی۔ ایک انگریز سیاح ولیم میتھولڈ نس، جس نے ۱۶۶۲ء میں ہندستان کا سفر کیا تھا، لکھا ہے کہ کولور کی ہیروں کی یہ کان مسولی پٹم سے ۱۰۸ انگریزی میل کے فاصلے پر واقع تھی، لیکن بعد میں یہ فاصلا ٹھیک ۱۰۰ میل پایا گیا۔ میتھیولڈ کے بیان کے مطابق یہ کان گولکنڈے کی تمام کانوں میں سب سے بڑی تھی، جہاں اس کے معائنے کے موقع پر ایک ہزار مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کان سے بادشاہ کو سالانا ۳ لاکھ پگوڈا یا ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ اسٹرلنگ کی آمدنی ہوتی تھی، لیکن اتنا ضرور بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کل آمدنی کا ایک قابل لحاظ حصہ تھا جو ۱۶۷۰ء میں دکن کے صوبے میں ۲۴۷۸۲۵۰۰ روپے تھی۔ ایک وینیشین سیاح جن نے جو شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درباروں میں آتا جاتا رہا تھا، اپنے سفرنامے کی دوسری جلد صفحہ ۱۸۴ پر لکھا ہے کہ ہندستان سے برآمد کیے جانے والے مال کے لیے یورپ اور دوسرے ملکوں کے تاجر کافی مقدار میں چاندی لیے ہوئے یہاں پہنچتے ہیں۔ اور بڑے بڑے ہیرے خرید کر لے جاتے ہیں۔"

ایڈون ڈبلو اسٹریچی نے اپنی کتاب "دنیا کے بڑے ہیرے" میں لکھا ہے کہ جنوبی افریقا میں ملنے والے ہیروں سے پہلے جنوبی ہندستان کے ہیرے ہی دنیا کے بڑے ہیرے ہوتے تھے۔ کوہ نور، ریجنٹ ڈائمنڈ اور گریٹ آسٹر بن وغیرا جیسے ہیرے دکن کی کانوں سے ہی لائے گئے ہیں۔" ریجنٹ ڈائمنڈ کے متعلق اس کا یہ بیان ملتا ہے کہ یہ دریائے کرشنا کے علاقے میں ملا تھا۔ اور بہت سے مالکوں کے ہاتھوں سے گذرتا ہوا فورٹ سینٹ جارج کے گورنر کے پاس پہنچا، جس نے ۱۷۱۷ء میں اسے ۱۲۶۰۰۰ پونڈ کے عوض ریجنٹ فرانس کے ہاتھ بیچ دیا۔ ام۔ تھیونیوٹ نے گولکنڈے کے بادشاہ کے قیمتی جواہر کا حال لکھا ہے، جو اس نے شاہی دربار میں دیکھے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہ اپنے سر کے تاج میں جواہر بھی لگاتا ہے، جن کا گچا ایک فٹ لمبا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت کا کوئی اندازا ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس گچے کی چوٹی پر چھوٹا سا تاج ہے جس سے کھجور کے پتے کی سی ایک شاخ نکالی گئی ہے، لیکن یہ گول ہے۔ اس کا نظر ایک انچ اور لمبائی آدھے فٹ کے برابر ہے۔ اس میں کئی پیچ لگے ہوئے ہیں، جو اس شاخ کے پتوں کی شکل میں ہیں، ہر پتے کے سرے پر ایک خوبصورت موتی لگا ہوا ہے۔ اس کی جڑ سے سونے کے دو حلقے نکلتے ہیں جن کے اطراف یاقوتوں میں جڑے ہوئے ہیرے سجائے گئے ہیں۔ جو اطراف لٹکنے والے موتیوں کے ساتھ مل کر ایک نادر سماں پیدا کرتے ہیں، جو تمام جواہر کو سر پہ تھامے رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بادشاہ اپنے خزانے میں اور بھی کئی نوادر رکھتا ہے۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قیمتی پتھروں کی حد تک یہ بادشاہ ہندستان کے تمام بادشاہوں سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ میر جملہ کی دولت کے بارے میں جو گولکنڈے کے سلطان کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کی خدمت میں داخل ہو گیا تھا، تھیونوٹ نے لکھا ہے کہ اس امیر کے پاس جو ہیرے

تھے ان کا وزن ۴۰ من تھا جو ہالینڈ کے چار سو اسی پونڈ کے مساوی ہے۔ اورنگ زیب ساری دولت اس نے کرناٹک کے علاقے میں لوٹ مار سے جمع کی تھی جہاں وہ گولکنڈے کی فوج کا سپاہ سالار تھا۔ گولکنڈے کے بادشاہ کے پاس ہیروں کے بہترین کاریگر جمع تھے جو قلعے میں رہتے تھے اور ان کے کھانے کا انتظام مفت کیا جاتا تھا۔ انہیں ہیرے حوالے کیے جاتے تھے اور اس کی سخت ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ کسی کو یہ بھی نہ بتائیں کہ ان سے کیا کام لیا جا رہا ہے۔ تاکہ اورنگ زیب کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ قیمتی پتھروں کی تراش خراش کے لیے یہاں کاریگر بھی ماہر ہیں اور وہ ان جواہر کو طلب نہ کر سکے۔

بعض مشہور ہیرے

بعض ہیرے اپنی جسامت یا تاریخ کے اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور یقینی طور پر خالص ہیرا اورلوف ہے جو شہنشاہ روس کے عصا میں تھا۔ اس کا وزن ۱/۴ ۱۹۴ قراط ہے اور اسے گلاب کی شکل میں تراشا گیا ہے۔ اس کا پیندا چپٹا اور کبوتر کے آدھے انڈے کی شکل میں تراشا ہوا ہے۔ ایک قصے کے مطابق ایک ہندستانی مورتی کی آنکھ بنائی گئی تھی جسے ایک فرانسیسی نے چرا لیا۔ ایک دوسرا قصہ یہ ہے کہ ہیرا نادرشاہ کی ملکیت میں تھا۔ اس کے قتل کے بعد ایک آرمینی تاجر کے ہاتھ لگا جو اسے امسٹرڈم لے گیا۔ ۱۷۷۴ء میں اسے کاؤنٹ اورلوف کے ہاتھوں بیچ دیا گیا جس نے ملکۂ کیتھرین کے لیے اسے ۴۵۰۰۰ روبل میں (دھاندلی کا سکہ) یا ۹۰۰۰۰ پونڈ کے عوض خرید لیا۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۰۰ روبل کی سالانا پنشن اور منصب امارت بھی اس کے بیچنے والے کو عطا کی۔ اس کے بعد ریجنٹ یا پٹ ڈائمنڈ کا درجہ ہے جسے مسٹر پٹ گورنر مدراس نے ۱۷۰۱ء میں ۲۰۰۰۰ پونڈ میں خریدا تھا۔ وہ اسے لندن لے گئے اور اسے تراش کر اس کی آب و تاب میں اضافہ کر دیا۔ اول ۱۷۱۷ء میں ریجنٹ ڈیوک آف اورلینس کے ہاتھ بیچ دیا جس نے اسے لوئی پانزدہم کے لیے ۱۳۰۰۰۰ پونڈ کے عوض خریدا، لیکن اندازا لگایا گیا ہے کہ اس کی قیمت اس سے دگنی تھی۔ پہلے فرانسیسی انقلاب میں اسے برلن بھیجا گیا، لیکن اس کے بعد یہ نپولین اول کی تلوار کے قبضے میں جڑا ہوا دیکھا گیا۔ یہ یورپ کا نہایت ہی عالا درجے کا اور خالص ترین ہیرا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا وزن ۱/۴ ۱۳۶ قراط ہے۔

کوہ نور سب میں بڑا ہیرا ہے جو تاج برطانیا کی زینت بنا ہوا ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ ہیرا ہزار برس پہلے مہابھارت کے ایک سورما کرن کے پاس تھا۔ پھر کئی افراد کے ہاتھوں سے گذرتا ہوا بابر کے پاس پہنچا۔ اور ۱۶۶۵ء میں اسے اورنگ زیب نے اسے ٹاورنیر کو دکھایا۔ اورنگ زیب کے عہد تک اس کا نام مغل اعظم (گریٹ مغل) تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ روس کا ہیرا اورلوف اور کوہ نور ہیرے مغل اعظم کے حصے ہیں۔ ۱۸۳۲ء میں خراسان پر حملے کے دوران میں ایک قیمتی پتھر عباس مرزا کے ہاتھ لگا۔ جس کا وزن ۱۳۲ قراط تھا۔ یہ غالباً اس ہیرے کا تیسرا حصہ ہوگا۔ ان تینوں کو ملانے کے بعد ہی جسامت اور شکل کا ہیرا بن سکتا ہے جس کا ذکر ٹاورنیر نے کیا ہے۔ اس طرح کوہ نور دنیا کے تمام معلوم ہیروں میں اپنی جسامت اور ہنگامہ خیز تاریخ کے لحاظ سے سب سے بڑا

کرم اظہار میں کیسے تمہاری مہربانی کا
کہیں گندم کی قلت سے کہیں توڑا ہی پانی کا
مجال انکار کی کیونکر ہو لطف بے نہایت سے
نوازا تم نے ہم کو بھوک بیماری جہالت سے
زراعت کی رگوں سے یوں لہو تم نے نچوڑا ہے
بھری بستی کو منصوبوں نے بنجر کر کے چھوڑا ہے
کہ حاکم آپ سا نہیں کوئی سارے زمانے میں
یہ درباری بڑے ہوشیار ہیں کہ کہتے ہیں
یہ کہتے ہیں وطن میں ہے جو شے کے گیت گاتے ہیں
سب ہی "سرکار زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہیں

رفیق مالی بھار

دروازہ — ادب — آخری قسط

ملیالم کا ادب

محمد اسحاق ایوبی

ملیالم کا دورِ جدید

ملیالم ادب نے جدید انقلابی دور میں اس وقت قدم رکھا جب مشہور و معروف مصنف کمارن آشان کا ناول "نلینی" زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ کتاب ملیالم میں نئی روح پھونکنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔ عصرِ جدید میں جن لوگوں نے ملیالم ادب کو نئے رنگ میں رنگنے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوششیں کیں ان میں عظیم شاعر ولتول کی شخصیت بھی نمایاں مقام کی مالک ہے۔ ان کی مشہور نظم "اریچترم" (تصویر) ۱۹۱۵ء میں منظرِ عام پر آئی، جس سے ملیالم ادب کی تاریخ میں عظیم تغیر رونما ہوا۔ انہوں نے والمیکی کی رامائن کا بھی اچھا ترجمہ کیا، جو ملیالم کی تاریخ میں نئی تبدیلی کی علامت بن گئی۔ ملیالم شاعری میں نئی تحریک کی نمایاں شخصیتیں ولتول، اولور اور کمارن آشان ہیں۔ اولور سنسکرت کے پرانے ڈھرے پر چلتے تھے، اور زندگی کو پرانچین کال کی آنکھوں سے دیکھتے اور زندگی کے مختلف مسئلوں کو اسی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو عوام میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ادھر کمارن آشان نظم و نثر دونوں میں عوامی زندگی کے مسایل سے بحث کرتے تھے۔ وہ علمی، سیاسی اور ادبی شعبوں میں جدید تحریکوں سے بے حد متاثر تھے۔ عوام میں ان کی شاعری بے حد مقبول ہوئی۔

سردار پنکر

سردار پنکر کے نام سے پنکر کا شمار ملیالم زبان کے مشہور مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ ریاست کیرل سے باہر وہ ایک ذہین، مدبر، نامور مورخ اور انگریزی زبان کے عظیم ادیب کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، چنانچہ زیادہ تر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ وہ ملیالم کے بھی اچھے مصنف ہیں۔ ادب کے ہر شعبے میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ڈراما، ناول اور تنقید کے میدان میں ان کا اشہب قلم کامیابی سے دوڑتا نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور نظموں میں سے "چینا نرنگی" "پنگر پریتیم" اور "اپا پالی" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے ایک خدنوشت سوانح عمری ملیالم میں بھی لکھی ہے۔ ان کے تاریخی افسانے کا نام "کیرل سمہم" ہے۔ ان کی تصنیفات ان کے علم کی وسعت ان کی تفاحتی ہمہ گیری، اور تاریخ میں ان کی گہری نظر کی آئینہ دار ہیں۔

شنکر اکروپ

عظیم شاعر جی۔ شنکر اکروپ کو ملیالم شاعری میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کا اسلوب بیان، سادگی اور سلاست کا حامل ہے، اور عوام و خواص دونوں ان کے اشعار سے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ موجودہ نسل کے سربراہ ہیں، اور عوام کو درپیش مسایل کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے اشعار جدید طلب شاعری کے لیے نمونے کا کام دیتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات نے عوام کے موجودہ دور کے سماجی اور اقتصادی مقاصد کو متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری جدید نسل کی پیش رفت کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ عوام کے مقاصد کے حصول کے لیے بائیں بازو کے نظریات کو ہمنوا چاہتے ہیں۔

ملیالم ادب کی ترقی میں عورتوں کا حصا

ملیالم زبان اور ادب کے گیسو سنوارنے میں خواتین نے بھی اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ پرانے دور یعنی ۱۹۱۵ء سے پہلے کے دور میں سب سے پہلے مشہور ادیبات میں اکاوما کا شمار ہوتا تھا، لیکن جدید دور میں بہت سی شاعرات اور ادیبات ہیں جو ملیالم ادب کی نشو و نما میں سرگرم حصہ لے رہی ہیں۔ اس ضمن میں بالمنی اما، میری جون اور پاروتی اما کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

نیا انقلابی دور

ملیالم ادب کے نئے انقلابی دور کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوتا ہے۔ اس وقت قومی تحریک نے زور پکڑا اور سیاسی میدان میں بائیں بازو کے افکار و نظریات کے حامی مکتب ادب نے جنم لیا۔ یہ مکتب ادب تنقید اور تبصرے میں آزاد خیالی کا علم بردار تھا۔ اور عوامی اور قومی مقاصد کا حامی بھی۔ اس تحریک کو ترقی پسند تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تنقید نگاری کے میدان میں اس تحریک کے پیشوا جوزف مندیشری، ام۔ پی۔ بال اور اے۔ بالکرشنا پلے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین نے افسانے اور ناول کے شعبے میں بہت زیادہ کام کیا۔ اس دور کے ممتاز شعرا میں شری دھر مینن، گوپال کروپ اور پالاے نارائن نائیر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جدید مکتب ادب نے واقعہ نگاری کو اپنایا اور قدیم تصورات کی پناہ نہیں لی "بالیا کال سکھی" (بچپن کا دوست) ملیالم کے مشہور ادیب محمد بشیر کا لکھا ہوا ناول ہے اور اس کا شمار بہترین کہانیوں میں ہوتا ہے۔ آج کے مشہور و معروف ناول نگاروں میں نکاسی کو بھی امتیازی مقام حاصل ہے۔ اوران کی ناز اکہانی "چیمین" کیرل کے ساحل ایلپی کے مچھیروں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس قصے کو ملیالم کی تمام کہانیوں میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ ملیالم ادب کو ان افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے نئے نئے خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔ ایس کے۔ پٹیکاٹ، کے۔ ٹی۔ محمد، جوزف مندیشری اور روما کی دیگر

ڈرامے

ملیالم ادب میں ڈراموں کو اہم مقام حاصل ہے۔ سی۔ وی۔ رامن پلے کا ڈراما "کروپلا کلری" (یعنیم مدرس کا اسکول) نابروں کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ تنقید نگاروں نے نئے دور میں اس وقت قدم رکھا جبکہ مندیشری، پال اور بالکرشنا پلے جیسے مشاہیر نے اس صنف میں طبع آزمائی شروع کی۔ چنانچہ ملیالم میں قابل قدر تنقیدی سرمایا موجود ہے۔

ملیالم ادب کی تاریخ

مختلف حلقوں میں ملیالم ادب کی تاریخ مدون کرنے کی جدوجہد ہوتی رہی ہے۔ مشہور مورخ 'بی'۔ گوبند پلے کی کتاب انیسویں صدی کے آخر میں چھپی تھی، اور اسے اس قسم کی دوسری کتابوں کا پیشرو سمجھنا چاہیے۔ اسی وقت سے ادبی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں ریسرچ کا کام بھی زور شور سے شروع ہوا ریسرچ کی بدولت ملیالم ادب کے بہت سے گم نام گوشے روشنی میں آ گئے۔ اس طرح مختلف ادوار میں جو مختلف شخصیتوں نے ملیالم ادب کی مختلف خدمات انجام دی ہیں، کیرل کے عوام ان سے اچھی طرح روشناس ہو گئے ہیں۔ نارائن پینکر نے ملیالم ادب کی جو تاریخ مرتب کی ہے، وہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر پیشوا رائر کی کتاب زیر طبع ہے۔ جس کی ناشر کیرل یونیورسٹی ہوگی۔ اس کا موضوع نہ صرف ملیالم ادب کی تاریخ ہوگا، بلکہ اس میں کیرل کی تاریخ بھی شامل ہوگی۔ یہاں پر عظیم ماہر زبان ڈاکٹر کے۔ ام۔ جارج کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان کی اہم تصنیف "راما چرتا" ملیالم زبان کے مختلف رجحانات سے بحث کرتی ہے۔

اخبار نویسی

صحافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ کیرل کے ادب نے بھی نئے دور میں قدم رکھا۔ آج کیرل جیسی چھوٹی ریاست میں بھاری تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس ریاست میں پڑھے لکھے افراد کا تناسب ہندستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے کیرل میں ادب عوامی زندگی کا لازمی جز بن گیا ہے۔

عربی حروف کا استعمال

جب سے عرب کیرل میں آئے انہوں نے عوامی زندگی کے مختلف شعبوں کو ترقی دینے میں تعاون و اشتراک سے کام لیا۔ انہوں نے ملیالم زبان سیکھنے کی بھی جد و جہد کی۔ اس سلسلے میں عربوں نے مقامی زبان یعنی ملیالم کے لیے خاص حروف تہجی بھی ایجاد کیے۔ یہ حروف چند تصرفات کے ساتھ عربی حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ عربی حروف میں لکھی جانے والی ملیالم زبان موپلوں کی مقامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ عربی حروف کے استعمال کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ موپلے عربی الفاظ اور مذہبی اصطلاحات کو صحیح مخرج سے ادا کر سکیں اور صحت کے ساتھ لکھ بھی سکیں۔ تاکہ ان میں تحریف اور تبدیلی کی ضرورت درپیش نہ ہو۔ مثال کے طور پر محمدؐ رحمٰن، صلوٰۃ اور قرآن۔ حروف ح، ص، ق اور ض وغیرہ خالص عربی حروف ہیں اور ملیالم میں یہ حروف نہیں پائے جاتے۔ عربی حروف کی ایجاد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو عرب کیرل آتے تھے انہیں عربی حروف میں، جن سے وہ اچھی طرح آشنا تھے، ملیالم زبان سیکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔

مالاباری کے موپلے مسلمانوں کا ادب بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ ان کے عوامی گیت "موپلا پاٹ" کہلاتے ہیں، جو موپلوں کے سماجی، نظریاتی اور مذہبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان گیتوں میں عربی، فارسی، ہندستانی، تامل اور سنسکرت الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے اوزان اور بحریں بھی خاص ڈھنگ کی ہوتی ہیں۔ ان میں واقعات کی تصویر کشی ایسے رنگ میں کی جاتی ہے کہ سننے والوں کا دل پھڑک اٹھتا ہے۔ اس قسم کے موپلا گیت عربی حروف میں قلم بند کیے گئے ہیں اور نسل بعد نسل منتقل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ عربی حروف میں لکھی جانے والی ملیالم زبان ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے جو مالابار میں موپلوں کے سنہری دور کی آئینہ دار ہے۔

ملیالم پر دوسری زبانوں کے اثرات

ملیالم کے خمیر میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دوسری زندہ زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ یہ الفاظ کچھ اس طرح ملیالم میں گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی اصلی زبان کا پتا بھی نہیں چلتا۔ صرف ریسرچ کا کام کرنے والے ہی دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کے اصل مصدر کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عرب اور کیرل کے مابین تاریخی اور ثقافتی تعلقات کی کہانی بہت پرانی ہے۔ عرب تاجر کیرل کے ساحل پر انفرادی اور جماعتی صورت میں پہنچتے اور وہاں مہینوں اور برسوں قیام کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی مقامی باشندوں کے دوش بدوش حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ نظری طور عربی زبان کی چھاپ کسی نہ کسی شکل میں ملیالم زبان پر بھی پڑی ہے۔

تسکین خاطر

قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی

درد بہت آرام بہت ہے — عشق کا ہر انعام بہت ہے
آہوں سے دل بہلائیں — ذوق خرد تو خام بہت ہے
کیوں وہ کریں تکلیف تکلم — نظروں کا پیغام بہت ہے
عزت رندی ہے حرسلامت — ایک شکستہ جام بہت ہے
حرف تمنا صاف ہے لیکن — کہنے میں ابہام بہت ہے
حسن و محبت راز ہیں اب تک — بات بظاہر عام بہت ہے

دوسری قسط | اقساط | آخری قسط

پشکن اور اس کی شاعری

پروفیسر کراشینن نیکوف

۱۸۲۵ء میں روس کے زار الیگزینڈر اول نے وفات پائی۔ وہ پشکن کے الفاظ میں "جسمانی طور پر کمزور لیکن بڑا چالاک حکمران تھا" تخت پر بیٹھتے وقت اس نے وعدا کیا تھا کہ میں عوام کی زندگی کو بہتر بناؤں گا، اور اہم اصلاحیں کروں گا، لیکن حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا۔ روس میں زندگی پہلے سے بدتر ہو گئی۔ پھر شاہی خاندان کے شہزادے نکولائی کو نیا روسی زار بننا نصیب ہوا، لیکن اس کی تخت نشینی کے دن ہی روس کے پائے تخت پیٹرزبرگ میں، روسی فوج میں بغاوت پھوٹ پڑی جو دسمبر کی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اس بغاوت میں حصا لینے والے، زیادا تر روسی قدیم خاندانوں کے نوجوان، اور روسی فوج کے افسر تھے۔ ۱۸۱۳ء میں یہ لوگ روسی فوجوں کے ساتھ پیرس کی فوجوں کا تعاقب کرتے ہوئے فرانس تک جا پہنچے تھے۔ یہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے فرانسیسی بورژوا انقلاب کے طوفان کو، یورپ کے مختلف ملکوں میں داخل ہوتے ہوئے اور غلامی کو نیست و نابود ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ روس میں بھی ایسی ہی تدبیلیاں عمل میں لائیں، اور روس میں غلامی نظام کو خاتمہ کر دیں۔

یہ بغاوت ناکام ہوئی۔ باغیوں کے دو چار سو آدمیوں کو جلاوطن کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ پانچ آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ جب نئے روسی زار نکولائی نے، پشکن کو جلا وطنی سے واپس بلایا اور پوچھا کہ "اگر تم بغاوت کے وقت سینٹ پیٹرزبرگ میں ہوتے تو کیا کرتے؟" تو پشکن نے جواب دیا تھا کہ "باغیوں کے ساتھ ہوتا۔" ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ پشکن کا باغیوں سے تعلق تھا، لیکن ان کو بغاوت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کیونکہ باغی افسر جانتے تھے کہ پشکن، روس کا عوامی شاعر، روسی شاعری کی امید ہے، اور اس کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا انہیں حق نہیں پہنچتا، لیکن زار نے آگے پشکن کا ایماندارانا جواب، بعد کو ان کی موت کا باعث ثابت ہوا۔ زار نکولائی نے پشکن کو پائے تخت اور ماسکو میں رہنے کی اجازت دیدی، اس کو امید تھی کہ وہ پشکن کو کسی نہ کسی طریقے سے اپنا درباری شاعر بنانے میں کامیاب ہو جائے گا، لیکن عقاب کبھی سانپ نہیں بن سکتا۔ جلاوطنی کے خاتمے کے بعد، یعنی ۱۸۲۶ء سے لے کر وفات تک پشکن کی زندگی، نمانا بدوش کی سی زندگی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ زیادا دن تک نہیں رہ سکتے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے دشمن تھے ——— کچھ تو ان کو غریب خاندان کا سمجھتے تھے، دوسرے ان کے چبھتے ہوئے طنز کا شکار ہونے کی وجہ سے ان سے نفرت کرتے تھے، لیکن وہ برابر محنت سے اپنا کام کیے جا رہے تھے جس کا نتیجہ ہے شمار نظمیں تھیں، اور چند شہرہ آفاق نظمیں۔ انہوں نے سائبیریا میں اپنے جلاوطن دوستوں کو ایک نظم بھیجی تھی جس میں وہ کہتے ہیں۔

"اے ساتھی، یقین جانو کہ آخر کار میری زندگی
اور قسمت کا ستارا طلوع ہو کر رہے گا۔
روس اپنی نیند سے بیدار ہو گا، اور روسی لوگ،
تمہارے ناموں کو
زاری روس کے کھنڈرات پر لکھیں گے۔"

پشکن کے یہ پیغمبرانا الفاظ صحیح ثابت ہوئے ان بہادر باغیوں کے نام، جنہوں نے خود کو، اپنے وطن اور اپنے عوام کے لیے قربان کیا تھا، روسی عوام کے دلوں پر ہمیشہ کندا رہیں گے۔

پشکن کو روس کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ روسی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت، عظیم روسی زار، پیٹر اول، سے بھی ان کو خاص دلچسپی تھی۔ اس زار کی زندگی اور اس کے کارناموں کے متعلق پشکن نے ایک مشہور نظم "پولتاوا" لکھی ہے۔ یہ طویل نظم روس کے جنگی کارناموں کا ایک شاندار ترانا ہے۔ اور روسی تاریخ کے ایک اہم ترین واقعے سے وابستہ ہے۔

پیٹر اول ۱۷ ویں صدی کے آخری، اور ۱۸ ویں صدی کی ابتدا میں روس پر حکومت کرتے تھے۔ روس کی تاریخ میں ان کو ایک خاص اور اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے قدیم بسلمدا اور کمزور روس کو ایک مضبوط اور ترقی یافتہ ملک میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھوں روس میں پہلی مرتبا، ایک طاقتور، تربیت یافتا اور منظم فوج قایم ہوئی تھی۔ پیٹر اول ایک زار بھی تھے اور لکڑہارے بھی۔ وہ زار بھی تھے اور جہاز بنانے والے بھی۔ وہ زار بھی تھے، اور سپاہ سالار بھی۔ وہ کسی گندے یا مشکل کام سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ دوستوں اور دشمنوں دونوں سے سیکھتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیتے تھے۔ جہازسازی کا فن سیکھنے کی غرض سے، وہ ایک مرتبا خفیہ طور پر ہالینڈ بھی گئے۔ روس میں تجارت اور صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے بالٹک سمندر کے کنارے انہیں ایک اچھی بندرگاہ کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے پڑوسی ملک سوئیڈن سے وہ زمینیں دوبارا حاصل کر لیں، جو پہلے روس کا حصا تھیں۔ اور بالٹک پر ایک عظیم اور شاندار شہر سینٹ پیٹرزبرگ کی بنیاد ڈالی، جو بعد کو روسی سرزمین کا پایے تخت بن گیا۔

۲۵۰ سال پہلے سوئیڈن، ایک درجے اول کی طاقت سمجھی جاتی تھی۔ اس ملک کی فوج اور اس کا بیڑا تمام یورپ میں سب سے زیادا طاقتور تھا۔ سارا بالٹک سمندر، اور اس کے ساحل سوئیڈن کے قبضے میں تھے۔ ایسی بڑی طاقت سے ٹکر لینا، بڑے خطرے کی بات تھی۔ پہلی جنگ میں جو قدیم روسی شہر نارووا کے قریب ہوئی تھی، روسی فوجوں کو فیصلہ کن شکست ہو چکی تھی۔ چونکہ اس وقت روسی فوج میں توپیں نہ تھا اور نہ ہی اسلحا اور اچھے افسر تھے۔ روسی فوجیں بہت بار میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی تھیں، لیکن یہ شکست پیٹر اول کے لیے ایک مفید سبق ثابت ہوئی۔ وہ سمجھ گئے کہ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔ اور یہ کہ سوئیڈن کو شکست دینے اور اس سے قدیم روسی علاقے واپس لینے کے لیے، نئی فوج، نئے اسلحا اور نئے توپیں ضروری ہیں۔ اور جب یہ سب کچھ تیار ہو گیا، تو روس اور سوئیڈن کے درمیان ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے واقعات سے پشکن نے اپنی طویل نظم "پولتاوا" کا پلاٹ بنایا ہے۔

پولتاوا، یوکرائینا کے ایک شہر کا نام ہے۔ سوئیڈن کا بادشاہ کارل روس سے لڑتا ہوا، یوکرائینا پہنچا، اس کو امید تھی کہ یہاں اس کی فوجوں کو، یوکرائینا میں قزاقوں کے باغی سردار، مازیپا سے مدد ملے گی۔ پولتاوا کے علاقے میں فیصلا کن لڑائی ہوئی۔ پشکن اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

"سوئیڈن کا طاقتور بادشاہ کارل، اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا۔ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے وہ حیرانی اور غصے کے ساتھ، روسی فوجوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ صرف دو تین سال پہلے اس کی طاقتوں اور تربیت یافتا فوجوں کے مقابلے میں، روسی فوج شکست کھا کر پسپا ہو چکی تھی، لیکن اب اب اس کے سامنے میدان جنگ میں بلکل نئی فوج تھی ـــــ شاندار پلٹنیں، جن کے جھنڈے بلندی میں لہرا رہے تھے۔ نئے عمدا توپیں، بہادر سپاہی، جو فتح اور موت دونوں کے لیے تیار تھے۔ کارل شش و پنج میں تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر کار کچ سوچکر اس نے اپنا ہات ہلایا۔ اور اپنی تمام فوجوں کو روسیوں پر حملا کرنے کا حکم دیا، اور پولتاوا کی وہ عظیم لڑائی شروع ہوئی، جس میں سوئیڈن کی فوج نیست و نابود ہو گئی۔

پشکن کو پیٹر اول کی شخصیت سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان پر فخر کرتے ہیں اور وہ ان کو روس کا عوامی ہیرو سمجھتے

وہ ان کے ترقی پسند کارناموں کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ پیٹر اول نے روس کے پرانے دشمن کو شکست دی تھی، اور روس کے لیے یورپ میں رستا کھول دیا تھا۔ یہ طویل نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ پشکن عظیم فاتح اور دلیر تھے اور روس کو خدمتار طاقتور ترقی یافتا اور تعلیم یافتا دیکھنا چاہتے تھے۔ تمام روس ان کے اس کارنامے سے متاثر ہوا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ پشکن اپنا مشہور منظوم ناول "یوجن اونی جن" بھی لکھ رہے تھے۔ یہ ناول ان کا عظیم ترین شاہکار ہے، اور خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کہانی طویل ناول ہے۔ جو دو سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ناول میں پشکن نے ۱۹ ویں صدی کے آغاز کے وقت، روس کی حقیقی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ہر قسم کے کردار ہیں ـــــ زمیندار، کسان، غلام، زار، ان کے درباری غلام، شاعر، افسر ـــــ غرض یہ اس زمانے کے روسی سماج کی مکمل تصویر ہے۔ دیہات کی زندگی، شہروں کی زندگی، پایۂ تخت میں، امرا اور عام لوگوں کی زندگی وغیرہ، اس منظوم ناول کا اہم کردار ایک امیر نوجوان "یوجینی اونے گن" ہے۔ جو روس کے سپہ سالار اور غلام سماج سے ٹکر لیتا ہے۔ اس نے بچپن میں اچھی تعلیم پائی تھی۔ دولت بھی کافی تھی۔ وہ خوش حال آدمی تھا، لیکن اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ آخر میں کیا کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ مجھے کیا کام انجام دینا ہے؟ اس کے سماج میں لوگ کسانوں کو لوٹ کھسوٹ کرتے تھے۔ گندی افواہیں پھیلاتے تھے۔ بڑے درباری بننے کے خواب دیکھتے۔ ان کے دلوں میں عوام سے بے پروائی، ہر عقلمند اور ایماندار آدمی سے نفرت۔ اور ہر ترقی پسند چیز سے نفرت تھی ـــ درباری کا ملازم ہوتا، اور بڑے بڑے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانا یوجن کو پسند نہ تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے گاؤں میں رہتا یا کہیں باہر جایا کرتا، لیکن اس پر بھی سماج کا کافی اثر ہوا تھا ـــــ وہ بھی خدغرض آدمی تھا۔ اپنی شخصی آزادی کو بچانے کی خاطر اس نے ایک بے حد خوبصورت نوجوان لڑکی کی محبت ترک کر دی تھی۔ جو تمام زندگی کے لیے اس کی اچھی دوست اور پیاری بیوی بن سکتی تھی۔ اس زمانے میں ایسے جوانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جو سماجی ماحول میں خراب ہو کر صرف اپنی ذات سے پیار کرنے لگتے تھے۔

روس کے ایک مشہور نقاد بیلنسکی نے کہا ہے کہ "یوجینی اونے گن" ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ یہ روسی زندگی کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ صدیوں بعد بھی اس کی اہمیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ اس میں ہماری روسی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں" اور ان کی یہ رائے حرف بحرف صحیح ہے۔

سنہ ۱۸۳۱ء کا سال پشکن کی زندگی اور ان کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اسی سال انہوں نے شادی کی، اور ان کی شاعری بھی خوب چمکی۔ اب پشکن تحاتحقیقت پسند بن گئے تھے۔ بے شمار عشقیا نظموں، چار نئی ٹریجڈیوں، اور اپنی کہانیوں کے مجموعے "بلکن کی کہانیاں" کی وجہ سے ان کا نام روس سے باہر بھی مشہور ہو گیا تھا۔ بلکن کی کہانیوں کا ترجمہ ہندستانی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ روسی نثر نگاروں کی تمام نسلوں کے لیے یہ چھوٹی سی کتاب جیسے TEXT BOOK کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی زبان وہی ہے جو موجودا زمانے میں روس میں بولی جاتی ہے۔ خوبصورت، پرکشش اور پر زور زبان۔

پشکن کی زندگی کے آخری پانچ سال تکلیفوں اور مصیبتوں میں گذرے۔ ہر طرف سے نفرت اور عداوت کا سامنا تھا۔ پھر معاشی حالات خراب۔ ان کی بیوی بیحد خوبصورت تھیں، اور کپڑوں اور زیوروں پر کافی خرچ کیا کرتی تھیں، لیکن یہ حالات ان کو اپنے کام سے نہیں روک سکے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی نثر سے اور عوام سے دلچسپی میں ہر مہینے اضافا ہوتا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں فرانس میں پھر انقلاب آیا۔ پولینڈ میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ روس میں بھی مختلف مقامات پر کسانوں کی بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ روس کے کسان غلامانا زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ عوام کی حالت

کو دیکھ کر، پشکن کو ایک عظیم بغاوت سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو چالیس سال پہلے روس میں ہر طرف پھیل گئی تھی، اور جس کے رہنما مشہور باغی عوامی ہیرو پوگاچیوف تھے۔ اس بغاوت کو بہتر طور پر جاننے کے لیے پشکن بغاوت کے مقامات پر گئے، وہاں انہوں نے ایسے بوڑھوں سے ملاقاتیں کیں، جنہوں نے خدا اپنی آنکھوں سے سردار پوگاچیوف کو دیکھا تھا۔ اس کے نتیجے کے طور پر، ان کی مشہور تاریخی کتاب "پوگاچیوف کی بغاوت کی تاریخ" وجود میں آئی۔ بعد کو انہوں نے ایک مشہور ناول "کیپٹن کی بیٹی" بھی لکھا۔ اس ناول میں بھی بغاوت کا ذکر ملتا ہے (چند مہینے ہوئے اس کتاب کا ہندستانی ترجمہ سکو سے شائع ہوا ہے) اگرچہ کہ خود پشکن روس کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ ایک عظیم انسانیت دوست آدمی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ساری ہمدردیاں باغی کسانوں اور ان کے بہادر سردار پوگاچیوف کے ساتھ تھیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پشکن نے نہ صرف پیٹر اول جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں نظمیں، ناول اور کہانیاں لکھی ہیں، بلکہ انہیں عام لوگوں سے بھی گہری ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ ان کی مصیبتوں اور مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی ایک طویل نظم "تانبے کا شہسوار" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ نظم ہے۔ اس میں دو اہم کردار ہیں، ایک تو معمولی سا CLERK یوجن EUGENY کا، اور دوسرا پیٹر اول کا۔ یوجن سینٹ پیٹرزبرگ میں کہیں رہتا ہے۔ وہ کسی ڈپارٹمنٹ کا ملازم ہے۔ یعنی ہر لحاظ سے ایک معمولی آدمی۔ اس زمانے میں پیٹرزبرگ ایک نیا بسایا ہوا شہر تھا، اور چونکہ وہ ندی کے کنارے واقع ہے، اس لیے اکثر سیلاب کا شکار رہا کرتا تھا۔ اور یہاں کے باشندوں کو آئے دن مصیبتیں اور نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ پیٹر اول کو مرے ہوئے ایک سو سال ہو چکے تھے، ان کی یاد میں شہر میں ایک عالیشان مجسمہ کھڑا کیا گیا تھا، جو اب بھی تانبے کے شہسوار کے نام سے مشہور ہے۔ ایک مرتبہ شہر میں سیلاب آیا، جس میں یوجن کا خاندان، مکان، ساز و سامان سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اور یوجن، مایوسی اور غم کی شدت کی وجہ سے پاگل ہو گیا۔ دن اور رات وہ شہر میں مارا مارا پھرتا تھا۔ گھومتے گھومتے اچانک اس کی نظر، ندی کے کنارے پیٹر کے مجسمے پر پڑی ——— تانبے کا بنا ہوا پیٹر، تانبے ہی کے بنے ہوئے گھوڑے پر سوار، اپنے ہاتھ فضا میں بلند کیے ہوئے گویا کسی طرف اشارا کر رہا تھا ——— شاید سمندر کی طرف۔ یوجن کو یاد آیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اس شہر کو بنوایا تھا۔ یہ اسی شخص کا تصور تھا کہ آج اس کا مکان تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ غصے میں آکر یوجن نے ہاتھ سے تانبے کو ڈرایا ——— فوراً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ پیٹر آہستہ سے اس کی طرف مڑ رہے ہیں اور ان کی آنکھوں میں خوفناک چمک ہے ——— انتہائی خوف زدہ ہو کر، یوجن وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تمام رات دوڑتا رہا۔ اب سونا اس کے لیے ناممکن تھا، کیونکہ پیٹر اس کا پیچھا کر رہے تھے ——— بیچارا یوجن مر گیا۔ صبح کو اس کی لاش کوتوالی میں لائی گئی۔ اس طویل نظم میں پشکن ایک عظیم انسانیت پسند کی حیثیت میں نمایاں ہے۔ غریب یوجن کے لیے شاعر کا دل، ہمدردی اور محبت سے لبریز ہے۔ اس کو افسوس ہے کہ سیلاب نے اس کی زندگی تباہ کر دی، لیکن ساتھ ہی پشکن یہ بھی دکھاتے ہیں کہ نیا شہر بنا کر پیٹر اول نے بڑا اہم کام کیا تھا۔ اس نئی بندرگاہ کے بغیر روس ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملک نہیں بن سکتا تھا۔

۱۸۳۳ء میں پشکن نے ایک نیا ناول "دوبرووسکی" لکھا۔ جو فصاحت اور بلاغت کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ اس ناول میں دو زمینداروں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک تو دولت مند اور ظالم ہے اور دوسرا ریٹائرڈ

اخر دوبروسکی، جو ایک بہادر شخص ہے، لیکن افلاس کے عالم میں زندگی گذار رہا ہے، مدت تک وہ ایک دوسرے کے قریبی دوست تھے۔ پھر دولت مند نے غریب کو کچھ برا بھلا کہا۔ جس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ غریب زمیندار دوبروسکی مرگیا اور اس کے بیٹے ولادیمیر نے دولت مند زمیندار سے بدلا لیا۔ اس ناول میں روس کے دیہاتوں میں رہنے والے زمینداروں کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ روسی کسانوں کی زندگی اور دوبروسکی سے ان کی وفاداری کا حال بڑا دلچسپ ہے۔ ناول کے آخر میں پشکن نے کسانوں کی بغاوت کا بھی ایک نقشا پیش کیا ہے۔ وہ لڑائی جو وہ اپنے دشمنوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اسی زمانے میں پشکن نے ایک طویل نظم "پھول کی رانی" بھی لکھی جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح روپیا انسان کو تباہ کرتا ہے۔

۱۸۳۷ء میں پشکن نے ایک ڈویل لڑتے ہوئے وفات پائی، اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک فرانسیسی افسر ڈانٹیس کام کی تلاش میں ماسکو آیا ہوا تھا۔ شہر میں افواہیں پھیلنے لگیں کہ وہ پشکن کی بیوی سے محبت کرتا ہے۔ اپنی بیوی اور اپنے خاندان کی عزت کی مدافعت کرنے کے لیے، پشکن نے اس افسر کو ڈویل کا چیلنج بھیجا۔ ۱۸۳۷ء میں ۲۷ جنوری کو وہ سینٹ پیٹرز برگ کے قریب شدید زخمی ہوگئے۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد اپنے عزیز ترین دوستوں یعنی اپنی کتابوں کو "خدا حافظ" کہتے ہوئے انہوں نے وفات پائی۔ جب پشکن کی موت کی خبر شہر میں پھیلی تو ہزاروں لوگ اپنے محبوب شاعر کو آخری بار دیکھنے کے لیے ان کے مکان کے اطراف جمع ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ روس کا ایک زبردست نقصان تھا۔ اور یہ کہ شاعر کی موت حقیقت میں، زار اور اس کے درباریوں کے اشارے پر ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ غریب لوگ، کسان، لکڑہارے، کوچوان، مزدور، بھکاری، یعنی وہ تمام لوگ جن کی مدد اور حمایت پشکن اپنی شاعری کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے اطراف جمع تھے لیکن زار، اور اس کے درباری بہت خش تھے، کیونکہ اب وہ اس عظیم شاعر کی نکتہ چینی سے نجات پا چکے تھے۔ پشکن سے عام لوگوں کی محبت اس قدر بڑی ہوئی تھی کہ زار خوفزدہ ہوگیا، اور اس نے حکم دیا کہ لاش کو فوراً چپکے سے کہیں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی بنا پر پشکن کی لاش، پیٹرزبرگ سے باہر ایک قدیم اور مشہور خانقاہ کے قریب دفن کر دی گئی۔ ان کی قبر پر ایک خوبصورت مزار، اور مجسمہ بھی تعمیر کیا گیا تھا، جسے دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں، جرمن فاشستوں نے خراب کر دیا۔

پشکن نے روسی ادب اور روسی شاعری کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ جوانی میں جب انہوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں، تو روسی ادیب مغرب کی نقالی کیا کرتے تھے، اور مغرب کی رجعت پسند رومانیت کا شکار تھے۔ اپنی ادبی تصانیف میں روسی شاعر ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے، جو بالکل متروک ہو چکے ہیں۔ وہ زاروں اور روس کے امیروں کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے۔ روسی عوام کی لوک کہانیوں، گیتوں، کہاوتوں اور عوامی نظموں سے، انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خیالات کے تصنع اور بناوٹ کی وجہ سے ان کی زبان بھی کسی حد تک مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روس کی ادبی زبان خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکی تھی۔ پشکن ہی پہلے روسی شاعر تھے، جنہوں نے روسی زبان کی چاشنی، اس کی خوبصورتی اور اس کے زور و اثر کو محسوس کیا۔ اس کو اپنایا، اور استعمال کیا۔ جوانی میں انہیں ترقی پسند رومانیت سے لگاؤ تھا، لیکن بعد کو وہ

ایک ٹھیٹ حقیقت پسند بن گئے۔ انہوں نے شاعری کو آسمان سے اتار کر زمین کی پستیوں کے لیے استعمال کیا، انہوں نے شاعری کو روسی عوام کی بھلائی اور روس کی عظمت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ وہ روس کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔

پشکن نے روسی ادب میں، نئی اصناف جیسے ناول، کہانی اور طویل نظمیں وغیرہ رائج کیں۔ اور ان کا ایک بلند معیار قایم کیا۔ ان کے بعد تمام روسی ادیب اسی رستے پر چلنے لگے اور اب تک چل رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پشکن سے پہلے ہمارے ادیب جانتے ہی نہ تھے کہ ناول، کہانی وغیرہ کیا چیزیں ہیں۔ پشکن ہی روس کے پہلے ناول نگار اور کہانی کار ہیں۔ پھر ان کی کہانیاں ناولیں اور نظمیں روسی ادب کے عظیم ترین نثر نگار جیسے طالسطائی، گوگول، چیخوف، تورگینیف، گورکی وغیرہ پشکن کو اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ طالسطائی کے الفاظ میں "ہم روسی ادیبوں کے لیے پشکن کی نثر کو اکثر پڑھنا اور پشکن کی ادبی مہارت سیکھنا نہایت ضروری ہے۔"

پشکن کو روس کی قدرت (نیچر) سے، روس کی آب وہوا سے، روس کی ندیوں اور جنگلوں سے، روس کے خزاں اور بہار سے، روس کے گرما اور سرما سے غرض روس کی ہر چیز سے گہری محبت تھی۔ متعدد نظموں میں انہوں نے، روسی قدرت کے بڑے دلفریب مناظر پیش کیے ہیں۔ مثلاً وہ موسم سرما کی تصویر کھینچتے ہیں ــــ صبح سویرے پلنگ سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالتے ہوئے، وہ اپنی بیوی سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

"سردی اور سورج! کتنی پیاری صبح ہے
میری خوبصورت دوست! تم اب تک کیسے سو سکتی ہو؟
اے میری پیاری! اٹھ جاؤ! رات ختم ہو چکی ہے!
تم کو یاد ہوگا کہ کل، باہر برف کے طوفان گرج رہے تھے۔
آسمان پر کالے کالے بادل تیزی کے ساتھ اڑ رہے تھے۔
لیکن اب! کھڑکی سے ذرا باہر دیکھو!
نیلے نیلے آسمان کے نیچے، شاندار قالینوں کی مانند۔
زمین پر برف بچھی ہوئی ہے، اور سورج کی کرنوں میں چمک رہی ہے۔"

یہاں ایک دوسری نظم کا منظر پیش ہے ــــ "زمین پر پہلی بار برف پڑی ہے۔ دیہات میں لوگ خوش ہیں۔ ایک کسان خستی کے عالم میں، سلیج پر بیٹھا ہوا گھوڑے کو دوڑا رہا ہے۔ اس کا چھوٹا گھوڑا برف کی پھسوس کرتے ہوئے تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ صحن میں ایک بچا کھیل رہا ہے۔ اپنے کتے کو سلیج میں بٹھا کر، وہ خود گھوڑا بن گیا ہے۔ اس کی ایک انگلی میں سردی سے درد ہو رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ہنسے یا روئے ــــ اور اس کی ماں گھر کی کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے اس کو انگلی سے ڈرا رہی ہے۔"

پشکن کی نظمیں پہلی نظر میں معمولی معلوم ہو سکتی ہیں، لیکن ان میں غیر معمولی خوبی ہے۔ ان میں روسی سرزمین کی روح ہے۔ ان میں سارے ملک، ہمارے عوام کی زندگی کے ٹکڑے ہیں۔ ان کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

پشکن کی عظمت نہ صرف اس میں ہے کہ وہ ایک بڑے شاعر تھے، جنہوں نے روسی ادب کو نئے رستے دکھائے، بلکہ ان کی عظمت زیادہ تر اس میں ہے کہ وہ حقیقی محب وطن، قدیم غلامی کے سماج کی سخت نکتہ چینی کرنے والے، اور عوام کی حمایت کرنے والے انسان تھے۔ وہ اپنے وطن کی بھلائی چاہتے تھے۔ اس کو مضبوط اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ روسی عوام کو لکھے

پڑے، آزاد اور خستہ حال دیکھنا چاہتے تھے ـــــ اسی میں ان کی ترقی کا راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاعر کا نام سارے روس میں ہر دلعزیز ہے۔ یہی سبب ہے کہ روس کے بچے، ان کی منظوم کہانیوں کو شوق سے پڑھتے ہیں، وہ کہانیاں خدانہوں نے اپنی آیا سے سنی تھیں ـــــ یہی سبب ہے کہ پشکن کی تصویریں بے شمار کتابوں میں، اور روسی شہری کے مکانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان کے مجسمے کے سامنے جو ماسکو میں ہے، ہر موسم میں تازہ پھول رکھے نظر آتے ہیں ـــــ

پشکن کی زندگی، ان کے ادبی کارنامے، ہندستانی ادیبوں کے لیے بھی سبق آموز ہیں۔ یہاں تو بڑے اور چھوٹے بہت سے شاعر گذر چکے ہیں۔ ان میں سے وہ جو بادشاہوں اور نوابوں کی شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ اب گم نامی میں غایب ہوتے جا رہے ہیں، اور وہ جنہوں نے عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھا، جو عوام میں رہتے تھے، اور عوام کے لیے لکھتے تھے، مثلاً نظیر اکبر آبادی، ان کے نام عوام کی یاد میں ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں، پشکن کا نام ہندستان میں بھی اتنا ہی مشہور اور ہر دلعزیز ہو جائے گا۔

روسی کا حق کہ وہ روس میں ہے

غزل

ارشد انصاری

مخاطبت نہ سہی، جلوئے تمام سہی
زبان دہن میں اگر ہے، تو لاکلام سہی

شکست عشق میں راز داری کی اب کیا پروا
شریک درد سہی زندگی میں جام سہی

غرور حسن کی ہے ہم کو ہر ادا منظور
تکلفات سہی، حسن انتظام سہی

ترے وجود سے اے دوست ہم بھی واقف ہیں
فریب حسن تصور خیال خام سہی

تصورات میں خود مہرباں ہے ساقی
تجلیات نظر میکدے میں عام سہی

ہمیں خبر ہے مقام ادب کی شوق فنوں
یہ بزم خاص ہے واعظ کا احترام سہی

وصال دوست کی حسرت کو بھولی جا ارشد
شب فراق کی لذت ترا انعام سہی

غزل

اختر شیرانی

نہ کوئی جام نہ کوئی سبو نہ کوئی پیمانہ
حقیقتاً ہے جس سے بھرم ہوش مندی کا

کچھ اس طرح کسی کافر کی یاد ہے دل میں
ہر ایک سمت سلگتا ہیں ظلمتیں لیکن

یہ تشنہ لب ترے محفل سے کون اٹھا ہے
ہیں کیوں خموش گریباں کی دھجیاں کردوں

وہ بات جس کو حقیقت سے قرب تھا آ دوست
یہ سوچتا ہوں چمن کا مآل کیا ہوگا

شب فراق ستارے بھی ساتھ نہ دے سکے
نسیم وہ بھی درمیکدہ تک آ نے ہیں

ہماری تشنہ لبی ہے فروغ میخانہ
زمانہ اس کو ستاتا ہے کہہ کے دیوانہ

کہ جیسے طاق حرم میں چراغ تہ خانہ
طلوع جام سے روشن ہے شام میخانہ

اداس اداس ہے ساقی فضائے میخانہ
وہ کہہ رہے ہیں مجھے آج اپنا دیوانہ

وہ بات آج بنی جا رہی ہے افسانہ
کہ باغباں ہے نظام چمن سے بیگانہ

گذر گئے میری منزل سے بے نیازانہ
زبان پر جن کی تھی تو بہن جام و پیمانہ

کتابوں کی باتیں

(ریڈیائی)

ڈاکٹر محمد حسین

آج کی صحبت افسانا اور افسوں سے شروع ہوگی اور حقایق اور معلومات کے ذکر پر ختم ہوگی۔ جو کتابیں میرے پیش نظر ہیں ان میں رئیس احمد جعفری کا نیا ناول "پاگل" مہیشور کا ڈراما "۱۸۵۷ء کی دلی" اور انور صابری اور نذیر بنارسی کے کلام کے مجموعے اور اسرار احمد آزاد کی کتاب "جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات" کے دوسرے حصے کی دوسری جلد ہے۔

رئیس احمد جعفری کا ناول ان کی نمایندہ تخلیق ہے۔ ان کی دنیا خنگوار اتفاقات اور ڈرامائی حادثات کی دنیا ہے جس میں ایک نیک، شریف، مگر غریب اور سلیقہ مند لڑکی اپنی آپا سکینہ کی محبت اور فلم کمپنی کی ملازمت کے سہارے دوبارہ اپنی زندگی شروع کرتی ہے، اور بے آسرا مفلسی کے درجے سے مشہور ایکٹرس، اور مالدار اور نامور شخصیت کے رتبے تک پہنچتی ہے۔

البتہ ایک خوددار اور مفلس ادیب سلیم کی عزت نفس اور بے پناہ پیار اسے جیت لیتا ہے۔ اور بے دھڑک آگ میں کود پڑنے والے سلیم کی محبت فلک پتی پروڈیوسر قاسم سیٹ پر ترجیح دیتی ہے۔ رئیس احمد جعفری کی نثر رواں، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ ان کے مکالموں کے بیچ وخم بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس ناول میں رعنا اور نجما گویا تصویر کے دو رخ ہیں۔ ایک کی خواہش رفاقت اور ایثار، اور دوسری کی شوخی، ناول کو اس طبقے کے لیے دلچسپ بنانے کے لیے کافی ہیں جو ناول کو دل بہلانے کے لیے پڑھتا ہے۔ سلیم کا پاگل پن زندگی کے المناک حادثوں کا عکس نہیں ہے، بلکہ وہ پاگل پن ہے جو محبت اور عشق کی لگن سے پیدا ہوتا ہے، بلکہ وہ پاگل پن ہے جو محبت اور عشق کی لگن سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ سولن یا نطشے نہیں ہے نہ گوئٹے کا ورتھر اور نہ کارگو کا ہیرو۔ جس کیلیے روشنی طبع بلا نیت ہوتی ہے۔ وہ سیدا سا دا اجرات مند اور دانست یا نہ نوجوان ہے، جو غم جاناں اور غم دوراں دونوں مرحلوں میں خودداری کو بات سے نہیں جانے دیتا۔ اور سود و زیاں کا حساب لگائے بغیر آگ میں کود پڑتا ہے۔ اس ڈرامائی لمحے میں "کیا اور کیوں" کا جواب دینا مشکل ہے۔ "پاگل" تو بس دلوں کو گرما دینے والی ایک روما نی کہانی ہے، جس میں اتفاقات کا فسوں چلتا ہے اور اسباب وعلل کے سلسلے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ "پاگل" کا پاگل پن بھیانک اور دردناک نہیں لطیف اور دلچسپ ہے۔

کمی حساس نگاری کے اعتبار سے سلیم کی خودداری اور راست بازی ہماری ہمدردانہ پرسش اور عزت نفس سے خالی دنیا کے لیے تازگی بخش ہیں۔ سلیم بیدار پرست اور ترقی پسند نوجوان ہے، گو اس کی دنیا خاص محدود اور اس کی کشمکش خاص سطحی سی ہے، اس ناول میں تو علیم سائن کی گونج ہے نہ فکر کی پیچ در پیچ نہیں ہیں۔ "پاگل" ہلکا پھلکا گھریلو قسم کا ناول ہے۔ جیسے سردی کی ایک ایسی صبح کو پڑھا جانا چاہیے جب پٹکیلی دھوپ کھلی ہو اور متوسط طبقے کے نوجوان فرصت اور اطمینان کے لمحے کسی ناول کی افسانوی دنیا میں بسر کرنا چاہتے ہوں۔ "پاگل" گوئٹی میماروں پر جانچنا اور تکمیل کی توقع کرنا درست نہیں ہے۔ اتنی بات کافی ہے کہ یہ ایک دل بہلانے والا سماجی ناول ہے جو بیک وقت صاف ستھرا اور دلچسپ اور پیار و محبت اور انسانیت کی روشنی سے بھرپور ہے۔

"۱۸۵۷ء کی دلی" مہیشور دیال کا تیسرا سماجی تین ایکٹ کا ڈراما ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو

کو بعض مورخوں نے اسے غدر کہا۔ بعض نے اسے جنگ آزادی قرار دیا، اور بعض نے اسے رجواڑوں اور معزول شاہوں کی جنگ زرگری قرار دیا۔ عام طور پر غدر ۱۸۵۷ء کے بارے میں جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان میں مختلف سیاسی شخصیتوں کے عروج و زوال کی داستانیں بیان کی ہیں۔ ہیشو ردیال نے غدر کو ایک عام بغاوت کی شکل میں دیکھا اور بیان کیا ہے جس میں چوڑی والی، گلشن، پہلوان، سنار محمد یوسف، میر صاحب، منتی جی، لالا جی اور مولوی صاحب سب ہی برابر کے شریک ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے "اس ڈرامے کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پس منظر لال قلعہ ہے لیکن اس کے تمام کردار دلی کے شہری ہیں۔ اس میں عوام کی جذباتی کیفیتوں کا مظاہرہ ہے۔ اثرات تلے سے اٹھتے ہیں، شہر میں پھیلتے ہیں۔ ڈرامے میں شہریوں کا عکس عمل نظر آتا ہے۔ امیر، شہزادے، اور خاکہ بادشاہ بھی جن کی ذات سے ۱۸۵۷ء کا معرکہ اپنے پر نہیں آتے، لیکن غالباً ڈرامے میں شریک ہیں۔" ہیشو ردیال نے اس عوامی جدوجہد کا خاصا درد ناک اور دلدوز روپ منتخب کیا ہے۔ ان کے کردار اردو اور صاف زبان بولتے ہیں۔ ان کا ڈراما مختلف المجموعے اور متضاد رجحانات کو پیش کرتا ہے۔ ان کے کردار انسانی شخصیت کی بوقلمونی اور بوالعجبی دونوں کا آئینہ خانہ ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ دل آویز اور جاذب نظر تصویریں گلشن اور میر صاحب کی ہیں جو موقع پرست مادھو اور رگھو خان کے ہاتھوں شہید ہوتے ہیں۔ مادھو جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں پالا پوسا اور گودیوں میں کھلایا، اور پروان چڑھایا۔ بہرحال ہیشو ردیال نے دلی کی پاکیزہ اور باصلاحیت زبان میں ایک قومی المیے کو درد مندی اور چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسمیں تاریخی حقائق سے نہ لفاظی، مگر واقعات کا بیچ و خم، اور کرداروں کی شخصیت اور کردار کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اسٹیج پر اس ڈرامے کے خط و خال اور بھی نکھر جائیں گے۔ انور صابری کا کلام "بعض دوران" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ انور صابری شاعروں کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ۲۱۶ صفحات کے اس مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہیں، اور وہ غزلیں جو شاعر کو لوٹ چکی ہیں۔ انور صابری کی غزل گوئی عام طور پر روایتی ہے۔ البتہ انور صابری نے جدید غزل کی اس روش کو بھی اپنایا ہے کہ سیاسی رموز و اسرار عشقیہ شاعری کے لب و لہجے میں سمو دیے جائیں۔ یہ مجموعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

ہزار بار یہ گلشن بنے اجڑ جائے
مگر چمن پہ نہ یارب کبھی زوال آئے

انور صابری نے غزل میں اپنی بات کہنے کا ہنر سیکھا ہے اور اس کا ثبوت ان کے اشعار سے ملتا ہے۔ نذیر بنارسی کے مجموعے کلام "گنگ و جمن" میں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، لیکن وہ غزل ہی کو اپنا متاع سمجھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں حب وطنی اور ہندستان کی سرزمین سے محبت اور عقیدت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، "جھانسی کی رانی" "جہاکوی کالیداس" "پیارا ہندستان" "ہندستانی مجاہد" "دیش سنگھار" "تعارف" "ایک مہاجر" "دوست" "عقیدت کے پھول" "پیام وطن" اور "۱۸۵۷ء کے شہیدوں کی یاد میں" انکی ایسی نظمیں ہیں جن سے اندازا ہوتا ہے کہ وہ صرف وطن کی سرزمین کے پجاری ہی نہیں، بلکہ اسکی تاریخ، اسکی روایات اور اسکی تہذیب کے بھی عزیز ہے۔ نظموں میں غزلوں کی سی کیفیت اور نکھار تو نہیں ہے، البتہ غزلوں کی سی سادگی اور روانی ضرور ہے۔ وہ عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں اور روزمرا کی زبان اور شاعری کی زبان کے فرق کے قابل معلوم نہیں ہوتے۔ نذیر کی غزلوں میں ندرت ادا کی کوشش، تازگی اور گھلاوٹ ملتی ہے۔ جو روانی اور سادگی کیساتھ انکے شعر کا جوہر شگفتہ ہیں۔ البتہ "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور "کل رات کو" انکی کامیاب نظمیں ہیں۔ غزلوں میں بات کو نئے پہلو سے کہدینے کا سلیقہ بہت کچھ ہوتا ہے اور یہ سلیقہ نذیر بنارسی نے برتا ہے، مثلاً ؎

آج تو آبرو عشق پہ حرف آجاتا
ہاتھ پہنچا تھا کوئی بار گریباں کے قریب

"گنگ و جمن" کے ذکر کیساتھ ہی ہم اپنا نا دانستہ ہندستان کی سرزمین سے نکل آتے ہیں۔ اسرار احمد آزاد کی کتاب "جدید مہین الاقوامی معلومات" اصل میں سیاسی لغات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جسکا آغاز مصنف نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا۔ یہ جلد دوم کا حصہ ہے، اور چار سو صفحات پر حاوی ہے۔ اسرار احمد آزاد ایک کہنہ مشق صحافی ہیں۔ انکے ہاں مختلف عنوانات کے تحت اہم

* بعض باتیں کلدیپ کے متعلق ہیں۔ (ی۔ ا۔ م۔ خان نے اجمل پریس حیدرآباد سے چھپوایا۔)

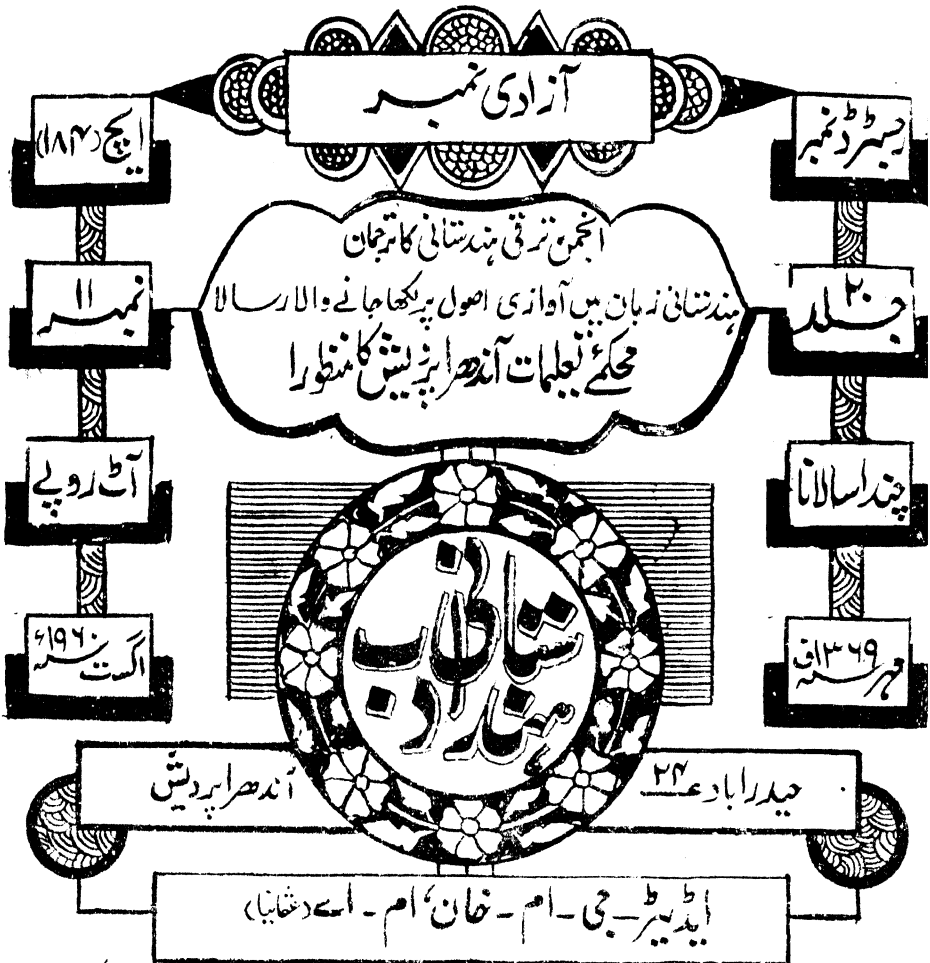
آزادی نمبر

ہندوستان ہمارا

حیدرآباد ۔ آندھرا پردیش

ایڈیٹر

جی ۔ ام ۔ خان ام ۔ اے (عثمانیا)



نمبر	عنوان	نام	صفحہ	شاریے کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی لکھنوی	۴	
۳	غزل	ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح الحصر نوح ناروی	۵	
۴	نئے سال کے موڑ پر	فضا ابن فیضی	۶	تعمیر
۵	صبح نو	ڈاکٹر تاپیر شاد اشہانہ زیب بریلوی	۸	
۶	صبح امید	افتخار احمد	۸	شہاب

۷ - ہندستان اور عرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات	قاضی اطہر مبارکپوری ایڈیٹر "البلاغ"	۹	معارف
۸ - اگر ہم بھی وطن سے ہو گئے غافل تو کیا ہوگا	پنڈت خوشدل	۱۳	پیام انقلاب
۹ - شاہان مغلیا کا شاہی کتب خانا	پروفیسر سعید احمد رفیق	۱۴	العلم
۱۰ - سمجوتا	کرشن چندر	۱۹	آندھرا پردیش
۱۱ - جشن آزادی	انوار افسری	۲۲	
۱۲ - شہرادے اندلس	قاضی زین العابدین میرٹھی	۲۳	اسلامی دنیا
۱۳ - غزل	پریم دربن	۳۱	
۱۴ - پیام آزادی	طالب رزاقی	۳۴	
۱۵ - پیغام نو	ریورنڈ ہینس ریحانی	۳۵	
۱۶ - آزادی کے بیش بہا برکت	منوہر لال بہار	۳۶	
۱۷ - آزادی کے جانبر	خیرات ندیم (عثمانیا)	۳۷	
۱۸ - ۱۵ اگست	بانو طاہرہ سعید بی - اے	۳۸	
۱۹ - نہرو شتابدی	وحید مرزا	۳۸	مجلس
۲۰ - تلوک چند محروم کی شاعری	نیاز فتح پوری	۴۱	سب رس
۲۱ - سلطانا رضیا	شیشور پرشاد نوا لکھنوی	۴۶	رہنمائے تعلیم
۲۲ - میری جان کرسی	مجید لاہوری	۴۸	
۲۳ - آزادی کے تیرا سال	ڈاکٹر ہمایون کبیر وزیر ثقافت و رسایٹھک ریرچ	۴۹	
۲۴ - دھابی دھوڑ اکا آدم خور	دشت پیما	۵۱	الشجاع
۲۵ - سہاگ	شمیم نکہت	۵۶	حریم
۲۶ - تشخیص مرض	شوکت تھانوی	۶۰	اطلاعات پاکستان

جی - ام - خان نے اعجاز پریس حیدرآباد میں چھپوایا

ہمارے خیالات

"آزادی" کی روشنی میں

خوشی کی بات ہے کہ "ہندستانی ادب" بھی آزادی کی مسرتوں میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری یہ دلی آرزو ہے کہ ہمارا دیس بڑھاپے سے بڑھاپا پہنچنے پر ہر سال آزادی کا جشن مناتا رہے۔

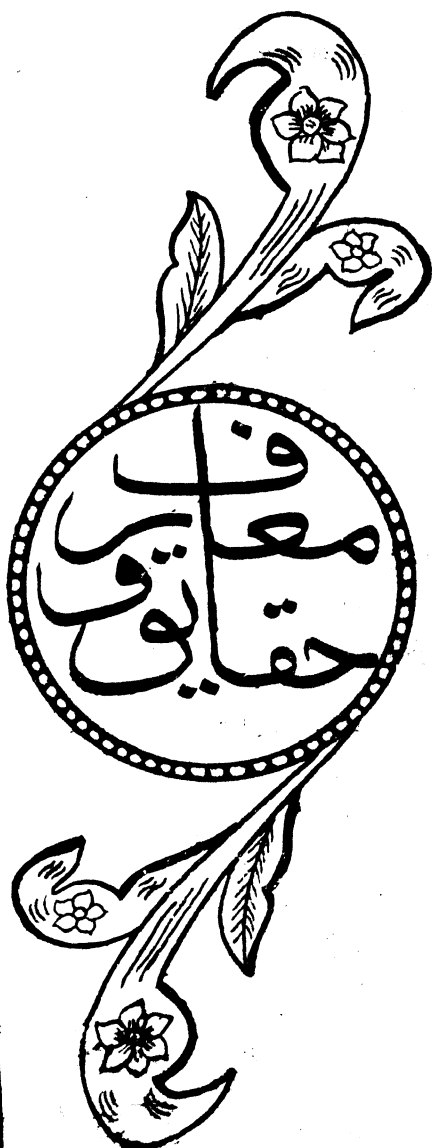
ہم نے پچھلے سال اسی موقع پر یہ کہا تھا کہ ہمارا دیس ہر طرح سے ترقی کر رہا ہے۔ آج سے تیرا سال پہلے ہمارے وطن کی صنعتیں گنی چنی تھیں، مگر آج سارے دیس میں صنعتوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا پانچسالا منصوبہ ختم ہو رہا ہے، اور دیس تیسرے منصوبے پر قدم رکھے گا۔ ان دونوں منصوبوں سے ملک کو بڑا فائدہ ضرور پہنچا ہے، لیکن شکایت اس بات کی ہے کہ بعض غلط قسم کے عہدے داروں نے رقموں کا استعمال صحی طریقے پر نہیں کیا، جس سے منصوبوں کے کاموں میں تھوڑی بہت رکاوٹ ضرور پیدا ہو گئی۔ حکومت کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو عبرتناک سزا ئیں دے۔

ہندستان تجارت کے میدان میں بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارے دیس کی درآمد کم اور برآمد زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس کا اچھا صرف صنعتوں کی ترقی پر ہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی خدائی صورت حال کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ پیداوار کی کمی کے سبب لاکھوں ٹن غلہ دوسرے ملکوں سے درآمد کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ کام ٹھیک نہیں، اس لیے کہ ۴۰ کروڑ ہندستانیوں کی موت اور حیات کا سوال ہے۔ ضرورت کا لحاظ کرتے غلا لازماً درآمد کرنا چاہیے، مگر ہم ساتھ ہی یہ بھی کہے بغیر نہ رہیں گے کہ خود دیس میں اجناس کی پیداوار کو اس حد تک بڑھانے کی کوشش کی جائے کہ باہر سے لینے کی محتاجی نہ رہے۔

تعلیمی اعتبار سے بھی ۱۳ سال کے عرصے میں کافی ترقی ہو گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تعلیم کی مدمیں، منصوبوں کے تحت کروڑوں ہی روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے، اور ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ سارے دیس میں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۱۳ سال پہلے ۱½ کروڑ کے لگ بھگ تھی، اور آج ۳½ کروڑ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے، مگر تعلیم کا معیار بڑھنا رہا، جس کی شکایت دو مہروں کے علاوہ خود مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین جناب ڈیسکمکھ کو بھی ہے۔ تعلیم پانے والوں کی تعداد بڑھانا حکومت کا اصل مقصد نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کم تعداد میں ہر سال بڑھا معیار کے تعلیم یافتا پیش کیے جائیں۔ یہی حقیقی تعلیمی پیداوار ہیں اور انہیں سے دیس کو سچی معنی میں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

دوسرے میدانوں میں ہمارے دیس نے کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اخلاقی اعتبار سے اب بھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ بقول مرکزی وزیر ہمایوں کبیر "سماجی انصاف اور تعلیمی ہر گرمیاں ملک کو متحد کرنے کے لیے ایک نئی قوت ثابت ہو سکتی تھیں، لیکن بدقسمتی سے تفرقہ ہر سطح پر دیانتداری اور اونچے آدرش پسندی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔" ان لوگوں نے ماضی میں ایک نیک مقصد کے لیے گوناگوں تکالیف یا نقصانات برداشت کیے آج وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنی قربانی کی قدر قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدغرضی میں مسلسل اضافا ہوتا دکھائی دیتا ہے، یہانتک کہ طلبا بھی اپنی پڑھائی ختم کرنے سے پہلے ہی آسان کاموں کے لیے سوچنے رہتے ہیں۔ آج ہر شخص دوسروں کی پروا کیے بغیر اپنے اغراض پورا کرنے میں مصروف ہے۔"

وینوبا نے کتنی ہی بتے کی باتیں کہی ہیں حقیقت میں ہم میں خدغرضی اور مفاد پرستی کا مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی کا با اخلاق رہنا ناممکن ہے۔ ایک بد اخلاقی کے سبب پچاسوں ہی دوسری برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، اس طرح سے ہمارے سماج کا ڈھانچا ہی ٹوٹ گیا ہے۔ اس لیے دیس کی خوشحالی کو چاہیے کہ وہ ہمارے دیس کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے کرپشن کو ختم کرے۔ حقیقت میں بڑی بھاری ضرورت ہوگی اور دیس صحیح معنی میں ترقی کی طرف قدم اٹھا سکے گا۔



نظر گاہ اہل نظر دیکھ لیتے
ترا ہاں ترا سنگ در دیکھ لیتے
شب غم رخ یار اگر دیکھ لیتے
فروغ بہار سحر دیکھ لیتے
انہیں ہم جو المختصر دیکھ لیتے
تو گویا مآل نظر دیکھ لیتے
تجھے نزع میں روٹھ کر جانیوالے
تمنا تھی بار دگر دیکھ لیتے
خدا جانے کیا حال موسیٰ کا ہوتا
اگر صورت جلوہ گر دیکھ لیتے
تصور کی دنیا بھی ہے خوب دنیا
نہ ہوتے بھی وہ، مگر ہم دیکھ لیتے
تمنا تھی اے مرگ ابھی اور کچھ دن
وہ نامہ و نامہ بر دیکھ لیتے
سمجھتے یہیں پر نشیمن تھا اپنا
کہیں ہم جو دو چار پر دیکھ لیتے
مزاج نگہباں کا اندازہ کرکے
یہ حسرت ترا سنگ در دیکھ لیتے
انہیں فکر خود اپنے درماں کی ہوتی
مرا حال اگر چارہ گر دیکھ لیتے
وہ جل جاتی خود ہی نشیمن سے پہلے
کوئی ہم جو شاخ شجر دیکھ لیتے
خراب سہر راہ منزل نہ ہوتے
مسافر جو زاد سفر دیکھ لیتے
مٹاتا ہے ہم خاکساروں کو کیسے
فلک کو اسی بات پر دیکھ لیتے
کبھی میکدہ میں جو آجاتے واعظ
یہ حضرت بھی اللہ کا گھر دیکھ لیتے
جلا کر نشیمن کو ہم اپنے افقر
تماشائے برق و شرر دیکھ لیتے

لسان الحقیقت
افقر موہانی
وارثی
لکھنوی



پسند آیا مجھے دنیا کے جھگڑوں سے جدا رہنا
یہ ہے کہنا، یہ ہے سننا، نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا

وہ کہتا ہے خبردار اب نہ اپنا حال تم کہنا
مناسب ہے مجھے ایسے میں بس خاموش ہی رہنا

کہاں تک ہیں مصائب سے رہائی کی دعا مانگوں
مقدر میں لکھا ہے مجھ کو آے دن کا غم سہنا

خزاں میں سوکھ کر پتے انہیں شاخوں سے گرتے ہیں
اترتا ہے عروسانِ چمن کے جسم کا گہنا

زمانے سے ہمیں بہتر خدائی سے ہمیں بڑھ کر
حقیقت میں ہے اس کہنے کا، ان کے واہ کیا کہنا

دمِ جوشِ جنوں کب دشت ہم سے چھٹنے والا ہے
وہیں جانا، وہیں رکنا، وہیں پھرنا، وہیں رہنا

مجھے دیکھو مرا دل دیکھ کر میرا جگر دیکھو
کوئی آساں نہیں ہر وقت کے آزار کا سہنا

ادھر ہے پاؤں میں بیڑی، ادھر ہے طوق گردن میں
پہنایا ہے تمہارے قیدیوں کو عشق نے گہنا

علاوہ اس کے اور آتا ہے کیا اہلِ محبت کو
کبھی روداد غم کہنی، کبھی حال ستم کہنا

چلاتے ہیں وہ پہلے تیر پھر مرہم لگاتے ہیں
ہوا دشوار میرے زخمِ دل سے خون کا بہنا

میرا دل اس نظر کے سامنے جائے تو کیا جائے
خمِ گردن نازکی رد سے ہے لازم دور ہی رہنا

یہ حسن و عشق کی دنیا میں دیکھا بیشتر میں نے
کسی کا رنج و غم ڈھانا کسی کا رنج و غم سہنا

کہاں تک جذب ہوں کے دو گرہ کی آستینوں میں
لگاتار آنسوؤں کا چشمِ دریا بار سے بہنا

نقاب اپنے رخِ روشن پہ اپنی ڈال لے کوئی
کہ اتنی عمر میں دیکھا نہ میں نے چاند کا گہنا

سکونِ زائل، حواس و ہوش غائب زندگی زحمت
نہ رہنے کے برابر اب ہے دنیا میں مرا رہنا

بجھوری زمیں والوں کا اک دستور ہے یہ بھی
فلک سے جو بلا نازل ہو اس کو ہر طرح سہنا

پیامِ شوق پہنچانا تو ہے دشوار اے قاصد
سلام شوق بھی آساں نہیں اس شوخ سے کہنا

ہوا یہ تجربہ اہلِ جہاں کو دل لگانے پر
بہت اچھا ہے اچھی شکل والوں سے لگا رہنا

تعجب کیوں ہے تم کو میری بیہم اشکباری پر
کہ دریا کا کسی موسم میں رک سکتا نہیں بہنا

دمِ فکرِ سخن اے نوحؔ یہ آرایش و زینت
عروسِ طبعِ موزوں کے لیے ہر لفظ ہے گہنا

نئے سال کے موڑ پر!

سید فضا ابن فیضی

صبح کا پھول کھلا، رات کے سائے مہکے　　یوں صبا سے خرابات کے سائے مہکے
زلفیں بکھریں میرے جذبات کے سائے مہکے
نغمہ زن کوں ہوا بربط ہستی پہ مرے　　پھر مری سانس میں نغمات کے سائے مہکے
ہچکی لہجے کی کھنک ساز کی انگڑائی تک
زندگی آ ہی گئی منزل رعنائی تک

ہر طرف شوخیٔ ماحول کے اشارے ملے　　تجھ کو راتوں کے اندھیروں میں بھی ضیا پارے ملے
جاگتے میگدے سنتے ہوئے بازار ملے
شاید اس راہ سے گذرا ہے ستاروں کا جلوس　　ذرّے جہاں گرد، وہاں کرنوں کے انبار ملے
ہے یہ جلووں کا تبسم کہ نظر ہنستی ہے
شام کے سرمئی دامن میں سحر ہنستی ہے

گیت والے چلے، شائستۂ فریاد چلے　　رند میکش چلے، صوفی چلے، زہاد چلے
ہم چلے، تم چلے، ناشاد چلے، شاد چلے
کہہ دو خسرو سے کہ راہوں میں بچھا آنکھیں　　قصر شیریں کی طرف جھوم کے فرہاد چلے
تخت زہ رستم دفند و فا میں گم ہے
زندگی منزل لیلیٰ کی فضا میں گم ہے

سو حجابات حوادث سے نکل کر آئی　　خار زاروں پہ روایات کے چل کر آئی
پیرہن تلخ حقایق کا بدل کر آئی
یہ بھی اعجاز ہے اے ساقی جمہور تیرا　　زندگی ساغر جمہور میں ڈھل کر آئی
پھر نظر میں وہی صہبا کی کرن جاگ اٹھی
جام یوں کھنکے سری صبح وطن جاگ اٹھی

چاندنی ذہن میں نظروں میں فسانے جاگے　　آنکھیں ملتے ہوئے خوابوں کے زمانے جاگے
پھر غنودہ سی فضاؤں میں ترانے جاگے
میری فریاد، لہجہ بھی تھا کیا خواب شکن　　سو رہے تھے جو زمیں میں وہ خزانے جاگے
کارواں محنت و سرمایہ کا کس موڑ پہ ہے
میری منزل ہے وہی زندگی جس موڑ پہ ہے

روح آلام کو مسرت بنا کر گذرا برق خونریز کو دامن میں چھپا کر گذرا
چھیڑ کر زخم کو اشکوں کو ہنسا کر گذرا
راہ ہستی سے فروغ غم جاناں کی قسم میں غم دہر کو آئینہ دکھا کر گذرا
خار بھی مجھ سے ملے ہیں "گل رعنا" بن کر
زہر ہستی مرے ساغر میں ہے صہبا بن کر

بانکپن نظم کا، غزلوں کی جوانی شاداب عشوۂ لفظ حسیں، روح معانی شاداب
خامشی نظروں کی، ہونٹوں کی کہانی شاداب
میرے ماحول کا بھرپور تغزل کیا خوب دن کا شہزادہ جواں، رات کی رانی شاداب
میری آغوش میں سلمائے بہار آج بھی ہے
شعلۂ دہر گلستاں بہ کنار آج بھی ہے

یہ جواں بزم میں کم عمر اجالوں کا ہجوم یہ شب ماہ یہ خورشید جمالوں کا ہجوم
یہ مرے شہر میں آوارہ غزالوں کا ہجوم
یہ حسیں لوگ، سبک شمع، جواں پروانے انجمن ہے کہ مرے شوخ خیالوں کا ہجوم
چاندنی کو مری پلکوں پہ ہے نیند آئی سی
نظریں اٹھتی ہیں تو بج اٹھتی ہے شہنائی سی

غم کے آداب مسرت کے قرینے بدلے وقت کی موجیں، تمدن کے سفینے بدلے
ارتقائے نگہ و فکر کے زینے بدلے
اے نئے سال! ترے غمزۂ کافر کے نثار روپ کتنے مری دیوانہ وشی نے بدلے
پاؤں رکھتا ہوں تو جل اٹھتے ہیں راہوں میں کنول
میں کہیں قلعۂ دہلی ہوں کہیں تاج محل

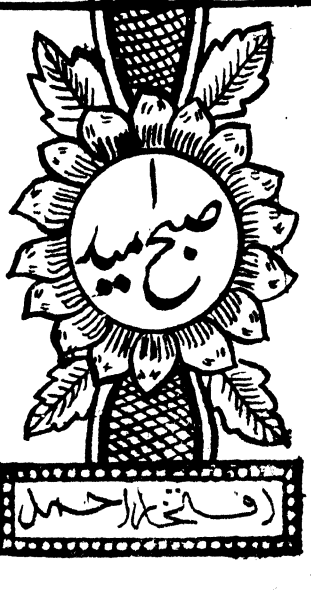
اک ذرا پرورش لوح قلم بھی کر لوں خاک اصنام سے تخلیق حرم بھی کر لوں
ٹھہر نا! بیعت پیران عجم بھی کر لوں
کس لیے نرم رہے مرے جنوں کا پندار اپنے قدموں پہ جبیں وقت کی خم بھی کر لوں
میں نے تاریخ کو دل اور نگاہیں دی ہیں
بازوئے عصر کو پرواز کی راہیں دی ہیں

جس کو منزل کہیں وہ طور میری راہ میں ہے ہر قدم عزم سے معمور مری راہ میں ہے
سایۂ رایت جمہور مری راہ میں ہے
فاصلے گھٹ کے رہے روشنی و ظلمت کے اک حسیں سلسلۂ نور مری راہ میں ہے
کس سے آسودگیٔ شوق کی یہ بات کہوں
میں نئے سال کی شاداب گذرگاہ پہ ہوں



صبح نو مژدہ سحر ہے نور سے کلی کا بھرم
کاش رکھتے وہ میری خوشی کا بھرم
درد اٹھتا ہے تو پوچھ لیتا ہوں میں
آگے منزل سے اٹھتے نہیں دو قدم
زینت آستاں بن گئی ہے جبیں
تری آنکھوں سے پی کر شراب خودی
مل گیا جب پیام نگاہ کرم
تیرے در پر جبیں کو جھکانا بھی کیا
اک جہاد مسلسل نے شام و سحر
انقلاب مذاق جنوں کی قسم
تری آنکھوں سے ساقی چھلکنے لگا
کہہ رہا ہوں شبستاں کی تنہائی سے
دل بھی خود دار ہوتا جو تیری طرح
اشک آنکھوں میں آئے تو دل نے کہا
ہر خوشی نے زمانے کی ٹھکرا دیا
زیبؔ تنظیم صبح چمن کے لیے

شام غم میں ہے کلی کی ہنسی کا بھرم
کچھ تو رہتا غم عاشقی کا بھرم
کس جگہ ہے مری زندگی کا بھرم
پاؤں نے رکھ لیا رہبری کا بھرم
میرے سجدوں سے ہے بندگی کا بھرم
رہ گیا ہے میری بے خودی کا بھرم
زندگی بن گئی زندگی کا بھرم
بیخودی بن چکی تھی خودی کا بھرم
رکھ لیا ہے گلوں کی ہنسی کا بھرم
میری وحشت تھی جامہ دری کا بھرم
توبہ توبہ مری میکشی کا بھرم
تو ہی رکھنا مری بے کسی کا بھرم
کون رکھتا مری بے خودی کا بھرم
کھل نہ جائے کہیں بے کسی کا بھرم
غم نے رکھ تو لیا زندگی کا بھرم
پھول نے رکھ لیا ہے کلی کا بھرم



میرے ہمراز! یہ آکاش کے نیلے موتی!
اندھی راتوں کے بھٹکتے ہوئے ساتھی ہیں
کون اس طرح دوراہے پہ کھڑا حیراں ہے
قافلہ بڑھ گیا، آواز جرس بیٹھ گئی
کس طرف جائے کہا پائے سراغ رہ راست
بڑھ گیا دور بہت راہبر نیرو قدم
اور رستوں کے کناروں پہ بیٹھے ہوئے لوگ
ان کی آنکھوں کی چمک ان کی جبینوں کی دمک
یہ مگر فطرت و قسمت، میری تقدیر نہیں
آبلے ٹھیک تو ہو جائیں ذرا پاؤں کے
سینۂ ظلمت شبگوں سے کرن پھوٹے گی
دیکھتے دیکھتے چھٹ جائیں گے کالے بادل
پھر وہی دن، وہی اینق، وہی گلشن ہوگا

بربط ساز شکستہ کی صدا کیا جانیں
کون یوں کرتا ہے فریاد و بکا کیا جانیں
راہبر کس کو، سر راہ گذر چھوڑ گیا
مضمحل، سوختہ پا، خاک بسر چھوڑ گیا
خضر منزل کا، سکندر کو پتا بھی نہ ملا
اور رستوں پہ نشان کف پا بھی نہ ملا
چشمکیں کرتے ہیں اس سوختہ سامانی پر
مستقل طنز ہے رہرو کی پریشانی پر
اپنی ہمت کو پھر ایک بار جگانا ہے تجھے
کاروان ایک نئے سر سے سجانا ہے تجھے
دل مایوس امیدوں سے نکھر جائے گا
نئے سورج کا علم چرخ پہ لہرائے گا
وہی ہم ہوں گے، وہی اپنا نشیمن ہوگا

دوسری | ادب | آخری قسط

ہندستان اور عرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات

قاضی اطہر مبارکپوری ایڈیٹر "البلاغ"

خلیفا ہارون رشید کی خدمت میں ایک ہندستانی راجا کے ہدیے اور زمرد کی چڑی کی کہانی

ھند ستان کے ایک راجا نے خلیفا ہارون رشید کے پاس بہت سے ہدیے اور تحفے بھیجے، ان میں زمرد کی ایک چڑی بات بھر لمبی تھی اس کے سر پر یاقوت سرخ کی ایک چڑیا بنی ہوئی تھی۔ جو بے انتہا نازک اور لطیف تھی۔ ہارون رشید نے یہ چڑی اپنی بیوی ام جعفر زبیدہ بنت جعفر کو دیدی جو رافقہ میں منتقل ہو کر امین کے پاس آئی پھر اس کے بھائی مامون کو ملی، اور ان دونوں کے بعد معتصم باللہ کے قبضے میں آئی (ص۔۲۰) ایک دن کا واقعہ ہے کہ معتصم اپنی مجلس خاص میں ندیموں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے ہات میں ایک چھڑی تھی۔ باتیں کرتے کرتے یہ چھڑی ندیموں کے سامنے ڈال دی اور ان سے پوچھا، تم لوگوں میں سے کوئی اس چھڑی کو پہچانتا ہے؟ سب نے اسے باری باری سے دیکھکر لاعلمی ظاہر کی، اور جب عبداللہ بن محمد المخلوع کی باری آئی تو اس نے کہا، اے امیر المومنین! اس چھڑی کو ہندستان کے راجا نے ہدایا اور تحایف کے ساتھ ہارون رشید کے پاس بھیجا تھا، اور زبیدہ نے میرے والد کو اس وقت دیا تھا جب وہ بچے تھے، وہ اس سے کھیلا کرتے تھے، اس کے سر پر یاقوت سرخ کی ایک چڑیا بنی ہوئی تھی، جس کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی، وہ چڑیا مجھے نظر نہیں آرہی ہے۔ یہ سن کر معتصم نے اس کے تلاش کرنے کا حکم دیا، اور خزانوں کے محافظوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے وہ چڑیا فوراً حاضر نہ کی تو ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی وقت وہ چڑیا تلاش کی گئی، اور اس چھڑی کے سرے پر لگا کر معتصم کے پاس اصلی شکل میں حاضر کی گئی۔

خلیفا ہارون اور بوران بنت سہل کے زفاف کے موقع پر ہندستانی راجا کا ہدیا اور ہندی عود کا قصا

ھند ستان کے ایک راجا نے ۲۱۰ھ میں خلیفا مامون کے ساتھ بوران بنت حسن بن سہل کی تقریب زفاف کے موقع پر حسن بن سہل کے پاس بہت سے قیمتی ہدیے روانا کیے، جس میں ایک لونڈی تھی، جس میں ایسی عود دہندی تھی جس کی مثال ملنی مشکل تھی۔

علی بن منجم کا بیان ہے کہ ایک رات ہم لوگ خلیفا متوکل کے یہاں موجود تھے، ہمارے ساتھ حسن بن سہل کا لڑکا عبداللہ بھی تھا، عبداللہ ظریف طبع ادیب تھا علمی اور ادبی مجالس دیکھ چکا تھا، اور ادبا کی صحبت اٹھا چکا تھا۔ اس دن متوکل نے پچھنا لگوا دیا تھا جس سے ضعف ہو گیا تھا۔ اور اطبا نے عود کی دھونی لینے کا مشورا دیا تھا، جب دھونی دی جانے لگی تو حاضرین مجلس نے کہا کہ واللہ ہم نے

آج تک اس عود کی جیسی خشبو نہیں سونگی تھی۔ یہ سنکر عبیداللہ بن حسن بن سہل نے کہا کہ یہ وہی عود ہے (ص ۳۲) جو ہندستان کے راجا نے میرے والد کے پاس میری بہن بوران کے زفاف کے موقع پر بھیجی تھی۔ متوکل نے عبیداللہ کو جھٹلایا اور وہ ٹوکری منگائی، جس سے عود کا یہ ٹکڑا دکھلایا گیا تھا، تو اس میں یہ عود ایک اوقیہ سے بھی کم مقدار میں تھی، اور ایک رقعا بھی ملا جس میں تحریر تھا کہ ھذا العود ھدیۃ ملک الھند الی الحسن بن سہل الزفاف بوران الی الماموں۔ اس پر متوکل بہت متاثر ہوا، اس نے عبیداللہ کے لیے انعام و اکرام کا حکم صادر کیا، اور اسی وقت اپنے وزیر عبیداللہ بن یحیٰی بن خاقان کو حکم دیا کہ کسی معتبر آدمی کو سفر خرچ کے لیے ایک ہزار دینار دو، اور دس ہزار دینار کی قیمت کے ایسے ہدایا اور تحایف اس کے حوالے کرو جو ہندستان میں نہیں پائے جاتے، وہ انہیں لے جاکر ہندستان کے راجا کے سامنے پیش کرے اور اس کے بدلے میں وہ عود مانگے جو اس کے یہاں محفوظ ہے۔ چنانچہ عبیداللہ بن یحیٰی وزیر نے ایک قاصد ہندستان روانا کیا، مگر وہ ہندستان سے اس رات کو واپس پہنچا، جس رات میں خلیفا متوکل کا قتل ہوا تھا۔ اس لیے قاصد نے ہندستان سے لائی ہوئی عود اپنے فیضے میں رکھی، یہاں تک کہ خلیفا معتمد علی اللہ تخت نشین ہوا، اور عبیداللہ بن یحیٰی کو وزارت پر برقرار رکھا۔ قاصد کا بیان ہے کہ اس وقت میں اس کے پاس گیا۔ عبیداللہ نے دیکھتے ہی پوچھا، تم ہی قاصد بن کر ہندستان کے راجا کے پاس گئے تھے؟ میں نے کہا ہاں آپ کے حکم کی تعمیل میں نے ہی کی تھی، پہلے راجا کی خدمت میں حاضر ہوکر میں نے یہ ہدایا پیش کیا، جس سے وہ بہت خش ہوا۔ جب میں نے عود کے بارے میں اس سے کہا تو اس نے کہا کہ اب میرے خزانے میں یہ عود ایک سو سیر (ایک من) اور رہ گئی ہے۔ اس میں سے نصف تم لے لو اور نصف میرے لیے رہنے دو، میں اسے پہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ سو رطل (۷۵ سیر) دینے پر راضی ہوگیا، اسی دوران میں ایک دن راجا نے مجھے کھانے پر بلایا۔ جب کھانے کے بعد نارجیل کی نبیذ (ناڑی یا تاڑی) لائی گئی تو میں نے اس کے پینے سے انکار کیا، اور اپنی تطریل کی تمراب نکالی جسے بغداد سے ساتھ لے گیا تھا، راجا نے پوچھا یہ کیا چیز ہے۔ میں نے جواب دیا انگور کا پانی ہے۔ میں نے ایک سو خماسی تطریلی شراب اس کو دیدی، اور اس کے بدلے میں اس نے مجھے ایک لاک درہم اور کپڑے اور خشبو دینے کا حکم دیا، اور میں یہ سب چیزیں لے کر رخصت ہوگیا، اور جب میں رائی واپس پہنچا تو اسی شب کو متوکل کے قتل کا حادثہ پیش آیا۔ اور عود عبیداللہ کے سامنے پیش کردی، عبیداللہ نے کہا عود کے علاوا جو کچھ تم نے لیا ہے، وہ تمہیں مبارک ہو، لیکن عود کل مجھے دیدو، چنانچہ قاصد نے (۳۴) کل عود اس کے حوالے کردی، چنانچہ عبیداللہ ہمیشہ یہی عود استعمال کرتا تھا اور کوئی دوسری عود پسند نہیں کرتا تھا۔

خلیفا معتمد کی خدمت میں موسیٰ بن عمر مہاری کی طرف سے سندی ہدیوں کی تفصیل

سندھ کے حاکم موسیٰ بن عمر بن عبدالعزیز مہاری نے ۲۷۱ھ میں خلیفا معتمد علی اللہ کے پاس ہدیا بھیجا، جس میں (۱) ایک بڑا ہاتی بھی تھا، اس سے بڑا ہاتی دیکھنے میں نہیں آیا تھا (۲) چند نہایت خوبصورت اونٹ تھے (۳) چاندی کے تین بدھ (۴) مشک (۵) عنبر (۶) حریر (۷) ہرن جو گائے کے مانند تھے، جن کا رنگ سیاہی مایل تھا (۸) عود کا ایک تخت (۹) اور ان کے علاوا دوسری بہت سی اشیا تھیں۔ (ص ۳۷)

حضرت معاویہ کی خدمت میں گیگان کے راجا کا آئینہ جہاں نما

خلیفا منصور عباسی کے عہد ۱۵۱ھ میں

ہشام بن عمرو تغلبی نے ہندستان پر حملا کیا اور سند کو عبور کر کے قندھار (گندھارا ضلع بھڑوچ واقع گجرات) پر حملا آور ہوا، تو یہاں اس نے لوہے کا ایک موٹا سا مینار پایا، جو ایک سو ہات لمبا تھا، ہشام نے مقامی لوگوں سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہ آبائے فارس کی اس زمانے کی تلواریں ہیں، جب انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملا کر کے توڑ ڈالیں تھیں، ان ہی تلواروں سے یہ مینار بنایا گیا ہے۔ اہل یمن کا خیال ہے کہ تبع نے اسی موقع پر یہ شعر کہا تھا۔

وَلَقَدْ نَصَرْتُ بِنَصْلِ سَامِ اَبِی کَا
خَرَتْ صَوَامِعُهَا وَکُلُّ عَمُوْدِ حَ

سند میں عمران بن موسیٰ برمکی کا قتل اور اس کے متروکات کی تفصیل اور گرانقدر ہدیوں کا بیان

خلیفہ واثق باللہ کے زمانے ذوالحجہ ۲۲۷ھ میں عمران بن موسیٰ ابن یحییٰ بن خالد بن برمک کو سند میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی خبر واثق کو ملی تو اس نے عمران بن موسیٰ کی دولت پر قبضا کرنے کے لیے بغداد اور بصرا اور سیراف میں آدمی روانا کیے، انہوں نے عمران کے بیٹے محمد اور اس کی ایک بہن کو گرفتار کر لیا، اور دو سال قید میں رہنے کے بعد ان کی رہائی ہوئی، عمران کے کارندوں اور وکیلوں کو بھی گرفتار کر کے سرمن رائی لایا گیا تھا۔ انہوں نے عمران کی وہ تمام دولت جو ان کے پاس تھی، حکومت کے حوالے کر دی، جس کی مجموعی قیمت ۵ کروڑ تھی۔ اس کے علاوا تقریباً دو ہزار خود کی ٹوکریاں تھیں، جو سامان لایتا ہو گیا اس کا کوئی شمار نہیں، جو سامان ملا تھا اس میں زیادا تر سونا تھا۔ واثق نے اسی سونے سے وہ مشہور ہندی خوان بنوایا جس کی پلیٹیں اور دوسرا سامان سونے کا تھا (۱۸۵)

عمران نے اپنی حکومت سند کے زمانے میں واثق کے پاس بہت سے گرانقدر ہدیے، سندی سامان، مشک، عنبر، عود ہندی، سونے چاندی کے برتن، ہندی تلواریں، عود ہندی کے تخت، کرسیاں خالص چاندی کی اتنی مقداریں بھیجی تھیں کہ سب کی مجموعی قیمت دو کروڑ سے بھی زیادا تھی۔ اس کے علاوا یاقات، شیر ببر اور دوسرے ایسے وحشی جانور اور خوبصورت پرندے بھیجے جو بغداد میں نہیں پائے جاتے تھے، واثق ان تحفوں سے بہت خوش ہوا (۱۸۶)

عمران کا جو سامان بغداد آیا تھا، ان میں جنگی اسلحے کی بھی کافی تعداد تھی۔ مثلاً (۱) سات سو پرانے ہندی نیزے ان نیزوں پر روغن پھیرا ہوا تھا (۲) سابری زرہیں (۳) بلند طرخونیا (۴) تبتی زرہیں (ص ۱۸۶) (۵) تبتی جدیدا (۶) آہنی بازو بند (۷) پیر کی پٹی آہنی (۸) خود (۹) گھوڑے کے بکتوان، اور اسی طرح کے دوسرے جنگی سامان اور اسلحا اتنی تعداد میں تھے کہ ان کا شمار مشکل تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے پاس متھرا کی ایک بیش بہا چیز

سلطان محمود بن سبکتگین کے پاس آئینے کی طرح یاقوت سرخ کی ایک چیز تھی۔ یہ چیز اپنی نفاست و غرابت کے اعتبار سے انمول تھی، سلطان محمود نے ۴۰۸ھ میں جب ہندستان پر حملا کیا تھا تو متھرا کے ایک تجانے میں یہ عجیب و غریب چیز ملی تھی۔ متھرا کے اس تجانے میں پانچ سونے کے بت تھے، جن میں سے ہر ایک کا وزن گیارا رطل تھا، اور قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔ ان بتوں کے ہات پر طرح طرح کے جواہر اور بے نظیر یاقوت جڑے تھے۔ اس تجانے کے جملا سامان میں رمانی رنگ کے اور سرخ رنگ کے یاقوت کے کچھ ٹکڑے تھے، جن کا مجموعی وزن چھ سو مثقال تھا۔

(ص ۱۹۲)

چار لاکھ فتح کیا تھا (ص ۱۷۵) قندھار کے فتح کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تلواروں کو توڑ

عرب امرا اور سلاطین کے مابین ہدیوں اور تحفوں میں ہندستان کی خاص خاص قیمتی اشیا

یعقوب بن لیث صفار نے ایک سال خلیفا معتمد کی خدمت میں ہدیے اور تحفے بھیجے تھے، جن میں دو سو سیر مجایت نفایس کے ساتھ ایک سو سیر (من) عود ہندی بھی تھی (ص ۳۹) پھر ۲۸۱ھ میں ہدیے بھیجے ان میں بھی ایک سیر عود (Osmania Univ) ۲۶۳ھ میں جو ہدیا بھیجا اس میں ۵۰ سیر (HYDERABAD) ۲۶۲ھ میں جب یعقوب بن لیث صفار نے خلیفا معتمد اور اس کے بھائی موفق سے شکست کھائی اور طسوج جازر (عراق) میں جا کر پناہ لی تو اس کے خزانے سے خلیفا کو دوسری چیزوں کے ساتھ سند، ہندستان، چین، فرغانا کے عمدہ اسامان، عود ہندی، مشک تبتی اور نقد دولت کے بیشمار صندوق ملے، جو سامان ملا تھا، اس کی نفاست و لطافت کی توصیف نہیں ہو سکتی (ص ۱۷۶)

صاحب بن اسحاق بن زیاد نے ۳۵۹ھ میں عزالدولا ابومنصور کو جو ہدیا دیا تھا اس میں منجملہ اشیا کے عود قماری کا باربان کا ڈنڈا تھا، جس کا طول دس ہات اور وزن تیس سیر تھا (ص ۶۶) سلطان مغرب معز بن بادیس بن منصور (ص ۶۸) بن بلکین بن زیری بن منار نے فاطمی خلیفا الظاہر لاعزاز دین اللہ کے پاس ہدیے بھیجے تھے، اس کے جواب میں الظاہر نے جو ہدیے بھیجے تھے (ص ۶۹) ان میں ہندستان چین اور فرانس کی خشبویات، اور جواہر کی تمام قسمیں بھی تھیں (ص ۷۰)

(میلہ ناصر الدولا کو علی حسن بن حمدان نے ۳۶۳ھ میں شاہ روم ارمانوس المعروف بہ دیوجانس کے پاس جو ہدیے بھیجے ان میں عود ہندی کے باربان کے ڈنڈے بھی تھے۔ ایک کا طول بارہ ہات تھا اور چوڑائی تین بالشت تھی اور وزن اسی سیر تھا، اور دوسرے کا طول سات بالشت تھا اور چوڑائی تین بالشت تھی، اور وزن چالیس سیر تھا (۸۵)

فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ۱۹۳ھ میں جب ہارون رشید کے بعد امین خلیفا ہوا تو اس نے سرکاری خزانو کے ساز و سامان شمار کرنے کا حکم دیا۔ میں نے خزانچیوں اور منشیوں کو بلا کر چار ماہ تک ان خزانوں کی چھان بین کی اور ایک ایک چیز کی تعداد و مقدار الگ الگ لکھوائی تو اس میں عود ہندی کی ایک ہزار ٹوکریاں بھی تھیں (۲۱۵)

خلیفا مستنصر کے خزانے میں ہندستانی اشیا

۴۶۰ھ اور ۴۶۱ھ میں خلیفا مستنصر باللہ کے محل کے خزانے بڑی بے دردی سے لوٹے گئے اور باغیوں نے قیمتی نوادر کو بری طرح برباد کیا۔ جو قیمتی اشیا شاہی خزانے میں پائی گئیں، ان میں سے کئی ایک کا تعلق ہندستان سے تھا۔ مثلاً (۱) کئی صندوق چھوٹی بڑی چوکور اور گول دواتوں سے بھرے ہوئے تھے، اور یہ دواتیں صندل اور عود کی بھی بنی ہوئی تھیں (ص ۲۵۴) (۲) کئی صندوق طرح طرح کے قلموں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں ہندستان کے خاص درخت خلفل کی لکڑی کے قلم بھی تھے (۳) نبت کے شک بھرے ہوئے کئی ظروف (۴) عود خضر کے درخت اور اس کے ٹکڑے (ص ۹۵۵) (۵) عود ہندی کے پانچ باربان جن میں سے ایک کا طول نو ہات سے دس ہات تک تھا (۶) رومال کا ایک ٹکڑا جو سمندل کے پروں سے بنا ہوا تھا۔ سمندل ایک مشہور ہندستانی پرندا ہے، اس کے پروں سے موخہ صاف کرنے کے لیے رومال بنے جاتے تھے، یہ رومال نو بالشت لمبا تھا، اور قنبر کے جلاسامانوں میں سے بھی فروخت کیا گیا۔ کسی مسافر تاجر نے اس کو نہایت ہی معمولی قیمت میں خرید لیا۔ اور جب اس کی اہمیت معلوم ہوئی اور تلاش کیا گیا تو تاجر کا پتا نہ چلا۔

سلطان محمود غزنوی کے دربار میں ۳ ہزار ہندستانی پیل وان اور سدے ہوئے ہاتی

ابو العباس طوسی کا بیان ہے کہ خلیفہ قادر باللہ نے غالب باللہ کی ولی عہدی کی دعوت کے سلسلے میں مجھے سلطان محمود بن سبکتگین کے پاس غزنا سفیر بنا کر بھیجا، جب میں وہاں پہنچا تو بہترین ساز و سامان کے ساتھ اتنی فوجیں دیکھیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

حتی وصلت الی علۃ عظیمۃ من الفیلۃ لحیط بہا علی ما قیل ثلاثون الف راجل من رجال المصل (ص ۱۳۵)

پھر جب دربار کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ہاتیوں کا ایک انبوہ کثیر ہے۔ جس کو ہندستان کے تیس ہزار آدمی (فیل بان) گھیرے ہوئے تھے۔

ابو العباس کا بیان ہے کہ اسی طرح دوسرے عجایب دیکھتے ہوئے میں محل میں جا کر سلطان محمود کو خلیفہ قادر باللہ کا خط دیا، اس کے بعد سلطان محل سے باہر چلا، میں بھی ساتھ ساتھ تھا، دروازے کے باہر کا یہ عجیب منظر دیکھا کہ۔

وصاح الراجل وسجلت الفیلۃ وصہلت الخیل وکان القیامۃ اذا خرجت قد قامت واحست بالارض تقل تزلزلت (ص ۱۵۲)

لوگوں (فیل بانوں) میں ایک شور تھا۔ تمام ہاتی سجدے میں گر گئے اور گھوڑے ہنہنانے لگے، اس وقت قیامت کا منظر تھا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ زمین لرز رہی ہے۔

اس واقعے کو قاضی رشید نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم نے صرف ہندستان کے متعلق حصا مختصر لکھا ہے۔

کتاب "الذخائر والتحف" للقاضی رشید بن زبیر

کے یہ اقتباسات اس کا ثبوت ہیں کہ عرب اور ہندستان کے تعلقات کتنے قدیم ہیں، اور ان میں کتنے گہرے روابط تھے اس طرح کی اور بھی مختصر، مگر مفید باتیں اس کتاب میں ملتی ہیں، جن کا تعلق عرب اور ہندستان سے ہے۔ اسی طرح عہد رسالت اور خلفاے راشدین کے زمانہ کی بعض ایسی اہم باتیں بھی ملتی ہیں، جن کو قاضی رشید نے اپنے پیش رو مورخین کی کتابوں سے لیا ہے، جن میں سے اکثر کتابیں آج ناپید ہیں۔ اس لیے اس دور کی معلومات کے لیے یہ کتاب نادر و

نہیں طوفان سے ڈر مجھ کو لیکن سوچتا ہوں یہ
اگر کشتی ڈبونے لگ گیا ساحل تو کیا ہوگا

حیات جاوداں قسمت میں میری لکھی ہے لیکن
مسیحا بن گیا میرا اگر قاتل تو کیا ہوگا

نظر میں آج منزل ہے تو دل بے چین ہے اتنا
نظر سے ہو گئی اوجھل اگر منزل تو کیا ہوگا

وطن کے پاسبانوں کو تو آئے نیند کے جھونکے
اگر ہم بھی وطن سے ہو گئے غافل تو کیا ہوگا

ہزاروں سہہ چکا ہوں اور سہہ لوں گا ستم لیکن
مگر باغی کسی دن ہو گیا یہ دل تو کیا ہوگا

وفاداروں میں بھی رہ کر نہیں جب بدگمانی ہے
جفا کاروں میں بھی ہو گیا شامل تو کیا ہوگا

مری حق گوئیوں پر بے ادب تم نے کہا مجھ کو
بغاوت کر اٹھی ساری اگر محفل تو کیا ہوگا

ہمیں کیوں کر اب اس دور میں جینا ہی مشکل ہے
یہ مشکل اور بھی کچھ ہو گئی مشکل تو کیا ہوگا

الم میں، درد میں، تکلیف میں، ایسی مصیبت میں
اگر کچھ اور بھی میں چھوڑ بیٹھا دل تو کیا ہوگا

ابھی سے کہہ رہے ہو تم یہ شاعر ہے بڑا منہ پھٹ
اگلنے لگ گیا شعلے اگر خوشدل تو کیا ہوگا

اگر ہم بھی وطن سے غافل ہو گئے تو کیا ہوگا

پنڈت جواہر لال نہرو

شاہانِ مغلیہ کا شاہی کتب خانہ

پروفیسر سعید احمد رفیق

کسی ملک کی ثقافتی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس ملک کی تعلیمی ترقی کو پیش نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ ملک کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیے بغیر میدان ترقی میں اس کی جگہ تعین نہ صرف مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔ اگر ہمیں اس ملک کا اندازہ لگانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں ہندستان ترقی کی کن منازل کو طے کر رہا تھا، تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس زمانے کی تعلیمی حالت کا پتا لگانا ناگزیر ہے۔

(جلد دوم) تاریخ میں مسلمانوں نے تقریباً سات سو سال تک حکمرانی کی۔ ان کا دایرۂ عمل صرف سیاسی برتری حاصل کر کے ملک پر حکومت ہی کرنا نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ وہ حقیقی معنی میں ہندستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ اس لیے یہاں کی رعایا کی ہر قسم کی بھلائی بھی چاہتے تھے۔ اگر ایک طرف وہ اپنی سلطنت کی پائیداری کے متمنی تھے، تو دوسری طرف عوام کی خلاح، بہبودی اور ترقی بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز اشاعت علم و ہنر تھی۔ قطب الدین ایبک سے لے کر آخر مغل شہنشاہ تک عموماً اکثر حکمرانوں نے علم و ہنر کی اشاعت میں حصہ لیا، نہ صرف سلاطین دلی اور شہنشاہان مغلیہ، بلکہ مختلف صوبوں کے آزاد حکمرانوں اور صوبیداروں نے بھی اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہ کی۔ ان کے علاوہ امرا اور علما بھی اپنی طرف سے اشاعت علم و ہنر میں پورے کوشاں تھے۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے صدیوں پہلے جب کہ یورپ میں تعلیم گرجا کے حلقۂ اثر میں ہوتے ہوئے صرف وہی ایک جماعت مستفید ہو سکتی تھی۔ ہندستان میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح تعلیم عام تھی، نہ اس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی پابندی تھی اور نہ ہی مشکل۔

اشاعت علم و ہنر کے مختلف ذریعوں مثلاً مدارس، مکاتیب، مساجد، مدد معاش، تعلیمی مجالس وغیرہ کے علاوہ تعلیم کو عوام تک پہنچانے کا ایک زبردست ذریعہ کتب خانوں کا قیام ہے۔ کتب خانوں کی وقعت، ضرورت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں ہم اکثر کتب خانوں کا حال پڑھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی تعداد کا موجودہ زمانے کے کتب خانوں کی تعداد سے مقابلہ کرنا بیکار ہے۔ جس کی وجہ اس زمانے میں چھپائی کی غیر موجودگی اور جزبات کی طرف سے تساہلی تھا، لیکن چھپائی کی غیر موجودگی کے باوجود فن خطاطی اور وراقی کی موجودگی کی بنا پر کتابوں کے ملنے میں اس قدر دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا، جتنا اس فن کی غیر موجودگی میں کیا جاتا۔ بہرحال اس زمانے میں چھپائی کے نہ ہونے یا صحیح الفاظ میں اس کے ترقی نہ کرنے کی وجہ سے (کیونکہ ۱۵۷۷ء میں جنوبی ہندستان میں سب سے پہلی کتاب چھپ چکی تھی) کتابوں کا ملنا اس قدر آسان نہ تھا۔ لہٰذا کہ موجودہ زمانے میں۔ اس لیے کتابوں کی قدر و قیمت بھی زیادہ تھی۔ وہ بادشاہ، امرا اور علما جن کے پاس کتابوں کا ذخیرہ ہوتا تھا، انہیں اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ کتب خانے صرف علم پرور بادشاہ کی ملکیت نہ ہوتے تھے، بلکہ شاہی خاندان کے افراد، امرا اور علما کے پاس بھی اپنی ذاتی لائبریریاں ہوتی تھیں۔

تاریخ ہندستان میں ہمیں بہت سے کتب خانوں کا حال ملتا ہے۔ ان میں سب سے مشہور شہنشاہان مغلیہ کا شاہی کتب خانا ہے، جس کے متعلق ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ کتب خانا بلحاظ تعداد کتب اور وسعت نظام باقی تمام کتب خانوں سے بڑا ہوا تھا۔ اس کتب خانے کو مغلیہ خاندان کے ہر ہر شہنشاہ نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق ترقی دی۔ سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر کی سیاسی مصروفیتوں نے اسے علم و ادب کی طرف زیادا توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں دی، لیکن اس کی اس کی خداداد قابلیت اور ذہانت نے پورا کر دیا۔ وہ عربی فارسی اور ترکی زبانوں کا ماہر تھا۔ کئی تصانیف خد اس کے زور قلم کا نتیجا ہیں جن میں سب سے مشہور اس کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ بابر کا ترکی زبان کا دیوان اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے مشہور ہے۔ دیوان کی طرح اس کی مثنوی بھی مشہور ہے، جو اس نے اپنے لڑکے مرزا کامران کی تعلیم کی غرض سے لکھی تھی۔ بابر ہندستان میں بہت کم رہا، اور یہ زمانا بھی زیادا تر جنگ و جدال میں بسر ہوا۔ وہ ہندستان کو پوری طرح نہ دیکھ سکا۔ اس لیے اس نے اپنی تزک میں ہندستان کے متعلق کچھ اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بہرحال یہاں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ جہاں وہ ہندستان میں حمام اور کالج وغیرا کے وجود سے انکار کرتا ہے (چاہے یہ بات حقیقت سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو) کتب خانوں کے وجود سے انکار نہیں کرتا، بلکہ پنجاب کی ایک لائبریری کا ذکر کرتا ہے، جو غازی خان افغانی کی ملکیت تھی۔ اس کتب خانے میں دینیات کی کتابیں کافی تعداد میں موجود تھیں۔ دینیات کے علاوا یہاں اور بھی باقی علوم و فنون کی کتابیں تھیں۔ اس لائبریری میں سے بابر نے اپنے بیٹے ہمایون اور کامران کو کتابیں بھیجی تھیں۔

ہمایون بادشاہ بننے کے بعد جتنا عرصا بھی ہندستان میں رہا، اس کا زیادا وقت بغاوتیں صرف کرنے اور شیر شاہ کو مطیع کرنے کی بے کار کوششوں میں صرف ہوا، لیکن ان سیاسی مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے علمی اور ادبی فرایض کی طرف سے غافل نہ تھا۔ بچپن میں اس کی تعلیم پر کافی توجہ دی گئی تھی، اور وہ اپنے خاندان کے اکثر افراد کی طرح عالا درجے کا تعلیم یافتا تھا۔ علوم عقلی و نقلی کا ماہر تھا، اور شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتا تھا، لیکن جن علوم میں اسے خاص طور پر دلچسپی تھی وہ ریاضی، ہیئت، جغرافیا اور سائینس تھے۔ اس نے طبائع عناصر پر ایک رسالا لکھا تھا۔ کرۂ ارض اور اسطرلاب کو ہندستان میں رواج دینے کا سہرا بھی ہمایون ہی کے سر ہے۔ وہ خد اسطرلاب ہمایونی کا موجد ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب رصد گاہ بنانے میں منہمک تھا، جس میں مختلف رنگ کے شعاعی کمرے اختراع کیے گئے تھے۔ اور ان کمروں میں ہفتے کے مختلف دنوں میں ان سیاروں کے اعتبار سے دربار منعقد کیا جاتا تھا، لیکن علم ہیئت اور سائینس کی طرف اس قدر رغبت کے باوجود وہ صرف ایک خشک سائینداں بن کر نہ رہ گیا تھا۔ اسے شعر و ادب سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ طبع موزوں تھی۔ فرصت کے اوقات میں شعر کہتا اور ہمایوں تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی کا دیوان اکبر کے شاہی کتب خانے میں موجود تھا۔

ہمایون کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ مرزا ہندال کے زمانے میں وہ اس کے مطالعے میں رہا کرتی تھیں، بلکہ زمانۂ جنگ میں بھی وہ کتابیں ساتھ رکھتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ ہندستان سے بے سروسامانی کی حالت میں بھاگا تو ان چند چیزوں میں جو وہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا، اس کی منتخب لائبریری بھی تھی۔ اور اس کے چند ہمراہیوں میں اس کا مہتمم کتب خانا لال بیگ بھی تھا۔ دوبارا واپسی پر اس نے شیر منڈل میں اپنا کتب خانا قایم کیا، اور یہی وہ جگہ تھی جس کی سیڑھیوں سے گر کر ہمایون نے جان دی۔ جس شخص کی عمر کا ایک حصا باوجود اور بہت سی مصروفیتو

کے علم حاصل کرنے اور اس کی اشاعت میں صرف ہوا۔ اس کی موت بھی آتی ہے تو شوق علم و عبادت ہی میں۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس کے مقبرے سے سیکڑوں سال تک مدرسے کا کام لیا جاتا رہا۔ آج اس کے مقبرے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی چھت پر کسی زمانے میں ایک بڑا دارالعلوم تھا۔ جس کے اساتذہ بڑے بڑے علما اور صاحب اقتدار اصحاب ہوتے تھے اور طلبا مقبرے کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہا کرتے تھے۔

اکبر کو بار سلطنت اگرچہ بچپن کے زمانے ہی سے اٹھانا پڑا، لیکن یہ کہنا کہ وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا واقعات کو جھٹلانا ہے۔ یہاں ہمیں اس چیز سے بحث نہیں کہ وہ ان پڑھا تھا یا نہیں، بہرحال اس کی علم پروری اور اشاعت علم کی کوششوں میں کوئی شک اور شبے کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک شاہی کتب خانے کا تعلق ہے، اکبر نے اس کی بہت زیادہ توسیع کی۔ شروع میں اس کا مہتمم ملا محمد تھا، لیکن زیادہ عرصے تک یہ ملک الشعرا فیضی کے زیر اہتمام رہا۔ اس کے زیر اہتمام کتب خانہ جس قدر بھی ترقی کرتا وہ اکبر و فیضی کے ذوق علم کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہ تھی۔ کتب خانوں کی تمام کتابوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا (۱) قصہ، شاعری، طب، نجوم اور موسیقی (۲) لسانیات، فلسفہ، صوفیانا، علم ہیئت اور اقلیدس، اور (۳) تفسیر، احادیث، دینیات اور قرآن۔ اکبر نے کتب خانے کو دو مقامات پر تقسیم کر دیا تھا، ایک قصر شاہی کے اندر اور دوسرا باہر۔ آئین اکبری میں ہے "جہاں پناہ نے اپنے تجربہ علمی سے کتب خانہ چند حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ کتب خانے کی ایک شاخ قصر شاہی کے اندر ہے اور ایک باہر۔ ان دونوں شاخوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ تمام علوم و فنون کی کتب و رسایل، قیمت و فنون کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف مدارج میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور ہندی، فارسی، یونانی، کشمیری و عربی زبانوں کی کتابیں نظم و نثر کے اختلاف کے لحاظ سے ترتیب وار پیش گاہ حضور میں لائی جاتی ہیں۔" اس کتب خانے میں ۲۴ ہزار کے قریب قلمی کتابیں تھیں، جن کی قیمت کا اندازا اسمتھ نے ساڑھے پینتیس لاکھ روپے لگایا ہے۔

حواس التوجہ کی کاوشوں نے اس کتب خانے میں اور بھی بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا۔ اکبر کے عہد میں مہابھارت، رامائن، اتھروید، ہرونس، لیلاوتی اور تاجک کا سنسکرت سے، معجم البلدان، جواۃ الجواہر کا عربی سے اور واقعات بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ ان کے علاوہ اسکھاسن بتیسی اور کلیلہ دمنہ کے بھی تراجم ہوئے اور ان کے نام ترتیب وار "نامہ خرد افزا" "عیار دانش" رکھے گئے۔ فیضی نے نل دمن کا فیضی نے مثنوی لیلا نجوں کی بحر میں فارسی میں ترجمہ کیا۔ تاریخ کشمیر کا بھی اسی کے عہد میں ترجمہ ہوا۔ تراجم کے علاوہ اس عہد میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، جن میں تاریخ الفی، اکبر نامہ، آئین اکبری، سواطع الالہام، مواد الکلم، الاحادیث اور نجات الرشید خاص طور پر مشہور ہیں، ان تمام کتب نے کتب خانے میں اور چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کتب خانے میں وقتاً فوقتاً اور کتابیں بھی جمع ہوتی رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو کسی دوسرے پورے کتب خانے کی کتابیں شاہی لائبریری میں منتقل کر دی جاتی تھیں۔ فتح گجرات کے موقع پر اعتماد خان کی لائبریری کی تمام کتابیں شاہی کتب خانے میں جمع کر دی گئی تھیں، لیکن مغل شہنشاہوں کو کتابیں صرف جمع ہی کرنے کا شوق نہ تھا، بلکہ وہ انہیں علما میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اکبر نے پہلے تو اعتماد خان کے کتب خانے کی تمام کتابیں شاہی لائبریری میں منتقل کرا دی تھیں، لیکن بعد میں ان میں سے بہت سی کتابیں اس کے حکم سے علما میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اکبر نے فیضی کے مرنے کے بعد اس کی لائبریری بھی شاہی کتب خانے میں شامل کر لی تھی۔ فیضی کے

کتب خانے میں چار ہزار چھ سو کتابیں تھیں۔ فیضی خدسو سے زیادا کتابوں کا مصنف تھا۔ اور اس کے باپ شیخ مبارک نے اپنی زندگی میں پانسو کتابیں نقل کی تھیں، باپ اور بیٹوں کی قابلیت اور علمی ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد کچھ بھی زیادا نہیں۔ اسی زمانے میں عبدالرحیم خانخانان کی لائبریری بھی بہت مشہور تھی۔ خانخاناں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کا زبردست عالم اور فارسی اور ہندی کا مشہور شاعر تھا۔ عالموں کو جتنا اس کی ذات سے فیض پہنچا تھا اتنا کسی اور سے پہنچا ہوگا۔ درس تدریس سے بھی اسے شوق تھا۔ وہ طلبا کو خد درس دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک کتب خانا تھا۔ یہ کتب خانا بجاے خد ایک اکاڈیمی (دارالحکمت) کا کام دیتا تھا جس سے عوام کو مستفید ہونے کی عام اجازت تھی۔

جہانگیر کے زمانے میں شاہی کتب خانے کا مہتمم مکتوب خان تھا۔ جہانگیر کو کتابوں کا اس قدر شوق تھا کہ سفر میں بھی کتابیں اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ عہد اکبری کی طرح اس کے عہد میں بھی تصنیف اور تالیف کا کام برابر جاری رہا۔ جس نے شاہی کتب خانے میں قابل قدر اضافا کیا۔ وہ خد بھی صاحب تصنیف تھا۔ اس نے محمد ہادی اور معتمد خان کی مدد سے اپنی تزک آپ لکھی۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اس نے خشونیسوں کو اس کی نقل کا حکم دیا، اور ان کاپیوں کو امرا اور شہزادوں میں تقسیم کیا گیا۔ سب سے پہلی کاپی شاہجہاں کو دی گئی تھی۔ اگرچہ اس کی تصانیف اور بھی ہیں مثلاً پند نامہ، مگر اس کا علمی شاہکار اس کی تزک ہی ہے۔ اسے فنون لطیفا اور خاص کر فن مصوری سے خاص شغف تھا، اس لیے اس نے مصوری کے بہترین شاہکار اپنے پاس جمع کیے۔ اس نے ان عجیب وغریب جانوروں کی جن کا ذکر اپنی تزک میں کیا ہے۔ تصاویر بھی تیار کروائی تھیں، اور انہیں تزک میں شامل کر دیا تھا، تاکہ پڑھنے والے ان کے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ ان کی شبیہہ بھی دیکھ سکیں۔ تزک کے علاوا اس نے شاہی کتب خانے میں بہت سی اور کتابیں بھی عالموں کو دی تھیں، تفسیر حسینی، تفسیر کاشفی، اور روضتہ الاحباب گجرات کے شوخ کو دی گئی تھیں۔ جن کی پشت پر اس نے خد اپنے ہاتھ سے اپنے گجرات پہنچنے اور کتابوں کو دینے کی تاریخیں درج کی تھیں۔ شاہجہاں کو اگرچے فن تعمیر کے علاوا اور فنون لطیفا مثلاً شاعری اور موسیقی سے بھی کافی دلچسپی تھی، لیکن علم وادب میں اس کے تاریخ کے شوق نے باقی دو سرے علوم کی طرف توجہ کو ماند کر دیا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ اس کے ذوق تاریخ کی زندا مثال ہے۔ اس کے زمانے میں شاہی کتب خانا برابر ترقی کرتا رہا۔ اور کتب تاریخ کے علاوا اور بھی مختلف کتابوں کا اضافا ہوا۔ دارا شکوہ اگرچے تخت نشینی حاصل کرنے میں کامیاب رہا، لیکن شاہجہاں کے آخر زمانے حکومت میں اسے کافی اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ وہ فارسی اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا اور اکثر کتابوں کا مصنف سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، نادر النکات، حسنات العارفین، مکالمہ بابا لال داس، رسالۂ حق نما، مجموعۃ البحرین اس کی تصانیف ہیں۔ اس نے اپنشد، بھگوت گیتا، جوگ واشٹھا اور رامائن وغیرا کا سنسکرت سے فارسی میں ترجما بھی کرایا تھا۔ اس کا شوق علم وادب شاہی کتب خانے کی ترقی کا موجب بنا اور کتب خانے میں مزید کتب کا اضافا ہوا۔

جہاں تک علم وادب کا تعلق ہے اورنگ زیب بلاشک وشبا تمام محل نشینشاہوں میں سب سے بڑا عالم اور عامل تھا۔ تبحر علمی، کثرت مطالعا، اور وسیع نظری میں وہ ان تمام پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی عقل وفراست اور ذہن رسا کی بدولت صاحب علم بادشاہوں میں وہ رتبا پیدا کیا، جو کم فرمانروادوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ یہ تو ضرور ہے کہ نہ اسے اپنے دادا کی طرح مصوری وشاعری کا زیادا شوق تھا، اور نہ باپ کی طرح تاریخ کا، لیکن

وہ علوم دینیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کا ماہر تھا۔ اسے انشا پردازی میں کمال حاصل تھا۔ اس کے رقعات کے تین مجموعے کلمات طیبات، قائم کرائم، اور دستور العمل آگاہی و آداب عالمگیری کے خطوط اس کی انشا پردازی پر صاد ہیں۔

اورنگ زیب کو مذہب سے خاص شغف تھا۔ اس نے شاہی کتب خانے میں مذہبی کتب کا کافی اضافہ کیا۔ اورنگ زیب کے زمانے کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" کے حوالوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہی کتب خانے میں مذہبی کتب کا کس قدر عالا ذخیرہ موجود تھا۔ عالمگیر کے زمانے میں شاہی کتب خانے میں عہد اکبری کی طرح بہت اضافہ ہوا۔ بیجاپور کی فتح کے بعد وہاں سے عمدا، نایاب اور قیمتی کتابیں گاڑیاں بھر بھر کر شاہی کتب خانے میں منتقل کرادی گئی تھیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ محمود گاوان کے ذاتی کتب خانے اور کالج لائبریری بھی بیجاپور کی شاہی لائبریری میں کبھی نہ کبھی منتقل ہوگئی ہوں۔ محمود گاوان، خاندان بہمنی کا مشہور وزیر اپنے علم و فراست اور علم پروری کی وجہ سے اپنے زمانے میں خاص شہرت کا مالک تھا۔ بدر کا مدرسا، اور اس کا مدرسے کا کتب خانا اس کے شوق علم و ادب کا زبردست ثبوت تھے۔ جس طرح مدرسا اپنی نفیس عمارت اور اعالا تعلیم کے لیے مشہور تھا۔ اسی طرح مدرسے کا کتب خانا بھی بہت مشہور تھا۔ فرشتا اس لائبریری کی کتابوں کی تعداد تین ہزار بتاتا ہے۔ یہ لائبریری مدرسے کے اساتذا اور طلبا کے لیے وقف تھی۔ اس کے ذاتی کتب خانے کی کتابوں کی تعداد، بہ روایت عدیقۃ الاقلیم صفحۂ مرتضیٰ حسین ۳۵ ہزار تھی۔ ان کتب کی موجودگی سے ہم بیجاپور کی لائبریری کی وقعت کا اندازا لگا سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس اضافے کا بھی جو ان کتب کی وجہ سے شاہی کتب خانے میں ہوا۔ اس شاہی کتب خانے کے علاوا خاندان مغلیا کے شہزادوں کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی تھے، جن کی کتابیں بھی آخر کار شاہی کتب خانے کی زینت کا موجب ہی ہتیں۔

ان ذاتی کتب خانوں میں گلبدن بانو بیگم، سلیمہ سلطانہ، جہاں آرا اور زیب النسا کے کتب خانے کافی مشہور تھے۔ شہزادی زیب النسا کا ذوق علم و ادب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی تھا۔ ہر فن کے علما فضلا موجود تھے۔ جو ہمیشا تصنیف اور تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ شہزادی کے تصنیف اور تالیف کے محکمے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانا بھی تھا، جس سے مصنفین استفادا کرتے تھے۔ مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانے میں مختلف علوم و فنون پر بیش بہا کتابیں موجود تھیں۔ اس کتب خانے کا انتظام ملا محمد شفیع کے سپرد تھا۔ افسوس کہ ایسی نایاب لائبریری کو جسے چھ شہزادوں نے انتہائی محنت سے جمع کیا، شہزادوں اور شہزادیوں اور امرانے اسے ترقی دینے میں پوری کوشش کی جس میں پنجاب کے غازی خان کے کتب خانے، گجرات کے اعتماد خان کے کتب خانے اور بیجاپور کی شاہی لائبریری کی کتابیں جمع کی گئیں۔ نادر شاہ برباد کر گیا۔ اور اس کی کچھ کتابیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس سے زیادا افسوس کا مقام یہ ہے کہ نادر شاہ کی لوٹ میں جہاں تخت طاوس کا ذکر اس رقت آمیز طریقے سے کیا جاتا ہے، وہاں شاہی کتب خانے کا ذکر بہت ہی کم ہوتا ہے، اور وہ بھی معمولی چیز کی حیثیت سے۔ گو یہ حقیقت ہے کہ کتب خانا قیمت میں تخت طاوس سے کسی طرح کم نہ تھا اور قدر و وقعت میں تو تخت طاوس اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا۔ نادر شاہ کی لوٹ کے بعد خاندان مغلیا کے آخری حکمرانوں نے بھی اس کتب خانے کو پھر سے مرتب کیا اور اس میں کافی اضافا کیا۔ بعض وقات حضرت شاہ عبدالعزیز شاہی کتب خانے سے استفادا کرتے تھے۔ اسی طرح آخری زمانے کے مشہور عالم میاں نذیر حسین محدث شاہی کتب خانے مستفید ہوتے تھے۔ شہنشاہان مغلیا کے کتب خانے کی آخری اور مکمل بربادی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ہاتوں ہوئی۔ جب دلی پر انگریزوں کا

سمجھوتا

کرشن چندر

واسنت مراٹھے کی شادی شاردا دیسائی سے ہوئی تھی۔ شاردا گجراتن تھی اور وسنت مراٹھا تھا۔ اور یہ شادی کبھی نہ ہوتی۔ اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چمبور میں لالٹین بنانے کا کارخانا نہ ہوتا۔ اور اس کے کارخانے کے قریب شاردا کا باپ مگن لال دیسائی اپنا کانچ کا کارخانا کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لالٹین بنانے کا سارا سامان تیار ہوتا تھا، سوائے کانچ کے ہنڈے کے۔ اور یہ ہنڈا دیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا، اس لیے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لالٹین مکمل ہو گئی۔

واسنت نائے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا۔ اور دور سے بلکل اپنے کارخانے کی لالٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا تھا۔ شاردا گورے رنگ کی لانبے قد کی بڑی بڑی آنکھوں والی نازک بدن کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے محبت ہو گئی، کیونکہ ہندستان میں شادی پہلے ہوتی ہے، محبت بعد میں ہوتی ہے۔ یورپ میں محبت پہلے ہوتی ہے۔ شادی بعد میں ہوتی ہے، بچا دونوں صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

واسنت اور شاردا کے دو بچے تھے۔ لکشمن اور کملا لکشمن چھ سال کا تھا۔ کملا چار سال کی تھی۔ دونوں میاں بیوی بڑے مزے میں اپنے بچوں کے ساتھ چار بیڈ روم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے، جس کا نام لالٹین واس تھا۔ یہ فلیٹ مگن لال دیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔

جس دن لکشمن پیدا ہوا، اس دن اس کے دادا رام مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لالٹینوں کے ساتھ ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانا بھی چالو کر دیا۔ پھر جس دن شاردا کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس دن لڑکی کے نانا نے تھرمامیٹر بنانے کا کارخانا بھی شروع کر دیا۔ اور مگن لال دیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا بیرومیٹر واسنت اور شاردا کے گھر میں لگا دیا۔ تاکہ دونوں میاں بیوی کے سمے ایک دوسرے کے ٹمپریچر کا اندازا ہوتا رہے!

شاردی کی زندگی کے سات سال بڑے مزے میں کٹے گئے۔ پھر جس دن رنگا ریڈی نے صابن بنانے کا کارخانا سائین میں چالو کیا، اور سرزار چانن نگر نے داور میں وی گریٹ مون شائین نلم کمپنی کا ہوورت کیا۔ اسٹوڈیو بمبئی میں ایک طوفان اٹھا۔ ہنگاما ہوا، گولی چلی، ڑاموں پہ پتھراؤ ہوا۔ سیکڑوں لوگ زخمی ہوئے، اور دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھوں کے سامنے لال ہو گئیں اور اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پہ پٹخ دیا۔ اور بولا۔

"چھے"؟

"صوں چھے؟" شاردا بولی

واسنت نے کہا یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئی ایکلی مراٹھوں کی نہیں ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ بمبئی ہماری ہے۔ ہنستا ہماری رہے گی ہم مراٹھوں کی! شاردا نرمی سے بولی!

"ہاں ہاں بمبئی تمہاری ہے۔ بیشک تمہاری ہے، لیکن وہ ہماری بھی تو ہے ہم گجراتیوں کی!"

"واہ بمبئی تمہاری کیسی ہو گئی؟ بمبئی تو مراٹھوں کی ہے!"

"نہیں وہ گجراتیوں کی ہے" شاردا ذرا غصے سے بولی "یہ سارا شہر ہم نے بنایا ہے۔ اس کا بزنس ہم نے چلایا ہے اس کا کارخانا ہم نے لگایا ہے..... تم کدھر سے حق جتانے لگے۔ ہماری بمبئی پر؟"

"تم نے بنایا ہے؟ ——— لیکن اس شہر کو بسایا کس نے ہے؟ ——— بزنس ضرور تم نے چلایا ہے، لیکن اس بزنس کو پھیلایا کس نے ہے؟ کارخانا لگایا تم نے ہے، لیکن کارخانے میں کام کون کرتا ہے؟ ——— ہمارے مہاراشٹرا کا مزدور! سمجھیں؟ ——— بمبئی آمچی آہے! ———"

واسنت نے آملیٹ کو چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"نا بمبئی اماری چھے!" شاردا بھی پلیٹ کنارے پر نمک چھڑک کر بولی۔

"تمی گدی کھوٹا بولتا!"

"تمے جسے کہو چھے تے چھٹو چھے۔ شدن چھوٹو چھے!"

"بمبئی آمچی آہے۔"

"نا۔ ماری چھے!"

واسنت نے چائے کا چمچا زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری کانٹے پلیٹ میں پھینک دیے۔ دونوں ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جا کر بند ہو گئے بچے سہم کر سسکنے لگے۔

جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال دیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بوڑھے نوجوان میاں بیوی کی حماقت پر بڑے ہنسے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا۔

"مگن بھائی۔ ہمارے بچے بھی کس قدر بھولے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مہاراشٹرا بن جائے چاہے گجرات الگ ہو جائے، مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت رہے گی، اور مراٹھوں کو گجراتیوں کی۔"

"ہاں: جیسے تمہاری لالٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمہاری لالٹین کی!" مگن لال دیسائی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بلکل"! رام مراٹھا سر ہلا کر بولا۔

"تو چلو، چل کر ان دونوں بیوقوفوں کو سمجھائیں!" مگن لال دیسائی نے تجویز پیش کی۔ اور دونوں بزرگ اسی وقت اپنی اپنی آرام کرسیوں سے اٹھے۔ اور موٹر میں بیٹھ کر لالٹین نواس پہنچے، اور وہاں جا کر واسنت اور شاردا کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔

واسنت کے باپ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"شرم نہیں آتی۔ بیوی بہو کو تنگ کرتا ہے۔" مگن بھائی نے شاردا سے کہا "نالائق! اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے؟"

"میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتاجی!" شاردا سسکتے ہوئے بولی "یہی جھگڑا کرتے ہیں۔ بولتے ہیں۔ تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہوتے ہو۔ ہمیشہ ہم مراٹھوں کا حق مارتے رہتے ہو۔"

"ایسا؟" مگن لال دیسائی چوکنا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔ واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا "پتاجی! شاردا کہتی ہے کہ ایکا بمبئی گجراتی لوگوں نے بنایا ہے۔ اور اس شہر کا سارا بزنس اس کا سارا دھندا گجراتی لوگ چلاتے ہیں۔ شاردا بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں۔"

"ایسا؟" رام مراٹھے نے گھور کر شاردا کی طرف دیکھا اور گرج کر پوچھا "کیا تم نے ایسا کہا تھا؟" اور یہ کہتے کہتے رام مراٹھے غصے سے کھڑا ہو گیا۔ پیشتر اس کے کہ شاردا کوئی جواب دیتی اس کے باپ نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا اور خود رام مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ "اگر میری بیٹی نے نہیں بھی کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے کہا ہے، اور جو اس نے کہا ہے وہ بلکل ٹھیک کہا ہے۔"

رام مراٹھے دانت پیس کر آگے بڑا اور بولا۔

"اگر تمہاری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے نے بھی جو کہا ہے، سو فی صدی ٹھیک کہا ہے۔ بمبئی آمچی آہے۔"

"بمبئی اماری چھے!" مگن لال دیسائی نے چلا کر کہا۔

اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے بولا "چل بیٹی اپنے گھر چل، ہم کوئی ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں۔"

"جاتے ہو تو جاؤ"۔ رام مراٹھے اپنی چھڑی ہوا میں گھما کر بولا "مگر کہے دیتا ہوں، دوبارا اس گھر میں گھسے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے۔ جیسے بمبئی تمہارے باپ کی ہے۔"

"ہاں! ہاں! بمبئی میرے باپ کی ہے، بلکہ میرے باپ کے باپ کی ہے۔" واسنت کا باپ گرجکر بولا "جے مہاراشٹر!"

"جے مہا گجرات!" نگن لال دیسائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اپنی بیٹی اور بچوں کو لے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

.....

آج واسنت کے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شاردا کو گھر چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال سے واسنت نے نہ شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ اپنے بچوں کی، اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آندولن چلے، اپس کے لڑائی جھگڑے ہوئے، مگر آخر میں سمجھوتا ہو گیا۔ بمبئی کا صوبا تقسیم ہو گیا۔ گجرات کا صوبا الگ بن گیا۔ مہاراشٹر کا صوبا الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ نے بھی پاس کر دیا۔ ہر چیز طے ہو گئی۔ ختم ہو گئی۔ ساری تقریریں اور کروتیں دھوڈالی گئیں۔ اور آج ۲۹ اپریل کو تو روشنیوں کا دن تھا۔ گانے، ناچ، جلسے، جلوس، ہنگامے، غل غپاڑے، تماشے، شاعرے، کوی سمیلن، نعرے، ڈھول، تاشے، باجے گاجے لوگوں نے آج ساری بمبئی میں روشنی کی تھی اور اسے دلہن کی طرح سجا دیا تھا، مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دو رویہ درختوں پر بجلی کے ہزاروں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ہواؤں میں خنکی تھی۔ فضاؤں میں قہقہے تھے۔ عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے جوڑے میں تتلی کی دبی سجائے ہوئے بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گذر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنے بیوی بچوں کی یاد سے بے چین ہو اٹھا۔ کئی بار اس سے پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی کے صلح کر کے اسے بچوں سمیت واپس بلا لائے، مگر ہر بار ایک جھوٹی عزت اس کا دامن پکڑ کر روک لیتی تھی۔ آج اسے نہ صرف شاردا، بلکہ اپنے پیارے بچے بھی کتنے یاد آ رہے تھے۔ نتا لکشمی اور بھولی کملا، ان دونوں معصوم بچوں کی صورتیں گویا اس کے دل کے دامن کو پکڑنے لگیں! اور وہ سوچنے لگا بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا۔ بلا وجہ بھی اپنا گھر برباد گیا ـــــ بھلا کیوں؟ بمبئی کے مہاراشٹر میں آجانے سے کیا اس کی صورت بدل گئی ہے؟ کیا اس کا سیرین ڈوائیو الٹ کر پونا چلا گیا ہے؟ کیا ٹراموے کا ایکسٹرا فیکٹو ریزرو رکھ دیا گیا ہے؟ کیا فورٹ کا علاقہ گیا ڈے میں آباد کر دیا گیا ہے؟ کیا آج بھی ڈوگ سڑکوں پر نہیں سوتے۔ غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے ـــــ دکھ اور درد کا درمان نہیں ڈھونڈ لے؟ مفلسی اور موت کا سامنا نہیں کرتے؟ ـــ پھر کس لیے اس نے اس قدر جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کر لیا اور اپنے بچوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔

آج ہر گھر میں روشنی ہے۔ صرف اس کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اور اس کے دل میں ہمت باقی نہیں ہے کہ اپنے اندھیرے کونے سے اٹھ کر ایک بتی بھی روشن کر دے۔

وہ دیر تک اسی طرح جلتا کڑھتا سوچتا رہا، اور ایک اندھیرے کونے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا۔ اور اس کے چاروں طرف خوشیوں کا جلوس گذرتا رہا۔ دو تین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی۔ جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو، مگر آج وہ کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا، اس لیے وہ اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔ جو بھی ہو گا خود ہی دروازہ پیٹ کر چلا جائے گا، یا بہت ہی ڈھیٹ ہو گا تو خود ہی اندر آجائے گا۔

پھر ایکا ایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "ارے آج خوشیوں کے روز یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟" اور اس آواز کے ساتھ ساتھ ایک بتی جگی اور اس بتی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے میں شاردا بچوں کو انگلی سے لگائے کھڑی ہے، اور مسکرا رہی ہے۔

ایک لمحے کے لیے اس نے چونک کر شاردا کی طرف دیکھا، جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ پھر وہ یکلخت اپنی کرسی سے اٹھا اور دوڑ کر دروازے کی طرف گیا اور جھپٹ کر اس نے جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھالیا، اور انہیں پیار کرنے لگا۔

شاردا نے ایکا ایک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جاکر بولی "شرم نہیں آتی ہے لوگوں کو مہاراشٹر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا کرتے ہیں"

واسنت کچھ نہ بولا، مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیئے قطار اندر قطار مسکرانے لگے۔ پھر وہ دھیرے اپنی بیوی کے قریب گیا۔ اور سر جھکا کے بولا۔

"شاردا مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آگئی ہو؟"

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیئوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا "کیوں نہ آتی! کیا یہ گھر میرا نہیں ہے؟ کیا یہ بمبئی شہر میرا نہیں ہے؟" شاردا نے بے خوف نگاہوں واسنت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بمبئی آچی آہے" واسنت نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری مجھے! تن من تمہاری مجھے!! — نہ صرف بمبئی تمہاری ہے۔ یہ گھر بھی تیرا ہے۔ اور میں خدیجی تیرا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوالو"

شاردا کا چہرا خشی سے کھلنا رہو گیا۔ اس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی بولی میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی۔ میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے، نہ میرا ہے۔ یہ سارا دیس ہمارا ہے، اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندی، بنگالی اور نیپالی، ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں۔ ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ گو صوبے الگ الگ ہیں، مگر ملک ایک ہے۔ گو کمرے الگ الگ ہیں، مگر گھر ایک ہے۔ میں گجراتی ہوں تم مراٹھے ہو، مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک ہے۔

واسنت نے مسکرا کر شاردا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور پھر بچوں کو لے کر باہر بالکونی میں آگیا۔ جہاں ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

جشن آزادی

انوار افسری

(ترنم کے ساتھ)

اب مرے دیس میں آزادی ہی آزادی ہے

اب مسافر کوئی لوٹنے والا ہی نہیں۔
اب یہاں کرب نہیں، غم نہیں جانکاہی نہیں
اب ترقی کے کسی کام میں کوتاہی نہیں

اب مرے دیس میں آزادی ہی آزادی ہے

اہل جبر، اہل ستم، اہل جفا بھاگ گئے
دوست احباب کی صورت میں فریبی ہے
کشور ہند کے ذرے بھی گہر تاب ہوئے

اب مرے دیس میں آزادی ہی آزادی ہے

بے زبو، بیکسو، افلاس زدو، جشن مناؤ!
راہ دشوار کے ثابت قدمو، جشن مناؤ!
خوش رہو، غم نہ کرو، غم نہ کرو، جشن مناؤ!

اب مرے دیس میں آزادی ہی آزادی ہے

شہزادے اندلس

قاضی زین العابدین میرٹھی

غرناطہ کا آخری مسلمان تاجدار ابو عبداللہ عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ایزابیلا کے لشکروں سے شکست کھا کر خلیج روم کے کنارے جبل الطارق کے دامن میں یاس و حسرت کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ حرم سلطانی کی بیگمات، شہزادے، شہزادیاں اور دولت بنی احمر کے جلیل القدر اراکین اسے جھرمٹ میں لیے ہوئے ہیں۔

ابو عبداللہ افریقا کی طرف بھاگنے کے لیے تیار ہے اور سمندر میں ایک کشتی اس کے انتظار میں چکر کاٹ رہی ہے سلطان نے اس سرزمین پر جہاں اس نے اور اس کے اسلاف نے صدیوں جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی تھی۔ ایک آخری اور پرحسرت نظر ڈالی۔ زمانے کے انقلابات و حوادث کی دلدوز تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی اور وہ چادر کا پلو آنکھوں پر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ جو لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے، اور بمشکل اپنے آنسو ضبط کر رہے تھے، اب وہ بھی ضبط نہ کر سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کا کنارا اچھا خاصا ماتم کدا بن گیا۔ آہ و زاری کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں، اور آنسوؤں کی جھڑیاں ساون بھادوں کا سماں دکھا رہی تھیں۔

سلطان دنیا و مافیہا سے غافل آنسوؤں کے دریا بہا رہا تھا کہ وہ ایک گرجتی ہوئی آواز سن کر چونک پڑا۔ سلطان نے آنسو پونچھے اور نظر اوپر اٹھائی ایک سفید ریش بزرگ کو پہاڑ کے اوپر عصا کے سہارے کھڑا ہوا دیکھا۔ جو بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

اے سلطان! افسوس تو مرد ناداد اپنی سلطنت کی حفاظت نہ کر سکا۔ اب تیری یہی سزا ہے کہ تو عورتوں کی طرح اس کے غم میں آنسو بہائے تو کل بہت ہنسا ہے آج دل کھول کر رو بھی لے۔ اس لیے کہ رنج و راحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح روز روشن کے بعد شب تاریک کا آنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسرت کے بعد غم کا وجود یقینی۔ اگر تیرا ملک کسی بلائے آسمانی کے سبب ہاتھ سے نکل جاتا تو قابل رحم تھا، لیکن افسوس کہ تو نے اسے اپنے کرتوتوں سے ضایع کر دیا، اور آج تیری مصیبت میں تیرا کوئی ہمدرد نہیں۔ خدا نے تجھے لاکھوں نعمتوں سے مالا مال کیا تھا، لیکن تاج و تخت کی ہوس نے تجھے اندھا کر دیا۔ تو اپنے خاندانی دشمنوں کی مدد کے بھروسے پر اپنے چچا کے مقابلے میں میدان جنگ میں اتر آیا۔ افسوس تمہارے دشمنوں نے تمہارے سروں کو اپنے ہاتھوں میں لے ٹکرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارے قدموں کے نیچے خون کا دریا موجیں مارنے لگا۔ اور تم دونوں اس میں غرق ہو گئے۔

اے بنی احمر! میں سات سال سے اس پہاڑ کی چوٹی پر تمہارے انجام بد کا انتظار کر رہا تھا، اور اس وقت کا منتظر تھا، جب تمہاری سلطنت کا آخری تاجدار اندلس کو الوداع کہے۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ جس سلطنت کے حکمراں جاہل و نامنہم ہوتے ہیں اسے دوام و بقا نصیب

نہیں ہوتی، افسوس! تم آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آنے لگا۔ تم مسلمانوں کو رزم گاہ میں کھینچ کر لے گئے اور خون کی ندیاں بہا دیں۔ تمہارے دشمن تمہاری تباہی اور بربادی کا انتظار کر رہے تھے اور تمہاری خانہ جنگیوں کو اپنی کامیابی و کامرانی کا زینہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ جب تم اپنی قوت خاک میں ملا چکے تو انہوں نے جھٹ تمہیں آ دبوچا اور آن واحد میں پیسا کر دیا۔

اے سلاطین اسلام! تمہیں کل قیامت کے دن اس قہار و جبار کی درگاہ میں جواب دہی کرنا ہوگی۔ وہ تم سے اسلام سے متعلق سوال کرے گا کہ تم نے اس کی عزت و حرمت کو کیوں خاک میں ملا دیا۔ وہ تم سے مسلمانوں کے متعلق دریافت کرے گا کہ تم نے انہیں دشمنوں کے قبضے میں دے کر ذلت و نکبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ وہ تم سے ان اسلامی شہروں کے متعلق پوچھے گا جنہیں تمہارے اسلاف نے اپنی جانیں قربان کر کے فتح کیا تھا۔ اور وہ اب تمہاری امانت میں تھے، مگر تم اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے بتاؤ بتاؤ! تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے۔

آہ جن مساجد کے میناروں پر کبھی تکبیر کے غلغلے تھے آج وہاں سے ناقوس کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور وہ سرزمین جو مسلمانوں کی جبین نیاز سے آباد تھی۔ عیسائیوں کی چوٹیوں سے پامال ہو رہی ہے! آہ آج مسلم پر خدا کی زمین تنگ ہو رہی ہے۔ اور وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں کے سوا کہیں جگہ نہیں پاتا جہاں اطمینان کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکے۔

اے بنی احمر! تم نے میری اولاد کو بڑا پے میں حج سے چھینا۔ اور انہیں میدان کارزار میں ان کے بھائیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ افسوس وہ تمہاری خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اے کاش! وہ دشمنوں کے مقابلے میں داد شجاعت حاصل کرتے۔ اور میں اپنے دل کو یہ سمجھ کر ہی تسکین دے سکتا کہ میرے بچے ملک و ملت پر قربان ہو گئے، مگر ہائے قسمت! وہ تو ایسی موت مارے گئے جو ناقابل فخر ہے اور نہ باعث شرف۔ اور آج میں اس ٹوٹی ہوئی چٹان پر اس وحشت ناک غار میں ان کے غم میں رو رو کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ اور ہر وقت خدا سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے جلد ان کے پاس پہنچا دے۔

اب بوڑھے کی آواز بھرا گئی اور وہ زار و قطار روتا ہوا اپنے عصا کے سہارے آہستہ آہستہ غار میں داخل ہو گیا، عیسائی لشکروں سے شکست کھا کر اور تاج و تخت سے محروم ہو کر سلطان کے دل پر وہ اثر نہ ہوا تھا جو بوڑھے کی وقت خیز تقریر سے ہوا۔ سلطان نے چلا کر کہا خدا کی قسم یہ آواز عدل الٰہی کی تھی۔ انسان کی نہ تھی۔ افسوس! میری داستان شقاوت کے آنے والے باب پچھلے بابوں سے کہیں زیادہ دردناک ہیں۔ آہ! میرے اعمال ایسے قابل شرم ہیں کہ اگر خدا مجھے بڑے سے بڑے عذاب میں گرفتار کرے تو مجھے مجال دم زدن نہیں۔ یہ کہہ کر سلطان کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھی بھی سوار ہو گئے اور کشتی موجوں کو چیرتی ہوئی انہیں افریقا کی طرف لے چلی۔ اس طرح اسلامی حکومت کا آفتاب آٹھ سو سال تک اندلس کے ذرے ذرے کو جگمگاتے رہنے کے بعد جہاں سے طلوع ہوا تھا وہیں غروب ہو گیا۔

(۲)

چھ بیس سال بعد افریقا میں اس جلاوطن شاہی خاندان کا صرف ایک فرد سعید باقی رہ گیا۔ سعید نے کبھی غرناطہ نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھیں قصر الحمرا، المرج، جنت العریف، نہر شنیل، عین الدمع اور جبل الثلج سے تخلیقاً آشنا تھیں، لیکن اس کے حافظے میں وہ نغمہ گیت جو اس کے خاندان کی عورتیں اسے جھولے میں جھلاتے وقت گایا کرتی تھیں۔ اور ان میں اپنے خاندان کے گذشتہ جاہ و جلال کا تذکرہ کیا کرتی تھیں، اور وہ دردانگیز مرثیے جن میں شعرائے اندلس نے بنی احمر کی عظیم الشان سلطنت کی بربادی کا ماتم کیا تھا محفوظ تھے۔ وہ جب کبھی تنہا بیٹھتا

تو ان گیتوں اور مرثیوں کو درد ناک لہجے میں پڑھتا اور پھر وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکتا اور اتنا روتا کہ روتے روتے بے ہوش ہو جاتا۔ دنیا سے وہ بیزار تھا۔ اس دار محن میں اس کی کوئی تمنا سوائے اس کے نہ تھی کہ وہ اسے چھوڑنے سے پیشتر اپنے خاندان عظمت مرداکی زندہ یادگار غرناطا کو دیکھ لے۔

چنانچہ وہ اس تمنا کو دل میں لیے ہوئے سبتا سے جہاز میں سوار ہو کر ساحل مالقا پر جا اترا اور وہاں سے عربی الطبا کے بھیس میں جو اندلس کے پہاڑوں پر چڑھی بوٹیوں کی تلاش میں پھرا کرتے ہیں غرناطا کی طرف روانا ہوا۔ جب وہ غرناطا کی طرف پہنچا تو شام کا وقت تھا وہ جبل الثلج کی ایک پہاڑی پر کھڑا ہو گیا۔ اور ماحول کے کیف آفریں منظر کو دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ جبل الثلج کی گود میں پانی کے سفید و شفاف چشمے اچھل اچھل کر بہہ رہے ہیں اور کچے دودھ جا کر لہراتے ہوئے سانپوں کی طرح ایک شہر میں گر جاتے ہیں، اس نے دیکھا کہ سرخ عقیق کے برج اور قبے اور سنگ مرمر کے اونچے مینار آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے دونوں ہاتوں سے اپنا جگر تھام لیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"یہ میرے اسلاف کی میراث ہے، لیکن میرا حصا اس میں صرف اتنا ہے کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی تقدیر کا ماتم کروں۔ یہ ان کی آرام گاہیں ہیں، جہاں ان کے دشمن آرام کر رہے ہیں۔ اور وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں موت چھپائے پڑے ہیں۔ یہ اونچے اونچے محل اپنے دریچوں کی آنکھوں سے ان کے چاروں طرف ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ قبے اور برج اپنی گردنیں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے خدا سے دعا مانگ رہے ہیں کہ وہ ان کے بنانے والوں ان کے پاس واپس بھیج دے، مگر افسوس ان کی مرادیں پوری نہیں ہوتیں۔"

سعید نے دیکھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے اور دور کا نورانی لشکر رات کی ڈراونی فوج سے مغلوب ہو رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے قدم لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا۔ آہ زمانے کے تغیرات کسی کو چین نہیں لینے دیتے۔ اسی طرح سلطنتیں الٹتی پلٹتی رہتی ہیں۔ اسی طرح نور کی ضیا پاش شعاعوں کی جگہ ظلمت کی چادریں تن جاتی ہیں۔ اور اسی طرح زندگی کے دلربا چہرے کو موت کے سیاہ بادل ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ فرش زمین پر اپنی کہنی کا تکیہ بنا کر سو گیا۔ سعید بہت تھکا ہوا تھا اس لیے اسے بے خبری کی نیند آئی۔ وہ اس وقت بیدار ہوا جب افق آسمان پر فجر کی روشنی پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے پہاڑ کی بلندی سے اترنا شروع کیا۔ اور نہر کے کنارے بیٹھ کر اس کے صاف و شفاف پانی سے وضو کیا۔ اور معبود حقیقی کی درگاہ میں سربسجود ہو گیا نماز ادا کر کے اس نے شہر کا رخ کیا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا یہ کام یہ تھا کہ وہ غربت کی چند راتیں بسر کرنے کے لیے کوئی کاروان سرائے تلاش کرے۔ غرناطا جیسے غدار شہر میں ایک مسلمان اجنبی مسافر اس مرحلے کو آسانی کے ساتھ طے نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کئی گھنٹے تک شہر کے بازاروں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا رہا، مگر صحرائے اس کو نہ ملی۔ اس نے حصول مقصد میں متعدد راہ گیروں سے مدد چاہی، لیکن اکثر نے تو اسے ناقابل التفات سمجھ کر جواب ہی نہ دیا۔ اور کسی نے جواب بھی دیا تو وہ نا کافی، اس عدم التفات کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ اور بدقسمتی سے وہ مسلمان بھی تھا۔ اس عالم بے کسی میں وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا نہر شنیل کے کنارے پر جا نکلا۔ نہایت خوبصورت نہر تھی۔ سفید و شفاف پانی میں چھوٹی کشتیاں رقص کر رہی تھیں۔ کنارے کنارے دور تک عظیم الشان عمارتوں کا سلسلا چلا گیا تھا جو اپنی دلکشی و دل آویزی سے دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا رہی تھیں۔ تھکا ہوا سعید ستانے کے لیے نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔

اور آس پاس کے دلکش منظر سے اپنی طبیعت بہلانے لگا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر سامنے کے قصر کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک قصر کا دروازہ کھلا اور ایک اسپینی خاتون باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر سیاہ نقاب پڑی ہوئی تھی۔ اور سینے پر چھوٹی سی صلیب آویزاں تھی۔ پیچھے پیچھے ایک غلام کتاب مقدس ہاتھ میں لیے جا رہا تھا۔ خاتون کی نظر سعید کے حسین چہرے پر پڑی۔ جس میں عزت و شرافت کے جوہر دمک رہے تھے، لیکن جو رنج و الم کے متواتر حملوں سے پھول کی طرح کملا گیا تھا۔ اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر خاتون کا غمگین دل تڑپ گیا۔ اور وہ آگے بڑھ کر اس کے قریب آئی اور اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی۔ سعید نے محسوس کیا کہ حسن و جمال کا سورج اس کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہو رہا ہے، جس کی ضیا پاش شعاعیں اس کے دل کو جلا کر بھسم کیے دیتی ہیں۔ خاتون نے سعید سے دریافت کیا "محترم نوجوان! آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

سعید نے اپنے کھوئے ہوئے حواس کو جمع کر کے جنہیں وہ پہلی ہی نظر میں جمال بے حجاب کی نظر کر چکا تھا۔ جواب دیا۔

"محترم خاتون! میں ایک پردیسی مسافر ہوں۔ آج ہی غرناطا میں بغرض سیاحت داخل ہوا ہوں۔ میں صبح سے کاروان سرائے کی تلاش میں مصروف تھا، مگر اجنبی ہونے کے باعث مجھے اب تک اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ میں اسی سبب سے پریشان ہوں۔"

خاتون نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کونسی پریشانی کی بات ہے۔ آیئے میں آپ کو سرائے تک پہنچا آتی ہوں۔"

خاتون سعید کو ساتھ لے کر سرائے کی طرف چلی، اور جب سرائے کے دروازے پر پہنچی تو خاتون نے سعید سے کہا، "ممکن ہے قیام غرناطا کے دوران میں آپ کو اجنبی ہونے کے باعث مشکلات سے دوچار ہونا پڑے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرورت کے وقت مجھ ناچیز کو فراموش نہ فرمائیں گے۔"

سعید نے خاتون کی اس ہمدردی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، اور خاتون رخصت ہو گئی۔

اب ہلکی رات میں سیاہ آسمان چمکیلے ستاروں کی روشنی میں جگمگا رہا ہے مگر جب افق مشرق سے آفتاب عالمتاب طلوع ہوتا ہے تو ستاروں کی روشنی باقی نہیں رہتی، اور آفتاب کی روشنی ان کی روشنی کو معدوم کر دیتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت انسان کے دل کی بھی ہے انسان کا دل ہزاروں تمناؤں کا مخزن ہوتا ہے، مگر آرزوئے محبوب کے پیدا ہوتے ہی یہ تمام تمنائیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ سعید نے جب صبح کے وقت کاروان سرا کی تلاش میں شہر کے بازاروں کا چکر لگایا تھا، تو یہ حسرت ناک منظر دیکھ کر کہ تمام مسجدیں کلیسا بنا لی گئیں اور ان اونچے اونچے میناروں پر کلمۂ طیبہ کے بجائے صلیب کا پھریرا اڑ رہا ہے، اس کا دل خون ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اس دلدوز منظر کو دیکھنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اور اس کا قلب اس جگر پاش انقلاب کو برداشت نہ کر سکتا تھا، اس لیے اس نے فیصلا کر لیا تھا کہ وہ محض چند روز غرناطا میں ٹھہر کر افریقا لوٹ جائے گا۔

لیکن خدا جانے اس اسپینی خاتون نے اس پر کیا جادو کر دیا کہ اس کی ذہنیت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا، اور اس کے دل نے یقین دلایا کہ غرناطا کے بازاروں میں وحشت کے اندھیروں کے ساتھ ساتھ انس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی موجود ہے نہ اور رنج و الم کی گھنگھور گھٹاؤں میں راحت و مسرت کی بجلی بھی کبھی کبھی کوند جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے سابقہ فیصلے کے برخلاف کچھ عرصہ یہاں قیام کی ضرورت محسوس کی، اور دوسرے روز نماز فجر سے فارغ ہو کر اس نے اس خیال سے نہ ٹلنے کا قصد کیا کہ وہ اسپینی خاتون سے ملاقات کرے، مگر افسوس کہ وہ مختلف عمارتوں کی تعمیری مشابہت کے سبب یہ بالکل

بھول گیا کہ وہ خاتون کس قصر کے دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ناکام و نامراد سہ پہر کے وقت لوٹ آیا اور بہت دیر تک اپنی شومئی تقدیر پر ماتم کرتا رہا۔ اب جدید کا یہ معمول تھا کہ وہ نماز فجر سے فارغ ہو کر پیرس شہر کے کنارے بازاروں میں، کلیساؤں کے سامنے اس امید پر چکر لگاتا رہتا کہ شاید وہ اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں کامیاب ہو جائے اور آنے جانے والی عورتوں میں وہ اپنی خاتون نظر آئے جس نے اس کی متاع صبر و قرار پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اور جب وہ تلاش کرتے کرتے تھک جاتا تو شہر کے باہر سلاطین بنی احمر کے مقبرے میں چلا جاتا۔ اور اپنے آبا اجداد کی قبروں کے سرہانے بیٹھ کر خوب دل کھول کر روتا، مگر یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی یہ آہ و زاری اس کے قدیم مصایب کی وجہ سے ہے جن میں وہ مدت سے گرفتار رہے یا کسی تازہ مصیبت کے سبب۔

غرناطا کے بعد شاہ فرڈیننڈ نے کامل مذہبی آزادی کا اعلان کیا تھا، لیکن دنیا نے بہت جلد معلوم کر لیا تھا کہ یہ بھی ایک سیاسی چال تھی۔ عیسائیوں کے تسلط کی تکمیل ہو جانے کے بعد ان کی تعزیرات کا بدترین جرم مسلمان ہونا تھا۔ لاکھوں خدائے واحد کے پرستاروں کی گردنیں چھری قہر صلیب کے آگے جھکا دی گئیں، اور جنہوں نے انکار کیا ان کو قتل کر ڈالا اور جلا دیا گیا، لیکن سرزمین غرناطا پر اب بھی بعض نیک دل عیسائی موجود تھے۔ جو حکومت کی ان ظالمانا کارروائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے وہ احسانات یاد تھے جو انہوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ کیے تھے۔ اب ان کی تمنا تھی کہ عیسائی بھی مسلمانوں سے اسی قسم کا برتاؤ کریں اور انہیں مذہبی معاملات مکمل آزادی عطا کر دی جائے۔ ان نیک دل عیسائیوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک انجمن "العصابۃ المقدسۃ" کے نام سے قایم کی تھی۔ اس انجمن کا صدر ایک ہر دل عزیز اور باعزت شخص تھا جس کو عوام نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حکومت جس کے عقل و ہوش کو تعصب نے تاراج کر دیا تھا۔ اس غریب کی جان کے درپے ہو گئی۔ حتاکہ اس کو خفیہ طور پر قتل کروا دیا۔ صدر "العصابۃ المقدس" کی حسین و جمیل بیٹی فلورنڈا پر باپ کی موت سے رنج و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ اس کی شفیق ماں بھی اپنے شوہر کے غم میں جانبر نہ ہو سکی اور اسے داغ مفارقت دے گئی۔ ماں باپ کے دو پے بعضنوں کو فلورنڈا بھلا نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ آج دو سال گذر جانے کے بعد بھی وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ مصیبتیں کو یا آج ہی اس پر نازل ہوئی ہیں اور وہ اٹھارہ سال کی لڑکی دنیا سے بے زار اپنے خوبصورت قصر میں راہبانا زندگی بسر کرتی تھی۔ عام طور پر وہ کلیسا کو جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے دیکھی جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی آثار قدیمہ میں بھی ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اس کے حسن و جمال اور دنیا سے قطعی تعلق کی وجہ سے لوگ اسے راہبا جمیلا کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ اسی راہبا جمیلا کی تلاش میں ہمارا سعید کئی روز سے سرگرداں تھا۔ فلورنڈا ایک روز مقبرۂ بنی احمر کی سیر کر رہی تھی کہ اس نے دور سے ایک عربی نوجوان کو دیکھا جو ایک قبر پر سر جھکائے زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ اپنی دردمند طبیعت سے مجبور ہو کر قریب آئی اور آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ فلورنڈا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"معزز جوان شاید آپ ان تاجداران اسلام کو رو رہے ہیں جن کی عظمت کی شہادت گاہ اندلس کا چپا چپا ہے، لیکن آج وہ کسمپرسی کی حالت میں فرش زمین پر محو خواب ہیں۔"

سعید نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔

"محترم سیدا! آپ اور تاجداران اسلام سے ہمدردی سرزمین اندلس پر قدم رکھنے کے بعد آج میں نے پہلی مرتبہ

ایک سچی سے ایسے تشفی آمیز الفاظ سنے ہیں۔"

فلورنڈا نے کہا۔

"ساری دنیا احسان فراموش ہو جائے، مگر میں ان احسانات کو ہرگز نہیں بھول سکتی جو ان فراخ حوصلہ تاجدارانِ اسلام نے اپنے دورِ سلطنت میں عیسائیوں کے ساتھ کیے ہیں۔ خدا غریق رحمت کرے ابا جان کو وہ ان کی رواداریوں کے ایسے عجیب قصے سنایا کرتے تھے کہ میں جب ان کا مقابلہ موجودہ حکومت کے رویے سے کرتی ہوں جو اس نے مظلوم مسلمانوں کے متعلق اختیار کر رکھا ہے تو شرم و ندامت سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ اور ہاں آپ نے ان کی وہ زندہ جاوید یادگاریں بھی ملاحظہ فرمائی ہیں، جنہیں یہ آئندہ نسلوں کی عبرت و موعظت کے لیے سرزمینِ غرناطہ پر چھوڑ گئے ہیں۔"

سعید نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ایسی قسمت کہاں؟ میں نے بعض مآثر میں داخل ہونے کا قصد کیا تھا، لیکن محافظین نے مجھے قدم بھی رکھنے نہ دیا۔ آہ انہیں کیا معلوم کہ آج صفحۂ زمین پر ان مآثر کی زیارت کا حج سے زیادہ مستحق اور کوئی نہیں۔" فلورنڈا نے پوچھا۔

"تو آپ شاید اندلس کے قدیم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟"

سعید نے جواب دیا۔

"بے شک، مگر نسبی تعلق نہیں، بلکہ غلامی کا تعلق۔ یہ ہمارے آقا و مولا تھے۔ ہماری گردنوں پر ان کے اس قدر احسانات ہیں کہ ہم انہیں مدت العمر فراموش نہیں کر سکتے۔"

فلورنڈا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"میرا دل بھی چونکے غم کے جمے کے کھا چکا ہے، اس لیے میں ہر غمزدا سے ہمدردی کا اظہار کرنے پر طبعاً مجبور ہوں آپ مجھے روزانا صبح کے وقت اسی جگہ ملا کریں۔ میں چند ہی روز میں آپ کو تمام قابلِ دید مآثر کی سیر کرا دوں گی۔"

سعید نے صمیمِ قلب سے فلورنڈا کی عنایت کا شکریہ ادا کیا، اور وہ دوسرے روز یہیں آملنے کا وعدہ کر کے اپنے قصر کو چلی گئی۔

اب دونوں کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت مقبرۂ بنی احمر میں آجاتے اور دونوں مل کر یہاں سے مختلف مقامات کی سیر کے لیے نکل جاتے۔ سعید کو راہبا جمیلا کے ساتھ آتے جاتے دیکھ کر عام لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی نیا عیسائی ہے جسے وہ دینِ عیسوی کی تعلیمات سے آگاہ کر رہی ہے۔

فلورنڈا نے جب پہلی مرتبہ سعید کو اپنے قصر کے سامنے دیکھا تو وہ اس کے وجاہت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ یہ تاثر ہر وقت کے ارتباط و اختلاط سے قوی تر ہوتا گیا۔ اور چند ہی روز گذرے ہوں گے کہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ رات کے وقت بستر پر کروٹیں بدل بدل کر انتظار کیا کرتی تھی کہ کب صبح ہو، وہ مقبرۂ بنی احمر میں جا کر سعید سے ملے۔ اس کو اپنے دل کی اس بے چینی کی خود بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن بعض اوقات اس کو کچھ اس قسم کا خیال آتا تھا کہ اس کو سعید سے محبت ہو گئی ہے۔

سعید اور فلورنڈا آج قصر الحمرا کی سیر کو جا رہے تھے، لیکن سعید کے چہرے پر نورِ مسرت کی وہ چمک موجود نہ تھی جو روزانا اس وقت مشاہدہ کی جاتی تھی، بلکہ ہجومِ افکار سے وہ نہایت مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ کل شام رخصت ہوتے وقت فلورنڈا نے اس سے کہا تھا کہ وہ غرناطہ کی تمام قابلِ دید عمارتیں دیکھ چکا ہے اور اب قصر الحمرا کی سیر باقی رہ گئی ہے۔ اس امر کا تصور اس کے جگر کو پاش پاش کیے ڈالتا تھا کہ روزانا کی ملاقات کا مقصد پورا ہو جانے کی وجہ سے اب فلورنڈا کا ساتھ چھوٹ جائے گا، اور یہ مسرت انگیز و نشاط آفریں صحبتیں شام ہوتے ہوتے ختم ہو جائیں گی۔ وہ بار بار اپنے دل میں حسرت کے ساتھ کہتا تھا کہ یا الٰہی میری شومئی تقدیر نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کیا ہزاروں دوسری مصیبتوں کے ساتھ ساتھ فراق کی مصیبتیں بھی مجھے برداشت کرنی پڑیں گی۔ وہ ان ہی افکار میں مستغرق تھا کہ فلورنڈا نے اس سے کہا۔

"دیکھو سعید قصر الحمرا سامنے ہے۔"

سعید نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اللہ اکبر کیا عظیم الشان قلعہ تھا۔ اس کی بلند و بالا دیواریں آسمان سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور اس کے فلک رس برج بادلوں کا سینہ چیر کر آسمان میں گھسے جا رہے تھے۔ فرش زمین پر سرخ و سپید کنکریاں کاشن جنت کے مختلف الالوان پھول معلوم ہوتے تھے۔ سعید اس پر عبرت کی نظر ڈالتا ہوا اس کے بانی کی جلالت قدر کا اندازا کرتا ہوا اور پھر اپنی بدبختی کا ماتم کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اب وہ ایک وسیع صحن میں پہنچا جس کا فرش زرد پتھر کا تھا۔ صحن کے چاروں طرف عالیشان کمروں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جن کے اونچے اونچے قبے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ سعید نے خیال کیا کہ یہ کمرے کسی زمانے میں اس کے اہل خاندان کی قیام گاہیں تھیں۔ اور پھر اس نے اپنی موجودہ بے سروسامانی کا تصور کیا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ٹپ ٹپ بہ آئے اور اس نے چاہا کہ کسی طرح دل کو اپنے دل کا بخار نکالے۔ جب اس نے دیکھا کہ فلورنڈا عمارتوں کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو گئی ہے اور اس کی طرف سے غافل ہے تو وہ اس کی نظر سے بچ کر سامنے کے کمرے کی طرف چلا، تاکہ وہاں تنہا بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پر چار آنسو بہائے۔ قریب کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کی نظر ایک کتبے پر پڑی جو دروازے کی پیشانی پر کندا تھا یا ابتا لا (ہائے ابا جان) کی دردناک آواز فضا میں گونجی اور سعید بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ کئی گھنٹے بعد جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ فلورنڈا اس کے سر کو اپنے زانوں پر رکھے بیٹھی ہے، اور اس کے پھول سے رخساروں پر شبنم کے قطروں کی طرح آنسو بہہ رہے ہیں۔

جب سعید کی طبیعت سنبھلی تو فلورنڈا نے کہا۔

"سعید فضول آپ نے مجھ سے اپنا راز چھپانے کی کوشش کی۔ میں آپ کی پرائی چاہنے والی تو نہ تھی۔ آخر اب اصلیت بے نقاب ہو ہی گئی۔"

جب شہزادے نے دیکھا کہ راز فاش ہو گیا ہے، اس نے اندلس سے جلاوطن کیے جانے سے آج تک کی اپنے خاندان کی دکھ بھری کہانی فلورنڈا سے رو رو کر بیان کر دی اور جب یہ داستان ختم کر چکا تو حسرت بھری نظروں سے فلورنڈا کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"افسوس! فلورنڈا! ابھی میرے مصایب کا سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ جب میں آنے والی مصیبتوں کا خیال کرتا ہوں تو میری نظروں سے گذشتہ تکلیفیں بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔"

فلورنڈا نے حیرت سے پوچھا۔

"شہزادے! کیا موجودہ مصایب سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی مصیبت ہو سکتی ہے؟"

سعید نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور پھر سر اٹھا کر رقت خیز لہجے میں بولا۔

"میں دنیا کی کٹھن سے کٹھن مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر فلورنڈا تمہارے فراق کی مصیبت میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

فلورنڈا نے قدرے تامل کیا، اور پھر نظریں نیچی کر کے پوچھا۔

"کیا واقعی آپ کو مجھ سے محبت ہے شہزادے؟"

سعید نے جواب دیا "بے شک جیسی شمع سے پروانے کو، اور چاند سے چکور کو۔"

فلورنڈا نے کہا۔

"لیکن آپ مسلمان ہیں اور میں عیسائی۔ اختلاف مذہب کے ہوتے ہوئے دعوائے محبت کیوں کر؟"

سعید نے جواب دیا۔

"فلورنڈا! مذہب و محبت دو جداگانہ چیزیں ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنے مذہب پر برقرار رہ کر بھی تمہارا عاشق ہو سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے جو خوبیاں پسند ہیں وہ سب تم میں پائی جاتی ہیں۔"

اب سورج غروب ہو گیا تھا۔ اور آفاق عالم میں

اندھیرا چھانے لگا۔ اس لیے دونوں اٹھے اور باتیں کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے روزانا جدا ہو جایا کرتے تھے، جب فلورنڈا رخصت ہونے لگی تو اس نے سعید سے کہا۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھے بھی آپ سے ایسی ہی مخلصانا محبت ہے۔ جیسی آپ کو مجھ سے۔ اگرچہ ہمارے مذاہب نے ہمارے اجسام کو جدا جدا کر دیا ہے، لیکن خداوند یسوع مسیح کی قسم ہماری محبت ہمارے قلوب کو مجتمع رکھے گی۔"

اس عہد نامۂ محبت کی تکمیل کے بعد سعید اور فلورنڈا دونوں عیش و مسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور اپنے مصایب و آلام کی داستانوں کو بھول گئے۔ سرزمین غرناطا پر گویا وہ دو خوبصورت پرند تھے۔ جو جہاں چاہتے اڑ جاتے اور جہاں چاہتے بیٹھ کر گانے لگتے۔ کاش زمانا ان سے تعرض نہ کرتا اور ان کے عیش و مسرتوں کی چند ساعتوں کو جنہیں انہوں نے لاکھوں مصایب کے بدلے میں خریدا تھا ان سے چھیننے کی کوشش نہ کرتا، اور یہ خیال کر کے ان پر ترس کھاتا کہ بدنصیبوں کے حصے میں زمانے کی خوشیوں میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تھوڑی دیر آپس میں مل کر بیٹھیں، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

ایک روز دونوں "عین الدمع" کی ایک نہر کے کنارے مصروف تفریح تھے کہ پاس سے حاکم غرناطا کا بیٹا "روڈریک" گزرا۔ عرصا ہوا "روڈریک" نے ایک دفعا فلورنڈا کو دیکھا تھا اور اس کی محبت کا تیر اس کے جگر میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس ملاقات کے بعد وہ کئی مرتبا فلورنڈا کے قصر میں گیا، اور ایک مرتبا اس سے شادی کی درخاست بھی کی، لیکن فلورنڈا نے اس درخاست کو مسترد کر دیا، اور صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے سے ہرگز نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ کورا جواب سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ آج جو اس نے دونوں کو یہاں مصروف گلگشت دیکھا تو اپنے دل میں کہنے لگا ہو نہ ہو اس عربی نوجوان نے فلورنڈا کے دل کو فتح کر لیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے میرے پیغام محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ چنانچہ اس واقعے کے دوسرے روز وہ فلورنڈا کے قصر میں گیا، تاکہ اس سے اپنے اس خیال کا اظہار کرے، لیکن فلورنڈا نے اس سے ملاقات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ حاکم غرناطا کا فرزند اس کھلی ہوئی رسوائی سے غضب آلود ہو گیا۔ اور اس نے فیصلا کر لیا کہ وہ فلورنڈا سے انتقام لے کر رہے گا۔

اس واقعے کے چند روز بعد سلطان اندلس ابو عبداللہ کا پوتا شہزادا سعید ابو یوسف نہایت ذلت کے ساتھ گرفتار کر کے محکمۃ التفتیش میں حاضر کیا گیا۔ جرم یہ تھا کہ وہ ایک مسیحی نوجوان خاتون کو دعوت اسلام دے رہا تھا۔

جج نے شہزادے سے پوچھا، تمہیں اپنے جرم کا اقرار ہے؟ شہزادے نے انکار کیا، لیکن جج نے کہا کہ محض انکار سے کام نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ اس کا ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ اور ثبوت محض یہ ہو سکتا ہے کہ تم اسلام کو خیرباد کہہ دو اور خدا کے بیٹے کی پناہ میں آجاؤ۔

نوجیل کا ہذائی شہزادا غصے سے کانپنے لگا اور اس نے نہایت بلند آواز سے جس سے محکمۃ التفتیش کا ہال گونج رہا تھا۔ جواب دیا۔

"اے مسیح کی امت! تمہارے کس مذہبی صحیفے میں یہ لکھا ہے کہ جو تمہارا دین قبول نہ کرے تم اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔ تم کہاں سے یہ سڑی ہوئی عقلیں اٹھا لائے ہو، جو یہ سمجھتی ہیں کہ انسانوں کو جبر و قہر مذہب کی رسی میں باندا جا سکتا ہے۔ جب تم اس ملک میں فاتحانا حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو تم نے وعدا کیا تھا کہ ہمارے دینی عقاید کے معاملے میں مکمل آزادی دو گے۔ اور مذہبی فرایض کی انجام دہی میں ہم سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو گے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ آج تمہارا وہ وعدا کیا ہوا، جو سلوک آج تم میرے ساتھ کر رہے ہو اور جو جیسے پہلے میرے

ہزاروں بھائیوں کے ساتھ کر چکے ہو۔ کیا ایفاے عہد اسی کا نام ہے؟ تم آج سلطنت کے مالک ہو۔ تم آج عزت و قوت کے مالک ہو۔ تم آج جو چاہو کر سکتے ہو۔ سلطنت والے ایفاے عہد کی پروا نہیں کیا کرتے۔ جو عہود و مواثیق طاقتوروں اور ضعیفوں کے مابین ہوتے ہیں وہ ان کے ہاتھوں میں شمشیر برہنا ہوتے ہیں، اور ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق۔ سچ تو یہ ہے کہ خدا کسی کو کمزور نہ بنائے۔ تم قوی ہو اور ہم ضعیف اب اگر تم ہم پر ظلم و ستم بھی کرو تو وہی حق و انصاف ہے۔ اچھا جو تمہارے جی میں آئے وہ تم کرو، افسوس تمہاری طاقت نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ تم ہمارے خون سے سمر زمین اندلس کو لالہ زار بنا دو۔ تم ہماری گردنوں کو ہمارے جسموں سے جدا کر دو، لیکن یاد رکھو کہ تم توحید کی امانت ہمارے سینوں سے نہیں نکال سکتے۔ جو دل ایک مرتبہ نور توحید سے منور ہو چکا ہے، وہ ہرگز ظلمت تثلیث کو گوارا نہیں کر سکتا۔"

شہزادہ اسی سلسلۂ کلام جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن جج نے اسے خاموش ہو جانے کا حکم دیا، اور سپاہیوں کو اشارا کیا کہ اسے قتل گاہ میں لے جائیں۔ شہزادے سے پہلے دس ہزار مسلمانوں کو اسی قتل گاہ میں شمع توحید کے پروانے ہونے کے جرم میں جلایا اور قتل کیا جا چکا تھا۔ شہزادہ بابجولاں قتل گاہ میں لایا گیا۔ ہزاروں تماشبیں اس خونی منظر کو دیکھنے کے لیے پہلے سے قتل گاہ میں پہنچ چکے تھے جلاد کی تلوار تڑپ کر میان سے نکلی اور شہزادۂ سعید کا سر خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ مسیحی تماشبینوں نے خوشی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور تمام فضا ان کے قہقہوں سے گونجنے لگی، لیکن لوگوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عیسائی لڑکی چیخ مار کر بے ہوش گر پڑی۔

غرناطا کی آبادی سے باہر مقبرۂ سلاطین بنی احمر کے کنارے آنے جانے والوں کو آج بھی سنگ مرمر کے سالم ٹکڑے کی بنی ہوئی ایک حسین و جمیل منقش قبر نظر پڑتی ہے۔ قبر کی سطح پر پتھر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ تراش کر ایک چھوٹا سا خستہ حوض بنایا گیا ہے۔ یہ حوض برسات کے زمانے میں بارش کے پانی سے لبریز ہو جاتا ہے اور گرمی کے زمانے میں پیاسے پرند اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس حوض کے ایک گوشے میں یہ عبارت منقوش ہے۔

هذا قبر اخی بنی احمر من صدق یقینه الوفیٰ بعهد هاحتی الموت فیلوی نل ا فیلیب

یہ قبر سلاطین بنی احمر کے آخری چشم و چراغ کی ہے۔ اس کی وفادار دوست فلورنڈا فیلیب کی جانب سے۔ جس نے اپنے عہد کو مدت العمر نبھایا۔

غزل

پیرم دربن

(مزاحیہ)

میرا ان کا ساتھ کیا دونوں کی ہے منزل الگ
غیر سے اتحاد بھی ہیں وہ اور ہیں جاہل الگ
ہیں الگ چھوڑا کیا کشتی میں سر پتوار سے
ناخدا حیرت میں تھا بیٹھا سر ساحل الگ
جب بھری محفل میں گفت خالی اوٹ گئی
کر دیے ناقابل الفت الگ، قابل الگ
اس طرح سی، آئی، ڈی نے کیس کی تحقیق کی
پھنس گیا مقتول خود اور ہو گیا قاتل الگ
گو بظاہر پیٹ میں رہتے ہیں دونوں ساتھ ساتھ
چیر کے دیکھو تو ہے معدہ الگ اور دل الگ
یوں کیا درپن کا اس نے خیر مقدم آج وہ
پہلے بڑھ کھینچے مارا، بعد اس کے سل الگ

ہمارے کارخانے

آندھرا پردیش، جو پہلے ہی سے "جنوب کے چاول کے مخزن" کی حیثیت رکھتا ہے، پانچسالا منصوبوں کے تحت مختلف نئے طریقے اختیار کرتے ہوئے اپنی غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ کرتا جارہا ہے۔ دوسرے منصوبے ہی کے پہلے تین برسوں میں ریاست کی غذائی پیداوار میں (۹ء۱۱) فی صد اضافہ ہوا ہے۔ آبپاشی کے بڑے اور اوسط درجے کے پروجکٹوں کی تکمیل کے بعد، جو اب پانچسالا منصوبے کے تحت زیر تعمیر ہیں، نہ صرف ریاست کی غذائی پیداوار بڑھی چڑھی رہے گی، جس سے ساری قوم کو فائدہ پہنچے گا، بلکہ یہاں بہت سی نئی صنعتیں بھی قایم ہوجائیں گی۔

اس ترقی کی نمایاں جھلکیاں ہر مہینے رسالہ آندھرا پردیش میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ماہانہ رسالہ ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے نہایت آب و تاب کے ساتھ تین زبانوں، انگریزی، تلگو اور اردو میں شایع کیا جاتا ہے۔ جس کا برائے نام سالانہ چندہ صرف (۲) روپیہ (۱۶) نئے پیسے ہے۔ اس رسالے میں لچھے قصے کہانیاں، ڈرامے، نظمیں اور طنز و مزاح کے ادبی شہ پارے کے نیز منفرد عکسی تصویریں بھی پابندی کیساتھ شایع ہوتی ہیں۔ اس رسالے میں اشاعت کیلئے قبول کئے جانیوالے تمام مضامین اور نظموں کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش کیجانب سے جاری کیا گیا

۴ فیصدی
۱۹۶۹ء سنہ

ریاستی ترقیاتی قرضہ آندھرا پردیش

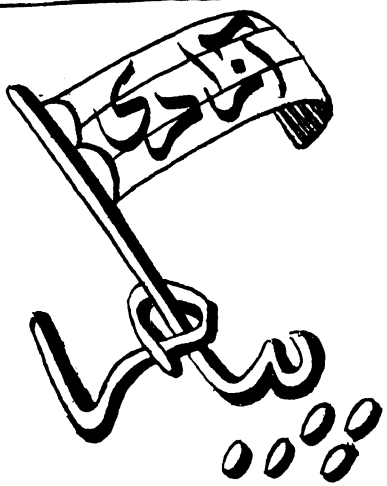
قیمت فروخت۔ (۹۹٫۷۵) فیصد
۲۹ اگست ۱۹۶۰ء کو کھلے گا

یہہ قرضہ (۹۰۰) لاکھ روپے کے لگ بھگ رقمیں وصول ہوتے ہی بغیر نوٹس کے بند کر دیا جائے گا اور ہر صورت میں ۳ ستمبر ۱۹۶۰ء سنہ کو کاروبار کے اوقات کے اختتام پر بند کر دیا جائے گا۔

درخواستیں ان دفاتر پر وصول کیجائیں گی۔

ریزرو بینک آف انڈیا، بمبئی، کلکتہ، نئی دہلی، مدراس اور بنگلور، اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخوں پر، اور ریاست آندھرا پردیش میں اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کی شاخوں اور ٹریژری پے آفسوں پر، اور ریاست آندھرا پردیش میں جن مقامات پر اسٹیٹ بینک آف انڈیا یا اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کی کوئی شاخ یا ٹریژری پے آفس موجود نہ ہو، وہاں سرکاری خزانوں یا ذیلی خزانوں پر۔

مکمل تفصیلات مذکورہ دفاتر یا شاخوں میں سے کسی بھی دفتر سے یا ریاست آندھرا پردیش کے کسی خزانے یا ذیلی خزانے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔



نغمۂ آزادیٔ انسانیت گاتے چلو
زندگی کو زندگی کا راز سمجھاتے چلو

وقت کا ہے یہ تقاضا، دل کی یہ آواز ہے
پیار کے نغمات سے دنیا کو گرماتے چلو

رنج و غم میں اشک برسانے کے دن جاتے رہے
رقص کرتے، مسکراتے، جھومتے گاتے چلو

تا بہ کے آخر سہو گے لالہ و نرگس کے ناز
صورت فصل بہار ان ناز فرماتے چلو

جہل کے زخموں کو بھر دو مرہم اخلاق سے
کائنات غم پہ دل کا نور برساتے چلو

خیر مقدم کیلئے بیتاب ہے قلب محیط
موج کو، گرداب کو طوفان کو ٹھکراتے چلو

خود قدامت از تقاضائے راہ پر آجائے گی
زندگی کو زیست کے آداب سکھلاتے چلو

دوڑ جائے خشک ہونٹوں پہ تبسم کی بہار
رخصت دور خزاں کا حکم فرماتے چلو

پرچم تہذیب کو، انسانیت کو، امن کو
مہر تاباں کی طرح دنیا پہ لہراتے چلو

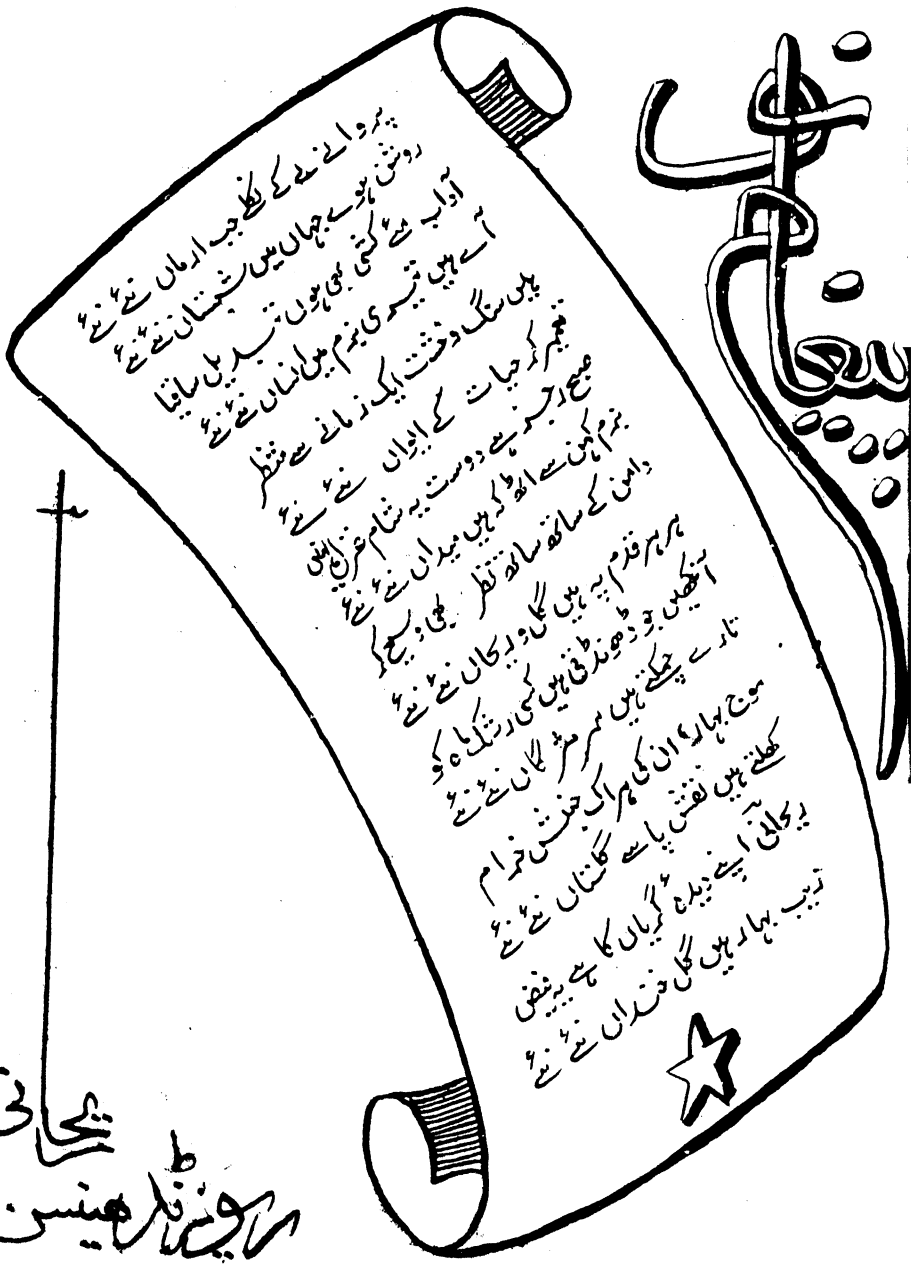
روشنی کا اک سفینہ ہے ہندوستاں
روشنی سے عالم ظلمت کو چمکاتے چلو

کل، مورخ روشنی ڈالے گا اس عنوان پر
آج تا تیر لب اعجاز دکھلاتے چلو

نقش کرو وقت کے ماتھے پہ عنوان حیات
امن کی تاریخ عالمگیر دہراتے چلے چلو

اپنی منزل کی طرف چلنا اگر ہے دوستو
زندگی کے گیت سازِ امن پر گاتے چلو

طالب سرحدی


نیا سال
پیمانے نئے کے لئے جب ارماں نئے نئے
روشن ہوئے جہاں میں نشیمناں نئے نئے
آداب ہے کتنی بھی ہوں تبدیلیاں سیاسی
آئے ہیں تیسری بزم میں انساں نئے نئے
پائیں سنگ و خشت ایک زمانے سے منتظر
تعمیر کر حیات کے ایواں نئے نئے
صبح و جشن ہے دوست یہ شام غریباں نئے نئے
بزم کہن سے اٹھ کر ہیں میداں نئے نئے
دامن کے ساتھ ساتھ نظر بھی وسیع کر
ہر ہم قدم پہ ہیں گل و ریحاں نئے نئے
آنکھیں جو ڈھونڈتی ہیں کسی رشک ماہ کو
تارے چمکتے ہیں سر مژگاں نئے نئے
موج بہار، ان کی ہم اک جنبش خرام
کھلتے ہیں نقش پا سے گلستاں نئے نئے
ریحانی اپنے زیلۂ گریباں کا ہے یہ شغف
ترتیب بہار دیں گل خنداں نئے نئے
ریحانی
رویندر ٹیگور

آزادی کے دیش بھگت

اب کہاں جھانسی کی رانی اور وہ تاج ظفر
جھائی ہیں جن کی بدولت یہ بہاریں ہند پر

اے بھگت سنگھ تیرے سر کا دار کو بھی فخر تھا
دشمنوں میں کھلبلی تھی تیرا ہر سو ذکر تھا

چند رشیکھر تیرے سینے پر لگی جو گولیاں
وہ بنی تھیں جنگ آزادی میں منزل کا نشاں

آستان ہند پر سر جھک گیا تیرا فلک
جگمگا اٹھا ہے بھارت ماں کے ماتھے کا تلک

قوم کا بابو تھا امن و آشتی کا دیوتا
جس کے کارن مل گیا ہم کو خوشی کا نیوتا

جوہر و آزاد و موتی ہند کے تھے پاسباں
جنگ آزادی کے یہ بھی تو رہے ہیں کارواں

دیش کا جانباز نیتا شیر ہندستان تھا
انقلاب بحر آزادی کو وہ طوفان تھا

قوم کا سردار جس کا عزم بھی طوفان تھا
دشمنوں کے حق میں وہ فولاد کا انسان تھا

خون کے آنسو بہا کر یاد میں روتے ہیں ہم
اے شہیدان وطن شردھا نجلی دیتے ہیں ہم

ہار کے سارے نگینوں میں جواہر لال ہے
یا خدا اس کو بچانا یہ ہمارا مال ہے

دیش میں باقی ہیں لیکن آج بھی کچھ الجھنیں
پا نہیں سکتے ہم آزادی کے سچی نعمتیں

رہبران قوم اب کس کر کمر آجائیے
بات تو جب ہے کہ ساری قوم کو اپنائیے

ہاتھ نہرو کے بٹاؤ قوم کی طاقت ہو تم
دیش کی دولت ہو تم اور قوم کی عزت ہو تم

اے بہار اس جشن آزادی سے آئے وہ بہار
نام مٹ جائے خزاں کا پھر گلوں پر ہو نکھار

منوہر لال بہار

آزادی کے جائزے

ابھی امنگوں کو بے رنگ آرزوؤں کو
ہم اپنے درد کا درماں تو کہہ نہیں سکتے
یہ رہ گذر یہ جلتے گریزپا لمحے
سکون ریست کا عنواں تو کہہ نہیں سکتے
یہ اس پھول فسردہ چمن فضا مغموم
اب اس کو جشن بہاراں تو کہہ نہیں سکتے

گھٹی گھٹی سی ہیں ماحول کی ابھی سانسیں
خسرتوں کا ہمیں کس طرح یقیں آئے
حیات شوق ہے محروم نغمہ و مستی
گلاب عارض جاناں ہیں اب بھی مرجھائے
ہر اک نگاہ مکمل سوال ہے اب بھی
تجلیوں کے عیوض رینگتے ہیں کیوں سائے

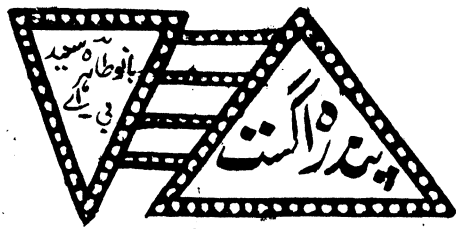
نہ جانے کتنے جرائم پہ ڈالنے پردہ
تم اپنی ہار کو جیتوں کا نام دیتے ہو
یہ اک فریب مسلسل نہیں تو پھر کیا ہے
کہ نفرتوں کو پیمبر تیوں کا نام دیتے ہو
تمہاری موت کا بن جائے گا وہ پیام کل
نہیں تم آج تو گیتوں کا نام دیتے ہو

ابھرتی جاتی ہیں سوچیں یہ آج ذہنوں میں
ابھی تو چند گریباں بھی سل نہیں سکتے
یہی ہے باغ یہی ہے باغباں تو ایسے میں
قسم خدا کی یہاں پھول کھل نہیں سکتے
اب اس کے بعد جو جمہور کا ارادہ ہے
وہ کیا بیاں ہو کہ الفاظ مل نہیں سکتے

یہ کن ضمیر فروشوں کی چیرہ دستی سے
نکھر سکا نہ جمال رخ حیات ابھی
سسکتے پیار سلگتے شباب کے ارماں
تبسموں کا خزانہ لیے ہے رات ابھی
لب عروس تمنا پہ شعلۂ رقصاں
لٹی لٹی سی مسرت کی کائنات ابھی

منا و جشن بہاراں مگر یہ یاد رہے
نہیں عوام کو اک دن جواب دینا ہے
شعور عظمت انساں کی بارگاہوں میں
ہر ایک سانس کا اک دن حساب دینا ہے
نئی حیات نیا عزم لیکے بڑھتی ہے
نئی سحر کو نیا آفتاب دینا ہے

خیرات ندیم (عثمانیا)



آج ہے یوم عشرت و شادی!
چودھواں یعنی سالگی آزادی!!
یاد آتی ہے کتنے پیاروں کی
جو نہیں آج درمیاں اپنے
ہے چمک یہ انہیں ستاروں کی
ورنہ بھارت پہ چھائی تھی ظلمت!
جنگ آزادی جیتنے والے
دے گئے ہم کو ارث آزادی
خون کی ہولی کھیلنے والے
سرخ رو کر گئے وطن کی زمیں!
دل میں اٹھتی ہے ہوک سی پیہم!
یاد آتی ہے جب شہیدوں کی
ہے بہاروں میں گریۂ شبنم!
دل بھر آیا ہے جشن عشرت میں
ہے ہمارا وطن اگر آزاد
غیر کی چھیڑ چھاڑ کیا معنی!
لب پہ بھارت کے اب بھی ہے فریاد
سرحدوں پر یہ چہلقش کیسی
قیمت دو جہاں ہے آزادی
سرفروشی سے ہم نہیں ڈرتے
ساتھ عزت کے موت ہے شادی
دیش بھارت رہے سدا آزاد
طاہرہ ساعت سعید ہے آج
یوم آزادی یوم عید ہے آج



دیویوں، دیوتاؤں کی یہ سرزمیں!
جس کو کہتے ہیں سب لوگ خلد بریں
رام، سیتا، مہابیر کا یہ وطن
جس کے سینے میں طوفان گنگ و جمن
جس کی مٹی ہے سونا تو امرت ہے جل
جس کی زلفوں میں گنگا کے لہرا کے بل
جس کے ماتھے پہ صبح بنارس کا نور
جیسے کوئی حسینہ ہو مستی میں چور
جس کے گاؤں پہ شام اودھ کا نکھار
جس کے دامن میں کشمیر کے لالہ زار
جس کے سانسوں میں اقبال کی شاعری
جس کے ہونٹوں پہ ٹیگور کے گیت ہیں
دیویوں، دیوتاؤں کی یہ سرزمیں
جس کو کہتے ہیں سب لوگ خلد بریں

بچت کی عادت ہی میں آپ کا تحفظ اور آیندہ خوشحالی مضمر ہے۔

آج ہی سے نیچے بتائے ہوئے طلائی تمسکات میں سے کسی ایک میں رقم لگانا شروع کر دیجئے

یہ انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس سے بھی مستثنیٰ ہیں۔

۱ ۔ ۱۲ سالہ نیشنل پلان سیونگس سرٹیفکیٹ

آپ کو سالانہ ۵ء۴۱ فیصد سود دلاتے ہیں۔ ہر (۱۰۰) روپے کے بارہ سال میں (۱۶۵) روپے بن جاتے ہیں۔ (۵) روپے، (۱۰) روپے، (۵۰) روپے، (۱۰۰) روپے، (۵۰۰) روپے، (۱۰۰۰) روپے اور (۲۵۰۰) روپے تک قیمتوں کے وثائق خریدے جا سکتے ہیں۔

۲ ۔ ۱۰ سالہ ٹریژری سیونگس ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ

آپ کے سرمائے کو محفوظ رکھتے ہیں اور آپ کیلئے سالانہ (۴) فیصد کی شرح سے مستقل سالانہ آمدنی کا بندوبست کرتے ہیں۔ (۵۰) روپے کے حاصل ضربوں میں (۲۵۰۰) روپے تک کی رقمیں جمع کرائی جا سکتی ہیں۔

۳ ۔ ۵ سالہ اینوٹی سرٹیفکیٹ

ان کے ذریعے آپ اپنے لیے اور اپنے متعلقین کے لیے (۱۵) سال تک مستقل طور پر ماہانہ اقساط کا انتظام کر سکتے ہیں، جو (۴ء۲۵) فیصد کی شرح سے مرکب سود کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ ان سرٹیفکیٹوں کے ذریعے (۱۳۳۰) روپے، (۳۳۲۵) روپے، (۶۶۵۰) روپے اور (۲۶۶۰۰) روپے کی رقمیں جمع کرائی جا سکتی ہیں۔ جن پر ترتیب وار ماہانہ انداز "(۵۰) روپے، (۵۰) روپے، (۱۰۰) روپے اور (۲۰۰) روپے کے اقساط ادا کیے جا سکتے ہیں۔

۴ ۔ گفٹ کوپن اسکیم

اس اسکیم کے تحت آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے بہترین تحفے کا انتظام کر سکتے ہیں، یہ تحفہ خوشگوار مستقبل کا بھی ضامن ہوگا۔

۵ ۔ پوسٹ آفس سیونگس اسٹامپ

بچوں اور چھوٹی چھوٹی رقمیں بچانے والوں میں کفایت شعاری کا شوق پیدا کرتے ہیں۔ جب یہ ٹکٹ (۵) روپے کی قیمت کے ہو جائیں ان کے بدلے ایک نیشنل پلان سیونگس سرٹیفکیٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۶ ۔ کیومولیٹیو ٹائم ڈپازٹ اسکیم

اس اسکیم کے تحت آپ (۵) سال یا (۱۰) سال کے اختتام پر اپنی دکھائی ہوئی رقم کا بدل یکمشت حاصل کر سکتے ہیں۔ (۱۰) روپے (۵) سال کی مدت میں (۶۵۰) روپے اور (۱۰) سال کی مدت میں (۱۴۵۰) روپے بن جاتے ہیں جو مدت کی تکمیل پر ملتے ہیں۔

حکومت ہند کے انعامی بانڈ خریدیئے، ممکن ہے کہ آپ کوئی بھاری انعام جیت لیں

تفصیلات کے لیے ان سے ربط قائم کیجئے۔

ریجنل نیشنل سیونگس آفیسر (۱۰ - ۲ - ۲) اے ۔ سی ۔ گارڈ روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۲ یا
آپ کے ضلع کے کلکٹر یا مقامی تحصیلدار یا ڈسٹرکٹ نیشنل سیونگس آفیسر
ڈائرکٹر نیشنل سیونگس ۔ آندھرا پردیش حیدرآباد نے جاری کیا

پام گڑ زیادہ سے زیادہ کھایئے
اس میں بڑی حد تک غذائیت ہے
یہ سستا بھی ہے اور غذائی قدروں سے بھرپور بھی ہے

آندھرا پردیش کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ حیدرآباد

پام گڑ کو اپریٹیو سوسائٹیاں قایم کرنے میں مالی مدد دیتا ہے۔ اگر یہ سوسائٹیاں حفظان صحت کے اصولوں پر بڑھیا قسم کا پام گڑ تیار کرنا چاہیں تو یہ بورڈ ٹکنیکل یا فنی امداد بھی بہم پہنچاتا ہے۔ اس بورڈ نے نیرے سے سفید شکر بنانے کا کام شروع کر دیا ہے، اور آندھرا پردیش میں اس مقصد کیلئے تین بھاری کارخانے قایم کرنے کی اسکیم بورڈ کے زیر غور ہے۔ گرمیوں کے موسم میں، شہر حیدرآباد میں اس بورڈ کی جانب سے نیرے کی فروخت کا انتظام بھی کیا جاتا ہے

آندھرا پردیش کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ

سیلس امپوریم (فروختگاہ) واقع تلک روڈ

حیدرآباد

ایک بار ضرور تشریف لایئے۔ یہاں پر آپ کو پام گڑ، پام شکر کے علاوہ دیہی مصنوعات کی اور بھی بہت سی آپ کی پسند کی سستی اور اچھی چیزیں ملیں گی۔ کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز (دیہی مصنوعات) کی مدد کیجئے، اور اس طرح سے بیروزگاری کا نام و نشان مٹا دیجئے!

آندھرا پردیش کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ
تلک روڈ۔ حیدرآباد کے گرڈ سکشن نے جاری کیا

تلوک چند محرومؔ کی شاعری

جب مجھ سے کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کی فرمایش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر مجھ سے عمر میں بڑا ہے یا چھوٹا۔ اگر بڑا ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ غالبؔ مجھے اس کے کلام پر رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں، اور اگر چھوٹا ہوتا ہے تو میں خش ہوتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح اپنی بزرگی ــــ نہیں ــــ محض طوالت عمر سے فائدہ اٹھانے کو میرا جی چاہتا ہے اور خیال کرتا ہوں کہ جس طرح میں اپنے بڑوں کا احترام کرتا ہوں، وہ بھی اسی طرح میرا احترام کرے گا۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں ــــ چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو ــــ اسے اگر وہ مان نہیں لے گا تو کم سے کم اس کی تردید میں گستاخی سے بھی کام نہیں لے گا۔ حالانکہ اس زمانے میں چلچلے

دشنام حلال است و شکر قند حرام است

اس اخلاق کی توقع کسی کے طرف سے قایم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جس وقت جگناتھ آزادؔ نے (صادب کا اضافہ ان کے نام کے ساتھ مجھے پسند نہیں، کیونکہ ان کو چھوٹا سمجھنے اور چھوٹوں ہی کی طرح ان سے خطاب کرنے میں مجھے زیادہ لطف آتا ہے) مجھ سے اپنے والد محترم جناب محرومؔ کے مجموعۂ کلام کا دیباچہ وطن پر اظہار خیال کی درخواست کی تو مجھے قدرے تامل ہوا، کیونکہ میں سمجھتا تھا وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ اور ان کی بزرگی کے پیش نظر صاف صاف کہنا میرے لیے غالباً مشکل ہوگا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں تو میرا یہ پس و پیش دور ہو گیا، لیکن نہایت قلیل عرصے کے لیے بالکل عارضی طور پر، کیونکہ اس کے بعد جب میں نے ان کے کلام پر نگاہ ڈالی تو یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اور بزرگی و بزرگی کا سارا ڈھکوسلا ختم ہو گیا۔ میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود، ذہن و فکر کے لحاظ سے وہ مجھ سے بہت بڑے نکلیں گے۔ اتنے بڑے کہ ان کی بالکل ابتدائی نظموں کے سمجھنے کے لیے بھی مجھے ایک قرن پہلے یا ایک قرن بعد پیدا ہونا چاہیے تھا۔

یہی اگر ان کی منظومات صرف غزلوں یا منظری نظموں تک محدود ہوتے تو شاید میں اس قدر مرعوب نہ ہوتا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ ۱۹۰۶ء میں (جبکہ ان کی عمر ۱۷ سال تھی اور میری ۱۲ سال) وہ اپنی ایک وطنی نظم میں اتنی اونچی بات سوچ سکتے تھے کہ ؎

اختر ہند کو ہم اوج ثریا کر دے

تو میں اپنے اندر بڑا احساس کمتری پاتا ہوں، کیونکہ اس وقت کیا، اس وقت بھی یہ بات میرے ذہن میں نہیں آ سکتی کہ کوئی نوجوان شاعر حسن و عشق کے علاوہ اچھے اور بھی سوچ سکتا ہے اور محض سوچتا ہی نہیں، بلکہ حد درجہ خلوص و صداقت کے ساتھ کہہ بھی سکتا ہے ــــ اچھا ہوا کہ ان کی اس نوع کی منظومات میری نظر سے نہیں گذریں ورنہ میں یقیناً ان کو سخت نالائق و کم سمجھتا اور ان کی زندگی کو لایق افسوس!

میری ان کی ذہنیت میں اتنا فرق کیوں تھا، اس کا سبب اس وقت تو میں سمجھ ہی نہ سکتا تھا، لیکن اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اور وہ ہندو گھرانے میں ــــ میں مذہب کی روایتی تعلیم سے حد درجہ متاثر تھا، اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت کافر کہہ کر شہر بدر کر دیا جاؤں۔ اس لیے جب اس گھٹی ہوئی

نیاز فتحپوری

فضا بھی کچھ دیر کے لیے ملی ہو جاتا تو حسن و عشق کی باتوں سے اس فرنگ کو دور کرتا۔ خلاف اس کے جناب محروم کی تعلیم تربیت ہندو گھرانے میں ہوئی۔ اور چونکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ محض ایک عمرانی نظام ہے جس کی عدم پابندی پر کوئی ہندو کافر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جناب محروم جو بات اب سے ۵۰ سال پہلے سوچ سکتے تھے، میں شاید آئندہ ۵۰ سال کے بعد بھی اسی صداقت کے ساتھ نہ سوچ سکوں گا۔ یہی فرق تھا میرے ان کے ماحول کا کہ جب دورِ جدید تعلیم یافتہ نوجوان شباب ہی میں شاعری شروع کی تو ان کے ہاں میں دامنِ وطن تھا اور میرے ہاں میں دامنِ حسن و عشق، یعنی ٹھیک اسی زمانے میں جب وہ مظلومیت وطن کی داستان سناتے ہوئے یہ دعا مانگتے تھے کہ ۔

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

تو میں صرف اس تمنا میں جان دیتا تھا ۔

ہیں ہوں گا، رات ہو گی، وہ مہ جمال ہو گا
ساعت وہ آئے تو، جب جینا محال ہو گا

کتنا فرق تھا میرے ان کے احساس میں! اور یہ لحاظ فکر و نظر میں ان سے کتنا خیر و شر تھا، اور وہ چھوٹے ہوتے بھی جج سے کتنے بڑے تھے؟

یہی وہ زمانہ تھا جب مخزن اور زمانہ عروج پر تھے آزاد و حالی کی تعلیم کی ہوئی شاہراہ پر متعدد شعرا چل پڑے تھے۔ جن میں سے ایک محروم بھی تھے۔

اکبر کی طنزیاتی تنبیہات، اقبال کے مفکرانہ الفاظ، اسمٰعیل میرٹھی کی سنجیدہ حقیقت نگاری اور سرور کے ادبیانہ مطالعۂ فطرت سے اس وقت کی فضائے شاعری گونج رہی تھی۔ اور انہیں آوازوں میں ایک محروم کی بھی تھی، لیکن ان سے زیادہ مختلف اس میں نہ اقبال کے تفلسف کی گونج تھی، نہ اکبر کے طنزیاتی نشتر کی سرتیزی، نہ اسمٰعیل و سرور کی تہذیبی نفاستی، بلکہ ایک مجروح احساس کی سی درد انگیزی! ایک اجتماعی درد و غم کی سی کسک اور ایک ہڑبڑایا ہوا شعور صلائے عام دیا حق گویان چاکی نہ تھا، بلکہ ایک نوع کی دعوت بغاوت گری تھی۔

پھر یہ تو نہیں کہ میں نے آوازوں کی طرف سے کان بند کر لیے ہوں۔ میں بھی اس شور کو سنتا تھا۔ چونک چونک پڑتا تھا، لیکن اس کی نوعیت اس سے زیادہ اچھی اور نہ تھی کہ ۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

پھر چند کچے زمانے کے بعد میں بھی چونکا اور شاید سے میری قومی نظمیں بھی زمیندار اور الہلال میں شائع ہونے لگیں، میری یہ بیداری بھی نئی ہی سی تھی۔ کیونکہ جو کچھ میں سوچتا اور کہتا تھا اس کا تعلق زیادہ تر بیرونی سیاست اسلامیہ سے تھا اور وطن پرستی کا کوئی جذبہ میرے اندر پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لیے میری ان کی ذہنیت کے اس عظیم فرق کو دیکھ کر آپ اندازہ ہو سکتا ہے کہ بہ لحاظ فکر و نظر وہ جج سے کتنے بڑے ہیں۔ اور ان کے ملی و وطنی شعور کی حقیقی داد دینے کی صلاحیت جج میں کتنی پائی جاتی ہے۔

اگر جناب محروم کی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پورے ایک قرن کی تاریخ ادب کو سامنے رکھ کر ان کے نقوش فکر کا مرتبہ متعین کیا جائے اور یہ کام آسان نہیں، کیونکہ اس سلسلے میں یہ سوال ہمارے سامنے آتا کہ اس وقت تک انہوں نے کیا کیا لکھا، بلکہ یہ کہ انہوں نے کیا کیا نہیں لکھا۔

یوں تو بلحاظ اصناف سخن ہم یہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے غزلیں بھی لکھیں، نظمیں بھی لکھیں، قطعے اور رباعیاں بھی لکھیں، لیکن یہ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم کو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ ان تمام منازل سے کیوں کر گذرے، کن خصوصیات کو لیے ہوئے گذرے اور اپنی انفرادیت کے کیا کیا نقوش چھوڑتے ہوئے گذرے، لیکن مجھے اس وقت ان کی شاعری کے ان تمام وسیع حدود کو نہیں دیکھنا ہے، بلکہ صرف ان نظموں کو دیکھنا ہے جن کا موضوع صرف "وطن" و "حب وطن" جو میری رائے میں ان

کی تمام کارگاہ شاعری کا NUCLEUS ہے اور اسکے اطراف ان کے دوسرے اصناف سخن بھی گردش کرتے ہیں۔

شاعروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خدا قصد کرکے شعر تک پہنچتے ہیں، دوسرے وہ جن تک شعر خود پہنچتا ہے۔ اس کا جذبا اور خیال صرف شعر ہی کی صورت میں ہم کو اپیل کرسکتا ہے اور اس کے فکر و احساس کی بلندی و پاکیزگی (شاعری سے قطع نظر) بجائے خود آخری دلچسپ ہوتی ہے کہ شعر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

عربی میں عالا قدر مراتب شاعر کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔

شعرور، شویعر، متشاعر، شاعر اور فحذید۔ پہلی دو قسمیں وہ ہیں جن کا تعلق شاعری سے نہیں بلکہ انہام شاعری ہے۔

متشاعر وہ جس کو دوسرے الفاظ میں ہم شعر فروش یا محض ردیف قافیے کے شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس کے بعد حقیقی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں جس میں شعور انسانی بھی شامل ہوتا ہے اور فنی خوبی کے ساتھ حسن فکر بھی پایا جاتا ہے اور اسی کی انتہائی اور ارتقائی منزل وہ ہے جب ایک شاعر فحذید یا نابغہ ہو جاتا ہے۔

یہی حال اس میں شک نہیں کہ شعر محض فنی تار و پود کا نام نہیں، بلکہ اس کا حقیقی تعلق فکر و خیال سے ہے اور انہیں دونوں کے امتزاج سے مراتب شاعری کی تعیین ہوتی ہے۔

ادبیات میں دو چیزیں اور بھی قابل لحاظ ہیں، تفصیلی ایجاز اور شاعری میں ان دونوں کا عرف بڑا سلیقا چاہتا ہے کیونکہ بسا اوقات ایک شاعر تفصیلی جزئیات کی کوشش میں اطناب تک پہنچ جاتا ہے۔ اور ایجاز کی سعی میں اجمال تک۔ پھر جب ہم ان تمام خصایص شاعری کے سامنے (جن میں فنی شعور، فکر و خیال، اسلوب بیان، صداقت و حقیقت اور تفصیل و ایجاز سب کچھ شامل ہے) جناب محروم کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو اس میں یہ تمام باتیں بڑے اچھے توازن کے ساتھ ہم کو مل جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ موقع و محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ کا استعمال جو بلاغت کی شرط اولین ہے کہ یہ محروم کا خاص فن ہے۔ ملک میں جناب محروم کی رباعیاں بہت مشہور ہوئیں، یہاں تک کہ رباعی کے ذکر میں محروم کا نام، محروم کے ذکر میں رباعی کا تصور ناگزیر سی چیز ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ایجاز گوئی میں انہیں بڑا سلیقا حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قطعات بھی اس خصوصیت سے خالی نہیں۔ اور غزلوں میں بھی (حالانکہ وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں) وہ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔

محروم جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ شاعری کا بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ ایک طرف روایتی شاعری گریباں گو تھی دوسری طرف آزاد و حالی کی شاعری و امنگیز تھی۔ ایک طرف نشاط از دست رفتہ کی یاد تھی۔ دوسری طرف اندیشۂ حال مستقبل کی فریاد۔ ایک طرف داستان سرائی تھی، دوسری طرف حقیقت آرائی۔ ایک طرف "عشرت دیرینہ دن" تھی، دوسری طرف "صلاے بیداری و راہ پیمودن"۔ ایک طرف محض عشرت شبانا تھی، دوسری طرف نفیر زمانا ــــ کچھ لوگ ہنوز محو خواب تھے، کچھ چونک پڑے تھے۔ اور کچھ انگڑائیاں لے کر چل پڑنے والے بھی تھے۔ انہیں میں ایک محروم بھی تھے۔ جنہوں نے جادۂ نو پر قدم رکھا اور اس انداز سے گویا وہ پہلے کبھی گمراہ ہی نہ ہوے تھے۔ جسے ہم اگر کہا جائے تو ان کی زندگی کا المیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر فکری تقدس کے لیے جذبات کی لذیذیت کی قربانی بھی ضروری قرار دی جائے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ عنفوان شباب ہی میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا محروم کو کس نے سکھایا۔ اور ان کی اس سلامت روی کے کیا اسباب تھے۔ مجھے ان کے ماحول، ان کی تربیت اور خاندانی روایات کا علم حاصل نہیں، ورنا شاید میں سمجھ سکتا کہ قبل از وقت ان کی ذہنی پختگی کے کیا اسباب تھے۔ وہ کون سا ذہنی اضطراب تھا جس نے ان

ہیں اس قدر جلا، صلحا نا سنجیدگی کی طرف مائل کر دیا اور وہ کونسی نا آسودگیاں تھیں جنہوں نے محروم تخلص رکھنے پر انہیں مجبور کیا۔ کاش کہ اس سلسلے میں ہم اور کچھ بھی کہہ سکتے۔

جیسا کہ اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں کہ رباعی نگاری محروم کا خاص رجحان تھا۔ جو شاعری میں فنی و ذہنی استعداد کی بڑی کسوٹی سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اگر اس سلسلے میں ہم اس سے پہلے ہی انہوں نے ملی و وطنی شاعری کو اختیار کر لیا تو ان کی فطری نہاد و افتاد طبع کے لحاظ سے کوئی عجیب بات نہ تھی، لیکن اس پر شدید استعجاب ضرور ایک حد تک تعجب انگیز ہے۔

اس وقت ان کی رباعیوں یا غزلوں پر اظہار خیال مقصود نہیں، بلکہ صرف وہی منظومات سامنے ہیں جو جذبۂ وطنیت سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا مجموعہ "کاروان وطن" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال ہندستانی شاعری میں وطنیت کا عنصر ہم کو بہت کم یا بالکل نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ عہد میر و سودا میں یا اس سے قبل خال خال کوئی ایسا شعر مل جائے جس کو ہم کھینچ تان کر جذبۂ وطنیت سے منسوب کر سکیں، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ ملت و وطن ہمارے کلاسیکل شعرا کا موضوع نہیں رہا۔ غالب اس لیے کہ ہندستانی غزل گوئی، فارسی غزل گوئی کا چربہ تھی، اور ایرانیوں میں اس وقت غزل نام تھا ایک خاص لب و لہجے میں ذکر محبوب کا اور محافل مے و مینا کا جو جذبات محبت کی آسودگی و ناآسودگی دونوں حالتوں میں بڑی محرک ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے امیال و عواطف ان کے شاعرانہ تعبیرات ان کے رموز اور سوچنے کے سب طریقے غیر وطنی تھے۔ اپنے ملک اور اپنے ملک کی چیزوں سے دلچسپی لینے کا ذوق ان میں پیدا نہ ہوا تھا۔ یقیناً یہ بڑی افسوسناک بات تھی، لیکن یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا مسلم حکومتوں کے ماحول کا جو اپنے زوال کے بعد بھی مسلمانوں کے دل و دماغ پر بڑا دیرپا اثر چھوڑ گئیں۔

علامہ میکل شعرا میں سب سے پہلا شاعر جس کو احساس کی اس گمراہی سے مستثنا قرار دیا جا سکتا ہے، نظیر اکبرآبادی تھا۔ اس کو بے شک اپنے وطن، اپنے وطن کی چیزوں، اپنے وطن کی روایات سے بڑی محبت تھی۔ اور جس طرح لہک لہک کر اس نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا وطن پرست شاعر تھا۔

اس کے بعد عرصے تک کوئی شاعر اس ذوق کا نہیں ابھرا۔ یہاں تک کہ غالب کا دور آ گیا۔ اور اس وقت حالی نے سب سے پہلے وہ قدم اٹھایا جسے ہندستانی شاعری میں وطنیت پرستی کی پہلی بنیاد سمجھنا چاہیے۔

ہمارا چند اس وقت ملک کے حالات کا اقتضا یہی تھا کہ ذہن انسانی قدرتاً حسن و عشق کی باتوں سے گذر کر کام کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ بقول غالب۔

"عشرت ماضی کا تمام سوز و شور اور جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ اور شاہ ظفر کے ساتھ صبح شب کی آخری شمع بھی گل ہو چکی تھی۔ غیر ملکی حکومت کے کافی عبرت انگیز حد تک پنجے جم چکے تھے، اور ان مصائب کا احساس سب ہی کو تھا، لیکن معاشرے کی اس دکھتی ہوئی رگ کو حالی کے سوا کوئی نہیں پکڑ سکا۔ تاہم چونکہ حالی کی یہ آواز وقت کی آواز تھی۔ حال و مستقبل کی آواز تھی اس لیے وہ بالکل بے اثر نہ رہی۔ اور آخر کار اس دور شاعری کا آغاز ہو گیا جس نے اقبال، اکبر، اسماعیل میرٹھی، چکبست اور محروم ایسے شاعر پیدا کیے۔

ہمارا چند ان سب کا نصب العین ایک ہی تھا، لیکن راستے مختلف تھے۔ جس سے ہر ایک کی انفرادیت الگ الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ اقبال کی حیثیت ایک بلند بانگ نقیب کی سی تھی، اور اکبر کی ایک نشتر فضا کی سی۔ اسماعیل نے مطالبۂ حقائق پر زیادہ زور دیا اور چکبست نے رجز خوانی پر، لیکن محروم کا رنگ ان سب سے علحدہ تھا، وہی صداقت جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔

ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے، نہ سرفروشانہ تبلیغ لیکن صداقت قومی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔

ان کے جذبات کا خلوص، انداز بیان کی متانت گویا ایک بڑا بحر اسمندر ہے۔ جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور ان کی شاعری محض ماتم ملک و ملت نہیں بلکہ مکمل داستان ہے۔ ان کے دردمندانہ احساسات کی خدا ان کے نفسیات و بطون کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔

یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات سے تعلق رکھتا ہے، اور دوسرا حصہ آزادی کے بعد سے لے کر اس وقت تک کے اثرات سے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندستان کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ہے، جذباتی تصویر بھی۔ اور اس میں جس سچائی سے کام لیا گیا ہے، اسے اگر "وراے شاعری چیزے دگر ہست" کہا جائے تو یقیناً غلط نہ ہوگا۔

آخر میں پھر ایک بار یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجروح کے بلند جذبات و طینت کا صحیح اعتراف مجھ سے ممکن نہیں تاہم اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر میں مجروح کو اچھی طرح نہیں جان سکتا تو نہ جانوں۔

"باغ تو سارا جانے ہے"



KOHINOOR
GLASS FACTORY
PRIVATE LIMITED.

کوہ نور گلاس فیکٹری (پرائیویٹ) لمیٹڈ

(سنہ ۱۹۳۶ء میں جاری کی ہوئی)

آندھرا پردیش کی سب سے قدیم گلاس فیکٹری ہے

اس کارخانہ میں کانچ کا ہر قسم کا نفیس ترین اور نہایت ہی عمدہ اور پائیدار سامان تیار ہوتا ہے۔ داموں بالکل واجبی لیے جاتے ہیں۔ آرڈر پر ہر قسم کے مال کی فوری تعمیل کی جاتی ہے۔

اس فیکٹری کا مال ہندستان میں اور ہندستان سے باہر دنیا کے بیشتر ممالک میں بھی سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہ کارخانہ ۳۵ سال سے مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا آرہا ہے۔ اس لمبے چوڑے عرصے میں اس کارخانہ کی تیار کی ہوئی اعلیٰ قسم کی چیزوں کو کئی ایک نمائشوں میں اول انعام اور طلائی تمغے بھی ملے ہیں۔

آرڈر کے لیے نیچے کے پتہ پر لکھیے۔

مینیجر کوہ نور گلاس فیکٹری (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(پی۔ او۔ صنعت نگر۔ حیدرآباد اے۔ پی)

P.O.
SANATHNAGAR,
HYDERABAD, (A.P.)

سلطانا رضیا

نشیشور پرشاد منور لکھنوی

تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ سلطانا رضیا کے دل و دماغ میں مردانا اوصاف تھے اور وہ بیس لڑکوں کے بمقابل کہیں زیادا بہتر تھی۔ اس کا نقص تھا تو صرف یہ کہ اس کا تعلق صنف نازک سے تھا۔ اس کی علمی استعداد بہت زیادا تھی، وہ اکثر و بیشتر اپنے باپ سلطان التمش کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ التمش جب محاصرے کو الیادر میں مصروف تھا تو اس نے رضیا کو دہلی میں اپنا نایم مقام مقرر کر دیا تھا، وہ ان تمام دماغی اور جسمانی صفات کی مالک تھی جن کا ایک مثالی اور معیاری حکمران میں ہونا ضروری ہے۔ محاصرے کو الیادر کے بعد اس کے باپ نے اس کو اپنا وارث اور جانشین مقرر کر دیا تھا۔ اس محاصرے کے دوران میں سلطان نے ایک روز اپنے وزیر کو صاف طور پر یہ جتا دیا تھا کہ رضیا کوئی معمولی عورت نہیں ہے، حالانکہ قدرت کی طرف سے اس کو نسوانی جامہ ملا ہے، وہ حقیقت میں ایک مرد ہے، اس میں مردانگی کے تمام جوہر موجود ہیں۔

سلطانا رضیا جب اپنے باپ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوئی تو اس کو نوزسخت ترین مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ نظام الملک وزیر سلطنت تھا، اس نے رضیا کو حکمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کچ اور امرا نے بھی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اودھ کی نظامت ان دنوں ملک نصرت الدین کے ہاتھ میں تھی۔ نظام الملک کی بغاوت کو دبانے اور امرا کی مخالفت کو فرو کرنے کے لیے نصرت الدین کو طلب کیا، لیکن نصرت الدین دار الخلافے میں داخل ہونے سے پہلے ہی قید کر لیا گیا اور اس طرح دار الخلافا مدت دراز تک محاصرے میں رہا۔ آخر کار ایک روز سلطانا نے شہر سے باہوں اتحادیئے اور شہر سے باہر خیمہ ڈال دیا پھر بڑی حکمت عملی سے کام لیکر اس نے دو باغی امرا کو اپنی طرف ملا لیا۔ جب دوسرے باغی امرا کو اس غیر متوقع تبدیلی کا علم ہوا تو وہ خود بیک بینی و دو گوش بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاہی فوجوں نے بہت بری طرح ان کا پیچھا کیا۔ دو امیر ملک سیف الدین اور اس کا بھائی فخر الدین شاہی فوجوں کے نرغے میں آ گئے اور انہیں گرفتار کر کے پھانسی دیدی گئی، اور امیر ملک علاو الدین کا سر کاٹ کر ملکا کے سامنے لایا گیا اور نظام الملک نے بھاگ کر پہاڑوں کی راہ لی وہیں اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ وزارت کی کرسی اب مہذب الدین محمد کو ملی جو اس سے پیشتر نظام الملک کا نایب تھا۔ سلطانا کی طرف سے اس کو بھی نظام الملک کا خطاب دیا گیا۔ بغلوغ خان کو سپاہ سالار اعظم کا بھاری عہدا ہات آیا، اور لاہور کی نظامت ملک عزیز الدین کبیر خان ایاز کے سپرد کی گئی اس طرح سلطانا نے تمام باغی سرداروں کو تہ و بالا کر ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اور مکھناوتی کے ملک نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ شمس الدین التمش کی وفات کے بعد دہلی کی مرکزی سلطنت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے لڑکوں میں حکومت کا کاروبار چلانے کی برائے نام بھی صلاحیت نہ تھی۔ یہ لوگ برے اور بدکار تھے، ان میں مردانگی کے جوہر بلکل ختم ہو چکے تھے بزدلی نے ان کو نکما بنا دیا تھا، عیاشیوں اور رنگ رلیوں میں ہر وقت مصروف رہتے۔ سب سے بڑے لڑکے رکن الدین کو شمس الدین کے بعد تاجداری ملی تھی مگر وہ برے کاموں میں گرفتار ہو گیا، انتظام حکومت اس کی ماں کرتی تھی۔ سلطان جس زمانے میں (ربیع الاول ۶۳۴ھ) کہرام میں تھا اس کی ماں نے سلطانا رضیا کے خلاف سازش کی۔ رضیا مرحوم سلطان شمس الدین کی سب سے بڑی لڑکی تھی مگر

امرا رکن الدین اور اس کی ماں کے طرز عمل سے سب بدل ہو چکے تھے۔ انہوں نے سلطانا رضیا کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی وفاداری کا دم بھرنے لگے، اس واقعے کی اطلاع پاتے ہی سلطان رکن الدین نے دار الخلافے کی طرف پیش قدمی کی، لیکن اس کے دلی پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ماں کو حراست میں لے کر قیدی بنا دیا گیا تھا۔ سلطانا رضیا نے رکن الدین کی گرفتاری کے لیے فوج بھیجی، رکن الدین بھی محصور کر کے گرفتار کر لیا گیا، اور اسے بھی قید کر دیا گیا۔

ہر کمزوری حکومت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں نے رنتھمبور کے قلعے کی فوج پر قابو پا لیا تھا۔ سلطانا رضیا کو جب بغاوت فرو کرنے کے بعد اطمینان سے سانس لینے کی فرصت ملی تو اس نے ملک قطب الدین حسین کو رنتھمبور کے فوجی دستے کی گلو خلاصی کے لیے روانا کیا۔ قطب الدین نے فوج کو مخالفوں کے قبضے سے چھڑا لیا اور قلعے کو مسمار کر کے خاک میں ملا دیا۔ سلطانا رضیا کو محض روزمرہ کے کاروبار حکومت ہی سے واقفیت نہیں تھی، بلکہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی معاملات کو بھی خوب سمجھتی تھی۔ وہ دربار کرتی، تخت شاہی پر متمکن ہو کر سب کے سامنے فرائض حکومت انجام دیتی، رعایا کے ساتھ اس کا اتنا اچھا سلوک تھا کہ بچا بچا اس پر جان چھڑکنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے حاسدوں اور مخالفوں نے کئی مرتبہ سر اٹھایا اور شورش برپا کی۔ ان سب کی سازباز سے سلطانا کے دشمنوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ سازشی گروہوں کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جس کے باعث ملک میں مکمل طور پر امن و امان قایم ہو گیا۔ اور دور دور تک انتظام حکومت چلنے لگا۔ رضیا کی شادی نہیں ہوئی تھی، لیکن اپنے داروغۂ اصطبل کی جانب بہت زیادہ مایل تھی، داروغۂ اصطبل کا عہدہ اس زمانے میں صرف ممتاز اشخاص کے حصے میں آتا تھا۔ اس عہدے کو شاہی اصطلاح میں "امیر آخور" کہتے تھے۔ امیر آخور ملک حبشی کا رہنے والا تھا۔ اسی لیے اگر اس کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی تو ترکی امرا کو ناگوار گذرتا تھا۔ سلطانا رضیا جب شہسواری کے لیے نکلتی تو یہی امیر آخور اس کو گھوڑے پر سوار کرتا۔ سلطانا رضیا کی یہ حرکت کچھ لوگوں کی آنکھوں میں بہت کھٹکتی تھی۔

مشہور مورخ ایچ۔ ٹی۔ ریورٹی نے انفشن کے حوالے سے سلطانا رضیا کے بارے میں لکھا ہے کہ اگرچہ سلطانا میں بہت سی خوبیاں تھیں، وہ بڑی ذہین تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنی ایک کمزوری پر غالب نہ آسکی اور وہ کمزوری یہ تھی کہ وہ امیر آخور پر غیر معمولی طور پر مہربان تھی، یہ بات اس کے مرتبے اور منصب کے خلاف تھی، اور خاص طور پر اس لیے کہ امیر آخور رنسل غلام تھا، مگر امیر آخور کی طرف اس کا یہ التفات کسی مجرمانہ ذہنیت کے تحت نہیں تھا۔ اس کے خلاف صرف یہ الزام تھا کہ اس نے مرتبۂ شاہی کا احترام ملحوظ نہیں رکھا اور ایک حبشی کو اس بات کی اجازت دی کہ اسے اٹھا کر گھوڑے کی پشت پر بٹھائے، مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیا گھوڑے پر کبھی سوار نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ہاتھی کو سواری کے لیے کام میں لاتی تھی۔ یہ نتیجہ ہے کہ اس معاملے میں بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہے۔ مولانا منہاج الدین ابو عمر عثمان مصنف طبقات ناصری کے حوالے سے ان حالات کا ذکر طبقات اکبری، فرشتہ اور بدایونی نے کیا ہے کہ سلطانا نے دلی کے مدرسۂ ناصریا کا انتظام انہیں مولانا منہاج الدین کے سپرد کیا تھا، اور مدرسے کے معمولی فرائض کے ساتھ ساتھ انہیں گوالیار کا قاضی بھی بنا دیا گیا تھا۔ فرشتہ بدایونی اور طبقات اکبری میں ان واقعات کو جو طبقات ناصری میں درج ہیں زیادہ اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بدایونی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب سلطانا گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہوتی تو خاص طور پر اسی حبشی جمال الدین یاقوت کا سہارا لیتی تھی۔ اپنی حکومت

کے آخری دور میں اس نے زنانا لباس ترک کر دیا، "قمر" نام رکھا، پوشاک پہننا شروع کر دی۔ اور پردے کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے داروغگی اصطبل کے فرائض میں یہ کام بھی شامل کر دیا گیا تھا، یا اس کو یہ اعزاز خاص طور پر دیا گیا تھا کہ حکمران کو ہاتی یا گھوڑے پر سوار کرنا کسی قسم کے ناواجب اختلاط کا باعث نہیں تھا۔ شاید صرف اسلامی آئین تمدن کے لحاظ سے وہ بات جو حکمرانوں کے لیے روا قرار دی گئی تھی۔ خواتین حکمرانوں کے لیے ناروا سمجھی جاتی تھی، اگرچہ طبقات ناصری کے مصنف نے خود اس قسم کا خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔ طبقات اکبری میں صرف یہ لکھا ہے کہ جمال الدین یاقوت سلطانا کا خاص منظور نظر تھا۔ اس دوران میں علاقۂ تبرانہند کے ناظم ملک اختیار الدین التونیا نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور دربار کے دغاباز امرا نے اس کی حمایت کی۔ لاہور سے تبرانہند روانا ہونے پر سلطانا کی فوج کے ترکی امرا نے غداری سے کام لیا اور سلطانا کو گرفتار کر کے تبرانہند کے قلعے میں مقید اور محبوس کر دیا۔ اس تیرہ بند کے عالم میں کہ لیے اب خود کو فاتح ترک التونیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں نظر آیا، اور جب اس کو نجات کی کوئی دوسری صورت نہیں نظر آئی تو اس نے التونیا کے ساتھ شادی کر لی۔ شادی کے بعد سلطان اور ملکا دونوں ایک فوج کے آگے آگے دار الخلافے کی طرف روانا ہوئے، لیکن تقدیر کا نشانہ کچھ اور ہی تھا۔ شہر کے بیرونی حصے میں پہنچتے ہی دونوں کی مڈبھیڑ شہزادۂ معز الدین بہرام سے ہو گئی، جس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ اس کے ساتھ کثیر تعداد طاقتور فوج تھی۔ اس کے مقابلے میں سلطانا اور ملکا دونوں کو شکست فاش ہوئی، اور وہ بھاگ کر کرنال ضلع کے ایک مقام کیتھل پہنچ گئے، کہتے ہیں وہاں ہندوؤں نے ان کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سلطانا رضیا ایک نہایت نیک سیرت ملکا تھی وہ علم و ہنر کی سرپرستی کرتی تھی۔ اور رعایا کا مفاد اس کو جان و دل سے عزیز تھا۔ اس کا انجام کس قدر دردناک ہوا معلوم نہیں۔ اس کی زندگی کا اس طرح خاتمہ آئین فطرت کی رو سے کہاں تک جائز تھا۔

سلطانا رضیا کے ابتدائی سکوں پر یہ عبارت کندا تھی۔

"عمدۃ النسواں ملکۂ زماں سلطان رضیہ بنت شمس الدین التمش ضرب بلدہ دہلی ۶۳۴ھ جلوس عہد"

عیسوی تاریخوں میں رضیا سلطانا کا زمانۂ حکومت ۱۲۳۶ء سے لے کر ۱۲۳۹ء درج کیا گیا ہے۔

سلطانا رضیا تاریخ ہندستان میں سب سے پہلی اور سب سے آخری مسلمان حکمران عورت تھی۔ اس کا سال شہادت ۱۲۴۰ عیسوی ہے۔

میرے جان کرسی الہوی

بڑھاتی ہے بے شان کی شان کرسی
ہے لیڈر کا دین اور ایمان کرسی
جو "کرسی نشیں" وہ بولے نہ بولے
مگر بول سکتی ہے بے جان کرسی
دلاتی ہے دولت بڑھاتی ہے عزت
دکھاتی ہے اللہ کی شان کرسی
کھڑا ہے بہت دیر سے تیرا خادم
خدا کے لیے لا "میری جان کرسی"
سنا کر انہیں کل کی جنت کے قصے
غریبوں پہ کرتی ہے احسان کرسی
خدا جسکہ کرسی کا ہے خود نگہباں
نہ ملت کی کیوں ہو نگہبان کرسی
مجید آپ نے بھی دیکھا ہے وہ منظر
کھسکتی ہے نیچے سے جس آن کرسی

مجید لاہوری

آزادی کے بیس سال

ڈاکٹر ہمایون کبیر مرکزی وزیر ثقافت اور

۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو ہماری آزادی کے بیس برس پورے ہوئے۔ چنانچہ یہ ایک اچھا موقع ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جایزہ لیں اور مستقبل کے لیے راہنمائی حاصل کریں۔

جہاں تک کامیابیوں کا تعلق ہے ہندستان اپنی بہت سی باتوں پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، کیونکہ کسی بھی ملک کی ترقی اور خوش حالی کا اندازا اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس نے تعلیم کو کس قدر فروغ دیا اور صنعتوں کی بہتری خصوصاً لوہے اور فولاد کی تیاری میں کس قدر ترقی کی اور پیدایش اموات کے اعداد شمار نیز خوراک کی بہرسانی ۔۔۔ کی روشنی میں معیار زندگی میں کتنی اصلاح کی۔

اگر ہم تعلیم کے پہلو پر نظر دوڑائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان نے آزادی کے بعد سے اس شعبے میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ آزادیٔ وطن کے وقت ہمارے ابتدائی اسکولوں میں کوئی ڈیڑھ کروڑ بچے زیر تعلیم تھے، مگر اب ان کی تعداد ساڑھے تین کروڑ کے قریب ہے۔ پندرہ برس سے بھی کم مدت میں دو کروڑ کے اضافے پر کوئی بھی ملک فخر کر سکتا ہے۔ اسی طرح سکنڈری اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں بھی طالب علموں کی تعداد تین گنا اور چار گنا ہو گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ٹیکنکل اور انجینیرنگ تعلیم کی رفتار ترقی اس سے بھی زیادہ قابل ذکر ہے اور یہ آشا کی جاتی ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے یہ پتا چل جائے گا کہ ملک کو پڑھا لکھا بنانے کے معاملے میں مجموعی طور پر ملک نے بہت پیشقدمی کی ہے۔ اب آیئے صنعت کے موضوع پر۔ اس سلسلے میں ہندستان میں پہلی بار بہت سی نئی اور بنیادی صنعتوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ خصوصاً فولاد سازی میں جو ترقی ہوئی ہے وہ صنعتی ترقی کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ چنانچہ گذشتہ بیس برس کی مدت میں ہندستان کی فولاد سازی میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ اور توقع ہے کہ ۱۹۶۲ء میں یہ تعداد ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں پانچ گنا ہو جائے گی۔ اس ضمن میں دنیا کا کوئی ملک اگر ہندستان کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ صرف جاپان ہے جس نے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان اس سلسلے میں قابل لحاظ ترقی کی تھی۔ پیدایش اور اموات کے اعداد شمار دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ صحت اور صفائی کو بہتر بنانے والی سرگرمیوں کی بدولت شرح اموات بہت کم ہو گئی ہے۔ چنانچہ تیسرے پانچسالا پلان کے خاکے کے مسودے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب ہمارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں، کیونکہ آبادی میں اضافے کی رفتار ہماری تمام توقعات سے بڑھ گئی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے بھی یہ اندازا ہوتا ہے کہ عوام کی قوت خرید بڑھ گئی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں خوراک کی پیداوار میں لگ بھگ پچاس فی صد کا اضافہ ہوا ہے، اور شکر کی پیداوار تقریباً دگنی ہو گئی ہے، مگر اسی مدت میں آبادی میں بیس فیصدی سے بھی کم اضافہ ہوا ہے۔ اناج کی درآمد میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ ان حقایق سے واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں آج ملک میں فی کس زیادا خوراک دستیاب ہے۔ اگر اناج اور شکر کی موجودا قیمتیں اونچی سطحوں پر ہی رہتی ہیں اس سے صرف یہی نتیجا نکالا جا سکتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں آج زیادا لوگ ان دونوں چیزوں کو زیادا مقدار میں استعمال کرنے کی توفیق رکھتے ہیں۔ یہ تمام اور دوسری بہت سی باتیں

ہمارے منافع کے کھاتے میں درج ہو سکتی ہیں، مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کے برعکس کچھ امور ایسے بھی ہیں جو ہمارے گھاٹے کے کھاتے میں درج ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی اتحاد اور دیانتداری کی کمی ہے۔ آزادی سے پہلے ملک نے برطانیا کے خلاف جو جنگ آزادی لڑی اس نے عوام کو متحد کر دیا تھا، مگر آج ہم اس منزل مقصود یعنی آزادی کو حاصل کر چکے ہیں اور برطانوی اقتدار ملک سے ہٹ چکا ہے۔ اس لیے آزادی سے پہلے ملک کو رشتۂ اتحاد میں باندھنے والی ایک بڑی قوت معدوم ہو چکی ہے۔ سماجی انصاف اور تعمیری سرگرمیاں ملک کو متحد کرنے کے لیے ایک نئی قوت ثابت ہو سکتی تھیں لیکن بدقسمتی سے تقریباً ہر سطح پر دیانتداری اور اونچے آدرش پسندی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ جن لوگوں نے ماضی میں ایک نیک مقصد کے لیے ایک گونا گوں رکاوٹ یا نقصانات برداشت کیے آج وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنی قربانی کی نقد قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدغرضی میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ طلبا بھی اپنی پڑھائی ختم کرنے سے پہلے ہی آسان کاموں کے لیے سوچنے لگتے ہیں۔ آج ہر شخص دوسروں کی پروا کیے بغیر اپنے اغراض پورا کرنے میں مصروف ہے۔ پھر انتشار پسندانہ رجحانات بھی بڑھتے ہی آ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جسے درگذر کرنا اپنی تباہی کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ چونکہ ہم ملک اور اپنے آپ کو ایک نہیں مانتے۔ اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خفیف ترین اشتعال پر قومی جائیداد پر حملے کیے جاتے ہیں اور اسے تباہ برباد کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ لوگ زیادہ اونچے آدرشوں یا قومیت کو سامنے رکھ کر سوچیں۔ بہت سے لوگ ذات، زبان یا فرقہ پرستی کے پہلو سے سوچتے ہیں۔ اس کی علاوہ ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ اگر کسی ٹھیکہ تک رسائی کر لی جائے تو قریب قریب یہ کام ہو سکتا ہے۔ آج بہت سے لوگ اہلیت کو نہیں بلکہ نوازش کو کامیابی کی کنجی سمجھتے ہیں۔ رشوت وغیرہ ایسی بدعنوانیاں جو عام طور پر موضوع بحث بنے ہوئے ہیں، وہ عوامی اور ذاتی دیانتداری میں یقین کی کمی کی مزید ثبوت ہیں۔ بلاشبہ بہت سے الزام بے بنیاد ہوتے ہیں اور ان میں اکثریت کے ساتھ مبالغے سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت کہ بہت سے الزامات لگائے جاتے ہیں اور عوام ان پر آسانی سے یقین لے آتے ہیں۔ اس بات کی شہادت ہے کہ ملک کے ڈھانچے میں کوئی نقص ضرور ہے۔ ایک اور پریشان کن خرابی یہ ہے کہ لوگ برائی کو چپ چاپ قبول کر لیتے ہیں۔ یہ گذشتہ صدیوں سے ہمارا قومی عیب رہا ہے۔ مثال کے طور پر مہابھارت میں بھیشم اور درون کوروں کے کردار سے متفق نہیں ہیں، مگر جب بھرے دربار میں کورو دروپدی کو بے عزت کرنا چاہتے ہیں تو ان دونوں میں سے کوئی بھی اس شرمناک بے حرمتی کو روکنے کے لیے مداخلت نہیں کرتا۔ اور یہ تو ہمارے روز بروز کے تجربے کی بات ہے کہ جب ہم کسی برائی کو دیکھتے ہیں تو ہم بعض اوقات نظر انداز کر دیتے ہیں یا اگر ہم اس کی مذمت کرتے بھی ہیں تو عام طور پر اسے دور کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو برطانوی حکومت کے اقتدار کے ساتھ ٹوٹے رہے تھے آج عوام سے متعلقہ بہت سے معاملات پر اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنے کے لیے تیار نہیں دکھائی دیتے۔ یہ بات زیادہ اجر ناک ہے کیونکہ آج ہمارے پاس وہ قومی رہنما موجود ہے۔ جس نے تمام دوسری خوبیوں کے مقابلے میں جرات کا زیادہ بلند کیا ہے۔ جواہر لال نہرو نے بار بار کہا کہ خوف تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ قحط قوحش خوف کی وجہ سے ہی ایک دوسرے کیساتھ برا سلوک کرتے ہیں یا لڑائی شروع کرتی ہیں۔ ڈر کے مارے بہت سے اشخاص ایسے کام کر گذرتے ہیں کہ جن پر وہ بعد میں خود ہی شرمسار ہوتے ہیں۔ جب ہم اس خوف کو پرے پھینک دیا تو ہم آزاد ہو گئے، مگر آج وہی خوف بہت سی شکلوں میں ہماری زندگی میں پھر سے گھسا اور اسے لگاتار ڈنا رہا ہے۔ آزادی مسلسل چوکسی کا تقاضا کرتی ہے لیکن بھروسہ کسی بھی قوم کی عظمت کا دارومدار اس کی جرات اور بہادری پر ہے۔ ۱۹۴۷ء سے جو ہندستان نے جو حقیقی کامیابیاں حاصل کیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندستانیوں میں اہلیت اور محنت کی کوئی کمی نہیں۔ البتہ اخلاقی ڈھانچے میں جو کمزوری واقع ہو رہی ہے

دھابی دھوڑا

آدم خور کا

اگر آپ نظری مناظر اور قدرتی حسن کے دلدادا ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ آپ "دھابی دھوڑا" کی پرکیف فضاؤں اور وہاں کے قدرتی مناظر کو ایک بار دیکھنے کے بعد بھول جائیں۔ یوں تو اس پوری وادی میں قدرت کی رنگینیاں دامن دل کھینچتی ہیں، مگر "بھگوان کی پہاڑی" کے دامن میں بنے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے تو یہ مناظر بے انتہا حسین نظر آتے ہیں اور انسان گھنٹوں ان دلکش نظاروں میں کھویا رہتا ہے۔ نہ جانے اس پہاڑی کا نام "بھگوان کی پہاڑی" کیسے پڑ گیا۔ شاید کوئی قدیم روایت یا عقیدے کی پختگی اس کے پیچھے کارفرما ہو۔ بہرحال یقین کرنے پر مشتمل اس ریسٹ ہاؤس سے پہاڑی ڈھلان سیدھے نیچے وادی میں دریائے پانار تک اترتی چلی گئی ہے اور وادی کے سرے پر اونچی اونچی پہاڑیوں کی دیوار اور بلند ہوتی چلی گئی ہیں۔ جس کی چوٹیاں موسم سرما میں برف کا لبادا اوڑھ کر وادی کی رعنائیوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ نینی تال سے جو ایک مختصر سڑک لوہارگیٹ کو جاتی ہے وہ دھابی دھوڑا کے مقام سے بھی گذرتی ہے۔ اور اسی سڑک کی ایک شاخ کٹ کرالموڑا اور دھابی دھوڑا کو ملاتی ہے۔

میں اصل میں الموڑا اور دھابی دھوڑا کو ملانے والی سڑک کے جنگلی میں "پانار" کے آدم خور شیر کو شکار کرنے کی نیت سے آیا تھا کہ اسی دوران میں ایک روز اور سیر نے مجھے یہ اطلاع پہنچائی کہ دھابی دھوڑا میں ایک اور آدم خور نے ایک دیہاتی کا شکار کیا ہے، چنانچہ اس خبر نے مجھے پہلے دھابی دھوڑا جانے پر مجبور کر دیا۔ ویسے بھی جس جگہ مجھے خبر ملی تھی وہاں سے دھابی دھوڑا بہت زیادہ دور نہ تھا۔ مغربی طرف سے دھابی دھوڑا پہنچنے کا قریب ترین رستا وہ تھا جو پہاڑی کے اوپر سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ اگرچہ کافی مشکل تھا اور چڑھائی بھی کافی تھی، لیکن میں نے وقت بچانے کی خاطر یہی رستا اختیار کیا۔

سہ پہر کا وقت تھا اور اپریل کا مہینہ۔ میں اسوقت ریسٹ ہاؤس کے برامدے میں بیٹھا ہوا وادی کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے سامنے سے دھابی دھوڑا کے مندر کا پجاری آتا دکھائی دیا۔ وہ یقیناً مجھ سے ملنے آرہا تھا، کیونکہ آج سے دو سال پہلے جب میں چمپاوت کے آدم خور کو شکار کرنے یہاں سے گذرا تھا، تو اس بوڑھے پجاری سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک سیدھا سادا مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ دھابی دھوڑا کے قریب و جوار میں مندر نہ ہونے کی وجہ سے آس پاس کے گاؤں والوں کے لیے بھی دھابی دھوڑا مندر کی وجہ سے خاصا متبرک بن گیا تھا، اور دیہاتی اس بوڑھے پجاری کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھے سلام کیا اور خیریت دریافت کر کے رسمی جملے ادا کرنے کے بعد وہ اطمینان سے آمنے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کو سگریٹ نکال کر دی۔ سگریٹ کے چند کش لگانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا پچھلی رات دھابی دھوڑا میں شیر سے کسی آدمی کے مارے جانے کی جو خبر مجھے ملی ہے وہ بالکل غلط ہے۔

"تو کیا واقعی یہاں کوئی نہیں مارا گیا اور یہاں کوئی آدم خور نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں آدم خور تو ضرور ہے۔ البتہ آدمی کے مارے جانے کی خبر صحیح نہیں۔ اصل میں وہ ایک چرواہا تھا جو الموڑا سے واپس اپنے گاؤں جاتے ہوئے رات گذارنے کے لیے مندر میں ٹھہرا تھا، اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ رات مندر کے

درشت
نیما

باہر والے برآمدے میں سو گیا۔ صاحب کوئی آدھی رات گئی ہوگی کہ ہم نے اس کے چیخوں کی آواز سنی۔ ہم سب دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ معلوم ہوا کہ آدم خور نے آکر اس کو ٹخنے سے پکڑ کر کھینچنا چاہا، مگر شاید اس کا پنجا اوجھا پڑا، چرواہے نے جاگ کر فوراً چیخنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پاس سے جلتی ہوئی آگ میں سے لکڑی نکال کر آدم خور شیر کی طرف پھینکی۔ اس کی چیخ اور آگ کی وجہ سے آدم خور فوراً ہی بھاگ گیا۔ اور چرواہے کے بھی معمولی زخم آئے تھے، جن کی ہم نے اسی وقت مرہم پٹی کر دی۔"

"مگر وہ چرواہا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو صبح ہی اپنے گاؤں چلا گیا۔"

پجاری کی اس گفتگو کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہی دھابی دھوڑا میں ٹھہروں گا۔ مندر اور ایک پیئے کی دکان ہونے کی وجہ سے آس پاس کے تمام چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ یہاں تقریباً روز ہی آتے ہیں۔ جب ان کو یہاں میری موجودگی کی خبر ملے گی تو وہ یقیناً مجھے اپنے علاقے میں کسی آدمی یا جانور مارے جانے کی خبر تو فوراً بھجوائیں گے۔ اور اس طرح مجھے اپنے کام میں زیادہ سہولت اور آسانی ہوگی۔

سہ شام جب پجاری مجھ سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کہیں قریب ہی کوئی شکار مل سکتا ہے، کیونکہ میرے ملازموں کو کئی روز سے گوشت نہیں ملا تھا۔ اور دھابی دھوڑا اور آس پاس کے کسی گاؤں میں قصاب کی کوئی دکان نہیں تھی۔

"ہاں صاحب کیوں نہیں" میرے سوال پر پجاری عجیب طریقے سے مسکرایا اور بولا "یہی مندر والا شیر ہے۔"

"مندر والا شیر؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں صاحب ہم اس کو مندر والا شیر کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اکثر مندر میں آتا ہے، مگر کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بھگوان کی عجیب لیلا ہے۔ آپ شوق سے مارئیے صاحب! مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا، مگر صاحب نہ تو آپ، اور نہ ہی کوئی اور، اس کو مار سکتا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر مجھے بہت تعجب ہوا، اور میں نے اس کی وجہ دریافت کی، مگر وہ کوئی وجہ بتائے بغیر اس کی گردان کزنار ہا کہ وہ مندر میں آتا ہے، مگر اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔"

ظاہر ہے اس کا یہ خیال مندر سے شیر کی وابستگی کی بنا پر تھا۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ پجاری کے جانے کے بعد میں آنے والے واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔

دوسری صبح کو میں ٹوہار گھاٹ جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ محض اس خیال سے کہ شاید آدم خور کے کچھ نشانات یا سکوں یا آس پاس کا کوئی باشندہ اس کے متعلق کسی قسم کی کوئی خبر دے سکے، کیونکہ میرا خیال تھا کہ پچھلی رات مندر میں چرواہے پر ناکام حملا کرنے کے بعد آدم خور یقیناً اسی طرف گیا ہوگا۔ کئی گھنٹے ادھر ادھر پھرنے کے بعد جب میں اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس ریسٹ ہاؤس پہنچا تو ایک دیہاتی کو اپنا منتظر پایا۔ اس دیہاتی نے مجھے بتایا کہ اسے پجاری کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ کو اپنے آدمیوں کے لیے گوشت چاہیے۔ اس نے کہا وہ ایسی جگہ بتا سکتا ہے، جہاں میں سانبر کا شکار کر سکتا ہوں۔ چونکہ مجھے اور میرے آدمیوں کو گوشت کی واقعی ضرورت تھی۔ اسی لیے میں نے کھانے کے بعد اس کے ساتھ چلنے کا وعدہ کر لیا۔ چند مہینے پہلے کلکتہ سے میں نے ایک ہلکی قسم کی نئی رائفل خریدی تھی۔ جو پرندوں اور ہلکے شکار کے لیے بے حد موزوں تھی۔ نیز دکاندار نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر صحی کام نہ دے تو میں اس کو بعد میں واپس بھی کر سکتا ہوں۔ اس رائفل کو آزمانے کے لیے میں نے یہ موقع اچھا سمجھا۔ نئی رائفل سنبھال کر میں اپنے دیہاتی دوست کے ساتھ سانبر کے شکار کے لیے چل پڑا۔

شمال کے مقابلے میں دھابی دھوڑا کے جنوبی حصے میں پہاڑی کی ڈھلان کم تھی۔ اور ہم اسی جانب بلوط کے پیڑوں اور گھنے جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے کوئی دو میل تک نکل آئے اس وقت ہم ایک گول سی پہاڑی پر تھے۔ جہاں پر لمبی لمبی گھاس تھی اور سامنے نیچے پوری وادی پھیلی تھی۔ نیچے وادی میں بائیں جانب ایک گھانس کے خطے کی طرف جو چہار جانب گھنے جنگل سے گھرا ہوا تھا، اشارا کرتے ہوئے مجھے میرے ساتھی نے بتلایا کہ گھانس کے اس خطے پر صبح و شام سانبر چرنے کے لیے آتے ہیں، اور وہ گاؤں سے آتے جاتے کئی بار ان کو دیکھ چکا ہے۔ ہمارے دائیں جانب سے ایک رستا نیچے وادی میں سے ہو کر جاتا تھا۔ میری رائفل پانچسو گز کے فاصلے سے نشانا لگا سکتی تھی۔ اور اس رستے اور اس خطے کا فاصلا تین سو گز سے زیادا کا نہ تھا۔ اس لیے میں نے نیچے وادی میں اس رستے سے جانے کا فیصلا کیا۔ تاکے شکار میں آسانی ہو، جب ہم گفتگو کر رہے تھے کہ میں نے سامنے بائیں جانب چند گدوں کو آسمان پر منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ جب اپنے ساتھی کی توجہ اس طرف لوٹائی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اور بہت ممکن ہے وہاں کسی مرد اجانور پر یہ گدھ منڈلا رہے ہوں۔ بہرحال ہم بہت جلد اس گاؤں میں پہنچیں گے، کیونکہ ہمارا رستا ادھر ہی سے ہو کر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم گاؤں میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہاں صرف ایک گھر ہے۔ ایک طرف مویشیوں کا اصطبل ہے اور ایک ایکڑ کے قریب کھیتی باڑی کی ہوئی زمین ہے۔ پاس ہی گھر اور کھیت سے علحدا ایک جوہڑ ہے، جس میں بارش کا پانی بھرا ہوا ہے اور دوسری جانب ایک مردا جانور کا ڈھانچا پڑا ہوا ہے، جس پر گدھ منڈلا رہے ہیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر ایک آدمی جھونپڑی سے باہر نکل کر ہمارے پاس آیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں کون ہوں اور دھابی دھوڑا کس مقصد کے لیے آیا ہوں، تو اس نے بڑے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"صاحب افسوس ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہیں ہیں ورنا میں آپ کو ضرور اطلاع دیتا، خیر اب آپ اس شیر کو ضرور شکار کریں، جس نے میری گائے مار ڈالی ہے۔"

اس نے مجھے بتایا کہ پچھلی رات کو کسی شیر نے اس کی سب سے زیادا خوبصورت اور صحت مند گائے مار ڈالی ہے، اس کے پاس کوئی بندوق وغیرا بھی نہیں ہے، جس سے وہ شیر یا کسی دوسرے خطرناک جانور کا مقابلا کر سکے۔ اس کے لیے یہ نقصان بہت زیادا تھا۔ چنانچہ وہ مری ہوئی گائے کی کھال بیچنے کے لیے قریب کے دوسرے گاؤں میں گیا تھا۔ تاکہ کچھ تو اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ کھال میرے آنے سے کوئی دو گھنٹے پہلے وہ اتار چکا تھا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں آدم خور ہے؟" میں نے پوچھا

"معلوم تھا صاحب" کسان نے جواب دیا۔

"تو پھر تم نے اپنے مویشیوں کو کھلا کیوں چھوڑا؟"

"اس لیے کہ ــــ" وہ بولا "پچھلی رات سے پہلے کبھی آدم خور نے کوئی جانور نہیں مارا تھا۔"

آخر جب میں وہاں سے چلنے کو ہوا تو کسان نے بڑی درخواست کی کہ میں سانبر کا شکار چھوڑ کر پہلے آدم خور کا شکار کروں۔

"صاحب میں بڑا غریب آدمی ہوں اور انہیں چند جانوروں اور ذرا سی زمین پر میرا گذارا ہے۔ اگر آدم خور میرے تمام جانور مار گیا تو صاحب میں تو زندا مر جاؤں گا۔" شدت غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اتنے میں سامنے سے ایک عورت سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے آتی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا۔ ان کے سروں پر خشک گھانس کے گٹھے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ واقعی پہلے آدم خور کو مارنا ضروری ہے۔

کل ابھی تک مردا گائے پر منڈلا رہے تھے اور بھو

نے اچھا خاصا حصہ کھا لیا تھا، کیونکہ آس پاس نہ تو لمبی گھاس تھی اور نہ ہی کوئی لمبی جھاڑی جہاں کہ شیر کو محفوظ کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ پچھلی رات اس کے شکار پر کسی بھی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ آدم خور ضرور واپس آئے گا۔ اس یقین کے پیش نظر مجھے ضرورت ہوئی کہ میں آس پاس کے علاقے کا جائزہ لوں اور یہ پتا لگاؤں کہ شیر کس سمت کو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں آدمیوں کو وہیں ٹھہرنے کو کہا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا اس جگہ زمین سخت اور پتھریلی قسم کی تھی۔ اور اس پر کسی قسم کے نشانات نہ تھے، مگر دوسری طرف بارش کے پانی کے چوہڑ کے قریب زمین کافی نرم تھی۔ یہاں پر شیر کے پنجوں کے نشانات صاف عیاں تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ شکار کھانے کے بعد شیر یقیناً اس طرف گیا ہے۔ اور یقیناً اسی طرف سے واپس بھی آئے گا۔ چوہڑ سے تقریباً تین گز کے فاصلے پر بوٹا کا ایک درخت تھا۔ جس پر جنگلی کگاب کی گھنی بیل لپٹی ہوئی تھی۔ چھپ کر بیٹھنے کے لیے مجھے یہ درخت موزوں ترین نظر آیا۔ بیٹھنے کی جگہ تلاش کر کے میں تھوڑی دیر میں دونوں آدمیوں کے پاس آیا۔ اور ان سے کہا کہ ریسٹ ہاؤس سے اپنی دونالی یا نچسو بور کی رائفل لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔

"صاحب آپ کیوں زحمت کرتے ہیں میں لے آتا ہوں۔" میرا ساتھی بولا۔ چنانچہ میں نے اس کو ہدایت دے کر رائفل لانے روانہ کر دیا۔ اور خود کسان سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بڑا تعجب تھا کہ یہ شخص یہاں اس تنہا اور خطرناک جگہ کیوں رہتا ہے۔

"تم آخر کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلے جاتے اس خطرناک جگہ رہنے سے فائدہ؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب میرا باپ بھی یہیں رہتا تھا۔ یہی میرا وطن ہے۔" اس نے کمال سادگی سے جواب دیا۔ زمین کی محبت بھی عجیب چیز ہوتی ہے جو ہزار خطروں پر غالب آجاتی ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا۔

سورج مغرب کی جانب جھک چلا تھا، اور اس کا چہرا زرد ہو گیا تھا کہ میں نے دیکھا کہ سامنے پہاڑی پر سے دو آدمی ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ جب قریب آئے تو میں ان کو پہچان گیا۔ ان میں ایک میرا وفادار پرانا ملازم بالاسنگھ تھا، مگر اور دوسرا وہی آدمی جس کو میں نے رائفل لینے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ دونوں خالی ہاتھ تھے۔ صرف بالاسنگھ کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ بالاسنگھ نے آکر بتایا کہ چونکہ کار نو سوٹ کیس میں بند تھے اور چابی آپ کے پاس تھی۔ اس لیے میں رائفل نہیں لا سکا۔ واقعی سوٹ کیس کی چابی تو میں دینا بھول ہی گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آج اس نئی ہلکی رائفل سے شکار کرتے ہیں۔ سانبر کے بجائے آدم خور پر آزمائے ہیں۔ اگرچہ اتنی ہلکی رائفل سے ایک آدم خور کا شکار کسی خطرناک حادثے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ شیر صرف زخمی ہو اور پھر کوئی خطرناک صورت اختیار کرے، مگر وقت اتنا کم تھا کہ اسی ہلکی رائفل سے شکار کرنے کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہ تھا، اور اسی لیے میں یہ خطرا مول لے رہا تھا۔

درخت پر چڑھنے سے پہلے میں نے کسان کو ہدایت کی کہ وہ خود اور اپنے بال بچوں کو بلکل خاموش رکھے نیز اپنی بیوی کو منع کر دے کہ وہ شام کے کھانے کے لیے آج چولا بھی نہ جلائے، کیونکہ میری کامیابی اور ناکامیابی کا بہت کچھ دارومدار انہیں باتوں پر تھا۔ بالاسنگھ کو میں نے پابند کیا کہ وہ ان کی نگرانی رکھے اور جب میں سیٹی بجاؤں تو وہ جھونپڑی میں لالٹین کی روشنی کر دے اور پھر میرے دوسرے حکم کا انتظار کرے۔ یہ تمام ہدایات دے کر میں درخت پر چڑھ گیا۔

سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی ساتھ آسمان پر سرخ شفق ادھر سے ادھر پھیل گئی اور اس کا قرمزی سایا سا تمام وادی پر پھیل گیا۔ جنگلی پرندے اپنے بسیرے کی تلاش میں ادھر سے ادھر منڈلانے لگے۔ آہستہ آہستہ شفق کی سرخی

کی جگہ سیاہی غالب آتی گئی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں گھس گئے اور سیاہی مایل نیلے آسمان پر ستاروں نے اپنی آنکھیں کھولنی شروع کر دیں۔ اندھیرا بڑھنے لگا اور پوری وادی میں ایک انتہاء خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو کبھی کبھی جنگلی الو کی صدا توڑ دیتی، مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہی انتہاء خاموشی طاری ہو جاتی۔ میں اپنی جگہ دم سادھے گھٹنوں پر رائفل رکھے سامنے تاریک ہوتے میدان پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ اور آنے والے حالات کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تاریکی اچھی خاصی چھا چکی تھی۔ چاند نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اچانک میں نے شیر کی نہایت ہلکی سی غراہٹ سنی۔ میرا خیال غلط نکلا۔ شیر میرے درخت کے نیچے سے نہیں گذرا، بلکہ دو سو گز کی سمت سے آکر اپنے شکار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ شاید گدوں کے شکار کھانے پر آہستہ آہستہ غرا رہا تھا۔ تین چار منٹ تک اس کے غرانے کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد جب چاند درختوں کی اوٹ سے نکل کر پہاڑی کے اوپر گہرے نیلے آسمان پر آگیا، اور اس کی سیمیں روشنی پوری وادی میں پھیل گئی تو میں نے تکیے کے ڈھانچے کی طرف دیکھا۔ چاند کی شفاف روشنی میں گدوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں صاف چمک رہی تھیں، مگر شیر کا وہاں نام تک نہ تھا۔ رائفل دو بار گھٹنوں پر رکھتے ہوئے میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستہ سے سیٹی بجائی، معلوم ہوتا تھا کہ بالاسنگھ جیسے میرے اشارے کا منتظر ہی تھا، کیونکہ سیٹی سنتے ہی میں نے اسے کسان کو روشنی کرنے کے لیے کہتے سنا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ لالٹین جلائی گئی۔ چھ پہاڑی کا دروازہ کھلا اور بالاسنگھ لالٹین لے کر اس کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اور میرے دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ جب سے میں درخت پر چڑھا تھا سوا اس کی سیٹی کے نہ تو میں نے کوئی آواز ہی سنی تھی اور نہ ہی ذرا سی حرکت کی تھی۔ ایک پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے میں اکڑ سا گیا تھا۔ چنانچہ کسلمندی دور کرنے کے لیے میں نے زبان ہاں ہلائے۔ اور چاہتا تھا کہ درخت سے نیچے اتروں کہ

اچانک میری نظر نیچے زمین پر پڑی۔ لمحے بھر کے لیے جیسے پوری وادی میری نظروں میں گھوم گئی۔ آدم خور میرے درخت کے عین نیچے کھڑا تھا، اور چھ پہاڑی کی سمت سر خم کیے بالاسنگھ کو دیکھ رہا تھا جو ابھی تک لالٹین ہاتھ میں لیے چھ پہاڑی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ رائفل کی نال اور شیر کے سر کا فاصلہ بمشکل پانچ فٹ ہو گا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ شکار خدا سے موت کے قریب آپہنچا ہے۔ اب صرف میرے بسملی دبانے کی دیر ہے۔ ابھی گولی نال سے نکل کر شیر کے سر میں پیوست ہو جائے گی اور قرب کی وجہ سے اس کے بالوں کو تک جھلس ڈالے گی۔ میں نے کمال آہستگی سے رائفل اٹھائی، شست لی اور بسملی دبا دی۔

مگر ــــ اوہ میرے خدا ــــ یہ کیا؟ بسملی تو دبی مگر گولی نکلنا تو کیا معنی یہاں تو ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ کیا میں چیمبر میں کارتوس ڈالنا بھول گیا۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا نہیں نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ایک نہ دو پورے پانچ کارتوس چیمبر میں ڈالے تھے۔ پھر کیا بندوق پرانی اور ناکارہ ہے؟ مگر رائفل تو بالکل نئی ہے۔ اور دکاندار نے بڑے دعوے کے ساتھ دی تھی ــــ پھر؟؟؟ میرا ذہن چکرا سا گیا۔ کارتوس چیک کرنے کے لیے میں نے لیور کھولا تو اس کی آواز سے شیر ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دوسرے ہی لمحے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے بالاسنگھ کی طرف نگاہ کی وہ بھی آواز سن کر فوراً چھ پہاڑی کے اندر چلا گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ اب خاموش رہنا قطعی بے سود تھا۔ چنانچہ میں نے بالاسنگھ کو آنے کے لیے پکارا، اور درخت سے نیچے اتر آیا۔ نیچے اتر کر میں نے کارتوس نکالنے کے بولٹ کو کھینچا تو دیکھا کہ ایک کارتوس اس کے چیمبر میں موجود ہے۔ میں نے رائفل کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ میں نے سیٹی کو پیچھے نہیں چڑھایا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ دکاندار نے بتایا تھا کہ یہ نئی قسم کی رائفل ہے جس میں ایک سیٹی کے ذریعے آپ جب تک آپ پیچھے کر کے دوسرا بسملی نہیں دبائیں گے کارتوس باہر نہیں آئے گا۔ جب بالاسنگھ کو میں نے تمام حال بتایا تو وہ آپ کو قصوروار ٹھہرانے لگا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے

سکھیا

جیسے تیسے کروٹیں بدل کر سکھیا نے صبح کی تھی۔ ابھی سورج کی کرن بھی نہ پھوٹی تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ـــ لیٹے لیٹے مسکرائی اور پھر اپنے آپ کھلکھلا کر ہنس دی۔ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان اپنا چہرا چھپا لیا، پھر اس نے جلدی سے کروٹ بدلی ـــ بانس کی کمزور کھاٹ نے بھی کروٹ لیتے ہی چرچرا کر جیسے اس کی مسرت میں شرکت کا اعلان کر دیا تھا ـــ وہ پھر مسکرائی ـــ آج ـــ آج آئے گا ـــ ضرور ضرور آئے گا ـــ لکھا تھا شکروار کو گاؤں آؤں گا ـــ اور ـــ آج ـــ آج شکروار ہے۔ یہ سوچتے ہی جیسے اس کی نیند میں نک جل اٹھیں۔ کچھ دیر اور پڑے رہنے کے بعد اس نے انگڑائی لی ـــ اور مسکراتی ہوئی کھاٹ سے اٹھ گئی ـــ وہ آج خوش تھی ـــ بے حد خوش۔ اس کے نتوے آج دھرتی سے کچھ اونچے پڑ رہے تھے ـــ اس کے انگ انگ میں جیسے کچھ تھرک رہا تھا ـــ اس نے اٹھتے ہی کوٹھری کی صفائی شروع کی ـــ ساری کوٹھری میں جھاڑو دے کر اس نے کوڑا سمیٹا۔ اور مڑ مڑ کر اپنی کوٹھری کا جائزہ لیتی ہوئی وہ باہر کوڑا پھینکنے چلی گئی۔ واپسی میں اسے لگا کہیں برجو کوٹھری میں آ نہ گیا ہو، اور یہ سوچتے ہی اس کی گردن ذرا نیچے جھک گئی۔ وہ چپکے سے کوٹھری میں داخل ہوئی۔ چاروں طرف دیکھا ـــ اوں ـــ ہوں ـــ بالکل ٹھیک نہیں ـــ اس نے جلدی سے چھوئی مٹی ہنڈیا اٹھائی اور ساری کوٹھری کی زمین ذرا دیر میں چمک اٹھی ـــ ایک اچھوتی مہک کے ساتھ۔

سکھیا جلدی کنوئیں سے ایک ڈول پانی کھینچ لائی۔ اپنے گندے پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ پھر ان کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ مونھ دھویا، ہات دھوئے۔ برتن وہ رات ہی صاف کر چکی تھی ـــ یہ کام بھی کوئی آج صبح کرنے کا تھا۔ اسے تو آج جلدی تھی کہ دھوپ سیدی ہو ـــ اور ـــ اور ـــ وہ مسکرا اٹھی ـــ ہاں تو وہ مونھ ہات دھو کر وہ اپنی کوٹھری میں گئی۔ اپنے چھوٹے سے آئینے کو طاق سے اٹھایا۔ مونھ دیکھا اور جیسے خود سے شرما گئی ـــ مسرت سے اس کا مونھ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آئینہ رکھ دیا ـــ ایسا لگا کہ جیسے برجو چھپا ہوا اس کی یہ خوشی دیکھ رہا ہو۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں آ نہ گیا ہو ـــ اس نے باہر نظر دوڑائی۔ ابھی سورج دو بالشت بھی نہ چڑھا تھا ـــ اور برجو ـــ برجو تو دھوپ سیدی ہونے پر آئے گا۔ اس نے کنگی اٹھائی اور کڑوے تیل سے بالوں کو چمکا کر چٹیا باندھی ـــ اور جب کاجل کی گہری لکیر اس نے آنکھوں میں ڈالیں تو اسے یاد آیا ـــ ایک بار برجو نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ نیری ان چنچریوں نے بھگوان کسم ہے سکھیا ایسا جکڑا ہے کہ گاؤں کی کوئی گوری بھلے ہی اس چھیلے پر مرے پر یہاں تو ـــ اور اس نے جلدی سے اپنی کلائیاں یہ کہتے ہوئے چھڑا لی تھیں ـــ ارے چھوڑ دے وہ ـــ ماں آ گئی ـــ تو وہ بناوٹی غصے سے باہر چلا گیا تھا، اور پھر اس کو کس طرح کواڑ کی آڑ سے خاموش کر کے اسے منایا تھا۔

کاجل کے بعد اس نے سیندور اٹھایا جو اسے بہت پسند تھا۔ چاہے مہر میں کنگی ہو یا نہ ہو پر سکھیا سیندور روز لگاتی ـــ سیندور لگانے کے بعد اس نے چھوٹی سنگچی گلابی رنگ کی پڑیا اٹھائی اور کھیا کی بھوکی طرح ذرا سے پانی میں رنگ گھول کر پہلے اپنے ہونٹ



رنگے اور پھر اپڑی۔ اس نے آئینے میں پھر دیکھا ــــ ہائے رے ــــ اتنے لال ہونٹ برجو نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ سوچنے لگی اس نے یہ بات پہلے ہی کیوں نہ معلوم کر لی تھی کہ ہونٹ ایسے لال کیے جاتے ہیں۔ سنگار کرنے کے بعد اس نے چھوٹی سی گٹھری نکالی۔ جس میں وہ ریشمی ساری بندی تھی جو برجو نے ان دو سالوں میں میکے کے بات اس کو بچی تھی اس نے ساری باندی۔ یہ اس کے برجو کا سب سے پہلا تحفا تھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار کانوں میں کرن پھول پہن کر اس نے اپنی کلائی دیکھی۔ جس میں موٹی موٹی لاک کی چوڑیاں تھیں اور بس ــــ اسے ذرا برا لگا۔ سونے کا ہات، مگر پھر اس نے خود سوچا ہوگا ــــ ہوں ــــ برجو زندا ہے، گنے بہت جائیں گے، اور برجو کا نام ذہن میں آتے ہی اس کے سامنے چکلے سینے والا کڑیل جوان آگیا ــــ آج اسے دو سال کے دکھوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ یاد میں لیا ہوا قرضا سب برجو کے بھیجے ہوئے ۲۵ روپے مہینے سے ادا ہو چکا تھا، مگر کمبخت سود سے نپچا پٹا تو پچھلے مہینے بوڑی ساس کے مرنے پر ہی سب روپے خرچ ہو گئے۔ اور اب ــــ اب تو سکھیا رانی بچاے گی ــــ اتنے بہت سے روپے برجو کماتا ہے۔ خوب گہنے بنواے گی، خوب کپڑے۔ اس نے سوچا، مگر خرچ بھی تو بڑھائیں گے۔ تھوڑے سے روپے بچائیں گے ضرور، ایسے نہیں چندا کی طرح کہ جب منے کا کام کرنے چلیں تو مہاجن کا موکھ تاکیں۔ منے کا تصور آتے ہی اس کے سامنے منا سا برجو کلکاری لیتے لگا۔ بلکل برجو ــــ وہ شرما گئی ــــ ہوں کیسے کیسے سوچ آتے ہیں۔

اس کا ذہن کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے ہات الگ کام کر رہے تھے اور دماغ الگ۔ اسٹے گھڑی باندی آئینا طاق پر رکھا ہی تھا کہ چندا آگئی۔ اس کی پڑوسن چندا ــــ سکھیا کو دیکھتے ہی تیز آواز میں بولی ــــ کیوں ری سکھیا یہ کیا رنگ ہے کیا کوئی گاوں میں ــــ اور سکھیا جھٹ سے بول اٹھی۔ ایسے مت بولا کرو دیدی ــــ دو سالی بیت تو۔ ارے ہاں کیا تو نے اس روز نہیں سنا تھا۔ وہی جب ہرکارا تار، تار کہہ رہا تھا ــــ تار؟ چندا انجانی ہنسی ہنستے ہوئے بولی ارے پگلی تار تو کسی کے مرنے میں آتا ہے۔ ہائے رے دیدی ایسی بدشگونی نہ کہو۔ تار میں تھا میں شکروار کو آوں گا۔ ہرکارے نے بتا دیا تھا، نہیں تو نہ جانے میں خد کیا سمجھتی۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ تب ہی میں کہوں یہ آج نئی نویلی دلہن کیسی بنی ہے۔ میں تو یہ بات جانوں کہ لاک خشی کی بات سہی، مگر ساس کو مرے ابھی سال بھی نہیں ہوا اور تم ایسی بن ٹھن کر برجو کے سامنے جاو گی کیا سوچے گا۔ یہ سنتے ہی سکھیا کو احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے، مگر اس کا دل غلطی ماننے پر تیار نہ ہوا ــــ برجو جب ہیرا کنڈ میدیر کام کرنے گیا تھا اس کی ایڑی کی مہاور بھی نہ چھٹی تھی۔ بیاہ کے صرف پانچ مہینے ہی تو ہوے تھے۔ اسے بہت ہوا دکھا تھا کہ چندا نے اس کے سہاگ سنگار کو اس طرح ٹوک دیا۔ اس کی نظریں آنگن میں پھیلتی ہوئی دھوپ پر گڑی تھیں۔ اور اپنے کام کے ساتھ ساتھ وہ چندا کی باتوں کا جواب ہوں ہاں میں دیتی رہی وہ چاہ رہی تھی کہ چندا چلی جائے تاکہ اس کا دقت سہانے سپنوں میں کٹ جاے۔

چندا نے بھی بھانپ لیا کہ سکھیا اس سے بات کرنا نہیں چاہ رہی ہے، کیونکہ اکثر چندا سکھیا کو یقین دلایا کرتی تھی کہ تیرے برجو نے مزدور شہر میں آنکھ لگائی ہے۔ تب ہی نہیں آتا ہے، مگر آج برجو کے آنے کی خبر سے اس کی پیشین گوئی غلط ہو رہی تھی۔ اور یہ اسے اچھا نہیں لگا تھا ــــ اچھا تو سکھیا میں چلی اب تو پس آنے میں دو ڈھائی گھڑی رہ گئی ہوگی ــــ ہاں دیکھا تو سڑک پر جاے گی برجو کو لیتے۔ ہاں دیدی اور ہے ہی کون میں تو اکیلی ــــ اور چندا نے اس کی بات ان سنی کر دی اور چلتے چلتے کہہ ہی دیا۔ یہ لچھن ہو بیٹیوں کے نہیں ہوتے کہ مرد پردیس سے آوے تو ڈانٹ سے پار ہی نہ سنو کر اس کو لینے پہنچ جائیں۔

چندا کی یہ بات سکھیا کو بہت بری لگی، مگر وہ چندا کو ٹالنے کے لیے چپ رہی اور موٹھ مونہہ میں بڑبڑاتی چلی گئی ـــــ اور سکھیا نے سکون کی سانس لی۔

وقت پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ وہ آئے گا۔ نہ جانے کیسے بولے گا۔ شہری بابو۔ میرا برجو اور مجھے بھول جائے۔

رسوئی میں سارے کام سے فرصت کر اس نے موٹی موٹی روٹی اور ساگ کو چھینکے پر رکھا۔ چولے کو بجھایا، مگر اس طرح کہ ایک کنڈے میں آگ سلگتی رہے۔ اس کا برجو تھکا ہوا آئے گا تو کیا وہ چلم کے لیے آگ بنانے بیٹھ جائے گی۔

دھوپ سیدی ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ سکھیا دروازے بند کر کے سڑک کی طرف چل دی۔ گاؤں سے باہر سڑک کے کنارے پہنچ کر وہ ایک درخت سے لگ کر بیٹھ گئی۔ یہیں بس رکتی تھی۔ اس کے دونوں طرف سامنے دور تک سڑک پھیلی تھی، مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا برجو کس طرف سے آئے گا۔ وہ کبھی ادھر دیکھتی اور پھر دور ماضی میں بھٹکنے لگتی۔ اب تو برجو بڑا آدمی لگتا ہوگا۔ جب بند بننے کی خبر آئی تو گاؤں کے لوگ مزدوری کے لیے جانے لگے۔ اس نے بھی سنا۔ وہ بالکل نئی دلہن تھی ـــــ بیاہ میں قرضا لیا گیا تھا۔ اس کی بوڑھی ساس پر کچھ پہلے کا بھی قرضا تھا ـــــ گاؤں میں سوکھا پڑا تھا۔ دن کیسے گذریں گے۔ قرضا کیسے ادا ہوگا۔ برجو کی بوڑھی ماں اپنے اکلوتے لال کو دور بھیجنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ابھی تو بیاہ کیا تھا اپنے بیٹے کا، مگر قرضا مہاجن بھوک اور ـــــ پھر بند کی نوکری ـــــ روپیا۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے برجو سے کہہ ہی دیا ـــــ تو بھی چلا جا برجو چھٹی لے کر جلدی آنا۔ برجو کا دل ماں کی یہ بات سنتے ہی تڑپ اٹھا ـــــ نہیں وہ نہیں جائے گا۔ سکھیا کی صورت اس کی آنکھوں میں گھوم گئی وہ بول اٹھا۔ ماں میں یہاں مجوری کروں گا ـــــ میں نہیں جاؤں گا۔

اور پھر رات کو پنڈال کے حلے میں سکھیا کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک نیا جیسے آدمی سے سنا تھا جو بند کے لیے مزدور لینے آیا تھا۔ اس نے سب کو بتایا تھا کہ دیش کو اس وقت کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ دیش کی ترقی کے لیے بند۔ بند کے لیے آدمی ـــــ آدمی کے لیے روٹی کپڑا۔ رہنے کے لیے مکان اور مہاندی جو ایک دیوی سمان ہے۔ اس پر بند بنا کر کتنی بنجر بھومیاں پوری ہوں گی۔ بند سے بجلی کا ایک بہت بڑا اسٹیشن بنے گا۔ صرف اس بند کے پورا ہو جانے سے اب سے پانچ لاکھ من اناج زیادا پیدا ہوگا۔ سیمنٹ پورمیں سمنٹ کا کارخانا بنے گا۔ اور دوسرے بہت سے کارخانے چالو ہو جائیں گے، جن میں ہزاروں آدمی کام کریں گے۔ اپنے دیش کی اب ہر چیز اپنی ہے۔ ہر چیز اب یہاں بنے گی اور سب کچھ اپنا ہی ہوگا ـــــ اور یہ سب سننے کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ برجو کو ضرور بھیجے گی۔ صرف روپے اور قرضے کے لیے نہیں دیش کی سیوا کے لیے اپنا سہاگ دیوتا مہاندی پر بھیجے گی۔ پھر اس نے رات ہی رات برجو سے کہا تھا تو نے برا کیا ماں سے منع کر دیا تم جرور جاؤ ـــــ تم دیش کے سپوت ہو دیش کو تمہاری ہم سے زیادا ضرورت ہے۔ برجو کو لگا جیسے اس کی مسرت کہیں کھو گئی ہو اس نے سکھیا کی ٹھوڑی اونچی کی۔ تھوڑی دیر کے لیے سکھیا کے چہرے پر اس کی آنکھیں جیسی جم گئی ہوں۔ اس نے آہستہ سے کہا سکھیا یہ تو کہہ رہی ہے میں چلا جاؤں دور۔ چوپال سے اٹھنے میں جرا دیر ہوئی کہ تو روٹھ گئی۔ آج تو ہی اتنی دور جانے کو کہہ رہی ہے۔ سکھیا نے نیچی نظر کیے ہوئے جواب دیا۔ ہوں۔ اور پھر آخر کار اسے ماننا ہی پڑا۔ صبح وہ باہر جانے کو تیار تھا۔ جب وہ جانے لگا سکھیا نے اپنے ہاتوں اپنا مونہہ چھپا لیا۔

کھڑ کھڑ کی آواز نے سکھیا کے خیالوں کا سلسلا توڑ دیا۔ اور وہ بس کو تاکنے لگی۔ بس نزدیک آ رہی تھی، اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ دل مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں کب وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دو سال بودہ آیا ہے۔ ان دو سالوں میں بار بار چٹھی کی کوشش کے باوجود وہ نہ آ سکا تھا۔

بس آکر سامنے ٹھہر گئی۔ وہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے پیر شرم اور خستی سے پھول گئے۔ آنکھیں کھڑکی پر جمی تھیں۔ مہیش، منگو، کرتار، حمید، راجو سب انہیں سکھیا نے دیکھا بس آگے بڑھ گئی ہے، برجو ــــ برجو کیوں نہیں آیا۔ سکھیا کے ذہن میں ابھرا، اور اس نے منگو کی طرف سوالیا نظروں سے دیکھا۔ منگو آگے بڑھا۔ بھوجی، بھوجی ہکلاتے ہوئے بولا۔ وہ ــ وہ برجو بھیا۔ اور وہ رک گیا۔ سکھیا ہاں ہاں بتاؤ وہ کب آرہے ہیں۔ نہیں بھوجی وہ ــــ نہیں آئے گا۔ دو روز پہلے بند کا ایک حصا گر گیا۔ اور برجو کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

یہ سنتے ہی سکھیا جیسے بہری ہوگئی تھی۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں کرتا ہوا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خاموش رہ گئی۔ چپ کھڑی تھی۔ منگو نے بڑھ کر اسے تھام لیا وہ بے جان پتھر کی مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ منگو نے سہارے سے آگے بڑھایا۔ اور وہ چپ چاپ منگو کے سہارے سے گاؤں تک چلی گئی۔ گاؤں میں تہلکا مچ گیا۔ برجو مر گیا برجو مر گیا۔ سکھیا کے گھر تمام پڑوسنیں جمع ہوگئی تھیں، مگر وہ دیو سے لگی ایک تصویر جیسی کھڑی تھی۔ اس کا مونہہ زرد ہوگیا تھا ہونٹوں پر پپڑی پڑی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے چپکے تھے۔ اس کی آنکھیں خشک اور پتھرائی دکھائی دے رہی تھیں ــــ ایک بوڑھی عورت نے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ سکھیا بیٹھ گئی، مگر اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دروازے سے باہر گڑی تھیں۔ پندا سکھیا کے پاس گئی وہ بھی رو رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ اس نے ایک ہات سے سکھیا کی کلائی پکڑی اور دوسرے ہات میں پتھر اٹھایا ہی تھا کہ سکھیا جیسے چونک پڑی۔ وہ چلا اٹھی۔ یہ کیا کرتی ہو۔ اب اس کے آنسو بہہ نکلے اور وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ اس کے اندر چھپا ہوا غم کا پہاڑ پھٹ پڑا تھا۔ اور آنسوؤں کا دھارا بہہ نکلا جیسے بند کا کونا ٹوٹ جانے سے مہاندی بہہ نکلی تھی۔ وہ چیخی ــ چوڑی ــــ چوڑی نہ توڑو دیدی میرا برجو مرا نہیں۔ میرا سہاگ اجڑا نہیں۔ وہ مر نہیں سکتا میرا سہاگ میرے پاس ہے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چند اکے ہات سے چھڑا لی۔ اس میں نہ جانے کہاں کی شکتی آگئی تھی۔ وہ بک رہی تھی چلا رہی تھی۔ میرا برجو مرا نہیں ہے۔ وہ مر نہیں سکتا۔ وہ تو بھارت واگ کا امر پتھر بن گیا ہے۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ سے اپنے سینے کو تھامے ہوئے تھی۔ جیسے اس کا دل باہر آجانے کو بے قرار ہو۔ عورتوں نے اس کا سینہ دبا مٹانا چاہا، مگر وہ پھر گئی۔ نہیں میں کہتی ہوں میں بیوا نہیں ہوں۔ وہ میرا سہاگ ہے۔ وہی۔ وہ ہے نا پہلے اس کا نام برجو تھا اب اس کا نام ہیرا کنڈ ہے۔ وہ بکے جا رہی تھی۔ میں سہاگن ہوں۔ جب تک ہیرا کنڈ ہے۔ وہ رات تک بکا کی، رات کو سب عورتیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں ــــ

صبح دس بجے روز صبح اندھیارے میں سڑک پر دور ایک سایا دکھائی دیا۔ اسی طرف بڑھتا ہوا ادھر سے کل

تصانیف حضرت جلیل

امام الفن حضرت جلیلؔ کی تصانیف کا مختصر سا اسٹاک موجود ہے۔ جو کہ ذیل کے پتوں پر حاصل فرما سکتے ہیں

۱۔ تاج سخن (دیوان اول) ۲/۸
۲۔ کلام جلیل (منتخب کلام کا مجموعہ) ۱۲/

کتب فروش صاحبان اور دیگر خواہش مند حضرات کو پانچ یا پانچ سے زاید کتب کی خریدی پر ۲۵ فی صدی ڈسکونٹ دیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

۱۔ مجتبیٰ پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن
۲۔ جمیل اینڈ کو مسجد چوک۔ حیدرآباد دکن

تشخیص مرض

وہ تین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ایک حکیم صاحب سے بھی مشورا کیا، مگر کسی کی سمجھ میں وہ مرض نہ آسکا جس میں بیگم صاحبا مبتلا ہیں۔ اور یہ ماننے کو میں تیار نہ تھا کہ وہ اچھی خاصی ہیں اور محض اخلاق پتہ مردا سی ہو رہی ہیں یا نفرنج گھل رہی ہیں۔ نہ ان میں وہ اگلی سی شگفتگی باقی تھی نہ وہ خدا پیشانی کچھ عجب آدم بیزار سی چڑچڑی ہو کر رہ گئی تھیں کہ کچھ نہیں ہے تو بچوں ہی کو ڈانٹ رہی ہیں۔ کہیں سیر سپاٹے کو چلنے کے لیے کہا جائے تو لڑنا شروع کر دیں۔ حد یہ ہے کہ اپنی بعض عزیز از جان سہیلیوں سے تک ملنا جلنا چھوڑ رکھا تھا۔ جن سے وہ اس حد تک ملا کرتی تھیں کہ ان کے لیے بددعا کرنے کے لیے میں نے نماز تک شروع کر دی تھی کہ الٰہ العالمین یا تو اب مجھ کو اٹھا لے یا ان کی ان سہیلیوں کا ناس ہو، جن کی وجہ سے میری اچھی خاصی بیوی میرے لیے عنقا بلکہ رہ گئی ہے، مگر آجکل میں ان ہی سہیلیوں کیلیے درازی عمر کے علاوا یہ دعا بھی کرنے لگا ہوں کہ اے مقلب القلوب تو میری بیوی کا دل ان کی سہیلیوں ہی کی طرف پھیر دے تاکہ انکی طبیعت کچھ تو بہلے، مجھے یقین ہے کہ میری یہی دعائیں قبول ہو گئیں اور آج ان میں سے دو تین سہیلیاں ان سے ملنے آگئیں۔ میں برابر کے کمرے میں کتابوں کی الماری کھول کر اپنی پسندیدہ سہیلیوں سے دل بہلانے لگا۔ اور اس کمرے میں جہاں کچھ دن سے زندگی کے تمام آثار مفقود تھے، ایک عجب گہما گہمی سی پیدا ہو گئی۔ شکوے شکایتوں کے دفتر کھلے۔ لے دوتی اور طلاق چشمی کے طعنے ایک نے دوسرے کو دیے۔ کسی نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی کا تذکرہ شروع کر دیا تو کسی نے اپنی بڑی سن کے طلاق کی پوری تفصیل سنا کر رکھدی۔ اللہ جانے یہ کس کا ذکر تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کو بٹھا رکھا ہے۔ اور سسرال بھیجنے کے بجائے داماد کو لکھدیا ہے کہ فارغ خطی لکھدو اور نہ جانے اس شادی اور طلاق کے ذکر پر ایک عجیب غریب نام اسنو کی بات کہاں سے چھڑ گئی، میں تو اسوقت چونکا ہوں جب بیگم صاحبا کی بھولی بسری کھنکتی ہوئی آواز کانوں میں آئی کہ "اے ہے۔ وہ کہاں ملی رہی ہے۔ میں نے تو سارے شہر کے سارے بازار چھان مارے کہیں اس نگوڑی اسنو کا پتا نہ چلا"۔ سسز جمیل کی آواز نے پہچان لی۔ وہ بڑی مستعدی سے بولیں "لو اور سنو بازار میں کہاں دھری ہے۔ ایک بچاے دکاندار نے خدا اسکا بھلا کرے۔ اس نے کچھ چیزیں چھپا کر رکھ لی تھیں، ان ہی میں یہ اسنو بھی تھی مگر ہن مہنگی بہت کر دی ہے"۔ بیگم صاحبا نے کہا "بلا سے مہنگی کر دی ہے، مگر ہے تو سہی۔ تو یہ اچھا ہوا ذرا ہے کہ دو شیشیاں مجھے منگا کر بھیج دو گی۔ اللہ جانتا ہے ترس کر رہ گئی ہیں تو ان چیزوں کو، یہ دیکھ لو ڈبا رکھا ہوا ہے پاؤڈر کا۔ سارا شہر چھان مارا کہیں نہیں ملتا"۔ ایک اور بیگم صاحبا بولیں "پھر آخر کہاں سے ملا؟"۔ بیگم صاحبا بقریب آہ بھرتے ہوئے کہا "ملتا کہاں سے خاصی ڈبا پڑا ہوا ہے، میں تو اسکے لیے بھی تیار ہوں کہ بلا سے کوئی دو گنے دام لیلے، مگر مے تو دے یہ پاؤڈر"۔ سسز جمیل کی آواز کھنکی "ایسی آگ لگی ہے ان تمام ولایتی چیزوں کو کہ میں کیا کہوں۔ اے دیکھو یہ لپ اسٹک میں بہتا استعمال کرتی ہوں، مگر اب کی جو لینے گئی تو دکان دکان ڈھونڈھ بھری کہیں نہ ملی۔ آخر ایک دکاندار نے ہنکے دام بلیک میں جانے کہاں سے لا دی۔ میں نے تو بہتیں اسی وقت ان ہی دامیں میں چھ خرید لیں کہ اللہ جانے پھر ملیں کہ نہ ملیں"۔ بیگم صاحبا نے بڑی مرجھائی ہوئی آواز میں کہا "اب میں تم سے کیا بتاؤں کہ ایک ایک چیز کیلیے کتنا کتنا پاپڑ بیلنا پڑتا ہے۔ نیل پالش ہے تو وہ غایب، روج ہے تو اس کا پتا نہیں۔ کریم اور اسنو تو ایسی غایب ہوئی ہیں کہ

شوکت تھانوی

دل بیٹھکر رہ گیا ہے' اب یہ تو بہن ہم سے ہو نہیں سکتا کہ زندگی بھر جن چیزوں کے عادی رہے ہیں انکو چھوڑ کر یہ ویسی قلبی شروع کردیں" مسز جمیل نے قہقہا لگایا۔ "واقعی تم نے بالکل ٹھیک کہا اللہ قسم وہ ہیں نا نجما' اے وہی ڈاکٹر کریم کی بیوی۔ اللہ بچائے اس سے بھی نہ جانے کونسا چونا موئے پر تھوپ کر دروازوں کا روغن چھوٹوں پر لگا لیتی ہے" بیگم صاحبا نے کہا۔ "ہاں بہن ہم سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ نتیجا یہ کہ نہیں آنے کے رہے نہ جانے کے' بھلا بتاؤ کون اس طرح موئے جھاڑ سر پھاڑ کہیں چلا جائے' بلکے میں نے تو تمہارے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ایک تو حج سے اب کہیں جانے کو نہ کہا کرو' دوسرے اب میں شروع کرتی ہوں برخاستگی۔" مسز جمیل ہنس پڑیں۔ "برخاستگی؟ سچ مچ برخاستگی ہی اڑوائے گا اب ان چیزوں کا خط۔ سچ مچ زندگی سے بیزار کر رکھدیا ہے ان چیزوں کی نایابی نے۔" بیگم صاحبا بولیں "حج سے زیادہ تو شاید ہی کوئی بیزار ہوا ہو۔ قسم لے لو حج سے جو میں کہیں بھی نکلی ہوں۔ کہیں جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اور تو اور وہ میلاد النبی ٹرین تک نہیں ملتا۔" مسز جمیل نے کہا۔ "نہیں یہ نجا تو کہیں سے لائی نہیں۔" نجا نے کہا۔ "وہی تین تولیں جو خیدی تھیں وہی چل رہی ہیں۔ کہو تو تمہارے لیے بھی ڈھونڈ لاؤں۔" بیگم صاحبا نے کہا۔ "اے بہن خدا کیلیے ڈھونڈ لاؤ' اور یہ پاؤڈر تو جتنے کا بھی ملے میں دس پانچ ڈبے لیکر رکھ لوں گی۔ کہو تو تمہارے بھائی صاحب سے کہوں موٹر نکالیں۔" اور پھر جذبی بلند آواز سے مجھکو پکارا۔ "اے میں نے کہا سن رہے ہیں آپ؟" میں تو ظاہر ہے کہ سن ہی رہا تھا۔ لہذا جواب عرض کیا۔ "اس سے قبل کہ میں کچھ سنوں مسز جمیل اور نجا بہن کو میرا سلام کہہ دیجیے۔" مسز جمیل نے اسی کمرے سے کہا۔ "تو کیا آپ پردا بیٹھ گئے ہیں بھائی صاحب؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں میں سلام کیلیے حاضر ہونا ہو میں نے محل ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا' خیال تھا کہ چلے کی میز پر سلام کرنے کا موقع مل ہی جائے گا۔" اور یہ کہتا ہوا میں تیم صاحبا کے کمرے میں جو آیا تو مجھے دیکھ کر نجب انگیز خستی ہوئی کہ بیگم صاحبا کے چہرے پر بحالی صحت کے پورے آثار موجود تھے' یعنی آنکھوں میں بھی چمک تھی' اور لبوں پر وہ موہ تبسم بھی جسکے میں لبوں کی ساخت میں شامل سمجھا کرتا تھا۔ مسز جمیل اور نجا تو سنبھل کر بیٹھ ہی چکی تھیں' مگر بیگم صاحبا کی حالت بھی مجھکو سنبھلی ہوئی نظر آئی۔ وہ بڑی شگفتگی سے بولیں۔ آپ ذرا موٹر نکال کر ہم لوگوں کو بازار نہیں لے چلتے۔" میں نے کہا۔ "میرے تو پروگرام ہی میں شامل تھا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جانا' مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے کہ مرض کی تشخیص ہو چکی ہے۔" مسز جمیل نے گھبرا کر پوچھا۔ "مرض کی تشخیص ہو گئی کیا؟" عرض کیا۔ "دونوں امراض کی تشخیص ہو گئی۔ ان کا مرض بھی اور بازار کا مرض بھی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان دونوں امراض میں باہمی تعلق کیا ہے' بلکے سچ تو یہ ہے کہ آپ بازار کی مریض ہیں اور بازار آپ کا؟ رہ گیا میں' تو جواب نہیں ہے میری حماقت کا' کہ اتنے دن سے بلا وجہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی ناز برداریاں کرتا پھر رہا ہوں۔" بیگم صاحبا نے بڑے غرے سے کہا۔ "اچھا خیر ہو گا بھی چلیے ناز را بازار۔" عرض کیا۔ "ویسے تو میں حاضر ہوں' مگر ایک بات سن لیجیے حج سے کہ اگر آپ سب کا یہی عالم ہے تو وہ تمام اصلاحی تدابیر قطع بیکار رہیں جو شروع سے جاری ہیں۔ آپ ہی قسم کے لوگ ان دکانداروں کو چور بازاری اور منافع خوری سکھاتے ہیں' اور آپ ہی کی قسم کے گاہکوں کی بدولت یہ لعنتی دلب کر ابھرتی ہیں' لیکن میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ اگر اس ملک کے باقی رکھا ہے تو یہ تمام چور بازاری کو ختم کرنا پڑیں گے اور جبتک آپ یہ چیزیں نہ چھوڑیں یہ دکاندار ان لعنتوں سے تائب نہیں ہو سکتے۔" "شروع شروع تو اس نے محل کو اس سے ان خواتین نے بیزاری ظاہر کی' مگر جب میں نے ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے عظیم نتائج انکے سامنے پیش کیے' اور جب بہ لفظ ان کے سامنے لایا کہ اسطرح وہ اپنا کتنا زر مبادلہ اپنے ملک کے باہر بھیجکر اپنے ٹیکس پیئر کی بدولت اپنے وطن کیلیے بدصورتی خرید رہی ہیں تو یقینی محسوس کیا کہ انکی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ نتیجا یہ کہ سب سے پہلے مسز جمیل بولیں۔ "پھٹکار ایسے بناؤ سنگار پر کہ ہم ملک ہی کو نیلام پر چڑھا دیں۔" بیگم صاحبا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "بہن یہ تو سچ ہے کہ اگر ہم نہ خریدیں گے' اموں یہ آخر نہ بیچیں تو یہ سب چور بازاری آخر کس سے کریں گے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تو پھر

SUPPORT

COTTAGE INDUSTRIES

PRODUCTS.

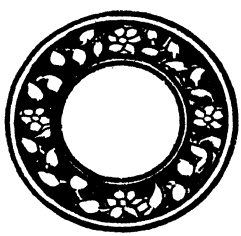
گھریلو مصنوعات کی مدد کیجیے!

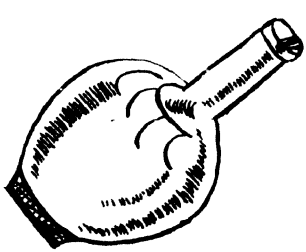
HANDICRAFTS OF ANDHRA PRADESH

آندھرا پردیش کی دستی مصنوعات

دستی مصنوعات

۱۔ بدری برتن
۲۔ نرمل کا سامان
۳۔ ہاتھی دانت اور سینگ کی اشیاء
۴۔ چاندی کے نقشی برتن
۵۔ کونڈاپلی کے کھلونے
۶۔ انتی کوپیا کے کھلونے
۷۔ نرمل کے کھلونے
۸۔ تروپاتھی کے کھلونے
۹۔ مٹی کی چیزیں
۱۰۔ چمڑے کا سامان
۱۱۔ شطرنجیاں اور دریاں
۱۲۔ گھانس کی چیزیں
۱۳۔ بید کا فرنیچر
۱۴۔ وغیرہ ۔ وغیرہ





ہینڈلوم کپڑے

۱۔ آرمور سلک
۲۔ گدوال ساڑیاں
۳۔ سدی پیٹ ساڑیاں
۴۔ پوچم پلی ساڑیاں
۵۔ امنگل ساڑیاں
۶۔ ہمرو
۷۔ گدوال چولی کھان
۸۔ آمنگلیار دوپال
۹۔ سدی پیٹ چولی کھان
۱۰۔ پوچم پلی چولی کھان
۱۱۔ جنگاؤں چولی کھان
۱۲۔ کاکاری کے چھاپے
۱۳۔ آرائش و زیبائش کے کپڑے
۱۴۔ وغیرہ ۔ وغیرہ

ذیل کے امپوریا سے مل سکتے ہیں

THE GOVT. HANDICRAFTS AND COT TAGE INDUSTRIES EMPORIUM — HYDERABAD.



۱۔ گورنمنٹ ہینڈی کرافٹس اینڈ کاٹیج انڈسٹریز امپوریم حیدرآباد
۲۔ گورنمنٹ کاٹیج انڈسٹریز سیلس امپوریم ۔ انتاپور
۳۔ سنٹرل سیلس امپوریم ۔ وجے واڑہ
۴۔ گورنمنٹ کاٹیج انڈسٹریز سیلس امپوریم ۔ وشاکاپٹنم
۵۔ گورنمنٹ کاٹیج انڈسٹریز سیلس امپوریم ۔ تروپاتی
۶۔ گورنمنٹ کاٹیج انڈسٹریز سیلس امپوریم ۔ ورنگل

THE
NIZAM SUGAR FACTORY
LIMITED
ANDHRA PRDESH

دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ آندھرا پردیش

مشرق کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری

NIFA ..... سفید۔ شفاف شکر اور نیفا

BRAND کنفکشنری۔ خالص اور نہایت ہی لذیذ ٹافیاں اور ٹافیاں TOFFEES

AUTOMATIC حفظان صحت کے اصولوں کے تحت، جدید خودکار

مشینوں کے ذریعہ تیار کی جاتی ہیں۔ ایک بار آزمایش شرط ہے۔

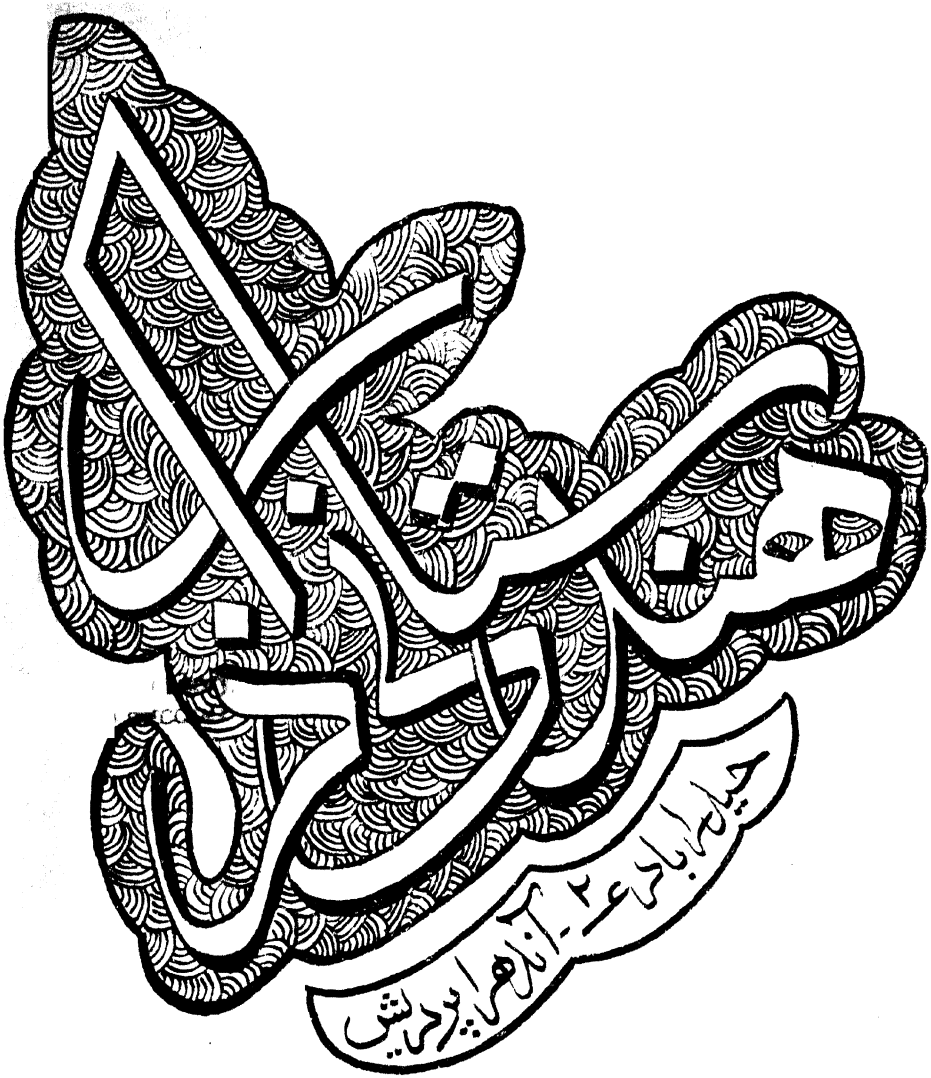
FACTORY
SHAKARNAGAR
(C.RLY.)
فیکٹری۔ شکرنگر سنٹرل ریلوے

CONFECTIONERY

HEAD OFFICE.
"FATEH MAIDAN"
P. O. B. 117,
HYDERABAD
(P-N.)

کنفکشنری
اعظم آباد۔ حیدرآباد دکن
AZAMABAD
HYDERABAD
(D-N.)

CABLES & GRAM,
"SUGAR"
PHONE
NOS.
3177—3185
3186
34059



ایڈیٹر - جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا
محکمۂ تعلیمات آندھرا پردیش کا منظورا

رجسٹرڈ نمبر ۱۰ اپچ (۱۸۴)
جلد ۲۰ نمبر ۱۲
چند اسالانا آٹھ روپے
سنہ ۱۳۶۹ف / ۱۹۶۰ء
آبان / ستمبر

ہندستانی ادب

ایڈیٹر
جی۔ام خان، ام۔اے
(عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریے کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
۲	حقایق و معارف	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۳	
۳	دوست کی موٹر	ضمیر جعفری	۴	اطلاعات پاکستان
۴	فلسفۂ حیات	رامیشور پرشاد روشن پٹیالوی	۵	لوک ہنکاری
		عمر انصاری	۶	خیال
۵	اے جنت کشمیر	شاب للت ام۔اے	۷	تعمیر
۶	آدم و حوا کا مکالمہ	خضر مغربی	۸	روشنی
۷	ادب، ادیب اور قاری	سوتی لال جیلانی	۹	تعمیر
۸	غزل	نعیم صدیقی	۱۲	شہاب
۹	غزل	رگھوبنسی نرمل	۱۲	آندھرا پردیش
۱۰	فرقت۔ہندستان میں	صابر میرولیٹف	۱۳	
۱۱	واجد علی شاہ کا سفر کلکتا	قاضی عبدالودود	۱۵	قومی زبان
۱۲	دھابی دھوڑا کا آدم خور	دشت پیما	۱۸	الشجاع
۱۳	بادۂ کرم	بیخود وارثی (علیگ)	۲۳	
۱۴	موساندی کی طغیانی	مرزا فرحت اللہ بیگ (مرحوم)	۲۴	صبا
۱۵	غزل	مرغوب بانھالی	۳۲	پیام انقلاب

ہمارے خیالات

ٹیچروں کی تنخواہوں میں مزید اضافا ہونا چاہیے!

"ہندستانی ادب" نے اپنی عمر کے بیس سالا دور میں ٹیچروں کے مسایل سے متعلق بار ہا لکھا ہے۔ ہمارا شروع ہی سے یہ خیال ہے کہ ہندستان میں ٹیچروں کو جو معاوضا دیا جاتا ہے، وہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ معاوضے میں کمی کے سبب ٹیچروں کا میعار زندگی گرا ہوا ہے۔ ان کے میعار کا بڑانا نہایت ہی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ خود طلبا کے "میعار گر" ہیں۔ جب خدان کا اپنا کوئی خاص میعار نہ ہو تو وہ طلبا کے ہر جہتی میعار کی طرف کب دھیان دے سکتے ہیں۔

ٹیچروں کی تنخاہوں کے اضافے کا مسلا خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لیے ہندستان کے ہر اسٹیٹ سے، اس بارے میں "ٹیچرز یونین" کی آواز اٹھتی رہی ہے۔ بعض اوقات اس کے مفید نتایج بھی نکلے ہیں۔ حال ہی میں پلاننگ کمیشن کی ایجوکیشن کمیٹی نے اس بات کی سفارش کی ہے کہ نیسرے پانچسالا منصوبے میں، ایک خاص تناسب کے ساتھ ٹیچروں کی تنخاہوں میں اضافا کیا جاے، لیکن یہ سفارش نہایت کمزوسی ہے، اس لیے حکومت ہندستان نے اس اہم معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک ——— HIGH-POWERED COMMITTEE بٹھائی ہے، جس کا کام یہ ہوگا کہ موجودا میعار زندگی کے اعتبار سے ٹیچروں کی شرح تنخاہوں میں اضافے کی سفارشات کرے۔

ہمارا ابھی یہی کہنا ہے کہ زمانے کی ضرورتوں اور موجودا میعار زندگی کا لحاظ کرتے ٹیچروں کی تنخاہوں میں اضافا کیا جاے، اور یہ اضافا پرائمیری گریڈ کے ٹیچروں سے لے کر یونیورسٹی گریڈ کے ٹیچروں کی تنخاہوں میں ضروری ہے۔

جگر مرادابادی

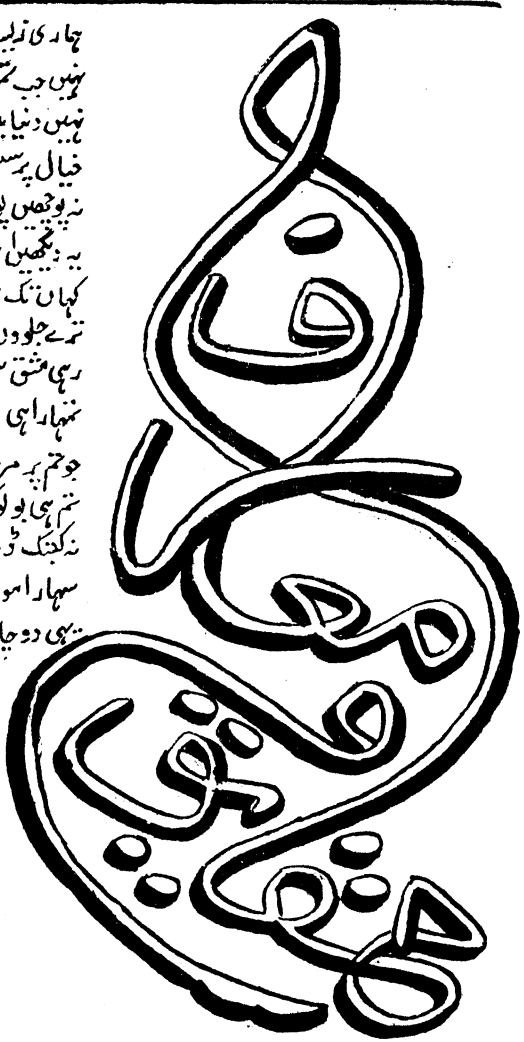
جگر بلاشبا "شہنشاہ غزل" تھے، اور ان کے اٹھ جانے سے دنیاے غزل میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جگر کے مرنے سے غزل گوئی ختم نہیں ہو سکتی، مگر یہ ضرور ہے کہ ان کے کمال غزل گوئی کے بھاری نقصان کی پابجائی کرنیوالا کوئی نہیں ہے! عمر بھر جگر پر بھی وہی گذری، جو ہر بڑے شاعر اور ادیب پر گذرتی ہے۔ جگر بھی غالب کی طرح تنگدستی اور عسرت کا شکار تھے۔ ان کی اپنی جو بھی آمدنی تھی وہ اصغر گونڈوی کے یادگاری مدرسے پر خرچ کر دیتے تھے اور خدصبر و قناعت کے ساتھ گذر کرتے تھے۔

جگر کا ابتدائی دور بڑا ہی رنگین رہا۔ صبح سے شام تک مینا و جام سے کھیلتے تھے۔ یہ رنگ برسوں رہا اور اس کے عادہ سخت بیمار بھی پڑ گئے تھے ——— یوں کہیے کہ مرتے مرتے بچے! اور اب کی بار تجدید توبا کی تو پھر مرے دم تک شراب کو ہات نہیں لگایا۔

جگر بڑے ہی خش قسمت رہے کہ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی شاعرانا صلاحیتوں کا حقیقی صلا پالیا، یعنی ساہتیا اکاڈیمی نے ان کے آخری مجموعے "کلام پر طلائی تمغا

اس عظیم شاعر کی موت پر ہم اظہار افسوس اور رنج و غم کے لیے الفاظ نہیں پا رہے ہیں۔ جگر کا کلام اس سال کی بہترین شاعری کی کتابوں میں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہندستانی ادب

اس نمبر کے ساتھ "ہندستانی ادب" نے اپنی عمر کے بیس سال پورے کر لیے!



لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی

ہماری زیست کا پھر مدعا کیا
نہیں جب تم تو جینے کا مزا کیا
نہیں دنیا میں جرموں کا صلا کیا
خیال پرسش روز جزا کیا
نہ پوچھیں پوچھنے والے ہوا کیا
یہ دیکھیں اس نے دل لیکر کیا کیا
کہاں تک ساتھ دے ذوق تظاہر
ترے جلووں کا میرا سامنا کیا
رہی مشق ستم دل پر یوں ہی مگر
تمہارا ہی مٹے گا گھر مرا کیا
جو تم پر مر مٹا ہوں جان و دل سے
تم ہی بولو کہ پاس اس کے رہا کیا
نہ کب تک ڈوبتا اپنا سفینہ
سہارا موج طوفاں کا بھلا کیا
یہی دو چار تنکے آشیاں کے
ملا صیاد کو اس کے سوا کیا
بتاؤ واقعات طور کچھ تو
کلیم اللہ گذرا ماجرا کیا
نہ ہیں ظالم کہوں گا تم کو لیکن
تمہیں دنیا کہتی ہے برملا کیا
دہائی ہے شب ہجراں دہائی
قیامت کی سحر کا آسرا کیا
قفس جانے سے پہلے نغمہ ہیں پر
نشیمن باغباں میرا ہوا کیا
بھلا میں اور ترک مے پرستی
جناب شیخ کو آخر ہوا کیا
مجھے تو مل گئی منزل عدم کی
تمہیں مجھکو مٹا کر مل گیا کیا
انہیں دل دیدیا یاد آیدہ افقر
حجاب و غمزہ و ناز و ادا کیا

دوست کی موٹر

ضمیر جعفری

عبث اک بار سا بیکار بہنوں نے اٹھایا ہے
نہ ماڈل ہے نہ باڈی ہے نہ پایا ہے نہ سایا ہے
گریباں چاک، انجن یوں پڑا ہے ایک چھپر میں
کبھی سیٹھی ہوئی دیکھی نہیں طبع علیل اس کی
توانائی قلیل اس کی تو بینائی بخیل اس کی
کوئی شئے ہے کہ بین جسم و جاں معلوم ہوتی ہے
یہ طرز عاشقانہ دوڑ کر بے ہوش ہو جانا
بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر خاموش ہو جانا
روانی اس کی اک طوفان، وجد حال ہے گویا
یہ چلتی ہے تو دو طرفہ مجالت ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا، ماں کی محبت ساتھ چلتی ہے
بہت کم اس خرابے کو خراب انجن چلاتا ہے
کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
پکڑ کر کھینچی جاتی ہے جکڑ کر لائی جاتی ہے
اذیت کو بھی اک نعمت سمجھنا شادماں ہونا
ہزاروں حادثے دیکھے زمانی بھی مکانی بھی
شکستہ آرمیچر بھی، سلنڈر بھی، کمانی بھی
غم دوراں کے ہاتھوں اب یہ نوبت آ گئی اکثر
اگر انسان اس میں بیٹھ جائے اور یہ چل جائے
اچھل جائے تو یہ خطرہ کہ موٹر سے نکل جائے
سند شوق ہی ہے اور سزائے تازیانہ بھی
کبھی جو زور سے بادِ مخالف سنسناتی ہے
نہ یہ سمجھو کہ بس گھر میں کھڑی تنخواہ کھاتی ہے
مگر چلنے ہی پائی تھی کہ ٹائر کا سلام آیا
اسے انسان کی بدبختی نے جانے کب بنایا ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے
کہ جیسے کوئی زخمی سر سے گھٹنوں تک تڑپتا ہے
نہیں اپنے محل پر کوئی گڈھری کوئی کیل اس کی
کہ اس کو مدتوں سے کھا چکی عمر طویل اس کی
کسی مرحوم موٹر کا دھواں معلوم ہوتی ہے
یہ رنگ دلبرانہ جھانک کر روپوش ہو جانا
جواں لوگوں کی طبیعت دفعتاً پرجوش ہو جانا
کہ جو پرزہ ہے گھٹکی مارتا قوال ہے گویا
بھرے بازار کی پوری ملامت ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہر مشقت ساتھ چلتی ہے
عموماً زور دست دوستاں ہی کام آتا ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھینچوائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر یا ئی جاتی ہے
تعالی اللہ یوں انسان کا مغلوب گماں ہونا
بہت سے روگ پالے ہیں زراہ قدردانی بھی
پرانی اور اس حد پر کہ بالکل آنجہانی بھی
کہ مرغی سے بھی ٹکرائی تو خود چکرا گئی اکثر
جو سردی ہو تو جم جائے جو گرمی ہو تو جل جائے
دیکھ رہتے ہیں یہ دھڑکا کبھی سانپے ہیں ڈھل جائے
فقیقت بھی، فسانہ بھی، قفس بھی آشیانہ بھی
تو پیچھے خواہ ٹیلہ بھی ہو یہ پیچھے ہی آتی ہے
نشیبوں تک اٹھا کر لے چلو تو چل بھی جاتی ہے
"تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا"

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN.)

فلسفۂ حیات

رامیشور پرشاد روشن پٹیالوی

کیا کبھی سوچا بھی ہے ہم نے کہ کیا ہے زندگی
زندگی کا شہرت دنیا پہ ہے کیا انحصار؟
زندگی دنیا میں ہے کیا عیش و عشرت ہی کا نام
کیا ہمیشہ ہو ہمارے سامنے جام شراب
علمیت پر ہی نہیں ہے ختم ساری زندگی
اپنی اپنی دھن میں سارے کھو رہے ہیں وقت کو
کاش ہو دل میں ہمارے مہر حق کی روشنی
قیمتی لمحوں کو اپنے کام میں لائیں مدام
زندگی کو سچے معنوں میں بنائیں زندگی
سامنے رکھیں ہمیشہ اپنے نصب العین کو
یہ نہیں واجب کہ ہم ہو کلفتوں سے بیقرار
منزل مقصد کی جانب ہم بڑھیں مردانہ وار
دہر میں ہرگز مصائب سے نہ گھبرائیں کبھی
ہم رہیں اپنے ارادوں پر ہمیشہ مستقل
آفتوں کا سامنا کرنے کو سمجھیں کھیل ہم
جذبۂ مستی ہمیشہ زندہ رہنا چاہیئے
بھول کر بھی دل میں نہ آئے ہمارے غم کبھی
کام میں ناکام ہونے پر بھی مایوسی نہ ہو

کس طرح یہ کشت رہ سکتی ہے دنیا میں ہری
بیوی بچوں پر ہے کیا اس زندگی کا مدار
رکھیں کیا ہم زندگی میں وقت کے کھونے سے کام
یا ہو اپنے روبرو ساقی کے چہرے کی کتاب
اچھے کپڑوں پر نہیں قایم ہماری زندگی
کس طرح اپنے فرایض کا ہمیں احساس ہو
کاش خدمت کو بنائیں رہنمائے زندگی
خدمت خلق خدا کرتے رہیں ہم صبح و شام
تاکہ حاصل ہو ہمیں دنیا میں روحانی خوشی
تاکہ دنیا میں کسی بھی بات سے دھوکا نہ ہو
خود فراموشی میں اپنے وقت کو دیں ہم گذار
بھرنا کامی کو کریں ہمتوں سے اپنی پار
اور شکستوں سے کبھی ہم ہرگز نہ شرمائیں کبھی
دنیوی آفات سے ہرگز نہ لغزش کھائے دل
حوصلہ ہمت بڑھے دل میں ہمارے دم بدم
اور نشان نخم تفکر کا نہ ہونا چاہیئے
دولت لطف مسرت سے رہے جھولی بھری
ویسی ہی کوشش سے ہم کرتے رہیں ہر کام کو

زندگی ہے کشمکش سے اوج پر چڑھنے کا نام
آفتوں کے درمیاں بھی راہ پر بڑھنے کا نام

کشمیر

عمر انصاری

دامن کہسار میں یہ پھولتا پھلتا چمن
گل بدست و گل بدوش و گل بدن گل پیرہن

پالکی میں سر بزانوں جیسے چوتھی کی دلہن
سیم رخ، سیما جبیں، سیمیں نگاہ و سیم تن

حسن فطرت کے لب معصوم کا ہلا سخن

دور تک استادہ دو رویہ شجر ہائے چنار
جس طرح اندر سبھا میں سبز پریوں کی قطار

سر بلندی، سرفرازی، سرخوشی کے شاہکار
خوش نوا و خوش جمال و زرفشاں و زرنگار

حسن ہو جن پر تصدق، عشق ہو جن پر نثار

سبزہ جیسے اطلس و کمخواب و دیبا و حریر
بھینی بھینی سی ہوائیں باغ جنت کی سفیر

راستے جیسے جواں ہاتھوں میں قسمت کی لکیر
لہلہاتے کھیت، جیسے بے گناہوں کے ضمیر

مانی و بہزاد کے البم نہیں جن کی نظیر

سلسلہ در سلسلہ ہر چار جانب کوہسار
باہمہ خلق و محبت باہمہ عز و وقار

پر خروش و گرم جوش و برف پوش و برف بار
امن عالم کے نگہباں، صلح کے آئینہ دار

صف بہ صف آراستہ پیراستہ سے شہسوار

دیدنی ہے باغ شالیمار کا جاہ و جلال
یاد کر کے حسن و الفت کا وہ عہد بے مثال

داستاں گوئے شراب و شاہد و ہجر و وصال
روز ماضی سے گلے ملنے چلا جاتا ہے حال

حافظ و خیام کا اک مشترک حسن خیال

ذرہ ذرہ جلوۂ صد رنگ کا آئینہ دار
غنچہ و گل صدائے ناز و عشوہ در کنار

نغمہ زن ہر موج دریا، زمزمہ زن ہر آبشار
یہ نگار جلوہ ارزاں وہ عروس نوبہار

موسموں کے ٹھاٹ جیسے بھیرویں، دیپک، ملار

سطح دریا پر شکاروں کے حریفانہ خرام
منتشر سا فرش آبی پر ستاروں کا نظام

سانس لینے کے تقاضے، زندگانی کے پیام
جیسے صحن میکدہ میں رکھ دیے ہوں بھر کے جام

مرکز چشم تماشا دعوت ہر خاص و عام

ذرہ ذرہ ماہ ساماں، ماہ پیکر مہ جبیں
تا حد ہوش و حواس و تا حد علم و یقیں

چپہ چپہ نازش کون و مکاں ناز آفریں
مسکراتی، کھیلتی، ہنستی ہوئی خلد بریں

زندہ باد اے جنت کشمیر تیری سرزمیں

کشمیر

شباب للت ایم اے

اے گلشن شاداب وطن ۔ حسن کی تصویر
اے جنت کشمیر
اے سرخیٔ رخسار وطن ۔ مخزن تنویر
اے جنت کشمیر

دامن کشش دل ہیں ترے کیف نظارے
دے ہیں تری خاک کے پر نور ستارے
اے جنت کشمیر

ہے سارے زمانے کی نظر میں تری توقیر
شاداب ترے دشت تری وادیاں گلپوش
آغوش ہے کیا کچھ نہیں کچھ کم ترا آغوش
اے جنت کشمیر

پانی ترا امرت ہے تو مٹی تری اکسیر
موجوں کا یہ سنگیت یہ جھرنوں کا حسیں ساز
مسکن ہے پریشوں کا تری جلوہ گہ ناز
اے جنت کشمیر

منظر ترے خیام کے اشعار کی تفسیر
اس باغ کے ہر پھول میں خوشبوئے وفا ہے
اس خاک کے ہر ذرے میں الفت کی ضیا ہے
اے جنت کشمیر

تو عشق کی میراث ہے تو حسن کی جاگیر
جلووں سے ترے آنکھ چرانا نہیں آساں
واپس ترے آغوش سے آنا نہیں آساں
اے جنت کشمیر

منظر ترے بنجاتے ہیں دل کیلئے نجر
نہر سے کوثر ہے اک تیرے آکاش سے ٹوٹے
تجھ کو ڈوبے سپر و ترے گلزار کے بوٹے
اے جنت کشمیر

تیرے ہی عناصر سے تھی اقبال کی تخمیر
ہے آج ترے گھر کی بہو بیٹی اجنبی
پہنے ترے بیٹوں کے ہیں شرمندۂ تعبیر
اے جنت کشمیر

پژمردہ چوگل تھے وہ ہوئے ہیں ترو تازہ
جتنا نے اٹھایا ہے غریبی کا جنازہ
اے جنت کشمیر

لہرایا ہے بیٹوں نے ترے پرچم تسخیر
صد شکر کہ باقی نہیں اب دورِ غلامی
نیرنگیٔ ایام سے بدلی تری تقدیر
اے جنت کشمیر

اک حصہ ہے مفلوج ابھی تک ترے تن کا
سر پر ہے ترے آج بھی تو ہوئی تنتر
ہے نشنہ تکمیل ابھی کام ہمارا
خطرے میں نظر آتا ہے آرام ہمارا
اے جنت کشمیر

کرنا ہے ابھی قلعۂ اغیار کو تسخیر
دشمن نے لکھی جس میں تباہی کی عبارت
کرنا ہے اسے خانۂ اغیار سے تحریر
تاریخ وہ تیری تھی کبھی تر عظمت
اے جنت کشمیر

ہے اپنا لہو اس کی حسیں مانگ کا سیندور
اے جنت کشمیر

ہے باعث تسکین جگر جس کا حسیں نام
ہیں جس کے تصور سے عدو لرزہ براندام
بختی ہے نگہبان وہ ترا صاحب تدبیر
اے جنت کشمیر

آدم و حوا کا مکالمہ

خضر مغربی

مرد

بظاہر بھولی بھالی ہے تیری ذات
تیری آنکھوں میں ہیں خفتہ بلیات
وزن تیرا ہے یوں تو ڈھائی تولے
ہے دل میں حضرت شیطاں کی سوغات

تیرا یہ حسن مصنوعی خجالت
ترا اس پہ یہ انوکھا حماقت
یہ بال اور گال و ابرو پیچیدہ خال
اسی کو لوگ کہتے ہیں نفاست

کسی پاگل نے مستی میں بکا ہے
"تمہارا دل مرکز مہر و وفا ہے"
تیرے دل کے بدلنے کی گواہی
یہ تیرا روز کا ڈریس دے رہا ہے

تیری یہ شان و شوکت میرے دم سے
تیرا دست سخاوت میرے دم سے
کماتا ہوں کھلاتا ہوں میں تجھ کو
تیرا آرام و راحت میرے دم سے

بتا کس کے لیے یہ سرمہ پوڈر
یہ غازہ اور یہ رنگین جالر
میں عاشق تھا تمہاری سادگی پر
بتا کس کے لیے یہ میرا فیور؟

عورت

زباں اور دل نوایوں تو ہے یکساں
تری ہستی تھی از بوئے ایماں
یہ تیرے ہتھکنڈے اف توبہ توبہ
یہاں ناکام ہیں افواج شیطان

ترا یہ زور و جبر و شور اور شر
سوا نالاں ہیں جن سے بحر و بر
زبردستی و ظلم و پیمہ دستی
ان ہی کا نام ہے مرد دلاور

کسی احمق نے ہے یہ ڈھینگ ماری
"بڑائی مرد نے دنیا ہے ساری"
اگر عورت نہ پاتی ووٹ کا حق
"ڈیموکریسی" میں مرجاتی بچاری

تیرے دل کی تسلی میرے دم سے
تیری ساری بھلائی میرے دم سے
کمانا تیرا، اور میرا پکانا
خدائی تیری ساری میرے دم سے

بتا کس کے لیے یہ ٹائی اور کالر
یہ پتلون جیٹ، یہ رنگین مفلر
میں عاشق تھی تمہاری سادگی پر
بتا کس کے لیے یہ خاص فیور؟

ادب، ادیب اور قاری

موتی لال جیل خانی

ادب کیا ہے؟ یہ سوال نیا نہیں ہے۔ ہر ادبی مباحثے کے شروع میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اختتام پر تشنۂ جواب رہ جاتا ہے۔ اگر ادب کی تشریح ہم یوں کریں کہ ادب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو "عکس ہائے رنگین" میں پیش کرنے کا نام ہے، لیکن اگر اس تشریح کا بغور جایزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت ہی فرسودا بحث چھڑ گئی فن اور مواد کا سوال پیدا ہوا۔ بہت سے احباب جو "ادب میں ازموں" کے قایل ہیں، اپنے اپنے خیال کے مطابق یا تو مواد پر زور دیں گے یا ہیئت پر، لیکن یہ بحث یہیں ختم نہیں ہوتی بعض دوست۔ احباب میں مواد کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیں گے اور بعض اس بات پر زور دیں گے کہ مواد اس وقت تک کسی کام کا نہیں جب تک اسے مناسب اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر پیش نہ کیا جائے۔ بہت سے احباب ادب میں زندگی کی عکاسی کا سراغ لگائیں گے اور کئی زندگی اور ادب کے آپسی رشتے پر ہی بس کریں گے۔

میں ذاتی طور پر ادب میں "ازموں" کا قایل نہیں ہوں۔ میری نظروں میں ادب "ادب" ہے۔ زندگی نہیں ہے۔ البتہ ٹھیک ہے کہ ادب اپنا مواد زندگی سے اخذ کرتا ہے، لیکن یہ مواد ادب میں پہنچکر فقط زندگی ہی نہیں رہ جاتا، بلکہ ادب کے تانے بانے کا جز بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں زندگی میں تغیر ایک ناقابل تنسیخ قانون بن جاتا ہے وہاں ادب لافانی ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ حقیقت پسندی رومانیت، کلاسیکیت ——— یہ سب ادبی اظہار کے مختلف اسلوب ہیں اور ادبی اظہار کے ذریعے ہو سکتے ہیں۔ اگر ادب میں صرف مواد کو ڈھونڈا جائے اور اس کی ہیئت کو نظر انداز کیا جائے تو ہم ادب سے وہ حظ اٹھانے سے رہ جاتے ہیں جو ادب کے اندر موجود ہے، اور جس کو حاصل کرنا ادب میں اولین کام ہوتا ہے۔ ادب سے جو مسرت قارئین کو حاصل ہوتی ہے وہ ادبی تجربے کے متر سے نہیں، بلکہ خود ادبی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ عام بول چال اور ادب کا فرق کیا ہے؟ عام بول چال میں خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن ادب میں حساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ زندگی کے تقابق کے ردعمل میں جو احساسات ایک ادیب کے ذہن میں ابھرتے ہیں ان کی ترتیب اور اظہار کا نام ہی ادب ہے۔ یہ صرف ادب ہی کے لیے نہیں، بلکہ تمام فنون لطیفہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ میں ادب میں افادیت کا قایل نہیں ہوں اور ادب کی افادیت کے لیے میرے نزدیک صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ قاری کو محظوظ اور متاثر کر سکے۔ اگر قارئین ادب سے محظوظ ہوتے ہیں تو ادب کی ساری لوازمات پوری ہو جاتی ہیں، لیکن اگر ادب میں کوئی افادی پہلو بھی نکل آئے اور اس کے ساتھ ہی ادب کی ساری لوازمات اور روایات بھی برقرار رہیں تو اس صورت میں "سونے پہ سہاگہ" والی مثال صادق آئے گی۔

ادب انسانی دل کے چند لگاؤ کے مقاصد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ادب کا کام انسان کی اندرونی خواہشات اور مقاصد کو

تبدیل کرنا نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کرنا ادب کے دائرے اختیار میں ہے۔ ادب زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے اور بہتر انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی بہت ہی عالا اور عمدا حقیقت کا نمونا ہوتا ہے، جس سے قارئین سرور و کیف سے جوم اٹھتے ہیں۔ وہ ادب کے اندر اپنے احساسات اور جذبات کی ترتیب ایک نئے انداز سے پاتے ہیں۔ گویا ادب ان کے سامنے اپنے جذبات اور احساسات کے آئینے کی حیثیت سے آتا ہے۔

بہت سے احباب کا خیال ہے کہ ادب کا واحد مقصد تخلیق حسن ہے۔ ادب کا مدعا فقط حسن پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ البتا یہ ٹھیک ہے کہ حسن ادب کا ایک جز ہے اور یہ ادب کے اندر کئی ایک طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ادب کا مدعا و مقصد فقط تخلیق حسن ہوتا تو انسان ادب سے اس قدر مسرور نہیں ہوتا جتنا کہ ہوتا ہے، کیونکہ ادب اپنا مواد زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ چونکہ زندگی بجائے خود بہت ہی حسین ہے، اور جس قدر حسن زندگی کے اندر موجود ہے اور کہیں نہیں ہے۔ البتا اگر ایسا کہیں کہ حسن اگر ہے تو زندگی میں ہے تو کوئی مبالغا نہیں ہوگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حسن خود زندگی کے اندر موجود ہے انسان کو حسن کی تخلیق کے لیے ادب کی ضرورت کیوں پڑی، اور زندگی میں حسن کی موجودگی میں انسان ادب سے کیوں ایک خاص قسم کا سرور حاصل کرتا ہے۔ ادب میں حسن کی عکاسی ہی قاری کو مسرور نہیں کرتی، بلکہ اسے ادب سے وہ تمام چیزیں حاصل ہوتی ہیں جنہیں وہ حقیقی دنیا سے حاصل نہیں کر پاتا اور جنہیں حاصل کرنا انسان کی ابدی جستجو ہے۔ اسی چیز میں ادبی سرور کا راز پنہاں ہے۔

ایک ادیب جب زندگی میں کلی یا جزوی طور پر متاثر ہوتا ہے تو وہ زندگی کے اسی پہلو کے نقوش اپنے ذہن کے اندر سمو لیتا ہے اور وہاں پر اس پر ایک خاص کیمیائی عمل ساجاری ہوتا ہے۔ اور ان نقوش کو ادیب اپنے تخیل کی رنگینیاں عطا کرتا ہے۔ اور اس طرح سے زندگی سے حاصل کیے ہوئے مواد اور ادیب کی عطا کی ہوئی تخیل کی رنگینیوں کے ملاپ سے ایک نیا کیمیائی مرکب وجود میں آتا ہے۔ اس کی اپنی ایک ہیئت ترتیب پاتی ہے، اور یہ کیمیائی مرکب اپنا ایک خاص تیکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ ادیب کے ذہن میں ایک ادبی کارنامہ جنم پاتا ہے۔ ادب چونکہ انفرادی چیز نہیں اور اس کے لیے سماجی ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے اس ادبی ہیئت کے، جو کہ ادیب کے ذہن کے اندر تیار ہوئی ہے، کے اظہار کے لیے ادیب بے قرار ہو جاتا ہے۔ اظہار کے لیے ذریعے کا ہونا لازمی ہے۔ ادیب ذریعے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ ادب کا ذریعۂ اظہار زبان ہے۔ اسی لیے زبان کا سہارا لے کر ادیب اپنی ذہنی ہیئت کا اظہار کرنا چاہتا ہے جو اس کے ذہن کے اندر موجود ہے اور جس سے وہ زندگی میں ایک مخصوص حالت میں فیضیاب ہوا تھا۔ جب زبان کے سہارے سے ادیب اپنی اصلی ذہنی ہیئت کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔ ہیئت سے پورے طور زبان کے سانچے میں ڈھالنے کے بعد بھی اصلی ذہنی ہیئت ادیب کے ذہن کے اندر موجود اور محفوظ ہوتی ہے۔ قارئین کا کام ہے کہ وہ ادب کی خارجی شکل کا سہارا لے کر اور زبان کو ادیب کے ذہن تک پہنچنے کا سامان سمجھ کر ادیب کی اصلی ذہنی ہیئت کو حاصل کریں۔ اسی صورت میں قاری ادیب کے فیضان سے پورے طور پر محظوظ ہو سکتا ہے۔

چونکہ زبان کے ذریعے سے ہی ایک ادبی ہیئت کی خارجی ترتیب ہوتی ہے۔ اس لیے زبان ادب کے لیے ایک اہم جز مانی گئی ہے۔ ادبی حسن کا سب سے اہم جز حسن اسلوب اور حسن بیان ہے۔ زبان اور طرز تحریر کا انتخاب ادیب کا اولین کام ہوتا ہے اور اس کام کی کامیابی میں اس کے ادبی کارنامے کی کامرانی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اگر اس کا طرز تحریر اور لب و لہجا اس ادبی کارنامے کے مزاج اور جذبات سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو وہ فنی کامرانی کا ہفت خوان طے

کرتا ہے۔ اس صورت میں قارئین طرز تحریر کے ذریعے ادب کی اصلی ذہنی ہیئت تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں اور اسی قسم کا فیضان حاصل کر سکتے ہیں جو ادیب کو عطا ہوا تھا۔ اس لیے اگر کہیں کہ طرز تحریر اور حسن اظہار ادب کی جان ہے تو کوئی بے جا بات نہیں ہوگی۔

ادیب ادب پیش کرتا ہے اور تجزیۂ ادب قارئین کا کام ہے، لیکن قارئین سے میری مراد ہر پڑھنے والے سے نہیں ہے۔ ہر پڑھنے والا قاری کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ ادب چونکہ ایک بہت ہی پیچیدہ عمل سے پیدا ہوتا ہے اور ادب میں ان ہی پیچیدہ اُرستوں سے ہو کر اصلی ادبی ہیئت کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ادب کو سمجھنے کے لیے ربط ذہن بہت ہی اہم بات ہے۔ صرف ربط ذہن سے ہی کام نہیں بن جاتا اس کے لیے قاری کا ——— RECEPTIVE MOOD بھی ایک اہم بات ہے۔ قاری کے اندر اگر یہ سارے اوصاف موجود نہ ہوں تو وہ ادب کی گہری وسعتوں سے فیض یاب نہیں ہو سکتا اور نہ وہ وہ وجدانی حالت حاصل کر سکتا ہے، جس سے ہمکنار ہونا ادب کا اصلی مدعا و مقصد ہے۔ ادب کو سمجھنے کے لیے بہت ہی محنت کی ضرورت ہے۔ صرف ایک بار کسی ادبی تخلیق کا پڑھنا کافی نہیں، بلکہ جب اس کا بار بار مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاً کے طور پر قاری اس سے وہ سرور حاصل کرتا ہے جسے پیش کرنا ادب کا اصلی مدعا ہے۔

میں ذاتی طور سے ادب میں اس بات کا حامی نہیں ہوں کہ ادب کا واحد کام زندگی کی تشریح اور تعبیر ہے۔ ادب کا سب سے بڑا اور واحد مقصد پڑھنے والے کو سرور بخشنا ہے، ہاں اگر اس میں زندگی کی تشریح، تعبیر اور ترتیب کا بھی معاً پیش کیا گیا ہو تو کوئی عذر نہیں۔ بشرطیکہ اس قسم کے مدعا و مطلب ادبی اکائی کے کیمیائی جزو بن گئے ہوں۔ ادب میں زندگی کے کیسے بھی زندگی کے اہم ترین پہلو کے لیے پروپیگنڈا کا سہارا ڈھونڈنا برابر انصافی ہے۔ ادب سے مراد خطابت کبھی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ادب اور خطابت الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ ادیب، ادیب ہے، کوئی خطیب نہیں کہ جب بھی اس کے من میں کسی اہم سیاسی یا سماجی مسئلے سے متعلق کوئی ترنگ اٹھے تو وہ قارئین کے سامنے لکچر بازی شروع کر دے۔ ذاتی طور سے میں ادب میں خطابت کے خلاف نہیں ہوں اور نہ ہی اس بات کا قایل کہ ادب میں خطابت کے لیے کوئی گنجایش نہیں، اصل میں ان سب چیزوں کا انحصار طرز بیان پر ہوتا ہے۔ اگر طرز بیان اس قسم کا اختیار کیا گیا ہو کہ یہ عنصر ایک ادبی کارنامے کی حقیقی اکائی میں گھل مل گئے ہوں تو یہ ادب کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ ہاں اگر اس میں ادیب کامیاب نہ ہو تو محض پروپیگنڈا بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے پروپیگنڈے کو کئی احباب غلط طور حقیقت پسندی کا نام دیتے ہیں۔

ادبی حقیقت پسندی صرف نیچر کی تقلید کا نام ہی نہیں ہے۔ ادبی حقیقت پسندی ایک غیر مانوس چیز کو ایک مانوس پیرائے میں پیش کرنے کا نام ہے۔ جو لوگ ادب میں نیچر کی تقلید کو حقیقت پسندی کا نام دیتے ہیں اور زندگی کی ہو بہو تصویر کو ادب کا نام دیتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک فوٹو گراف اور فن مصوری کے ایک کارنامے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ادب زندگی کا عکس پیش کرنے کا نام نہیں، بلکہ عکس ہائے رنگین پیش کرنے کا نام ہے۔ زندگی میں جتنی حقیقتیں ایک ادیب کو متاثر کرتی ہیں ادیب ان کو پیش کرنے میں اپنے تخیل سے مدد لیتا ہے اور پھر اس امتزاج کو مبالغے سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے جو حقیقت ادیب کے مشاہدے میں آئی تھی، اس میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح سے ایک نئی حقیقت کا خمیر ہوتا ہے، جسے ہم بہ آسانی ادبی حقیقت کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ ادبی حقیقت ایک نظری حقیقت نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اصل میں ایک ILLUSION ہے اور جس پر ہمیں حقیقت

ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ ادب کی دلکشیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ربط ضبط ایک اہم بات ہے قارئین جب تک محنت اور لگاؤ کے ساتھ ادب کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ ادب کے بارے میں اپنا کوئی نظریہ پیش نہیں کر سکتے۔ جب قاری اپنے اندر وہ ربط پیدا کر لیتا ہے جسے پا کر وہ ادب کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے تو اس حالت میں قاری ادیب کو اپنے نظریۂ ادب سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرح سے ادب کو پیدا کرنے اور اسے دلکش سے دلکش بنانے میں ادیب کی رہنمائی کرتا ہے۔

(ب) ادیب اور قاری کا آپس میں جو رشتہ ہے یہ ادبی دنیا کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اور ادبی دنیا میں ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا ناممکن ہی نہیں، بلکہ ان کے بغیر ادبی دنیا کا قائم رہنا محال ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کر کے ہی ادبی دنیا کو متحرک کرتے اور ادبی تحریک کو آگے لے جاتے ہیں۔

نعیم صدیقی

غزل

جب سے گئے ہو تم نہ شب شب نہ روز روز
اب تک وہیں ہے گردشِ دوراں رکی ہوئی

اک شعلہ زار کرب جگر میں گھٹا ہوا
اور غم کی اک گھٹا سرِ مژگاں رکی ہوئی

ہاں جنبشِ نظر سے اشارا تو کیجئے
کب سے کھڑی ہے برقِ درخشاں رکی ہوئی

یوں اک نگاہ گرم کا محفل پہ ہے اثر
جیسے ہو نبضِ عالمِ امکاں رکی ہوئی

ان کی نظر میں صبحِ درخشاں ہے منتظر
ان کے لبوں پہ موجِ بہاراں رکی ہوئی



سکوت اچھا نوائے بے دلاں سے
زمیں بہتر دیارِ کہکشاں سے
خدا جانے وہ کیا لغزش تھی اپنی
بچھڑ کر رہ گئے ہم کارواں سے
بس اتنا یاد ہے محفل میں کل شب
لہو بہتا تھا نغموں کی زباں سے
جلن، آہیں، مسلسل درد، آنسو
یہ سوغاتیں ملیں شہرِ بتاں سے
پئے رنگینیٔ بزمِ نگاراں
میں وہ انداز اب لاؤں کہاں سے
دمکتی ہے جبینِ صبحِ فردا
جنوں کی داستانِ خونچکاں سے
کسے معلوم نرمل سوز پنہاں
نظر آتے ہیں یوں تو شادماں سے

فرقت ۔ ہندوستان میں

صابر میرولیف

گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں انگریکستان کا ایک عظیم شاعر اور عالم ہندوستان آیا اور جب یہاں سے واپس گیا تو اس کے دل پر ہندوستانی فن اور تہذیب کا گہرا نقش قایم ہو چکا تھا۔

"میں ہندستان آیا تو میرے آئینے دل کا
رنگ صاف ہو گیا ۔ فرقت

"تعجب کیا اگر دل والے ہندستان سے
امیدیں باندھتے ہیں" ۔ فرقت

فرقت نے مشرقی ملکوں کی بہت سیر کی تھی ۔ وہ ۱۸ برس یعنی ۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۹ء تک اپنے وطن سے باہر رہے اور ہندستان، مصر اور ترکی کے علاوہ دوسرے ملکوں کا بھی دورہ کیا ۔ فرقت نے ہندستان میں جو اثرات لیے وہ دوسرے مشرقی ملکوں کے مقابلے میں زیادہ گہرے تھے ۔ اور ان کے تصنیفوں میں ان اثرات کا گہرا نقش موجود ہے ۔ یہ چیز ان کے مضامین شاعرانہ خطوں اور مختصر نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے ۔

"تعجب کیا" میں جو فرقت نے تاجک زبان میں لکھی ہے اور بمبئی سے ایک خط میں (یہ ایک منظوم مراسلا ہے جو فرقت نے بمبئی سے اپنے ایک دوست کو لکھا ہے) اور ہندستان کا نقش اس تحریر میں بھی موجود ہے جس کا عنوان ہے "کشمیر میں" ۔

فرقت اپنی ان تحریروں میں اس بات کے معترف ہیں کہ کشمیر سایل اور حسن سے مالا مال ہے، وہ اس کے فن اور اس کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں ۔ خصوصاً چوبی کام اور نقش گری کا جس میں ہندستان نے، بے مثل کمال حاصل کیا ہے ۔ ہندستان پہنچ کر انہوں نے لکھا "میرے آئینے دل سے زنگ صاف ہو گیا" انہیں ہندستان بہت پسند آیا، اور انہوں نے لکھا کہ "یہاں میرے دل میں مجبوری اور مظلومی کا احساس نہیں"

بمبئی سے ایک خط

بمبئی اس وقت مشرق کے ایک آباد اور خوش حال شہر کی حیثیت سے بہت مشہور تھا ۔ اسی زمانے میں اس کو ہندستان کا "پہلا شہر" کہنے لگے تھے ۔ فرقت نے اپنی نظم بمبئی سے ایک خط میں اس "پہلے شہر" کے اثرات بہت روشن خطوط میں پیش کیے ہیں ۔ انہوں نے ہندستانی مناظر، یہاں کے لوگ اور ان کی تہذیب کی تصویر بہت دانا اور محبت بھرے انداز میں کھینچی ہے ۔ شاعر نے لکھا ہے کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقا کے بہت سے شہروں میں گیا، لیکن اس نے "دنیا میں کہیں بھی ایسا شاندار شہر نہیں دیکھا جیسا کہ بمبئی ہے"

فرقت بمبئی کی عظمت، اس کی چنی ہوئی دیواروں اور اس کی شاندار عمارتوں سے بہت متاثر ہیں، لیکن وہ جس چیز کے سب سے زیادہ معترف ہیں وہ ہندستانی دستکاری کی لاجواب فنکاری ہے ۔

شاعر ہی پر ہندستان کے سحر کار معماروں اور فنکاروں نے جادو کر دیا ہے، اس کے دل میں ان کی بے انتہا عزت ہے اور وہ اپنے شعروں میں اس لطف اور مسرت کا بھی ذکر کرتا ہے جو رقص اور موسیقی سے حاصل ہوئی ہیں ۔ وہ اپنی نظم "چشم سیاہ" میں محبوب کی آنکھوں کے لیے ہندستان کے بچوں کی کہ دلکشی کا استعارا تلاش کرتا ہے "میں نے اسے کشمیر میں دیکھا" اس عنوان کی نظم میں شاعر نے ہندستانی عورتوں کے

حسن، ادا اور نزاکت کا ذکر کیا ہے۔ محبوب کی شرم و حیا، اس کی نفاست اور ناز و ادا، اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کے لبوں کی مسکراہٹ، بڑے خوبصورت اور بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ واقعی بڑی دلکش نظم ہے۔

غیروں کے راج میں ہندستان کا غم و اندوہ

فرقت ہندستان کے مناظر اور اس کے فن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنی نظموں میں بڑے مزے سے حسین دوشیزاؤں کی تیلی کمر اور گرم لگاوٹوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیرونی حکومت میں ہندستانیوں کے غم و اندوہ کا بھی احساس ظاہر کیا ہے۔ ان کا شاہد اپنا بہت تیز تھا اور وہ جمہوریت کے پرستار تھے۔ اس لیے وہ یہ نظارہ نہ دیکھ سکے کہ ہندستان کی بے مثال تہذیب پر غیروں کے راج کا تاریک سایا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے بیرونی حاکموں کے خلاف اس قوم کی زبردست جدوجہد کا بھی حال بیان کیا ہے۔ جس نے فن اور تہذیب کے ایسے لاجواب نمونے تخلیق کیے ہیں۔ فرقت نے نہ صرف ہندستانی لڑکیوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا ہے، بلکہ انہوں نے ہندستان کی عورتوں کی بے مثال دلیری کے بھی نغمے گائے ہیں، جو اپنے مردوں کے دوش بدوش بڑی بہادری کے ساتھ اپنے وطن کے لیے لڑتی ہیں۔ فرقت جب ہندستان آئے تو ۱۹۰۵ء کی عظیم بغاوت کی یادیں لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھیں۔

فرقت نے جبر و تشدد کی اس بے درد پالیسی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ جس پر برطانوی حکمران عمل کر رہے تھے۔ وہ غلام قوم کے درد کو محسوس کر کے اس میں شریک ہیں، اور اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

برطانوی حاکموں نے ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کی جو آگ بھڑکائی تھی فرقت اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "کلکتے سے خبر آئی ہے کہ ہندستان کے دوسرے حصوں میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق پایا جاتا ہے۔ یہ نفاق اور دشمنی برطانوی حاکموں نے پیدا کی ہے۔" فرقت کی اس تحریر کا سبب یہ ہے کہ انہیں ہندستان کے لوگوں سے اور ان کی آزادی اور خودمختاری کی جدوجہد سے پرخلوص ہمدردی تھی۔

وسط ایشیا سے تہذیبی رشتے

اس عظیم شاعر نے ہندستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کے اقتصادی اور تہذیبی رشتوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ برطانوی سامراج نے جو دیواریں کھڑی کی تھیں، جن کی بدولت ہندستان اپنے ہم سایا ملکوں سے دور ہو جاتا تھا، ان دیواروں کو فرقت نے اپنے رستے میں حایل نہ ہونے دیا۔ ان رشتوں کو تازا اور استوار کرنے میں اس شاعر کا بڑا ہاتھ ہے۔

ذاکر جان فرقت

ذاکر جان فرقت (۱۸۵۸ء تا ۱۹۰۹ء) ازبکستان کے ایک عظیم شاعر اور جمہوریت پسند تھے۔ ان کی شاعری جس میں محبت کے غم اور عشق کی سرشاری ہیں بہت مقبول ہوئی اور ازبکستان کے ادب اور کلچر کے ارتقا میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

کئی مشتاقوں کی آخری رہائی کے ابتدائی دن تھے جب فرقت ہندستان آئے۔ اس سفر کا انہوں نے بہت گہرا اثر قبول کیا اور ان کی بعد کی تمام تخلیقات اس سے متاثر ہوئی ہیں۔ وہ مئی ۱۸۹۱ء میں تاشقند سے ہندستان کے لیے روانا ہوئے اور اگست ۱۸۹۲ء کے آخر میں بمبئی پہنچے۔ دلی، میرٹ اور لاہور کے علاوہ کشمیر کے شہروں کی سیاحت کے بعد انہوں نے مارچ ۱۸۹۳ء کا شہر میں مستقل سکونت حاصل کر لی جہاں ان کی زندگی کے آخری ۱۶ سال گذرے۔ البیرونی، علی شیر نوائی اور بیدل نے جمہوریت اور انسان دوستی کی جو روایات قایم کی ہیں فرقت بھی انہیں روایات پر عمل پیرا رہے۔ علم و حکمت اور روشن خیالی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے ازبک قوم اور ازبکستان کے ادب کی تاریخ میں مشرقی قوموں کے ساتھ دوستانہ رشتوں کے قیام کے لیے اور ان رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے بہت کچھ کیا۔

واجد علی شاہ کا سفر کلکتا

قاضی عبدالودود

واجد علی شاہ، آخری بادشاہ اودھ متخلص بہ اختر سایہ "دیوان مبارک" میں ۳۲۵، ابیات کی ایک مثنوی (ص ۱۳۲ تا ص ۱۶۱) ہے۔ جس کا کوئی خاص نام نہیں اور جس کا آغاز بیت ذیل سے ہوتا ہے۔

کروں ابتدا نام اللہ سے
ضیا دام لوں عارض ماہ سے

یہ مثنوی زہرا محل یکے از ازواج واجد علی شاہ کے خط کا جواب ہے۔ اس دیوان میں بکثرت غزلیں واجد علی شاہ کی مختلف ازواج کی مدح میں ہیں، ان میں سے ایک کا تعلق زہرا محل سے ہے۔ جس کا مصرع اول یہ ہے۔

"پری رو، پری زاد زہرہ محل"

مثنوی کے آخری دو شعر جن سے تاریخ تصنیف معلوم ہوتی ہے، یہ ہیں ؎

جو ذالحج کی ہے ساتویں اے صنم
کیا اس میں یہ نامہ ہم نے رقم
بہتر گئے بارہ سو پر زیاد
(ص ۱۶۱) ہوا جب رقم نامہ خوش نہاد

زہرا محل اور ان کے خط سے متعلق جو اشعار ہیں ان میں سے چوبیس درج ذیل ہیں۔

جو انجم ہیں سلطاں کی زہرہ محل
ضیا میں نہ ہو ان کی ذرہ خلل
سلامت رہیں باغ اسلام میں
پھلیں پھولیں بارہ وہ ہر کام میں
یہ ہو حسن ذاتی جہاں میں نصیب
کہ شرمندہ ہو عکس رخ سے رقیب
عجب حسن سے خط نازک ملا
کہ حسن شہ ہند تھا گھٹ چکا
عجب اس کے مضمون چیدہ حال
عجب اڑے تھے عجب قیل و قال
عجب شہرۂ حسن اشعار تھا
ہر اک دائرہ چرخ دوار تھا
عجب بندشیں تھیں عجب حسن تھا
کہ فردوسی شعر میں خود ثنا
عجب ہاتھ کا تھا لکھا خط پاک
کہا تھا دل اس پہ روحی فداک
عجب نغز انگیز اشعار تھے
عجب حلقۂ زلف سہ دار تھے
الف نے کہا ایک اللہ ہے
وہی بادشہ ہے شہنشاہ ہے
یہ ایما ہے ی کا کہ ری پائیں گے
ولایت سے پھر با ظفر آئیں گے
یہ ہے طے کی شکل اے باخدا
کہ مقبول کشتی ہو جیسے کھلا
کہا طے نے میں پری خانہ ہوں
پئے چشم بد ایک سیہ دانہ ہوں
مرکب حروفات جیسے سپہر
جو مفرد ہیں جس طرح ماہ و مہر
تقارب میں اس بحر کے شک نہیں
وہ سالم نہ تھی، تھی مزاحف کہیں
اشارے کیے علم کے اس لیے
کہ راقم کو اس کی کوئی داد دے
وگرنہ زمانہ کہاں ہم کہاں
ہوا دین عیسی وہ عالم کہاں
زمانے میں پوچھے گا کون اب ہنر
نہ عربی، نہ اردو کی لے گا خبر
وہ ہم تک یہ سامان سارا گیا
کہ اب کب تک بھی چارا گیا
مگر ہاں جو ہوئیں گے پیدا نئے
جہاں میں جو ہوں گے ہویدا نئے
وہ البتہ جانیں گے اس دور کو
وہ سمجھیں گے خوبی حق اسی طور کو
مری جان نالہ نہ تھا وہ رقم
رکا جس کے دیکھے سے سب میں دم
لکھا تھا جو تم نے یہ زہرہ محل
کہ غم کر کے دیوانہ خود کو خلل
سوائے جان من غم کا پایاں نہیں
جو غم گیں نہ ہو کچھ وہ انسان نہیں

خط کے مطالب سے بحث کے بعد واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

ملی کوٹھی راجۂ پردوان مرے رہنے کو اے پری جہاں
مفصل کلکتا کا حال یوں لکھا ہے۔
ملک نے جو گھر سے نکالا مجھے
بڑ بندن کے بنگلے میں ڈالا مجھے

ہوے کانپڑ میں ہم آکر مقیم
وہ بنگلہ دیا تھا مجھے مستعار
وہ گڑی وہ لوں اور وہ خوکی تپش
جو تھا جانور منہ کو کھولے تھا وہ
ہرن جا بجا ہپھپاے ہوے
نہ نالا نہ جھر کہیں اور نہ جھیل
اگر تند صحرا میں آیا نظر
ہر اک سو ہوا اٹ کھڑا اٹھی ہوئی
نہ کوئی خبر حال کی پوچھتا
کوئی کہہ رہا تھا میاں ہاے ہاے
عجب اس کو لوٹا غضب کر دیا
غرض اک مہینا رہے ہم وہاں
بڑا عارضہ تھا جو مجھ کو مراق
غضب کا غضب سوز تھا
علاج مسیحا سے پائی شفا
چلے شب کو گاڑی پہ ہو کر سوار
پہر رات باقی رہی جب صنم
وہاں ایک بنگلا کرائے کا تھا
رہے ایک دن پھر وہاں پر مقیم
چلے شب وہاں سے بھی آ مر تھا
پڑی مجھ کو منزل وہ چالیس کوس
ہوے ہانپتے بیلے جو تھا مادہ در
یکایک یہ انداز چرخی ہوا
چلیں گھوڑیاں بھی روے ہوا
کہا کوچبان سے ارے تو سنبھال
کوئی منہ پکڑ تا نہیں ہاے ہاے
بفضل خدائے زمانہ ہیں
پہر دن چڑھے ہم بخیال طپاں
طا ایک بھٹیارہ خوش مذاق
کہا اس نے اترو مکاں میں مرے

عجب وقت تھا اور عجب خوف و بیم
نہ تھا کچھ کرائے کو وہ زنہار
وہ سورج کی تیزی نے کی تھی خلش
جو دیوانہ تھا خاک رو لے تھا وہ
ہر اک چوکڑی کو بھلاے ہوے
نہ کوئی کنواں نہ آب سبیل
علی چیل اس پریشان خر
پسی روح ایسی چباتی ہوں
نہ ملک اور نہ کچھ مال کی پوچھتا
عجب بادشہ ہے جواں ہاے ہاے
ستم کیا لوٹا غضب کر دیا
وہ گڑی وہ گڑی غضب لاماں
فراق عزیزاں ہوا مجھ پہ شاق
سر شام نظروں میں ہر روز تھا
تو بعد مہینہ روانہ ہوے
بیادہ کہاں تھے مگر راہوار
تھکے فتح پور میں ہمارے قدم
قفس کی طرح تیلیوں سے منڈھا
علالت سے ہو گئے ہم سقیم
بنا برج گاڑی ہوا خستہ چرخا
پسینہ ہوا یاد سے پائیوس
نہ گاڑی کو مطلق ہوئی کچھ خبر
کہ تہمہ تلک باگ کا چوٹ گرا
غضب ہے غضب کیا ہوا کیا ہوا
وہ بولا یہاں پر مری کیا مجال
بھلا کس طرح زندگی مرتہ جاے
یکایک وہ خود گھوڑیاں رک گئیں
الہ آباد میں آے باغ و شاں
فضا کی کا نظفہ سراسر دفاق
کہ پورے ہوں میرے بھی کچھ حوصلے

کرائے کا جب فیصلہ ہو گیا
رہے آٹھ دن اس مکاں میں مقیم
ہوا آٹھواں دن تو بولا عزیز
ہوے ہم جو حیراں تو بولا وہ سنگ
مگر ہم کو چوبیس سو دیجئے
ذرا سی جو حجت ہوئی آشکار
رسن راہ چلتے میں باندھتے ہاں
تہنک ہو اب زیادہ عیاں
روانہ ہوے شب کو گاڑی پہ ہم
کہاں تک لکھوں جان میں اور رنج
وہ بنگلہ ہمیں راہ میں مل گیا
پہر رات باقی تھی اترے وہاں
رہے ایک دن پھر جو بنگلے میں ہم
طلب کر کے گاڑی روانہ ہوے
غرض با خرابی و رنج عظیم
بنارس کا راجہ عجب نیک تھا
مکاں اس نے پہلے کیا تھا درست
تصاویر شاہان ماضی عجب
ہماری بھی تھی نصب تصویر ایک
جو تصویر اپنی نظر آ گئی
کہا دل سے کیونکر چھپاؤں تجھے
وہ ایسا اطاعت پہ آمادہ تھا
عجب ٹھاٹھ سے نذر دے کر ہٹا
کہا چوبداروں نے ہشیار ہو
کیا دور سے جھک کے اس نے سلام
ادب سے قریبے سے اور دور سے
ہدایا بہت خوب معقول سب
عجب جفۂ صاف الماس کار
وہ مالائے در بے بہا صاف صاف
وہ پشمینے کی کشتیاں تین چار

تو پھر پنجصد پر وہ راضی ہو گیا
کہوں کیا کیا جو کہ اس نے ستم
کرایہ نہ لوں گا بنارس تمہیں
کہ ان پانسو کو تو رکھیے الگ
پھر آگے جو مرضی ہو وہ کیجئے
لے آیا وہ ملعون کہہ سے سوار
غضب لوگ ہیں الاماں الاماں
کہا میں نے چوبیس سو لو میاں
لقب پر لقب اور الم پر الم
کہ داخل ہوے آن کر گویی گنج
جو اختر سے برج تمر شکل تھا
ہوا خضر اختر غم دوستاں
اٹھے بھاگتے تھے وہاں سے قدم
تفنگ الم کا نشانہ ہوے
بنارس میں آ کر ہوے ہم مقیم
ہزاروں میں لاکھوں میں وہ ایک تھا
سبھوں کی طبیعت ہوئی خوب خوش
نظر آتا تھا بولتی ہیں یہ سب
نظر آ گئی سب حسینوں میں ایک
یہ ہنرمندہ صورت بھی گھر آ گئی
یہاں سے کہاں لے کے جاؤں تجھے
یقینی ہمیں پر وہ دلدادہ تھا
کہ دریا کا پھر گیا جمگھٹا
ادب سے تھا بہت سے اس جا چلو
پکارا یہ دربان اے نیک نام
سلامت شہ ہند ذیشان رہے
جواہر کی بھی ایک کشتی عجب
کہ تھے آب پر جس کے موتی نثار
جو کہنا تھا تشخیص رکھو معاف
تو ہر قسم کے پارچے بے شمار

وہ سرکشیاں ایک اور پچاس
سباغ تصدق کو بھیجے ہزار
عجب لطف سے پندرہ دن رہے
عجب طرح کی روشنی آس پاس
جو عرصہ زیادہ وہاں پر ہوا
زمانہ وہ طوفان کا تھا زیادہ
وہ گھمسان تھا وہ دواد و دش
وہ کپتان کافر شرر بار تھا
بزیع گو سفندیں اسی جا مقیم
وہ تھنکار فنگر کی زنجیر کی
وہ بنگالی جا شو بہت بدتمیز
فقط میرے بھائی تو ہمراہ تھے
وہ غل جا شو و کا وہ موجوں کی تو
پھریرے سفینے کے نکبت نشاں
عجب باوٹے تھے عجب ہونٹ تھا
سخن سنج کرتے تھے گستاخیاں
مکاں قید خانہ، زمیں کاٹھ کی
دھوئیں کا وہ آلہ کہ جیسے نہنگ
وہ شعلے نکلتے تھے سوراخ سے
وہ چرخی تھی سکان کی الاماں
وہ پہیوں کا غل شور زنجیر کا
وہ پانی کا اڑنا وہ موجوں کی تھا
پہنچتا تھا اندر وہ سب آب شور
پھر اس پر طرہ نرالا ہوا
کہ سوراخ پیندی میں تھی بند ہوا
کمر تک بھرا آب تہ خانے میں
جو تیرتا تھا اسباب مثل حباب
عیاں اس پہ ہر جانثو رطعام
کہ اب دال اور آگ کا ساتھ ہے
وہ آخور گاواں وہ سرگین بد

جو کیں پیشکش آئیں وہ میرے پاس
کہا ہوں ستارہ شہر یار
کہ کچھ عیش رفتہ بھی یاد آ گئے
اطاعت کے روشن تھے ہر سو گلاس
تو مرکب دخانی پر مقرر ہوا
سوائے خدا کچھ نہ آتا تھا یاد
نصاریٰ کو ہر آن ہم سے خلش
دھوئیں کی طرح جل کے انبار تھا
یہ دنیا میں دیکھا عذاب عظیم
وہ جا شو کی آواز تھی تیز کی
ریگانہ نہ کوئی نہ اپنا عزیز
بہت سے لوگ خشکی کی راہ سے گئے
وہ اشخاص ارزال کا اک ہجوم
نصاریٰ کا تھا سر بسر عیاں
ہر اک صاف مضمون تلک لکھا تھا
ہوا میری نظروں میں تیرہ جہاں
عجب کاٹھ کی ہم کو کوٹھی ملی
دہن باز ہر وقت تھا بیدرنگ
تغیر ہوا دل کو اس کاخ سے
کہ جس طرح ہیچک فلک کی عیاں
ہوا حوصلہ تنگ تحریر کا
وہ بیڈھا اچھلنا وہاں بار بار
سیاہی کرے جس کی بینوں کو کور
ہر اک زخم دل جس سے آلا ہوا
یہ کہتا تھا دل اب چلا اب چلا
نہ کچھ رہ گیا جان کے جانے میں
تو تھے اشک جاری برنگ گلاب
جو ذرے اڑے ہو گیا دل تمام
یہیں پنجۂ مرگ میں ہا تھا ہے
کہ روح جہنم کو ہو ہے حد

وہ بشکل بزوں کی وہ کوڑوں کی مار
وہ ابران بنگالیاں مثل سگ
وہ شیطان کپتان فرنگی نژاد
وہ انگریز دن رات فریاد میں
کبھی بیٹ اور گاہ لف کا خیال
وبا نے کیا آ کے سب پر کرم
ہوے ایک دن سترہ ٹوٹ ٹوٹ
غرض بعد انیس دن کے ضمم
یہ کلکتہ ہم کو دکھائی دیا
ہوے آ کے داخل بفضل خدا
عجب سیر دیکھی یہاں آن کر
کروں گا اسے نظم بار دگر

واجد علی شاہ نے دیوان مبارک کی ایک دوسری مثنوی میں کلکتا کے متعلق لکھا ہے۔

آ کے جو داخل ہوے کلکتے
آدمی ہیں یہاں کے بے ایماں
ہیں دغا باز فیلسوف یہاں
عورتیں بے حیا زنانے مرد
اور بری اسطرح کی آب و ہوا
گوشت، گھی، تیل، پانی سب بدتر
داد بیداد کر رہے ہیں داد
پیشی و داد و خارش و اسہال
دیر ہے ہیں ہر اک بدن کو وبال
ہوئی جس پر بنائے کلکتہ
کیا کہوں کام کی نہیں کوئی شے
دام بردوش پھرتے ہیں صیاد
ایسی ایذا اٹھائی ہے کس جا
جان اب لب پہ آئی ہے اس جا

نکلنے میں کرتی نہ تھی دیر
خور و نوش ماہی سے تھے کل لگ
کہ آ آ گئی روز فردا کی یاد
شب و روز عیسیٰ کی تھا یاد میں
عجب تھی زباں اور عجب قیل و قال
ہوے لوگ راہی ملک عدم
کیا پھر نہ کپتان نے بھی رپورٹ
بہ لطف خداوند عالی کرم
ذرا کچھ کمی تھی وہ ہوا حوصلہ
خدا دے اسی طرح سب کو مدعا

"ہندستانی ادب" آپ کا اپنا پرچا ہے۔ اس کے لیے خریدار فراہم کر کے ہمارے کام میں ہاتھ بٹایئے ——— شکریہ!

دوسری قسط

دھابی دھوڑا کا آدم خور

دشت پیما

صبح دس بجے جب میری آنکھ کھلی تو خاصا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کھڑکی سے باہر آسمان کی رنگت سیاہی مائل نیلی تھی اور اس پر کئی ایک ستارے روشن تھے، مگر آج میں جلد سے جلد باہر نکل کر آس پاس کے علاقے میں گھومنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں شیر کے متعلق اندازا کرنا چاہتا تھا کہ کل شام جان بچا کر اس نے کونسی سمت اختیار کی ہے۔ چنانچہ میں نے ضروریات سے فراغت پا کر کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔ پہاڑی علاقے کی صبح کتنی گنجان یا صاف ستھرے شہر، ہموار میدان یا میلوں تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو کسی پہاڑی علاقے میں کچھ روز رہ چکے ہوں، یا پھر جنہیں جیسے بوگ جو سیر و شکار کے شوق میں گھر کے آرام کو بالائے طاق رکھ کر دنوں اور ہفتوں تنہا جنگلوں کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہوں۔ اس وقت آسمان کے مشرقی کونے سے نور کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ اور اس کی سنہری آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ صبح کی اس روشنی میں سارا جنگل جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ بلوط، چیڑ اور دیودار کے لانبے درختوں میں سے جب نسیم سحر گذرتی تو وہ خوشی سے جھومنے لگتے۔ مختلف قسم کے پہاڑی پرندوں کی آواز سے پوری وادی جیسے گونج رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی چڑیاں ادھر سے ادھر پھدک رہی تھیں، اور وادی کے نیچے سرے پر جو چشمہ تھا وہاں ایک سانبر اپنے خوبصورت سینگ اٹھائے کھڑا تھا۔ پاس ہی اس کی مادا چشمے سے پانی پی رہی تھی۔ زمین کے وہ حصے جہاں گھاس زیادہ البھری ہوئی تھی وہاں شبنم کے قطرے سچے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ جگہ جگہ مختلف قسم کے جنگلی گلاب کھلے ہوئے تھے اور پہاڑی زندگی کی سوندھی سی مہک پوری فضا میں رچی ہوئی تھی۔ یہ مناظر اتنے حسین اور دلکش تھے کہ میں ان میں محو آگے بڑھتا رہا۔ نیچے وادی میں جب میں چشمے کے پاس پہنچا تو میری آہٹ سن کر ہی سانبر اور اس کی مادا بھی قلانچیں بھرتے ہوئے چشم زدن میں میری آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔ چشمے کا پانی نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر پیا اور پھر کنارے پر پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور گذشتہ واقعات کی روشنی میں آئندہ کے لیے پروگرام تجویز کرنے لگا۔ واقعی یہ شیر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کل شام اتنی آسانی سے اپنی جان بچا کر نکل گیا، اور اب جبکہ وہ خود بھی محتاط اور چوکنا ہو گیا ہوگا ایسا سنہری موقع ہاتھ آنا آسان نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصے میں وہ کتنا جانی نقصان اور کرے گا۔ اور کتنے مقابلوں کے بعد میری رائفل کی گولی اس کو ابدی نیند سلائے گی۔ اب سورج پہاڑوں کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ اس کی سنہری کرنوں سے جنگلوں کے تمام درخت جگمگا اٹھے تھے۔ میں چشمے سے اٹھا اور پھر شیر کی کھوج میں نسبتاً گھنے جنگل کی طرف روانا ہو گیا، مگر باوجود ڈھائی گھنٹے گھومنے کے مجھے کوئی بھی ایسا نشان ہاتھ نہ لگا جس سے شیر کے فرار ہونے کی سمت کا سراغ لگا سکتا۔ جب میں ریسٹ ہاؤس واپس ہوا تو دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں داخل

ہوا تو میرے نوکر نے بتایا کہ ایک دیہاتی بڑی دیر سے میرا انتظار ہے۔ میں فوراً کھٹک گیا کہ ہو نہ ہو یہ آدم خور کے متعلق ہی کوئی خبر لایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے فوراً بلایا اور میرا شبہ صحیح نکلا۔ دیہاتی آتے ہی بولا۔

"صاحب میری گائے ——— بڑی خوبصورت اور تندرست تھی صاحب ——— لیکن ———"

"کس وقت شیر نے تمہاری گائے شکار کی تھی؟" میں نے اس کا جملا کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب آج ہی صبح جب وہ چر رہی تھی۔ صاحب میں تو بے موت مر گیا۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"کیوں؟ کیا تمہارے پاس اور کوئی گائے نہیں ہے؟"

"ہیں صاحب، مگر ان میں سے کوئی بھی دودھ نہیں دے رہی، آجکل ———؟" اس نے جواب دیا۔

"ہوں" میں نے ہوں کو کافی لمبا کر کے کہا ——— "مگر تم رہتے کہاں ہو ——— میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

جواب جو جگہ اس نے بتلائی، وہ اس جگہ سے جنوب مغرب کی طرف چند میل دور تھی۔ جہاں کل شام ایک ذرا سی غلطی سے شیر بچ نکلا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائے تو میں کھانے کے بعد اس کے ساتھ چلوں گا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ سامان باندھنے کا سامان لے کر اس دیہاتی کے ہمراہ روانہ ہوا۔

اپنے گاؤں کے قریب پہنچ کر دیہاتی نے مجھے وہ قطعۂ زمین دکھلایا، جہاں کہ صبح اس کی گائیں چر رہی تھیں۔ یہ ایک پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ جہاں پر چھوٹی چھوٹی گھانس اگی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ درخت بھی کھڑے ہوئے تھے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر یہ مختصر سا گاؤں آباد تھا اور نیچے وادی کے آخری سرے سے آگے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شیر نیچے وادی کی سمت سے اوپر کی طرف آیا اور اپنا شکار کر کے واپس نیچے لوٹ گیا۔ بقیہ گائیں چیختی ہوئی اوپر گاؤں کی طرف بھاگ آئیں۔ یہاں سے گاؤں تک پہنچنے کا اگرچہ ہمارا مختصر ترین رستہ یہ تھا کہ ہم نیچے وادی میں اتر کر اس جگہ سے ہوتے ہوئے جہاں کہ گائیں چر رہی تھیں اوپر پہنچ جاتے، مگر میں نے اس مختصر رستے کو چھوڑ کر وادی کے دوسرے سرے سے گھوم کر جانا پسند کیا، کیونکہ میں پہلا رستہ اختیار کر کے شیر کو ذرا بھی چوکنا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

پہاڑی کے قریب تک زمین خاصی نرم اور گیلی تھی اور اس پر گایوں کے کھروں کے نشان بڑے واضح تھے جو ان کے بھاگتے سے پڑ گئے تھے۔ جہاں سے گائیں بھاگی تھیں، اس جگہ خون کا ایک سیاہی مایل چکنا پڑا ہوا تھا، اور نرم زمین پر لاش کو گھسیٹنے کے نشانات بھی نمایاں تھے۔ یہ نشانات وادی میں کوئی دو سو گز نیچے کی جانب جھاڑ جھنکاڑ اور درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک گہرے نالے تک چلے گئے تھے جس میں تھوڑا تھوڑا پانی بھی چمک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ شیر اپنے شکار کو اس گہرے نالے میں لے گیا ہے۔ شیر نے گائے کا شکار تقریباً صبح دس بجے کیا تھا۔ اور شکار کرنے کے بعد قدرتی طور پر اس کے سامنے سب سے پہلا سوال اس لاشے کو انسانی آنکھ سے دور کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ پہلے تو اپنے شکار کو اس گہرے نالے تک لایا، اور شکار کو ایک محفوظ جگہ رکھ کر خود اندر جنگل کی طرف چلا گیا، کیونکہ نالے کی چکنی مٹی پر اس کے پنجوں کے نشانات دور تک چلے گئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ماہر سے ماہر اور بڑے سے بڑا شکاری بھی ایسی جگہ جہاں سے انسانی آبادی بھی نزدیک ہو اور گھریلو جانور بھی چرتے ہوں شیر کا تابہ نہیں لگا سکتا کہ وہ اس وقت کس جگہ ہوگا، کیونکہ معمولی سے معمولی

آہٹ بھی شیر کو اپنی جگہ بدلنے کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ شیر کے پنجوں کے نشانات پر نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ ہم سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر نیچے کی طرف پہاڑی میں ایک کافی بڑا گڑھا تھا، جس میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ اصل میں یہیں سے وہ گہرا نالا شروع ہوتا تھا۔ اس گڑھے کے کنارے پر بلوط اور جنگلی نوکدار پتوں کے دس بارہ فٹ گھنے درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں کے درمیان میں قدرے صاف قطعۂ زمین پر شیر نے اپنا شکار چھپایا تھا، لمبی لمبی گھانس اور درختوں نے گائے کے لاشے کو اس طرح چھپا لیا تھا کہ باہر سے وہ بالکل نظر نہ آتا تھا۔ شیر نے ابھی تک اس کو بالکل نہیں چھوا تھا، اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ پھر آئے گا۔

اب میرے سامنے سب سے پہلا سوال بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش تھی، اگرچہ نالے کے دونوں جانب بلوط کے گھنے اور لانبے پیڑ تھے، مگر ان میں سے ایک پر بھی بیٹھ کر میں نہ تو گائے کے لاشے کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ان پر چڑھنا آسان تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، گائے کے لاشے سے کوئی ۳۰ گز نیچے بائیں جانب ایک کو کھلا مگر مضبوط درخت نظر پڑا، جس کی شاخیں زمین سے بالکل زوایۂ قایمہ بنائے ہوئے تھیں۔ زمین سے کوئی چھ فٹ کی بلندی پر دو مضبوط اور موٹی سی شاخیں اس طرح تھیں کہ ایک پر نہایت آرام سے بیٹھ کر دوسری پر ٹانگیں پھیلائی جا سکتی تھیں۔ میرے ساتھیوں نے زمین سے اس قدر نزدیک بیٹھنے پر اعتراض کیا، کیونکہ میرا یہ اقدام خطرے سے خالی نہ تھا، مگر چونکہ اس کے علاوہ اور کوئی موزوں درخت نہ تھا۔ اسلیے میں نے خطرے کی کوئی پروا نہ کی۔ درخت پر بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنے دونوں نوکروں اور اس دیہاتی کو یہ ہدایت دے کر رخصت کر دیا کہ وہ واپس گاؤں چلے جائیں اور اس وقت تک میرا انتظار کریں، جب تک میں ان کو نہ بلاؤں۔ مچھ سے گاؤں تک کا فاصلہ تقریباً آدھا میل کا تھا، مگر وہ یہاں سے نگاہوں کی زد سے باہر نہ تھا۔ اس وقت شام کے چار کا عمل تھا۔ جب میں درخت پر چڑھا تو میرا رخ مغرب کی جانب تھا، اور مجھے یقین تھا کہ آدم خور سورج ڈوبنے سے قبل نہیں آئے گا۔ میری نشست کے سامنے کی جانب نالا تھا جو تقریباً دس فٹ گہرا تھا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ دائیں طرف اوپر کی جانب بلوط کے درخت اور لمبی لمبی گھانس تھی۔ جس کے اندر گائے کا لاشا تھا، مگر وہ نظر نہ آتا تھا۔ اور میرے نیچے کی جانب بھی بلوط کے تناور درخت کھڑے تھے۔ شیر اپنا شکار گڑھے میں چھپا کر نالے میں سے ہو کر جنگل کی طرف گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اسی راہ سے واپس بھی آئے گا ——

چنانچہ میں ہر طرح سے تیار ہو کر آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگا۔

اس جنگل میں سانبر اور لنگوروں کے علاوہ جنگلی تیتروں، مینا وں، طوطوں اور نیل کنٹھوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، اور جب کبھی یہ شیر، چیتے، ریچھ یا اس قبیل کے کسی درندے کو دیکھتے ہیں تو خطرے کے احساس کے تحت زور زور سے بولنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں مطمئن تھا کہ شیر کی آمد کی اطلاع مجھے اپنے ان مددگاروں سے مل جائے گی —— مگر یہ کیا؟ میرے کان شیر کی ہلکی غراہٹ سن رہے تھے۔ وہ کمال آہستگی اور ہشیاری کے ساتھ اپنے شکار کے پاس پہنچ چکا تھا۔ غالباً اس نے نالے کا وہ رستا اختیار نہ کیا تھا جو میری نگاہوں کے سامنے تھا، بلکہ بلوط کے گھنے درختوں میں سے ہوتا ہوا میری پشت سے آکر شکار کے پاس پہنچ گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں اس کی واپسی پر دیکھا جائے گا۔

شیر کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دن کے وقت زیادہ دیر اپنے شکار کے پاس نہیں ٹھہرتا۔ شیر کے شکار

کھانے کی آواز صاف طور پر مجھے سنائی دے رہی تھی۔ اور میں دم سادھے اپنی نشست پر بے جان بت کی مانند بیٹھا آنے والے لمحوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جنگل میں نہ جانے کیوں اس وقت خلاف معمول خامشی طاری تھی۔ یا شاید یہ میرا احساس تھا۔ بہرحال ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ اور پھر پورے پندرہ منٹ گذر گئے۔ شیر ابھی تک اپنا شکار کھانے میں مشغول تھا۔ ناگاہ میری نظر بائیں جانب اٹھ گئی۔ میں ششدر رہ گیا، اوپر پہاڑی کی جانب سے ایک خونخوار کالا ریچھ بائیں طرف سے دائیں جانب جا رہا تھا۔ بلاشبہ ہالیا کی ٹہلی کے خوفناک جنگلوں میں رہنے والے ریچھوں میں سے تھا۔ اپنے جسم اور نیز وقامت کے لحاظ سے وہ تمام ریچھوں سے بھی بڑا تھا۔ اس کی چال میں بڑی لاپروائی اور خداعتمادی نمایاں تھی۔ اچانک چلتے چلتے وہ لمحے بھر کے لیے رکا، گردن موڑی اور نیچے ہماری جانب دیکھنے لگا جیسے کوئی بھیانک صدا اس کے کانوں میں آئی ہو اور پھر وہیں زمین پر دھت بیٹھ گیا۔ کوئی ایک یا دو منٹ کے بعد اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر گھمائی جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دن کے وقت پہاڑی علاقوں میں ہوا کا رخ عموماً وادی سے چوٹی کی طرف ہوتا ہے۔ ریچھ نے ایک مرتبہ پھر گردن گھمائی۔ یقین کچھ ہے۔ اس کا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ ہوا کے ساتھ گوشت اور تازہ خون کی بو اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے متجسس اور تیز نگاہوں سے جائزہ لیا۔ جنگلی درندوں میں شیر یا چیتا اپنے شکار کی طرف جس ہشیاری، چالاکی اور آہستگی سے بڑھتے ہیں اتنا کوئی دوسرا جانور نہیں، مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ریچھ ان آدم خور شیروں اور چیتوں سے کہیں زیادہ ہشیاری اور خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگر یہ شکار تک اس کا فاصلہ دو سو گز سے زیادہ نہ تھا، مگر یہ فاصلہ وہ سانپ کی سی چالاکی اور سائے کی خامشی کی مانند طے کر رہا تھا۔ جوں جوں فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، وہ اور زیادہ محتاط ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں سے ڈھکے ہوئے گڑھے میں شیر ابھی تک شکار کھانے میں مشغول تھا۔ گڑھے کے نزدیک پہنچ کر ریچھ نے ایک لمبا سانس اندر کھینچا اور پیٹ کے بل لمبا ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لمحے بھر بعد اس نے آہستہ سے اپنا سر گڑھے کے کنارے سے ذرا آگے نکال کر اندر جھانکا اور پھر اتنی ہی آہستگی سے واپس کھینچ لیا۔ جنگل میں ایک خطرناک خامشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور انتہائی خطرے کے احساس سے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

اپنی طویل شکاری زندگی میں صرف دو مرتبہ میں نے ہالیا کی ٹہلی کے ریچھوں کو شیر کی غیر موجودگی میں شیر کا شکار کرتے دیکھا تھا۔ اور ایک مرتبہ نیندوے کی لڑائی بھی دیکھی تھی، جس میں ریچھ نے اپنے دشمن کو جلد ہی ابدی نیند سلا دیا تھا، مگر اس مرتبہ حالات مختلف تھے۔ اس مرتبہ ریچھ اور نیندوے کا مقابلہ نہ تھا، بلکہ جنگل کے بادشاہ سے مقابلہ تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ریچھ اس قدر بے وقوفی نہ کرے گا کہ وہ شیر کے کھانے میں ۔ اخلت کی دعوت دے ——— میں نے ریچھ کی سمت نظر کی، وہ بڑی خامشی کے ساتھ کسی آنے والے لمحے کا منتظر تھا۔ اس لمحے شیر نیچے گڑھے میں شکار کی ہڈیاں چبا رہا تھا۔ اچانک ہی ریچھ نے اپنے پیر سمیٹے اور ایک خوفناک آواز کے ساتھ اندر گڑھے میں شیر پر جست لگا دی ——— اس کی خوفناک چیخ کا مطلب شاید یہ تھا کہ اس اچانک حملے سے شیر بدحواس ہو جائے، مگر ریچھ کا یہ مقصد شاید حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ ریچھ کی چیخ اور اس کی جست کے ساتھ ساتھ میں نے شیر کی جوابی دھاڑ سنی جو ریچھ کی آواز سے کہیں بلند اور زبردست تھی۔ شیر کی دھاڑ اور ریچھ

کی خوفناک چیخوں کی آواز سے تمام جنگل گونج اٹھا۔ درختوں پر سے جنگلی پرندے گھبرا کر پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑے اور قریب کی جھاڑیوں سے دو چار ہرن خرخیاتے ہوئے دور بھاگ گئے۔ دائیں جانب نیچے وادی میں سے دو چار سانبر نکلے اور قلانچیں بھر کر گھنے جنگل میں چھپ گئے شیر اور ریچھ ابھی تک گڑھے کے اندر تھے اور آوازوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر حملا کرنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ کوئی دو یا تین منٹ کا عرصا گذرا ہوگا کہ شیر ایک جست لگا کر گڑھے سے باہر نکل آیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ریچھ نے بھی جست لگائی اور باہر آ گیا۔ وہ دونوں کھلے قطعے پر ایک دوسرے پر بڑے خوفناک حملے کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو خوفناک پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ میرے لیے یہ موقع بڑا غنیمت تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک لمحے سے زاید ایک پوزیشن میں نہ رہتا تھا۔ میں بار بار شیر کے سر پیچھے یا پشت کا نشانا لیتا، مگر دوسرے ہی لمحے وہ جست لگا کر دوسری طرف پہنچ جاتا۔ آخر ایک مرتبہ شیر نے اپنے دشمن پر حملا کرنے کے لیے جو ہی جست لگائی میں نے انتہائی تیزی سے رائفل اس کی طرف گھمائی اور اس کی پشت پر فائر کر دیا۔ شیر بڑی زور سے دھاڑا اور میرے دائیں جانب جست لگائی اور نالے کے دوسرے کنارے پر گھنے پیڑ والی جھاڑیوں میں جا گرا۔ پانچسو بور کی رائفل کی گونج کافی ہوتی ہے، مگر اس وقت تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی توپ داغ دی گئی ہو، لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ ریچھ پر کوئی دہشت طاری نہ ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے حالات کا جائزہ لیا اور پھر بڑے دہشتناک طریقے پر چیختی ہوئی حملا آور ہوا۔ میرا ارادہ اگر چہ ریچھ پر فائر کرنے کا بالکل نہ تھا، مگر ان حالات میں اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا، کیونکہ اگر اس کی موت یقینی نہیں تو پھر میری موت یقینی تھی۔ جب ریچھ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اس کے سر کا نشانا لیا اور لبلبی دبا دی۔ ایک اور خوفناک چیخ کے ساتھ وہ اچھلا اور پیچھے کو گر گیا۔ گولی نے اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

ایک منٹ پہلے جو جنگل شیر اور ریچھ کی خوفناک آوازوں اور پانچسو بور کی رائفل کے زبردست تڑاخوں سے گونج رہا تھا، اب وہاں خاموشی چھا گئی تھی سوائے اس کے کہ چند پرندے ابھی تک درختوں سے اوپر اڑ رہے تھے، جن کی آواز سے ٹھہر ٹھہر کر سکوت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لے کر جسم کو ڈھیلا کیا اور طلب مٹانے کے لیے شکاری کوٹ کی جیبوں میں سگریٹ و ماچس ڈھونڈنے لگا۔ کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے مجھے اپنی داہنی جانب کسی چیز کے ہلنے جلنے کا احساس ہوا۔ میں نے گردن گھمائی۔ میں ایک لخت اچھل پڑا اور درخت سے گرتے گرتے بچا ـــــ خدایا، یہ کیا ـــــ؟ نالے کے دوسرے کنارے گھنے پیڑوں والی جھاڑیوں کے پاس شیر کھڑا ہوا تھا اور اس کی نگاہیں اپنے مرد اد شمن پر گڑی ہوئی تھیں۔ جی ہاں وہی شیر جس پر ابھی کچھ دیر پہلے میں نے فائر کیا تھا، اور جسے میں اپنی دانست میں مار چکا تھا۔ آپ شاید یہاں مجھے ایک اناڑی شکاری سمجھیں جس کا نشانا بھی صحیح نہیں۔ نشانے کے بارے میں وقتی طور پر میں یہ الزام سہہ سکتا ہوں، کیونکہ شیر پر فائر کرتے وقت مجھے احساس تھا کہ نشانا چوک سکتا ہے، میرا خیال تھا کہ اس سے میں صرف اس کو زخمی کر پاؤں گا، مگر اس کی زبردست دھاڑ اور پھر اچھل کر ۲۰ فٹ دور نالے کے پار گرنے سے میں سمجھا تھا کہ گولی یقیناً اس کی کمر کو چھیدتی ہوئی اس کے سینہ تک اتر گئی ہے، مگر شاید گولی اس کی کمر کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔

ایک دو لمحوں تک تو میں بہوت بنا بیٹھا رہا۔ اسی سمے شیر نے ایک لمحے کے لیے میری طرف نظریں اٹھائیں اور پھر پیچھے ڈھلان کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے خالی رائفل لوڈ کی اور بغیر شست لیے فائر کر دیا، کیونکہ شیر اس وقت نیچے ایک چٹان پر سے گذر رہا تھا اور قریب تھا کہ مڑ جائے۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی شیر اپنے پچھلے پیروں پر اچھلا، گھوما اور بجلی کی سرعت کے ساتھ جست لگا کر چٹان کے پیچھے غایب ہو گیا۔ اس کے گھومتے گھومتے گولی اس کے موڈھے کے قریب چٹان پر لگی اور پتھر کی کرچیں دور دور تک اڑ گئیں ——— ایک مرتبا پھر شیر جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔

متفقہ رائے.....
بہترین معیاری ادب پیش کرنیوالا
اپنے طرز کا واحد حسین و جمیل ماہنامہ
"خیال" کامٹی
جو مدیر
فیض انصاری
کی ادارت میں
ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندی سے شایع ہوتا ہے۔
ہند و پاک کے ممتاز و مشہور اہل قلم اس کے مستقل قلمی معاون ہیں۔
وھیلر کے بک اسٹالوں سے بھی خرید یئے
(نمونے کیلئے ۵۰ نئے پیسے کے ٹکٹ بھیجئے)
سالانہ چھ روپے ۔ فی کاپی ۵۰ نئے پیسے
ماہنامہ "خیال" ۔ کامٹی (ناگپور)

بادۂ کرم

بخود وارثی (علیگ)

تری چشم مست کا ہے یہ بڑا کمال ساقی
کہ پلا رہی ہے سب کو وہ مئے حلال ساقی

ابھی میں نے توبہ کی ہے۔ ابھی توبہ نے آیا
مہ نو کو ساتھ لے کر مئے کہنہ سال ساقی

تری دید کی تمنا نے گرائی برق ایمن
مری چشم آرزو نے جو کیا سوال ساقی

مری لغزش نظر کی تو نہ فکر کر خدارا
ترا گر پڑے نہ ساغر تو اسے سنبھال ساقی

جو بھر رہی ہے شبنم رگ گل کے ساغروں میں
تری چشم مست کی ہے وہ مئے جمال ساقی

نہ بچے گا دل کا شیشہ تری شوخیٔ نظر سے
یہ بچا ہے ٹوٹنے سے ابھی بال بال ساقی

مرے دل کو دے رہا ہے تو فریب نگ و بو کا
ترے حسن نے بچھایا ہے گلوں کا جال ساقی

وہ پلا شراب مستی کہ ہو غرق جس میں ہستی
ترے ماسوا کسی کا نہ رہے خیال ساقی

نہ اٹھاؤں میکدے سے نہ اٹھو گا یا طاعت
یہ خیال اپنے دل سے تو نکال ڈال ساقی

مری خاک دل کے ذروں کا چمک اٹھے مقدر
تری خوش خرامیوں سے جو ہوئیں پائمال ساقی

تو پلائے جا خدارا مجھے بادۂ محبت
غم زندگی کا جب تک یہ رہے حلال ساقی

تری یاد سے غرض ہے تری آرزو سے مطلب
مجھے فکر عاقبت ہے نہ غم مآل ساقی

ترے بادۂ کرم کا ہے ہر ایک مست و بیخود
تری حمد کیا بیاں ہو تو ہے بے مثال ساقی

موسا ندی کی طغیانی

مرزا فرحت اللہ بیگ (مرحوم)

۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء میں شہر حیدرآباد میں طغیانی آئی تھی۔ یہ طغیانی شہر کیلئے طوفان نوح سے کم نہ تھی۔ شہر کا ایک بڑا حصہ اس کی زد میں آگیا تھا۔ ہزاروں ہی آدمی سیلاب کے نظر ہو گئے اور ہزاروں ہی بے خانماں ہو گئے۔ امیر مفلس بن گئے اور لکھپتی دولت مند بن بیٹھے۔ مظلوموں کی آہ و بکا اور دردمندوں کی چیخوں سے آسمان پھٹا جاتا تھا، اور دردمند لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ شہر کا ایک بڑا حصہ نہایت ہی بھیانک اور دردناک منظر پیش کر رہا تھا۔

اسی واقعے کو مشہور ادیب اور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ (مرحوم) نے پیش کیا ہے۔ ہم یہ مضمون معاصر "صبا" حیدرآباد سے شکریہ کے ساتھ ٹیرا ئیکٹ کر رہے ہیں۔ "صبا" سے بھول ہو گئی اور ہم نے اس بھول سے فائدہ اٹھایا۔ طغیانی ستمبر کے مہینے میں آئی تھی اس لیے یہی مہینہ کا آرٹیکل اور محرماتی مضمون ستمبر ہی کے "ہندستانی ادب" میں پیش ہے۔

موسا ندی کا پانی شہر کے مختلف حصوں میں جس بلندی تک آیا تھا، اس کے یادگاری کے طور پر طغیانی کے بعد حکومت حیدرآباد نے انگریزی میں "H. F. L. 1908" یعنی ہائی فلڈ لیول (HIGH FLOOD LEVEL) کے اسی لیول پر جہاں پانی پہنچا تھا، شہر کے بعض محلوں میں یہ نشانیاں آج بھی موجود ہیں۔ ان حرفوں کا مطلب ہائی فلڈ لیول ہے ——— (ایڈیٹر "ہندستانی ادب")

بڑی گھما گھمی تھی کہ ۲۲ آبان ۱۳۱۷ف م ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کو موسا ندی آئی اور حیدرآباد کو تباہ کر گئی۔ اس مصیبت کے متعلق بہت سے مرثیے لکھے جا چکے ہیں۔ میں بھی کچھ حالات لکھے دیتا ہوں، تاکہ یادگار رہ جائیں اور یہاں کی تباہی و بربادی کا قصہ سنا سکیں۔

یوں تو کئی روز سے بارش ہو رہی تھی، مگر ۲۲ آبان ۱۳۱۷ف م ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کو آسمان کا پیٹ پھٹ گیا۔ اس زور سے پانی برسا کہ بڑی بڑی عمارتیں "چیں" بول گئیں۔ تالاب ٹوٹ گئے

بھائی کورٹ میں آنے کے ساڑھے تین مہینے کے بعد ۱۷ مہر ۱۳۱۷ف م ۲۲ اگست ۱۹۰۸ء کو ہماری شادی ہوئی۔ نکلر گا تشریف میں ہوئی۔ اور بڑے زور شور سے ہوئی۔ ان واقعات کا تعلق میری ملازمت سے نہیں ہے، اس لیے ان کو چھوڑتا ہوں، لیکن سلسلہ قائم کرنے کے لیے کچھ حالات بیان کیے دیتا ہوں۔ شادی کے بعد ہم سب حیدرآباد آئے۔ آٹھ روز کے بعد ہماری بیگم صاحبہ اپنے میکے چلی گئیں۔ اس شادی کے موقع پر سارا خاندان جمع ہو گیا تھا، وہ ہمارے ہاں ہی رہا۔ گھر میں

ندی چڑھ گئی، غرض جدھر دیکھو پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ندی کا چڑھاؤ دیکھنے کے لیے پلوں پر جمے ہوئے تھے۔ پلوں کی یہ حالت تھی کہ پنکھے کی طرح پڑے ہل رہے تھے۔ ندی کا پانی کناروں سے نکل نشیبی محلوں میں گھس گیا تھا۔ اس روز کوئی چار بجے ہوں گے کہ حضرت غفران مکان (حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں) اپنے اسٹاف کے ساتھ ندی کی حالت دیکھنے آئے۔ افضل گنج کے پل سے ندی کا رنگ دیکھا، ضروری ہدایتیں دیں اور واپس چلے گئے۔ خدا معلوم صحیح ہے یا جھوٹ روایت تو یہ ہے کہ ان کی موٹر ندی کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے کھینچ کھانچ کر باہر نکالی۔ ہمارا دفتر تو ندی سے ملا ہوا ہی تھا۔ ہر گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد پل پر جاتے وہاں کی سیر کرتے اور چلے آتے۔ ہم پانچ بجے دفتر سے اٹھے، سیکل لی اور گھر کی طرف روانا ہوئے۔ یوں تو سارے رستے میں پانی ہی پانی تھا، مگر جب ہم محلے دارالشفا میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سڑک پر ایک دریا بہہ رہا ہے۔ اور اس میں کئی مرد تیراکی کر رہے ہیں۔ گھر آنا تھا آخر، اس پانی میں پاؤں ڈالنا ہی پڑا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ گھٹنوں تک آیا۔ اس مصیبت سے نکل کر گھر پہنچے اس زمانے میں ہم کاچی گوڑا میں رہتے تھے۔ اب بھی اسی حالت میں وہ مکان محسن میاں کی پھاٹک میں موجود ہے۔ شادی کی وجہ سے ماشاءاللہ ہمارے گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ سب نے کہا چلو ہم بھی تماشا دیکھیں، مگر جب مردوں کے بہنے کا حال سنا تو بعضوں کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔ اب کیا تھا یار دوست پھر پھرا کر آتے ندی کا حال سناتے اس پر رائے زنی ہوتی، مگر کسی کے شان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند گھنٹے میں یہ ندی کیا غضب ڈھانے والی ہے۔ غرض اسی طرح باتیں کرتے کراتے رات کے گیارہ بج گئے اور سب کو سونے کی سوجھی، بستر بچھائے گئے اور سب اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ کچھ یوں ہی آنکھ جھپکی تھی کہ ایک شخص غل مچاتا ہوا آیا کہ مولوی مسعود علی صاحب کی لڑکیاں ندی میں گھر گئی ہیں۔ گاڑی لے کر چلو۔ مولوی مسعود علی صاحب ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے تھے، مگر ان کی گاڑی ہمارے اصطبل میں کھڑی ہوتی تھی۔ اس گاڑی کو لینے جو شخص آیا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بیان کیا کہ مسعود علی صاحب کی لڑکیاں میر لیاقت علی صاحب کے ہاں ندی کا تماشا دیکھنے گئیں تھیں۔ رات کو کھانا کھانے کے لیے ان کو بلا لیا گیا اتنے میں ندی نے برابر والے پشتے کو توڑ مکان کو گھیر لیا، اور اب وہاں کمر برابر پانی آگیا ہے۔ یہ سن کر سب کمبل اور رضائیاں پھینک اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدے چادر گھاٹ پل پہنچے، کیا دیکھتے ہیں کہ ندی سے ملا ہوا جو محلا ہے وہ ایک تالاب ہو گیا ہے، بلکہ یوں کہو کہ ندی کا ایک جزو بن گیا ہے۔ میر صاحب کا مکان پل سے تھوڑی ہی دور ذرا کنارے پر تھا۔ بڑی مشکل سے گاڑی وہاں پہنچائی گئی اور اسی طرح میر صاحب اور محمود علی صاحب کے لوگوں کو نکالا گیا۔ ابھی یہاں سے فراغت نہیں پائی تھی کہ ہمارے ایک دوست آغا مرزا صاحب پل کے قریب ملے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اب ان سے حال پوچھتے ہیں تو وہ کوئی جواب نہیں دیتے، مگر روئے چلے جاتے ہیں۔ آخر بہت کچھ سمجھانے کے بعد انہوں نے بیان کیا کہ وہ اور ان کے گھر والے کھانے بیٹھے ہی تھے کہ صحن میں ایک بڑا سا غار ہو گیا اور اس میں سے پانی اتنے زور سے ابلا کہ تھوڑی سی دیر میں صحن کو بھر والان میں گھس آیا۔ آخر سوائے اس کے کچھ نہ سوجھی کہ بال بچوں کو کندے پر چڑھا بیوی کا ہاتھ پکڑ اور اللہ کا نام لے کر

پانی میں اتر پڑے۔ پانی کی یہ حالت کہ برابر چڑھ رہا تھا۔ صحن میں پہنچے تو گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا، مگر جب دروازے سے باہر قدم رکھا تو کمر تک پانی آگیا۔ غرض کسی طرح گیٹ کھاٹ کر سب کو اس مصیبت سے نکالا اور بھائی کے گھر پہنچا دیا، مگر گھر کے مال و اسباب میں ایک کوڑی نہیں بچی اور نئے سرے سے زندگی بنانے کی آفت آپڑی۔ ہم سبھوں نے ان کو یہ کہہ کے بہت کچھ تسلی دی کہ جان بچی لاکھوں پائے۔ خدا مسبب الاسباب ہے، گھر بسانے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی دے گا، مگر آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس طرح ایک ہی دفعہ تباہ ہو جانے سے دل پر کیا دھچکا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھر میں جانے اور کچھ نہ کچھ نکال لانے پر تلے ہوئے ہیں، مگر ان کے مکان میں قد آدم سے بھی اونچا پانی ہو گیا تھا اور ارد گرد مکان بیٹھ رہے تھے۔ اس لیے ان کو زبردستی ان کے بھائی کے ہاں پہنچایا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ ان کو گھر میں سے نکلنے نہ دینا نہیں تو ان کی جان کی خیر نہیں ہے۔

اس سے فراغت پا کر یہ خیال ہوا کہ اب اپنے گھر والوں کو کسی حفاظت کی جگہ پہنچا دینا چاہیے۔ سواریاں لانے میں خدا گیا۔ کچھ نہ پوچھو کہ کس مصیبت سے شکر میں کے اڈے پہنچا۔ شکر والوں کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ بڑی مشکل سے تین تین روپے پر دو شکر میں لایا۔ بھائی مرزا حسین احمد بیگ میری سیکل پر سوار ہو کر اپنے ایک دوست کے ہاں گئے۔ اور ان کے پاس سے گھوڑا گاڑی لائے، مگر میری سیکل وہیں چھوڑ آئے۔ دو ایک دن کے بعد جو سیکل آئی تو یہ معلوم ہوتا تھا یہ سیکل ہے یا اور کوئی چیز۔ المونیم کی سیکل تھی، پونے تین سو روپے میں چند ہی روز پہلے آبرج اینڈ کمپنی سے خریدی تھی وہ بے چاری بیچاری ٹھاٹھے اس ندی کی جھک میں آکر تباہ ہو گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ سب کو سوار کرکے دیا یوں کہو کہ لادکر) بھائی کرامت (نواب کرامت جنگ مرحوم) کے ہاں کنٹاگوشا محل پہنچا دیا۔ میاں احمد، رفیق بیگ، میاں نصیر، چھید اور بھائی بندھی ساتھ تھے۔ اور گھر پر رہ گئے کون کہ بھائی امیر الدین، میاں رحمت، فصیح الدین اور میں۔

جب گھر والوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو ہم سب کو سیر کی سوجھی۔ پہلے تو چولا سلگایا۔ گرم گرم چائے پی گئی اور اس کے بعد ہم سب لالٹینیں ہاتھوں میں لیے ندی کا تماشا دیکھنے نکل گئے۔ ندی کے کنارے کنارے پر ہی کمیلا تھا۔ اس میں تھوڑا تھوڑا پانی آ گیا تھا۔ کمیلے سے ملا ہوا خفیا پولیس کا دفتر تھا اور اس میں گورندوں کے رہنے کا جیل خانا۔ اس دفتر اور جیل خانے میں اس طرح روشنی تھی گویا دیوالی منائی جا رہی ہے۔ کوئی کمرا ایسا نہ تھا جس میں بجلی روشن نہ ہو۔ رہنے والے سب باہر نکل آئے تھے۔

ہمارے پھاٹک کے قریب ہی سڑک کے موڑ پر ایک میز کرسی بچھی تھی۔ اس پر عمارت کا ایک نقشا لیے ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ جتنے گورندے تھے، سب ان کے گرد جمع تھے۔ خفیا پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کا سارا سامان ایک جگہ ڈھیر تھا۔ دوسری لائن کا بچا بچایا سامان دوسری جگہ اوپر تلے پڑا تھا۔ ندی کے پانی کا یہ عالم تھا کہ خفیا پولیس کے دفتر سے آکر اس زور سے ٹکرا رہا تھا گویا توپیں چھوٹ رہی ہیں۔ بیس پچیس دفعا آوازیں ہوئیں اور کوئی نہ کوئی کمرا دھڑ کرکے گرا۔ ادھر کمرا گرا اس کا لیمپ بجھا ادھر نگرانکار نے آواز لگائی "کمرا نمبر ۴ گیا"، جو صاحب نقشا کھولے بیٹھے تھے انہوں نے گھڑی دیکھ کر نقشے میں لکھ دیا کہ کمرا نمبر ۴ فلاں وقت گرا۔ اس کے بعد پھر وہی "دھواں دھوں" کا سلسلا شروع ہوا۔ کسی دوسرے کمرے کا لیمپ بجھا اور آواز آئی کمرا

نمبر فلاں گر گیا" غرض اسی طرح ایک ایک کر کے تقریباً دو تہائی عمارت ندی کی نذر ہو گئی۔ یہاں تو یہ آفت برپا تھی۔ ادھر بعض آدمیوں کو چوری کی سوجھی۔ کیلے سے نکال کر بکروں کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کوئی حضرت ایک بکرے کو بغل میں مار کر بھاگے ــــ غل ہوا پکڑو، پکڑو، بھاگنے جانے نہ دیجیو، مگر اس وقت کون کسی کی سنتا تھا سب اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ وہ تو کہو کہ چرانے والے صاحب پریشان ہو گئے جو بکرے کو پھینک کر چلتے ورنا یقین مانیے کہ چور کو پکڑنے یا بکرے کو چھڑانے کے لیے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ بکرے کی رہائی کو ابھی کچھ دیر نہ گذری تھی کہ کوئی دوپہر صاحب خدا جانے کہاں سے آئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس کا ایک بکس جس میں چاندی کا سامان تھا اٹھا کر بھاگے، لیکن وہیں پکڑ لیے اور بٹھا لیے گئے، مگر سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ان کی نگرانی کون کرتا۔ انہوں نے دیکھا کہ میری طرف کوئی توجہ کر ہی نہیں رہا ہے تو یہ چپکے سے اٹھے اور چلدیے۔ سیر دیکھ کر ہم سب گھر آئے، اور میں نے اپنی بیوی کو یہاں کے واقعات سے متعلق ایک بڑا تفصیلی خط لکھا اور اسی وقت لے جا کر ڈاک کے بمبے میں ڈال دیا۔ یہ بمبا چادر گھاٹ کے پل کے پاس انگریزی پولیس کے تھانے سے ملا ہوا ڈاکٹر حامد علی کے مکان کے سامنے تھا۔ اب یہ سنیے کہ کیونکر یہ خط پانی کے رستے چلتا ہے اور کس طرح بجائے بگیر گاہ شریف جانے کے خدا میرے پاس آجاتا ہے۔ پانی کے زور سے یہ بمبا اپنی جگہ سے اکھڑا اور آکر ڈاکٹر صاحب کے مکان کے ایک کونے پر ایسی زبردست ٹکر ماری کہ دیوار میں غار ڈال دیا، مگر اس کے ساتھ ہی اس بیچارے بمبے کے ٹکڑے ٹکڑے اور جتنے خط اس میں تھے وہ دیوار کے غار میں پھیل گئے۔ تیسرے دن جب ہم نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا کر یہ تماشا دیکھا تو اپنے خط کا خیال آیا۔ ڈھونڈا تو وہ خط ان ہی خطوں میں ملا۔ نکال لایا اور بطور یادگار اس کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔ ابھی کوئی سال بھر ہوا ہو گا کہ دوسرے خطوں کے ساتھ اس کو بھی بے ضرورت سمجھ کر نذر آتش کر دیا۔ اب اس کا افسوس ہو رہا ہے۔ اگر وہ رہتا تو ان حالات کے سلسلے میں اس کو بھی یہاں نقل کرتا اور یہ دفعا قانون شہادت کے تحت ایک بڑی مضبوط شہادت میرے بیان بالا کی ہوتی۔

غرض اسی طرح دیکھتے بھالتے، پھرتے پھراتے صبح ہو گئی۔ رات کو تو ندی کی اصلی حالت معلوم نہیں ہوتی تھی، مگر صبح کو اس کا رنگ دیکھ کر ہوش و حواس جاتے رہے۔ سنتے ہیں پانی اپنی سطح برابر رکھتا ہے، لیکن یہاں یہ شکل تھی کہ ندی کے بیچ میں جو دھارا تھا وہ کناروں سے کوئی بیس پچیس فٹ بلند تھا اور اس دھارے کے عین بیچ میں ہر قسم کا سامان صندوق، پلنگ، تخت وغیرہ قلابازیاں کھاتے چلے جا رہے تھے۔ ندی کی رفتار کا اس سے اندازا کر لیجیے کہ اس دھارے پر چکر کھاتی ہوئی لوہے کی سینکڑوں تجوریاں بہہ گئی ہیں اور کئی کئی میل دور جا کر نکلی ہیں۔ ندی کے کنارے کنارے سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ بہت سے رسیوں میں لوہے کے کانٹے باندھے کھڑے تھے۔ جب کوئی تختا یا لکڑی کا ٹکڑا کنارے کے قریب سے گذرنے لگتا تو کانٹا پھینکتے۔ اکثر کے نہ لگتے، اور جو خدانخواستہ کسی کا کانٹا کسی چیز سے اٹک جاتا تو قیامت سی آجاتی۔ کانٹے میں پھنستے ہی وہ چیز اس زور سے دھارے کی طرف جاتی کہ کئی آدمی زور مارتے، مگر کنارے پر آنے کا نام نہ لیتی۔ بہت سوں کے تو کانٹے اور رسیاں ندی کی نذر ہو گئیں۔ اور بعض کچھ تھوڑا بہت مال کنارے پر کھینچ لائے۔ ایک صاحب اس چھینکے میں ندی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آخر جب پولیس نے

آکر انتظام کیا تو اس وقت کہیں جا کر یا لکڑیوں کا انتظام موقوف ہوا۔

یہاں یہ تماشا ہو رہا تھا کہ نواب افسر جنگ بہادر گھوڑے پر سوار آئے، اس وقت تک پل کے اوپر کی دیواریں پانی کی مار سہہ رہی تھیں، مگر موریوں میں سے ہو کر پل پر سے گھٹنوں گھٹنوں پانی بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ پل کی یہ حالت تھی کہ گویا کانپ رہا ہے، یہ حالت دیکھ کر نواب صاحب گھوڑے پر سے اتر پڑے اور کہنے لگے کیا کروں سرکار نے یاد فرمایا ہے، مگر پل کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس وقت گرتا ہے۔ وہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک عزیز نظیر مرزا صاحب پل کی دوسری طرف سے چھتری لگائے آتے دکھائی دیے۔ پائنچے تو ضرور چڑھے ہوئے تھے، مگر وہ اس طرح خراماں خراماں آ رہے تھے گویا ندی میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر نواب افسر الملک کی ہمت بندگئی۔ ایک دفعہ ہی سوار ہوئے اور گھوڑے کو سرپٹ کر دیا۔ جب یہ نظیر مرزا کے پاس سے نکلے تو بہت چیخ کر کہا بھاگو! وہ یہ تو نہیں سمجھے کہ آخر بھاگنے کی ضرورت کیا ہے، مگر صرف اس لیے کہ نواب افسر الملک بہادر کا حکم تھا، بھاگے اور بڑے زور سے بھاگے خدا کی قدرت دیکھیے کہ افسر الملک اس کنارے پر اور یہ اس کنارے پر پہنچے اور ادھر سارے کا سارا پل اڑاڑاڑ ادھم کر کے بیٹھ گیا۔ خدا محفوظ رکھے پل کے گرنے کی ایسی سخت آواز ہیں ہوئیں کہ سارا محلا ہل گیا اور پانی جو پھیلا تو جتنے لوگ کنارے پر کھڑے وہ سر سے پاؤں تک بھیگ کر چور ہو گئے۔ پل کے گرتے ہی پانی اس تیزی سے بڑھا کہ تھوڑی ہی دیر میں اس نے نکاچی گوڑا کے زیریں حصے کو گھیر لیا اور مکانوں کے گرنے کی دھما دھم شروع ہو گئی۔ اب ہم لوگوں کو بھی اپنے مکانوں کی فکر ہو گئی۔ گھر پر آئے تو دیکھا کہ ہمارے وہ عزیز بھی آگئے ہیں جو رات کو بھائی کرامت کے ہاں چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی کھڑے لبو رہے تھے۔ ان سے پوچھا بھئی آخر یہ کیا معاملا ہے؟ انہوں نے کہا ہم بچ تو گئے مگر پہننے کو کسی کے پاس ایک کرتا تک نہیں ہے، آخر گذرے گی تو کیسے گذرے گی؟ بات معقول تھی۔ اس لیے چاندی کے چھپر کھٹ لگائے گئے اس پر گھر کے ہر شخص کا ایک صندوق رکھا گیا۔ سبھوں نے ہات لگایا۔ اس طرح سامان کے ان مردوں کو کسی نہ کسی طرح لے کر عیسا میاں کے بازار پہنچے۔ وہاں پر سامان سر راہ مانجی پلے کے سپرد کیا اور واپس چلے آئے۔ سر راہ مانجی پلے وہی صاحب ہیں جو چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور جن کی ماتحتی میں ہماری ملازمت کا ابتدائی زمانا گذرا تھا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد صلاح ہوئی کہ بھائی کرامت کے ہاں چلنا چاہیے، کیونکہ ہمارے مکان کے پھاٹک تک آ گیا تھا۔ اور ڈر تھا کہ اگر پیدڑنی کی دیوار ٹوٹ گئی تو سارا عیسا میاں کا بازار اور کاچی گوڑا ایک دم پانی میں غرق ہو جائے گا۔ غرض کمروں پر قفل ڈالے۔ مکان کو اللہ کی راہ پر چھوڑا اور سب کے سب عیسا میاں کے بازار اور ڈیڈنی کے پہلو پر سے ہوتے ہوئے کنٹا گوشا محل پہنچے۔ رستے میں لوگوں کی جو حالت اور پریشانی دیکھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی ہے اور سب کے سب نفسی نفسی کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کوئی صندوق سر پر اٹھائے بھاگ رہا ہے۔ کوئی بچوں کو گود میں سنبھالے دوڑ رہا ہے۔ عورتیں ہیں کہ ننگے سر ننگے پاؤں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پریشان حال پھر رہی ہیں۔ بچے رو رہے ہیں۔ جوان چیخ رہے ہیں۔ بڈھے لبو رہے ہیں۔ غرض جو ہے اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ خیر کسی نہ کسی طرح

کیچڑ پانی میں سے ہوتے ہوئے ہم بھائی کرامت کے ہاں پہنچے۔ وہ حسین ساگر کا انتظام کرکے اسی وقت واپس آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو پھر جاتا ہوں۔ تم سب لوگ یہاں سے نکل کر فتح میدان والے مکان چلے جاؤ یہاں کا مکان اب خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہاں پانی ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ پانی موتی عزیز مرزا صاحب کے مکان میں گھس آیا ہے۔ ان کا مکان اسی سڑک پر بھائی کرامت کے مکان سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ یہ سنتے ہی بھائی کرامت تو ادھر گئے اور یہاں پھر سامان سمیٹنا شروع ہوا۔ بھائی امیر الدین کا ایک دودھ پیتا بچا ساتھ تھا وہ پہلے سے بیمار تھا۔ اس گڑبڑ میں اس کی حالت نازک ہو گئی مگر کیا کیا جاتا، بغیر بھاگے وہ بھی نہیں سکتے تھے۔ ابھی یہاں بھاگنے کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ بھائی کرامت واپس آئے اور کہا کہ اب یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانی اترنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ سن کر سب نے اطمینان کا سانس لیا اور بندھا ہوا سامان کھلنے لگا۔

سچ ہے کہ انسان بھی عجب چیز ہے ذرا مصیبت ٹلی اور اس کو مزے اڑانے کی سوجھی۔ یہ سن کر کہ پانی اتر رہا ہے ہم میں سے اکثر کو شوق ہوا کہ چلو یہ نظارا بھی دیکھ لیں۔ گھر سے نکلے دیکھا کہ پانی جس تیزی سے چڑھا تھا اسی تیزی سے اتر رہا ہے، لیکن لوگوں پر ڈر اتنا بیٹھ گیا تھا کہ پانی کے اترنے کے بعد بھی کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ کنٹا گوشا محل کی سڑک کے نکڑ ہی پر سے یہ دکھائی دیتا تھا کہ سدی عنبر کا سارا بازار بٹرا ہو گیا ہے۔ بہت سے مکان گر چکے ہیں۔ کچے کھڑے لڑکھڑا رہے ہیں۔ لوگوں کو اپنے مکانوں پر جانے کی فکر ہے، لیکن مکان کی حالت قدم پکڑے لیتی ہے۔ اب رہا رونا پیٹنا تو کوئی محلا نہیں تھا جو اس سرے سے اس سرے تک صاف نہ ہو گیا ہو۔ اور کوئی خاندان نہیں تھا جس میں سے کم سے کم دو چار آدمی نہ بہہ گئے ہوں۔ اب رہا مال تو وہ بھلا کیا بچتا۔ گھانسی کے بازار اور بیگم بازار کی طرف پانی اس طرح ایک دفعا ہی لوٹا تھا کہ کسی کو گھر سے نکلنے کی تک مہلت بھی نہیں ملی۔ اور سب یوں ہی مال اسباب چھوڑ ایک جوڑے کپڑے سے نکلے تھے۔ ان میں سے کچے بہہ گئے تھے، کچے رہ گئے تھے۔ غرض جو لوگ بچتے تھے وہ تھوڑی سی دیر میں فقیر سے بدتر ہو گئے۔ کچے لوگ درختوں پر چڑھ گئے۔ ان تک کشتیوں میں بیٹھ کر فوج والے گئے اور وہاں سے ان کو اتار کر لائے۔ کچے لوگ دو منزلوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے ان کو سیڑھیاں لگا کر اتارا گیا، لیکن ایک سفید گھوڑے کو نہ اتارا سکے جو بہتا ہوا کہیں سے آگیا تھا، اور ایک دو منزلہ مکان کی چھت پر آکر ٹک گیا تھا۔ اس مکان کی مضبوطی واقعی قابل داد تھی ندی نے بنیاد کو تقریباً کھود کر پھینک دیا تھا، لیکن مکان کی دونوں منزلیں اس طرح قائم تھیں جیسے پہلے تھیں۔ میرا جہاں تک خیال ہے ندی اترنے کے کوئی بیس پچیس روز کے بعد یہ گھوڑا رسیوں میں باندھ کر زمین پر اتارا گیا۔ یہ مکان اب تک موجود ہے۔ اب بھی جب کبھی ادھر سے گذرتا ہوں تو یہ دو منزلا پر گھوڑے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

یہی حال خوب پھر پھرا کر شام کو بھائی کرامت کے ہاں آئے۔ ندی بہت کچھ اتر چکی تھی۔ اس لیے ہم سے کچھ کاچی گوڑا گئے اور کچھ یہاں رہے۔ گھر پر جاکر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ندی ہمارے گھر کی چوکھٹ چوم کر واپس ہوئی ہے۔ مکان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، اور یہ ہاتھ لگاتا کون۔ ہر شخص اپنی مصیبت میں گرفتار تھا۔

ہم نے مکان کھولا۔ بازار سے کباب کلیجے منگائے، چائے بنی، رات کے کوئی ایک بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ دو آدمی جاگیں اور بقیہ سب سوئیں، دو دو گھنٹے کے بعد باری بدلی جائے، تاکہ اگر خدانخواستہ ندی پھر اپنا سیق دہرانے لگے تو وقت پر بھاگ سکیں۔ رات آرام سے گزر گئی۔ التمامحلے کے لوگوں کے رونے پیٹنے سے کبھی کبھی بے چینی ہونے لگتی تھی۔

صبح ہوئی۔ چائے کا پھر دور چلا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر مکان پر قفل ڈال سب باہر نکلے۔ اب ندی کو جا کر دیکھا تو معلوم ہوتا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ بھری ہوئی تو ضرور چل رہی تھی، مگر نہ وہ تیزی تھی اور نہ وہ غل۔ پانی دونوں کناروں سے بھی ہٹ کر ندی کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ سامان جو یہ کر آیا تھا وہ ریت میں دھنس گیا تھا، لیکن کہیں اس دبے ہوئے سامان کے کچھ حصے اور کونے دکھائی دیتے تھے۔ بعض اللہ کے نیک بندے اس سامان کو نکالنے اور قبضا کرنے میں مصروف تھے۔ ندی کے دھارے کے قریب ہی ایک چھوٹی سی چٹان تھی۔ اس پر بیٹھ ہم تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک دفعہ غل ہوا کہ حسین ساگر کا بند ٹوٹ گیا، اور پانی مشیر آباد سے ہوتا ہوا کاچی گوڑا کی طرف آ رہا ہے۔ یہ سن کر وہ سب مصیبت زدہ بھاگے جو ندی کے اترنے کی وجہ سے اپنے گھروں میں لوٹ آئے تھے۔ ان کا بھاگنا تھا کہ بدمعاشوں نے گھر لوٹنے شروع کر دیے۔ ہم سب تو ندی کے بیچ میں بیٹھے تھے۔ آخر جاتے تو کہاں جاتے سوچ لیا کہ اگر ڈوب مرنا ہی ہے تو یہیں سہی۔ جو لوگ کاچی گوڑا سے رزیڈنسی کی طرف بھاگے تھے وہ تھوڑی سی دیر میں الٹے پاؤں ادھر آ رہے ہیں غرض ندی کی طغیانی سے زیادہ لوگ ان افواہوں کی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ندی کے دونوں کناروں پر ایسا کوئی محلہ نہ تھا جہاں اس قسم کی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ کاچی گوڑا میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا ایک غریب سے آدمی جن کا نام عبدالحق تھا اپنے بیوی بچوں کو لے کر خدا جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ندی اترنے کے بعد یہ سب گھر واپس آئے۔ بیچاری بیوی نے کھچڑی پکائی۔ چٹنی بیسن دسترخوان بچھایا۔ اب یہ کھانے ہی بیٹھے تھے کہ حسین ساگر کے بند کے ٹوٹنے کا غل ہوا۔ دسترخوان یوں ہی لگے کا لگا چھوڑ یہ سب بھاگے۔ گھر سے کچھ ہی دور جا کر معلوم ہوا کہ خبر غلط ہے۔ وہاں سے واپس ہوئے۔ اب جو آ کر دیکھتے ہیں تو ایک بدمعاش صاحب دسترخوان پر ڈٹے کھچڑی اڑا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوٹنے کے لیے گھر گئے تھے۔ ان بیچارے غریب کے گھر میں کون سی دولت رکھی تھی جو ملتی۔ جب کچھ ملتے ملانے سے مایوس ہو گئے تو "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" پر عمل کر کے دسترخوان پر تشریف فرما ہو گئے۔ ہمارے ایک بھائی مرزا لڈن (مرزا اسلیمان بیگ صاحب) ہیں۔ وہ اس حسین ساگر کے بند ٹوٹنے اور ہانڈیوں کے پھوٹنے کی گڑبڑ میں ایسے بے تحاشا بھاگے کہ اپنی جوتیاں بھی کہیں چھوڑ آئے۔ اگر یہ لوٹ مار کچھ دیر اور چلتی تو سارا شہر لٹ جاتا۔ وہ تو کہو کہ حضرت عفران مکان نے افسر الملک کو انتظام کرنے کا حکم دیا اور آناً فاناً میں سارے شہر میں فوج پھیل گئی جب کہیں جا کر یہ مصیبت دور ہوئی۔

فوج نے اس زمانے میں جو کام کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ملبے سے نکالا، مردوں کو دفن کیا اور اس طرح حیدرآباد کو وبا پھیلنے سے بچا لیا۔ ہم چاہتے تھے کہ شہر کی حالت بھی جا کر دیکھیں مگر ندی کا عبور کرنا بھی مشکل تھا۔ خدا خدا کر کے

۲۴ر آبان ۱۳۱۷ف م ۲۹ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو ندی پایاب ہو گئی۔ اس وقت ہم سب مل کر شہر کے اندر گئے۔ وہاں جو حالت دیکھی وہ خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ چادر گھاٹ کے پل سے لگا کر صفائی کے دفتر تک بازار کا ایک رخ بالکل صاف تھا۔ دارالشفا میں جو دواخانا تھا وہ تقریباً غایب تھا اور اس کے مریض ندی کے نظر ہو چکے تھے یہاں کے مکانوں پر پانی کا جو نشان تھا وہ کسی طرح انیس بیس فٹ سے کم اونچا نہ ہوگا۔ اس کے بعد کے مکانات صحیح وسالم تھے۔ وہاں سے ہم دیوان کی دیوڑھی کی طرف بڑھے۔ یہاں بھی پانی آیا تھا، مگر زیادہ نہیں تھا اس لیے نقصان بھی کم ہوا تھا یہ سب سے بری حالت زچگی خانے کی تھی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس ہسپتال میں کتنی جانوں کا نقصان ہوا ہے۔ صفائی کی بیسیوں کرسچیاں کھڑی تھیں اندر سے عورتوں کی لاشوں کو لاتے، اوپر تلے بھر دیتے اور اوپر سے ایک بوریے کا ٹکڑا ڈال دیتے تھے۔ چلو تجہیز وتکفین پوری ہو گئی۔ کرو پنچ گئی، کسی گڑھے میں ان لاشوں کو الٹا اور واپس آ گئی۔ سنا جاتا ہے کہ اس طرح کچھ اوپر چار سو لاشیں ٹھکانے لگا دی گئیں۔ ہائی کورٹ کی ساری عمارت میں بھی پانی آیا تھا۔ رجسٹرار صاحب (نواب عماد جنگ مرحوم) کمروں میں سے املا لکلوانے اور سوکھنے کے لیے صحن میں پھیلانے میں لگے ہوئے تھے۔ ہم یہ حالت دیکھ کر وہاں سے کھسک آئے، کیونکہ جانتے تھے کہ انہوں نے دیکھ لیا تو ہمیں بھی اسی بیگار پر لگا دیں گے۔ یہاں سے نکل کر ہم افضل گنج کے ٹوٹے ہوئے پل کو لانگتے پھلانگتے سدی عنبر کے بازار میں آئے یہاں اس سرے سے اس سرے تک تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید ہی کوئی مکان ہوگا جو گرنے سے بچا ہو۔ اور شاید ہی کوئی مکان گرا ہوگا، جس کے نیچے دو چار آدمی دب کر نہ مرے ہوں۔ یہی حالت افضل گنج کی تھی۔ بیگم بازار میں سناٹا مارا تھا۔ مکانات بد وضع اور بد قطع تھے، مگر بڑے مضبوط، لیکن یہ پانی کی مار کو نہ سہار سکے۔ یہاں معلوم ہوا کہ ایک بڑے مضبوط مکان کے دو منزلا پر کوئی سوڈیڑھ سو آدمیوں نے پناہ لی تھی۔ پانی نے اس بلا کی کاٹ کی کہ دو منزلا چھت مکان سے الگ ہو کر ندی میں کشتی کی طرح بہہ گئی۔ اس کشتی نے پل سے ٹکر کھائی اور سب کے سب وہیں ختم ہو گئے۔ یہاں قریب شاہی فیل خانا تھا۔ یہاں یہ واقعہ سنا کہ ۲۴ر آبان ۱۳۱۷ف م ۲۷ر ستمبر ۱۹۰۸ء کی شام ہی کو سب ہاتی دوسری جگہ منتقل کر دیے گئے تھے۔ ایک ہاتی مست تھا اس کو نکال نہ سکے۔ ندی کا پانی ایک دفعا ہی ۲۸ر کی صبح کو اس زور کا آیا کہ پتھر کے جس ستون سے یہ ہاتی بندھا ہوا تھا وہ جڑ سے اکھڑ گیا۔ ہاتی نے نکل بھاگنے کی کوشش کی، مگر پانی کی رو اس کو پل کی طرف لے گئی۔ پل سے اس کی ٹکر اس زور سے ہوئی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ افضل گنج کے ہسپتال کی تقریباً ساری عمارت تباہ ہو گئی تھی۔ صرف چند دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں۔ معلوم نہیں کہ یہاں کے مریضوں کا کیا حشر ہوا، کیونکہ یہاں ایک دم پانی لوٹا تھا۔ اندرون شہر میں گھانسی بازار، محبوب کی مہندی پیٹلہ برج اور کاروان کی حالت بہت خراب تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تباہی ہی تباہی نظر آتی تھی۔ ان محلوں میں جان کا نقصان سب سے زیادہ ہوا تھا، کیونکہ یہاں فصیل توڑ کر پانی اس تیزی سے دوڑا تھا کہ ذرا سی دیر میں ان محلوں کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا تھا اور کسی کو اتنی فرصت نہ ملی کہ سامان نکالنا تو کجا اپنی جان بچا کر لے جا سکے کوٹھوں پر چڑھ گئے۔ کچھ قسمت سے بچ گئے۔

ہم یہاں ندی کی مصیبت میں گرفتار تھے، اور وہاں گلبرگا شریف میں ہماری بیوی سخت پریشانی میں مبتلا تھیں، مگر کیا کیا جاتا۔ تار ٹوٹ گئے تھے ریل کی پٹریاں اکھڑ گئی تھیں۔ ڈاک کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے ۲۳ آبان ۱۳۱۷ف م ۱۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کو صبح کے وقت ایک تار دے دیا تھا کہ یہاں سب خیریت ہے، مگر اس وقت تک گلبرگا شریف میں یہاں کی حالت کی کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی، اس لیے سمجھا گیا کہ معمولی تار ہے۔ اس کے دوسرے روز وہاں یہ شہرت ہوئی کہ سارا حیدرآباد ندی میں بہہ گیا اور کاچی گوڑا کا ایک مکان بھی نہیں بچا۔ اب کوئی تو یہ کہتا تھا کہ یہ تار ندی آنے سے پہلے کا ہے، اور کوئی کہتا تھا کہ نہیں ندی آنے کے بعد کا ہے۔ وہاں سے تار پر تار دیے گئے، مگر ہم کو ایک نہیں پہنچا۔ چوتھے روز ریل کی پٹری کچھ درست ہوئی تو پہلی ٹرین سے میاں سلیم بیگ یہاں آئے۔ سب کو زندا سلامت دیکھ کر مطمئن ہوئے اور دوسری گاڑی سے میں اور وہ دونوں گلبرگا شریف پہنچ گئے۔ جب کہیں جا کر وہاں کی پریشانی رفع ہوئی چند روز وہاں ٹھہر کر ہم واپس آئے اور کام پر جٹ گئے۔

غزل مرغوب بانھالی

دل جلوں کی بنی نہ باغوں میں
وہ خلش کب بٹی ہے اغوں میں

کس کی جانب لپک کے جائے
اک ہے پروانہ سو چراغوں میں

سر بلف آج بھی ہیں پروانے
وہ کشش ہی نہیں چراغوں میں

کھل کے ہنسا نہیں ہے آج کوئی
بڑے گلچیں چھپے ہیں باغوں میں

بات اپنی دل میں رہ نہیں سکتی
لاکھ جاسوس ہیں سراغوں میں

دل کی بستی نہیں ہے اب محفوظ
بڑے خطرات ہیں دماغوں میں

آج مرغوب کو ہوا معلوم
خار ہی خار ہیں باغوں میں

کل پاکستان انجمن ترقی اردو
کا
پندرہ روزہ ترجمان

"قومی زبان"

جو ایک عرصے سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی زیر نگرانی اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے اور جس کا ہر شمارہ بیش بہا معلومات کا خزینہ ہوتا ہے۔

چند مستقل عنوانات —

★ حرفے چند (جدید ادبی مسائل کا تجزیہ)
★ آئینہ (ہر ماہ کے اردو ادبی رسائل کا جائزہ)
★ گرد و پیش (ادبی، علمی اور ثقافتی خبریں)
★ رفتار ادب (اردو کے اشاعتی اداروں سے متعلق معلومات)
★ تبصرے (اردو کی تازہ ترین کتب پر بے لاگ تبصرے)
★ غزل نما (اہم شعری مجموعوں کی غزلوں کا انتخاب)

قیمت فی پرچہ ۴ آنے۔ سالانہ ۵ روپے

دفتر "قومی زبان"
انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۔ اردو روڈ
کراچی

جی۔ ام۔ خان نے اعجاز پریس حیدرآباد ۲ میں چھپوایا۔